ماہنامہ

زندگی رامپور

جلد :- ۳۶
شمارہ :- ۱

رمضان المبارک ۱۳۸۵ھ
جنوری ۱۹۶۶ء

مدیر :- سید احمد قادری

• خط وکتابت وارسال زر کا پتہ — منیجر رسالہ "زندگی" رام پور۔ یوپی

• زر سالانہ :- چھ روپیہ ــ ششماہی :- تین روپیہ ــ فی پرچہ :- ۶۰ پیسے

ممالک غیر سے :- بارہ شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر

[illegible] - ایڈیٹر سید احمد قادری - پرنٹر پبلشر :- [illegible] مطبع :- دہلی پرنٹنگ ورکس محلہ [illegible]
مقام اشاعت :- دفتر زندگی رامپور یوپی

اشارات

سید احمد قادری

مذہب پر اختلافات، نزاع اور جھگڑے ٹنٹے پھیلانے کا الزام رکھنے والوں کے لیے روس اور چین کا جھگڑا صرف ایک عبرت ہی نہیں بلکہ زبردست طمانچہ ہے جو ان کے سیدھے گال پر پڑ رہا ہے۔ یہ جھگڑا اب کس حد تک پہنچ چکا ہے اسے سمجھنے کے لیے چینی اور روسی پریس کے چند حوالے کافی ہوں گے۔

۲ ستمبر ۱۹۶۵ء کو لن پاؤ (Lin Piao) نے جو چینی کمیونسٹ پارٹی کی سنٹرل کمیٹی کے وائس چیرمین اس کے علاوہ نائب وزیر اعظم اور وزیر دفاع بھی ہیں۔ بیس ہزار الفاظ پر مشتمل ایک بیان دیا تھا جو براڈ کاسٹ کیا گیا اور کمیونسٹ چین کے اندر پانچ زبانوں میں شائع کیا گیا۔ اس بیان میں روس کو امریکہ کی صف میں رکھ کر اسے بھی تباہ و برباد کر دینے کی دھمکی اور ترغیب دی گئی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے:-

"خروشچیف کی تحریف کو پسند کرنے والوں کا پروپیگنڈا جو وہ عوامی جنگ کے خلاف کر رہے ہیں اور شکست خوردگی اور دشمن کے سامنے ہتھیار رکھ دینے کا جو پرچار انھوں نے کیا ہے وہ ہر ملک کے انقلاب پسند عوام کی ہمت شکنی اور انہیں روحانی طور پر کمزور کرنے کا سبب بن رہا ہے۔ یہ تحریف پسند وہ خدمت انجام دے رہے ہیں جسے امریکی سرمایہ دار خود انجام دینے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ انھوں نے مارکس اور لینن کے انقلابی نظریے میں مکمل تحریف کی ہے اور یہ عوامی جنگ کو غلط راستے پر ڈال دینے کے مجرم ہیں۔

امریکی امپرلزم کے خلاف جنگ جیتنے اور عوامی جنگوں کو فتح یاب کرنے کے لیے ضروری ہے کہ دنیا بھر کے انقلاب پسند، مارکس اور لینن کے سچے پیرو، خروشچیفی تحریف پسندوں کی مخالفت کریں ...... دنیا کے انقلابی عوام ہر اس چیز کو بہالے جائیں گے جو ان کے اقدام و ترقی کی راہ میں حائل ہو ..... خروشچیف ختم ہو چکا ہے اور اس کی تحریف کے پیرو، سرمایہ داروں سے بہتر ثابت نہ ہوں گے۔ رجعت پسند اور

خروشچیفی تحریف پسند جو عوامی جنگ کے خلاف ایکا کر چکے ہیں۔ انقلابی عوام کی طاقت ور جھاڑو انہیں تاریخ کے اسٹیج سے گرد کی طرح صاف کر دے گی۔

چین کے انگریزی روزنامہ "پیپلس ڈیلی" کے ایک تازہ مقالے میں اس سے بھی زیادہ صاف انداز میں کہا گیا ہے کہ :۔

"چینی اور روسی کمیونزم کے درمیان مصالحت نہیں ہو سکتی اور یہ مسئلہ صرف اسی وقت حل ہو سکتا ہے جب آخر الذکر کو سیاسی اور نظریاتی طور پر پاش پاش کر دیا جائے ـــــ دونوں نقطۂ نظر میں مصالحت کا کوئی سوال نہیں کیونکہ اب دونوں کے درمیان جزوی یا کوئی نقطۂ اشتراک بھی باقی نہیں ہے اس لیے سرمایہ دار امریکہ کی طرح سوویت یونین کو بھی مکمل طور پر تباہ کر دیا جانا چاہیے۔ اسی طرح دنیا کے ان تمام افراد اور قوموں کو بھی ختم کر دینا چاہیے جو روسی طریق فکر کی حمایت کرتے ہیں۔

روسی کمیونسٹوں نے بڑے صبر کے ساتھ چینی کمیونسٹوں کے ان حملوں کو برداشت کیا لیکن اب انکا پیمانۂ صبر بھی لبریز ہونے لگا ہے چنانچہ ابھی ۲۲ نومبر کو روسی کمیونسٹ پارٹی کے ترجمان "پراودا" نے ایک طویل اداریہ شائع کیا ہے جس میں اس نے چین کو متنبہ کیا ہے کہ :۔

"روس ہر قسم کی موقع پرستی اور ان تمام لوگوں کے خلاف جنگ کرے گا۔ جو مارکس اور لینن کی تعلیمات کو توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں۔ پراودا نے نام لیے بغیر چینی کمیونسٹوں پر الزام لگایا ہے کہ وہ کمیونسٹ اتحاد میں انتشار پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور ان کی یہ کوشش یقیناً ناکام ہوگی۔

اس اختلاف میں چین کا موقف صحیح ہے۔ یا روس کا ؟ ہمیں اس سوال سے اس وقت کوئی بحث نہیں ہے اور نہ اس پر اظہار خیال مقصود ہے کہ اس جنگ میں کامیابی کس کو حاصل ہوگی۔ ہمیں اس وقت صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ کمیونسٹ ملحدین نے مذہب پر جس قسم کے الزامات لگائے تھے وہ سب خود ان کی طرف لوٹ رہے ہیں۔

مذہب پر ایک بہت بڑا الزام یہ تھا کہ وہ نہ صرف مختلف مذہب کے ماننے والوں کے درمیان سخت اختلافات کا باعث ہے، بلکہ ایک مذہب کے مختلف فرقوں کے درمیان بھی انتہائی تلخ بحث و نزاع کا سبب ہے ـــــ جب مارکس کا ایجاد کردہ فلسفہ، لینن کے دور میں ایک عالمی طاقت بن کر ابھرا تو اس وقت پوری قوت کے ساتھ یہ دعویٰ کیا گیا کہ مارکس کی تصنیف "دی کیپیٹل" ہی وہ کتاب ہے جو انسانیت کو متحد

کر سکتی ہے یہ کتاب کمیونسٹوں کی بائبل ہے۔ مذہب کی مذمت کے لیے ہزار بار مذہب عیسوی کے دو فرقوں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کے درمیان جنگ و جدل اور خون خرابے کو مثال کے طور پر پیش کیا گیا اسی طرح صلیبی جنگوں کو بھی بار بار ثبوت میں پیش کیا گیا مسلمانوں میں مقلدین و غیر مقلدین، شیعہ اور سنی اور خود اہل سنت میں دیوبندیوں اور بریلویوں کے اختلافات کو نمک مرچ لگا لگا کر اچھالا گیا اور طاقت کے گھمنڈ میں کہا گیا کہ مذہب کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنا چاہیے۔ فرمایا گیا کہ مذہب کی تاریک رات ختم ہو چکی ہے اور کمیونزم اور غیر طبقاتی سوسائٹی کا روشن دن نکل آیا ہے۔

جو لوگ کل انسانیت کو متحد کرنے کا دعویٰ لے کر اٹھے تھے وہ آج خود انسانیت کو منتشر کرنے کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ کمیونسٹ دو بڑے حصوں میں تقسیم ہو چکے ہیں۔ ہر فرقہ دوسرے پر مارکس اور لینن کی تعلیمات میں تحریف کا الزام لگا رہا ہے اور نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ چین کے نزدیک یہ الجھن اس وقت تک سلجھ نہیں سکتی جب تک روس کو بھی امریکہ کی طرح مکمل طور پر تباہ نہ کر دیا جائے۔ روس اس کے نزدیک کمیونسٹ باقی نہیں رہا بلکہ سرمایہ داروں اور رجعت پسندوں کی صف میں داخل ہو چکا ہے کل جو لوگ کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں کے درمیان اختلاف کا سبب مذہب کو قرار دے رہے تھے وہ آج اپنے درمیان کے اختلاف کا سبب کمیونزم کو نہیں بلکہ دوسرے فرقے کی تحریف کو قرار دے رہے ہیں چینی کمیونسٹ کہہ رہے ہیں کہ سچے اور صحیح کمیونسٹ ہم ہیں۔ روس بورژوائی ہو گیا ہے اور روسی کمیونسٹ چیخ رہے ہیں کہ چین کے کمیونسٹ، مارکس اور لینن کی تعلیمات کو توڑ مروڑ کر پیش کر رہے ہیں سچے اور صحیح کمیونسٹ ہم ہیں۔

مذہب و اخلاق کی طاقت دور کھڑی ان بے وقوفوں پر ہنس رہی ہے وہ کہتی ہے کہ احمقو! سچا کمیونسٹ روس ہو یا چین تمہارا یہ جھگڑا کسی تحریف کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ وہ دین اور وہ فلسفۂ زندگی ہی جس پر تم ایمان لائے ہو۔ اپنی عین فطرت کے لحاظ سے اختلاف خیز اور فتنہ انگیز ہے۔ اگر تمہارے درمیان یہ اختلاف نہ ہوتا تو حیرت ہوتی۔ جب تمہارے نزدیک اس دنیا کا کوئی خدا نہیں ہے جو زندگی کے لیے قانون عطا کرے اور جب اس زندگی کے بعد دوسری کوئی اور زندگی نہیں ہے جس میں اس زندگی کا حساب دینا ہو تو پھر تم میں کا ہر فرقہ اپنی خدائی کا ڈنکا بجانے کی سعی کیوں نہ کرے۔ واقعہ جو کچھ ہے وہ یہ کہ چین اپنی کثیر آبادی

کے بل بوتے پر کمیونسٹ بلاک کی رہنمائی اور اقتدار کا مستحق اپنے آپ کو سمجھتا ہے اور روس اپنے ترقی یافتہ ذرائع و وسائل کے زور پر مقتدر اعلیٰ خود بننا چاہتا ہے رہا باقی رہا کمیونزم تو وہ نام ہی سے ۔ موقع سے فائدہ اٹھا لینے کا دوسری اٹل اور لازوال اخلاقی قدر کا حامل ہی کب ہے کہ اس میں تحریف کا سوال پیدا ہو ـــــ یہ واقعات کی ستم ظریفی ہے کہ مارکس نے اپنے نقطۂ نظر سے کل مذہب کو جو مقام دیا تھا آج اس کا اپنا ایجاد کردہ فلسفہ ٹھیک وہی رول ادا کر رہا ہے ۔

چین اور روس کی کش مکش نے اب پہلے سے زیادہ کمیونزم کا پول کھول دیا ہے اس موقع پر تمام دنیا کے مذہبی ممالک اور ان کے مذہبی عوام و خواص کا فرض یہ تھا کہ وہ ان دو بڑے ملکوں کے سامنے مذہب کی حقانیت اور اس کی افادیت کا ثبوت پیش کرتے اور ان ملکوں کے عوام کو بتاتے کہ تم جس فلسفۂ زندگی کو لے کر آگے بڑھ رہے ہو وہ انسانیت کو متحد کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا لیکن افسوس یہ ہے کہ ایسے تمام ممالک اس فرض سے غافل ہیں ۔ بالخصوص اس فرض سے مسلمان ممالک کی غفلت بہت افسوسناک ہے

دنیا کے مسلمان اللہ کے بھیجے ہوئے دین حق ۔ اسلام کے امین ہیں اور یہ ان کا دینی فریضہ ہے کہ وہ دنیا کے سامنے اس کی حقانیت ثابت کریں ان کا صرف یہی فرض نہیں ہے کہ دنیا کے ان ممالک کو کمیونزم سے بچائیں جو ابھی اس کے چنگل میں نہیں پھنسے ہیں بلکہ یہ بھی ان کا فرض ہے کہ خود روس اور چین کے عوام کو اس کے بے رحم چنگل سے نجات بخشیں انہیں روسی اور چینی عوام کو بتانا چاہیے کہ مذہب کے بارے میں بالعموم اور دین اسلام کے بارے میں بالخصوص انہیں سخت غلط فہمی میں مبتلا کیا گیا ہے ان کے سامنے اسلام کی انقلابی تحریک کو چند جامد اور بے روح رسم و رواج کی شکل میں پیش کیا گیا ہے اور اس کی بہترین تعلیمات کو جو انسانی سعادت اور انسانیت کے اتحاد کی ضامن ہیں پوری کوشش کے ساتھ مخفی رکھا گیا ہے ۔ اسلام کے صالح انقلاب کی چند جھلکیاں بھی وہ نہیں دیکھ سکے ہیں ۔ اسلامی نظام کے اعتدال اور توازن کی انہیں بالکل خبر نہیں ہے ۔ اسلام کے پیرو اگر کمیونسٹ عوام کے سامنے اس کی صحیح تصویر پیش کریں اور کمیونزم اور سرمایہ داری کے مقابلے میں اس کے اعتدال اور توازن کو نمایاں کریں تو پوری توقع ہے کہ خود ماسکو اور پیکنگ میں اسلام کو سمجھنے کی ایک فضا پیدا ہو جائے ۔ یہ صحیح ہے کہ ابھی روس اور چین میں نہ اسلامی لٹریچر پہنچایا جا سکتا ہے اور نہ وہاں جا کر اسلام پر آزادانہ گفتگو کی جا سکتی ہے لیکن کیا

اسلامی ممالک اس مقصد کے لیے چینی اور روسی زبان میں براڈکاسٹ کا انتظام نہیں کر سکتے۔ کیا ان کے ان سفارت خانے یہ خدمت انجام نہیں دے سکتے۔ کیا ان کے تاجر اور پڑھے لکھے لوگ جو تمام دنیا میں سفر کرتے رہتے ہیں اس مقصد کو سامنے نہیں رکھ سکتے اور کیا اقوام متحدہ کے مرکز میں جہاں ان کے نمائندے دنیا بھر کے مسائل پر گفتگو کرتے رہتے ہیں۔ اور اس سے کبھی نہیں تھکتے۔ اس مسئلے پر گفتگو کی کوئی راہ نہیں نکال سکتے۔ درحقیقت مشکل یہ نہیں ہے کہ اس کام کے تمام راستے بند ہیں بلکہ مشکل صرف یہ ہے کہ ان کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔ اپنے دنیوی اور مادی مسائل کو حل کرنے کے لیے وہ ہر خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہیں لیکن اس خالص دینی فریضے کی انجام دہی میں ان کے لیے کسی خطرے کا وہم بھی مانع بن جاتا ہے۔ امن وسلام کی پیاسی دنیا اسلام کے چشمۂ حیوان کی سخت محتاج ہے لیکن وہاں تک پہنچنے کے تمام راستے خود مسلمانوں نے بند کر رکھے ہیں۔

۲

یہ جو ہندوستان میں پانچ چھ کروڑ مسلمان آباد ہیں ان کی اپنی حالت چاہے جیسی کچھ ہو پورے ملک کے لیے ان کا وجود بعض پہلوؤں سے بہت مفید ہے۔ مثال کے طور پر ایک زبردست افادیت کا پہلو یہ ہے کہ ان کا وجود ہندوستان میں کشمیر کے انضمام و ادغام کے لیے ناقابلِ شکست دلیل بن گیا ہے۔ ہمارے ذمہ دار رہنما کہتے ہیں کہ اگر کشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت کی وجہ سے اس کو پاکستان کی طرف جانا چاہیے تو پھر ہندوستان کے پانچ چھ کروڑ مسلمانوں کا کیا بنے گا؟ یعنی جب اس وسیع ملک کے دائرے میں پانچ چھ کروڑ مسلمان داخل ہیں تو پھر کشمیر کے محض چالیس لاکھ مسلمان کہاں کے ایسے نرالے مسلمان ہیں کہ وہ اس دائرے میں ضم نہیں ہو سکتے۔ ہندوستان کا نظام حکومت جمہوری اور اس کا دستور سیکولر ہے اس میں مختلف مذہب و ملت کے لوگ آزادی اور اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہر شہری کو مساوی حقوق حاصل ہیں۔ پاکستان جمہوریت سے محروم اور اس کا دستور مذہبی اور فرقہ وارانہ ہے۔ ایسی صورت میں کشمیر کے مسلمانوں کے لیے ہندوستان کے ساتھ وابستہ رہنا مفید ہے یا پاکستان کی ڈکٹیٹرشپ کے ماتحت چلا جانا؟ اور اگر پاکستان کشمیر کے چالیس لاکھ مسلمانوں کو مذہب کی بنیاد پر اپنے اندر ضم کرنے پر مصر ہے تو اسے ہندوستان کے پانچ کروڑ مسلمانوں کو بھی اپنے چھوٹے سے ملک میں دھنسا لینا چاہیے ورنہ پھر ان کا کیا بنے گا۔ پھر ان کے ہندوستان میں بسے رہنے کی وجہ جواز کیا ہوگی؟ یہ ہے وہ دلیل جس کا توڑ نا محالات میں سے

ہے۔ دیو قامت ٹینک ٹوٹ سکتے ہیں، فلک سیر ہوائی جہاز ٹوٹ سکتے ہیں۔ فوجی قلعے ٹوٹ سکتے ہیں لیکن یہ دلیل نہیں ٹوٹ سکتی۔ ہم مسلمانوں کی خوش قسمتی ہے کہ ہمارا وجود ایسے نازک وقت میں اپنے وطن کے کام آیا۔ جن سنگھی اور مہاسبھائی اس ملک میں مسلمانوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور مسلمان ان کے نزدیک اس ملک کے لیے زحمت ہی زحمت ہیں لیکن کشمیر کے معاملے میں انھوں نے بھی اس دلیل کو برحق تسلیم کیا ہے۔ ہندو مہاسبھا برابر مسلمانوں کو ہندستان سے نکالنے کی آواز بلند کرتی رہتی ہے اس لیے اس موقع پر اس کو کہنا چاہیے تھا کہ یہ کیا لغو دلیل دی جارہی ہے۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ ہندوستان کے پانچ کروڑ اور کشمیر کے چالیس لاکھ مسلمان سب کے سب پاکستان چلے جائیں یہی اس مسئلے کا بہترین حل ہے لیکن اس کیمپ سے اس طرح کی کوئی آواز بلند نہیں ہورہی ہے۔ اس طرح کم سے کم اس معاملے میں مسلمانوں کے وجود کی افادیت کے قائل وہ بھی ہوگئے ہیں۔ اب مسلمان اپنی قسمت پر جس قدر ناز کریں کم ہے

یہ دلیل آں جہانی پنڈت نہرو کے زمانے میں بھی دی جاتی رہی ہے اور اب شری لال بہادر شاستری کے زمانے میں بھی دی جارہی ہے۔ میرے ناقص علم کی حد تک پاکستان اس اٹوٹ دلیل کا کوئی جواب نہیں دے سکا ہے اور نہ امید ہے کہ آئندہ دے سکے گا۔ جواب نہ بن پڑا تو جھلا کر اس نے جنگ چھیڑ دی اور اس میں بھی جیسا کہ ہمارے لیڈر کہہ رہے ہیں اس نے منہ کی کھائی۔

ابھی چند دن ہوئے مرکزی کابینہ کے ایک معزز وزیر نے بمبئی میں جو بات کہی ہے اسے سمجھنے میں راقم الحروف کو دشواری پیش آرہی ہے۔ انھوں نے فرمایا :-

"رائے شماری کا مطلب یہ ہے کہ ہندستان میں رہنے والے ہر مسلمان کی زندگی خطرے میں پڑجائے آج کوئی مہاتما گاندھی زندہ نہیں ہیں جو ان کی خاطر کوئی عظیم قربانی دے سکیں"

دعوت، دہلی ۲۶ر نومبر ۱۹۶۵ء

ان جملوں میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس کے معنی معلوم نہ ہوں اس کے باوجود ان کا مطلب سمجھنا آسان نہیں ہے۔ پہلے جملے کا مطلب سمجھنا یوں مشکل ہے کہ کشمیر میں رائے شماری اور ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کی زندگیوں میں ایسا اٹوٹ ربط سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ اگر وہاں رائے شماری ہو تو یہاں ان کی زندگیاں خطرے میں پڑجائیں۔ اور محض رائے شماری سے زندگیوں کا خطرے میں پڑجانا ایک ایسا معمہ ہے جسے حل نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ رائے شماری کا نتیجہ تو یہ بھی نکل سکتا ہے کہ وہاں کی اکثریت ہندستان کے حق میں ووٹ

والے اور اگر جناب وزیر کا مطلب یہ ہے کہ کشمیر میں رائے شماری ہوئی تو وہاں کی اکثریت پاکستان کے حق میں ووٹ دے گی اور کشمیر ہندوستان سے الگ ہو جائے گا اور اس کا اثر ہندوستان کے مسلمانوں پر برا اثر پڑے گا تو یہ بات اس لیے عجیب معلوم ہوتی ہے کہ ہماری حکومت کا ــ جس کے جناب وزیر بھی ایک آنریبل ممبر ہیں ـ دعویٰ یہ ہے کہ کشمیر کی اکثریت ہندوستان کے ساتھ ہے ۔ حکومت کے موقف کے خلاف خود حکومت کے ایک رکن کس طرح زبان کھولیں گے؟ نیز یہ کہ اگر بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ ایسا ہو سکتا ہے تو پھر وہ خطا سمجھ میں نہیں آتی جس کی پاداش میں ہندوستان کے ہر مسلمان کی زندگی خطرے میں پڑ جائے ۔ معاملہ بھارت اور پاکستان کی حکومتوں کے درمیان یا بھارت اور کشمیر کے درمیان ہے آخر یہ ہندوستان کے مسلمان کس قصور کی سزا پائیں گے؟ جناب وزیر کو سوچنا چاہیے تھا کہ ان کے اس بیان سے دنیا کی رائے عامہ کیا اثر لے گی ۔ دنیا ایک طرف ہماری حکومت کا یہ دعویٰ سنتی ہے کہ کشمیر کے اکثر مسلمان ہندوستان کے ساتھ ہیں اور اب جناب وزیر کا یہ بیان اس کی نظر سے گزرے گا تو وہ کیا سمجھے گی؟ کیا اس کی رائے پر یہ اثر نہیں پڑ سکتا کہ حکومت ہند کا دعوے خود اس کے بعض ارکان کے نزدیک مشکوک ہے اور کیا اس کی رائے پر یہ اثر نہیں پڑ سکتا کہ ہندستان کی سیکولر جمہوری حکومت میں مسلمان شہریوں کی زندگیاں ان کے کسی خطا و قصور کے بغیر بھی خطرے میں پڑ جاتی ہیں اور اگر جناب وزیر نے یہ بات صرف دھمکی کے طور پر کہی ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ دھمکی انھوں نے کس کو دی ہے ۔ پاکستانی حکومت کو یا کشمیر کے مسلمانوں کو یا ہندوستان کے مسلمانوں کو اگر پاکستانی حکومت کو یہ دھمکی اس لیے دی گئی ہے یا دی جاتی ہے کہ مسلمانان ہند کی جان و مال کے استحفاظ کی خاطر کشمیر کا خیال ترک کر دے گی تو یہ بالکل فضول اور لاحاصل ہے ۔ جب سرد جنگ کے زمانے میں یہ دھمکی اس پر اثر انداز نہ ہوئی تو اب گرم جنگ کے ماحول میں اس پر کیا اثر پڑے گا جبکہ کشمیر حاصل کرنے کے لیے اس نے خود اپنے ملک کو خطرے میں ڈال دیا ہے ۔ اگر کشمیری مسلمانوں سے یہ کہا گیا ہے کہ وہ اپنے بھارت کے مسلمان بھائیوں کے مال و جان پر ترس کھا کر رائے شماری کے مطالبے سے باز آجائیں تو اس تنبیہ کے لاحاصل ہونے پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے ۔ ہم سب دیکھ رہے ہیں کہ اس تنبیہ کا کشمیری مسلمانوں پر نہ پہلے کوئی اثر تھا نہ آج ہے ـــ اگر بھارت کے مسلمانوں کو یہ آگاہی دی گئی ہے یا دی جاتی ہے تو یہ بے معنی بھی ہے اور عجیب و غریب بھی ـــ ایک طرف تو

(باقی صفحہ ۶۳ پر)

قرآن ـ دل کے زنگ کو دور کرنے والی کتاب

جناب وحیدالدین خاں صاحب

رمضان کا مہینہ دوسرے لفظوں میں قرآن کا مہینہ ہے۔ اس مہینے میں خاص طور پر قرآن سے زیادہ سے زیادہ قریب ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ذیل میں چند حدیثیں نقل کرتا ہوں جس سے دین میں مطالعۂ قرآن کی اہمیت واضح ہوگی۔

عن عثمان قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَہٗ (بخاری، بحوالہ مشکوٰۃ، کتاب فضائل القرآن)	حضرت عثمان سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو قرآن کو سیکھے اور دوسروں کو سکھائے

قرآن کو حاصل کرنے اور اس کو پھیلانے کی فضیلت بالکل واضح ہے۔ جو کتاب حقیقت کی ترجمان ہو، جو کائنات کے آغاز و انجام کو بتاتی ہو، جس سے کامیابی تک پہنچنے کا راستہ معلوم ہوتا ہو، اگر اس سے تعلق پیدا کرنے والا افضل نہیں ہوگا تو اور کون ہوگا؟

عن ابن عمر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان ھذہ القلوب تصدأ کما یصدأ الحدید اذا اصابہ الماء قیل یا رسول اللہ وما جلاءھا قال کثرۃ ذکر الموت وتلاوۃ القرآن (بیہقی)	حضرت ابن عمر سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ دلوں کو زنگ لگتا ہے جس طرح پانی لگنے سے لوہے میں زنگ لگ جاتا ہے۔ پوچھا گیا، یا رسول اللہ! اس کو صاف کرنے کا طریقہ کیا ہے۔ فرمایا۔ موت کو زیادہ یاد کرنا اور قرآن کو کثرت سے پڑھنا۔

خدا پرستی کی روح یہ ہے کہ آدمی دنیا میں رہ کر ان حقیقتوں کو یاد رکھے جو اس سے چھپی ہوئی ہیں

اور جن سے وہ آخرت میں دوچار ہوگا۔ حدیث میں اس یاد کو اپنے ذہن میں تازہ رکھنے کے دو ذریعے بتائے گئے ہیں۔ موت کی یاد اور قرآن کا مطالعہ۔ موت ایک حسی واقعہ ہے جو آدمی کو یاد دلاتا ہے کہ اسے مرکر ایک روز خدا کے دربار میں حاضر ہونا ہے اور قرآن ان حقیقتوں کا لفظی بیان ہے جو موت کے بعد آدمی کے سامنے پیش ہوں گی۔

عن ابی موسی الاشعری قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تعاھدوا القرآن فوالذی نفسی بیدہ لھو اشد تفصیا من الابل فی عقلھا (متفق علیہ)

ابو موسیٰ اشعری سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ قرآن کی فکر رکھو۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے ایک بندھے ہوئے اونٹ سے زیادہ وہ نکل جانے والا ہے۔

عن ابن عمر ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال انما مثل صاحب القرآن کمثل صاحب الابل المعلقۃ ان عاھد علیھا امسکھا وان اطلقھا ذھبت (متفق علیہ)

ابن عمر سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ صاحب قرآن کی مثال بالکل اس شخص کی سی ہے جس کے پاس ایک بندھا ہوا اونٹ ہو۔ اگر وہ اس کی فکر رکھے گا تو وہ بندھا رہے اور اگر غافل ہوگا تو وہ نکل جائے گا۔

یہ دونوں حدیثیں بالکل ہم معنی ہیں۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا۔ قرآن غیبی حقیقتوں کی یاددہانی ہے۔ مگر آدمی جس دنیا میں رہ رہا ہے، وہ اس کے سوا ایک اور دنیا ہے جو ہر وقت اس کو اپنی طرف متوجہ کر رہی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس یاددہانی کو مطالعۂ قرآن کے ذریعے بار بار ذہن نشین کیا جاتا رہے۔ ورنہ موجودہ دنیا اس کو آنے والی حقیقی دنیا سے غافل بنا دے گی۔

عن سعد بن عبادۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما من امرئ یقرء القرآن ثم ینساہ الا لقی اللہ یوم القیمۃ

سعد بن عبادہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص بھی قرآن کو پڑھے اور پھر اس کو بھلا دے، وہ قیامت کے دن خدا سے اس حال میں ملے گا کہ وہ کوڑھی

اجنوہ (ابوداؤد دارمی) ہوگا۔

کوڑھ ایک ایسا مرض ہے جس میں انسان کا گوشت اور اس کے اعضا کٹ کٹ کر گر جاتے ہیں۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کو قرآن کا علم حاصل ہوا اور پھر وہ اسے بھلا دے، وہ روحانی کوڑھ میں مبتلا ہے جس میں مکمل انسان ناقص انسان بن جاتا ہے۔ خدا کی کتاب نے اس کمالِ انسانیت کا راستہ دکھایا تھا۔ مگر وہ اس پر قائم نہ رہ سکا۔ اور جان بوجھ کر اپنے آپ کو گڑھے میں گرا لیا۔

عن عبد اللہ بن عمرؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لم یفقہ من قرء القرآن فی اقل من ثلاث (ترمذی، ابوداؤد، دارمی)	عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص قرآن کو اس طرح پڑھے گا کہ تین رات سے کم میں اسے پڑھ ڈالے اس کو قرآن کا علم نہیں آ سکتا

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دین میں قرآن کی تلاوت کا جو حکم دیا گیا ہے اس سے مراد قرآن کے الفاظ کو اپنی زبان سے دہرا کر محض اسے ختم کر لینا نہیں ہے بلکہ اس سے مراد اس کو سمجھ کر پڑھنا اور اس پر غور کرنا بھی ہے۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ
رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا

رمضان کے روزوں کو صرف عبادت اور صرف تقوی کی تربیت ہی نہیں قرار دیا گیا ہے بلکہ انہیں مزید برآں اس عظیم الشان نعمت ہدایت پر اللہ کا شکریہ بھی ٹھہرایا گیا ہے جو قرآن کی شکل میں اس نے ہمیں عطا فرمائی ہے حقیقت یہ ہے کہ ایک دانشمند انسان کے لیے کسی نعمت کی شکر گزاری اور کسی احسان کے اعتراف کی بہترین صورت اگر ہو سکتی ہے تو وہ صرف یہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس مقصد کی تکمیل کے لیے زیادہ سے زیادہ تیار کرے جس کے لیے عطا کرنے والے نے وہ نعمت عطا کی ہو۔ قرآن ہم کو اس لیے عطا کیا ہے کہ ہم اللہ کی رضا کا راستہ جان کر خود اس پر چلیں اور دنیا کو اس پر چلائیں۔ اس مقصد کے لیے ہم کو تیار کرنے کا بہترین ذریعہ روزہ ہے۔

تبلیغ دین

(مولانا محمد یوسف اصلاحی)

انسان کا اصل دین

انسان کا اصل دین اسلام ہے ۔ خدا کے نزدیک انسان کے لیے یہی واحد مستند اور سچا دین ہے ۔ اس کے سوا کوئی دین خدا کے یہاں مقبول نہیں۔ خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبر اپنے اپنے زمانوں میں اسی دین کی تبلیغ کرتے رہے' اور آخر میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی دین کو آخری مکمل شکل میں پیش فرمایا :۔

تمام انبیاءؑ کی دعوت ایک تھی

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ (نحل ۳۶)

اور ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی بندگی کرو' اور طاغوت کی بندگی سے بچو ۔

خدا کے سوا جو بھی اپنی آقائی اور خدائی کا دم بھرے' اور کسی پہلو سے بھی خدا کے بندوں سے اپنی بندگی اور اطاعت کا مطالبہ کرے ۔ وہ طاغوت ہے ۔ خدا کے سارے رسول اسی لیے بھیجے گئے کہ انسان طاغوت کی بندگی اور اطاعت سے بچیں اور ایک خدا کی مخلصانہ بندگی کریں ۔ یہی اسلام کا جوہر ہے اور یہی اس کلمہ کی حقیقت ہے جس کا اقرار کرکے آدمی اسلام کے دائرے میں داخل ہوتا ہے ۔

تمام انبیاء اسلام کے داعی تھے

إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ ۚ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ (آل عمران - ۱۹)

اللہ کے نزدیک دین تو بس اسلام ہی ہے ۔ اس سے ہٹ کر اہل کتاب نے جو مختلف طریقے اختیار کیے ہیں اُن کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ انھوں نے ایک دوسرے پر زیادتی کرنے کے لیے علم الٰہی آجانے کے بعد ایسا کیا ۔

یعنی خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے سارے پیغمبر اسلام ہی کے داعی تھے۔ خواہ وہ کسی قوم میں آئے ہوں اور کسی زمانے میں آئے ہوں۔ بعد میں ان کے ماننے والوں نے اپنی اغراض و خواہشات اور مختلف مفادات کی خاطر اصل دین میں رد و بدل کر کے مختلف دین و مذہب رائج کر ڈالے۔

سارے انسان ایک ہی امت ہیں

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيِّيْنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔

(البقرہ ۲۱۳)

تمام انسان ایک ہی امت ہیں۔ (جب ان میں باہمی اختلاف رونما ہوئے) تو اللہ تعالےٰ نے نبی بھیجے جو راست روی پر بشارت دینے والے اور کج روی کے برے انجام سے ڈرانے والے تھے۔ اور ان کے ساتھ کتاب برحق نازل کی، تاکہ حق کے بارے میں لوگوں کے درمیان جو اختلافات ہو گئے ہیں ان کا ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دے۔ (اور ان اختلافات کے رونما ہونے کی وجہ یہ نہ تھی کہ لوگوں کو حق بتایا نہ گیا تھا بلکہ) اختلاف ان لوگوں نے برپا کیا جن کو حق کا علم دیا جا چکا تھا ان نے روشن ہدایات پا لینے کے بعد محض اس لیے حق کو چھوڑ کر مختلف طریقے نکالے کہ وہ آپس میں زیادتی کرنی چاہتے تھے پس جو لوگ ایمان لے آئے انہیں اللہ نے اپنی توفیق سے اس حق کا سیدھا راستہ دکھایا جس میں لوگوں نے اختلاف کیا تھا۔ اللہ جسے چاہتا ہے راہ راست دکھاتا ہے۔

یعنی سارے انسان اپنی فطرت اور اصل کے لحاظ سے ایک ہی امت ہیں خدا نے ان کے پاس ایک ہی دین بھیجا تھا البتہ انھوں نے ایک دوسرے سے بڑھ کر حقوق و امتیازات حاصل کرنے کی ہوس میں بھانت بھانت کے مذاہب ایجاد کیے اور مختلف فرقوں میں بٹ گئے۔

اسلام کے سوا کوئی دین مقبول نہیں

وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِينَ (آل عمران)

اور جو کوئی اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کو اختیار کرنا چاہے گا۔ اس کا وہ دین ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور آخرت میں وہ ناکام و نامراد ہوگا۔

خدا کے نزدیک صرف وہی دین مقبول ہے جو اس نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے اپنے بندوں کی رہنمائی کے لیے بھیجا۔ اور جس کو مکمل ترین شکل میں خدا کے آخری رسول نے پیش فرمایا اس سچے اور مستند دین کو چھوڑ کر اپنے ذہن و دماغ سے لوگوں نے بندگی کے جو جو طریقے بھی ایجاد کیے ہیں اور جس غیر مستند دین سے بھی وابستہ ہیں خدا کی نظر میں ان کی کوئی قیمت نہیں۔

حضرت ابراہیمؑ اور اسلام

وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِينَ ○ إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِينَ ○ (البقرہ: ۱۳۰)

اور ہم نے ابراہیمؑ کو اپنے کام کے لیے چن لیا تھا اور آخرت میں ان کا شمار صالحین میں ہے جب ان کے پروردگار نے ان سے اسلام و فرماں برداری کا مطالبہ کیا تو فوراً پکار اٹھے۔ میں رب العلمین کا مکمل فرماں بردار ہو چکا ہوں

حضرت ابراہیمؑ کا دین بھی اسلام ہی تھا اور ان کی رہنمائی پر یہود و نصاریٰ اور ان تمام قوموں کا اتفاق ہے جو کسی آسمانی کتاب یا دین کے قائل ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ اور امامت عالم

وَإِذِ ابْتَلٰى إِبْرٰهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمٰتٍ فَأَتَمَّهُنَّ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا

اور یاد کیجیے کہ ابراہیم کو ان کے پروردگار نے چند باتوں میں آزمایا اور وہ سب میں پورے اترے تو اللہ نے فرمایا۔ میں تم کو تمام انسانوں کا امام اور پیشوا بناتا ہوں۔

یعنی جب وہ خدا کی فرماں برداری میں ہر طرح پورے اترے تو خدا نے انہیں تمام عالم کی پیشوائی کا عظیم منصب عطا فرمایا اور ہر قوم نے انہیں اپنا رہنما اور امام تسلیم کیا۔

حضرت ابراہیمؑ کی وصیت

وَوَصّٰى بِهَا إِبْرٰهِيمُ بَنِيهِ

اور ابراہیمؑ نے اپنی اولاد کو اسی دین اسلام پر چلنے کی ہدایت کی۔ اور اسی

وَيَعْقُوبُ يَٰبَنِيَّ إِنَّ ٱللَّهَ ٱصْطَفَىٰ لَكُمُ ٱلدِّينَ فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ ۝ (البقرہ-۱۳۲)

کی وصیت یعقوبؑ نے اپنی اولاد کو کی اور کہا کہ میرے بچو خدا نے تمہارے لیے اسی دین کو پسند فرمایا ہے۔ تو تم مرتے دم تک مسلم ہی رہنا

دینِ ابراہیمی سے اعراض حماقت ہے

وَمَن يَرْغَبُ عَن مِّلَّةِ إِبْرَٰهِيمَ إِلَّا مَن سَفِهَ نَفْسَهُۥ (البقرہ:-۱۳۰)

اب کون ہے جو ابراہیم کے دین سے روگردانی کرے جس نے خود کو نادانی اور حماقت میں مبتلا کر لیا ہو اس کے سوا اور کون یہ حرکت کر سکتا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کی تمنائیں

وَإِذْ قَالَ إِبْرَٰهِيمُ رَبِّ ٱجْعَلْ هَٰذَا ٱلْبَلَدَ ءَامِنًا وَٱجْنُبْنِى وَبَنِىَّ أَن نَّعْبُدَ ٱلْأَصْنَامَ ۝ رَبِّ إِنَّهُنَّ أَضْلَلْنَ كَثِيرًا مِّنَ ٱلنَّاسِ فَمَن تَبِعَنِى فَإِنَّهُۥ مِنِّى وَمَنْ عَصَانِى فَإِنَّكَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ رَّبَّنَا إِنِّىٓ أَسْكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِى بِوَادٍ غَيْرِ ذِى زَرْعٍ عِندَ بَيْتِكَ ٱلْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا ٱلصَّلَوٰةَ فَٱجْعَلْ أَفْئِدَةً مِّنَ ٱلنَّاسِ تَهْوِىٓ إِلَيْهِمْ وَٱرْزُقْهُم مِّنَ ٱلثَّمَرَٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ ۝ رَبَّنَا إِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِى وَمَا نُعْلِنُ وَمَا يَخْفَىٰ عَلَى

اور (ان احسانات کو یاد کرو) جب ابراہیمؑ نے دعا کی کہ اے میرے رب! اس شہر (مکہ) کو امن کی جگہ بنا دے اور مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے بچائے رکھ۔ اے رب ان بتوں نے بہتوں کو گمراہی میں ڈال رکھا ہے (ایسا نہ ہو کہ یہ میری اولاد کو بھی گمراہ کر دیں) سو جو میرے طریقے پر چلتا رہا وہ میرا ہے اور جو میرے خلاف طریقہ اختیار کرے تو (میں کیا کہوں) تو معاف کرنے والا مہربان ہے۔ (اگر تو ان پر بھی رحم فرمائے تو تیرے فیصلے کو کون ٹال سکتا ہے۔) اے میرے رب میں نے اپنی اولاد میں سے کچھ کو اس بے آب و گیاہ آبادی میں تیرے عزت والے گھر کے پاس لا بسایا ہے۔ میرے پروردگار یہ میں نے اس لیے کیا ہے کہ یہ یہاں نماز قائم کریں لہٰذا تو لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل کر دے اور تو انہیں پھل عطا فرما تاکہ یہ تیرے شکر گزار بندے رہیں اے میرے

دین

اللّٰہِ مِنْ شَیْئٍ فِی الْاَرْضِ
وَلَا فِی السَّمَاءِ ○

رب تو وہ باتیں بھی جانتا ہے جنہیں ہم چھپاتے ہیں
اور وہ باتیں بھی جنھیں ہم ظاہر کرتے ہیں اور واقعی
خدا سے کچھ بھی چھپا ہوا نہیں ہے، نہ زمین میں اور نہ آسمان میں

( )

حضرت ابراہیمؑ کی سب سے بڑی تمنا یہ تھی کہ جس بے آب و گیاہ میدان میں انھوں نے اپنی اولاد کو بسایا ہے اور جہاں انھوں نے توحید کا مرکز قائم کیا ہے۔ یہ شہر شرک کی گندگیوں سے مامون رہے وران کی اولاد شرک سے بچی رہے۔ انہیں اگر کوئی فکر دامن گیر تھی تو صرف یہ کہ میرے بعد کہیں میری سل بھی شرک کی آلودگیوں میں نہ پھنس جائے اور اس طریقے سے نہ ہٹ جائے جس کے لیے میں نے س پاک گھر کی تعمیر کی۔ آپ نے دعا فرمائی۔ کہ پروردگار! جن دینی جذبات کے ساتھ میں نے تیرے اس ھر کو بسایا ہے وہ بھی تجھ سے چھپے ہوئے نہیں ہیں اور زندگی بھر تیری راہ میں جو دوڑ دھوپ کی ہے ہ بھی تیرے سامنے ہے۔ پروردگار! میں نے یہ پاک گھر اس لیے بسایا ہے کہ میری نسل کے یہ لوگ یری عبادت کے لیے نماز قائم کریں۔ پروردگار! تو لوگوں کے دل ان کی طرف جھکا دے اور انہیں ہر رح کی نعمتوں سے مالا مال فرما دے کہ یہ تیرے شکر گزار بندے بنے رہیں اور توحید کی روشنی دنیا بھر میں س مرکز سے پھیلتی رہے' یہ ان کی ایمانی تڑپ' نرم دلی' شفقت اور دین سے محبت کی واضح ترین مثال ہے۔ اسی ایمانی تڑپ اور دینی درد کے ساتھ انھوں نے آخری رسول کی بعثت کے لیے بھی دعا دی کہ ان کے ریعہ سے رہتی دنیا تک توحید کی تعلیم زندہ رہے اور لوگ دین حنیف پر قائم رہیں۔

آخری رسول کی دُعا

بعثتِ رسول کی دُعا رَبَّنَا وَابْعَثْ
فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا
عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ وَیُعَلِّمُهُمُ
الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَیُزَكِّیْهِمْ
اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ (البقرہ ۱۲۹)

اے ہمارے پروردگار! ان لوگوں
میں خود انہیں کی قوم سے ایک رسول اٹھا جو
انہیں تیری آیات سنائیں' ان کو کتاب و حکمت
کی تعلیم دیں اور ان کی زندگیوں کا تزکیہ کریں۔
حقیقت یہ ہے کہ تو نہایت با اقتدار اور حکمت والا ہے

مومنوں پر خدا کا عظیم احسان لَقَدْ مَنَّ

حقیقت یہ ہے کہ مومنوں پر خدا نے

اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِھِمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ (آل عمران - ۱۶۴)

یہ عظیم احسان فرمایا ہے کہ ان کے درمیان خود انہی میں سے ایک ایسے رسول کو اٹھایا جو انہیں خدا کی آیات سناتے ہیں۔ ان کی زندگیوں کا تزکیہ کرتے ہیں اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔

آخری رسول کے فرائض تبلیغ دین

یٰٓاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَہٗ (المائدہ ۶۷)

اے رسول تبلیغ کیجیے اس دین کی جو آپ کے رب کی طرف سے آپ پر نازل کیا گیا ہے۔ اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے رسالت کا حق ادا نہ کیا۔

رسول کے اٹھائے جانے کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ خدا کے بندوں کو خدا کے احکام اور پیغام پہنچائیں۔ اسی لیے فرمایا کہ اگر آپ نے فریضۂ تبلیغ میں ادنیٰ کوتاہی بھی کی تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ آپ نے رسالت کا حق ادا نہ کیا۔

انذار و تبشیر

اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ بِالْحَقِّ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا (البقرہ - ۱۱۹)

حقیقت یہ ہے کہ ہم نے آپ کو علم حق دے کر بھیجا ہے خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر۔

یعنی کائنات اور اس کا انجام، حق و باطل اور نیکی اور بدی کا جو علم آپ کو دیا گیا ہے اس کی بنیاد قیاس و اندازہ اور وہم و گمان پر نہیں بلکہ حقیقت اور یقین پر ہے تاکہ آپ یقین کی پوری قوت کے ساتھ خدا کے بندوں کو کفر اور بدی کے برے انجام سے ڈرائیں اور ایمان و عمل صالح کے حسن انجام کی خوش خبری سنائیں۔

امر بالمعروف نہی عن المنکر

یَاْمُرُھُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھٰھُمْ عَنِ الْمُنْکَرِ (الاعراف ۱۵۷)

وہ انہیں نیکیوں کا حکم دیتے ہیں اور برائیوں سے روکتے ہیں۔

شہادت حق اور دعوت الی اللہ

یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ

اے نبی! ہم نے آپ کو حق کی گواہی دینے والا، نیکی پر حسن خبر کی دینے والا اور

شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيرًا وَّ دَاعِيًا إِلَى اللّٰهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا (الاحزاب - ۴۵، ۴۶)

برائی کے انجام سے ڈرانے والا اور خدا کی توفیق اور حکم سے خدا کی طرف بلانے والا اور روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔

یعنی آپ اپنے قول و عمل سے دین حق کی گواہی دینے والے ہیں اور خدا سے بچھڑے ہوئے غافل بندوں کو خدا کی طرف بلانے والے اور اس سے قریب کرنے والے ہیں۔

نظامِ عدل کا قیام

إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللّٰهُ (النساء - ۱۰۵)

اے رسول! ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ آپ پر اتاری ہے تاکہ آپ خدا کی دی ہوئی ہدایات کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلے کریں

یعنی رسول کا کام یہ ہے کہ وہ کتاب الٰہی کی ہدایات اور روشنی میں لوگوں کے درمیان عدل و انصاف قائم رکھیں۔

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (الحدید: - ۲۵)

ہم نے اپنے رسولوں کو واضح ہدایات کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان کو اتارا تاکہ سارے لوگ انصاف پر قائم رہیں اور ہم نے لوہے کو اتارا جس میں زبردست قوت ہے اور لوگوں کے لیے بہت سی منفعتیں ہیں۔

میزان سے مراد عدل و انصاف کے قوانین ہیں اور لوہے سے مراد وہ مادی قوتیں ہیں جو کسی غالب قوم کو حاصل ہوتی ہیں۔

یعنی دنیا میں عدل و انصاف کو قائم کرنے کے لیے خدا نے پیغمبروں کو کتاب ہدایت دی اور عدل و انصاف کے حقیقی قوانین دیے اور پھر خدا نے دنیا میں وہ قوت قاہرہ بھی نازل فرمائی جو ان قوانین پر عمل کرانے اور نظام عدل کو قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے۔

دین حق کا غلبہ

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ

وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو حقیقی ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ

لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ (التوبہ: ۳۳، الفتح: ۲۸) اس دین کو تمام دینوں پر غالب کردے۔

دینِ حق سے مراد وہ آسمانی نظامِ بندگی ہے جس کی بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ اقتدار کا مالک تنہا وہ خدا ہے جو تمام کائنات کا خالق اور پروردگار ہے، وہی انسان کا حقیقی مالک معبود اور حاکم ہے اور عبادت اور اطاعت صرف اسی کا حق ہے۔

یہی وہ دینِ حق ہے جو ہر دور میں خدا کے پیغمبروں کے ذریعے انسان کی ہدایت کے لیے آتا رہا ہے اور اسی دینِ حق کے ساتھ خدا کے آخری رسول کی بھی بعثت ہوئی۔

خدا اقتدار اور فرماں روائی کا تنہا مالک ہے۔ اس کے بھیجے ہوئے نظامِ بندگی کا حقیقی مقام ہی یہ ہے کہ وہ اطاعت کے ان تمام نظاموں پر غالب ہو کر رہے جو انسان نے اپنی سوسائٹی کے لیے گھڑ لیے ہیں یا ان کا ہونا انسانی زندگی کے لیے ناگزیر ہے۔ خدا کے آخری رسول کی بعثت کا یہی مقصد تھا اور ۲۳ سال کی مبارک زندگی میں آپ نے اسی فریضے کو بحسن و خوبی انجام دیا۔ اس دورِ رسالت میں دین کو نہ صرف ذہنی اور فکری غلبہ ہی حاصل تھا بلکہ سیاسی اور مادی غلبہ بھی حاصل ہوا ــــــ اور اس غلبہ کو حاصل کرنے کے لیے خدا کے رسول اور آپ کے جاں نثار صحابیوں نے خدا کی اس ہدایت پر پورا پورا عمل کیا جو سورہ توبہ میں اس آیت کے دو ہی آیتوں کے بعد آئی ہیں۔ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً كَمَا يُقَاتِلُونَكُمْ كَافَّةً "اور مشرکوں کے مقابلے میں سب متحد ہو کر لڑو" اور مشرکوں کے مقابلے میں سب متحد ہو کر لڑو جس طرح وہ سب مل کر تمہارے مقابلے میں لڑتے ہیں۔"

یعنی خدا کے دین کو قائم کرنے کی راہ میں جو مشرک رکاوٹ ڈال رہے ہیں۔ اگر وہ مادی قوتوں سے تمہارے مقابلے میں آئیں تو تم پوری اجتماعی قوت کے ساتھ ان سے جنگ کرو۔ اور جان کی بازی لگا کر خدا کے دین کو قائم کرو۔

تکمیلِ دین کا اعلان

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (المائدہ ۳)

آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے پسند کر لیا ہے۔

خدا کے اس اعلان کا مطلب کہ میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر

تمام کردی۔ مطلب یہ ہے کہ مختلف زمانوں میں ضرورت اور حالات کے مطابق یہ دین آتا رہا۔ اور ہر دور کے تقاضوں کے مطابق اس کے احکام میں جزوی تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ انسانیت علم وخرد کی ترقی کے لحاظ سے اس مقام پر آپہنچی کہ اسے آخری اور دائمی شریعت دی جائے جس کے لیے اصول ایسے عالمگیر، دائمی اور لچکدار ہوں جو ہر دور کے نت نئے تقاضوں اور تمام پیش آمدہ حالات پر بخوبی منطبق ہوسکیں اور جو پوری انسانی برادری کے لیے قابلِ قبول اور قابلِ عمل ہوں چنانچہ آخری رسول ؐ کو یہ دائمی شریعت دے کر دین کی تکمیل کر دی گئی اور خدا نے یہ آخری نعمت دے کر امتِ مسلمہ پر اپنی نعمت تمام کر دی۔ اب رہتی دنیا تک کے لیے نہ کسی دوسری شریعت کی ضرورت باقی ہے اور نہ کسی رسول کی رہنمائی درکار ہے۔

ختمِ نبوت

وَمَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ	لوگو! محمد تمہارے مردوں میں سے
رِّجَالِکُمْ وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ	کسی کے باپ نہیں ہیں بلکہ وہ خدا کے رسول
اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ وَکَانَ اللّٰہُ	اور خاتم النبیین ہیں اور اللہ ہر چیز سے بخوبی واقف
بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا ۝ (الاحزاب: ۴۰)	ہیں

یعنی اب کارِ رسالت کو انجام دینے کے لیے کوئی نئے پیغمبر نہ آئیں گے سلسلۂ نبوت آپ پر ختم ہو چکا ہے اور اب قیامت تک کے لیے جو بھی پیغمبروں کی راہ پر چلنا چاہے اس کے لیے ایک ہی راستہ ہے کہ وہ آپ پر ایمان لاکر آپ کی پیروی کرے۔

امتِ مسلمہ اور اس کے فرائض

امت کے ظہور کی دعا

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا	ہمارے پروردگار! مجھے اور اسمٰعیل
مُسْلِمَیْنِ لَکَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّۃً	کو اپنا تابع فرمان اور مسلم بنا اور ہماری اولاد
مُّسْلِمَۃً لَّکَ (البقرہ۔ ۱۲۸)	سے ایسی امت کو اٹھا جو تیری تابع فرمان اور مسلم ہو

یہ وہ دعا ہے جو مرکزِ توحید کو تعمیر کرتے ہوئے حضرت ابراہیم ؑ نے مانگی تھی۔ خدا نے حضرت کی یہ دعا قبول فرمائی اور آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں ایک ایسی امت کو برپا کیا جو قیامت تک کے لیے تبلیغ دین اور شہادتِ حق کا وہ فریضہ انجام دیتی رہے گی جو ختم نبوت سے پہلے انبیے

اپنے زمانے میں خدا کے پیغمبر انجام دیتے رہے ہیں۔

رسول کی جانشینی

هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَمَا جَعَلَ	اس نے تمہیں منتخب فرمالیا ہے اور دین
عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ	کے معاملے میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی ہے پیروی
مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ	کرو اس دین کی جو تمہارے اپنے باپ ابراہیم
هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ	کا دین ہے۔ آپ نے پہلے ہی سے تمہیں مسلم کے
وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ	نام سے نوازا تھا اور اسی سلسلے میں کہ رسول
شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا	تمہارے لیے دین حق کی شہادت دیں اور تم دنیا
شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (الحج - ۷۸)	کے سارے انسانوں کے سامنے دین حق کی شہادت دو۔

آیت پر غور کرتے وقت حضرت ابراہیمؑ کی وہ دعا ضرور سامنے رہنی چاہیے جو کہ تعمیر کعبہ کے وقت آپ نے زندگی کے آخری لمحات میں والہانہ انداز میں مانگی تھی۔

پروردگار! مجھے اور اسمٰعیل کو اپنا مسلم اور فرماں بردار بنا اور ہماری اولاد میں ایک ایسی امت کو برپا کر جو تیری مسلم اور فرماں بردار ہو" اور دل کی انتہائی گہرائیوں سے کہا تھا "ہمارے پروردگار! ان میں انہی کی قوم سے ایک ایسا رسول اٹھا۔ جو انہیں تیری آیتیں پڑھ کر سنائے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کی زندگیوں کا تزکیہ کرے" خدا نے اپنے خلیل کی دعا کو قبولیت بخشی اور ساری دنیا کی رہنمائی کے لیے آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو منتخب فرمایا ساتھ ہی آپ کی قیادت میں ایک ایسی امت کا بھی انتخاب فرمایا جو رہتی دنیا تک اس سچے دین کی شہادت دیتی رہے جس کی شہادت زندگی بھر حضرت محمدؐ دیتے رہے۔

کارِ رسالت کے لیے امت کا انتخاب کرتے ہوئے قرآن نے 'اجتباء' کا لفظ استعمال کیا اور یہ اجتباء یا اصطفاء کا لفظ عام طور پر قرآن میں انبیاء کے لیے استعمال کیا گیا ہے امت کے لیے اس لفظ کے استعمال کے معنی یہ ہیں کہ یہ امت اصطلاحی طور پر پیغمبرانہ شان ضرور رکھتی ہے اس لیے کہ اسے پیغمبر کے جانشین کی حیثیت سے وہی پیغمبرانہ فریضہ انجام دینا ہے۔ پھر جس طرح آخری رسول کی آمد کی بشارت مدتوں پہلے سے دی جاری تھی اسی طرح اس امت کو بھی اس کے ظہور سے بہت پہلے مسلم کے نام سے نوازا گیا تھا۔ یہ گویا امت کے ظہور سے سیکڑوں سال پہلے ایک بشارت تھی کہ ایک ایسی امت برپا

کی جانے والی ہے جو اسلام اور بندگیِ رب کا زندہ نمونہ ہوگی۔ اسی لیے فرمایا کہ بہت پہلے تمہارا نام مسلم رکھا اور اسی سلسلے میں رکھا کہ تمہارا یہ انتخاب ایک عظیم مقصد کے لیے ہوا ہے۔ پھر فرمایا۔

"تاکہ رسول تم پر دینِ حق کی گواہی دیں اور تم دنیا کے سارے انسانوں کے سامنے حق کی گواہی پیش کرو۔" یہ امت کی اصل حیثیت کا اظہار ہے کہ وہ رسول کی جانشین ہے اور اسے وہی کام انجام دینا ہے جو رسول نے انجام دیا۔ جس طرح آخری رسولؐ نے اپنے قول و عمل اور شب و روز کی زندگی سے خدا کے دین کو واضح کرنے کا حق ادا کر دیا۔ ٹھیک اسی طرح امت کو بھی دنیا کے سارے انسانوں کے سامنے خدا کے دین کو واضح کرنا ہے اور دینِ حق کی زندہ شہادت بن کر رہنا ہے۔

امت مسلمہ کی امتیازی حیثیت

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ	اور اسی طرح ہم نے تم کو ایک "امت وسط"
اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى	بنایا ہے تاکہ تم سارے انسانوں کے لیے دین حق
النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۭ (بقرہ)	کے گواہ بنو اور ہمارے رسولؐ تمہارے لیے گواہ ہوں۔

یعنی تمہاری حیثیت عام امتوں کی طرح نہیں تمہیں خدا نے امت وسط بنایا ہے اور ایک امتیازی شان بخشی ہے۔ تم انسانوں میں وہ اعلیٰ اور اشرف امت ہو جسے دنیا کی تمام قوموں میں صدر کی طرح رہنمائی کی مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اور تم ہر افراط و تفریط سے محفوظ خدا کی سیدھی راہ و اعتدال کے ساتھ قائم ہو۔ تمہیں خدا نے شہداء علی الناس کے امتیازی مقام پر سرفراز فرمایا ہے اور تمہیں قیامت تک اسی شان امتیاز کے ساتھ دنیا میں رہنا ہے۔

امت کا حقیقی منصب

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ	تم بہترین امت ہو جو سارے انسانوں کے لیے وجود میں لائی گئی ہے۔ تم بھلائی کا حکم
تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ	دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر
الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (آل عمران)	کامل ایمان رکھتے ہو۔

یعنی امت مسلمہ فکر و عمل کی امتیازی خوبیوں میں دنیا کی تمام قوموں اور جماعتوں میں ایک بہترین امت ہے۔ یہ زندگی کے میدان میں یوں ہی معمول کے مطابق نہیں آنکلی ہے بلکہ اسے ایک عظیم مقصد کی خاطر نہایت اہتمام سے برپا کیا گیا ہے۔

اسے سارے انسانوں کے لیے وجود میں لایا گیا ہے یعنی اسے سارے انسانوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے اٹھایا گیا ہے اور اب رہتی زندگی تک تمام انسانی جماعتوں کی پیشوائی اور امامت کا فریضہ اسی کو انجام دینا ہے۔

تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو یعنی تمہارا کام محض وعظ و نصیحت اور انذار و تبشیر نہیں ہے، بلکہ تم نیکی کے آمر اور حاکم بنائے گئے ہو۔ تمہارا حقیقی منصب یہ ہے کہ تم ایک غالب جماعت بن کر رہو اور اپنی سیاسی قوت کے ذریعے نیکی کو پروان چڑھاؤ اور برائیوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکو۔

امت کا نصب العین اقامت دین

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ (الشوریٰ/۱۳)	مسلمانو! خدا نے تمہارے لیے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کی وصیت اس نے نوح کو کی تھی اور جس کی وحی اے رسول ہم نے آپ کی طرف بھیجی ہے۔ اور جس کی ہدایت ہم ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو دے چکے ہیں کہ اس دین کو قائم کرو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو۔

اس آیت کو پوری طرح سمجھنے کے لیے چند باتوں پر غور کرنا ضروری ہے۔

۱۔ ان پانچ پیغمبروں کے ذکر کی وجہ

۲۔ دین کا حقیقی مفہوم

۳۔ اقامت کا مطلب

۴۔ امت کا نصب العین

آیت میں جن پانچ جلیل القدر پیغمبروں کا ذکر ہے ان میں سب سے پہلے حضرت نوح ہیں جو طوفان کے بعد انسانیت کے اولین پیغمبر تھے۔ ان کے بعد سب سے آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہے پھر درمیان کے سلسلۂ نبوت میں سے تین اہم ترین پیغمبروں کا ذکر ہے جن میں حضرت ابراہیمؑ تو وہ ہیں جن کی عظمت اور پیشوائی پر سب ہی متفق ہیں اور حضرت موسےٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی اہمیت یہ ہے کہ دنیا کی دو عظیم ملتیں یہود و نصاریٰ ان کی طرف خود کو منسوب کرتی ہیں۔

سلسلۂ نبوت کے ان پانچ اہم ترین پیغمبروں کے ذکر سے بتانا یہ مقصود ہے کہ خدا کی طرف سے جتنے

بھی رسول آئے۔ ان سب کا نصب العین یہی تھا کہ خدا کے دین کو قائم کریں۔

سب سے پہلے رسول کو بھی اس کی وصیت کی گئی تھی اور سب سے آخری رسول کو بھی اسی کی وحی بھیجی گئی اور درمیان کے ان تین عظیم پیغمبروں کو بھی اس کی وصیت کی گئی جن کی رہنمائی اور نبوت کو تقریباً پوری دنیا تسلیم کرتی ہے لہذا امت کا فرض ہے کہ وہ پورے یقین اور شرح صدر کے ساتھ اس نصب العین کو اپنا فریضہ حیات سمجھے۔

دوسری بات یہ ہے کہ دین کا حقیقی مفہوم کیا ہے۔ دین سے مراد توحید رسالت اور آخرت کے بنیادی عقائد بھی ہیں جو ہمیشہ سے انبیاء کی تعلیم میں متفق علیہ رہے ہیں اور وہ احکام شریعت بھی جو حالات اور ضرورت کے تحت مختلف انبیاء کے زمانوں میں بدلتے رہے ہیں۔ قرآن کی تصریحات کے مطابق دین دراصل وہ مکمل نظام زندگی ہے جو عقائد و عبادات، تعلیم و اخلاق تہذیب و ثقافت معیشت و معاشرت اور قانون و سیاست غرض زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے اور انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جو اس کی رہنمائی سے خارج ہو۔

تیسری بات لفظ اقامت ہے اقامت کا لفظ جب مادی چیزوں کے لیے بولا جاتا ہے تو اس کے معنی ہوتے ہیں کھڑا کردینا اور جب یہ لفظ غیر مادی چیزوں کے لیے استعمال ہوتا ہے تو اس کا مفہوم ہوتا ہے اس چیز پر کماحقہ عمل کرنا اور اس کا پورا پورا حق ادا کرنا۔ چوتھی بات امت کے نصب العین کی ہے۔

آیت میں خطاب مسلمان امت سے ہے اور کہا گیا ہے تمہارے لیے وہی طریقہ مقرر کیا گیا ہے جس کی تاکید تمام پیغمبروں کو کی گئی تھی کہ دین کو قائم کرو۔ لہذا امت کا نصب العین قرآن قطعی طور پر قرار دیتا ہے کہ وہ کامل یکسوئی اور اخلاص کے ساتھ اس پورے دین کی پیروی کرے اور عملاً اسے نافذ اور قائم کرے جو بنیادی عقائد اصول اخلاق اور انسانی زندگی سے متعلق تمام ہی آسمانی ہدایات پر مشتمل ہو

اس حقیقت کی فیصلہ کن دلیل جو فداکاران اسلام کے دلوں میں یقین کی ٹھنڈک پیدا کرتی ہے اور وہ آخری رسول کا ۲۳ سالہ روشن دور ہے۔ اس دور سعادت میں آپ نے عقائد اور اخلاق کی تعلیم بھی دی، عبادت کے طریقے بھی سکھائے۔ قرآنی ہدایات کے مطابق انسانی سماج کی تعمیر بھی کی اور انسانی زندگی کو منظم کرنے والی ایک بابرکت اسٹیٹ بھی قائم فرمائی۔

دعوت اسلام اور سیاسی اقتدار

اسلام ایک جامع اور ہمہ گیر دین ہے اس کی رہنمائی اور ہدایت سے زندگی کا کوئی گوشہ خالی نہیں ہے۔ سیاست و حکومت کے بارے میں نہ صرف یہ کہ اسلام، روشن ہدایات اور احکام دیتا ہے بلکہ اس کو اپنا ایک لازمی شعبہ قرار دیتا ہے اور اس بات کو ایمان کے منافی سمجھتا ہے کہ سیاست حکومت کو خدا کی ہدایت سے بے نیاز رکھا جائے۔

قرآن کے نزدیک حکومت اور اقتدار صرف خدا کا حق ہے اور وہ صرف اسی سیاسی نظام کو جائز اور برحق مانتا ہے جس میں اقتدار اعلیٰ خالص خدا کا حق تسلیم کیا گیا ہو۔ پھر اسلامی احکام و ہدایات کا ایک اہم حصہ وہ ہے جس کی پوری پوری پیروی اسی وقت ہو سکتی ہے جب اسلام کو اقتدار حاصل ہو حکومت اور اقتدار کے بغیر یہ سارے احکام بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کا سیاسی اقتدار محض سماجی نظام کو سدھارنے اور انسانی مسائل کو حل کرنے کا بے مثال ذریعہ ہی نہیں بلکہ وہ ایک دینی ضرورت، ایمانی تقاضا اور اسلامی فریضہ ہے

اقتدار اعلیٰ

لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ ۝ (الانبیاء ۲۳) — وہ جو کچھ بھی کرے اس سے کوئی پوچھ گچھ نہیں اور ان سب سے بازپرس ہونی ہے۔

اقتدار اعلیٰ اپنے کاموں کے لیے کسی کے آگے جواب دہ نہیں ہوتا اور سب ہی اس کے آگے اپنے کاموں کے لیے جواب دہ ہوتے ہیں اور یہ حیثیت صرف کائنات کے خالق و مالک کو حاصل ہے

وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ۔ (الرعد:۴۱) "اللہ ہی فیصلہ کرتا ہے اور اس کے فیصلے کو کوئی ٹالنے والا نہیں"

اقتدار اعلیٰ خدا ہی کا حق ہے

قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَا اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ

ان سے کہیے بتاؤ اگر تم سمجھ سے کام لینے والے ہو۔ یہ زمین اور اس کی ساری آبادی کس کی ملکیت ہے۔ یہ کہہ اٹھیں گے اللہ کی۔ ان سے پوچھیے ساتوں آسمان اور عرش عظیم کا مالک کون ہے؟ یہ کہہ اٹھیں گے اللہ! کہیے پھر تم

السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ۝ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ قُلْ مَنْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ۝ (المؤمنون ۸۶-۸۹)

اس کا خوف کیوں نہیں رکھتے۔ ان سے کہیے بتاؤ اگر تم سمجھ سے کام لینے والے ہو کہ ہر چیز پر اقتدار کس کا ہے اور کون ہے وہ جو پناہ دیتا ہے۔ اور کوئی نہیں جو اس کے مقابلے میں پناہ دے سکے یہ پکار اٹھیں گے کہ یہ حق تو اللہ ہی کا ہے۔ کہیے پھر تم کہاں سے دھوکہ کھا رہے ہو؟

خدا کے اقتدار میں کوئی شریک نہیں

وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا ۝ (بنی اسرائیل ۱۱۱)

نہ کوئی اس کے اقتدار میں شریک ہے اور نہ وہ عاجز ہے کہ کوئی اس کا مددگار ہو اس کی بڑائی بیان کرو کمال درجے کی بڑائی۔

خدا ہی کی پاکی بیان کر رہی ہے وہ تمام مخلوق جو آسمانوں میں ہے اور وہ تمام مخلوق جو زمین میں ہے حقیقی بادشاہ عیوب سے پاک، سب پر غالب، دانائی کا سرچشمہ یہ ساری کائنات جس کی پاکی بیان کر رہی ہے وہی ان کا حقیقی فرماں روا ہے وہی فرماں روائی کی تمام بنیادی صفات کا سرچشمہ ہے اور کوئی ایسی طاقت نہیں جو ان صفات میں اس کی شریک ہو انسان پر حکومت کرنے اور انسان کے لیے قانونِ زندگی بنانے کا حق اسی ہستی کو حاصل ہے جو تمام کمزوریوں اور عیبوں سے پاک ہو جو دانائی کا سرچشمہ ہو اور جو سب پر غالب ہو اور کوئی اس کے قبضہ قدرت سے باہر نہ ہو۔

حکومت خدا ہی کی ہے۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ (یوسف۔ ۴۰)

حکومت خدا ہی کی ہے۔ اس کا ارشاد ہے کہ اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔ یہی ہے سیدھا سچا دین۔

سیاسی اقتدار ایک دینی ضرورت

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا ۝ (بنی اسرائیل ۸۰)

اور دعا کیجیے کہ اے پروردگار مجھے جہاں بھی تو لے جا سچائی کے ساتھ لے جا اور جہاں سے نکال سچائی کے ساتھ نکال اور اپنے پاس سے زور و اقتدار کو میرا مددگار بنا دے۔

یعنی خدا کی سرزمین میں جہاں بھی میں رہوں سچائی اور حق ہی میرا حقیقی مقصود ہو۔ میں کہیں سے نکلوں تو اسی کی خاطر اور کہیں پہنچوں تو اسی کی خاطر اور اس مقصد کے حصول کے لیے قوت و اقتدار میرا پشت پناہ بنا دے۔ دراصل سیاسی اقتدار ہی حق اور راستی کو قائم کرنے اور باطل کو ختم کرنے کا سب سے بڑا اور موثر ترین ذریعہ ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ "خدا حکومت کی طاقت سے ان چیزوں کا سد باب کر دیتا ہے جن کا سد باب قرآن کے ذریعہ نہیں کرتا۔"

اسلامی اقتدار کی اہمیت

أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ حُكْمًا لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ (المائدہ)

کیا یہ لوگ جاہلیت کا حکم چاہتے ہیں اور جو لوگ اللہ پر یقین رکھتے ہیں ان کے لیے اللہ سے بہتر حکم دینے والا اور کوئی نہیں

یعنی اللہ کے حکم کے مقابلے میں ہر حکم جاہلیت کا حکم ہے جس کی بنیاد محض گمان، وہم اور قیاس پر ہے۔ خدا ہی کا حکم انسانی زندگی کے ہر گوشے میں صحیح رہنمائی کرتا ہے اور صحیح طرز عمل کی ہدایت دیتا ہے کیونکہ خدا ہی علم و حکمت کا واحد سرچشمہ ہے۔

اسلامی اقتدار بعثت رسول کا مقصود

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ (الصف)

وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو حقیقی ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اس دین کو وہ تمام دینوں پر غالب کر دے۔

یعنی آخری رسول کی بعثت کا اصل مقصود ہی یہ ہے کہ اسلام ایک غالب نظام بن کر رہے اور زندگی کے ہر شعبے میں خدا ہی کا دین قائم اور نافذ ہو۔

حق و باطل کی کشمکش

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لَاعِبِينَ ۝ لَوْ أَرَدْنَا أَنْ نَتَّخِذَ لَهْوًا لَاتَّخَذْنَاهُ مِنْ لَدُنَّا إِنْ كُنَّا فَاعِلِينَ ۝ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا

اور ہم نے اس آسمان اور زمین کو اور جو کچھ بھی ان میں ہے کچھ کھیل کے طور پر نہیں بنایا ہے اگر ہم کوئی کھلونا بنانا ہی چاہتے اور بس یہی کچھ ہمیں کرنا ہوتا تو اپنے ہی پاس سے کر لیتے مگر ہم تو حق کو باطل سے ٹکراتے ہیں جو باطل کا

زَاهِقٌ ط سر توڑ دیتا ہے اور وہ دیکھتے دیکھتے مٹ جاتا ہے

یعنی یہ عظیم کائنات ناسمجھ بچوں کا کوئی گھروندا نہیں ہے۔ بلکہ ایک علیم و حکیم خدا کا بنایا ہوا بامقصد کارخانہ ہے۔ اگر ہمیں کھیلنا ہی ہوتا تو کھلونے بنا کر ہم خود ہی کھیل لیتے۔ حق و باطل کے درمیان یہ دائمی کش مکش خیر و شر کے درمیان یہ ٹکراؤ اور ذی عقل و ذی حس انسانوں کے درمیان یہ کشاکش کبھی نہ ہوتی۔ دراصل حق و باطل کی اس ختم نہ ہونے والی کش مکش میں انسان کی آزمائش مقصود ہے —
وَنَبْلُوكُم بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً اور ہم تمہیں خیر و شر کے ذریعے آزمانا چاہتے ہیں —

اہلِ باطل کی خواہشات

حق کا چراغ بجھا دیں

يُرِيدُونَ لِيُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ (الصف)

اہلِ باطل چاہتے ہیں کہ خدا کی روشنی کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں۔ مگر وہ یاد رکھیں کہ خدا اپنی روشنی کو درجہ کمال تک پہنچا کر رہے گا۔ اگرچہ باطل پرستوں کو برا لگے۔

اہلِ حق کو باطل کی طرف پھیر لیجائیں

وَلَن تَرْضَىٰ عَنكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَىٰ حَتَّىٰ تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ (البقرہ-۱۲۰)

اور یہ یہود و نصاریٰ تم سے ہرگز خوش نہ ہوں گے جب تک تم ان کے طریقے پر نہ چلنے لگو۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تُطِيعُوا فَرِيقًا مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ يَرُدُّوكُم بَعْدَ إِيمَانِكُمْ كَافِرِينَ ۝ (آل عمران — ۱۰۰)

اے مومنو! اگر تم نے ان لوگوں میں سے جن کو کتاب دی گئی تھی کسی ایک گروہ کی بات بھی مانی تو یہ تمہیں ایمان سے پھر کفر کی طرف لے جائیں گے۔

یعنی حق و باطل کی کش مکش دائمی ہے۔ حق کی فطرت یہ ہے کہ وہ باطل پر غالب ہو کر رہے اور باطل کی کوشش یہ ہے کہ وہ حق کی روشنی کو پھیلنے نہ دے۔

دین حق میں رد و بدل کا مطالبہ

وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ

اور جب انہیں ہماری صاف صاف آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو ہم سے ملاقات کا یقین نہیں رکھتے کہتے ہیں کہ اس

لِقَاءَنَا ائْتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هٰذَا أَوْ بَدِّلْهُ قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِي إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ

(یونس ۔ ۱۵)

کہ اس قرآن کے بجائے کوئی اور قرآن لاؤ یا اسی میں کچھ رد و بدل کر دو۔ اے رسول ان سے کہہ دیجیے۔ میرا یہ کام نہیں ہے کہ اپنی طرف سے میں اس میں کچھ رد و بدل کر دوں میں تو بس اسی وحی کا پیرو ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے۔

یعنی یہ کتاب میری تصنیف تو نہیں کہ میں اس میں کچھ رد و بدل کروں۔ یہ تو خدا کی بھیجی ہوئی آسمانی کتاب ہے اور میں نہ صرف تمہیں اس کی پیروی کی دعوت دیتا ہوں بلکہ خود میں بھی اس کا پیرو ہوں۔

باقی آئندہ

بنگلور میں "زندگی" ملنے کا پتہ

بنگلور بک ہاؤس ۔ ۱۷ ۔ خلاصی پالم ۔ مین روڈ ۔ بنگلور ۲

زکوٰۃ کے چند اصولی احکام

(سید احمد قادری)

راقم الحروف یہاں فریضۂ زکوٰۃ سے متعلق چند اصولی احکام لکھ رہا ہے۔ وجوب زکوٰۃ اور ادائے زکوٰۃ کی تمام تفصیلات پیش کرنا مقصود نہیں ہے۔ اگر یہ اصولی باتیں ذہن نشین رہیں تو زکوٰۃ کے بہت سے جزئی اور چھوٹے مسائل کا سمجھنا آسان ہو جائے۔

(۱) اسلامی شریعت میں اصولی طور پر وجوب زکوٰۃ کے لحاظ سے ہمیں دو حکم ملتے ہیں۔ ایک ان اموال کا جو بیع و فروخت کی نیت سے حاصل کئے گئے ہوں، یا پہلے سے حاصل شدہ مال کو تجارتی مال بنا دیا گیا ہو اور ان کی بیع و فروخت شروع کر دی گئی ہو۔ ان اموال کو ہم اختصار کے لیے تجارتی اموال کہہ سکتے ہیں۔ شریعت نے تجارتی مال کی ہر قسم پر (جس کی تجارت شرعاً جائز ہو) زکوٰۃ واجب کی ہے۔ ان میں مال کی کوئی قسم ایسی نہیں ہے جس پر زکوٰۃ واجب نہ ہو۔ ہم اموال تجارت کے عنوان سے تھوڑی سی تفصیل آگے پیش کریں گے۔

دوسرے ان اموال کا حکم جو تجارت کے لیے نہ ہوں یا جن کی تجارتی بیع و فروخت نہ کی جا رہی ہو۔ ایسے غیر تجارتی اموال کی ہر قسم پر شریعت نے زکوٰۃ واجب نہیں کی ہے بلکہ کچھ مخصوص اقسام پر واجب کی ہے۔ ہم ذیل میں ان اقسام کو لکھتے ہیں جن پر زکوٰۃ واجب ہے:۔

(الف) معدنی اشیاء یعنی کان سے نکلنے والی چیزوں میں صرف دو چیزوں پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ چاندی۔ سونا۔

چاندی کا نصاب [۱] ۳۶ تولے ساڑھے پانچ ماشے ہے۔ اس سے کم مقدار پر زکوٰۃ واجب

---

[۱] بہت سے علماء کے نزدیک چاندی کا نصاب ساڑھے باون تولے چاندی ہے۔ راقم الحروف کے نزدیک اس نصاب کو ترجیح حاصل ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے

نہیں ہے ۔ اگر عاقل و بالغ مرد و عورت صاحب نصاب ہوں تو چند شرائط کے ساتھ چاندی کی اس مقدار یا اس سے زیادہ پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ زکوٰۃ کی مقدار نصاب کا چالیسواں حصہ ہے۔ مثال کے طور پر ۳۶ تولہ ساڑھے پانچ ماشے کا چالیسواں حصہ دس ماشے ساڑھے سات رتی ہوتا ہے ۔

سونے کا نصاب پانچ تولے[1] ڈھائی ماشے ہے ۔ اس سے کم مقدار پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ اس مقدار کا چالیسواں حصہ ایک ماشہ ساڑھے چار رتی ہوتا ہے ۔ نصاب کی مقدار میں یا اس سے زیادہ چاندی اور سونا جس شکل میں بھی موجود ہو اس پر زکوٰۃ واجب ہے ۔ چنانچہ زیورات پر بھی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے ۔ اگر کسی مرد یا عورت کی ملکیت میں نصاب کے برابر یا اس سے زیادہ چاندی یا سونے کے زیورات ہیں تو اس کی زکوٰۃ ادا کرنا اس پر واجب ہے۔ زیورات میں اگر قیمتی پتھر جڑے ہوئے ہوں تو ان کے وزن کو الگ کر کے صرف چاندی یا سونے کے وزن کا حساب کیا جائے گا۔

سونے اور چاندی کی زکوٰۃ سونا اور چاندی دے کر بھی ادا کی جا سکتی ہے یا جو مقدار واجب ہوئی ہے اس کی قیمت دے کر بھی ادا کی جا سکتی ہے۔ نوٹ اور دوسرے رائج سکوں کی زکوٰۃ اس وقت واجب ہوتی ہے جب ان کی قیمت چاندی کے نصاب تک پہنچ جائے ۔ مثال کے طور پر اگر کسی کے پاس اتنی قیمت کے نوٹ ہیں کہ ان سے ۳۶ تولہ ساڑھے پانچ ماشے چاندی خریدی جا سکتی ہے تو ان نوٹوں پر زکوٰۃ واجب ہوگی ویسے سہولت کے لیے ڈھائی روپیہ فی صد کے حساب سے زکوٰۃ نکالی جاتی ہے اسی طرح اگر کسی کی ملکیت میں دوسرے سکے اتنی قیمت کے موجود ہیں کہ ان سے نصاب کے برابر چاندی خریدی جا سکتی ہے تو ان پر زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کاغذی سکوں کی قیمت کاغذ یا دھات سے متعین نہیں ہوتی بلکہ اس قوت خرید سے متعین ہوتی ہے جو کسی حکومت نے قانونًا ان میں پیدا کر دی ہے اسی لیے نوٹوں اور رائج سکوں کو چاندی کا قائم مقام تسلیم کر لیا گیا ہے

(ب) جانوروں کی زکوٰۃ ۔ تین قسم کے جانوروں پر شریعت نے زکوٰۃ واجب کی ہے (۱) اونٹ اونٹنیاں۔ (۲) بھیڑ بکری (۳) گائے بیل بھینس ــــــ یہ جانور اگر افزائش نسل

---

[1] سونے کا نصاب ساڑھے سات تولے بتایا جاتا ہے ۔ ہم جس نصاب پر مطمئن ہوں اس کا ذکر اوپر کیا گیا ۔

کے لیے پالے گئے ہوں اور سال کے اکثر حصے میں چرائی پر رہتے ہوں تو ان پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، ورنہ نہیں۔ مثلاً اگر کسی نے صرف گوشت کھانے کے لیے یا کھیت جوتنے کے لائق جو جانور ہیں انہیں کھیت جوتنے کے لیے پالا ہے یا انہیں گھر پر رکھ کر کھلاتا پلاتا ہے تو ان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

اونٹ کا نصاب پانچ عدد ہے، پانچ سے کم پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ بھیڑ بکری کا نصاب چالیس عدد ہے، اور گائے بیل بھینس کا نصاب تیس عدد ہے۔

مقدار زکوٰۃ ۔ اگر صرف پانچ اونٹ اونٹنیاں ہیں تو ایک بکری دینی پڑے گی۔ صرف تیس عدد گائے، بیل اور بھینس ہیں تو ایک سال کا بچہ دینا پڑے گا۔ صرف چالیس عدد بھیڑ بکریاں ہیں تو ایک بھیڑ یا ایک بکری دینی پڑے گی۔

سونا، چاندی اور جانوروں کی زکوٰۃ دو شرطوں کے ساتھ ادا کرنا واجب ہے۔ ایک شرط حولانِ حول ہے یعنی ان اموال پر ایک سال گزر جانے کے بعد ادائے زکوٰۃ واجب ہوگی۔ سال کی ابتدا اور انتہا پر نصاب کا پورا ہونا ضروری ہے۔ درمیان سال میں اگر مال نصاب سے کم ہو جائے تو اس کا اعتبار نہیں کیا جائے گا ــــ حولانِ حول میں سال کا شمار قمری مہینوں سے کیا جائے گا شمسی مہینوں سے نہیں۔ اس کی ایک دلیل وہ حدیث بھی ہے جس میں حولانِ حول کو ادائے زکوٰۃ کے لیے شرط قرار دیا گیا ہے۔ لیے شرط قرار دیا گیا ہے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ یہ اموال قرض و دَین سے فارغ ہوں۔ اگر صاحب نصاب شخص مقروض ہو یا کسی کا اس پر کوئی دین ہو، تو یہ دیکھا جائے گا کہ قرض و دَین ادا کرنے کے بعد جو مال بچتا ہے وہ نصاب تک پہنچتا ہے یا نہیں۔ اگر پہنچتا ہے تو زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے، ورنہ نہیں۔ مثلاً اگر کسی شخص کے پاس ایک سال گزرنے کے بعد سو روپیے ہیں اور وہ اتنی روپیے کا مقروض ہے تو اب جو رقم بچتی ہے وہ نصاب یا اس سے زیادہ ہے اس لیے اس کو ستر روپیوں کی زکوٰۃ ادا کرنا ہوگی۔

(۳) زمین سے پیدا ہونے والے غلے جو ذخیرہ کرکے رکھے جاتے ہیں جیسے گیہوں، جو، چاول، چنا اور اسی طرح کے دوسرے غلے اور پھل جو ذخیرہ کرکے رکھے جاتے ہیں جیسے چھوہارے، خشک انگور (منقٰی) اور خشک میوے، ان سب پر زکوٰۃ واجب ہے۔ اس زکوٰۃ کو فقہ کی اصطلاح میں عشر کہتے ہیں ــ

اگر کھیت اور باغ آسمانی بارش سے سیراب ہوئے ہوں تو عشر یعنی پیداوار کا دسواں حصہ زکوٰۃ میں

نکالنا واجب ہے اور اگر کنوئیں سے پانی کھینچ کر یا بار برداری کے ذریعے کسی دوسری جگہ سے پانی لاکر یا خرید کر کھیت اور باغ سیراب کیے گئے ہوں تو نصفِ عشر یعنی پیداوار کا بیسواں حصہ زکوٰۃ میں نکالنا ہوگا۔

غلے اور پھل کا نصاب پانچ وَسْق ہے۔ ایک وسق ساٹھ صاع کا ہوتا ہے۔ پانچ وسق کا وزن اٹھارہ من تیس سیر ہوا۔ اس سے کم مقدار کے غلے اور پھل میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے[1]۔

عشر ادا کرنے میں نہ دین سے فارغ ہونے کی شرط ہے اور نہ سال گزرنے کی۔ فصل کٹنے کے بعد ہی عشر ادا کرنا واجب ہو جاتا ہے اور اگر سال میں کئی فصل ہوں تو ہر فصل کا عشر ادا کرنا ہوگا۔ اسی طرح اگر صاحب نصاب پر دین یا قرض ہو جب بھی عشر ادا کرنا واجب ہے۔

ان مخصوص اقسام کی تفصیل سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ اگر کسی کے پاس ان کے علاوہ کوئی مال ہزاروں روپیے کی قیمت کا بھی موجود ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص ہزاروں روپیے کے سچے موتی اور جواہرات کا مالک ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے الا یہ کہ وہ اس کی تجارت کر رہا ہو۔

(د) **اموال تجارت**۔ جیسا کہ اوپر لکھا گیا کہ ہر قسم کے مال تجارت پر شریعت نے زکوٰۃ واجب کی ہے۔ عام ازیں کہ وہ کسی قسم کی پیداوار ہو، سونا اور چاندی ہو، کسی قسم کا جانور ہو (جس کی تجارت شرعاً جائز ہو) موتی اور جواہرات ہوں، کتابیں ہوں، یا تیل اور نمک ہو، یا کوئی بھی چیز ہو جس کی تجارت کی جا رہی ہو۔

مال تجارت کا نصاب وہی ہے جو چاندی کا نصاب ہے یعنی اگر کسی کے پاس اتنا مالِ تجارت ہے جس کی قیمت چاندی کے ایک نصاب کی قیمت کے برابر یا اس سے زیادہ ہے تو اس پر دین سے فراغت اور حولانِ حول کے بعد زکوٰۃ واجب ہے

---

[1] امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ زمین کی پیداوار کا کوئی نصاب نہیں ہے بلکہ قلیل و کثیر ہر مقدار میں دسواں یا بیسواں حصہ زکوٰۃ میں نکالنا واجب ہے۔ اسی طرح ایسی پیداوار پر بھی جو ذخیرہ نہیں کی جاتی (جیسے سبزی ترکاری) ان کے نزدیک زکوٰۃ واجب ہے۔ وہ صرف گھاس پات اور بانس اور نرکل کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ کرتے ہیں۔ راقم الحروف کے نزدیک تعیین نصاب کی دلیل قوی ہے۔ اس لیے میں نے امام یوسف، محمد، مالک، شافعی، احمد رحمہم اللہ کی رائے اختیار کی ہے۔ ذخیرہ نہ کی جانے والی پیداوار کو بھی صحیح حدیث میں زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔

اس کی زکوٰۃ ادا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ سال گزر جانے کے بعد جو مال اس کے پاس موجود ہو اس کی قیمت کا حساب کرے اگر ایک نصاب کی قیمت یا اس سے زیادہ کا مال ہو تو ڈھائی فی صد کے حساب سے زکوٰۃ ادا کرے۔ اگر مال نصاب سے کم ہو مگر خزانے میں نقد روپیہ بھی موجود ہوں تو دونوں کو ملا کر حساب کرنا چاہیے۔ اس کے بعد بھی اگر نصاب پورا نہ ہوتا ہو تو زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

یہاں تجارت اور کاروبار کا فرق واضح کر دینا ضروری ہے اس فرق کو نہ جاننے کی وجہ سے بعض مسائل میں الجھن پیش آتی ہے ـــــ زکوٰۃ کے مسئلے میں تجارت کا لفظ خرید و فروخت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے مطلقاً کاروبار کے معنی میں استعمال نہیں ہوتا ہماری اردو زبان میں کاروبار کا لفظ تجارت سے عام ہے۔ ہم اگر کسی چیز کی خرید و فروخت کریں تو اس کو بھی کاروبار کہتے ہیں اور اگر مکانات خرید کر صرف انہیں کرایے پر چلائیں تو اسے بھی کاروبار کہتے ہیں، لیکن فقہی اصطلاح میں اس کاروبار کو تجارت نہیں کہیں گے اور ان مکانات پر تجارتی مال ہونا صادق نہیں آئے گا۔ کاروبار کے لیے عربی میں صحیح لفظ معاملہ ہے۔ معاملات میں تجارت، زراعت، صنعت اور اسی طرح کی تمام چیزیں داخل ہیں جس حدیث کی بنا پر سامان تجارت میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اس میں بیع کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ معلوم ہوا کہ جب تک کسی مال میں بیع و فروخت جاری نہ ہو وہ مال تجارت نہیں ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ کرایہ پر چلائے جانے والے سامان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی کیونکہ کسی سامان کو کرایے پر چلانا "تجارت" نہیں ہے۔ اس معاملے کے لیے فقہی اصطلاح اجارہ ہے۔ اجارے اور تجارت میں بنیادی فرق یہ ہے کہ تجارت میں اشیاء کا لین دین ہوتا ہے۔ خریدار اس چیز کا مالک ہو جاتا ہے جسے اس نے خریدا اور بائع اس چیز یا اس رقم کا مالک ہو جاتا ہے جس کے عوض اس نے اپنی کوئی چیز بیچی، اجارے میں کرایہ پر کوئی شے حاصل کرنے والا اس شے کا مالک نہیں ہوتا بلکہ اس سے صرف وہ منفعت حاصل کرتا ہے جس کے لیے اس نے اجرت دی ہے وہ شے جوں کی توں اسی مالک کی ملکیت میں رہتی ہے جس نے اس کو کرایے پر دیا ہے۔

(۲) دوسری اصولی بات جو ذہن نشین کرنی چاہیے وہ یہ ہے کہ ائمہ اربعہ ابوحنیفہؒ، مالکؒ، شافعیؒ، احمد رحمہم اللہ میں سے کسی امام کے نزدیک بھی وجوب زکوٰۃ کے لیے یہ بات بہرحال لازمی نہیں ہے کہ مال، صاحب مال کے قبضے اور تصرف میں موجود ہو، بلکہ بہت سی صورتوں میں کسی شخص کے

اس مملوکہ مال میں بھی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے جو کسی دوسرے شخص کے قبضہ و تصرف میں ہو۔ ایسی صورت میں اس مال پر اصل مالک کا قبضہ حکمی وجوب زکوٰۃ کے لیے کافی تسلیم کر لیا گیا ہے۔ قبضہ حکمی کا مفہوم یہ ہے کہ مال حقیقت میں تو مالک کے قبضے میں نہ ہو لیکن حکماً اس پر اس کا قبضہ مان کر زکوٰۃ واجب کی گئی ہو۔ میں یہاں اس کی چند مثالیں پیش کر رہا ہوں تاکہ یہ اصول واضح ہو جائے۔

(الف) صاحب نصاب مسافر پر زکوٰۃ واجب ہے اگرچہ اس کا مال سفر میں اس کے ساتھ نہ ہو بلکہ وہ خود محتاج ہو کر مستحق زکوٰۃ بھی بن گیا ہو۔ فرض کیجیے کوئی شخص سفر میں ہو اور کئی سال سفر میں گزر جائیں اور گھر پر اس کی ملکیت میں اتنا مال موجود ہو جس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے تو جتنے برس وہ سفر میں رہا ہے اور زکوٰۃ ادا نہیں ہو سکی ہے۔ ان تمام برسوں کی زکوٰۃ اسے ادا کرنی ہوگی۔

(ب) صاحب نصاب قیدی پر زکوٰۃ واجب ہے۔ اگر کوئی مال دار آدمی قید کر دیا گیا ہو، اور وہ اپنے مال سے بالفعل فائدہ حاصل نہ کر سکتا ہو تو اس کی وجہ سے اس کے مال کی زکوٰۃ ساقط نہ ہوگی۔

(ج) کسی شخص کا کسی دوسرے شخص پر نصاب کے برابر یا اس سے زیادہ قرض ہو اور وہ قرض قابل وصول بھی ہو تو اس مال پر زکوٰۃ واجب ہے۔

(د) بینک میں یا کسی شخص کے پاس کسی کا ایک نصاب یا اس سے زیادہ مال امانۃً محفوظ ہو، تو اس مال پر زکوٰۃ واجب ہے۔

(ہ) کسی نے ایک نصاب یا اس سے زیادہ روپیہ کسی کو مضاربت کے اصول پر حوالہ کیا اور کاروبار شروع ہونے سے پہلے ہی اس پر ایک سال گزر گیا تو اس روپیے پر زکوٰۃ واجب ہے۔

ان تمام صورتوں میں وہی اصول کام کر رہا ہے جس کا ذکر ابھی اوپر گزرا یعنی یہ کہ وجوب زکوٰۃ کے لیے مالک کا اپنے مال پر حکماً قبضہ کافی ہے حقیقۃً اور بالفعل مال کا اس کے قبضہ و تصرف میں ہونا ضروری نہیں ہے۔

اسی اصول کے تحت پراویڈنٹ فنڈ پر بھی زکوٰۃ واجب ہوگی۔۔۔ اس اصول کے تحت جن اموال کی

لے اس مسئلے کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے مولانا مودودی نے جو کچھ فرمایا ہے وہ شہاب مورخہ ۱۳ اکتوبر ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا ہے اسے بھی ہم یہاں نقل کر رہے ہیں۔ مدیر (باقی اگلے صفحہ)

زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اس کی ادائیگی کب واجب ہوگی؟ اس کو بھی سمجھ لینا چاہیے۔ اگر ایسی صورت موجود ہے کہ صاحب مال کسی کو اپنا نائب بنا کر زکوٰۃ ادا کر سکتا ہو تو سال گزرتے ہی اسے ادا کر دینا چاہیے۔ مثلاً مسافر قیدی اپنے مال کے نگران کو یا کسی قابل اعتماد شخص کو اپنا نائب بنا کر اس کے ذریعے سے زکوٰۃ ادا کر سکتا ہے اور اگر ایسی صورت نہ ہو تو زکوٰۃ ادا کرنا اس وقت واجب ہوگا جب مال اس کے اپنے قبضے میں آجائے۔

(۳) اگر کسی کا مال کسی دوسرے کے قبضے میں ہو تو فقہ مالکی و حنفی و شافعی کسی میں بھی وجوب زکوٰۃ کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ مال اس سے بخوشی حاصل کیا گیا ہو بلکہ ایسی صورت بھی ہو سکتی ہے کہ کسی سے بجبر حاصل کیے ہوئے مال پر زکوٰۃ واجب ہو جائے۔ مثال کے طور پر اگر کسی نے کسی کے روپے غصب کر لیے لیکن ایسے ذرائع موجود ہیں کہ مالک اپنے غصب کردہ مال کو غاصب سے حاصل کر سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اس کا مال قابلِ وصول ہے تو اس مال پر بھی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے لیکن ادائیگی اس وقت واجب ہوگی جب مال اس کے اپنے قبضے میں آجائے۔

اس اصول کے تحت اس پراویڈنٹ فنڈ پر بھی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے جو ملازم کی مرضی کے بغیر کاٹا جاتا ہے —— پراویڈنٹ فنڈ پانے والے ملازمین ہر سال اس کا حساب جوڑتے رہتے ہیں اور اس کے بارے میں پروگرام بناتے رہتے ہیں کہ ملازمت سے علیحدہ ہونے کے بعد اس رقم سے یہ کریں گے اور وہ کریں گے لیکن زکوٰۃ کا نام آتے ہی ان میں کے بعض طرح طرح کے بہانے بنانے لگتے ہیں گویا ہزاروں کی رقم ہاتھ میں آجانے کے بعد بھی مسکینوں اور محتاجوں کے لیے چند سو بطور زکوٰۃ نکالنا ان کے لیے عذاب سے کم نہیں ہے۔ ایک مسلمان کو جو آخرت کے لازوال اجر پر یقین رکھتا ہے ایسی ذہنیت سے پناہ مانگنی چاہیے۔

حاشیے کا بقیہ

"پراویڈنٹ فنڈ کی رقم آپ ہی کی ہے اور ریٹائرڈ ہونے یا ملازمت سے علیحدہ ہونے کے بعد وہ ساری رقم آپ کو ملے گی۔ اس لیے میرے نزدیک اس پر زکوٰۃ فرض ہے بعض علما کے نزدیک اس پر زکوٰۃ نہیں ہے لیکن میرے نزدیک اگر پراویڈنٹ فنڈ کی رقم آپ کو مل جائے تو اس کے بعد اس پر زکوٰۃ ادا کرنی چاہیے۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر

(مولانا جلال الدین عمری)

رشتہ داروں کو معروف کا حکم دینا اور منکر سے روکنا ضروری بھی ہے اور اہم بھی، لیکن اس کے کچھ حدود و آداب ہیں۔ ان حدود کی رعایت کے بغیر یہ فرض صحیح طریقے سے انجام نہیں پا سکتا۔ ہم یہاں صرف والدین اور اولاد اور میاں بیوی کے درمیان امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے حدود و آداب بیان کریں گے، کیونکہ ان رشتوں میں جو نزاکت پائی جاتی ہے وہ دوسرے رشتوں میں نہیں ہے۔

شریعت نے اولاد کی دو قسمیں قرار دی ہیں۔ ایک بالغ اولاد اور دوسری نابالغ اولاد۔ ان دونوں قسم کی اولاد پر والدین کے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی نوعیت ایک دوسرے سے کسی قدر مختلف ہے۔

نابالغ اولاد کو معروف کا حکم دینے اور منکر سے منع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کو صحیح تعلیم و تربیت دی جائے اور ان کو اس قابل بنایا جائے کہ ہوش سنبھالنے کے بعد وہ اسلام کے مطابق اپنی زندگی بسر کر سکیں۔ حدیثوں میں بچوں کی تعلیم و تربیت کی بڑی فضیلت بیان ہوئی ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:-

لان یؤدب الرجل ولدہ	آدمی اپنے بچے کو ایک ادب سکھائے
خیر من ان یتصدق بصاع[1]	اس سے بہتر ہے کہ ایک صاع صدقہ کرے

ایک دوسری حدیث میں ہے۔

ما نحل والد ولدہ من نحل	کسی باپ نے اپنے بچے کو اچھے ادب سے

[1] ترمذی، ابواب البر والصلۃ، باب ما جاء فی ادب الولد۔

افضل من ادب حسن[1] | بہتر کوئی عطیہ نہیں دیا۔

بچوں کی تعلیم و تربیت محض کار ثواب نہیں ہے بلکہ یہ والدین کی شرعی ذمہ داری ہے۔ اس فریضہ سے سبک دوش ہونے کے لیے شریعت نے ان کو وقت ضرورت اولاد کی تعزیر کا بھی حق دیا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے:۔

مروا اولادکم بالصلوٰۃ وھم ابناء سبع سنین واضربوھم علیھا وھم ابناء عشر[2]

اپنی اولاد کو نماز کا حکم دو جب کہ وہ سات سال کے ہوں اور جب وہ دس سال کے ہو جائیں تو نماز سے غفلت اور کوتاہی پر ان کو مارو۔

حدیث میں صرف نماز کے سلسلے میں سختی کا ذکر ہے لیکن یہی حکم روزے کا بھی ہے[3] والدین پر اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت فرض ہے اس لیے فقہاء نے لکھا ہے کہ وہ ان کو قرآن کے پڑھنے، علم دین حاصل کرنے اور اسلامی آداب سیکھنے پر مجبور کر سکتے ہیں[4]۔

بچوں کا سرپرست باپ ہے۔ اس لیے ان کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری اصلاً اسی پر عائد ہوتی ہے۔ لیکن ماں کو بھی اس معاملہ میں ایک طرح کی سرپرستی حاصل ہے۔ حضرت مریم کی والدہ نے دعا کی تھی:

رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَکَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ٥ (آل عمران)

اے میرے رب میں اس بچے کو جو میرے پیٹ میں ہے دنیا کے تمام کاموں سے آزاد کر کے تیری نذر کرتی ہوں تو میری یہ نذر قبول فرما۔ یقیناً تو سننے والا اور جاننے والا ہے۔

علامہ ابوبکر جصاص اس واقعہ کے ذکر کے بعد کہتے ہیں۔

یدل علی ان للام ضربا من الولایۃ علی الولد فی تادیبہ

اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ بچہ کی تعلیم، تادیب اسے وقف کرنے اور

---

[1] ترمذی، ابواب البر والصلۃ، باب ماجاء فی ادب الولد۔ [2] ابو داؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب متی یؤمر الغلام بالصلوٰۃ۔ [3] رد المحتار علی الدر المختار، ج ۲ صفحہ ۔ [4] البحر الرائق شرح کنز الدقائق۔ جلد ۵ صفحہ

وتعليمه وامساكه وتربيته لولا انها تملك ذالك لما نذرته في ولد ما له

تربیت کے معاملہ میں ماں کو بھی ایک طرح کی سرپرستی حاصل ہے۔ اگر وہ اس کی حق دار نہ ہوتیں تو اپنے بچے کے سلسلے میں اس کی نذر نہ مانتیں۔

اس لیے جس طرح باپ بچہ کی تادیب اور تعزیر کا حق رکھتا ہے۔ اسی طرح ماں کو بھی یہ حق حاصل ہے[1] کم سن اور نابالغ اولاد کی تادیب اور تعزیر کا والدین کو حق ہے لیکن جب اولاد بالغ ہو جائے تو والدین کو یہ حق باقی نہیں رہتا۔ کیونکہ بالغ اولاد کی حیثیت اجنبی کی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ابن عابدین کہتے ہیں :—

اما الكبير فكالاجنبى[2]

لیکن لڑکا جو بڑا ہو جائے تو اجنبی کی مانند ہے

بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ بچے کے بالغ ہونے کے بعد بھی والدین کو اس کی تادیب کا حق ہے۔ چنانچہ بحر الرائق میں ہے۔

ذكر الاسبيجاني ان للاب ان يؤدب ولده البالغ اذا وقع منه شيئ[3]

اسبیجانی نے بیان کیا ہے کہ باپ کو اپنی بالغ اولاد کی تادیب کا حق ہے جب کہ اس سے کوئی غلط حرکت سرزد ہو۔

ان دونوں باتوں میں بظاہر تضاد ہے لیکن حقیقت میں تضاد نہیں ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے آپ کو ایک خاص پہلو سے غور کرنا ہوگا۔ وہ یہ کہ نابالغ اور بالغ اولاد میں دو حیثیتوں سے فرق ہے۔ نابالغ اولاد غیر مکلف اور والدین کے تابع ہوتی ہے۔ اس کے برعکس بالغ اولاد اپنی ایک آزاد اور مستقل حیثیت رکھتی ہے اور اپنے تمام اقوال و افعال کی شرعاً مکلف اور ذمہ دار ہے۔ اس لیے اصولی طور پر یہ بات بالکل صحیح ہے کہ اولاد جب تک نابالغ اور والدین کے تابع ہے اس کی تادیب کا والدین کو حق بھی ہے لیکن جب اولاد عاقل و بالغ ہو جائے اور والدین کے تابع نہ رہے تو اس کی تادیب کا حق بھی والدین کو نہیں ہے۔ اس اصولی حقیقت کو ماننے کے بعد عملی نقطہ نظر سے اگر آپ اس مسئلے پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ہر بچہ بالغ ہوتے ہی تمام ذمہ داریوں کے اٹھانے کے قابل

---

[1] احکام القرآن جلد ۳ ص ۱۲ — [2] رد المحتار علی الدر المختار ج ۳ ص ۲۶۱ [3] رد المحتار علی الدر المختار جلد ۳ ص ۲۶۱ [4] البحر الرائق ج ۴ ص ۱۷

نہیں ہوجاتا بلکہ بعض اوقات وہ والدین کی سرپرستی اور تعاون کا مزید ایک عرصے تک محتاج رہتا ہے۔ مثال کے طور پر کوئی باپ عاقل و بالغ اور صاحب الرائے لڑکے کو اپنے ساتھ رہنے پر مجبور نہیں کرسکتا۔ لیکن اگر لڑکے کے اخلاق و عادات کی طرف سے اطمینان نہ ہو تو باپ کو حق ہے کہ اسے کسی الگ مکان میں رہنے کی اجازت نہ دے اور اپنے ساتھ رکھے[1] یہی نہیں بلکہ ان حالات میں وہ وقت ضرورت اس کی تادیب بھی کرسکتا ہے۔ چنانچہ درمختار میں ہے:۔

(والغلام اذا عقل واستغنى	لڑکا جب سوجھ بوجھ والا اور صاحب
برایہ لیس للاب ضمہ الی نفسہ	الرائے ہوجائے اور دوسروں کی رائے کا
الا اذا لم یکن مامونا علی	محتاج نہ رہے تو باپ کو اسے اپنے ساتھ
نفسہ فلہ ضمہ لدفع فتنۃ	رکھنے کا حق نہیں ہے الا یہ کہ اس کے بارے
او عار وتادیبہ	میں اطمینان نہ ہو تو فتنہ یا شرمندگی سے
اذا وقع منہ	بچنے کے لیے باپ اس کو اپنے ساتھ رکھ سکتا
شیء[2]	ہے۔ اور اگر اس سے کوئی غلط حرکت سرزد
	ہو تو باپ کو اس کی تادیب کا بھی حق ہے۔

جن حالات میں باپ کو یہ حق ہے کہ لڑکے کو بالغ ہونے کے باوجود اپنے ساتھ رکھے۔ ابن عابدین کہتے ہیں کہ ان حالات میں باپ نہ ہو تو لڑکے کا جو بھی سرپرست ہو اسے یہ حق ملنا چاہیے۔ کیونکہ یہ سب سے بڑی صلہ رحمی اور دفع منکر ہے اور شریعت نے ان دونوں کا حکم دیا ہے۔

والظاھر ان الجد	بظاہر دادا بھی باپ ہی کی طرح ہے بلکہ
کذالک بل غیرہ من العصبات	دادا کے علاوہ دوسرے عصبات جیسے بھائی
کالاخ والعم ..... فان	اور چچا بھی اسی حکم میں ہیں ..... کیونکہ منکر
دفع المنکر واجب علی کل	کا دفع کرنا ہر اس شخص پر واجب ہے جو اس
من قدر علیہ لاسیما من یلحقہ	کی قدرت رکھتا ہو۔ خاص طور پر اس شخص
عارہ وذالک ایضا من اعظم	کے لیے جس کو اس کی وجہ سے شرمندگی لاحق

---

[1] البحر الرائق ج ۴ ص ۱۸۱ [2] الدر المختار شرح تنویر الابصار ج ۲ ص ۸۸۳

صلۃ الرحم والشرع امر بصلتھا وبدفع المنکر ما امکن[1]	ہوتی ہو۔ علاوہ ازیں یہ بہت بڑی صلہ رحمی ہے اور شریعت نے صلۂ رحمی اور امکان کی حد تک دفع منکر کا حکم دیا ہے۔

جس طرح بعض حالات میں والدین کو بالغ اولاد کی تعزیر کا حق حاصل ہے اسی طرح بعض حالات میں ان پر کچھ ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں۔ اس کی ایک مثال ہم بیان دیتے ہیں۔ لڑکے کے بالغ اور کسب کے قابل ہونے کے بعد باپ پر اس کی معاشی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ لیکن لڑکا اگر اس وجہ سے کمانے کی پوزیشن میں نہیں ہے کہ وہ علم دین حاصل کر رہا ہے تو باپ کے لیے اس کا خرچ اٹھانا ضروری ہے[2]

اولاد کو فتنہ میں پڑنے سے بچانا نہی عن المنکر ہے تو اس کی تعلیم میں مدد دینا امر بالمعروف ہے۔ گویا والدین کو وقت ضرورت اپنی اولاد پر اس کے بالغ ہونے کے باوجود امر بالمعروف بھی کرنا پڑتا ہے اور نہی عن المنکر بھی۔

اولاد کے لیے ماں باپ پر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض انجام دینا بہت نازک کام ہے اور اس میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ اگر کسی کے والدین ناواقفیت کی بنا پر ترک معروف یا ارتکاب منکر کر رہے ہوں تو اس کی ذمہ داری ہے کہ ان کو احکام شریعت بتائے اور نصیحت کرے۔ اس سے آگے ڈانٹ ڈپٹ یا زد و کوب یا قتل تو اس کی قطعاً اجازت نہیں ہے۔ قرآن میں ہے۔

وَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا	انہیں اف تک نہ کہو انہیں جھڑکو نہیں
وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا (بنی اسرائیل)	اور ان سے ادب و احترام سے بات کرو۔

والدین کا اولاد پر یہاں تک حق ہے کہ اگر وہ اولاد کو قتل کر دیں تو ان سے قصاص نہیں لیا جائے گا۔

لا یقاد الوالد لولدہ[3]	اولاد کے عوض باپ کو قتل نہیں کیا جائے گا

---

[1] ردالمحتار علی الدرالمختار ج ۲ ص ۲۸۸ [2] بحرالرائق ج ۴ ص ۲۱۳ [3] ترمذی ابواب الدیات باب ما جاء فی الرجل یقتل ابنہ یقاد منہ ام لا

اسی طرح خود لڑکا بھی باپ سے قصاص نہیں لے سکتا۔ مثال کے طور پر کوئی شخص اپنے لڑکے کی ماں کو قتل کر دے تو قصاص لینے کا حق لڑکے سے خود بخود ساقط ہو جائے گا[1]

کافر ماں باپ جنگ میں اگر اولاد کے سامنے آجائیں تو حکم ہے کہ اولاد انہیں اپنے ہاتھ سے قتل کرنے سے حتی الوسع بچے، الا یہ کہ وہ اس پر حملہ آور ہوں اور اسے اپنی جان بچانے کے لیے اقدام کرنا پڑے[2]

فقہاء نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر والدین پر حد واجب ہو جائے تو اولاد ان پر حد نہیں جاری کرے گی[3]

اس طرح کی تفصیلات پیش کرنے کے بعد امام غزالیؒ فرماتے ہیں۔

فاذا لم يجز له ايذاءه	جب لڑکے کے لیے باپ کو ایک ایسی سزا
بعقوبة هي حق على جناية سابقة	کے ذریعہ تکلیف دینا جائز نہیں ہے جو اس کے
فلا يجوز له ايذاءه بعقوبة	سابق جرم کی وجہ سے اس پر واجب ہوئی ہو
هي منع من جناية مستقبلة	تو اس کے لیے ایک ایسے جرم پر باپ کو سزا دینا
متوقعة بل اولى[4]	جو آئندہ ہونے والا ہے بدرجہ اولیٰ ناجائز ہوگا

علامہ ابن عابدین نے 'فصول العلامی' کے حوالے سے لکھا ہے کہ آدمی اپنے ماں باپ کو منکر کا ارتکاب کرتے ہوئے دیکھے تو ایک مرتبہ انہیں منع کرے۔ اگر وہ باز آجائیں تو ٹھیک ہے لیکن یہ بھی ان کو ناگوار گزرے تو خاموش ہو جائے اور دعا کرتا رہے کہ خدا ان کو ہدایت دے اور ان کی غلطیوں سے درگزر فرمائے[5]

بعض لوگوں نے کہا ہے کہ والدین اگر کسی منکر کا ارتکاب کر رہے ہوں تو ان کو ہاتھ لگائے بغیر اس منکر کو مٹا دینا چاہیے جس کا وہ ارتکاب کر رہے ہیں[6] مثال کے طور پر شراب پی رہے ہوں تو ان سے تعرض نہ کیا جائے اور شراب بہادی جائے۔

اب آیئے اس سوال پر غور کیا جائے کہ شوہر کے بیوی کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے کیا

---

[1] الہدایۃ مع شرح العنایۃ علی ہامش فتح القدیر ج ۸ صفحہ ۲۲۶ [2] احکام القرآن للجصاص ج ۳ صفحہ ... بحر الرائق ج ۵ صفحہ ... [3] احیاء علوم الدین ج ۲ صفحہ ۳۰۸ [4] رد المحتار علی الدر المختار ج ۳ صفحہ ۲۶۱ [5] ... [6] التشریع الجنائی صفحہ ۵۰۹

ہیں اور بیوی کی حد و دمیں شوہر پر یہ فرض انجام دے سکتی ہے۔ قرآن میں ہے :۔

الرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ (النساء ۳۴) مرد عورتوں پر قوام ہیں

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام نے خاندان کا جو نظام مقرر کیا ہے اس میں شوہر قوّام ہے اور بیوی اس کی تابع اور محکوم۔ شوہر کے قوام ہونے کا تقاضا محض یہ نہیں ہے کہ وہ بیوی کا معاشی بوجھ اٹھائے اور گھر کے انتظامی معاملات کی نگرانی کرتا رہے، بلکہ یہ بھی اس کا تقاضا ہے کہ شوہر بیوی کے دین و ایمان کی حفاظت کرے اور اس کے اخلاق و سیرت میں جو خامیاں ہوں ان کی اس طرح اصلاح کرے جس طرح کوئی سرپرست اپنے سے چھوٹے کی خامیوں کی اصلاح کرتا ہے۔ علامہ ابن کثیر 'قوام' کی تشریح میں فرماتے ہیں :۔

الرجل قیم علی المرأة ای هو رئیسها وکبیرها والحاکم علیها ومؤدبها اذا اعوجت[1]	مرد عورت پر قیم ہے یعنی وہ اس کا سردار، اس کا بزرگ، اس پر حکومت کرنے والا اور جب وہ ٹیڑھی ہو جائے تو اس کی تادیب کرنے والا ہے۔

جصّاص کہتے ہیں :۔

تضمن قوله الرجال قوامون علی النساء قیامهم علیهن بالتادیب والتدبیر والحفظ والصیانة[2]	"مرد عورتوں پر قوام ہیں" خدا کے اس قول میں مردوں کا مستقل عورتوں کی تادیب، ان کا انتظام اور ان کی حفاظت و نگرانی کرنا بھی شامل ہے

امر بالمعروف و نہی عن المنکر فرض کفایہ ہے لیکن اگر کوئی خاص شخص ہی کسی کے ترک معروف یا ارتکاب منکر سے واقف ہوا اور وہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی قدرت بھی رکھتا ہو تو یہ کام اس کے لیے فرض کفایہ نہیں بلکہ فرض عین ہو جاتا ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ کوئی بھی شخص اپنے بیوی بچوں کی خوبیوں اور خامیوں سے جس قدر واقف ہو سکتا ہے اتنی واقفیت کسی دوسرے کے لیے ممکن نہیں ہے اور پھر ان کی اصلاح کی جو طاقت اور جو حقوق اسے حاصل ہیں وہ بھی کسی اور کو حاصل نہیں ہیں۔ ان دونوں باتوں کو سامنے رکھ کر اگر آپ مذکورہ بالا اصول

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۴۹۱ [2] احکام القرآن ج ۲ ص ۲۲۹

پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ انسان کے لیے اپنے بیوی بچوں کی اصلاح ان بے شمار معاملات میں فرض عین ہو جائے گی جن سے دوسرے نہ تو واقف ہو سکتے ہیں اور نہ اصلاح کر سکتے ہیں۔ امام نووی امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

ثم انہ قد یتعین	امر بالمعروف ونہی عن المنکر بعض حالات
کما اذا کان فی موضع لا یعلم	میں فرض عین ہو جاتا ہے۔ جیسے آدمی کسی ایسی
بہ الا ھو ولا یتمکن من	جگہ ہو کہ منکر کے ارتکاب سے صرف وہی واقف
ازالتہ الا ھو وکمن یری	ہو یا اس کا ازالہ صرف وہی کر سکتا ہو۔ مثلاً جو
زوجتہ او ولدہ او غلامہ	شخص اپنی بیوی یا اپنی اولاد یا اپنے غلام کو منکر
علیٰ منکر او تقصیر فی	کا ارتکاب کرتے یا معروف میں کوتاہی کرتے دیکھے
المعروف[1]	(تو اس پر امر بالمعروف ونہی عن المنکر واجب ہے)

عورت اگر شوہر کے حقوق نہ ادا کرے اور اس کے حکم کی خلاف ورزی کرے تو شوہر کو اس کی تعزیر کا حق ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

وَاللّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ	جن عورتوں کی سرکشی کا تمہیں ڈر ہو انہیں
وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ	سمجھاؤ، خواب گاہوں میں ان سے الگ رہو
(النساء: ۳۴)	اور انہیں مارو

شریعت نے بیوی کی تعزیر کا شوہر کو جو حق دیا ہے اس سے وہ بیوی کو معروف پر عمل کرانے اور منکر سے باز رکھنے میں مدد لے سکتا ہے لیکن یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اس حق کے استعمال کے کچھ حدود ہیں۔ ان ہی حدود میں شوہر بیوی کی تعزیر کا مجاز ہے۔

(۱) شوہر کو اس وقت بیوی کی تعزیر کا حق ہے جب کہ وہ بغیر کسی عذر شرعی کے اس کی جنسی خواہش پوری کرنے سے انکار کر دے، یا اس کی حکم عدولی اور اس کے مقابلے میں ترفع اور استکبار کی روش اختیار کرے۔ مثال کے طور پر اس کے ساتھ بدزبانی اور جھگڑا کرے، اس کی داڑھی نوچ دے، اس کے کپڑے پھاڑ دے۔ اس کے حکم اور استطاعت کے باوجود جائز زیب وزینت ترک کر دے،

---

[1] شرح مسلم ج ۱ صلا۵

اس کی مرضی کے خلاف گھر کی چیز کسی کو دے دے وغیرہ۔ یا اس سے کوئی غیر اخلاقی حرکت سرزد ہو
جیسے وہ کسی کو گالی دے، اجنبیوں کے سامنے اپنا چہرہ کھول دے یا ان سے بات چیت کرے
شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے نکل جائے۔ وغیرہ [1]

(۲) عورت اگر اپنے نان و نفقہ کے لیے اصرار اور تقاضا کر رہی ہے تو شوہر اسے سزا نہیں دے
سکتا۔ کیونکہ یہ اس کا حق ہے اور اپنے حق کے لیے وہ اصرار کر سکتی ہے [2]

(۳) شوہر ناحق اور بلا وجہ بیوی کو مار پیٹ کرے تو خود شوہر کی تعزیر کی جائے گی [3]

(۴) تعزیر صرف ان ہی منکرات کے ارتکاب پر ہوتی ہے جن کے ارتکاب پر شریعت نے کوئی
حد مقرر نہیں کی ہے۔ جن منکرات کے ارتکاب پر شریعت نے حد مقرر کر دی ہے ان پر حد جاری ہوگی
تعزیر نہیں ہوگی اور حد جاری کرنا عوام کا کام نہیں بلکہ حکام کا فرض ہے۔ اس لیے شوہر صرف ان
ہی منکرات کے ارتکاب پر عورت کی تعزیر کر سکتا ہے جن میں شریعت نے کوئی حد مقرر نہیں کی ہے
علامہ کاشانی کہتے ہیں :-

اذا ارتکبت معصیۃ سوی	عورت شوہر کی نافرمانی کے علاوہ (بھی)
النشوز لیس فیہ حد مقدر	کسی ایسی معصیت کا ارتکاب کرے جس پر کوئی
فللزوج ان یؤدبھا تعزیرا	متعین حد نہیں ہے تو شوہر کو بطور تعزیر اس کی
لھا لان للزوج ان یعزر	تادیب کی اجازت ہے۔ کیونکہ شوہر کو اپنی
زوجتہ کما للمولی ان	بیوی کی تعزیر کا اسی طرح حق ہے جس طرح آقا
یعزر مملوکہ [4]	کو اپنے غلام کی تعزیر کا۔

(۵) بیوی کی تعزیر کی ایک حد ہے جسے حدیث میں 'ضربا غیر مبرح' [5] (ایسی مار جو سخت نہ ہو)
کہا گیا ہے۔ اس حد سے آگے بڑھنا شوہر کے لیے ناجائز ہے۔ 'ضربا غیر مبرح' کی تشریح میں
عبداللہ بن عباس رض فرماتے ہیں۔ مسواک یا اس جیسی کسی چیز سے مارنا ایک دوسری روایت میں ہے
ہیں کہ ایسی ضرب نہیں کہ جس سے اس کی ہڈی ٹوٹ جائے۔ قتادہ کہتے ہیں۔ "ایسی ضرب جس سے

---

[1] کنز الدقائق مع شرحہ البحر الرائق ج ۵ صفحہ ۴۰ [2] البحر الرائق ج ۵ صفحہ [3] ایضاً
[4] بدائع الصنائع ج ۲ صفحہ ۳۳۴ [5] مسلم، کتاب الحج، باب حجۃ النبی

کے جسم میں کوئی عیب نہ پیدا ہو[1] اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو بری طرح مار پیٹ دے تو خود اس کی تعزیر کی جائے گی۔

ادعت علی زوجھا ضربا	اگر عورت اپنے شوہر کے خلاف بری طرح
فاحشا وثبت ذالک علیہ	مار پیٹ کا دعوے کرے اور یہ ثابت ہو جائے
عزر[2]	تو اس کی تعزیر کی جائے گی۔

فقہاء احناف نے یہاں تک لکھا ہے کہ تعزیر کی وجہ سے عورت کی جان چلی جائے تو شوہر پر دیت واجب ہوگی[3]

(۶) بیوی اگر شوہر کے حقوق ادا نہیں کر رہی ہے تو شوہر کو اسے نصیحت کرنا چاہیے اور اگر نصیحت کارگر نہ ہو تو قرآن کی ہدایت ہے کہ وہ اپنا بستر اس کے بستر سے الگ کرلے۔ اگر اس سے بھی راہ راست پر نہ آئے تو شوہر اس کی تعزیر کر سکتا ہے۔ بیوی کی نافرمانی کے ساتھ پہلے ہی قدم پر اس کی تعزیر کا شوہر کو حق نہیں ہے[4]

(۷) بعض فقہاء کا خیال ہے کہ عورت کی تعزیر اسی وقت صحیح ہے جب کہ اس سے اس کی اصلاح کی توقع ہو۔ اگر اصلاح کی توقع نہ ہو، یا شوہر یہ سمجھتا ہو کہ بغیر سخت قسم کی سزا کے اس کی اصلاح نہیں ہو سکتی تو تعزیر کی اجازت نہیں ہے۔ ان دونوں صورتوں میں تعزیر شوہر کی زیادتی سمجھی جائے گی[5]

امر بالمعروف ونہی عن المنکر بہت وسیع کام ہے۔ اس میں پوری زندگی کی اصلاح شامل ہے۔ عقیدہ وعبادات کی بھی اور اخلاق ومعاملات کی بھی۔ اس کے مقابلے میں شریعت نے شوہر کو بیوی کی تعزیر کا جو حق دیا ہے وہ محدود ہے۔ اس سے وہ چند خاص شعبوں ہی میں بیوی کی اصلاح کر سکتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ بیوی اگر اس حد تک بگڑ جائے کہ وہ نہ صرف شوہر کو تکلیف دے اور اس کے حقوق نہ ادا کرے بلکہ حقوق اللہ کو بھی نظر انداز کر جائے اور احکام شرع کی خلاف ورزی کرنے لگے تو شوہر کو کیا کرنا چاہیے؟ اس کا مختصر سا جواب یہ ہے کہ ایسی بیوی کو طلاق دے دینا چاہیے۔ چنانچہ بحر الرائق میں غایۃ البیان کے حوالے سے لکھا ہے:۔

---

[1] جامع البیان فی تفسیر القرآن (ابن جریر) ج ۵ ص۴۱ [2] تنویر الابصار ج ۳ ص۲۶۲ [3] ہدایہ مع فتح القدیر ج ۴ ص۲۱۷ [4] بدائع الصنائع ج ۲ ص۳۳۴ [5] التشریع الجنائی ص۵۱۶-۵۱۷

یستحب طلاقہا اذا کانت	اس کا طلاق دینا پسندیدہ ہے جب کہ وہ بھاگا
سلیطۃ موذیۃ او تارکۃ للصلوٰۃ	کرتی اور تکلیف دیتی ہو، نماز چھوڑ دے اور
او تقیم حدود اللہ تعالیٰ[1]	حدود اللہ کو قائم نہ کرے ۔

علامہ عابدین نے اس پر اتنا اضافہ اور کیا ہے :۔

الظاہر ان ترک الفرائض	بظاہر نماز کے علاوہ دوسرے فرائض کا
غیر الصلوٰۃ کالصلوٰۃ[2]	چھوڑنا بھی نماز ہی کے چھوڑنے کی مانند ہے ۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ میرا خدائے تعالیٰ سے اس حال میں ملنا بہتر ہے کہ بیوی کا مہر میرے ذمے ہو، بمقابلہ اس کے کہ میں ایک ایسی عورت کے ساتھ زندگی گزاروں جو نماز نہ پڑھتی ہو۔[3]

عورت شوہر کی تابع اور محکوم ہے ۔ بقول امام غزالی شوہر کے مقابلے میں بیوی کی حیثیت ایسی ہی ہے جیسی کہ باپ کے مقابلے میں بچے کی ۔ اس لیے شوہر نادانستہ کسی منکر کا ارتکاب کرے تو بیوی اسے شریعت کا حکم بتائے گی اور جانتے بوجھتے وہ منکر کا ارتکاب کر رہا ہو تو اسے نصیحت کرے گی ۔ اس سے آگے ڈانٹ ڈپٹ یا مار پیٹ کا اس کو حق نہیں ہے ۔[4]

---

[1] البحر الرائق ج ۳ ص ۲۳۷　[2] ردّ المحتار علی الدر المختار ج ۲ ص ۵۷۲　[3] ایضاً یہاں اس بات کا ذکر بھی مناسب ہوگا کہ فقہائے احناف کے نزدیک راجح قول یہ ہے کہ نماز کے چھوڑنے پر شوہر بیوی کی تعزیر بھی کرسکتا ہے دیکھیے البحر الرائق ج ۵ ص ۴۹　[4] احیاء علوم الدین ج ۲ ص ۴۸

ہندو مذہب کا عقیدۂ وصال و تقرب

جناب سلطان مبین صاحب ایم اے

منتروں کے رشی یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ مردہ "یم راج" کی تحویل میں دے دیے جاتے ہیں۔ مردے "پتروں" کی صورت ہو کر دیوتاؤں کی ہم نشینی سے محظوظ ہوتے ہیں۔ "برہمنوں" میں یہی ہم نشینی و قربت اپنے طور پر مدلل و مبرہن کر کے پیش کی گئی۔ جو جس خداوند کی بندگی و اطاعت کرتا ہے وہ مرنے کے بعد اسی خداوند ملاح کا ہم ذات و ہم صفات ہو جاتا ہے۔ چنانچہ

"آگ ہی محیط ہے۔ آگ ہی ان مخلوقات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ یہ مخلوقات آگ ہی کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ جو شخص اس (رمز) کو جانتا ہے وہ آگ کا ہم ذات، ہم شکل ہم نشین ہو جاتا ہے۔ اتیرے برہمن ۶ : ۵ : ۳۲ سال ہی محیط ہے۔ سال ہی مخلوقات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ یہ مخلوقات سال ہی کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ جو شخص اس (رمز) کو جانتا ہے وہ سال کا ہم ذات، ہم شکل اور ہم نشین ہو جاتا ہے اتیرے برہمن : ۶ : ۵ : ۳۲ شت پتھ برہمن : ۱۲ : ۱ : ۳ (۱) جو یگیہ کے لیے چلہ کش ہوتے ہیں (گویا) آگ اور بشنو دیوتا کو نذر گزارتے ہیں وے آگ اور بشنو دیوتا ہو جاتے ہیں۔ آگ اور بشنو کے وصال و ہم نشینی کو جیت لیتے ہیں۔ (۳) اور جو ..... کرتے ہیں۔ (گویا) وے خداوند سوم کو نذر گزارتے ہیں۔ وے خداوند سوم ہو جاتے ہیں اور سوم کے وصال و ہم نشینی کو جیت لیتے ہیں۔ (۴) اور جو ..... سے نذر گزارتے ہیں (گویا) وے خداوند بشنو کو نذر گزارتے ہیں۔ خداوند بشنو ہو جاتے ہیں۔ بشنو کے وصال و ہم نشینی کو جیت لیتے ہیں۔ (۵) اور جو ..... سے نذر گذارتے ہیں (گویا) وے خداوند آفتاب کو نذر گزارتے ہیں خداوند آفتاب ہو جاتے ہیں۔ آفتاب کے وصال و ہم نشینی کو جیت لیتے ہیں۔ (۶) اور جو ..... کے پاس جاتے ہیں (گویا) ان سبھی دیوتاؤں کو نذر گذارتے ہیں جتنے "اپ" میں رہتے ہیں وے وہی خداوند ہو جاتے ہیں

ان خداوندوں کے وصال و ہم نشینی کو جیت لیتے ہیں۔ (۷) اور جو آگ رسوم کے موشتی سے نذر گذارتے ہیں۔ وے (گویا) خداوند آگ و خداوند سوم ہو جاتے ہیں۔ آگ اور سوم کے وصال و ہم نشینی کو جیت لیتے لیتے ہیں۔ (۸) اور جو ... کے پاس جاتے ہیں۔ (گویا) وے خداوند شب و روز کو نذر گزارتے ہیں وے خداوند شب و روز ہو جاتے ہیں۔ شب و روز کے وصال و ہم نشینی کو جیت لیتے ہیں۔ (۹) اور جو ۲۴ دن تک رہتا ہے۔ (گویا) وہ خداوند سال کو نذر گزارتے ہیں۔ وے خداوند سال ہو جاتے ہیں۔ سال کے وصال و ہم نشینی کو جیت لیتے ہیں۔ (۱۰) اور چھ دن تک ... کے پاس رہتے ہیں۔ (گویا) وے خداوند موسم کو نذر گزارتے ہیں وے خداوند موسم ہو جاتے ہیں۔ موسموں کے وصال و ہم نشینی کو جیت لیتے ہیں۔ (۱۲) اور جو ... کے نزدیک جاتے ہیں وے (گویا) خداوند آتش کو نذر گزارتے ہیں۔ وے خداوند آتش ہو جاتے ہیں۔ آتش کے وصال و ہم نشینی کو جیت لیتے ہیں۔ (۱۳) اور ... کا پاس کرتے ہیں (گویا) خداوند آب کو نذر گزارتے ہیں۔ وے خداوند آب ہو جاتے ہیں۔ آب کے وصال و ہم نشینی کو جیت لیتے ہیں۔ (۱۴) اور جو ... کا پاس کرتے ہیں (گویا) وے خداوند (آفتاب) آدتیہ کو نذر گذارتے ہیں وے خداوند آدیتہ ہو جاتے ہیں۔ آدیتہ کے وصال و ہم نشینی کو جیت لیتے ہیں۔ سور سام کا ذکر ہو چکا۔ (۱۵) اور جو ... پاس کرتے ہیں (گویا) وے خداوند اندر کو نذر گزارتے ہیں۔ وے خداوند اندر ہو جاتے ہیں۔ اندر کے وصال و ہم نشینی کو جیت لیتے ہیں۔ (۱۶) اور جو ... کا پاس کرتے ہیں (گویا) وے خداوند متر و ورن کو نذر گزارتے ہیں وے خداوند متر و ورن ہو جاتے ہیں۔ متر و ورن کے وصال و ہم نشینی کو جیت لیتے ہیں۔ (۲۱) اور جو "مہابرت" کا پاس کرتے ہیں (گویا) وے خداوند پرجاپتی کو نذر گزارتے ہیں۔ وے خداوند پرجاپتی ہو جاتے ہیں۔ پرجاپتی کے وصال و ہم نشینی کو جیت لیتے ہیں۔ شت پتھ برہمن : ۱۲ : ۱ : ۳ : ۱ — ۱۶، ۲۱ دیگر

یوگی نہ بہت زیادہ کھاتا ہے نہ بہت کم کھاتا ہے۔ نہ بہت زیادہ سوتا ہے نہ بہت زیادہ جاگتا ہے۔ مناسب کھانے پینے والے، چلنے پھرنے والے، مناسب محنت کرنے والے، مناسب سونے جاگنے والے کا یوگ دکھوں کو ختم کر دیتا ہے۔ انسان اسی طریقے سے وصال و تقرب کو پا لیتا ہے۔ اپنی وفاشعاری سے خداوند کی طرح ہو کر وصال و تقرب سے بہرہ ور ہوتا ہے۔ دیری یکسوئی سے ہمیشہ لو لگانے سے یعنی کوشش کرنے سے بہت دنوں کے بعد انسان خداوندوں کے وصال کو پاتا ہے چڑھاوے

پوجا سے ہوم سے سجدہ کرنے سے ہمیشہ سوچتے رہنے سے حسب استطاعت پوجا کرنے سے انسان اپنے خداوند مطلوب سے جا ملتا ہے ۔ حسین آنکھوں والی! میرا (مہادیو) اور وشنو کا وصال و تقرب سبھی وصالوں اور تقربوں سے بڑھ چڑھ کر ہے ۔ مجھ اور وشنو کو پا کر لوگ نہیں لوٹتے ہیں ۔ مہابھارت : انوشاسن : د ۲۴۳ سنسکرت ایڈیشن طبع اول ۔ گیتا پریس ۔ گورکھپور ۔

قدیم ہندوستان کے کالے لوگ شجر و حجر ، مار و ماہی ، گاؤ و خوک کی الوہیت کے قائل تھے ۔ نو وارد گورے رشی حضرات آگ پانی ، برق و باد ، مہر و ماہ ، روز و شب ، ماہ و سال ، زمین و آسمان کی الوہیت کے معتقد تھے ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انسان کبھی مسند خداوندی پر نہیں بیٹھ سکے گا ۔ اور یہ بدنصیب ہمیشہ محروم الوہیت رہے گا ۔ تاہم غیر متوقع طور پر برہمن ادب میں وصال کے رجحان نے مردم پرستی کے دروازے کو کھول دیا ۔

جس زمانے میں مہاتما گوتم بدھ نے تبلیغ و دعوت کا کام شروع کیا ۔ اس زمانے میں وصال و تقرب کا عقیدہ برہمن حلقوں میں بڑا مقبول تھا ۔ آں جناب نے جا بجا اسی عقیدے کی تردید و اصلاح کی ہے ۔ بعد میں برہمن فلسفیوں نے اساطیر نویسوں ، اور صوفیوں نے اس عقیدے کے بل پر بڑے بڑے مسئلوں کا حل پیش کیا ۔ رسم و رواج مدلل کیا ۔ خداوند کے بھگتوں اور دشمنوں دونوں کو خدا رسیدہ اور پہنچا ہوا بتایا ۔ دھیان و گیان کے نادر و حیرت انگیز اثرات بتائے ۔ عقیدۂ وصال کی ہمہ گیر مقبولیت و وکالت نے برہمنی مذہب پر بڑے دور رس اثرات ڈالے ۔ برہمنی دستور زندگی کے وسیع علاقے کو اپنی "چھتر چھایہ" میں لے لیا ۔

نظریۂ وصال و تقرب کی اثر آفرینی

جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے کہ برہمن گرستھوں نے یہ بات بتا دی تھی کہ انسان جس خداوند کو نذر گزارتا ہے اس کا ہم ذات و ہم صفات ہو جاتا ہے ۔ اس خیال و عقیدے کو رکھنے والے مفکرین نے جب غور و فکر شروع کیا ہوگا ۔ تو بہت جلدی اس نتیجے پر پہنچ گئے ہوں گے کہ بندے اور خداوند ، عبد اور معبود ہم جوہر ہم اصل ہیں چنانچہ بندگی اور عبودیت کا رشتہ دھیرے دھیرے کٹتا رہا ۔ یہاں تک کہ برہمن صوفیا اور متکلمین کو آمد یا آورد کے طور پر ایک مثال ایک نظیر ہاتھ لگی ۔ انھوں نے دیکھا کہ بھڑ ، مکڑی اور بلڈی بچوں کو لا کر مٹی کے خانوں اور غلافوں میں جمع کرتی جاتی ہے ۔ چند دنوں کے بعد انہیں مٹی کے غلافوں سے بہت سی بھڑیں نکل آتی ہیں ۔ ان کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ مکڑیاں یا بڈے بھی "سمادھی" (مراقبہ) کی

سے بھڑ (ملنی) کی شکل میں بدل جاتے ہیں[1]۔ مکڑی پر بھڑ کا خوف سوار ہو جاتا ہے۔ مکڑی مٹی کی کوٹھڑی میں بند بند "بھڑ" ہی کے بارے میں مسلسل سوچتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ خود ہی بھڑ ہو جاتی ہے۔ ٹھیک انسان بھی اسی طرح جس دیوتا جس بھگوان و خداوند کا محبت یا عداوت سے مسلسل تصور کرتا ہے وہ وہی دیوتا وہی بھگوان و خداوند ہو جاتا ہے۔

کرشن کے دشمن راجاؤں کے پہلے کے گناہ ختم ہو گئے اور آخر میں۔ خول کے کیڑے کی طرح۔ کرشن کے ہم ذات ہو گئے۔ بھاگوت: ۱۷ : ۱۰ : ۳۹

سادھوں کا سوانگ اور ریلا کے کردار میں کی الوہیت

جب یہ بات مدلل ہو گئی کہ مراقبے سے انسان خداوند کا ہم ذات اور ہم صفات ہو جاتا ہے تب یہ رجحان اتنا ترقی یافتہ ہو گیا کہ ہر عارف خود فریبی میں مبتلا ہو کر میں خداوند ہوں (اہم برہم۔ انا الحق) میں خداوند ہوں کہہ کہہ کر خدا ہونا چاہتا تھا۔ "میں خداوند ہوں" یہ فلسفہ کا مسئلہ نہیں بلکہ یہ عارف کا ذکر وظیفہ اور مراقبہ ہے "خداوند ہوں" کے ذکر و فکر سے عارف انسانیت سے الوہیت کی منزل کو پہنچتا ہے۔ سادھو ہوتے وقت نیا سادھو کہتا تھا "شیوو اہم شیوو اہم" (شیوام شیوام۔ انا شیو۔ انا شیو ہوں) تاکہ مرنے کے بعد شیو ہو جائے۔ اس خیال سے شیوجی کا سوانگ بھرتا ہے جٹا رکھتا ہے۔ ترشول رکھتا ہے جسم پر راکھ ملتا ہے۔ مہا دیوجی کی یہ نقل اس لیے پابندی سے بجا لاتا ہے کہ وہ اس مسلسل شیوجی کی نقل و شکل سے "شیو" ہو جائے۔ تارک الدنیا ہی میں نہیں بلکہ دنیا داروں میں بھی یہ رجحان گھر کرنے لگا۔ چنانچہ بیاہ کے وقت کے رسوم و ملفوظات یہ بات واضح کرتے ہیں کہ دلہا "بشنو" اور دلہن "لکشمی" اور یقیناً "شیو" (مہا دیو کو ماننے والے) لوگ ہر مرد کو مہا دیو اور ہر عورت کو پاربتی سمجھتے تھے۔ رام لیلا و راس لیلا میں سوانگ بھرنے والے لڑکے لڑکیوں کو رام، سیتا کرشن و رادھا سمجھا جاتا تھا ٹھیٹروں میں رام وغیرہ کے کردار کے سامنے ناظرین تعظیماً کھڑے ہو جاتے تھے۔ راس لیلا کے موقع پر ہر خانہ کرشن و رادھا کی آمد پر تعظیماً کھڑا ہو جاتا تھا۔ آج بھی رام لیلا میں رام کے کردار کو پھول بتاشے چڑھایا جاتا ہے۔ کیونکہ ذکر و فکر اور تشبیہ و نقل سے انسان خداوند ہو جاتا ہے۔

---

[1] حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ بھڑ وحی الہیٰ سے کڑی اور ٹڈوں کو ڈنک مار کر بے ہوش کر دیتی ہے اور ان کو مٹی کے خول میں اسٹور کر کے انڈے دے دیتی ہے۔ خول کے اندر انڈے سے بچے نکل کر مکڑی اور ٹڈے کے تازہ گوشت کو کھا کر "لاروا" پیوپا کے مدارج طے کر کے بتدریج کر خول سے باہر نکل آتے ہیں۔

انتہا اخلاق ہے یعنی یہ کائنات سراسر خداوند ہے۔ انسان کو اس کا برملا اقرار کرنا چاہیے۔ اسی پر ایمان رکھنا چاہیے۔ ہر شے کو خداوند سمجھ کر برتنا چاہیے۔ معاملات میں ہر شخص کو خداوند سمجھ کر سلوک کرنا چاہیے۔ بڑی بلند آہنگی سے اس نظریے کے استیلا کی کوشش کی گئی۔ "عارف باعمل' عالم برہمن اور چنڈال کو ہاتھی' گائے اور کتے کو برابر سمجھتا ہے۔ گیتا: مہابھارت: بھیشم: ۲۹: ۱۸۔ مگر چونکہ یہ نظریہ سراسر خلاف فطرت ہے اس لیے عوام کے سامنے اس کو رکھنے کی جرات نہیں کی گئی۔ اس لیے عوام تو بدترین شرک و مظاہر پرستی میں آلودہ و غرق رہے اور خواص اپنے کو خداوند سمجھتے رہے۔ عوام چونکہ اپنی نذر و نیاز کے لیے برہمنوں کی طرف رجوع کرتے تھے اس لیے دھیرے دھیرے عوام یہ سمجھنے لگے کہ یہ لوگ خداوند کی نزدیکی میں مقرب ہیں۔ ادھر برہمن عرفان کے سبب سے اپنے کو خدا سمجھ ہی رہا تھا۔ اور یہ دعوا نہ دیکھا بھی تھا کہ خداوند و دیوتا لوگ محض ہمارے ہی ہاتھوں سے روزی پاتے ہیں۔ اگر ہم ان کو نذر و نیاز نہ چڑھاویں تو دیوتا بے چارے بھوک پیاس سے لاغر و ناتواں ہو جائیں گے۔ کیونکہ جاہل عوام دیوتاؤں کی میزبانی کے آداب سے یکسر کورے و ناآشنا ہیں۔ بس ہم ہیں کہ دیوتا ہمارے دست نگر ہیں اور عوام ہماری دعاؤں کے محتاج ہیں۔ خداوندیوں کے ذکر و وظیفہ نے برہمنوں کے دلوں سے خداوندی عزت و عظمت کو کم تر کر دیا تھا۔ عوام اپنی ہر مصیبت و ضرورت پر برہمنوں کی قدمبوسی کے لیے لاچار تھے۔ پس برہمنوں کے پندار کا کیا پوچھنا ایک طرف تو وہ گیان و عرفان کے پندار سے سرشار تھے۔ دوسری طرف اقتدار تقدس و احترام سے ان کا پیر زمین پر نہیں پڑتا تھا۔ انھوں نے اپنی خداوندی کا سربازار اعلان کر دیا چونکہ دھرم و دھان۔ دستور دین۔ انہیں کے ہاتھوں میں تھا اسی لیے انھوں نے اپنی خداوندی کی دفعات کا ہر کتاب میں ذکر کیا۔ چنانچہ

(۸۷) پڑھانے' یگیہ کرنے اور دوسروں سے خیرات لینے سے برہمن میں ناپاکی نہیں آتی۔ کیونکہ برہمن جلتی ہوئی آگ کی طرح ہے۔ (۸۸) جاہل یا عالم' غیر مہذب یا مہذب برہمنوں کو کم تر نہیں سمجھنا چاہیے راکھ میں چھپی ہوئی آگ کی طرح۔ (۸۹) جس طرح مرگھٹ پر جلنے والی آگ ناپاک نہیں ہوتی۔ کیونکہ برہمن یا جاہل برہمن بڑے خداوند ہیں۔ مہابھارت: بن: ۲۰۰: ۸۷-۸۹ وغیرہ

(۱۴) برہمن کے لیے چندن اور گندگی کھانا و نہ کھانا برابر ہیں۔ ان کے لیے چادر کپڑا یا ہرن کی کھال یکساں ہے۔ (۱۵) برہمن بہت دنوں تک بغیر کھانا کھائے رہ سکتے ہیں۔ شرمگاہوں کی حفاظت کرتے

انوشاسن ۹۱: ۲۲، ۲۳، ۹۴، ۹۶

اس تقرب ووصال کے عقیدے نے سبب سے آگ و پانی میں خودکشی کرنے والے شخص کو نجات یافتہ
ہوئے تلاوتوں اور مطالعوں سے ہاتھ پاؤں کو سکھا دیتے ہیں۔ (۱۶) برہمن غیر خدا کو خدا بنا دیتے ہیں
اور خدا کو غیر خدا بنا دیتے ہیں اور غصہ میں آجانے پر برہمن دوسری دنیاؤں اور رب (ارباب) کائنات
کو پیدا کر دیتے ہیں۔ (۱۷) ان (برہمن) بزرگوں نے بددعا سے سمندر کو کھاری بنا دیا ہے جن کے
غصہ کی آگ آج بھی "دنڈک" کے علاقے میں جل رہی ہے۔ (۱۸) یہ خداوندوں کے خدا ہیں اور مسبب
الاسباب ہیں اور دلائل کی سند ہیں۔ کون ان عقلمندوں کو زیر کر سکتا ہے۔ (۱۹) جن کا بوڑھا اور بچہ
ہر ایک عزت کا مستحق ہے۔ یہ لوگ آپس میں علم و ریاضت کے امتیاز سے احترام کرتے ہیں۔ (۲۰) ہر
برہمن بھی خداوند اہل اور بہت پاک ہے۔ عالم برہمن بھرے ہوئے سمندر کی طرح خداوند برتر ہے
(۲۱) جاہل یا عالم برہمن خداوند بزرگ ہے جیسے کہ مقدس کی ہوئی یا مقدس نہ کی ہوئی آگ بہرحال
خداوند بزرگ ہے۔ (۲۲) روشن آگ مرگھٹ پر بھی ناپاک نہیں ہوتی۔ آگ کا گھر پر یگیہ میں روشن ہونا
تو نور علی نور ہے۔ (۲۳) اسی طرح سے برہمن گرچہ سبھی برے کاموں میں آلودہ ہو تو بھی وہ ہر طرح
معزز و محترم ہے۔ اس کو خداوند بزرگ جانو۔ مہابھارت: انوساسن: ۱۵۱: ۱۴-۲۳۔ دیکھ
آپ نے نظریہ وصال و تقرب نے ایک طبقہ کی خداوندی کا جھنڈا گاڑ دیا ہے جو آج تک لہرا رہا ہے۔

۳۔ الوہیت راجگان

یقیناً قدیم ہندوستان میں راجاؤں کی الوہیت کا عقیدہ موجود تھا
یہاں تک کہ ہم آخری مغل بادشاہوں کے زمانے تک عوام کو صبح صبح بادشاہ
کا درشن کرتے ہوئے پاتے ہیں اور مقدس ادب میں اس کے بکثرت شواہد موجود ہیں۔ شاید نظریہ وصل و تقرب
سے اس عقیدے نے اپنی غذا لی ہے۔ راجاؤں کی الوہیت یا تو باہر سے درآمد ہے یا برہمنوں نے
راجاؤں سے خوش ہو کر ان کو بھی "الوہیت میں سے حصہ بخشا ہے۔

راجہ۔ سوم، آگ، سورج، ہوا، اندر، کبیر، ورن، یم راج۔ آٹھ خداوندان جہاں کے جسم کو
رکھتا ہے۔ منو: ۵: ۹۶ وغیرہ

(۳) اس جہان کے لوگ راجہ نہ ہونے پر خوف سے بھاگ رہے تھے کہ رب کی حفاظت کے
لیے خداوند نے راجہ کو پیدا کیا۔ (۴) اندر، ہوا، یم راج، سورج، آگ، ورن، چاند اور کبیر کے اجزاء

برہمنوں کی الوہیت انا الحق (میں خداوند ہوں) یہ فلسفہ کا مسئلہ نہیں، بلکہ یہ اظہار حقیقت ہے نفس الامریت ہے۔ ذکر زندگی ہے فکر زندگی ہے۔ مدار اخلاق ہے، ابدیہ کو لیبکر (خداوند نے راجہ کی تخلیق کیا) چونکہ راجہ ان خداوندوں کے اقنوم سے بنایا گیا ہے اس لیے جملہ مخلوقات کو یہ اپنے جلال سے زیر کر دیتا ہے۔ (۶) راجہ سورج کی طرح آنکھ اور دل کو چکا چوند کر دیتا ہے۔ زمین میں کوئی بھی راجہ کو بھرپور دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ (۷) راجہ اپنی تاثیر سے آگ، ہوا، سورج، چاند، یم راج، کبیر، برن اور اندر ہوتا ہے۔ (۸) کم سن (بچہ) راجہ کو انسان سمجھ کر چھوٹا نہیں سمجھنا چاہیے۔ یہ انسان کی شکل میں خداوند بزرگ ہوکر قائم ہے (منو: ۷: ۳-۸)

۴۔ مردوں کو آگ میں جلانا تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ یونان و ہند کے آرین کم و بیش اپنے مردوں کو آگ میں جلاتے تھے۔ ہندوستان میں آگ کو "نذر بردار" ماننے کے عقیدے نے "مردہ سوختنی" کے رجحان کو خاطر خواہ ترقی دیا۔ پھر نظریہ "وصال و تقرب" کی دیا نت نے مردہ سوختنی کے رواج پر صیقل کر دیا۔ حتیٰ کہ عقل پرست لوگ بھی یہ سمجھ کر مطمئن تھے کہ ہرچہ در کان نمک رفت نمک شد کی طرح، ہرکہ در آتش رود آتش شود بھی ایک صداقت اور ہے۔ آگ میں خودکشی کرنا بھی اس نظریہ وصال و تقرب کی رو سے ایک امر مستحسن ٹھہرا۔ دانش و تعقل کی سرزمین ہند میں ان مسائل پر کسی سرزنش کا وجود کیا امکان بھی نظر نہیں آتا۔

۵۔ مردوں کو پانی میں ڈالنا ندیوں کی الوہیت کے موجود رہنے پر "وصال و تقرب" کے نظریہ کو بھلا کون محدود و محصور کر سکتا تھا۔ عوام مردوں کو ندیوں میں ڈالنے لگے اور بہت خوش بھی تھے کہ اس طرح مردہ ندیوں کی سرزمین قدس میں پہنچ جاتا ہے۔ گویا آگ کی طرح پانی بھی نجات کا ایک دروازہ ہے۔

آدمی کی ہڈی جتنے سال تک گنگا کے پانیوں میں رہتی ہے، اتنے ہزار سال وہ آدمی سورگ میں جلوہ افروز ہوتا ہے۔ مہابھارت: انوشاسن: ۲۶: ۳۲

زندگی میں گنگا کے تقرب و وصال سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

(۶۲) آدمی گنگا دیکھ کر، چھوکر، نہاکر سات اگلی سات پچھلی پیڑھیوں کو نجات دلواتا ہے۔ (۶۴) دیکھنے، چھونے، پینے اور گنگا گنگا کہنے سے ہزاروں سیکڑوں گنہگاروں کو (گنگا) پاک کر دیتی ہے۔ مہابھارت

خدا رسیدہ سمجھا جاتا تھا۔

دودھ والی، گھی والی، بڑی بزرگ مالامال، تیز گنگا میں جا کر جو لوگ اپنے جسم کو چھوڑتے ہیں وہ صاف فراست لوگ خداوندوں کے برابر ہو جاتے ہیں۔ مہابھارت: انوشاسن: ۲۶: ۸۲

نکتہ وحدت ادیان کے قائلین گرفتار سراب ہیں یا مصلحت پرست ہیں جو باہم متغایر مذاہب کو ہم رنگ وہم مزاج کہتے ہیں۔ مذاہب کی سرزمین میں تو ہر عقیدہ الگ الگ اثر و تاثیر رکھتا ہے۔ عقیدہ اگر باہم مماثل ومشابہ ہیں اگر ان کی تعبیر متبائن ہے تو ان کے اثرات بھی اتنے مختلف و متنوع ہیں کہ معمولی فہم کا انسان بھی سمجھ سکتا ہے۔ اگر عقیدہ ایک ہے مگر اس کا رجحان تو ان کے اثرات و نتائج باہم متضاد ومتناقض ہو جاتے ہیں۔ پارسی مذہب اور برہمنی مذہب باہم توام مانے جاتے ہیں۔ رگ وید اور اوستا کے خداوندوں کے اسماء وآداب میں حیرت انگیز مشارکت ومشابہت ہے دونوں عناصر کی الوہیت کے قائل ہیں۔ دونوں زمین پانی آگ کو خداوند سمجھتے ہیں۔ پارسی مذہب زمین پانی اور آگ کی الوہیت کو ایمان داری کے ساتھ نبھاتا ہے۔ برہمنی مذہب تقرب والوہیت کے رجحان سے زمین، پانی و آگ کی الوہیت کا حصہ دار و شریک بن جاتا ہے اور شریک بن کر حریف ہو کر ان کی الوہیت کو بھی چیلنج کر دیتا ہے۔ جب یہ صورتِ حال ہو تو اگر برہمنی ان کو آلودہ و ناپاک کر دے یا ان کی گردن پر سوار ہو جائے تو بسا تعجب نہیں۔ پارسی و برہمن دونوں مردہ کی نجاست کے قائل ہیں۔ پارسی مذہب زمین، پانی آگ کے تقدس کو میت کی آلائش سے ملوث نہیں کرتا رکھی زمین، پانی، آگ میں مردہ رکھنا ان کے یہاں گناہ عظیم ہے۔ مگر برہمنی مذہب پانی اور آگ میں مردے کو ڈالنے کو فوز وفلاح نجات و مکتی کا سبب سمجھتا ہے

۱۰۔ شوہر کی الوہیت و رسم ستی شدن

برہمنوں نے "نظریہ وصال وتقرب" سے ایک طرف باہر کی دنیا کو اپنا بندہ بنایا تو دوسری طرف انھوں نے اپنے گھر میں رہنے والی بیویوں کو بھی باندی بنایا۔ اور یہ تاثر دیا کہ بیوی اپنے شوہر کا ہمیشہ دھیان رکھے اگر وہ اس دنیا میں معیت کا حق ادا کر لیتی ہے تو لازماً دوسری دنیا میں وہ اپنے شوہر کی ہم نشینی کے شرف سے نوازی جائے گی۔ چنانچہ عورت کو دیوی دیوتاؤں کی پوجا کی ضرورت نہیں ہے بس اس کو اپنے "پتی دیو" (خداوند شوہر) کی خدمت کرنی چاہیے۔

(۳۵۱) منتر پڑھ کے نور یعقد ہونے کے سبب سے شوہر ایام وغیر ایام میں اس دنیا اور آخرت

میں بیوی کے آرام کا سبب ہے۔ (۱۵۴) شوہر بھلے ہی بدچلن اور آوارہ ہو، اچھائیوں سے خالی ہو مگر بھلی بیوی کو چاہیے کہ ہمیشہ شوہر کی۔ خداوند کی طرح۔ بندگی کرے۔ (۱۵۵) عورتوں کے لیے الگ یگیہ، برت اور روزہ نہیں ہے۔ جو کچھ شوہر کی خدمت کرتی ہے اس کے سبب سے جنت میں سرفراز ہوتی ہے۔ منوسمرتی: ۵: ۱۵۴: ۱۵۵ دیگر

(۳۶) وہی عورت مذہب پرست ہے، وہی عورت دین دار ہے جو سیدھی سادگی ہمیشہ شوہر کو "خداوند" کی طرح دیکھتی ہے۔ (۳۷) پاک بازی اور خوشی سے جو عورت شوہر کی بندگی اور خدمت "خداوند" کی طرح کرتی ہے وہی برت والی اور سرخ رو ہوتی ہے۔ (۴۰) نیک بیوی ہمیشہ شوہر کو "خداوند" کی طرح دیکھتی ہے۔ یہی میاں بیوی کا مبارک ساتھ رہنے کا دھرم ہے۔ (۴۳) وہی بیوی مذہب پر چلنے والی ہے جو شوہر کے علاوہ سورج چاند اور مذکر نام درخت کو بھی نہیں دیکھتی۔ (۴۴) جو عورت غریب مریض، کمزور، ماندہ، عاجز شوہر کی خدمت "لڑکے" کی طرح وہی عورت دین دار ہے۔ (۵۵) شوہر ہی عورتوں کے خداوند ہیں۔ شوہر ہی (حقیقی) رشتہ دار ہے۔ شوہر ہی نجات ہے۔ شوہر سے بڑھ کر عورتوں کے لیے نجات نہیں۔ شوہر تو خداوند جیسا ہے۔ مہابھارت: انوشاسن: ۴۶: ۳۶۔ ۵۵

یہ ہدایات "شوہر پرستی" کے لیے بہت ہیں۔ اب یہ سوال رہ جاتا ہے کہ عورت دین دار جنتی ہے اور شوہر گنہگار دوزخی ہے تو پھر کیا بنے گا؟ بیوی کو شوہر کی معیت سے تو خواہ مخواہ تکلیف ہوگی۔ اس کا جواب شاستروں کی زبان سے سنیے۔ (۱۲) عورت شوہر کے جلنے مرنے پر بھلائی کرتی ہے۔ (۱۳) سچی پاکباز عورت زندہ رہ کر شوہر کو نجات بخشتی ہے۔ سپیرا جس طرح بل سے سانپ کو نکال لیتا ہے۔ (۱۴) اسی طرح پاک باز عورت شوہر کے ساتھ جلنے (ساتھ جلنے سے) شوہر کو دوزخ سے نکال لیتی ہے۔ گرڈ پران: پریت کلپ: ۱۴: ۱۲۔ ۱۴ (۱۵) لڑکے، پوتے کو چھوڑ کر جو عورت اپنے شوہر کے ساتھ جل مرتی ہے وہ مرکر مدت مذکور (۳ کروڑ سال) تک سورگ بھی رہتی ہے۔ (۱۶) بہت سے گناہ کرنے اور ہمیشہ شوہر سے حسد رکھنے کے باوجود بھی وہ عورت اپنے شوہر کے ساتھ جل مرنے سے سب گناہوں کو دھو دیتی ہے۔ (۱۷) گر شوہر بڑا گنہگار، بدنسل اور بدچلن ہو تو بھی "ستی عورت" سب گناہوں کو نیست و نابود کر دیتی ہے۔ گرڈ پران: پریت کلپ: ۲۸: ۱۵۔ ۱۷

صحبت اولیاء: جب آگ، پانی اور مردہ کی ہم نشینی و پناہ گزینی سے نجات پالیے [illegible]

موجود ہو تو بزرگوں کی صحبت و معیت کے اثر و فیض کو کون جھٹلا سکتا تھا۔ یہاں کہیں بھی یہ خیال نہیں پیدا ہوسکا کہ قابل کی استعداد و صلاحیت کو بھی معلول کی وجود پذیری میں بڑا دخل ہے۔ یہاں مہابھارت کے ایک قصہ کا اقتباس پیش کیا جارہا ہے جس سے اندازہ ہوگا کہ مہاتماؤں کی تاثیر صحبت خارج میں کسی قبولیت سے مشروط نہیں ہے۔ (۱۵) مچھلی کے طالب مچھیروں نے گنگا اور جمنا کے پانی پر بڑی چالاکی سے جال پھیلا دیا۔ (۱۶) ان کا جال نو دھاگے سے بنا ہوا، لمبا چوڑا اور خوب بڑا تھا۔ اس کو انھوں نے پانی میں ڈال دیا۔ (۱۷) تب سب کے سب پانی میں اتر کر بڑے مضبوط پھیلے ہوئے جال کو کھینچنے لگے۔ (۱۸) انھوں نے بے خوف و خطر خوش خوش باہم مل جل کر مچھلیوں اور دوسرے آبی جانداروں کو باندھ لیا۔ (۱۹) مہاراجہ! انھوں نے خواہ مخواہ مچھلیوں سے گھرے ہوئے بھرگو کے صاحبزادے چیون کو جال کے ذریعے کھینچ نکالا۔ (۲۰) چیون کا جسم ندی کی گھاس سے بھرا ہوا تھا۔ مونچھ داڑھی اور جٹا ہری ہری تھی۔ گھونگھے اور سنکھوں کے سینے پر انوکھے ہار کی طرح دکھائی پڑتے تھے۔ (۲۱) مچھیروں نے آن جناب' وید کے عالم۔ کو جال سے نکالا ہوا دیکھ کر ہاتھ جوڑ کر زمین پر سروں کو رکھ کر سجدہ کیا۔ (۲۲) تکلیف سے' خوف سے' جال میں گھسیٹے جانے سے اور خشکی میں آجانے کے سبب سے مچھلیاں مردہ ہوگئیں۔ (۲۳) ان منی نے جب مچھلیوں کی تڑپتے دیکھا تو وہ رحم سے بھر گئے اور بار بار ٹھنڈی سانس لینے لگے۔ مچھیروں نے کہا (۲۴) ہم نے نادانستہ یہ گناہ کردیا ہے۔ ہم پر رحم فرمائیں۔ مہامنی! ہم آپ کی کیا خدمت کریں۔ (۲۵) ایسا کہے جانے پر جناب چیون نے مچھلیوں کے درمیان ہی میں سے فرمایا۔ آج میرے ارادے کو تم سب اچھی طرح سنو۔ (۲۶) میں آج مچھلیوں کے ساتھ اپنی جان کو گنوا دوں گا۔ پانی میں ساتھ رہنے والی مچھلیوں کی مفارقت میرے لیے ناقابل برداشت ہے۔ مہابھارت: انوشاسن ۵۰۔ ۱۵۔ ۲۶

مچھیروں نے کہا۔ (۳۵) مہامنی! ہم نے آپ کا درشن کیا۔ آپ سے بات چیت کی۔ شریفوں کے ساتھ محض سات قدم چلنے سے دوستی ہوجاتی ہے۔ ہم پر آپ نوازش فرمائیں۔ (۳۶) آگ جیسے سب چڑھاؤں کو کھا ڈالتی ہے اسی طرح آپ روشن ضمیر انسانوں میں آگ کی طرح ہیں۔ دھرماتما! (۳۷) عالم! ہم سجدہ کرتے ہوئے آپ کو خوش کرنا چاہتے ہیں۔ چیون نے کہا۔ (۳۸) کنجوس سانپ اور منی کی آنکھ انسان کو پورا پورا جلا ڈالتی ہیں۔ جیسے آگ تنکے کو۔ (۳۹) مچھیرو! میں تمہاری طرف کو

قبول کرتا ہوں۔ تمہارے گناہ ختم ہو گئے۔ پانی میں پیدا ہونے والی مچھلیوں کے ساتھ تم سب جنت کو جاؤ (۴۶) مچھلیاں اور مچھیرے جنت کو چلے گئے۔ مہابھارت: انوشاسن: ۵۱: ۳۵-۳۹، ۴۶

خدا دشمن و خدا دوست یکساں چونکہ یہ تسلیم کر لیا گیا تھا کہ مہاتماؤں کا فیض ہر کس و ناکس کے لیے یکساں مؤثر ہے۔ بس یہ بات بھی مان لی گئی کہ بھگوان لشنو کے دشمن۔ راون ہرناکشیپ، کنس، پوتنا وغیرہ سورگ لوک کو گئے۔ یہ بڑی عجیب بات ہے۔ اساطیر نویسوں نے خداوند سے محبت کرنے والے اور اس سے نفرت کرنے والے دونوں کو ناجی قرار دیا۔ (۴۸) ششوپال، پونڈرک، شالو وغیرہم راجہ جو کرشن سے دشمنی کرتے تھے۔ وے کرشن کی رفتار روا دار کے تصور باندھتے تھے۔ بیٹھتے لیٹتے کرشن کی صورت شکل کو ذہن نشین کیے ہوئے تھے۔ وے اسی کرشن کے ہم ذات ہو گئے۔ پھر بھگتی کرنے والوں کا کیا پوچھنا۔ بھاگوت: ۱۱: ۵: ۴۸

(۳۸) کرشن نے جس شیطانہ کے پستان کا دودھ پیا تھا وہ "ماں کے انجام" جنت کو پہنچی۔ تو پھر گئو ماتاؤں (مادران گاؤ) کا کیا کہنا! بھاگوت: ۱۰: ۶: ۳۸

بگلا شیطان کی بہن "بکی" نے قتل کے ارادے سے پستان پر زہر لگا کر جس کرشن کو پلایا تھا اسی کرشن نے اس کو جنت میں مقام مادری دیا۔ تو ایسے کرشن کو چھوڑ کر میں کسی دوسرے رحیم خداوند کی پناہ لوں۔ بھاگوت ۳: ۲: ۲۳

۸۔ **استخفاف معاصی** دھیرے دھیرے یہ خیال پختہ ہوتا چلا گیا کہ بالقصد یا بغیر قصد "نارائن" "ہری" کا نام لینے سے جملہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ خداوند کے نام کو تیز دوا کی طرح اثر انداز مان لیا گیا۔ نام کو پارس پتھر کی طرح موثر تسلیم کر لیا گیا جو ہر طرح کے لوہے کو۔ قصاب کی چھری کو اور منڈے کے لوہے کو سچے سونے میں بدل دیتا ہے۔

(۱۸) دانستہ یا نا دانستہ خداوند کا پاک نام لینا انسان کے گناہوں کو جلا ڈالتا ہے جس طرح آگ ایندھن کو جلا ڈالتی ہے۔ (۱۹) تیز دوا خواہ مخواہ۔ اثر نہ جاننے والے کے مرض کو ختم کر دیتی ہے۔

لہ کرشن جی نے ان راجاؤں کو اپنے دست خاص سے قتل کیا ہے جس کو آں جناب نے چھپایا ہو کے اس کے انجام کا کیا پوچھنا۔ تقابل۔ رام چندر جی "اہلیہ" کو چھو کر نجات دیا۔ سہ پوتنہ راکشسی نے کرشن کے قتل کی نیت سے ان کو زہر آلود پستان پلایا تھا۔ آں جناب نے دودھ کے ساتھ اس کی جان لے ڈالی

اسی طرح منتر مذکور ہی ۔ بھاگوت: ۶ : ۲ : ۱۸

ہندو عوام میں "نام" کی تاثیر کا عقیدہ کبیر داس و سور داس کے زمانے تک علیٰ حالہ مقبول مسلم رہا ہے ۔

آدی نام پارس اسے من ہے میلا وہ ۔۔۔ نام ہے پارس دل ہے لوہا
پرست من کنچن بھئو چھوتا جیون سدہ (کبیر) ۔۔۔ کہتے ہی دن ہوتا سونا

دیگر
اک لوہا پوجا میں راکھت ۔۔۔ اک لوہا مندر میں رہتا
ایک گھر بدھک پرو ۔۔۔ ایک قصائی ہاتھوں پڑتا
پارس گن اوگن نہیں جانت ۔۔۔ پارس ان کو جیوں ہی چھوتا
کنچن کرت کھرو ۔۔۔ ان کو سچا سونا کرتا
ایک ندیا اک نار کہاوت ۔۔۔ ایک ندی ہے ایک نالا
میلو نیر بھرو ۔۔۔ پانی بہتا ہے کالا
جو دو دل ایک برن بھئو ۔۔۔ دونوں مل کر اجلا ہوتے
سرسری نام پرو ۔۔۔ ہم بھی اس کو گنگا کہتے

(سُور)

تاثیر بلا شرط کے نتیجے میں گناہوں کو ہلکا سمجھنے کا رجحان ترقی پاتا گیا ۔

(۹) چور، شرابی، دوست سے بے وفائی کرنے والا برہمن کا قاتل، گرو کی بیوی سے زنا کرنے والا عورت، ماجا اور والدین کا قاتل اور جو دوسرے کبائر کرنے والے لوگ ہیں ۔ (۱۰) ان گنہگاروں کا یہی فدیہ ہے کہ "بشنو" کا نام لے کیونکہ ان سے ان کا دھیان ہوتا ہے ۔ بھاگوت: ۶ : ۲ : ۹، ۱۰

عقیدۂ فنا

نظریۂ وصال و تقرب نے مجموعی طور پر یہ اثر ڈالا کہ ہندوستان کے فلسفی و متکلم اس نقطہ پر قریب قریب متفق ہو گئے کہ دو عہد ہیں ۔ عہدِ ظہور و عہدِ خفا، عہدِ بیداری و عہدِ خواب، عہدِ جلوہ و عہدِ خلوہ ۔ عہدِ ترکیب و تحلیل ۔ گیان کال اور مایا کال زمانۂ علم و زمانہ جہل ۔ سرشٹی کال اور پرلے کال ۔ زمانۂ کون و فساد ۔ پہلے عہد میں دنیا رہتی ہے دوسرے عہد میں دنیا مٹ جاتی ہے ۔ تکوین و ترکیب کے عہد میں موجودات و ممکنات اپنا

الگ وجود رکھتی ہیں۔ مگر زمانہ "پرلے تحلیل" میں موجودات واجب الوجود میں شامل ہو جاتی ہیں۔ اس طرح نکوکار، بدکار، جنت و جہنم کا وجود عہد کائنات تک رہتا ہے اور پرلے کال میں۔ زمان فنا میں۔ نکوکار، بدکار، جنت و جہنم کا وجود۔ کائنات کے وجود کے ساتھ ساتھ واجب الوجود میں ڈوب جاتا ہے تحلیل ہو جاتا ہے۔ اس طرح انجام و آخرت کے لحاظ سے نیک و بد انسان یکساں ہیں گویا تناسخ کی طرح "نظریہ فنا و تحلیل بھی" خدا بیزاری اور الحاد کی فلسفیانہ تعبیر ہے۔

شرک اپنی فطرت کی وجہ سے جس طرح متعین خداوندوں پر قناعت نہیں کرتا بلکہ خداوندوں کے حلقہ کو وسیع تک کرتا رہتا ہے، حذف [illegible] کرتا رہتا ہے۔ اسی طرح وہ ایک محاذ پر ایک ہی عقیدہ نہیں رکھتا۔ بلکہ متعدد عقیدے رکھتا ہے۔ زمانے کے لحاظ سے بدل و حذف ہوتا رہتا ہے۔ ویدک رشی عالم اجداد پر یقین رکھتے تھے۔ مگر اس کے بھی اشارے موجود ہیں کہ وہ بزرگ جزا علی الاولاد کے بھی قائل تھے۔ چنانچہ

جزا علی الاولاد

باپ کے کیے ہوئے گناہوں سے ہم کو چھٹکارا دیجیے۔ جن (گناہوں) کو ہم نے اپنے تئیں کیا ہے ان سے چھٹکارا دیجیے۔ راجن! (ورن!) مویشی چرانے والے باندھے گئے۔ چور کی طرح مجھ کو چھوڑ دیجیے بسشٹھ کو۔ رسی سے بچھڑے کی طرح۔ چھوڑ دیجیے۔ رگ وید: ۷: ۸۶: ۵

پرانوں کے ایام میں تو جزا علی الاولاد کا مستقل عقیدہ کام کرتا ہوا نظر پڑتا ہے۔ تدوین تورات کے زمانے میں یہودی قوم بھی "جزا علی الاولاد" کی واضح طور پر قائل تھی۔ پران (اساطیر) نویس بزرگوں کا اس باب میں یہ عقیدہ تھا کہ اگر لڑکا گناہ کرتا ہے تو "اجداد" کی زندگی جنت میں دوبھر ہو جاتی ہے اور انہیں اخراج کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ باپ اگر گناہ کرتا ہے اور اس کی سزا اگر باپ کو نہیں ملتی تو لڑکے پوتے نواسوں کو دنیا میں مل کر رہتی ہے۔ لڑکا کس طرح اپنے باپ دادا کو جنت سے باہر نکلوانے کا سبب بنتا ہے کس طرح لڑکا دس دس پشت کو نجات بخشتا ہے؟ اس کی تفصیل ہمارے مقالہ کے لیے "مقالہ خانہ داری اور رہبانیت" (زندگی، اپریل ۶۲ء) کی طرف رجوع کریں۔ یہاں وہ تفصیل موجب طوالت و تکرار ہوگی۔

ماں باپ کے گناہ لڑکے، پوتے اور نواسے پر پڑتا ہے۔

(۱۷۲) دنیا میں کیا ہوا گناہ۔ زمین کی طرح۔ فوراً پھل نہیں دیتا۔ وہ دھیرے دھیرے باری آنے پر گنہگار کی جڑوں کو ہی کاٹ ڈالتا ہے۔ (۱۷۳) اگر گنہگار پر اثر نہیں دکھاتا ہے تو وہ لڑکوں

(باقی صفحہ پر)

سیلی اُستاد

صفحات ۱۱۲ - کتابت و طباعت بہتر - قیمت :- ۲ روپیہ
ملنے کا پتہ :- ہومیو کارنر - دریاپور - پٹنہ ع۴

تعمیر پسند حلقۂ ادب میں محمد نیاز غیر معروف نہیں ہیں - تبصرہ نگار انہیں ایک ذہین — اور خطرناک حد تک ذہین نوجوان کی حیثیت سے جانتا ہے اور اس واقفیت کی مدت خاصی طویل ہے اللہ تعالیٰ نے محمد نیاز کو ذہن رسا کی نعمت عطا کی ہے اور ان کی شاعری ان کے ذہن رسا کی مظہر ہے - ان کے علم و فن اور ذہانت کی اصل جولاں گاہ' ان کی سنجیدہ' بامقصد اور باوقار شاعری ہے لیکن زیر تبصرہ کلام بھی ان کی ذہانت ہی کا ایک پرتو ہے - انھوں نے روزنامہ "سنگم" پٹنہ میں ذہنی موضوعات پر جو قطعات لکھے تھے "سیلی استاد" انہیں قطعات کے ایک حصہ پر مشتمل ہے - ان قطعات کے بارے میں محمد نیاز "عرض نیاز" میں لکھتے ہیں :-

> ہر قطعہ منٹوں کی کاوش فکر کا نتیجہ ہے - لہذا فی البدیہہ ہے - یہ تنقید سے بالاتر نہ سہی متوقع فروگزاشتوں کے لیے مصنف قابل معافی ضرور قرار دیا جائے -

جب اچھی طرح سوچا سمجھا کلام بھی فروگزاشتوں سے خالی نہیں ہوتا تو ارتجالاً کہے ہوئے قطعات میں ان کا وجود ذرا بھی خلاف توقع نہیں ہے لیکن اس کے باوجود سرسری نظر میں تبصرہ نگار کو زبان و بیان کی کوئی قابل لحاظ فروگزاشت دکھائی نہ دی البتہ بعض بعض قطعے میرے نزدیک "حدودِ ظرافت و طنز" سے تجاوز کر گئے ہیں - وقتی شاعری یا وقتی و ہنگامی موضوعات پر شاعری میرے نزدیک بے کار شئے نہیں ہے بلکہ میں اس کی افادیت و اہمیت کا قائل ہوں "سیلی استاد" کے مطالعے نے میری اس رائے میں استحکام پیدا کیا ہے - ذیل میں اپنے چند پسندیدہ قطعات نقل کرتا ہوں -

مرغ کا سالن رکھا تھا اور بھی ڈبل رکھی مجھ سے بیرے نے کہا کٹلٹ ہی لیجئے یہ
میں جو چکرایا تو بولا بھوجنالیہ میں ہیں آپ اور یہاں کی گفتگو میں "سمپلی سیٹی" ہے یہ
اس قطعہ کا عنوان ہے "سمپلی سیٹی"

شوق اشاعت

میں نے بھی لکھی ہے اک کہانی عنواں مگر اس پہ آپ دیجیے۔
املا بھی غلط سلط ہے لیکن اصلاح کے بعد چھاپ دیجیے

یار کا غصہ

سُن لو ہمارے ہاتھ سے کشمیر اگر گیا۔ بھارت کے مسلمین کے بدن ہونگے دار پر
بخشی میاں نے دی ہے یہ تازہ چتاونی کہتے ہیں اس کو یار کا غصہ بھتار پر

خنجر اشعار

جس کو دیکھیے غزل اخبار کے دفتر چلا وار چھپ نا تھا کہ گنگے شاعری کرنے لگے
جیسے اب ہوگا جواہر لال کا املانِ جنگ چین والے خنجر اشعار سے ڈرنے لگے

انقلاب فکر و نظر

میں نے بیگم سے کہا بیگم خدا کے واسطے پاؤں پھیلا اپنی چادر کی طوالت دیکھ کر
ہنس کے بولی جی نہیں کل آپ ہی بہر خدا دوسری چادر خریدیں قد و قامت دیکھ کر

گردش مدام

یوں ہوا پرسوں کہ وہ اندر گئے بات کل کی ہے کہ پھر باہر چلے
آج سنتا ہوں کہ دلی گھوم کر پھر علی گڈھ کو "علی یا ور" چلے

امید ہے کہ شعر و سخن سے ذوق رکھنے والے لوگ اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے ویسے اس کتاب کے نام سے ڈر کر بھی لوگوں کو اسے خریدنا ہی پڑے گا۔ (ح۔ق)

بقیہ صفحہ ۶۰

تو نواسوں پر مؤثر ہوتا ہے۔ گنہگار کا کیا ہوا کیا ہوا گناہ بے کار و بے اثر نہیں ہوتا۔ منو سمرتی: ۴: ۱۷۲-۱۷۳ گ

(۲۲) اگر گنہگار پر کیے گئے پاپوں کا اثر نہیں پڑتا۔ ساجھ! اس کا اثر لڑکوں، پوتوں، نواسوں پر پڑتا ہے۔ مہابھارت: شانتی: ۱۲۹ : ۲۲ دیگر

(۲) راجن! کیا ہوا گناہ ـــــ زمین کی طرح ـــ فوراً پھل نہیں دیتا۔ وہ دھیرے دھیرے باری آنے پر گنہگار کی جڑوں ہی کو کاٹ ڈالتا ہے۔ (۳) اگر گناہ گنہگار پر اثر نہیں دکھاتا ہے تو وہ لڑکوں اور نواسوں پر اثر انداز ہوتا ہے ـــ پیٹ میں کھائی گئی بھاری چیز کی طرح ـــ گناہ ضرور ہی پھل لاتا ہے۔ مہابھارت: آدی: ۸ : ۲ ، ۳

(بقیہ اشارات)

تمام دنیا سے کہا جا رہا ہے کہ بھارت کے مسلمان، پاکستان کے مقابلے میں بھارت کی حکومت کے ساتھ ہیں اور ان کے جوانوں نے اپنا خون دے کر اپنی وفاداری ثابت کر دی ہے پھر انہیں مسلمانوں سے یہ بات کیسے کہی جا سکتی ہے کہ اگر کشمیر کے مسلمانوں نے پاکستان کی طرف رخ کیا تو تمہاری خیر نہیں مختصر یہ کہ جناب وزیر کے اس بیان کو جس پہلو سے دیکھیے کسی طرح اس کی کل ٹھیک نہیں بیٹھتی۔ اگر جن سنگھی اور مہا سبھائی لیڈر اس طرح کی باتیں کہتے ہیں تو مسلمان یہ سوچ کر اس کو نظر انداز کرتے ہیں کہ مسلم دشمنی میں انھوں نے عقل و خرد کو اپنے پیچھے چھوڑ دیا ہے لیکن کسی وزیر کی زبان سے ایسی بات نکلنے کی توقع نہیں جاتی جب پر عقل و خرد اپنا سر پیٹ لے۔

آنریبل وزیر کا دوسرا جملہ پہلے سے بھی زیادہ حیرت انگیز ہے تعجب ہوتا ہے کہ کسی ایسے شخص کی زبان سے جو گاندھی جی کا معتقد، گاندھی واد کی پیروی کا مدعی اور گاندھی جی کو مہاتما تسلیم کرتا ہو ایسی بات کس طرح نکلی۔ سوال یہ ہے کہ گاندھی جی نے بھارت کی خیر خواہی اور اس کی بھلائی کے لیے جد وجہد کرتے ہوئے اپنی جان قربان کی تھی یا بھارت کو نقصان پہنچانے کی وجہ سے ان کی جان لی گئی تھی۔ اگر بات پہلی تھی اور ہمیں یقین ہے کہ جناب وزیر بھی اسی کو صحیح سمجھتے ہوں گے تو پھر بھارت کے لیے یہ کوئی قابل فخر بات نہیں ہے کہ اب بھارت کی بھلائی کے لیے جان دینے والا کوئی لیڈر موجود نہیں ہے۔ پھر سوال یہ بھی ہے کہ کیا گاندھی جی کی جان صرف بھارت کے مسلمانوں کی خاطر لی گئی تھی؟ جناب وزیر مجھ سے بہتر طور پر جانتے

ہونگے کہ گوڈسے نے گاندھی جی کو صرف اس لیے قتل نہیں کیا تھا کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی حفاظت کرنا چاہتے تھے بلکہ ان کے قتل کا سب سے بڑا محرک یہ تھا کہ وہ پاکستان کے مقابلے میں نرم رویہ اختیار کرنے اور اس کی ہمدردی پر اصرار کر رہے تھے یہاں تک کہ وہ خود پاکستان کا سفر کرکے اس کو اپنی ہمدردی کا یقین دلانا چاہتے تھے۔ یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اگر گاندھی جی پاکستان کے مقابلہ میں سخت رویہ اختیار کرتے یا اس کے ساتھ سختی کی راہ میں حائل نہ ہوتے تو گوڈسے انہیں محض اس لیے ہرگز قتل نہ کرتا کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی حفاظت کیوں کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے علاوہ قابلِ غور بات یہ بھی ہے کہ کیا گاندھی جی کی عظیم قربانی کے بعد بھی ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کی زندگیاں جن سنگھیوں اور مہاسبھائیوں کے ہاتھوں محفوظ رہ سکیں؟ جب نہیں رہ سکیں تو اب کون سی نئی قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ ان کے سروں پر جو قیامت ٹوٹ چکی ہے یا آئندہ ٹوٹ سکتی ہے اس کا تعلق صرف کشمیر میں رائے شماری سے نہیں ہے اس کے عوامل بالکل دوسرے ہیں۔ ممکن ہے کہ جناب وزیر نے کسی دوسرے سیاق میں گاندھی جی کی قربانی کا ذکر کیا ہو اور انگریزی اخبار میں رپوٹ غلط چھپی ہو لیکن اب تک ان کی طرف سے اس کی کوئی تردید نظر سے نہیں گزری۔

ہم اپنی حکومت کے ذمہ دار رہنماؤں سے عرض کریں گے کہ کشمیر کا مسئلہ عقل و خرد سے بیگانہ جذباتیت سے حل نہیں ہوگا۔ اس کے لیے کم از کم ونوبا بھاوے جیسے ٹھنڈے دماغ اور ٹھنڈی زبان کی ضرورت ہے۔ ہم ادب کے ساتھ ان کی خدمت میں یہ بھی عرض کرنا چاہتے ہیں کہ انہیں عوام کو نری جذباتیت سے بلند کرکے عقل، سنجیدگی اور غور و فکر کی سطح تک پہنچانا چاہیے۔ یہی بات قوم اور ملک کے لیے مفید ہوگی۔

۲ر دسمبر ۶۵ء

ماہنامہ

زندگی رامپور

شوال المکرم ۸۵ھ
فروری ۱۹۶۶ء

جلد :- ۳۶
شمارہ :- ۲

مدیر :- سید احمد قادری

- خط و کتابت و ارسال زر کا پتہ ـــ منیجر "زندگی" رامپور۔ یوپی
- زر سالانہ :- چھ روپیہ ـــ ششماہی :- تین روپیہ ـــ فی پرچہ :- ۶۰ پیسے
- ـــ ممالک غیر سے :- بارہ شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر

مالک: جماعت اسلامی ہند۔ ایڈیٹر: سید احمد عروج قادری۔ پرنٹر پبلشر :- احمد حسن مطبع :- دہلی پرنٹنگ ورکس نزد آزاد [illegible]

مقام اشاعت :- دفتر زندگی رامپور یوپی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

سید احمد قادری

قرآن کی مکی اور مدنی سورتوں کے درمیان فرق بیان کرنے کے لیے عام طور پر یہ بات کہی جاتی ہے کہ مکی سورتوں میں بہت کم احکام نازل کیے گئے ہیں۔ احکام کی بہت بڑی تعداد صرف مدنی سورتوں میں ملتی ہے چنانچہ بہت سے احکام کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ مکے میں ان کا بالکل وجود نہ تھا صرف مدنی سورتوں اور آیتوں میں وہ احکام دیے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے بڑی مثال قتال فی سبیل اللہ کی دی جاتی ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ جہاد کی اس قسم کا وجود مکی آیتوں میں نہیں ہے۔ مدینہ آنے کے بعد اچانک قتال فی سبیل اللہ کا حکم نازل کر دیا گیا اور مسلمانوں نے تلواریں سونت لیں۔ مکی اور مدنی سورتوں کے درمیان جو یہ فرق بیان کیا جاتا ہے اگر اس کا مطلب یہ ہوتا کہ مدینہ آکر بیشتر احکام کی تفصیل، تقیید، تعیین اور تکمیل کی گئی ہے تو بات ٹھیک ہوتی لیکن بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مدینہ آکر ایسے احکام بھی دیے گئے ہیں جن کا مکے میں بالکل وجود نہ تھا۔ یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ مدنی سورتوں میں شاید ہی کوئی ایسا حکم موجود ہو جس کی اصل اجمالی طور پر مکی سورتوں میں نازل نہ ہو چکی ہو۔ چونکہ مکی سورتوں میں احکام سے متعلق زیادہ تر قواعد کلیہ نازل کیے گئے ہیں اور مدنی سورتوں میں انہیں قواعد کلیہ کے تحت جزئیات کی تفصیل و تعیین کی گئی ہے اس لیے غور و فکر کے بغیر یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ مدنی سورتوں میں کون سا حکم کس قاعدۂ کلیہ کے تحت ہے۔ اور مکی سورتوں میں وہ قاعدہ کلیہ کہاں بیان کیا گیا ہے۔ اس نکتے کو واضح کرنے کے لیے مناسب تو یہ ہے کہ مکی سورتوں پر تفصیلی نظر ڈال کر یہ دیکھا جائے کہ ان سورتوں میں کیا اور کتنے احکام دیے گئے ہیں لیکن یہ ایک لمبا

کام ہے۔ اس وقت ہم مختصر طور پر چند چیزیں پیش کرنا چاہتے ہیں ۔
مکی اور مدنی سورتوں کے درمیان فرق اور فہم قرآن کے سلسلے میں علامہ شاطبی نے الموافقا
میں متعدد مقامات پر اصولی اور بصیرت افروز بحثیں کی ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ پہلے یہی اصولی بحثیں
آجائیں۔ المطبعۃ الرحمانیہ مصر نے علامہ شاطبی (م ۷۹۰ ھ) کی بہترین تصنیف الموافقات فی اصول
الشریعۃ شیخ علماء دمیاط استاذ کبیر شیخ عبداللہ دراز کے حاشیوں کے ساتھ شائع کی ہے۔ ہم متن کے
ترجمے کے ساتھ قوسین میں ان حاشیوں کے ضروری حصوں کے ترجمے بھی پیش کریں گے ۔۔۔ علامہ
شاطبی ایک مقام پر لکھتے ہیں ۔

جب تم مدنی آیتوں میں کوئی اصل کلی دیکھو تو غور کرو۔ غور و تامل سے تم یہ حقیقت پالو گے
کہ وہ اصل کلی کسی دوسری کلی اعم کی یا تو جزئی ہوگی (جیسے جہاد جو امر بالمعروف و نہی عن المنکر
کے قاعدہ کلیہ کی ایک جزئی ہے) یا وہ کسی دوسری اصل کلی کی تکمیل ہوگی (جیسے تحریم خمر
جو اثم وعدوان سے اجتناب کی اصل کلی کی تکمیل ہے) اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ وہ اصول
کلیہ جن کی حفاظت کے لیے شریعت آئی ہے، پانچ ہیں :۔
دین[۱] ۔ نفس[۲] ۔ عقل[۳] ۔ نسل[۴] ۔ مال[۵]

دین کتاب و سنت نے جس چیز کی طرف دعوت دی ہے اور ان دونوں سے جتنی چیزیں
پیدا ہوتی ہیں ان سب کی اصل، دین ہے اور دین سب سے پہلی چیز ہے جو مکہ میں نازل ہوئی
نفس حفاظت نفس کی اصل کلی بھی مکے میں نازل ہوئی ہے جیسے وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ
الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ[۱] اور وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ بِأَيِّ ذَنبٍ قُتِلَتْ[۲]
اور وَقَدْ فَصَّلَ لَكُم مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ إِلَيْهِ[۳] اور اس طرح کی
دوسری آیتیں (محل دلیل الا ما اضطررتم الیہ کا ٹکڑا ہے ۔ یہ استثنا حفاظت نفس کے لیے
حرام غذاؤں کے استعمال کی اجازت دیتا ہے ۔)

---

[۱] اور ہلاک نہ کرو اس جان کو جسے اللہ نے محترم قرار دیا ہے مگر حق کے ساتھ ۔ انعام رکوع ۱۹
[۲] اور جب زندہ دفن کی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس جرم میں قتل کی گئی ۔
[۳] اور وہ واضح طور پر تمہیں بتا چکا ہے جو کچھ اس نے تم پر حرام کیا ہے الا یہ کہ تم اس کے استعمال پر مجبور ہو جاؤ ۔ سورۂ ...

عقل

اگرچہ مفسد عقل شراب کی حرمت سے متعلق مکے میں کوئی تفصیلی نص نازل نہیں ہوئی لیکن اجمالی طور پر اس کی حرمت کی آیتوں میں موجود ہے (انسان کی جان اور اس کے اعضا بدن اور ان کے منافع کی حفاظت کے بارے میں جو آیتیں مکہ میں نازل ہوئی ہیں، عقل اور اس کی منفعت کی حفاظت بھی اسی ضمن میں مندرج ہے۔ اب اگر کوئی ایسی چیز ہے جو عقل کو بالکل ختم کرنے والی ہے تو اس کو انسان کے کسی ایک جز کو ختم کرنے والا سمجھا جائے گا اور اگر کوئی چیز ایسی ہے جو عقل کی منفعت کو ہمیشہ کے لیے یا تھوڑے عرصہ کے لیے ختم کرنے والی ہے تو اس کو انسان کے کسی ایک جز کی منفعت کو ختم کرنے والا سمجھا جائے گا لہذا حفاظت نفس ایک ایسی کلی ہے جس میں حفاظت عقل بھی اجمالاً مندرج ہے۔ اس کے علاوہ ایک لمحے کے لیے بھی عقل کو فاسد کرنے والی شے کو حرام قرار دینا نفس، دین، نسل، مال اور آبرو کی حفاظت کو مکمل کرنے والی چیز ہے کیونکہ عقل کی سلامتی ان تمام چیزوں کی سلامتی کے لیے ضروری ہے۔ بہرحال حرمتِ خمر کا حکم یا تو حفاظت نفس وغیرہ کے اصول کلیہ کا ایک جزیہ ہے یا اس سے ان اصول کلیہ کی تکمیل ہوتی ہے)

مال

حفاظت مال کے لیے سلبی طور پر ظلم، اکل مالِ یتیم، اسراف، دوسروں کے حق پر دست درازی ناپ تول کی کمی، فساد فی الارض اور اس طرح کی دوسری چیزوں کو حرام قرار دینے والی آیتیں مکہ میں نازل ہوئی ہیں۔

عزت و آبرو کی حفاظت بھی حفاظت نفس کے ساتھ ملحق ہے کیونکہ آبروریزی نفس انسانی کو سخت تکلیف پہنچانے والی چیز ہے۔

نسل

حفاظتِ نسل کے لیے مکہ میں زنا کی حرمت نازل کی گئی اور شرمگاہ کی حفاظت کا (بیوی اور لونڈی کو چھوڑ کر) حکم دیا گیا۔

ان اصول خمسہ کو فنا و فساد سے بچانے کے لیے جو امور سلبی طور پر وارد ہوئے ہیں (مثلاً ظلم اور ناپ تول میں کمی کی حرمت) انہیں کے ساتھ ایجابی طور پر وہ امور بھی وارد ہوئے ہیں جن سے ان کے وجود و بقا کا استحفاظ ہوتا ہے (مثلاً حفاظت نفس کے لیے کھانا پینا) یہ بات چار آخری اصول (نفس، عقل، نسل، مال) میں ظاہر ہے۔ باقی رہی اصل اول یعنی دین، تو اس کا مرجع دو چیزیں ہیں تصدیق بالقلب اور انقیاد بالجوارح ــــ اللہ، رسول اور یوم آخر

پر ایمان کے معاملے میں تصدیق قلبی سے مقصود حاصل ہو جاتا ہے۔ مدنی آیتوں میں ان کی جو
تفصیلات آئی ہیں وہ سب اس اصل کی فرع ہیں اور یہ اصل ایمانی مکے میں نازل ہو چکی ہے
۔۔۔۔ جوارح کا انقیاد کسی ایک حکم کے تحت حاصل ہو جاتا ہے (یعنی کسی ایک بدنی تکلیف کے
ضمن میں انقیاد بالجوارح کی کلی کا معنی متحقق ہو جاتا ہے) انقیاد بالجوارح سے متعلق مکی آیتوں
میں نطق بالشہادتین اور نماز اور زکوٰۃ موجود ہیں اور ان سے انقیاد کا معنی حاصل ہو جاتا ہے
باقی رہا روزہ اور حج تو ان دونوں کا حکم مدینے میں آیا اور یہ دونوں باب تکمیل سے ہیں
علاوہ ازیں حج کی عبادت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے وراثۃً عرب میں ہوتی چلی
آرہی تھی۔ اسلام نے صرف ان خرابیوں کو دور کیا ہے جو اس عبادت میں پیدا کر دی گئی تھیں
اور اسے ٹھیک اس طریقے کی طرف لوٹا دیا گیا ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت میں رائج
تھا۔ یہی حال روزے کا بھی ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں عرب یوم عاشورا کا روزہ رکھتے تھے
اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی رکھتے تھے۔ مدینہ آکر بھی آپ نے یہ روزہ رکھا اور صحابہ کو بھی حکم دیا
یہاں تک کہ رمضان کے روزوں نے اس کے وجوب کو منسوخ کیا۔ صیامِ عاشورا کے سلسلے
میں حضرت عائشہؓ کی حدیث پڑھو۔ اس سے معلوم ہوا کہ روزے کی اصل بھی مکے میں موجود تھی تشریع
مدنی نے ان دونوں عبادتوں کی تکمیل کی ہے اور انہیں مضبوط بنیادوں پر قائم کر دیا ہے۔ باقی
رہا جہاد جو مدینہ میں شروع ہوا ہے تو یہ دو اصل' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی
فروع میں سے ایک اعلیٰ فرع ہے اور امر بالمعروف کی اصل مکہ میں مقرر ہو چکی تھی يَا بُنَيَّ
أَقِمِ الصَّلَاةَ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ اور اس جیسی دوسری آیتیں

الموافقات ج ۳ ص ۴۶ تا ۵۰

علامہ شاطبی کی اس بصیرت افروز بحث کا حاصل یہ ہے کہ مکی آیتوں میں اصول کلیہ بیان کیے
ہیں اور مدنی آیتیں ان اصولِ کلیہ کی تقیید و تکمیل کرتی ہیں اس لیے یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ
منورہ میں ایسے احکام بھی نازل کیے گئے ہیں جن کا مکی آیتوں میں کوئی وجود نہ تھا بلکہ حقیقت
ہے کہ ہر مدنی حکم کی اصل مکی آیتوں میں نازل ہو چکی تھی۔ اس سلسلے میں انھوں نے حرمت خمر، زنا

اے بیٹے نماز قائم کر اور نیکی کا حکم دے اور برائی سے روک (لقمٰن)

حج اور جہاد کی مثالیں دے کر بتایا ہے کہ ان احکام کی اصل بھی مکہ میں موجود تھی۔ علامہ شاطبی کی دین کے بارے میں ذیل کی عبارت خاصی اہم ہے۔

اما الدین فہو اصل ما	رہا دین تو وہ اصل ہے اس چیز کی
دعا الیہ القرآن والسنۃ	جس کی طرف قرآن اور سنت نے دعوت دی
وما نشاء عنہما ہو اول	اور ان چیزوں کی جو ان دونوں سے پیدا
ما نزل بمکۃ (الموافقات ج ۳ ص ۴۶)	ہوئیں اور یہی چیز جو مکہ میں سب سے پہلے نازل ہوئی تھی

جب قرآن و حدیث کی دعوت اور ان دونوں کے تعلیم کردہ تمام عقائد و اعمال کا نام دین ہے اور دین سب سے پہلی چیز ہے جو مکہ میں نازل ہوئی تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے لے کر وفات تک قرآن اور احادیث میں جتنے احکام دیے گئے ان سب کی اصل مکہ میں نازل ہو چکی تھی۔

یہی بات ہے جس کو علما کبھی یوں کہتے ہیں کہ کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ میں پورا دین سمٹا ہوا ہے یہ وہ بیج ہے جس سے پورے دین کا تنا ور درخت پیدا ہوا ہے اور اس کی تائید اس شرعی مسئلہ سے بھی ہوتی ہے کہ صرف کلمہ طیبہ کی شہادت دینے اور اس پر یقین کا اعلان و اعتراف کرنے سے ایک غیر مسلم دائرہ اسلام میں داخل ہو کر مسلم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد خدا و رسول کے کسی حکم سے انکار کرنا اس کے لیے جائز نہیں رہتا۔ ظاہر ہے کہ جب کسی شخص نے اپنی پوری زندگی خدا و رسول کے حوالے کر دی تو اب گنجائش کہاں رہی کہ وہ ان کے کسی حکم پر چون و چرا بھی کر سکے۔ ایمان لانے کے لیے یہ ہرگز ضروری نہیں کہ اس کو قرآن کا ہر حکم بتایا جائے اور سب پر الگ الگ ایمان لانے کا اس سے مطالبہ کیا جائے۔ دنیا کے معاملات میں بھی ہر عاقل یہ جانتا ہے کہ کسی چیز کو تسلیم کر لینے کے بعد اس کے تقاضوں اور لوازم کو تسلیم کرنا بھی ضروری ہے اگر کوئی شخص کسی چیز کو تسلیم کر لے لیکن اس کے لوازم کو ماننے سے انکار کر دے تو اس کا یہ رویہ غیر معقول اور نادرست ہوگا۔ علامہ شاطبی نے اپنی اس مختصر عبارت میں اسی حقیقت کی طرف رہنمائی کی ہے۔ وہ اپنی کتاب میں ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:-

جان لو کہ قواعد کلیہ پہلے وضع کیے گئے اور مکہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن قواعد کلیہ

کے ساتھ نازل ہوا۔ پھر اس کے بعد بہت سی چیزیں مدینے میں نازل ہوئیں۔ ان سے ان قواعد کی تکمیل ہوئی جن کی اصل کے میں وضع کی گئی تھی۔ ان قواعد کلیہ میں سب سے پہلا قاعدہ اللہ، اس کے رسول اور آخرت پر ایمان کا قاعدہ تھا۔ پھر اس کے بعد کچھ اصول عامہ نازل ہوئے جیسے نماز انفاق مال اور دوسری چیزیں اور وہاں پر ایسی چیزوں سے روکا گیا جو کفر یا لازمۂ کفر ہو مثلاً کفار کے وہ جھوٹ جو انھوں نے ذبح لغیر اللہ کے سلسلے میں گھڑ لیے تھے وہ ان شرکاء کے نام پر جانور ذبح کیا کرتے تھے جن کو انھوں نے اپنے جی سے گھڑ کر خدا کا شریک بنا لیا تھا اسی طرح وہ تمام چیزیں جنھیں انھوں نے بغیر کسی اصل شرعی کے اپنے اوپر حرام یا واجب قرار دے لیا تھا۔ یہ سب چیزیں عبادت لغیر اللہ کی اصل کلی کی خادم تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ کے میں تمام مکارم اخلاق کا حکم دیا گیا جیسے عدل، احسان، وفائے عہد، عفو و درگزر، جاہل سے اعراض، دفعت بطریق احسن، خوف خدا، صبر، شکر اور اسی طرح کی دوسری چیزیں اور تمام برے اخلاق سے روکا گیا جیسے فحشاء، منکر، بغی، قول بغیر علم، ناپ تول میں کمی، فساد فی الارض، زنا، قتل، بچے کو زندہ درگور کرنا اور ان کے علاوہ دوسری چیزیں جو دین جاہلیت میں رائج تھیں۔ کے میں تشریع جزئیات کی تعداد کم ہے اور اصول کلیہ نزول اور تشریع میں بہت ہیں۔ پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے اور دین اسلام کا حلقہ وسیع ہو گیا تو یہاں بتدریج اصول کلیہ کی تکمیل کی گئی۔ (یہاں ج ۳ ص ۴۶ مسئلہ ثامنہ کے تحت جو بحث کی گئی ہے اس کو سامنے رکھو تاکہ ان اصول کی تکمیل کا مفہوم سمجھ سکو) جیسے اصلاح ذات البین، معاہدات کا ایفاء، مسکرات کی تحریم (مسئلہ ثامنہ میں یہ گزر چکا ہے کہ مسکر کی تحریم اجمالاً حفاظت نفس میں داخل ہے۔ مدینہ میں اس کی حرمت کی صراحت کر کے اس اجمال کو کھول دیا گیا اور حفاظت نفس کی اصل کو مکمل کیا گیا ہے) اسی طرح مدینے میں ان حدود کی تحدید کی گئی جو امور ضروریہ کی حفاظت اور ان کی تکمیل و تحسین کرتے ہیں۔ مدینہ ہی میں تخفیفات اور رخصتوں کے ذریعے رفع حرج کا قاعدہ نازل ہوا اور اسی طرح کی دوسری چیزیں۔ یہ تمام چیزیں اصول کلیہ کی تکمیل ہیں۔

الموافقات ج ۳ ص ۱۰۲ تا ۱۰۳

علامہ شاطبی کی یہ بحث اوپر والی بحث کی مزید توضیح کرتی ہے اور اس میں مکی احکام کی بہت سی

مثالیں دی گئی ہیں۔ اس سے آگے انھوں نے مکی اور مدنی سورتوں کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے ایک نہایت عمدہ، مفید اور گہری بحث کی ہے۔ ہم ذیل میں اس کا ترجمہ درج کرتے ہیں۔

مدنی سورتوں کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ مکی صورتیں سامنے رکھی جائیں۔ اسی طرح مکی سورتوں کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ بعض کو بعض کے ساتھ نیز مدنی سورتوں کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ بعض کو بعض کے ساتھ ترتیب نزولی کے مطابق سمجھا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو قرآن کا فہم صحیح نہ ہوگا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ مدنی خطاب کا معنی اکثر اوقات مکی خطاب پر مبنی ہوتا ہے جس طرح کی و مدنی آیتوں میں ہر متاخر آیت اپنے سے متقدم آیت پر مبنی ہوتی ہے۔ استقرا اس دعوے کی دلیل ہے۔ ایک آیت کے دوسری آیت پر مبنی ہونے کی درج ذیل صورتیں ہوتی ہیں:-

کسی مجمل کا بیان، کسی عموم کی تخصیص، کسی مطلق کی تقیید، کسی غیر مفصل کی تفصیل، کسی غیر مکمل کی تکمیل۔

اوپر کہی ہوئی بات کا پہلا شاہد خود شریعت ہے۔ کیونکہ شریعت، مکارم اخلاق کی تکمیل اور ان تمام خرابیوں کی اصلاح کے لیے آئی ہے جو ملت ابراہیمی میں پیدا کر دی گئی تھیں (یعنی شریعت محمدی خود اپنے سے سابق شریعت ابراہیمی پر مبنی ہے اس میں جو تغیر پیدا کر دیا گیا تھا اس کی تصحیح کرنے والی اور جو نقص پیدا کر دیا گیا تھا اس کی تکمیل کرنے والی ہے لہذا ٹھیک یہی بات اجزائے شریعت محمدی میں بھی جاری ہوگی یعنی متاخر جزء کو سابق جزء پر مبنی اور اس کی تکمیل کرنے والا ہونا چاہیے) اس شاہد سے ملا ہوا دوسرا شاہد سورۂ انعام کا نزول ہے۔ اس لیے کہ یہ سورۃ بنیادی عقائد اور اصولِ دین کو بیان کرنے کے لیے نازل کی گئی ہے۔ علماء نے اس سورۃ سے توحید کے وہ تمام قواعد اثبات واجب الوجود سے لے کر اثبات امامت تک مستنبط کیے ہیں جن پر متکلمین نے کتابیں لکھی ہیں۔ یہ علماء کا قول ہے اور میں کہتا ہوں کہ اگر تم اس اصولی اور کلی نظر سے اس سورہ کو پڑھو گے جس کے مطابق الموافقات لکھی گئی ہے تو پاؤ گے کہ یہ سورۃ شریعت اسلامیہ کے ایسے قواعد کلیہ کی توضیح کرتی ہے کہ اگر ایک قاعدہ بھی کم کر دیا جائے یا توڑ دیا جائے تو پورا نظام شریعت ٹوٹ جائے۔

(باقی صفحہ ۶ پر)

شش عید کے روزے

(سید احمد قادری)

عَنْ اَبِیْ اَیُّوْبَ الْاَنْصَارِیْ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَنْ صَامَ رَمَضَانَ ثُمَّ اَتْبَعَہٗ سِتًّا مِّنْ شَوَّالَ کَانَ کَصِیَامِ الدَّھْرِ (صحیح مسلم کتاب الصوم)

ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا جس نے رمضان کے روزے رکھے پھر اس کے بعد شوال کے چھ روزے رکھے تو یہ سال بھر کے روزوں کے مثل ہوگا۔

اس حدیث کی توضیح حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کی دو حدیثوں سے ہوتی ہے ان کی حدیثوں کے الفاظ یہ ہیں :-

عن ثوبان مولی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال من صام ستۃ ایام بعد الفطر کان تمام السنۃ من جاء بالحسنۃ فلہ عشر امثالہا (ابن ماجہ)

ثوبان مولی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ حضور نے فرمایا جس نے (عید) الفطر کے بعد چھ دن روزے رکھے تو یہ پورے سال کے روزوں کے برابر ہوں گے کیونکہ (قرآن میں ہے) جس نے ایک نیکی کی اس کو دس گنا اجر ملے گا

ان کی دوسری حدیث کے الفاظ یہ ہیں :-

عن ثوبان ان رسول اللہ

ثوبان سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی

صلی اللہ علیہ وسلم قال صیام شہر بعشرۃ اشہر وستۃ ایام بعدہن بشہرین فذالک تمام السنۃ یعنی شہر رمضان وستۃ ایام بعدہ (مشکوٰۃ) علیہ وسلم نے فرمایا۔ ایک مہینے کے روزے دس مہینوں کے برابر اور چھ دن ان کے بعد دو مہینوں کے برابر تو یہ پورا سال ہوا۔ مہینے سے مراد رمضان ہے اور چھ دن رمضان کے بعد

مذکورہ بالا حدیثوں سے یہ بات واضح ہوگئی کہ شوال کے روزے عید الفطر کے بعد رکھے جائیں گے۔ (کیونکہ عید کے دن روزہ ناجائز ہے) اور سال بھر سے مراد پورا سال ہے ان حدیثوں سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ شوال اور اس کے بعد شش عید کے روزے مل کر اللہ تعالیٰ کے قانونِ فضل کی وجہ سے پورے سال کے روزوں کے برابر ہو جاتے ہیں۔ اس کے قانونِ فضل میں ہر نیکی دس نیکیوں کے برابر ہوتی ہے یعنی وہ ہر نیکی کے بدلے میں کم سے کم دس اجر عطا کرتا ہے اس طرح رمضان کا مہینہ دس مہینوں کے برابر اور شوال کے چھ دن دو مہینوں کے برابر ہوئے اور سال پورا ہوگیا۔

حدیث کی حیثیت شش عید کے روزوں کی یہ فضیلت صحیح احادیث سے ثابت ہے صحیح بخاری کے سوا حدیث کی تمام کتابوں میں فضیلت کی احادیث موجود ہیں حضرت ابو ایوب انصاری کی حدیث بخاری اور نسائی کے سوا تمام محدثین نے روایت کی ہے اور حضرت ثوبان کی حدیث ابن ماجہ، نسائی، دارمی، امام احمد اور بزار نے روایت کی ہے ان دو کے علاوہ پانچ دوسرے صحابۂ کرام سے بھی شش عید کے روزوں کی حدیث مروی ہے حضرت ابوہریرہؓ حضرت جابر، حضرت عائشہ، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہم اجمعین

روزے کب اور کس طرح رکھے جائیں یہ روزے شوال کے ابتدائی ایام میں رکھے جائیں یا یہ مہینے کے کسی حصے میں بھی رکھے جا سکتے ہیں؟ اسی طرح دوسرا سوال یہ ہے کہ فضیلت حاصل کرنے کے لیے ان روزوں کو پے در پے بلا ناغہ رکھنا ضروری ہے یا ناغہ کرکے الگ الگ بھی رکھے جا سکتے ہیں؟ جواب یہ ہے کہ شش عید کے روزے مہینے کے ابتدائی ایام میں پے در پے رکھنا بہتر ہے لیکن اگر کوئی شخص مہینے کے آخر میں ناغہ کرکے الگ الگ رکھے تب بھی وہ فضیلت اسے حاصل ہو جائے گی جو حدیث میں ہے اور غالباً کسی فقیہ کا اس میں اختلاف نہیں ہے بلکہ بعض

خیال ہے اختلاف یہ کہتے ہیں کہ یہ روزے ناغہ کرکے الگ الگ رکھے جائیں تو زیادہ بہتر ہے۔ امام ترمذی نے امام ابن المبارک کے جو اقوال ان روزوں کے بارے میں نقل کیے ہیں وہ یہ ہیں:-

وقال ابن المبارك هو حسن
مثل صيام ثلثة ايام من كل شهر
قال ابن المبارك ويروى فى بعض
الاحاديث ويلحق هذا الصيام
برمضان واختار ابن المبارك
ان يكون ستة ايام من اول الشهر
وقد روي عن ابن المبارك انه قال ان صام
ستة ايام من شوال متفرقا فهو جائز (ترمذی)

اور ابن المبارک نے کہا کہ یہ اچھے
روزے ہیں جس طرح ہر مہینے میں تین دن کے
روزے۔ انھوں نے کہا کہ بعض احادیث میں آیا
ہے کہ یہ روزے رمضان کے ساتھ ملحق کیے
جاتے ہیں اور ان کے نزدیک پسندیدہ یہ ہے کہ
یہ چھ دن مہینے کی ابتدا سے ہوں اور روایت ہے
کہ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اگر کوئی شخص شوال کے
چھ روزے الگ الگ بھی رکھے تو جائز ہے۔

امام نوویؒ نے بھی یہ لکھا ہے کہ کوئی شخص ان روزوں کو الگ الگ بھی رکھے تو فضیلت حاصل ہو جائے گی ـــــ ان روزوں کے ضمن میں نفلی عبادتوں سے متعلق دو باتیں ذیل میں لکھتا ہوں:-

نوافل کی دو قسمیں نوافل کی ایک قسم وہ ہے جس کے لیے مخصوص طور پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قولاً یا عملاً کوئی ترغیب نہیں دی ہے بلکہ وہ بالکلیہ ہر مسلمان کی اپنی صوابدید پر موقوف ہیں، انہیں "خالص نوافل" کہنا چاہیے۔ نوافل کی دوسری قسم وہ ہے جو احادیث سے ثابت ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف قول سے یا صرف عمل سے یا قول وعمل دونوں سے جن کی ترغیب دی ہے اور ان کی فضیلت بیان کی ہے نوافل کی یہ قسم خالص نوافل یعنی نوافل محض سے بلند ہو کر مستحب بن جاتی ہے۔ اس طرح کے نوافل کو "مستحب نوافل" کہنا چاہیے۔ شوال کے چھ روزوں کی فضیلت بھی صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ اس لیے یہ روزے مستحب نوافل میں داخل ہیں۔

نوافل کے تین بڑے فائدے نفلی عبادتوں کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ فرائض وواجبات میں جو کوتاہیاں ہو جاتی ہیں نوافل سے ان کی تلافی ہوتی رہتی ہے۔ مثلاً فرض نمازوں میں جو کوتاہیاں ہوتی ہیں جن کی وجہ سے ان میں نقص رہ جاتا ہے ان کی تلافی نفل نمازوں سے ہوتی رہتی ہے۔ اسی طرح رمضان المبارک کے فرض روزوں میں جو

کوتاہیاں ہم سے ہوتی ہیں سال بھر کے نفلی روزے ان کی تلافی کرتے رہتے ہیں۔ ہم امید رکھتے ہیں کہ قیامت میں اللہ تعالےٰ فرائض ونوافل دونوں پر بحیثیتِ مجموعی نگاہ ڈال کر فیصلہ فرمائے گا۔ دوسرا بڑا فائدہ یہ ہے کہ نفل عبادتیں، فرض عبادتوں سے حاصل کردہ فائدوں کو تقویت پہنچاتی ہیں۔ فرض نمازوں سے جو فائدے حاصل ہوتے ہیں، نفل نمازیں ان کو تقویت پہنچاتی ہیں اور فرض روزوں سے جو فائدے حاصل ہوتے ہیں، نفل روزے ان کو بڑھا دیتے ہیں ——— نوافل کا تیسرا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ان سے اللہ تعالیٰ کی بندگی، اس کی محبت اور تقرب میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

موسمِ سرما سے فائدہ اُٹھایئے

موسم سرما کے روزے بھی خدا کی بارگاہ میں اسی طرح مقبول ہیں جس طرح موسم گرما کے ——— روزوں سے جو فائدے حاصل ہوتے ہیں ان میں بھی موسم سرما اور موسم گرما کے روزوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ بات بھی ہم سب جانتے ہیں کہ جاڑوں کے روزے گرمیوں کے مقابلے میں بہت آسان ہوتے ہیں تو پھر ہمیں اس موسم سے فائدہ اٹھا کر کم سے کم شش عید اور اس کے علاوہ مستحب روزوں کے اجر و ثواب اور ان کے فوائد سے محروم نہ رہنا چاہیے۔

شرائطِ ایجنسی

۱۔ ایجنسی کم سے کم ۵ پرچوں پر دی جائے گی

۲۔ ـــــ/۵ ایڈوانس جمع کرنے ہوں گے۔

۳۔ ۵ سے ۵۰ پرچوں تک ٪25 کمیشن دیا جائے گا۔ البتہ ۵۰ سے زائد رسالوں پر کمیشن ٪33 دیا جائے گا۔

۴۔ رسائل کی روانگی کا خرچ دفتر برداشت کرے گا۔ رجسٹری اور وی پی (V P) کا خرچ ایجنٹ صاحبان کے ذمے ہوگا۔

۵۔ ہر ماہ کا بل باقاعدگی سے ادا کرنا چاہیے۔

تبلیغِ دین

(۲)

(مولانا محمد یوسف اصلاحی)

کشمکش میں اہلِ حق کی ذمہ داری

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَ

حق پر جمے رہو اسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ ۚ

وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ ۖ وَقُلْ آمَنْتُ

بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتَابٍ ۖ وَأُمِرْتُ

لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمُ

(الشوریٰ ۱۵)

پس اے رسول! انھیں اسی حق کی دعوت دیتے رہیے، اور آپ کو جو حکم دیا گیا ہے اسی پر جمے رہیے اور ان کی خواہشوں کو ہرگز نہ مانیے اور کہہ دیجیے کہ اللہ نے جو کتاب نازل فرمائی ہے۔ میں اس پر ایمان رکھتا ہوں اور مجھے یہ حکم ہوا ہے کہ میں تمہارے درمیان انصاف کردوں۔

یعنی اہلِ باطل کی خواہشات کچھ بھی ہوں۔ اہلِ حق کا منصب یہ ہے کہ وہ برابر حق کی دعوت پیش کرتے رہیں حق پر مضبوطی کے ساتھ جمے رہیں اور صاف صاف کہہ دیں کہ ہم خدا کی نازل کی ہوئی کتاب پر ایمان لائے ہیں۔ ہمارا فریضہ یہ ہے کہ ہم انسانی سوسائٹی میں عدل وانصاف قائم رکھیں اور کوئی طاقت ہمیں اپنے منصب اور مقام سے نہیں ہٹا سکتی۔

خدا سے تعلق مضبوط رکھو وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَأَنْتُمْ تُتْلٰى

اور تمہارے لیے کفر کی طرف پھرنے کا آخر کیا موقع ہے جب کہ تمہیں خدا کی آیتیں پڑھ کر

عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (آل عمران ۱۰۱)

سنائی جا رہی ہیں اور تمہارے درمیان خود اس کے رسول تشریف فرما ہیں اور جس نے خدا کے دامن کو مضبوط تھام لیا وہ سیدھی راہ پر لگ گیا

یعنی ایمان لانے کے بعد بھلا پھر کفر کی دلدل میں جا پھنسنے کا کیا موقع ہے، اور بالخصوص اس حالت میں جب کہ خدا کے رسول بہ نفس نفیس تمہارے درمیان موجود ہوں اور تمہیں خدا کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سنا رہے ہوں۔ البتہ کشاکش کے سنگین دور میں حق پر جمے رہنے کی صورت صرف یہی ہے کہ اللہ کے دامن کو مضبوط تھامے رہو۔ اسی کو حقیقی سہارا سمجھو۔ اس کے دامن میں پناہ ڈھونڈو۔ اس کے احکام کی مخلصانہ پیروی کرو، اس کی نافرمانی سے بچو اور اسی سے دعائیں مانگتے رہو۔

اہل کفر کے آگے ہرگز نہ جھکو

وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ (ہود ۱۱۳)

اور ان ظالموں کی طرف ہرگز نہ جھکنا ورنہ جہنم کی لپیٹ میں آجاؤ گے اور تمہیں کوئی ایسا حامی نہ مل سکے گا جو خدا سے تمہیں بچا سکے اور کہیں سے تم کو مدد نہ پہنچے گی

اہل کفر سے ہوشیار رہو

وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ (المائدہ ۴۹)

اور ہوشیار رہو کہ یہ لوگ تم کو فتنے میں ڈال کر اس ہدایت سے ذرہ برابر منحرف نہ کرنے پائیں جو خدا نے تمہاری طرف نازل کی ہے۔

اہل کفر کو دوست نہ بناؤ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ (النساء ۱۴۴)

اے ایمان والو! مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست نہ بناؤ۔

فتنہ کا سدباب کرو

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (الانفال ۳۹)

اور ان باطل پرستوں سے جنگ کرتے رہو۔ یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورا کا پورا خدا کے لیے ہو جائے۔

فتنہ سے مراد ظلم و جبر اور فساد و سرکشی کی وہ حالت ہے جس میں انسان خدا کے سوا دو

کی اطاعت میں گرفتار ہو۔ اور خدا کے بندے خدا کی مخلصانہ بندگی نہ کرسکیں ــــ اہلِ حق کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے برابر اہلِ باطل سے لڑتے رہیں اور اس وقت چین سے بیٹھیں جب دین پورا کا پورا خدا کے لیے ہو جائے۔ اور نظامِ حق قائم ہو جائے جس کی بنیاد محض خدا کی اطاعت پر ہو ــــ اور ہر وہ فتنہ و فساد ظلم و جبر اور نظامِ باطل مغلوب اور بے اثر ہو جائے جو خدا کے بندوں کو خدا کی بندگی سے روکنے والا ہو۔

اقامتِ دین کے اصول و احکام

اقامتِ دین کی جس عظیم ذمہ داری پر امت مامور کی گئی ہے قرآن نے تفصیل کے ساتھ اس کے اصول و احکام بھی بیان کیے ہیں اور پیغمبروں کی تاریخ سے اس راہ کے ایک ایک مرحلہ کو بھی واضح کیا ہے۔

تعمیرِ سیرت دین کو قائم کرنے کا نصب العین لے کر اٹھنے والوں کے لیے قرآن حکیم کی اولین ہدایت یہ ہے کہ سب سے پہلے اپنی ذات پر دین کو قائم کریں اور سیرت و کردار کے ہر گوشے میں اسلام کا سچا نمونہ بنکر رہیں۔

ایمانِ کامل

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ	مومن تو حقیقت میں وہی لوگ ہیں جو
اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ	اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لائے (اور
لَمْ یَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ	ایسا ایمان لائے کہ) پھر انھیں کوئی شک اور
وَاَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ	تذبذب نہ رہا اور وہ برابر لڑتے رہے خدا کی
اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ	راہ میں اپنی جانوں سے اور اپنے مال سے۔
(الحجرات: ۱۵)	دراصل یہی لوگ ہیں جو اپنے ایمان میں سچے ہیں

اس راہ کا اصل سرمایہ ایمانِ کامل ہے۔ اس کے بغیر نہ اس راہ میں چلنے کا سوال پیدا ہوتا ہے نہ تصور کیا جا سکتا ہے ــــ ایمانِ کامل درحقیقت وہی ہے جس پر شک اور تذبذب کا سایہ بھی نہ پڑا ہو۔ ایسا ہی ایمان مومن میں یہ حوصلہ ابھارتا ہے کہ وہ اپنا جان و مال سب کچھ خدا کی راہ میں جھونک دیتا ہے۔

مخلصانہ عبادت

وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ وَيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ

اور ان کو حکم دیا گیا تھا تو صرف یہ کہ یکسوئی کے ساتھ خدا کی مخلصانہ عبادت کریں نماز قائم کریں، زکوٰۃ دیں۔ یہی سیدھا سچا دین ہے

ایمان کے بعد مومن کا محبوب عمل خدا کی مخلصانہ عبادت ہے۔ عبادات سے شغف کے بغیر مومن نہ دین کی راہ میں جم سکتا ہے نہ آگے بڑھ سکتا ہے۔ عبادات ہی سے ایمان کا اظہار بھی ہوتا ہے اور عبادات ہی سے "ایمان" کو زندگی کی قوت بھی ملتی ہے۔

اقامت صلوٰۃ اور خدا سے وابستگی

هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِنْ قَبْلُ وَفِي هٰذَا لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ فَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا

اس نے پہلے ہی سے تمہارا نام مسلم رکھا تھا اور اسی کام کے پیش نظر تاکہ رسول تم پر گواہ ہوں اور تم لوگوں پر گواہ بنو۔ پس نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔ اور اللہ سے تعلق مضبوط رکھو۔

مسلم ہر وہ شخص ہے جو خدا کے دین کو مان کر خدا کی مکمل اطاعت میں اپنے آپ کو دے دے اور فکر و نظر، عقیدہ و عمل، اخلاق و کردار اور سلوک و معاملات غرض پوری زندگی میں قانون الٰہی کی بالاتری تسلیم کر کے اس کی مکمل پیروی کرے۔ اس مفہوم کے لحاظ سے وہ تمام انسان مسلم ہی تھے جو کسی بھی نبی پر ایمان لا کر اور کسی بھی خدائی دین کو مان کر اس کی پیروی کرتے رہے ہیں لیکن یہ آخری امت خصوصیت کے ساتھ "امت مسلمہ" کے لقب سے اور اس کے افراد مسلم کے خطاب سے اس لیے نوازے گئے کہ ان کے اندر یہ صفت "اسلامیت" بدرجہ اتم پائی جاتی ہے اور ان کو اس دین کا حامل بنایا گیا ہے جس کا خطاب پوری انسانیت سے ہے جو پوری زندگی کا قانون ہے اور جو اب رہتی دنیا تک کے لیے آخری مستند دین ہے۔

اس گراں ترین ذمہ داری پر جو امت فائز کی گئی ہے اور امت مسلمہ کے عظیم ترین خطاب سے نوازی گئی ہے اس کو تین بنیادی اور امتیازی اعمال کی تاکید کی گئی ہے اور اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ یہ تمہارے منصبی اعمال ہیں: اقامت صلوٰۃ، ادائے زکوٰۃ اور اعتصام باللہ۔

خدا کو اپنا معبود جان کر اس کا قرب چاہنا، اسی سے دعائیں مانگنا، اسی کی پناہ ڈھونڈھنا اسی کے احکام کی مخلصانہ اطاعت کرنا اس کی نافرمانی سے بھاگنا اور ہر حال میں اسی پر بھروسہ رکھنا ـــــ اس کیفیت کا نام اعتصام باللہ ہے۔

یہ روحانی کیفیت نماز کے بغیر ہرگز پیدا نہیں ہوسکتی۔ نماز ہی بندے کو خدا کا قرب بخشتی ہے، اس پر بھروسے کی قوت پیدا کرتی ہے۔ اور اس کی طرف بڑھنے اور اس کی خاطر سب کچھ قربان کر دینے کا جذبہ پیدا کرتی ہے ـــــ اور ایک ایسا شخص ہی شہادت علی الناس کا گراں ترین فریضہ انجام دے سکتا ہے جس میں یہ روحانی قوت اور ایمانی کیفیت پائی جائے۔ نماز شہادت علی الناس کے لیے تیار رکھنے والا ایک منصبی عمل بھی ہے اور بطور خود دین حق کی شہادت بھی، تصور نہیں کیا جا سکتا کہ ان بنیادی اعمال کے بغیر امت مسلمہ شہادت علی الناس کی ذمہ داری پوری کر سکے گی ـــــ اور پھر نماز اور زکوٰۃ کے علاوہ وہ کون سا عمل ہوگا جو امت مسلمہ انجام دے گی ـــــ جسے انجام دے کر وہ خود بھی بندگی رب کا حق ادا کرے گی اور دوسروں کو بھی خدا کی بندگی کے لیے تیار کرے گی۔

کامل پیروی

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ اِنَّہٗ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ (البقرۃ ۲۰۸)	مومنو! تم پوری طرح سب مل کر اسلام میں داخل ہو جاؤ۔ اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے

یعنی ہر معاملہ میں اسلام کی پیروی کرو۔ اسلام ہی سلامتی اور عافیت کا گہوارہ ہے اور زندگی کے کسی گوشے میں بھی اسلام سے ہٹ کر شیطان کی پیروی مت کرو۔

پاکیزہ کردار

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (آل عمران ۱۰۲)	اے ایمان والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو، جیسا کہ اس سے تقوے کرنے کا حق ہے اور دیکھو تمہیں موت آئے تو اسی حال میں کہ تم مسلمان فرماں بردار ہو

یعنی جب تم ایمان کے لقب سے متصف ہوئے ہو تو تمہیں چاہیے کہ مرتے دم تک تقوٰ

اور اطاعت کے جوہروں سے اپنے کردار کو پاکیزہ تر بنانے کی کوشش برابر جاری رکھو

آزمائشوں میں صبر و ثبات

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ○ (البقرۃ: ۱۵۵، ۱۵۶)

اور ہم تمہیں خوف و خطر، فقر و فاقہ، جان و مال کی تباہی اور پیداوار کے نقصانات میں مبتلا کر کے ضرور آزمائیں گے اور بشارت ان کو دے دیجیے جو ان حالات میں صبر و ثبات سے کام لیں۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان پر کوئی مصیبت آپڑتی ہے تو یہی کہتے ہیں کہ ہم خدا ہی کے ہیں اور ہمیں خدا ہی کی طرف پلٹنا ہے۔

آزمائشوں کی حکمت و غرض

أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُّتْرَكُوا أَنْ يَّقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ ○ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِينَ صَدَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِينَ ○ (العنکبوت۔۲،۱)

کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ "ہم ایمان لے آئے" اور انہیں آزمایا نہ جائے گا۔ حالانکہ ہم نے ان سب لوگوں کو بھی آزمایا تھا جو ان سے پہلے ہو گزرے ہیں۔ اللہ تو یہ دیکھ کر رہے گا کہ تم میں کون اپنے ایمان میں سچے ہیں اور کون جھوٹے ہیں۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصَّابِرِينَ ○ (آل عمران:۔۱۴۲)

کیا تم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ یوں ہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے وہ کون ہیں جو اللہ کی راہ میں جانیں لڑانے والے اور اس کی خاطر صبر و ثبات دکھانے والے ہیں

یعنی جو لوگ بھی ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں اور خدا کی وفاداری کا دم بھرتے ہیں خدا تعالیٰ

ان کو مختلف قسم کی آزمائشوں سے لازماً گذارتا ہے۔ تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ کون اپنے دعویٰ ایمان میں سچا ہے اور کون جھوٹا ہے۔

اتحادِ قول و عمل

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ

اے ایمان والو! وہ بات تم کیوں کہتے ہو جس کو تم کرتے نہیں ہو۔

یعنی جن باتوں کو تم دوسروں کے سامنے پیش کرو، خود تمہارا عمل بھی اس کے مطابق ہونا چاہیے۔ تب ہی تمہاری بات میں وزن ہوگا اور اسے لوگ قبول کر سکیں گے

أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ (البقرہ ۵)

کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور خود کو بھول جاتے ہو

جو شخص خود کو بھلا کر دوسروں کو نیکی کی دعوت دیتا ہے وہ زبردست جاہل اور انتہائی نادان ہے۔ اپنا بھی دشمن ہے اور اپنے دین کا بھی خود تو وہ دین کی برکتوں سے محروم رہے ہی دنیا بھی اس کی نصیحت سے کوئی اثر نہ لے گی۔

عملی نمونہ کی اہمیت

وَمَا أُرِيدُ أَنْ أُخَالِفَكُمْ إِلَىٰ مَا أَنْهَاكُمْ عَنْهُ (ہود ۸۸)

اور میں ہرگز نہیں چاہتا کہ جن باتوں سے میں تم کو روکتا ہوں خود ان باتوں کو کرنے لگوں

یعنی اس دعوت کے سچا ہونے کی سب سے بڑی دلیل اور زندہ شہادت یہ ہے کہ میں خود بھی اس پر پوری طرح عمل کر رہا ہوں۔ آدمی دوسرے کا خیرخواہ ہو یا نہ ہو اپنا خیرخواہ یقیناً ہوتا ہے۔

ذکر و فکر

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِأُولِي الْأَلْبَابِ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ

بلاشبہ آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات اور دن کے آنے جانے میں بہت نشانیاں ہیں ان عقل والوں کے لیے جو اللہ کو یاد کرتے رہتے ہیں کھڑے بیٹھے اور لیٹے ہر حال میں اور غور و فکر کرتے رہتے ہیں آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں، جو

تبلیغ میں

وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ٥

(آل عمران ۔ ١٩٠، ١٩١)

بے اختیار پکار اٹھتے ہیں) پروردگار! یہ کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ۔ تو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے پس اے رب ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے

سیرت کی تعمیر کے لیے ضروری ہے کہ داعی دنیا میں غافلوں کی سی زندگی نہ گزارے بلکہ کائنات کی نشانیوں پر سوچتا رہے اور حقیقت کو پالینے کی برابر کوشش کرتا رہے اور اس خدا کی یاد سے کبھی غافل نہ ہو جس نے اس کائنات کو انتہائی حکمت کے ساتھ پیدا فرمایا ہے ۔ خدا کی یاد کے بغیر غور و فکر بے نتیجہ ہے اور غور و فکر کے بغیر خدا کی یاد میں گہرائی پیدا نہیں ہوسکتی ۔ اس لیے داعیٔ حق کے لیے ضروری ہے کہ وہ ذکر اور فکر دونوں کا اہتمام کرے

قرآن میں تدبر

كِتَابٌ اَنْزَلْنَاهُ اِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِيَدَّبَّرُوْا اٰيَاتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ٥ (ص: ٢٩)

یہ کتاب جو ہم نے آپ کی طرف بھیجی ہے سرتاسر برکت ہے تاکہ لوگ اس کی آیتوں میں غور و تدبر کریں اور عقل سلیم رکھنے والے اس سے سبق حاصل کریں

خدا کی کتاب جو ہدایت و عبرت کا واحد سرچشمہ ہے اسی لیے نازل ہوئی ہے کہ عقل و خرد والے اس میں غور و تدبر کریں اور اس کی رہنمائی میں زندگیوں کی تعمیر کریں ۔ خدا کے دین کو وہی لوگ قائم کرسکتے ہیں جن کے غور و فکر کا مرکز اور دلچسپی کا محور خدا کی کتاب ہو۔

نظامِ جماعت

دینی اجتماعیت کی اہمیت

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا اٰبَاءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَاءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ

اے ایمان والو! اپنے باپوں اور بھائیوں کو بھی اپنا رفیق نہ بناؤ اگر وہ ایمان پر کفر کو ترجیح دیں تم میں سے جو ان کو رفیق بنائیں گے وہی لوگ ظالم ہیں۔

بلاشبہ باپ اور بھائی کا رشتہ قریب ترین رشتہ ہے اور ان سے قلبی لگاؤ اور محبت
یک فطری بات ہے۔ لیکن دین کی بنیاد پر جو اجتماعیت وجود میں آتی ہے اس کے نزدیک
صل رشتہ ایمان و اسلام کا رشتہ ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ اگر تمہارے باپ اور بھائی
بھی ایمان کے مقابلہ میں کفر کو عزیز رکھیں تو پھر تمہارے دلوں میں ان کے لیے محبت و رفاقت کے
جذبات ہرگز نہ ہونے چاہییں۔ یہ بڑا ظلم ہو گا کہ تم خدا پر ایمان بھی لاؤ اور خدا کے دشمنوں کو
عزیز بھی رکھو۔

وَلَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ	تم اس گروہ کو جو اللہ اور یوم آخر
بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَادُّوْنَ	پر ایمان رکھتا ہے ان لوگوں سے محبت اور
مَنْ حَادَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَ	الفت کرتے نہ دیکھو گے جو خدا اور رسول
لَوْ كَانُوْا اٰبَاءَهُمْ اَوْ	کے دشمن اور مخالفت پر کمربستہ ہوں چاہے
اَبْنَاءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ	وہ ان کے اپنے ہی باپ یا اپنے ہی بیٹے یا
اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ	اپنے ہی بھائی یا اپنے خاندان والے کیوں
(مجادلہ: ۲۲)	نہ ہوں

اجتماعیت کی بنیاد

وَاعْتَصِمُوْا	تم سب مل کر خدا کی رسی کو مضبوط
بِحَبْلِ اللّٰهِ	پکڑے رہنا اور الگ الگ فرقے نہ بن جانا
جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا	اور خدا کے اس احسان کو یاد رکھنا جو اس نے
نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ	تم پر کیا ہے۔ تم ایک دوسرے کے دشمن
كُنْتُمْ اَعْدَاءً فَاَلَّفَ بَيْنَ	تھے اس نے تمہارے دل جوڑ دیے اور تم
قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖ	اس کے فضل و کرم سے بھائی بھائی بن گئے
اِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ	تم آگ سے بھرے ہوئے ایک گڑھے کے
مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا	کنارے کھڑے تھے۔ اللہ نے تم کو اس
(آل عمران- ۱۰۳)	سے بچا لیا۔

خدا کی رسی سے مراد اسلام ہے۔ اسلام ہی خدا کا وہ عظیم احسان ہے جس کی بدولت صدیوں

سے خانہ جنگی میں مبتلا ایک دوسرے کے خون کے پیاسے قبیلے آپس میں شیر و شکر ہو گئے اور ان میں بے مثال دینی اخوت قائم ہو گئی

قرآن کے نزدیک مسلمانوں کی عالمگیر وحدت و اخوت کی بنیاد صرف اسلام ہے اس لیے وہ محض اجتماعیت اور اتحاد کی تاکید نہیں کرتا بلکہ اس اجتماعیت اور اتحاد کی تاکید کرتا ہے جس کی بنیاد اسلام ہو۔ اسلام کے سوا کوئی بھی بنیاد مسلمانوں کو جوڑنے والی نہیں بلکہ پارہ پارہ کر دینے والی ہے۔

مثالی اجتماعیت

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ — بلاشبہ خدا ان لوگوں کو اپنا محبوب بناتا
الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ — ہے جو اس راہ میں اس استقلال کے ساتھ
فِیْ سَبِیْلِہٖ صَفًّا کَاَنَّھُمْ — صف باندھے لڑتے ہیں گویا کہ سیسہ پلائی
بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ (الصف:۴) — ہوئی دیوار ہیں

جماعت میں باہمی برتاؤ

رُحَمَآءُ — آپس میں ایک دوسرے پر رحم
بَیْنَھُمْ (الفتح:۲۹) — کرنے والے
اَذِلَّۃٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ (المائدۃ:۵۴) — مومنوں کے حق میں نہایت نرم

باہمی تلقین

وَالْعَصْرِ۝ اِنَّ — زمانہ گواہ ہے کہ انسان گھاٹے
الْاِنْسَانَ لَفِیْ — میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان
خُسْرٍ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا — لائے اور جو عمل صالح کرتے رہے اور
الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا — جو ایک دوسرے کو دین حق کی وصیت
بِالصَّبْرِ۝ (العصر) — کرتے رہے اور صبر و ثبات کی تلقین کرتے رہے

باہمی تعاون

وَتَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ — اور نیکی اور خدا ترسی کے کاموں
وَالتَّقْوٰی (المائدۃ:۲) — میں ایک دوسرے کی مدد کرو۔

یعنی اسلامی جمعیت کے افراد میں خود غرضی اور نفسا نفسی نہیں ہوتی بلکہ وہ نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے کا تعاون کرتے ہیں۔

خوشگوار تعلقات

فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَ — پس اللہ سے ڈرو اور اپنے

وَاَصْلِحُوا ذَاتَ بَیْنِکُمْ (الانفال ۱) — کے تعلقات کی اصلاح کرو

گروہ بندی سے بچنے کی تاکید

وَلَا تَفَرَّقُوا (آل عمران ۱۰۳) — اور الگ الگ فرقے نہ بن جانا

وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ — اور اللہ اور اس کے رسول کے

وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا — کہنے پر چلو اور آپس میں لڑو جھگڑو

وَتَذْھَبَ رِیْحُکُمْ — نہیں ورنہ تم کمزور پڑ جاؤ گے اور

(انفال - ۴۶) — ہوا اکھڑ جائے گی -

امیر کی اطاعت

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوا — مومنو! اطاعت کرو اللہ کی اور

اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ — اطاعت کرو اس رسول کی اور ان

وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ (النساء ۵۹) — اصحاب امر کی جو تم میں سے ہوں

خدا اور رسول کی اطاعت کے بعد تیسری اطاعت جو اسلامی نظام میں مسلمانوں پر واجب ہے وہ ان اصحاب امر کی اطاعت ہے جو مسلمانوں کے کسی بھی اجتماعی معاملہ کے ذمہ دار بنائے گئے ہوں مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ خوش دلی کے ساتھ ان کی اطاعت کریں چاہے ان امراء کے احکام ان کی مرضی کے مطابق ہوں یا ان کی مرضی کے خلاف

البتہ ان امراء کی اطاعت کے کچھ حدود و شرائط ہیں

پہلی شرط یہ ہے کہ وہ خود بھی خدا اور رسول کے فرماں بردار ہوں، جیسا کہ قرآن کے خطاب سے ظاہر ہے - "ایمان والو! اللہ اور رسول کی اطاعت کرو" بلاشبہ اس خطاب میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو مسلمانوں کے ذمہ دار ہیں -

اطاعت کی حد یہ ہے کہ صرف ان باتوں میں اطاعت کی جائے جو خدا اور رسول کی اطاعت کے تحت ہوں، نہ کہ اس سے آزاد یا اس کے خلاف ہوں - یہ بات خود قرآن کے بیان سے بھی ظاہر ہے - اس لیے کہ خدا اور رسول کے مطیع فرمان وہی امراء ہوں گے جو نیک اور معروف باتوں کا حکم دیں نہ کہ وہ جھگڑا اور گناہ کی باتوں کے احکام صادر فرمائیں - نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وضاحت یوں فرمائی ہے -

مسلمان پر واجب ہے کہ وہ اپنے ذمہ دار کی بات سنے اور مانے خواہ وہ حکم اس کے لیے خوش گوار ہو یا ناگوار ہو بشرطیکہ وہ خدا کی نافرمانی کا حکم نہ ہو اور جب اسے خدا کی نافرمانی کا حکم دیا جائے تو وہ بات نہ سننی چاہیے اور نہ ماننی چاہیے۔

امیر و مامور کے اختلاف کا حل

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا (النساء ۵۹)

پھر اگر کسی معاملہ میں تمہارے درمیان نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو۔ اگر تم واقعی سچے دل سے خدا اور رسول کو مانتے ہو یہی ایک صحیح طریق کار ہے اور اسی کا انجام بھی اچھا ہے

یعنی اگر مسلمانوں میں باہم اختلافات اور جھگڑے اٹھ کھڑے ہوں یا امیر و مامور کے درمیان کوئی نزاع پیدا ہو جائے تو اس کا حل صرف یہ ہے کہ وہ خدا اور رسول کی طرف رجوع کریں اور کتاب و سنت کی روشنی میں اس اختلاف کا حل نکالیں۔ پھر ہدایت کے ان سرچشموں سے جو بھی فیصلہ انھیں ملے بے چون و چرا اس کے آگے سر تسلیم خم کر دیں۔

نظام جماعت کی دینی حیثیت

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰۤی اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ یَذْهَبُوْا حَتّٰی یَسْتَاْذِنُوْهُ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (النور ۶۲)

مومن تو حقیقت میں وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کو دل سے مانیں اور جب کسی اجتماعی کام کے موقع پر رسول کے ساتھ ہوں تو ان سے اجازت لیے بغیر نہ جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ آپ سے اجازت لیتے ہیں وہی لوگ اللہ اور اس کے رسول کو ماننے والے ہیں۔

قرآن کے عمومی انداز کے مطابق یہاں بھی رسول کو خطاب کر کے ایک اصولی اور دائمی ہدایت دی جاتی ہے۔ دین کے اجتماعی معاملات میں جو حکم نبی علیہ السلام کے سلسلہ میں دیا جا رہا ہے یہی حکم آپ کے بعد آپ کے جانشینوں کا بھی ہے اور یہی حکم ان تمام لوگوں کا ہے جو کسی بھی دور میں اسلامی تحریک کے ذمہ دار رہیں۔ نظم جماعت کی پابندی اور امیر کی اطاعت محض ایک قانونی

معاملہ نہیں ہے بلکہ قرآن نے اسے بڑی اہم دینی حیثیت دی ہے۔ قرآن انہی لوگوں کے ایمان کی سچائی کی شہادت دیتا ہے۔ جو نظم جماعت کے پابند ہوں اور کسی جماعتی ڈیوٹی سے اسی وقت ہٹیں جب اپنے سربراہ کار سے اجازت حاصل کر لیں۔

اسلامی جماعت کا امیر اور اس کے اوصاف

انتخاب امیر کا معیار

يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (الحجرات ۱۳)

لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہارے کنبے اور قبیلے بنائے تاکہ تم باہم پہچانے جاؤ۔ البتہ خدا کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ باعزت وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔

دنیا کے سارے ہی انسان ایک ماں باپ کی اولاد ہیں اور سب برابر ہیں کسی کو کسی پر کوئی بڑائی نہیں مختلف قبیلے اور قومیں بھی محض اس لیے ہیں کہ ان میں باہم شناخت ہو سکے بزرگی اور بڑائی کا معیار صرف خدا کا تقویٰ ہے۔ اسلامی جماعت میں وہی شخص سب سے زیادہ اونچا اور معزز ہے جو سب سے زیادہ خدا ترس ہے۔

انتخاب کی دینی حیثیت

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا (النساء ۵۸)

بلا شبہ اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم اپنی امانتیں انہیں کے سپرد کرو جو اس کے اہل ہیں۔

یہ ایک اصولی ہدایت ہے لیکن سلسلۂ بیان میں امانتوں سے مراد خاص طور پر اسلامی جماعت کی ذمہ داریاں ہیں یعنی اسلامی جماعت کی رہنمائی اور قیادت کی ذمہ داری کے لیے ایسے موزوں اور اہل ترین افراد کا انتخاب کرو جن میں اس بارِ امانت کے اٹھانے کی صلاحیت و اہلیت ہو۔ دینی پیشوائی کے لیے موزوں ترین انتخاب ایک خالص دینی فریضہ ہے جس کے لیے قرآن نے امانت کی ادائیگی کا [illegible] اختیار کیا ہے۔ اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم اپنی امانتیں ان لوگوں کے سپرد کرو

جو اس کے اہل ہوں۔

جماعتی کاموں میں مشورہ کی تاکید

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (آل عمران) — اور دین کے معاملات میں ان لوگوں سے مشورہ کیجیے

جو حکم حضورؐ کو دیا گیا ہے یہی حکم ان تمام لوگوں کے لیے ہے جو کسی بھی دور میں اسلامی جماعت کے ذمہ دار بنائے جائیں۔ قرآن کی تاکید یہ ہے کہ اسلامی جماعت کا نظام شورائی اور امیر جماعتی کاموں میں جماعت سے مشورہ لینے کا پابند رہے۔

مومنوں کا اکرام

إِذَا جَاءَكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِنَا فَقُلْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ (الانعام: ۵۴) — اور جب آپ کے پاس وہ لوگ آئیں جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں تو ان سے کہیے تم پر خدا کی طرف سے سلامتی ہو۔

یعنی جماعت کے افراد جب اپنے ذمہ دار کے پاس پہنچیں تو وہ خندہ پیشانی کے ساتھ اچھے انداز اور دعاؤں کے ساتھ ان کا استقبال کرے۔

رفقاء جماعت کی اہمیت کا احساس

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ تُرِيدُ زِينَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا۔ (الکہف ۲۸) — اور اپنے آپ کو ان لوگوں کی معیت پر مطمئن رکھیے جو اپنے رب کی رضا کے طلبگار بن کر صبح و شام اس کو پکارتے رہتے ہیں اور ان کو نظر انداز کرکے دنیوی شان و شوکت کی طلب میں اپنی نگاہیں آگے نہ دوڑائیے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے اسلامی جماعت کے ذمہ داروں کو ہمیشہ کے لیے ایک اہم اصولی حقیقت سمجھائی جا رہی ہے کہ آپ کا اصل سرمایہ اور آپ کی توجہ کے اصل مستحق وہ لوگ ہیں جو ایمان کی دولت سے مالامال ہو کر آپ کے ساتھ ہو گئے ہیں۔ دنیوی اعتبار سے خواہ ان ناداروں اور کمزوروں کی کوئی حیثیت نہ ہو۔ لیکن خدائی نظر میں یہ دنیا کے ان بڑے بڑے سرداروں اور لیڈروں سے کہیں زیادہ قدر و عظمت اور عزت و وقعت کے لائق ہیں جو اگرچہ جاہ و منصب اور دنیوی شان و شوکت سے تو آراستہ ہیں لیکن دولت ایمان سے محروم ہیں۔

مشفقانہ برتاؤ

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ۝ (الشعراء ۲۱۵)

اور آپ اپنے شفقت کے بازو پھیلا دیجیے ان مومنین کے لیے جو آپ کی پیروی کر رہے ہیں۔

رحم اور نرم دلی

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ (آل عمران ۱۵۹)

یہ خدا کی رحمت ہی تو ہے آپ ان لوگوں کے لیے انتہائی نرم دل ہیں ورنہ اگر کہیں آپ سخت مزاج اور سخت گیر ہوتے تو یہ سب آپ کے گرد و پیش سے چھٹ جاتے

جرأتِ اقدام

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ (آل عمران ۱۵۹)

اور دینی کاموں میں ان سے مشورہ کیجیے۔ پھر جب آپ کسی کام کا پختہ فیصلہ کر لیں تو اللہ پر بھروسہ رکھیے۔

یعنی جب کسی دینی معاملہ میں رفقاء سے مشورہ لینے کے بعد آپ کسی نتیجے پر پہنچ جائیں اور اس کام کو انجام دینے کا عزم کر لیں تو پھر پوری ہمت اور جرأت کے ساتھ تمام اندیشوں اور آزمائشوں سے بے نیاز ہو کر اقدام کیجیے اور صرف اللہ ہی کا سہارا پکڑیے۔ یہی وہ سہارا ہے جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں۔

نظمِ جماعت کا اہتمام

فَإِذَا اسْتَأْذَنُوكَ لِبَعْضِ شَأْنِهِمْ فَأْذَن لِّمَن شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللَّهَ۔ (النور ۶۲)

تو جب وہ اپنے کسی خاص کام کے لیے آپ سے اجازت مانگیں تو آپ جس کو چاہیں اجازت دے دیا کریں اور ان لوگوں کے حق میں خدا سے استغفار بھی کیا کریں۔

یعنی جب مسلمان کسی اجتماعی کام کے لیے جمع ہوں اور پھر بعض لوگ اپنی ضرورت اور عذر سے اجازت چاہیں تو سربراہِ جماعت کا فرض ہے کہ وہ نظمِ جماعت کا پورا پورا اہتمام کرے اور صرف انھی لوگوں کو اجازت دے جن کی ضرورت واقعی دینی اجتماعی کام کے مقابلے میں زیادہ اہم ہو۔ [illegible] قابلِ قبول ہو۔

دعوت و تبلیغ

اسلامی جماعت کا مقصد وجود

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (آل عمران ۱۰۴)

اور تم میں ایک جماعت تو ایسی ضرور ہی ہونی چاہیے جو خیر کی دعوت دے اچھے کاموں کا حکم دے اور برے کاموں سے روکے اور یہی لوگ ہیں جو فلاح و کامرانی پائیں گے

خیر سے مراد ہر وہ فطری بھلائی ہے جسے ہمیشہ انسانی فطرت نے بھلائی سمجھا اور جس کے بھلائی ہونے کی شہادت خود خدا کی کتاب نے بھی دی۔ ان تمام بھلائیوں کی ایک جامع اور مرتب شکل خدا کا بھیجا ہوا وہ دین ہے جو ہر دور میں انبیاء لاتے رہے ہیں اور جس کی آخری مکمل مستند اور محفوظ شکل وہ ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم قرآن و سنت کی شکل میں امت کو دے گئے ہیں۔

اسلامی جماعت کا مقصد وجود یہ ہے کہ وہ سارے انسانوں کو اس دین کی دعوت دے اور ایک ایسی غالب قوت بن کر رہے کہ وہ بھلائیوں کو اپنے قانون اور حکم سے نافذ کرے اور برائیوں کا سدباب کرے۔

قرآن کا اندازِ دعوت

اسلام کی بنیادی دعوت

وَاِبْرٰهِيْمَ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا وَّتَخْلُقُوْنَ

اور ابراہیم کے قصے سے نصیحت حاصل کرو جب کہ انھوں نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا۔ اللہ واحد کی بندگی کرو اور اس سے ڈرو۔ اگر تمہارے اندر کچھ سمجھ ہے تو یہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔ تم [illegible]

إِفْكًا ۚ إِنَّ الَّذِينَ تَعْبُدُونَ	ہیں اور تم ایک جھوٹ گھڑ رہے ہو (جس
مِن دُونِ اللَّهِ لَا يَمْلِكُونَ	کے لیے کوئی معقول وجہ نہیں ہے) واقعہ
لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوا عِندَ	یہ ہے کہ خدا کو چھوڑ کر تم جن کو پوج رہے
اللَّهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوهُ	ہو وہ تو تمہیں کوئی رزق دینے کا بھی
وَاشْكُرُوا لَهُ ۖ إِلَيْهِ	اختیار نہیں رکھتے۔ بس اللہ ہی سے رزق
تُرْجَعُونَ ۝	مانگو اسی کی بندگی کرو۔ اور اسی کا شکر ادا
(العنکبوت ۲)	کرو۔ اسی کی طرف تم پلٹائے جاؤگے۔

شرک ایک بے حقیقت چیز ہے اور کائنات میں اس کے جواز کے لیے کوئی معقول وجہ موجود نہیں ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے ان چند جملوں میں نہایت اختصار اور حکمت کے ساتھ ان تمام دلائل کی طرف بلیغ اشارے کر دیے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان میں ذرا بھی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہو تو کبھی ایسی بے معنی چیز کو زندگی کی بنیاد نہیں بنا سکتا۔ کسی کی بندگی کے لیے کوئی معقول وجہ ہونی چاہیے یہ بت بے جان پتھر ہیں محض پتھر ہرگز اس کے مستحق نہیں ہیں کہ ان کی بندگی کی جائے نہ یہ انسان کے خالق ہیں کہ نہ وہ اپنی زندگی کے لیے ان کا محتاج ہو نہ یہ انسان کو رزق دینے والے ہیں کہ وہ زندگی کی بقا میں ان کا دست نگر ہو نہ انسان کا مستقبل ان سے وابستہ ہے کہ وہ اپنے انجام کی خاطر ان کی پوجا کرے پھر آخر کس وجہ سے ان کی پوجا کی جائے؟ علم وعقل سے کام لینے والا جب بھی سوچے گا اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ بندگی کا مستحق صرف وہی ایک خدا ہے جس نے انسان کو وجود کی نعمت بخشی، جو انسان کی پرورش کر رہا ہے اور جس کے پاس آخرکار انسان کو پلٹ کر جانا ہے۔

بندۂ مومن کی فکر انگیز دعوت

وَقَالَ الَّذِي آمَنَ يَا قَوْمِ	اور بندہ مومن نے اپنی قوم سے کہا
اتَّبِعُونِ أَهْدِكُمْ سَبِيلَ	بھائیو! میرے نقش قدم پر چلو۔ میں تمہیں ٹھیک
الرَّشَادِ يَا قَوْمِ إِنَّمَا هَٰذِهِ	کی شاہراہ پر چلاؤں گا۔ بھائیو! یہ دنیا کی
الْحَيَاةُ الدُّنْيَا مَتَاعٌ وَإِنَّ	زندگی (عارضی [illegible]) ہے اور آخرت
الْآخِرَةَ هِيَ دَارُ الْقَرَارِ	ہی ہمیشہ کی قرارگاہ ہے جو برائی کرے گا
	[illegible] بدلہ پائے گا اور جو نیک

عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا يُجْزٰى
اِلَّا مِثْلَهَا وَمَنْ عَمِلَ
صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ
هُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ
الْجَنَّةَ يُرْزَقُوْنَ فِيْهَا بِغَيْرِ
حِسَابٍ ۝ وَيٰقَوْمِ مَا لِيْٓ اَدْعُوْكُمْ
اِلَى النَّجٰوةِ وَتَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَى
النَّارِ تَدْعُوْنَنِيْ لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ
وَاُشْرِكَ بِهٖ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ
عِلْمٌ وَّاَنَا اَدْعُوْكُمْ اِلَى
الْعَزِيْزِ الْغَفَّارِ لَا جَرَمَ اَنَّمَا
تَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ لَيْسَ لَهٗ
دَعْوَةٌ فِي الدُّنْيَا وَلَا
فِي الْاٰخِرَةِ وَاَنَّ مَرَدَّنَآ
اِلَى اللّٰهِ وَاَنَّ الْمُسْرِفِيْنَ
هُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ

(المومن ۳۸-۴۳)

عمل کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت البتہ
ہو صاحب ایمان تو ایسے لوگ جنت میں
جائیں گے وہاں ان کو بے حد و حساب نعمتیں دی
جائیں گی۔ اور اے میرے بھائیو! ذرا میری حالت
پر غور کرو۔ میں تو تمہیں نجات کی طرف دعوت
دے رہا ہوں اور تم مجھے جہنم کی آگ کی طرف
بلا رہے ہو! تم مجھے دعوت دے رہے ہو کہ
میں خدا کا ناشکرا بنوں اور اس کے ساتھ
شرک کروں جس کے لیے میرے پاس کوئی علم اور
دلیل نہیں اور میں تمہیں دعوت دے رہا
ہوں اس خدا کی طرف جو سب پر غالب ہے
اور جو بہت زیادہ بخشنے والا ہے۔ سچ تو
یہ ہے کہ جس چیز کی طرف تم مجھے بلا رہے ہو
اس کی پکار نہ دنیا میں ہے اور نہ آخرت میں
اور یہ حقیقت ہے کہ ہم سب کا پلٹنا اللہ ہی
کے پاس ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ حد سے
نکلنے والے دوزخی ہیں۔

فکرونظر کی اصلاح

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ
نَبَاَ اِبْرٰهِيْمَ ۝
اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ
قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ
لَهَا عٰكِفِيْنَ ۝ قَالَ هَلْ
يَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ

اور ان کو ابراہیم کا قصہ سناؤ جب
انھوں نے اپنے باپ اور قوم کے لوگوں سے
پوچھا یہ کیا ہیں جن کو تم پوج رہے ہو؟ انھوں
نے جواب دیا کہ یہ کچھ مورتیاں ہیں جن کو ہم پوجتے
ہیں اور جن کی سیوا میں لگے رہتے ہیں۔ ابراہیم
نے پوچھا کیا یہ تمہاری سنتے ہیں جب تم انہیں

اَوْ يَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ يَضُرُّوْنَ
قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَا اٰبَاءَنَا
كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ قَالَ
اَفَرَاَيْتُمْ مَا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ
اَنْتُمْ وَاٰبَاؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ
فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْ اِلَّا رَبَّ
الْعٰلَمِيْنَ o الَّذِيْ خَلَقَنِيْ
فَهُوَ يَهْدِيْنِ o الَّذِيْ هُوَ
يُطْعِمُنِيْ وَيَسْقِيْنِ o وَاِذَا
مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ o وَالَّذِيْ
يُمِيْتُنِيْ ثُمَّ يُحْيِيْنِ o وَالَّذِيْ
اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لِيْ خَطِيْٓئَتِيْ
يَوْمَ الدِّيْنِ

ہو یا یہ تمہیں کچھ نفع یا نقصان پہنچا سکتے ہیں؟
لوگوں نے جواب دیا نہیں بلکہ ہم نے اپنے باپ
دادا کو ایسا ہی کرتے دیکھا ہے۔ اس پر ابراہیم
نے کہا کیا تم نے کبھی ان پر غور کیا ہے جن کو
تم اور تمہارے پچھلے باپ دادا پوجتے رہے
ہیں۔ یہ سب میرے تو دشمن ہیں مگر ہاں ایک
رب العالمین (وہی بندگی کے لائق ہے) جس
نے مجھے پیدا کیا پھر وہی مجھے سیدھی راہ دکھاتا
ہے اور وہ جو مجھے کھلاتا ہے اور پلاتا ہے
اور جب میں بیمار پڑتا ہوں تو وہی مجھے شفا بخشتا
ہے اور وہ جو مجھے موت دے گا اور پھر دوبارہ
زندہ کرے گا اور وہ جس سے میں امید رکھتا
ہوں کہ روز جزا میں وہ میری خطاؤں سے درگزر
فرمائے گا۔

(الشعراء - ۶۹ - ۸۲)

ابراہیمؑ نے انتہائی حکمت کے ساتھ شرک کی تردید کی اور یہ حقیقت خود ان کی زبان سے واضح فرمائی کہ شرک کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ خود مشرکین کو بھی یہ اعتراف ہے کہ ہم ان معبودوں کی پوجا اس لیے نہیں کر رہے ہیں کہ ہمارے پاس کوئی علم یا دلیل ہے بلکہ ہم نے اپنے باپ دادا کو یونہی کرتے دیکھا ہے اور ان کی اندھی تقلید میں ہم بھی ایسا کر رہے ہیں۔ پھر ابراہیمؑ نے انتہائی حکیمانہ ترتیب کے ساتھ وہ وجوہ بیان کیے ہیں جن کی بنا پر صرف ایک اللہ ہی عبادت کا مستحق ٹھہرتا ہے وہ خالق ہے وہی ہدایت اور رہنمائی فرماتا ہے۔ وہی ہماری دنیوی ضرورتیں پوری کرتا ہے ہر طرح ہماری خبرگیری کرتا ہے۔ بیماری اور مصیبتوں سے نجات دیتا ہے۔ موت اور زندگی اسی کے اختیار میں ہے اور روز جزا کا وہی مالک ہے۔ وہی انسان کی کوتاہیوں کو معاف کر سکتا ہے۔

حکمتِ تبلیغ اُدْعُ اِلٰی سَبِيْلِ [illegible]

رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۝ (النحل ۱۲۵)

دیجیے حکمت کے ساتھ اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اور مباحثہ کیجیے تو ایسے طریقے پر جو انتہائی بھلا ہو۔

دعوت و تبلیغ کا سلیقہ اور حکمت بتاتے ہوئے قرآن نے تین جامع اور اصولی ہدایتیں دی ہیں۔

- حکمت کے ساتھ دعوت دو
- عمدہ نصیحت کے ساتھ دعوت دو
- مباحثہ اچھے طریقے پر کرو۔

حکمت کے ساتھ دعوت دینے کا مفہوم یہ ہے کہ داعی کو اپنی دعوت کے تقدس اور عظمت کا پورا پورا احساس رہے اور وہ اس دولت کو نادانی کے ساتھ یوں ہی نہ بکھیر دے۔ بلکہ موقع و محل کا بھی پورا پورا لحاظ رکھے اور مخاطب کا بھی۔ ہر طبقہ، ہر گروہ اور ہر فرد سے اس کی فکری رسائی استعداد، صلاحیت، ذہنی کیفیت اور سماجی حیثیت کے مطابق بات کہے[1]

عمدہ نصیحت کے ساتھ دعوت دینے سے مراد یہ ہے کہ داعی اس سوز، خیر خواہی اور خلوص کے ساتھ نیک جذبات کو ابھارے کہ مخاطب شوق و رغبت کے جذبات سے سرشار ہو جائے اور اسے محض عقلی اطمینان ہی حاصل نہ ہو بلکہ حق کے ساتھ اس کو جذباتی لگاؤ پیدا ہونے لگے[2]

اچھے طریقے پر مباحثہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ایسا سادہ اور دل نشین انداز اختیار کیا جائے کہ مخاطب میں ضد، نفرت، ہٹ دھرمی، تعصب اور حمیت جاہلیت کے جذبات نہ ابھریں بلکہ وہ واقعی کچھ سوچنے سمجھنے پر مجبور ہو اور اس میں حق کی طلب پیدا ہو اور جہاں یہ کیفیت پیدا ہوتی نظر آئے داعی کو چاہیے کہ وہ زبان بند کرے اور مجلس سے اٹھ کر چلا آئے۔

---

[1] اس کی وضاحت اور تفصیل جاننے کے لیے قرآن کے ان حصوں کا مطالعہ کرنا چاہیے جن میں پیغمبروں کی دعوت و تبلیغ کی روداد بیان کی گئی ہیں۔

[2] اس کی وضاحت کے لیے قرآن کے وہ حصے مطالعہ میں رکھے جائیں جن میں اعمال صالحہ کے لیے بے حساب اجر و انعام اور اعمال سیئہ کی ہولناک سزائیں اور جنت کی غیر فانی نعمتوں اور جہنم کے ابدی عذاب کے ذکر کے ساتھ وہ حصے جن میں پیغمبر اور ان کے ساتھیوں پر خدا کے انعام اور دین کے مخالفین کی تباہی کی داستانیں بیان ہوئی ہیں۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر

اوصاف

مولانا سید جلال الدین عمری

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کچھ خاص قسم کے اوصاف چاہتا ہے۔ جس شخص میں یہ اوصاف ہوں وہ اس کام کو ٹھیک ٹھیک اپنے تمام حدود و شرائط کے ساتھ انجام دے سکتا ہے اور جو ان اوصاف سے خالی ہو اس کے لیے اس کام کا حق ادا کرنا ممکن نہیں ہے۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے لیے جو اوصاف مطلوب ہیں ان میں سے بعض کا ذکر ہماری پچھلی بحثوں میں ضمناً آچکا ہے۔ یہاں ہم مزید چند اہم صفات کا ذکر کریں گے۔

نماز ۔ مومن دنیا میں معروف کا قائم کرنے والا اور منکر کا مٹانے والا ہے۔ خدا اور اس کے رسول نے انسان کو جس بات کا بھی حکم دیا ہے وہ معروف ہے اور جس چیز سے بھی منع کیا ہے وہ منکر ہے۔ یہ دو لفظ پورے دین پر حاوی ہیں۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر حقیقت میں اقامت دین کا دوسرا نام ہے۔ اتنا بڑا کام وہی لوگ انجام دے سکتے ہیں جن کی زندگیاں برائی سے پاک ہوں اور جو اپنے اوپر 'معروف' کو قائم کر چکے ہوں۔ جو شخص خود 'منکر' میں آلودہ ہو وہ دوسروں کو اس سے کیا روک سکتا ہے اور جس کی زندگی میں 'معروف' نہ ہو وہ کس منہ سے دوسروں پر 'معروف' کی تبلیغ کر سکتا ہے۔ دنیا میں انقلاب بے عمل واعظ نہیں لاتے بلکہ اس کے لیے باہمت لوگ درکار ہیں جو اپنی بات کے آپ نمونہ ہوں اور جو دوسروں کو کہنے سے پہلے خود عمل کر کے دکھائیں۔ نماز مومن کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ انجام دے سکے۔ دنیا کو بھلائی کا حکم دے سکے اور برائی سے روک سکے۔ حضرت لقمان علیہ السلام کی نصیحت میں اسی طرف اشارہ

کیا گیا ہے :۔

يَا بُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ	اے میرے بیٹے! نماز قائم کر اور
بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ	بھلائی کا حکم دے اور برائی سے منع کر اور
وَاصْبِرْ عَلٰى مَا اَصَابَكَ اِنَّ	اس راہ میں جو تکلیف پہنچے اس پر صبر کر۔
ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (لقمٰن : ١٧)	یقیناً یہ بڑی عزیمت کا کام ہے۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو 'اقامت صلوٰۃ' کی جو نصیحت کی ہے اس کا مطلب یہ ہو کہ وہ اپنی ذات کی تکمیل کرے۔ خدا کی طرف متوجہ ہوا ور اپنے اندر تقویٰ اور انابت کی کیفیت پیدا کرے۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی نصیحت کا مقصد یہ ہے کہ وہ دوسروں کو دین کی دعوت دے اور ان کی اصلاح وتربیت کی کوشش کرے۔ یہ دو الگ الگ کام ہیں لیکن ان کے درمیان بہت گہرا ربط ہے۔ نماز گو اصطلاحی معنی میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے لیے شرط نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود ایک واقعہ ہے کہ نماز ہی سے آدمی اس قابل ہوتا ہے کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا بوجھ اٹھا سکے جس شخص کو نماز سے تعلق نہیں ہے اس کے لیے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا انجام دینا ممکن نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے لیے جن اعلیٰ صفات اور بہترین خوبیوں کی ضرورت ہے وہ نماز ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔ جو شخص دنیا کو عیش وتفریح کی جگہ سمجھ کر اس میں گم نہ ہو جائے بلکہ اسے ایک امتحان گاہ تصور کرے اور اس طرح زندگی گزارے کہ اسے اپنے ایک ایک عمل کا خدا کے سامنے جواب دینا ہے، جو اپنے ہر کام میں آخرت کی کامیابی چاہے اور اسی کے لیے اپنی تمام کوششیں صرف کر دے، جس کی رگ رگ میں خدا کی یاد اتر جائے اور جو ان تمام کاموں سے یک لخت کنارہ کش ہو جائے جن میں خدا سے غافل انسان دلچسپی لیتے ہیں اور جس کی زندگی فواحش اور منکرات سے بالکل پاک ہو وہی امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا عظیم کام اس طرح انجام دے سکتا ہے جس طرح اسے انجام دینا چاہیے۔ قرآن کہتا ہے کہ ان اعلیٰ صفات اور بہترین خوبیوں کا سرچشمہ نماز ہے۔ نماز سے زندگی میں اسلامی نقوش ابھرتے ہیں اور اعلیٰ اخلاقیات کی تعمیر ہوتی ہے۔ نماز سے انسان کو ایسی زندگی ملتی ہے جو فحش ومنکر سے خالی، خدا کی یاد سے بھرپور اور بندگی کے جذبے سے سرشار ہوتی ہے۔ یہی بات قرآن کی اس آیت میں کہی گئی ہے :۔

أَقِمِ الصَّلٰوةَ إِنَّ الصَّلٰوةَ	نماز قائم کرو۔ یقیناً نماز بے حیائی اور
تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَلَذِكْرُ	برائی سے روکتی ہے اور اللہ کی یاد بہت
اللّٰهِ أَكْبَرُ (العنکبوت:۔ ۴۵)	بڑی چیز ہے۔

اس سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جو شخص فحش اور منکر کے خلاف جنگ کرنے اور خیر اور معروف کو پھیلانے کے عزم سے میدان میں آئے اس کے لیے نماز کتنی اہمیت رکھتی ہے۔

حضرت لقمانؑ نے اپنے بیٹے کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے ساتھ صبر کی بھی نصیحت کی ہے۔

صبر یہ اس حقیقت کا اظہار ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر صبر چاہتا ہے۔ بے صبر انسان اس کا اہل نہیں ہو سکتا۔ امام رازی فرماتے ہیں۔

من یأمر بالمعروف	جو شخص معروف کا حکم دے اور منکر سے
وینھی عن المنکر یؤذی	روکے اسے (لوگوں کی طرف سے) تکلیف
فامرہ بالصبر[1]	پہنچائی جاتی ہے۔ اس لیے حضرت لقمانؑ نے
	اپنے بیٹے کو صبر کا حکم دیا۔

یہی بات آپ سورۂ عصر میں دیکھیں گے کہ وہاں بھی 'تواصی بالحق' کے ساتھ 'تواصی بالصبر' کا حکم ہے۔ تواصی بالحق یہ ہے کہ ایک دوسرے کو خدا کے دین کی نصیحت کی جائے۔ یہ دین کو ماننے والوں کے درمیان امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔ تواصی بالصبر یہ ہے کہ دین پر قائم رہنے اور اسے پھیلانے کی راہ میں جو بھی تکلیف آئے اسے جھیلنے کی باہم ترغیب دی جاتی ہے۔ اس سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے صبر کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے صبر کی ضرورت اور اہمیت کا اندازہ آپ امام ابن تیمیہ کے اس بیان سے کر سکتے ہیں کہ۔

امر اللہ الرسل وھم ائمۃ	اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو جو کہ امر بالمعروف
الامر بالمعروف والنھی عن	و نہی عن المنکر کے معاملہ میں دوسروں کے امام
المنکر بالصبر[2]	ہیں صبر کا حکم دیا ہے۔

[1] مفاتیح الغیب (التفسیر الکبیر) ج ۶ ص ۵۷۵　　[2] الحسبۃ فی الاسلام ص ۱۰۷

جب خدا کے پیغمبروں کو امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے لیے صبر کی ضرورت تھی تو عام افراد بغیر صبر کے اسے کیسے انجام دے سکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر بہت دشوار کام ہے۔ یہ آدمی کی بہترین صلاحیتوں کو نچوڑ لیتا ہے۔ اس میں قدم قدم پر انسان کی قوت برداشت کا امتحان لیا جاتا ہے اور اسے سخت آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس کام کو وہی شخص انجام دے سکتا ہے جس میں مصائب کو جھیلنے کی طاقت ہو، جو چوٹ پر چوٹ کھانے کے باوجود دین پر جمنے کی استطاعت رکھتا ہو، جسے شاہان وقت کے سامنے کلمہ حق کہنے میں باک نہ ہو۔ جس کے عزم وحوصلہ کا یہ عالم ہو کہ دنیا کی کوئی بھی طاقت اسے سچائی کے اظہار سے باز نہ رکھ سکے اور جس میں اتنی جرأت اور ہمت ہو کہ بڑے سے بڑے جبار اور ظالم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکے۔ اسی طرح امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ انسان پہلے اپنی خواہشات نفس پر غلبہ پائے اور احکام الٰہی کا تابع ہو جائے۔ کیونکہ جس شخص میں اپنے نفس کی خواہشات پر غالب آنے کی صلاحیت نہیں ہے وہ دوسروں کی اصلاح نہیں کر سکتا۔ صبر کا وصف ان تمام خوبیوں کا جامع ہے۔ جس شخص میں صبر کا وصف ہے وہ اس قابل ہوگا کہ سخت ترین حالات میں بھی امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فرض انجام دے سکے اور مسلسل انجام دیتا رہے۔ لیکن جو شخص اس وصف سے محروم ہے وہ اس کام کو انجام نہیں دے سکتا اور اگر کبھی اس کی ہمت کر بھی گزرے تو ثابت قدم نہیں رہ سکتا۔

عفو واعراض

قرآن مجید نے عفو، امر بالمعروف اور اعراض کا ایک ساتھ ذکر کیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ	عفو کی روش اختیار کرو، معروف کا
وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ (الاعراف ۱۹۹)	حکم دو اور جاہلوں سے اعراض کرو۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امر بالمعروف سے عفو واعراض کا بہت گہرا تعلق ہے۔ مفسرین نے آیت کے پہلے ٹکڑے خُذِ الْعَفْوَ کے تین معنی بیان کیے ہیں۔ ایک یہ کہ لوگوں کے ساتھ عفو ودرگذر کا برتاؤ کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ ان سے اونچے اخلاق کی نہ توقع رکھی جائے اور نہ اس کا تقاضا کیا جائے بلکہ وہ جو بھی سلوک کریں اسے گوارا کیا جائے۔ تیسرے یہ کہ مالی مطالبات میں ان پر سختی نہ

کی جائے بلکہ وہ بآسانی جو بھی دے سکتے ہوں اسے قبول کرلیا جائے ۔ ان تینوں چیزوں کا تعلق اخلاق سے ہے ۔

قرآن نے امر بالمعروف کی ہدایت سے پہلے عفو کی روش اختیار کرنے کا حکم دیا ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان امر بالمعروف کے قابل اسی وقت ہوتا ہے جبکہ وہ اخلاقی حیثیت سے بہت بلند ہو ۔ جو شخص حلم اور بردباری کا پیکر ہو‘ جو لوگوں کی غلطیوں کو معاف کردے‘ اور جو ان کی ظلم وزیادتی اور طعن وتشنیع کو برداشت کرے‘ اسی کے لیے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا انجام دینا ممکن ہے ۔ پست اخلاق اور جذباتی انسان اسے انجام نہیں دے سکتا ۔

عفو اور امر بالمعروف کی ہدایت کے بعد قرآن نے اعراض کا حکم دیا ہے ۔ یہ ترتیب ظاہر کرتی ہے کہ انتہائی شرافت اور حسنِ اخلاق کے ساتھ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فرض انجام دینے کے باوجود مخاطب کی طرف سے جہالت کا مظاہرہ ہو تو آدمی کو اس سے اپنا منہ پھیر لینا چاہیے ۔ کیونکہ جاہلوں سے الجھنا اس شخص کی شان سے فروتر ہے جو امر بالمعروف ونہی عن المنکر جیسا عظیم مقصد لے کر انسانوں کے درمیان کھڑا ہو ۔

قرآن اس کی مخالفت نہیں کرتا کہ کسی مسئلہ پر معقولیت سے بحث کی جائے لیکن جہاں بات کو سمجھنے کا جذبہ نہ ہو اور محض کٹ حجتی اور ہٹ دھرمی سے معقول سے معقول بات کو رد کیا جارہا ہو‘ تو اس کی ہدایت یہ ہے کہ آدمی جوابی کارروائی میں اپنا وقت ضائع کرے اور خاموش ہوجائے ۔

عفو اور اعراض کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اگر کوئی شخص خدا اور رسول سے بغاوت کرے تو اس کے ساتھ مداہنت کی جائے‘ یا جن اعمال کی ادائیگی سے کوئی بھی مستثنیٰ نہیں ہے ان میں ڈھیل دی جائے اور جن حقوق کا ادا کرنا ہر ایک کے لیے ضروری ہے ان میں نرمی کی جائے ۔ کیونکہ اس قسم کے معاملات میں نرمی یا غفلت سے شریعت کا سارا نظام درہم برہم ہوجائے گا اور ہر شخص من مانی کرنے لگے گا ۔ عفو اور اعراض کا تعلق عام اخلاقیات اور انسانی سلوک سے ہے‘ حقوق اور واجبات سے نہیں ہے ۔ امام رازی عفو اور امر بالمعروف کے احکام کی نوعیت سے بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

الحقوق التی تستوفی من	وہ حقوق جو انسانوں سے حاصل کیے
الناس وتوخذ منهم اماان	جاتے ہیں ان کی دو قسمیں ہیں ۔ یا تو ان میں

یجوز ادخال المساھلۃ والمسامحۃ فیھا واما ان لا یجوزا ما القسم الاول فھوالمراد بقولہ خذ العفو ویدخل فیہ ترک التشدد فی کل ما یتعلق بالحقوق المالیۃ ویدخل فیہ ایضا التخلق مع الناس بالخلق الطیب وترک الغلظۃ والفظاظۃ .... ومن ھذا الباب ان یدعوا الخلق الی الدین الحق بالرفق واللطف ...... واما القسم الثانی وھو الذی لا یجوز دخول المساھلۃ والمسامحۃ فیہ فالحکم فیہ ان یامر بالمعروف والعرف والعارفۃ والمعروفۃ ھو کل امر عرف انہ لا بد من الاتیان بہ وان وجودہ خیر من عدمہ وذالک لان فی ھذا القسم لو اقتصر علی الاخذ بالعفو ولم یامر بالعرف ولم یکشف عن حقیقتہ، لکان ذالک سعیا فی تغییر الدین وابطال الحق وانہ غیر جائز۔[1]

ڈھیل دی جاسکتی ہے اور صرف نظر ممکن ہے یا یہ بات ممکن نہیں ہے۔ خدائے تعالیٰ کا فرمانا کہ "درگذر کی روش اختیار کرو" پہلی قسم سے تعلق رکھتا ہے اسی میں یہ بات بھی شامل ہے کہ مالی حقوق میں سختی نہ کی جائے۔ لوگوں کے ساتھ اچھے اخلاق کا برتاؤ کیا جائے اور تحقیر اور درشتی کا سلوک نہ کیا جائے ...... اسی کے تحت یہ بات بھی آتی ہے کہ لوگوں کو نرمی اور بلاطفت کے ساتھ دین حق کی دعوت دی جائے ...... دوسری قسم جس میں درگزر اور ڈھیل صحیح نہیں ہے۔ اس کے بارے میں امر بالمعروف کا حکم ہے۔ 'عرف' عارفہ اور معروفہ ہر اس کام کو کہتے ہیں جو اس حیثیت سے جانا پہچانا جائے کہ اس کا کرنا ضروری ہے اور اس کے موجود نہ ہونے سے اس کا موجود ہونا بہتر ہو۔ اگر اس دوسری قسم میں بھی درگزر سے کام لیا جائے' معروف کا حکم نہ دیا جائے اور حقیقت حال کھولی نہ جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ دین کو بدلنے اور حق کو مٹانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ظاہر ہے یہ بات صحیح نہیں ہے۔

ابن جریر طبری اعراض کے بارے میں فرماتے ہیں:۔

[1] مفاتیح الغیب (التفسیر الکبیر) جلد ۴ صفحہ ۳۴۲

ذالك وان كان امراً من	یہ گو کہ خدا کی طرف سے اپنے نبی کو اعراض
الله نبيه به فانه تأديب منه	کا حکم ہے لیکن اس میں خدائے تعالیٰ نے اپنی
عز ذكره لخلقه باحتمال من	مخلوق کو یہ ادب سکھایا ہے کہ جو ان پر ظلم و
ظلمهم او اعتدى عليهم لا	زیادتی کرے اسے وہ برداشت کریں۔ یہ
بالاعراض عمن جهل الواجب	نہیں کہ جو شخص خدا کے لازمی حق کے مقابلہ میں
عليه من حق الله ولا بالصفح	سرکشی کا رویہ اختیار کرے اس سے بھی
عمن كفر بالله وجهل	اعراض کریں اور نہ اس کا مطلب یہ ہے کہ
وحدانيته وهو	جو اللہ کے ساتھ کفر اور اس کی وحدانیت کا
للمسلمين حرب[1]	انکار کرے اس سے درگزر کریں۔ کیونکہ ایسا
	شخص مسلمانوں کا محارب ہے ۔

اخلاص اخلاص ہر کام کی جان ہے ۔ دنیا جن کاموں کو عظیم سمجھتی ہے وہ بھی خدا کے نزدیک بے وزن ہیں اگر ان سے روحِ اخلاص نکل جائے۔ اس لیے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض انجام دیتے وقت آدمی کو اپنی نیت کا بار بار جائزہ لیتے رہنا چاہیے کہ کہیں اس میں کوئی کھوٹ تو نہیں ہے، اس کے اخلاص کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچ رہا ہے اور وہ خدا کی رضا کے علاوہ کوئی دوسری چیز تو نہیں چاہ رہا ہے ؟

امر بالمعروف و نہی عن المنکر دین کی خدمت اور انسان کے لیے بہت بڑی سعادت ہے۔ اتنی بڑی سعادت کہ اس سے بڑی سعادت کا تصور نہیں کیا جا سکتا ۔ یہ سعادت ان لوگوں کو ملتی ہے جو سراپا اخلاص ہوں اور جو اپنی شخصیت کو رضائے الٰہی کی طلب میں گم کر دیں اور جو آخرت کی کامیابی کے سوا کوئی دوسری چیز نہ چاہتے ہوں لیکن یہ ایک واقعہ ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے کام میں اخلاص کا باقی رہنا بہت مشکل ہے ۔ جب آدمی بڑے بڑے مجمعوں میں حق کی ترجمانی کے لیے کھڑا ہو، جب اس کی تحریریں بے شمار انسان پڑھتے ہوں، جب وہ دین کی خاطر قید و بند کی مصیبتیں برداشت کر رہا ہو، جب وہ بے خوف ہو کر باطل کو چیلنج کر رہا ہو، جب اس کی خدمتِ دین، اس کی استقامت

[1] جامع البیان فی تفسیر القرآن جزء ۹ صفحہ ۹

اور اس کی قربانیوں کا ہر طرف چرچا ہو اور جب تعریف کرنے والی زبانیں اس کی مدح سرائی میں مصروف ہوں تو اس بات کا سخت خطرہ ہے کہ اس کے اندر شہرت، نام آوری اور ریا کا جذبہ ابھر آئے۔ اس جذبے کے ابھر آنے کے بعد امر بالمعروف ونہی عن المنکر سے خواہ مخاطب کو فائدہ پہنچ جائے لیکن اس فرض کا انجام دینے والا یقیناً اس کے نفع سے محروم رہے گا۔ بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ آدمی میں خلوص اور للّٰہیت نہیں ہے تو وہ اپنی تبلیغ ونصیحت سے دوسروں کو بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے نتیجہ خیز ہونے اور اس راہ میں خدا کی مدد حاصل ہونے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اخلاص کے ساتھ یہ فرض انجام دے رہا ہو۔ چنانچہ ان کے الفاظ یہ ہیں:۔

من اھم شروط الامر	امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی ایک اہم
بالمعروف والنھی عن المنکر	شرط یہ ہے کہ اس کام کا کرنے والا اپنے کام میں
ان یکون صاحبہ مخلصا فی	مخلص ہو اور اس سے اس کا مقصد یہ ہو کہ
فعلہ طالبا اظہار دین اللّٰہ	خدا کا دین غالب ہو اور اس کا کلمہ بلند ہو اور
واعلاء کلمتہ واطاعۃ امرہ	اس کی مخلوق اس کے احکام کی تابع ہو جائے
فی بریتہ دون الریاء والسمعۃ	ساتھ ہی اس میں ریا اور شہرت کا اور اپنے
والحمیۃ لنفسہ وطبیعتہ فانما	نفس اور مزاج کی حمیت کا جذبہ نہ ہو۔ اگر
ینصر ویزول بہ المنکر اذا	وہ اپنے عمل میں سچا ہے اور اخلاص کے مقام
کان صادقا وفی مقام الاخلاص	پر کھڑا ہے تو یقیناً اس کی مدد ہوگی اور منکر زائل
موافقا قال اللّٰہ تعالیٰ اِنْ	ہوگا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "اگر تم اللہ کی
تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ وَ	مدد کروگے تو وہ بھی تمہاری مدد کرے گا اور
یُثَبِّتْ اَقْدَامَکُمْ لہ	تمہیں ثابت قدم رکھے گا۔

جو شخص امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فرض انجام دے اسے اس حقیقت کو نہیں بھولنا چاہیے کہ وہ ایک ایسا کام کر رہا ہے جس کے لیے خدا کے پیغمبروں کی بعثت ہوئی تھی اور جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابۂ کرام نے انجام دیا تھا۔ اس لیے اگر اس کے اندر پیغمبروں اور ان کے ساتھیوں کے اخلاص

لہ البیین المبین لفہم الاربعین ص ۱۹۲-۱۹۳

کی جھلک بھی نہیں ہے تو وہ ان کا جانشین نہیں ہو سکتا۔ اخلاص کے بغیر جو شخص امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فرض انجام دیتا ہے گو بظاہر وہ پیغمبرانہ کام انجام دیتا ہے لیکن یہ کام اس روح سے خالی ہے جو پیغمبر کے کام میں ہوتی ہے
نظام الدین نیشاپوری امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے بعض حدود و آداب بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں

كل ذالك ايمانا واحتسابا لا سمعة ولا رياء ولا لغرض من الاغراض النفسانية والجسمانية وذالك ان هذه الدعوة منصب النبي وخلفاء الراشدين بعده [1]

یہ سب کچھ ایمان کے جذبے اور ثواب کی نیت سے ہو نہ یہ کہ شہرت اور ریا اور نفس و جسم کی کسی غرض کی تکمیل کے لیے۔ اس لیے کہ یہ دعوت نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد خلفائے راشدین کا منصب ہے۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر بہت بڑے مقصد کے لیے انجام دیا جاتا ہے۔ وہ یہ کہ خدا کی زمین پر خدا کا کلمہ بلند ہو اور اس کا دین غالب آئے۔ انسان خدا کا بندہ بن جائے اور باطل سے نجات پائے۔ یہ ایک بہت ہی مقدس کام ہے۔ اس میں اگر اخلاص نہیں ہے تو ہو سکتا ہے کہ اس سے انسان کے نفس کی تسکین ہو جائے اور دنیا میں اس کی تعریف ہونے لگے لیکن خدا کے ہاں اس کے اجر کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی۔

[1] غرائب القرآن ورغائب الفرقان (علی ہامش ابن جریر) جلد ۴ ص ۳۲-۳۱
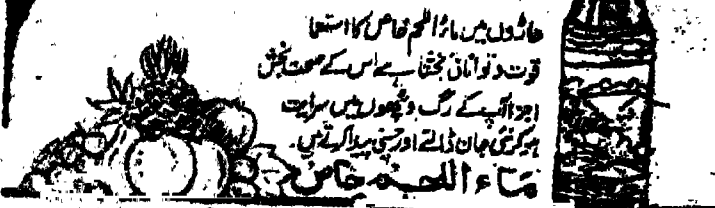
صدق تقویٰ اور توکل

مولانا محمد سلیمن فرخ آبادی

صدق وصفا

صداقت و راستی کا مفہوم اردو میں سچائی کے لفظ سے ادا کیا جاتا ہے اور عام طور پر سچ اور سچائی کا تعلق محض زبان سے سمجھا جاتا ہے کہ جو واقعہ جس طرح پیش آیا ہو اسے بالکل اسی طرح بیان کر دیا جائے مگر درحقیقت سچائی کا تعلق جس طرح زبان سے ہے اسی طرح دل اور دماغ سے بھی ہے اور اسی طرح پوری عملی زندگی سے بھی ہے۔

صداقت و راستی اور صدق وصفا کا تقاضا یہ ہے کہ پوری زندگی میں اور زندگی کے ہر پہلو میں ہر شغل اور مصروفیت میں ہر کام کاج میں سچائی کی روش اختیار کی جائے۔ سچائی کی روش اختیار کرنا انسانی اور اسلامی تقاضا ہے۔ کوئی انسان شریف انسان اور مسلمان بن نہیں سکتا جب تک کہ سچائی کی روش اختیار نہ کرے اور سچائی کی روش صرف ایک ہے جس کی طرف اللہ کے رسولوں نے انسانوں کو بلایا ہے اور جس کی طرف آج بھی قرآن وسنت کی زبان تمام انسانوں کو دعوت دے رہی ہے۔

(۱) یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ — اے ایمان والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور صداقت کی روش اختیار کرنے والوں کے ساتھ ہو جاؤ۔ سچائی اختیار کرو اور سچوں کا ساتھ دو

(۲) اللہ تعالےٰ اپنے صالح بندوں کے متعلق فرماتا ہے :-

۱. وَالصّٰدِقِیْنَ وَالصّٰدِقٰتِ — اور سچائی اختیار کرنیوالے مرد اور عورتیں

(۳) ایک اور مقام پر فرمایا

فَلَوْ صَدَقُوا اللّٰهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ

پس اگر وہ اللہ کے ساتھ سچائی کا معاملہ کرتے تو ان کے واسطے بہتر ہوتا۔

سچائی جنت کی طرف لیجاتی ہے

قَالَ صلعم اِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِیْ اِلَى الْبِرِّ وَاِنَّ الْبِرَّ يَهْدِیْ اِلَى الْجَنَّةِ وَاِنَّ الرَّجُلَ لَيَصْدُقُ حَتّٰى يُكْتَبَ عِنْدَ اللّٰهِ صِدِّيْقًا (متفق علیہ)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یقیناً سچائی رہنمائی کرتی ہے نیکی کی طرف اور نیکی رہنمائی کرتی ہے جنت کی طرف اور آدمی سچ بولتا رہتا ہے (سچائی کی روش اختیار کیے رہتا ہو) یہاں تک کہ اللہ کے نزدیک صدیق لکھ لیا جاتا ہے۔

جھوٹ دوزخ کی طرف لے جاتا ہے

وَاِنَّ الْكِذْبَ يَهْدِیْ اِلَى الْفُجُوْرِ وَاِنَّ الْفُجُوْرَ يَهْدِیْ اِلَى النَّارِ وَاِنَّ الرَّجُلَ لَيَكْذِبُ حَتّٰى يُكْتَبَ عِنْدَ اللّٰهِ كَذَّابًا (متفق علیہ)

اور جھوٹ رہنمائی کرتا ہے بدکاری کی طرف اور بدکاری دوزخ کی طرف لے جاتی ہے اور آدمی جھوٹ بولتا رہتا ہے (جھوٹ کی روش اختیار کیے رہتا ہے) یہاں تک کہ اللہ کے ہاں کذاب لکھ لیا جاتا ہے۔

سچ اطمینان ہے

دَعْ مَا يَرِيْبُكَ اِلٰى مَا لَا يَرِيْبُكَ فَاِنَّ الصِّدْقَ طُمَاْنِيْنَةٌ وَالْكِذْبَ رِيْبَةٌ (ترمذی)

چھوڑ دے اسے جو تجھے شک میں ڈالے اس کے (عوض) جو شک میں نہ ڈالے۔ کیونکہ سچ اطمینان ہے اور جھوٹ شک ہے

تعلیمات نبوی

يَقُوْلُ (صلعم) اُعْبُدُوا اللّٰهَ وَحْدَهٗ لَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّاتْرُكُوْا مَا يَقُوْلُ اٰبَاؤُكُمْ وَيَاْمُرُنَا بِالصَّلٰوةِ وَالصِّدْقِ وَالْعَفَافِ وَالصِّلَةِ (متفق علیہ)

اکیلے اللہ کی عبادت کرو اس کے ساتھ کچھ بھی شریک نہ کرو اور چھوڑ دو اسے جو کچھ تمہارے باپ دادا کہتے ہیں اور (نبی) ہم کو حکم دیتے ہیں نماز کا، سچائی، پاک دامنی اور صلہ رحمی کا۔

سچائی کے ساتھ التجا مقبول ہوتی ہے (قاسم)

مَن سأل الله تعالیٰ الشهادة بصدق بلّغه الله منازل الشهداء وإن مات على فراشه (مسلم)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جس شخص نے اللہ تعالیٰ سے سچائی کے ساتھ شہادت طلب کی تو اللہ تعالیٰ اسے شہداء کے مدارج عطا فرمائے گا اگرچہ اس نے بستر ہی پر دم توڑا ہو۔

دنیوی معاملات میں بھی سچائی

فإن صدقا وبيّنا بورك لهما في بيعهما وإن كتما وكذبا محقت بركة بيعهما (متفق علیہ)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ خرید و فروخت کرنے والوں نے اگر سچائی سے معاملہ کیا اور صاف صاف بیان کر دیا تو ان کو برکت حاصل ہوگی اور اگر انھوں نے چھپایا اور جھوٹ بولے تو ان کی تجارت کی برکت مٹا دی جائے گی۔

غرضکہ سچائی ہمیں سچا اور شریف انسان بناتی ہے۔ اللہ کا وفادار اور فرماں بردار بناکر جنت کا مستحق بناتی ہے۔ آخرت میں کامیابی سے ہم کنار کرتی ہے۔ دنیا میں ہمارا بھرم قائم کرتی اور برکت کا ذریعہ بنتی ہے۔ اے اللہ! ہمیں سچا انسان بنا دے۔ آمین!

تقویٰ اور پرہیزگاری

تقویٰ کا تعلق آدمی کے ظاہر اس کے اعمال، اخلاق اور معاملات سے جس قدر ہے اسی قدر اس کے باطن یعنی دل و دماغ اور جذبات اور احساسات سے ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تین بار فرمایا التقویٰ ههنا تقویٰ یہاں ہے۔ اور اس کا تعلق جس قدر انسان کے باطن (دل و دماغ) سے ہے اسی قدر اس کے ظاہر سے ہے۔ ایک بزرگ سے سوال کیا (ما التقویٰ) تقویٰ کیا ہے۔ دوسرے بزرگ نے کہا کسی ایسی پگڈنڈی سے جس کے دونوں جانب خاردار جھاڑیاں اور گھنے گھنے کھڈ ہوں، اگر آپ کو گزرنے کا اتفاق ہو تو کیا کریں گے؟ بولے پیروں کو احتیاط سے سنبھال کر اٹھائیں اور رکھیں گے کہیں ڈگمگا نہ جائیں۔ پہلے بزرگ کے اس جواب پر دوسرے بزرگ نے کہا بس یہی تقویٰ ہے، اسلام کی سیدھی شاہراہ پر قدموں کو سنبھالے دامنوں کو سمیٹے جنت

کی طرف چلتے رہیے کفر و شرک کے گڑھوں میں گرنے سے فسق و فجور اور بے حیائی و بیہودگی کی جھاڑیوں سے دامنوں کو الجھنے سے بچاتے ہوئے زندگی گزار دیجیے یہی تقویٰ ہے۔

فقہائے کرام فرماتے ہیں۔ اوامر باری تعالیٰ اور احکام شریعت کی اتباع اور نواہی باری تعالیٰ اور منہیات سے پرہیز تقویٰ ہے۔ غرضکہ زندگی کے تمام کاموں اور باتوں میں اس بات کا دھیان اور خیال رکھنا تقویٰ ہے کہ ہم اللہ کے بندے اور غلام ہیں۔ ہر ہر کام اور ہر ہر بات میں ہمیں اس کی فرماں برداری کرنا اور نافرمانی سے بچنا چاہیے۔ ہر چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے کام میں یہ خیال رکھنا کہ اللہ کی فرماں برداری چھوٹ نہ جائے اور کہیں کوئی نافرمانی نہ ہو جائے۔ قدم کہیں جادۂ مستقیم اور سنت نبی کریمؐ سے ہٹ نہ جائے۔

توحید اسلامی عقائد کا اگر محور اور مرکز ہے تو تقویٰ اعمال و اخلاق اور معاملات کی روح اور جان ہے۔

اللہ کا تصور تقویٰ کی جان ہے

قرآن کہتا ہے:-

(۱) وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ	اور وہ (اللہ تعالیٰ) تمہارے ساتھ ہے تم جہاں کہیں بھی ہو
(۲) إِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفَىٰ عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ	زمین و آسمان میں کوئی چیز بھی اللہ پوشیدہ نہیں ہے۔
(۳) إِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ	تیرا رب یقیناً گھات میں ہے
(۴) يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ	اللہ تعالیٰ جانتا ہے آنکھوں کی چوری کو اور جو کچھ کہ سینے چھپا لیتے ہیں۔

حدیث جبریل میں ہے:-

قَالَ أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ (متفق علیہ)	حضورؐ نے فرمایا احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو پس اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تو تم کو دیکھ رہا ہے

ہر جا اور ہر دم میں صفت تقویٰ

قال (صلعم) اتق اللہ حیثما کنت واتبع السیئة الحسنة تمحھا والناس وخالق الناس بخلق حسن (ترمذی)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جہاں کہیں بھی ہو اور برائی (اگر تم سے ہو جائے تو اس کے بعد) بھلائی کرو۔ پس نیکی اس برائی کو مٹا دے گی اور لوگوں کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آؤ۔

تقویٰ ایمان کا تقاضا ہے

یاایھا الذین امنوا اتقوا اللہ حق تقاتہ

اے ایمان والو! اللہ کا تقویٰ اس قدر اختیار کرو جس قدر کہ اس سے تقویٰ کرنے کا حق ہے۔

اپنی استطاعت بھر تقویٰ اختیار کرو

فاتقوا اللہ ما استطعتم

پس اللہ کا تقوےٰ اختیار کرو جتنی کہ تم میں سکت ہے۔

بات چیت میں بھی تقویٰ

یاایھا الذین امنوا اتقوا اللہ وقولوا قولا سدیدا

اے ایمان والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور ٹھیک ٹھیک بات کہو۔

متقی کو اللہ بے گماں دیتا ہے تقوے کی زندگی گذارنے اور ہر ہر بات اور کام میں شریعت کی پابندی کرنے کھانے کمانے اور کاروبار میں بھی حلال و حرام اور جائز و ناجائز کا خیال رکھنے معاملات اور برتاؤ میں بھی سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا پورا پورا پاس و لحاظ کرنے سے عموماً معاشی تنگی کا ایک بھیانک مستقبل سامنے آن کھڑا ہوتا ہے اور ابلیس اس اوچھے ہتھیار سے مومن کو تقویٰ کی راہ سے ہٹا کر فسق و فجور کی راہ بھگانے کی کوشش کرتا ہے جس میں وہ بسا اوقات کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔ قرآن چونکہ اللہ کا کلام ہے لہذا اس نے شیطان کی اس چال کی نشاندہی اور اعلان فرمایا:—

ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجا ویرزقہ من حیث لا یحتسب

اور جو شخص اللہ کا تقوےٰ اختیار کرتا ہے اللہ اس کے لیے راہ بنا دیتا ہے اور اس کو اس جگہ سے رزق دیتا ہے جہاں سے اسے گمان بھی نہیں ہوتا۔

تقوےٰ دلیل راہ، حق و باطل کا معیار، گناہوں کا کفارہ اور مغفرت کا ذریعہ ہے قرآن کہتا ہے

إِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ — اگر اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تو وہ تمہیں
لَكُمْ فُرْقَانًا وَّيُكَفِّرْ عَنْكُمْ — فرقان (حق و باطل کی کسوٹی) عطا کرے گا اور
سَيِّئَاتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ — تمہاری خطاؤں کو مٹا دے گا اور تمہیں بخش دیگا
وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ — اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

تقویٰ کے لیے التجا

ان النبی صلعم کان — نبی علیہ السلام دعا کیا کرتے تھے اے
یقول اللّٰھم انی — اللہ! میں تجھ سے ہدایت، تقویٰ، پاک دامنی اور
اسئلک الھدیٰ والتقیٰ والعفاف والغنیٰ (مسلم) — استغنا کی بھیک مانگتا ہوں۔

تقویٰ کے ذریعہ جنت حاصل ہوتی ہے

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں ارشاد فرمایا۔

اِتَّقُوا اللّٰہَ — اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور اپنی
وصلوا خمسکم وصوموا — پانچوں نمازیں پڑھو اور اپنے مہینے (رمضان)
شھرکم وادوا زکوٰۃ اموالکم — کے روزے رکھو اور اپنے مالوں کی زکوٰۃ ادا
واطیعوا امراءکم تدخلوا — کرو اور اپنے امراء کی اطاعت کرو (اس طرح)
جنۃ ربکم — اپنے رب کی جنت میں داخل ہو سکو گے۔

توکّل

توکل کے معنی کسی پر اعتماد اور بھروسہ کرنے کے آتے ہیں، کسی کو آپ نے اپنے معاملات سپرد کر دیے، اپنے اختیارات سونپ دیے تو گویا آپ نے اس پر توکل کیا۔ عقل کا تقاضا ہے کہ بھروسہ اسی پر کرنا چاہیے جو ہر طرح سے کامل ہو کسی قسم کا نقص، عیب اور کمزوری اس میں نہ ہو، ہر طرح کی خوبیوں سے وہ مالا مال ہو

ہر طرح کی طاقتیں اور قدرتیں رکھتا ہو۔ ایسی ہستی جو ساری خوبیوں اور تمام کمالات رکھتی ہو اور جو ہر قسم کے عیب سے پاک ہو، صرف اللہ تعالےٰ کی ہستی ہے۔ لہذا توکل صرف اللہ پر کرنا چاہیے۔ انسان اللہ کا مخلوق، مملوک اور محکوم ہے اس لیے اس کی فطرت کا تقاضا بھی ہے کہ اپنے خالق، مالک اور حاکم پر بھروسہ اور توکل کرے۔

ایک سوال جو پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالےٰ پر توکل کرنے کا صحیح مطلب کیا ہے؟ کچھ لوگوں نے حالات کی ناسازگاری، ماحول کی مخالفت اور چاروں طرف پھیلی ہوئی برائیوں کو بہانہ بنا کر اپنے ایمان کی

مزوری اور عملی کوتاہیوں پر پردہ ڈال رکھا ہے۔ کہتے ہیں اللہ جو چاہے گا وہ ہوگا ہمارا اسی پر توکل ہے۔ حالانکہ یہ توکل نہیں فریب ہے۔ توکل تو یہ ہے کہ جو کچھ اور جیسے کچھ ذرائع و وسائل اپنے اختیا میں ہوں جتنی اور جس قدر صلاحیتیں اور مواقع موجود ہوں ان کے استعمال کرنے اور ان سے کام لینے میں کسی طرح کی کوتاہی نہ کرنا اور پوری جاں فشانی کے ساتھ مقصدِ حق کے لیے جد و جہد کرنا، نتائج اور انجام کو اللہ پر چھوڑ دینا اور کامیابی کے واسطے اس سے دعا کرتے رہنا اور یہ یقین رکھنا کہ کامیابی اور ناکامی اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ یہ ہے توکل کا صحیح مفہوم جو کتاب و سنت سے ثابت ہے۔

توکل کے لیے یقین لازمی ہے جب تک اللہ کی امداد، اس کے کامل ہونے، ہر طرح کی طاقتوں کا مالک ہونے اور ہر عیب سے پاک ہونے کا پختہ یقین اور اذعان نہ ہوگا تب تک آپ اس پر سچا توکل نہیں کر سکتے۔ جس قدر ایمان و یقین میں ضعف ہوگا اسی قدر توکل میں کوتاہی ہوگی۔ مسلمانوں کے لیے ہر کام میں اور خصوصاً اقامتِ دین کے فریضے کی ادائیگی اور اس کی جد و جہد میں توکل علی اللہ ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے جس کے بغیر منزل کو پہنچنا تو درکنار دو قدم آگے بڑھنا بھی ناممکن ہے۔

قرآن کا ارشاد ہے :-

توکل اللہ پر اور صرف اللہ پر کرنا چاہیے

(۱) وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ	اور توکل کرو زندہ جاوید ہستی پر جسے کبھی موت نہ آئے گی۔
(۲) وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ	اور اہل ایمان کو صرف اللہ ہی پر توکل کرنا چاہیے۔
وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهُ	جو شخص اللہ پر توکل کرے گا تو اللہ اس کے لیے کافی ہے۔
إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَعَلَى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ	مومن تو وہی لوگ ہیں جن کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل پگھل جائیں اور جب ان پر اللہ کی آیات تلاوت کی جائیں تو ان کا ایمان بڑھ جائے اور وہ اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔

اللہ پر توکل کافی ہے

مومن تو وہی ہیں جو اللہ پر توکل کریں

توکل اسوۂ نبوی میں

حضور صلعم کی پوری زندگی مجاہدانہ اور متوکلانہ گذری ہے۔ یہاں ہم چند حادثات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

● حضرت ابراہیمؑ کو جب آگ میں ڈالا گیا تو آپؑ نے فرمایا حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ ہمارے لیے اللہ کافی ہے اور بہترین کارساز ہے۔ (میں نے اپنا معاملہ اسی کے سپرد کر دیا) اور جب محمدؐ اور صحابہؓ سے کہا گیا۔ لوگوں نے تمہارے لیے بڑا سامان اور تیاری کی ہے۔ پس ان سے ڈرو تو صحابہ کرام اور حضورؐ نے کہا۔ حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ۔ اللہ ہمارے لیے کافی اور بہترین کارساز ہے۔

● غزوۂ ذات الرقاع کا واقعہ ہے۔ صحابہ کرامؓ درختوں کے نیچے پڑاؤ کیے ہوئے تھے۔ حضورؐ الگ اور دور کسی درخت کے نیچے سایہ میں آرام فرمانے لگے تھے تلوار درخت میں لٹکا دی تھی آپ کی آنکھ جھپک گئی تھی کہ اچانک ایک دشمن دعثور نامی آپہنچا اور حضورؐ کی تلوار ہاتھ میں لے کر کھینچ کر کھڑا ہو گیا اور کہا مَنْ یَمْنَعُکَ مِنِّیْ؟ مجھ سے تمہیں کون بچائے گا؟ حضورؐ کی آنکھ کھلی تو اپنے اوپر دشمن کو تلوار کھینچے کھڑا پایا۔ آپ پر کسی قسم کے آثار نمایاں نہ ہوئے اور بے ساختہ توکل کے لہجے میں تین بار فرمایا:۔ اللہ

● غار ثور میں حضرت ابو بکرؓ نے مشرکین کے قدم دیکھے تو عرض کیا۔ یارسول اللہ! ان میں کا ایک بھی اگر اپنے پیروں کی جانب دیکھے تو ہم کو دیکھ لے گا۔ آپ نے فرمایا:۔ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا غم نہ کرو، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

● حضرت عمرؓ کا کہنا ہے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ اگر تم اللہ پر توکل کرو جیسا کہ توکل کا حق ہے تو وہ تم کو اس طرح رزق دے گا جس طرح پرندوں کو دیتا ہے صبح کو خالی پیٹ جاتے ہیں اور شام کو شکم سیر ہو کر واپس آتے ہیں۔ یعنی حرکت تو بہر حال کرنا ہی پڑتی ہے اور اسی میں برکت ہے۔

تدبیر کے ساتھ توکل

قَالَ رَجُلٌ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَعْقِلُھَا وَاَتَوَکَّلُ اَوْ اُطْلِقُھَا وَاَتَوَکَّلُ قَالَ اِعْقِلْھَا وَتَوَکَّلْ (ترمذی)

ایک شخص نے عرض کیا اے اللہ کے رسول۔ میں اونٹنی کو باندھ دوں اور توکل کروں یا چھوڑ دوں اور توکل کروں؟ آپ نے فرمایا باندھو اور توکل کرو۔

دنیا کی مختلف زبانوں میں

کتاب اللہ کے اہم تراجم کی تاریخ

لاطینی مغربی زبانوں میں سب سے پہلے قرآن کریم کا ترجمہ کرنے کا خیال کلونی (فرانس) کے ایک راہب پطرس نرابلس کے دل میں آیا۔ اس نے لاطینی زبان میں ترجمہ شروع کر رکھا تھا کہ ۱۱۵۷ء میں موت نے آلیا جس کی وجہ سے کام مکمل نہ ہو سکا۔ بعد میں قرآن حکیم کے اسی ترجمے کو ایک انگریز مسٹر رابرٹ آورٹینیا اور ایک جرمن ہرمن آوز نے ۱۱۴۳ء میں مکمل کیا۔ اس کے بعد بھی یہ ترجمہ تقریباً چار سو سال تک خانقاہ میں بند پڑا رہا حتیٰ کہ ۱۵۴۳ء میں بھیوڈو ورنبلی اندڑو نے اسے "باسل" (سوئٹزرلینڈ) سے پہلی بار شائع کیا۔ یہی ترجمہ بعد میں مختلف زبانوں میں مثلاً اطالوی، جرمن، ڈچ میں شائع ہوا۔ اس کا دوسرا اڈیشن ۱۵۵۰ء میں نکلا اور تیسرا اڈیشن ۱۷۲۱ء میں۔ اسی زبان میں دوسرا ترجمہ فادر لیوس مراکشی کا ہے جو مقام پدو (اٹلی) سے ۱۶۹۸ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوا۔ فادر لیوس مراکشی پوپ انوسنٹ یازدہم کا دوست اور رفیق کار تھا۔ تیسرا ترجمہ جسٹس فریڈرکیس فروریپ نے ۱۷۶۸ء میں کیا

فرانسیسی اس زبان میں سب سے پہلا ترجمہ ایم اندڑ لو دورائر نے ۱۶۴۷ء میں مکمل کر کے پیرس سے چھپایا۔ اس کے بعد ۱۶۷۲ء، ۱۶۵۱ء، ۱۶۶۹ء کا مطبوعہ ... ۱۸۳۰ء کا مطبوعہ برلن ۱۹۲۳ء میں طبع ہوئے۔

یونانی یونانی زبان میں قرآن مجید کے صرف ایک ترجمے کا پتہ چلتا ہے جو ینٹپا کی نے ۱۸۰۰ء میں کیا اور ایتھنز سے نکلا۔ بعد میں اس کی ۱۸۸۰ء اور ۱۹۲۴ء میں دو اشاعتیں اور بھی ہوئیں۔

عبرانی عبرانی زبان میں قرآن مجید کے صرف تین ترجموں کا پتہ چلتا ہے۔ پہلا ... اسرائیل

کا ۔ دوسرا ہرمن رکنڈر روٹ کا جو ۱۹۲۲ء میں لیپسگ سے طبع ہوا۔ تیسرا الٹین کا جو ۱۹۲۲ء میں نیو طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آیا۔

سویڈش اس زبان میں پہلا ترجمہ سنٹولب کا ہے جو ۱۸۴۳ء میں اسٹاک ہالم سے شائع ہوا۔ دوسرا فریڈرک کا ہے جو ۱۸۴۴ء میں لندن سے طبع ہوا۔ تیسرا ترجمہ زیٹرسٹین کا ہے، یہ ۱۹۱۷ء میں اسٹاک ہالم سے منظر عام پر آیا۔

پولینڈ یہاں ۱۸۵۸ء میں برشکیف نے قرآن مجید کا ترجمہ کیا جو وارسا سے شائع ہوا

اطالوی اس زبان میں سب سے پہلا ترجمہ ہینن کا ہے۔ یہ ۱۵۴۷ء میں طبع ہوا۔ کلازو کا اطالوی ترجمہ ۱۸۴۷ء میں چھپا۔ تیسرا اہم ترجمہ نیرزی جو پہلی بار ۱۸۸۲ء میں طبع ہوا بعد میں اس کی دو اشاعتیں ۱۹۱۲ء، ۱۹۱۳ء میں اور ہوئیں۔ فیولانٹی مطبوعہ روم ۱۹۱۲ء کا ہے۔ برالنسی نے فرانسیسی زبان سے ۱۹۱۳ء میں ایک ترجمہ کیا۔ فراقاس کا ترجمہ ۱۹۱۴ء میں مکمل ہوا۔ فردجو کا ترجمہ ۱۹۲۰ء میں مقام باری سے عالم وجود میں آیا۔ اطالوی میں آٹھواں ترجمہ بونلی نے ۱۹۲۹ء میں میلان سے چھپوایا۔

پرتگالی پرتگال میں پہلا ترجمہ فرانسیسی سے ۱۸۸۲ء میں طبع ہوا۔

ہسپانوی سورۃ المعراج کا ترجمہ حکیم ابراہیم نے کیا۔ اس زبان میں پہلا باقاعدہ ترجمہ ڈی ریکلا مطبوعہ میڈرڈ کا قرار پایا ہے جو ۱۸۴۴ء میں پہلی بار طبع ہوا۔ آرتز عنقد کا دوسرا ترجمہ ۱۸۷۲ء میں مکمل کر کے بارسلونا سے چھپوایا۔ برجینڈو کا ترجمہ بھی میڈرڈ سے ۱۸۷۵ء میں منظر عام پر آیا۔ براغو مطبوعہ بارسلونا ۱۹۰۷ء کا ہے۔ پانچواں ترجمہ کاڈس نے اول بار ۱۹۱۳ء [illegible] بعد میں اس کے دو اور ایڈیشن ۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۴ء میں میڈرڈ سے طبع ہوئے۔

سریانی سریانی میں صرف ایک ترجمے کا پتہ چلتا ہے جسے بکر لوہر آف شسنر نے ۱۹۱۰ء میں کیمبرج سے طبع کرایا۔

ڈچ اس زبان میں پہلا ترجمہ ٹیکنگ نے ۱۶۴۱ء میں کیا اور ہیمبرگ سے طبع کرایا۔ اس کا [illegible] ترجمہ القرآن گلاسا ماکر نے اپنا ترجمہ ۱۶۵۸ء میں لیڈن سے شائع کیا

سن کا دوسرا اڈیشن ۱۷۹۹ء میں طبع ہوا۔ تیسرا ترجمہ لغس کا مطبوعہ باقیات ۱۸۸۹ء کا ہے

چوتھا ڈاکٹر کرونے ۱۸۰۰ء میں ہارم میں چھپوایا۔ بعد میں اس کے تین اڈیشن ۱۸۷۰ء، ۱۹۰۵ء،

۱۹۱۶ء میں نکلے۔

البانوی البانوی زبان میں ایک ترجمہ الف میم قاف کا ہے جس کا سن اشاعت معلوم نہیں ہو سکا

ڈنمارک یہاں پہلا ترجمہ پیڈرسن مطبوعہ کوپن ہیگن ۱۹۱۹ء اور دوسرا بھی مطبوعہ کوپن ہیگن ۱۹۲۱ء بہل کا ہے۔

ارمنی ارمنی زبان میں پہلا ترجمہ امیر خانیانے کیا جو پہلی بار ۱۹۰۹ء میں وہنہ سے شائع کیا۔ اس کا دوسرا اڈیشن ۱۹۰۵ء میں نکلا۔ لارنز کا ترجمہ ۱۹۱۱ء میں طبع ہوا۔ تیسرا ترجمہ کوریانیان کا ہے جو وینہ سے ۱۹۱۲ء میں طبع ہوا۔

بلغاری اس زبان میں ٹوموف اور سکولعف کا مشترکہ ترجمہ صوفیانہ سے ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا

بوہیمیہ بوہیمیہ زبان میں پہلا ترجمہ قلی کا ہے۔ یہ پراگ سے ۱۹۲۵ء میں طبع ہوا۔ دوسرا نیکل کا ہے۔ یہ بھی پراگ سے ۱۹۳۲ء میں طبع ہوا۔

رومانی الیوکل نے رومانی زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ ۱۹۱۲ء میں چھپوایا۔

ہنگری اس زبان میں روڈ مایرن کدیون نے ایک ترجمہ ۱۸۵۴ء میں شائع کروایا۔

جاوی جاوی میں اول ترجمہ بینا دیا کا ہے جو ۱۹۰۳ء میں سماٹرا سے نکلا۔ دوسرا ترجمہ سمارنگ کا ہے یہ ۱۹۱۳ء میں عالم وجود میں آیا

روسی روسی زبان میں ۱۷۷۶ء میں ایک ترجمہ سینٹ پیڈرز نے کیا

ارگونی ارگونی زبان میں ایک مترجم جان انڈریز کا نام ملتا ہے

انگریزی اس زبان میں سب سے پہلا ترجمہ ۱۶۴۹ء میں فرانسیسی سے لندن میں طبع ہوا۔ اس کا دوسرا اڈیشن ۱۶۸۸ء میں اور تیسرا اڈیشن ۱۸۰۶ء میں امریکہ سے نکلا۔ جارج سیل کا ترجمہ اول بار ۱۷۳۴ء میں لندن سے طبع ہوا جو نہایت مقبول ہوا اور اس کے یکے بعد دیگرے ۱۲۶ اڈیشن شائع ہوئے۔ آخر بار سر ڈانسون روسی کے مقدمے کے ساتھ ۱۹۱۳ء میں طبع ہوا۔ یہ امریکہ میں آٹھ بار طبع ہوا۔ آخری اڈیشن ۱۹۲۹ء میں نکلا۔ روڈویل کا ترجمہ پہلی مرتبہ لندن میں ۱۸۶۱ء

نکلا۔ بعد میں اس کے اڈیشن ۱۸۷۶ء، ۱۹۰۹ء، ۱۹۱۱ء، ۱۹۱۵ء، ۱۹۲۱ء نکلتے رہے۔ امریکہ میں
۱۹۰۹ء میں طبع ہوا۔ پامر کا ترجمہ پہلی دفعہ ۱۸۸۰ء میں طبع ہوا۔ پامر کا ترجمہ پہلی دفعہ ۱۸۸۰ء میں
طبع ہوا۔ اس کی دو جلدیں ہیں اور اسے آکسفورڈ نے شائع کیا۔ پھر لندن سے یہی ۱۹۰۵ء، ۱۹۲۸ء
۱۹۲۹ء میں تین دفعہ طبع ہوا۔ امریکہ میں اس کا اڈیشن ۱۹۰۹ء میں نکلا۔ ۱۹۰۵ء میں ڈاکٹر محمد عبدالحکیم
نے اپنا انگریزی ترجمہ طبع کروایا۔ مرزا ابوالفضل کا ترجمہ ۱۹۱۱ء میں الٰہ آباد سے مع عربی متن کے نکلا
اور مقبول ہوا۔ یہاں تک کہ اس کی تعریف متعصب لوگوں نے بھی کی۔ مرزا حیرت دہلوی اڈیٹر کرزن
گزٹ کا ترجمہ مع حواشی اور تفسیر کے ۱۹۱۹ء میں سلیس انگریزی میں شائع ہوا۔ غلام سرور کا ترجمہ
آکسفورڈ سے ۱۹۳۰ء میں نکلا۔ ۱۹۳۵ء میں علامہ یوسف علی (سابق پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور)
نے قرآن کریم کا ضخیم ترجمہ مع عربی متن اور مبسوط مقدمہ جس میں تاریخی اور جغرافیائی مواد بہم پہنچانے
میں انتہائی کوشش کی ہے، لاہور سے طبع کرایا۔

فارسی فارسی میں قرآن مجید کے بہترین متعدد ترجمے موجود ہیں۔ ان میں غالباً سب سے پہلا ترجمہ
حضرت شیخ سعدی کا ہے اور ہندوستان میں فارسی کا پہلا ترجمہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی
کا فتح الرحمٰن کے نام سے ہے

اردو اردو زبان میں بے شمار قرآن مجید کے ترجمے موجود ہیں۔ ان میں سے غالباً سب سے پہلا ترجمہ
حضرت شاہ عبدالقادر ابن حضرت ولی اللہ ۱۲۰۵ء ہے۔ باقی تراجم میں مولانا رفیع الدین
مولانا نذیر احمد دہلوی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی، مولانا فتح محمد جالندھری
مولانا مودودی، سید حکیم لٹین شاہ کے ترجموں کو اعلیٰ مقام حاصل ہے۔

رومن اردو رومن اردو میں ڈاکٹر امام الدین نے سب سے پہلا ترجمہ کیا۔ جسے کرسچن مشن پریس
الٰہ آباد نے شائع کیا۔

بنگالی بنگالی زبان میں شاہ رفیع الدین کے ترجمے سے پہلا بنگالی ترجمہ ۱۸۸۶ء میں ہوا۔ ابن محمد
عبدالحق نے ۱۹۰۱ء میں ایک اور بنگالی ترجمہ کیا۔ اس سے پہلے دو ترجمے بنگالی مسلمانوں
کی مجلس نے ۱۸۸۲ء میں کلکتہ سے اور نعیم الدین کا ترجمہ ۱۸۹۹ء میں طبع ہوئے۔ ان کے علاوہ [illegible]
کا ترجمہ جو پہلی بار ۱۹۰۸ء میں چھپ، کا دوسرا اڈیشن ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا۔ قابل ذکر ہے۔

جاپانی جاپانی زبان میں سکاموٹو کے ترجمے کا نام ملتا ہے۔

چینی چینی زبان میں ۱۹۲۲ء میں ایک ترجمہ لوچ چو صاحب نے چھپوایا۔ دوسرا ترجمہ چہ ہاک ری ۱۹۳۱ء میں شنگھائی سے طبع ہوا۔ ۱۹۲۷ء میں ایک اور ترجمہ پاد شاہ جنگ نے شائع کیا۔ چوتھا ۱۹۴۲ء میں نی چنگ نے چھپوایا۔

باطومی اس زبان میں قرآن مجید کے صرف ایک ترجمے کا ذکر ملتا ہے۔

پشتو پشتو میں غالباً پہلا ترجمہ ۱۳۱۹ء میں طبع ہوا

پنجابی پنجابی میں پہلا ترجمہ حافظ محمد لکھنوی (مطبوعہ لاہور) کا ہے۔ فیروز الدین، شمس الدین مطبوعہ (امرتسر) اور حیات اللہ مطبوعہ لاہور کے ترجمے قابل ذکر ہیں۔

سندھی اس زبان کے اہم ترجمے عزیز اللہ مطبوعہ بمبئی ۱۲۹۳ھ اور محمد صدیق و عبدالرحمن مطبوعہ بمبئی ۱۳۱۷ھ ہیں۔

عواجدانیہ حافظ عبدالرشید کا مطبوعہ دلی ۱۳۰۶ھ اور یہاں کا دوسرا اڈیشن ۱۳۱۱ء میں نکلا۔ دوسرا ترجمہ عبدالقادر بن لقمان کا ہے جو ۱۸۷۴ء بمبئی سے طبع ہوا۔ محمد اصفہانی کا ترجمہ بھی بمبئی سے ۱۹۰۰ء میں طبع ہوا۔ غلام علی کا ترجمہ ۱۹۰۳ء میں چھپا۔

ترکی اس میں سب سے مکمل ترجمہ "ترجمۃ القرآن" ہے جو ابراہیم علی نے چھپوایا۔

تلنگو تلنگو میں مسٹر تامائن نے مولوی محمد علی کے ترجمے سے مدد لے کر ترجمہ کیا۔

مرہٹی اس میں حکیم صوفی محمد یعقوب نے قرآن مجید کا ترجمہ کیا۔

ہندی ہندی میں ریورنڈ ڈاکٹر احمد شاہ نے اصل عربی سے ہندی میں بامحاورہ ترجمہ کیا۔

گورمکھی نومسلم محمد یوسف نے عربی سے اس زبان میں ترجمہ چھپوایا

(بشکریہ الاعتصام لاہور)

شیخ مصطفیٰ الزرقار
ترجمہ ابوالمکارم رامپوری

مُردوں کے اعضاء سے زندوں کی پیوند کاری

دمشق کے عربی ماہنامہ "حضارۃ الاسلام" جلد ۲ عدد ۱ "ترقیع الاحیاء بأعضاء الاموات" کے عنوان سے ایک مختصر سی تحریر شائع ہوئی ہے جس میں شیخ مصطفیٰ الزرقار نے دلائل کے ساتھ یہ رائے ظاہر کی ہے کہ زندوں کو فائدہ پہنچانے کے لیے مُردوں کے اعضاء کا استعمال جائز ہے ـــــ

جامعۃ الفلاح بلریا گنج ضلع اعظم گڈھ کے ہونہار طالب العلم ابوالمکارم رامپوری نے اس کا ترجمہ کیا ہے اور اس پر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی رائے کا اضافہ کرکے اس کو ایک مختصر مضمون کی شکل دے دی ہے ۔ یہ مسئلہ اس لائق ہے کہ دوسرے علماء بھی دلائل کے ساتھ اپنی رائیں ظاہر کریں ـــ "زندگی" کے صفحات اس کے لیے حاضر ہیں ۔

ادارہ

عالمِ اسلامی کے نامور محقق مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اس موضوع پر جو کچھ فرمایا ہے وہ ان کے الفاظ میں یہ ہے :-

"آنکھوں کے علاج کا معاملہ صرف آنکھوں تک ہی محدود نہیں رہتا ۔ بہت سے دوسرے اعضاء بھی مریضوں کے کام آسکتے ہیں انسانی جسم کے دوسرے مفید استعمال بھی ہو سکتے ہیں [illegible] اگر کھال [illegible] جائے تو [illegible] [illegible] اسلامی نظریہ یہ ہے کہ [illegible] [illegible] [illegible]

کا فرض ہے کہ اس کا جسم احترام کے ساتھ دفن کر دیں۔

اسلام نے انسانی لاش کی حرمت کا جو حکم دیا ہے وہ دراصل انسانی جان کی حرمت کا ایک لازمہ ہے۔ ایک دفعہ اگر انسانی لاش کا احترام ختم ہو جائے تو بات صرف اس حد تک محدود نہ رہے گی کہ مردہ انسانوں کے بعض کارآمد اجزاء زندہ انسانوں کے علاج میں استعمال کیے جانے لگیں، بلکہ رفتہ رفتہ انسانی جسم کی چربی سے صابن بھی بننے لگیں گے۔ (جیسے کہ فی الواقع جنگ عظیم دوم کے زمانے میں جرمنوں نے بنائے تھے) انسانی کھال کو اتار کر اس کو دباغت دینے کی کوشش کی جائے گی تاکہ اس کے جوتے یا سوٹ کیس یا منی پرس بنائے جا سکیں۔ (چنانچہ یہ تجربہ بھی چند سال قبل مدراس کی ایک فیکٹری کر چکی ہے) انسان کی ہڈیوں اور آنتوں اور دوسری چیزوں کو استعمال کرنے کی بھی فکر کی جائے گی۔ حتیٰ کہ اس کے بعد ایک مرتبہ انسان پھر اس دور وحشت کی طرف پلٹ جائے گا جب آدمی آدمی کا گوشت کھاتا تھا۔ میں نہیں سمجھتا کہ اگر ایک دفعہ مردہ انسان کے اعضاء نکال کر علاج میں استعمال کرنا جائز قرار دے دیا جائے تو پھر کس جگہ حد بندی کر کے آپ اسی جسم کے دوسرے مفید استعمالات کو روک سکیں گے اور کس منطق سے اس بندش کو معقول ثابت کریں گے۔

رسائل و مسائل حصہ سوم بحوالہ ترجمان القرآن جنوری ١٩٦٢ء

اور شام کے مشہور قانون داں اور فقیہ شیخ مصطفےٰ الزرقا نے اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہے اس کا ترجمہ نیچے درج کیا جاتا ہے:۔

عصر حاضر میں اس موضوع پر اکثر سوال کیا جاتا ہے، اور خصوصاً آنکھوں کا آپریشن کرنے والے ڈاکٹروں کی طرف سے۔ کیونکہ طب کی ترقیوں کی وجہ سے اب یہ بات ممکن ہو گئی ہے کہ اگر مرنے والے لوگوں کی آنکھوں کو ان کے مرنے کے بعد فوراً نکال لیا جائے تو انہیں زندہ لوگوں کی آنکھوں کی جگہ فٹ کیا جا سکتا ہے جس کے نتیجے میں بعض خاص قسم کے اندھے لوگ بینا بنائے جا سکتے ہیں۔

اسی سلسلے میں خون کے بینکوں کی طرح آنکھوں کے بینک قائم کرنے کے بارے میں بھی اکثر سوال کیا جاتا ہے جن میں مردوں کی آنکھوں کو سائنسی طریقوں سے اس طرح محفوظ کر لیا جائے کہ ان کی حیاتی خصوصیات برقرار رہیں اور ضرورت پڑنے پر اندھے لوگوں کی آنکھوں کی جگہ [illegible] کے لیے وہ بالکل تیار حالت میں موجود رہیں۔ جیسا کہ آج کل خون کے بینکوں میں خون کو [illegible]

کے لحاظ سے الگ الگ محفوظ رکھا جاتا ہے تاکہ مریضوں اور زخمیوں کی جان بچانے کے لیے فوری امداد کے طور پر ہر قسم کا خون تیار حالت میں مل سکے۔

اس مقصد کے لیے مردوں کی آنکھوں کو استعمال کرنے کے جواز کے سلسلے میں دورِ حاضر کے بعض فقہاء متردد ہیں اور بعض اسے ناجائز قرار دیتے ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک اس موضوع پر ایک مخصوص شرعی نقطۂ نگاہ سے غور کرتا ہے چنانچہ بعض علماء انسانی ہمدردی کے پہلو سے سوچتے ہیں اور انسانیت کے سلسلے میں کتاب وسنت میں جو نصوص آئے ہیں ان پر غور کرتے ہیں اس طرح ان کے نزدیک جواز کا پہلو راجح ہوتا ہے۔ اور بعض علماء اس پہلو سے سوچتے ہیں کہ اس طرح میت کے ایک جزو سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ چنانچہ ان کے نزدیک عدم جواز کا پہلو راجح ہوتا ہے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ یہ مسلمانوں کے درمیان تو جائز ہو سکتا ہے لیکن یہ بات جائز نہ ہوگی کہ مسلمان میت کا عضو لیکر اسے غیر مسلم کے عضو میں جوڑا جائے۔

حال ہی میں "آنکھوں کی پیوندکاری" کے موضوع پر جمہوریہ شام کے سابق مفتی اعظم محمد ابوالیسر عابدین کی طرف سے اس کے جواز میں ایک فتویٰ شائع ہوا ہے۔

اس مسئلے میں میری رائے یہ ہے کہ اسلامی شریعت میں "ضرورتِ شدیدہ" کا اصول اس طرح کے تبدیلِ اعضاء کی تمام قسموں کے جواز کا متقاضی ہے۔ اور یہ اس لیے کہ آنکھوں کے تبادلے کو (جس میں کہ لوگوں کو تردد یا اشتباہ ہے) اس ضرورتِ شدیدہ پر قیاس کیا جا سکتا ہے جس کے تحت بعض حرام چیزوں کو استعمال کرکے زندگی کو بچایا جاتا ہے یا عضو کو ضائع ہونے سے بچایا جاتا ہے ـــــ اور ایسے موقع پر فقہاء صراحت کے ساتھ یہ فرماتے ہیں کہ دفعِ ہلاکت کے لیے ایسا کرنا واجب ہے۔ اسی طرح اگر یہ کہا جائے کہ میت کی آنکھ کو استعمال کرنا بھی جائز ہے جب کہ کسی انسان کی تلف شدہ آنکھ کو زندہ کرنا مقصود ہو، تو یہ بات شرعاً قابلِ قبول ہوگی۔

اور جب علمِ طب حاصل کرنے یا جرم کا پتہ لگانے کے لیے میت کی چیر پھاڑ کرنا جائز بلکہ جب ضروری ہے اور کسی طبی ضرورت کے پیشِ نظر یا تکلیف دور کرنے کی غرض سے مرد اور عورت کی شرمگاہ کو کھولنا جائز ہے ـــــ حالانکہ دراصل یہ ساری چیزیں قطعاً حرام ہیں لیکن پھر بھی درج ذیل اصول کے تحت ضرورت کے درجے کے لحاظ سے مباح یا واجب قرار دی گئی ہیں کہ "الضرورات

تبیح المحظورات" شدید ضرورتیں شریعت کی ممنوعات کو مباح کر دیتی ہیں۔ ـــــ تو کیا ایک اندھے شخص کی بصارت کو لوٹانے کے لیے مُردوں کی آنکھوں سے استفادہ کرنا بدرجہ اولیٰ جائز نہ ہوگا؟

اس سلسلے میں ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ موجودہ دور کے فقہاء میں سے کسی کو بھی ضرورت کے وقت ایک جسم کا خون دوسرے جسم میں منتقل کرنے کے شرعاً جائز ہونے میں کوئی تردد نہیں ہے۔ جیسا کہ ایک شخص کی جلد کو دوسرے کے جسم میں لگانے کے جواز میں کوئی متردد نہیں ہے۔ تو اب اس میں اور تبدیلِ چشم میں کیا فرق ہے جبکہ یہ معلوم ہے کہ طبی نقطۂ نظر سے جسم کے تمام اعضاء کی طرح خون بھی اسی طرح جسم کا ایک حصہ ہے جیسے آنکھیں اور جلد ـــ اور یہ بھی معلوم ہے کہ شرعی نقطۂ نظر سے زندہ کے جزو کو علیحدہ کرنے کے بعد اس کی حیثیت بھی وہی ہو جاتی ہے جو میت کے جزو کی ہوتی ہے اور اسی بناء پر فقہاء قطعیت کے ساتھ یہ بات کہتے ہیں کہ اگر زندہ بکری کا کوئی عضو کاٹ کر الگ کر لیا جائے تو وہ اسی طرح ہوگا جیسا کہ مردار کا جزو ہوتا ہے اور اس کا کھانا جائز نہ ہوگا۔ البتہ مچھلی اس سے مستثنیٰ ہے کیونکہ اس کے بارے میں نص وارد ہے کہ اس کا مردار بھی حلال ہے۔ اسی لیے مچھلی کو حلال کرنے کے لیے اس کا ذبح کرنا بھی شریعت نے واجب نہیں کیا۔

اب یہ بات واضح ہوگئی کہ شرعاً جو حکم تبادلۂ خون اور جلد کا ہوگا وہی حکم تبدیلِ چشم کا بھی ہوگا۔ اب رہی یہ بات کہ خون اور جلد تو زندہ آدمی سے حاصل کیے جاتے ہیں اور آنکھ میت کے جسم سے لی جاتی ہے تو اس سے حکم پر کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ زندہ کا احترام میت کے احترام سے بڑھ کر ہے اور جیسا کہ ہم نے اوپر بتایا کہ زندہ سے کسی عضو کو علیحدہ کرنے کے بعد وہ عضو شرعاً میت سے علیحدہ کیے ہوئے عضو کی مانند ہو جاتا ہے۔

ہاں جواز کے لیے یہ قید لگانا ضروری ہے کہ آدمی اپنی زندگی میں اس کے بارے میں اجازت دے دے یا اس کے مرنے کے بعد اس کے اولیاء اجازت دے دیں اگر اس نے مرنے سے پہلے اپنی آنکھوں کو دینے سے منع نہیں کیا تھا۔ اور یہ شرط لگانا بھی ضروری ہے کہ یہ کام صرف عطیے اور تبرع کے طور پر کیا جائے ـــ اس میں کسی طرح کے معاوضے کا حصول مقصود نہ ہو کیونکہ اس طرح کے مسائل میں معاوضے کا لین دین بہت سی خرابیوں کا موجب ہوگا۔ اور یہ چیز ان اصولوں کے منافی

(باقی ص ۶۱ پر)

چھوت چھات کے خلاف مثبت فکر کی ضرورت

حکومت ہند نے سات افراد پر مشتمل ایک کمیٹی مقرر کی ہے جو چھوت چھات کے مسئلے کی جانچ اور ہریجنوں کی اقتصادی ترقی کے مسئلے پر غور و فکر کرے گی۔ اس کمیٹی کے چیرمین مسٹر الایا پرمل ایم پی ہیں ابھی زیادہ دن نہیں گزرے۔ انھوں نے مدراس میں ایک پریس کانفرنس کے اندر کہا تھا کہ "ہندوستان کے دیہاتوں میں ۹۰ فی صدی اعلیٰ نسل کے ہندو اب تک چھوت چھات پر عمل کر رہے ہیں"۔ انھوں نے کہا کہ اب تک جو معلومات انھوں نے جمع کی ہیں وہ ان کی اس تشخیص کی تائید کرتی ہیں کہ ہریجن آج ہندوؤں کے امتیازی برتاؤ سے نقصان اٹھا رہے ہیں۔ چھوت چھات کا قانون سختی کے ساتھ نافذ نہیں ہوا ہے۔ ہندوستان کے آٹھ کروڑ ہریجن اقتصادی طور پر پس ماندہ ہیں اور انہیں چھوٹے مندروں میں جانے اور گاؤں کے کنوئیں سے پانی حاصل کرنے سے روکا جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ سول ملازمتوں میں ان کے لیے مناصب کی تخصیص پر پوری طرح عمل نہیں ہوا ہے۔ انھوں نے محسوس کیا ہے کہ ملازمت کے لیے انتخابی کمیٹیوں نے ہریجنوں کے ساتھ امتیازی برتاؤ کیا ہے۔ یہ امتیاز اس حالت میں بھی برتا گیا ہے جبکہ امیدواروں میں مستحق اور ملازمت کے لیے مشروط صفات سے متصف ہریجن قابل حصول تھے۔

——— مسٹر پرمل کا یہ بیان قابل غور ہے جس ملک کے پانچ چھ کروڑ باشندے مذہبی بنیاد پر تفریق و امتیاز کے شاکی اور آٹھ کروڑ باشندے نسلی بنیاد پر امتیاز و تفریق کے صید زبوں ہوں اس ملک میں یک جہتی، ہم آہنگی اور اتحاد کی گفتگو، کھوکھلے نعرے کے سوا اور کیا حیثیت رکھے گی۔ ہندوستان کے دستور میں مذہبی اور نسلی بنیاد پر تفریق و امتیاز کی مکمل نفی کی گئی ہے۔ دستور ہی کی بنیاد پر چھوت چھات کو قانونی جرم قرار دیا گیا اور اس ایکٹ کے نفاذ پر بھی سترہ اٹھارہ سال گزر گئے لیکن عمل کی دنیا میں اس کا جو حال ہے وہ مسٹر پرمل کی تشخیص اور ان کے بیان میں زیادہ خاندانی ہندو چھوت چھات پر

کم سے کم کہتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک فی صدی کا جو استثنا ہے وہ بھی مشکوک ہے اور ہو سکتا ہے کہ دیہاتوں کے ۹۹ فی صدی سے بھی زیادہ خاندانی ہندو چھوت چھات پر عمل کر رہے ہوں۔ چھوت چھات کی شدت کا یہ حال ہے کہ بزعم خویش اعلیٰ ذات کے ہندو جس کنوئیں سے پانی لیتے ہیں اس سے نیچ ذات کا کوئی ہندو پانی نہیں لے سکتا اونچی ذات کا ڈول اور نیچی ذات کا ڈول ایک ہی کنوئیں پر نہیں ڈالا جا سکتا۔ اونچی ذات کے مندر میں داخل ہو کر نیچی ذات کا کوئی ہندو اس بت کو بھی نہیں پوج سکتا جس کو وہ بھی اسی طرح اپنا معبود سمجھتا ہے جس طرح اونچی ذات کا ہندو ——— تفریق و امتیاز کی یہ لعنت ہمارے وطن کی ایک ایسی سخت بیماری ہے کہ جب تک یہ ختم نہ ہو اس ملک میں اتحاد کی توانائی کا خیال بھی فضول ہے۔ ملازمتوں اور مناصب میں اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کو ہریجنوں پر ترجیح دینا نسلی امتیاز کا لازمی نتیجہ ہے اس سے بچنا آسان نہیں۔

مسٹر پرل نے یہ بات بالکل صحیح کہی ہے کہ جب تک دل اور ذہن میں تبدیلی پیدا نہ ہو یہ روش نہیں بدل سکتی لیکن انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ یہ ذہنی و فکری تبدیلی کیا ہو اور کس طرح پیدا کی جائے۔ ہم اس طرح کی رپورٹیں اخبارات میں برابر پڑھتے رہتے ہیں لیکن آج تک کوئی ایسی چیز سامنے نہیں آئے جس میں کسی ہریجن یا غیر ہریجن ہندو نے کسی ایسے مثبت فکر کی نشان دہی کی ہو جو دماغوں سے نسلی برتری کے خیال کو نکال باہر کر دے۔ جب تک کسی مثبت فکر کی نشان دہی کر کے حکومت اسے پوری قوت کے ساتھ ملک میں نہ پھیلائے۔ اس طرح کی کمیٹیوں جائزوں اور رپورٹوں کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہے ——— اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ دنیا کے تمام انسان ایک آدم کی اولاد ہیں اور تمام انسانوں کے درمیان آدمیت مشترک ہے۔ اس لحاظ سے کسی کو کسی پر کوئی نسلی برتری حاصل نہیں ہے۔ ہاں خدا کے نزدیک سب سے معزز و مکرم وہ ہے جو سب سے زیادہ اس سے ڈرنے والا ہے۔ یہ عقیدہ نسلی برتری کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔ کیا حرج ہے اگر اس عقیدے کو تسلیم کر کے حکومت اسے پورے ملک میں پھیلانے کی سعی کرے

(بقیہ اشارات)

پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینے کی طرف ہجرت کی تو وہاں سب سے پہلے آپ پر سورۂ بقرہ نازل ہوئی۔ اس سورہ نے تقوے کے ان قواعد کو مقرر و موکد کیا جو سورۂ انعام کے قواعد پر مبنی ہیں اس لیے کہ سورۂ بقرہ نے افعال مکلفین کی جملہ اقسام کو بیان کر دیا ہے۔ اگرچہ دوسرے

سورتوں میں ان کی تفصیلات ملتی ہیں جن افعالِ مکلفین کو اس سورہ نے بیان کیا ہے وہ یہ ہیں۔
عبادات جو اسلام کی بنیاد ہیں۔ عادات ان کا تعلق ماکول و مشروب سے ہو یا ان
کے علاوہ دوسری چیزوں سے۔ معاملات۔ بیع و فروخت۔ نکاح اور اس سے متعلق مسائل
جنایات۔ ان کا تعلق انسان کی جان سے ہو یا دوسری چیزوں سے۔ نیز یہ کہ اس سورہ میں
حفاظتِ دین کے احکام ہیں اور نفس، عقل، نسل اور مال کی حفاظت کے احکام پر بھی یہ مشتمل ہے
اس سورہ کے قواعد سے جو چیز خارج ملے گی وہ محض تکمیلی ہوگی۔ سورۂ بقرہ کے بعد جتنی سورتیں
نازل ہوئیں وہ سب اس سورہ پر مبنی ہیں۔ تم نزولی ترتیب کے لحاظ سے قرآن کی تمام سورتوں پر
غور کرو گے تو اس بات میں کوئی فرق نہ پاؤ گے۔ قرآن پر غور کرنے والے سے یہ حقیقت مخفی نہ ہونی
چاہیے اس لیے کہ یہ علوم تفسیر کے اسرار میں ہے۔ اس حقیقت کی جتنی معرفت حاصل ہوگی اسی کے
مطابق اللہ کے کلام کی معرفت نصیب ہوگی۔

الموافقات ج ۳ ص ۴۰۶ تا ۴۰۷

قرآن فہمی کے سلسلے میں علامہ شاطبی کی یہ بحث آب زر سے لکھنے کے لائق ہے۔ اس سے اندازہ
ہوتا ہے کہ ان کا مطالعۂ قرآن کتنا گہرا اور کس قدر وسیع تھا۔ اس بحث کا حاصل بھی یہی ہے کہ مدنی
سورتوں میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ سب مکی سورتوں پر مبنی ہے اور ان سب کی اصل مکی سورتوں میں
پائی جاتی ہے۔

(باقی)

بقیہ ص ۵۸

ہے جو اس طرح کے مسائل میں شریعت نے مقرر کیے ہیں۔

چند سال قبل شام میں ایک قانون جاری ہوا ہے جس کی رو سے مُردوں کی آنکھیں اس
مصرف کے لیے نکالنا اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ میت کے اولیاء سے اجازت لے لی گئی ہو
یا اس نے خود وصیت کی ہو، یا مرنے سے پہلے اس نے اجازت دے دی ہو لیکن اس قانون
میں معاوضہ کے مسئلے سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا ہے، کیونکہ اس کے بارے میں اس وقت کوئی
سوال ہی نہیں ابھرا تھا کہ اس پر غور و فکر کیا جاتا۔

یہ اس موضوع پر میری رائے ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

(مجلہ حضارۃ الاسلام جلد ۶ عدد اول)

تنقید و تبصرہ

چھیڑ غالب سے چلی جائے جمع و ترتیب اکبر علی خاں۔ صفحات ۳۰۴ کاغذ، کتابت، طباعت معمولی۔ قیمت تین روپیہ۔ ناشر کتاب کار (پبلیکیشنز) رامپور، یوپی

زیر تبصرہ کتاب، غالب سے متعلق دلچسپ مزاحیہ تحریروں، ڈراموں اور فیچروں پر مشتمل ہے جسے جناب اکبر علی خاں صاحب نے مرتب کیا ہے۔ "عوامی لائبریری سیریز" کے نام سے معیاری اردو کتابوں کے سستے اڈیشن چھاپنے کا انتظام کیا گیا ہے۔ یہ کتاب بھی اسی کی ایک کڑی ہے۔

غالب کے بارے میں سنجیدہ اور تحقیقی و تنقیدی مقالات بھی بہت لکھے گئے ہیں اور مزاحیہ انداز میں ان کا تعارف کرانے کے لیے بھی بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اسی طرح کی مزاحیہ و خیالی نگارشات کے بارے میں فاضل مرتب نے عرض مرتب میں لکھا ہے۔

ان مضامین خیالی میں غالب اپنی پوری دلکشی کے ساتھ چلتے پھرتے نظر آتے ہیں اس لحاظ سے ان مضامین کی اپنی ایک افادی حیثیت بھی ہے کہ عام قاری جو تحقیق، تنقید اور سوانح کے خشک اوراق سے نہیں گزر سکتا۔ غالب کے بارے میں بہت کچھ جان بھی لیتا ہے اور تازہ دم بھی رہتا ہے

یہ بات جناب مرتب نے صحیح لکھی ہے۔ اس طرح کے مضامین کو جمع کرنے اور انہیں مرتب کرنے میں محنت کی گئی ہے اور یہ مجموعہ اس محنت کا ثمر شیریں ہے۔ تبصرہ نگار نے اس مجموعے کے چند مقالات پہلے بھی پڑھے تھے اور اس مجموعے میں انہیں دوبارہ پڑھ کر اس نے تذکر کا لطف لیا۔ امید ہے کہ یہ کتاب دلچسپی سے پڑھی جائے گی۔

رسوم دہلی تصنیف مولوی سید احمد دہلوی۔ صفحات ۱۹۲۔ قیمت دو روپے۔
ناشر: کتاب کار، رامپور۔ یوپی

مولوی سید احمد دہلوی مرحوم مولف فرہنگ آصفیہ اپنے اُس اردو لغت کی وجہ اس زبان کی تاریخ میں زندہ جاوید ہوچکے ہیں۔ رسوم دہلی بھی انہیں کی تصنیف ہے اور مسلمانان ہند کی سماجی زندگی کی تاریخ کے لیے یہ کتاب بھی خاصی اہمیت رکھتی ہے۔ اس کتاب پر مقدمہ سید یوسف بخاری دہلوی نے لکھا ہے اس کے علاوہ انھوں نے رسوم دہلی کی فرہنگ بھی مرتب کی ہے جو اس کتاب کے اخیر میں لگی ہوئی ہے۔ یہ فرہنگ خود ایک قیمتی چیز ہے اگر یہ نہ ہو تو اب ہمارے لیے "رسوم دہلی" کو پوری طرح سمجھنا بھی مشکل ہوجائے۔ "رسوم دہلی" کے بارے میں سید یوسف بخاری صاحب لکھتے ہیں:۔

"رسوم دہلی" کے مطالعے سے ہمیں رسوم کے علاوہ سیکڑوں چیزوں کے نام، بیسیوں اصطلاحات اور درجنوں لغات کا علم ہوتا ہے۔ رسوم دہلی میں ایسے نادر الفاظ بھی ملتے ہیں جن کو اگر منشی سید احمد اپنی فرہنگ آصفیہ یا رسوم دہلی کے حواشی وغیرہ میں نہ لکھتے تو قدیم و جدید فرہنگ و لغات کے چوڑے چکلے سینوں میں بھی یہ گنج معانی ڈھونڈے نہ ملتے۔ چنانچہ اسی مقصد کے لیے اس جدید نسخے کے ساتھ فرہنگ کا اضافہ کیا جارہا ہے۔"

اس عبارت سے اس کتاب کی اہمیت و افادیت کا کچھ اندازہ ہوجاتا ہے۔ کتاب کار رامپور نے یہ کتاب شائع کرکے مفید خدمت انجام دی ہے۔

۲۷/۲۸

خیالات یونس نگرامی ندوی، صفحات ۶۴، قیمت ایک روپیہ پچیس پیسے۔ شائع کردہ: مکتبہ طیبہ، بیبی ڈیوڑھی آغا میر۔ لکھنؤ

فاضل مرتب لکھتے ہیں:۔

"پیش نظر کتاب ان ملاقاتوں کا نتیجہ ہے جو وقتاً فوقتاً ملک کے ممتاز علما اور صاحب فکر حضرات سے ہوتی رہی ہیں۔ یہ تمام ملاقاتیں 'انٹرویو' کی صورت میں "تعمیر حیات" لکھنؤ میں شائع ہوچکی ہیں
یہ کتاب آٹھ ممتاز افراد کی ملاقاتوں پر مشتمل ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی۔ مولانا سید مسعود علی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔ مولانا سعید اکبرآبادی۔ مولانا مفتی عتیق الرحمٰن۔ پروفیسر عبدالباری ندوی۔

ناشر: معین الدین احمد ندوی۔ مولانا محمد اسحٰق سندیلوی

فاضل مرتب نے ان ممتاز افراد سے مختلف سوالات کے جوابات ملاقاتیں کر کے حاصل کیے ہیں۔ انٹرویو ممتاز افراد کے ذاتی حالات اور مختلف مسائل پر ان کے خیالات و تجربات معلوم کرنے کا اچھا اور مفید ذریعہ ہے۔ زیر تبصرہ کتاب ایک مفید اور دلچسپ کتاب ہے۔

اسلامی حکومت کے نقش و نگار از مولانا ظہیر الدین مفتاحی۔ صفحات ۱۴۴۔ قیمت: ایک روپیہ پچھتر پیسے۔ ناشر: مفتاحی اکیڈمی۔ مئو۔ اعظم گڈھ۔ یوپی۔

یہ کتاب فتاوی دارالعلوم کے مرتب نے مرتب کی ہے "تاریخی حقائق" کے سلسلے کا یہ پہلا حصہ ہے یہ حضرت صدیق اکبرؓ و فاروق اعظم اور آپ کے عہد خلافت کے دوسرے ذمہ داران خلافت کے منتخب واقعات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا تعارف مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے تحریر فرمایا ہے۔

جو کتاب عہد خلافت راشدہ کے سبق آموز واقعات پر مشتمل ہو اس کے مفید ہونے میں کیا شبہ ہے فاضل مرتب نے مختلف عنوانات کے تحت بہت سے واقعات کو یکجا کر دیا ہے۔ واقعہ نقل کرنے کے بعد اس سے جو سبق ملتا ہے فاضل مرتب نے اس کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں

> آزاد بھارت کے مسلمان اس واقعہ سے سبق حاصل کریں اور وہ یقین کرلیں کہ ان کی کامیابی کا راز صرف اس بات میں مضمر ہے کہ وہ گناہوں سے توبہ کریں اور پیکر اخلاص بن جائیں بجائے ملک کے حکمرانوں کی خوشامد کے اپنے حقیقی مولیٰ کو راضی کرنے کا عزم کرلیں اور اپنی تمام جدوجہد اسی کے لیے وقف کر دیں ص۱۸

ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:۔

> مسلمانوں کی گراوٹ کی انتہا یہ ہے کہ وہ اقتدار کے بت کے آگے سرنگوں نظر آتے ہیں اور کفر و شرک سے اپنی محبت کا زبان سے اظہار بھی کرتے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون
>
> (ص۲۷)

ذیقعدہ ۱۳۸۵ھ
مارچ ۱۹۶۶ء

زندگی رامپور

جلد :۔ ۳۶
شمارہ :۔ ۳

مدیر :۔ سید احمد قادری

- خط و کتابت و ارسالِ زر کا پتہ　　　منیجر زندگی رامپور۔ یوپی
- زرِ سالانہ :۔ چھ روپیہ ۔ ششماہی :۔ تین روپیہ ۔ فی پرچہ :۔ ۶۰ پیسے
- ممالکِ غیر سے بارہ شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر

مالک :۔ جماعت اسلامی ہند ۔ اڈیٹر :۔ سید احمد عروج قادری ۔ پرنٹر پبلشر :۔ احمد حسن ۔ مطبع :۔ دہلی پرنٹنگ ورکس بنگلا آزاد دہلی میں چھپا
مقامِ اشاعت :۔ دفتر زندگی رامپور یوپی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات[1]

مولانا ابو اللیث صاحب اصلاحی، امیر جماعت اسلامی ہند

ہندوستان اس وقت مختلف طرح کے مسائل سے دوچار ہے جن میں ہر مسئلہ اپنی ایک مخصوص اہمیت رکھتا ہے اور اس بنا پر وہ سب مسائل اس کے مستحق ہیں کہ ان کی مخصوص اہمیت کے اعتبار سے ان کی طرف توجہ دی جائے لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ ان مسائل میں ایک خاص مسئلہ بڑی بنیادی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ درحقیقت اس پر ہی ملک کی آئندہ صحیح تعمیر کا بہت کچھ دار و مدار ہے لیکن بدقسمتی سے ابتک وہ یہاں کے عوام و خواص کی نگاہ میں وہ اہمیت حاصل نہیں کرسکا ہے جس کا وہ مستحق ہے اور وہ ہے یہاں کے شہریوں کے بنیادی حقوق کا مسئلہ

ہماری نگاہ میں اس بات کی بھی بڑی قدر ہے کہ ہندوستان کے دستور میں بنیادی حقوق کو ایک نمایاں جگہ دی گئی ہے اور ان کا دائرہ اتنا وسیع قرار دیا گیا ہے کہ یہاں کے تمام شہری مذہب اور نسل وغیرہ کے امتیاز کے بغیر ان سے یکساں طور سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں کیونکہ ہمارے نزدیک کسی ملک کے دستور میں کسی چیز کے جگہ پانے اور نہ پانے کے دو الگ الگ معنی ہیں اور اس اعتبار سے دونوں کے اثرات و نتائج بھی الگ الگ ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی اپنی جگہ بہت اہم ہے کہ کسی ملک کے شہریوں کے حقوق کم ہوں یا زیادہ ان کی اصل قدر و قیمت ان کے اعلان پر نہیں بلکہ اس بات پر موقوف ہے کہ عملاً وہاں کے شہری ان سے کس حد تک فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہمیں اس کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ ان کے حقوق کے سلسلے میں ہمارے اعلان اور عمل میں

[1] ہم گزشتہ شمارے کے مسلسل اشارات کو ملتوی کر کے محترم امیر جماعت کے اشارات شائع کر رہے ہیں۔

بڑا تفاوت پایا جاتا ہے۔

اس تفاوت کے نمونے ہماری عملی زندگی کے بہت سے گوشوں میں دیکھے جا سکتے ہیں لیکن غالباً یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس وقت اس کا سب سے نمایاں نمونہ ملک میں مسلسل ایمرجنسی کا قیام اور ڈی آئی آر کا اندھا دھند استعمال ہے۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جب ملک کی آزادی اور سالمیت خطرے میں ہو تو اس کی حفاظت کے لیے عارضی طور سے بنیادی حقوق معطل یا محدود کیے جا سکتے ہیں چنانچہ اسی ضرورت کے پیش نظر ہمارے دستور میں بھی اس کی گنجائش رکھی گئی ہے لیکن یہ کتنی عجیب بات ہے کہ ۱۹۶۲ء میں چینی حملے کے وقت ایمرجنسی کے قیام کا اعلان کیا گیا تو وہ اب تک بدستور برقرار ہے ۱۹۶۳ء سے لیکر ۱۹۶۵ء کے وسط تک عملاً کوئی لڑائی درپیش نہیں تھی اور حالیہ چند روزہ جنگ کے بعد اب پھر حالت امن قائم ہو چکی ہے بلکہ اس مدت میں معاہدۂ تاشقند بھی وجود میں آچکا ہے جس کی رو سے دونوں ملکوں کی حکومتوں نے ایک طرح سے اپنے مسائل کو جنگ کے بجائے باہمی گفت و شنید کے ذریعے طے کرنے کا اعلان کر دیا ہے لیکن ایمرجنسی پھر بھی قائم ہے

دستور ہند میں جس ایمرجنسی کی گنجائش رکھی گئی ہے وہ کسی واقعی حملے کے مقابلے کے لیے ہی ہے جو بہرحال ایک محدود مدت ہی تک جاری رہ سکتا ہے اور خود ایمرجنسی کا لفظ اپنے اندر محض عارضی ہونے کا مفہوم رکھتا ہے، اس لیے اس کا مسلسل قیام بے وجہ شہریوں کو ان کے بنیادی حقوق سے محروم کر دینے کا ہم معنی ہے۔ رہی یہ بات کہ چین کے حملے کا خطرہ ابھی باقی ہے یا خود پاکستان کی طرف سے آئندہ حملے کو خارج از امکان قرار نہیں دیا جا سکتا تو اسے صحیح تسلیم کرتے ہوئے بھی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ محض حملے کا خطرہ یا اس کا امکان بنیادی حقوق کو معطل کر دینے کے لیے کافی ہے پھر تو یہاں جمہوریت کو بالائے طاق ہی رکھ دینا ہوگا کیونکہ کم از کم چین کے بارے میں تو یہ ایک تقریباً مسلمہ سی بات ہے کہ اس کے توسیعی مقاصد ہندوستان کے لیے ایک مستقل خطرے کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن اس کے معنی سوا اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتے کہ ہم نے جمہوریت کو اس کی خوبیوں کی بنا پر مستقل طور سے اپنانے کا ارادہ نہیں کیا ہے بلکہ اس کا قیام پڑوسیوں کے دیے یا رحم و کرم پر موقوف ہے۔

اصل یہ ہے کہ جمہوریت ایک خاص اندازِ فکر کا نام ہے جو کسی ملک میں اسی وقت جڑ پکڑ سکتی ہے جب اس کے اصولوں کو پسندیدہ سمجھ کر اختیار کیا گیا ہو اور اس کے لیے اہلِ ملک کچھ قربانیاں پیش کرنے کے لیے بھی آمادہ ہوں اور اس پہلو سے ابھی ہمارے یہاں فضا اس کے لیے پوری طرح تیار نہیں ہوسکی ہے اور اسی بنا پر یہاں یہ چیز ممکن ہو سکی ہے کہ ہمارا حکمران طبقہ ایمرجنسی کے نام پر عملاً اتنی مدت سے اپنی ڈکٹیٹرشپ چلا رہا ہے اور عام پبلک خاموشی کے ساتھ اسے برداشت کر رہی ہے۔

ڈی آئی آر دراصل ایمرجنسی ہی کی پیداوار ہے اس لیے ایمرجنسی کی طرح اس کی ضرورت بھی کسی عارضی مدت کے لیے کسی درجے میں ثابت کی جاسکتی ہے لیکن جب خود ایمرجنسی اپنی معنویت ختم کر چکی ہو تو ڈی آئی آر کا وجود بھی از خود بے معنی بن جاتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ بھی بدستور قائم ہے اور اس شان کے ساتھ قائم ہے کہ جن حالات سے نمٹنے کے لیے پہلے سے قانون موجود ہیں ان میں بھی وہ بے دھڑک استعمال ہو رہا ہے۔

اور اس سے بھی بڑی بات یہ کہ اس کثرت کے ساتھ اور ایسے بے محابا طور سے استعمال ہو رہا ہے کہ اچھے خاصے شریف شہری بھی اپنے گھروں میں بیٹھے ہوئے ڈر محسوس کرتے ہیں کہ کہیں ان پر بھی کسی وقت اس کا وار نہ چل جائے اور حالیہ جنگ کے موقعہ پر خاص طور سے مسلمانوں کے سلسلے میں تو وہ ایسے بے دردانہ طور پر استعمال ہوا ہے کہ اچھے خاصے سمجھدار اور کھلے دماغ کے لوگوں کا ذہن کچھ اس طرح سوچنے پر مجبور ہوگیا ہے کہ اس کا وجود کوئی ضرورت نہیں بلکہ بہت بڑی لعنت ہے جنگ کے دوران میں جس اندھادھند طریقے سے مسلمانوں کی گرفتاریاں عمل میں آئی ہیں اس کا حال عام طور سے لوگوں کو معلوم نہیں ہے جس کی بڑی وجہ غالباً یہ ہوئی ہے کہ ان گرفتاریوں سے مسلمانوں میں جو خوف وہراس پیدا ہوگیا تھا اس کی بنا پر اور خاص طور سے جنگ کے دوران میں ان کے اندر اس کی بھی جرأت باقی نہیں رہ گئی تھی کہ اس پر کوئی حرفِ شکایت بھی اپنی زبان پر لائیں اور بدقسمتی سے جنگ کے نتیجے میں غیر مسلموں کا ذہن بالعموم کچھ اس طرح متاثر رہا ہے کہ ان گرفتاریوں پر انہیں ایک گونہ کچھ اطمینان و سکون سا محسوس ہوا ہے اس لیے قدرتاً ان کے اندر

اس پر نہ کوئی اضطراب و تشویش پیدا ہو گی اور نہ اس کے بارے میں تحقیق و تفتیش اور پوچھ گچھ کرنے کا کوئی داعیہ ان کے اندر ابھر سکا۔ بحمداللہ معاہدۂ تاشقند کے بعد اب حالات میں کئی خوشگوار تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں اور اب مسلمانوں کی زبانیں بھی کچھ نہ کچھ کھلنے لگی ہیں اس لیے جن باتوں پر اب تک پردے پڑے ہوئے تھے وہ بھی رفتہ رفتہ منظر عام پر آنے لگے ہیں اس لیے وقت آگیا ہے کہ جنگ کے دوران میں جو کچھ ہوا ہے اس پر کچھ سنجیدگی کے ساتھ غور کیا جائے اور جو غلط باتیں ظہور میں آئی ہیں ان کے تدارک کی فکر کی جائے۔ یہ سمجھنا صحیح نہ ہو گا کہ وہ غلط باتیں اپنے اثرات کے ساتھ ختم ہو گئی ہیں ان کے اثرات تادیر قائم رہنے والے ہیں اور ابھی تو اس زمانے میں گرفتار ہونے والوں میں سے بہت سے لوگ اب تک جیلوں میں بند ہیں۔

ہم ان لوگوں میں ہیں جن کو ان گرفتاریوں اور ان کے اثرات و نتائج کو قریب سے دیکھنے کا بہت کافی موقع ملا ہے کیونکہ مسلم جماعتوں میں یہ امتیاز خاص صرف جماعت اسلامی کو حاصل رہا ہے کہ متعدد ریاستوں میں اس کے بہت سے کارکن گرفتار ہوئے اور مہاراشٹر میں تو تقریباً اس کے تمام ارکان ہی گرفتار کر لیے گئے تھے اور اس مدت میں ہمیں ملک کے بہت سے مقامات پر جانے یا وہاں کے لوگوں سے براہ راست ربط قائم کرنے کا بھی اتفاق ہوا ہے اس لیے ہم ان کے بارے میں دوسروں کے مقابلے میں نسبتہً زیادہ اعتماد کے ساتھ گفتگو کر سکتے ہیں۔

یہ بات تو ہم بھی قطعیت سے نہیں بتا سکتے کہ جنگ کے دوران میں ڈی آئی آر کے تحت گرفتار ہونے والوں کی صحیح تعداد کیا ہے اور ان میں مسلمانوں کا تناسب کیا رہا ہے کیونکہ اس کا اظہار غالباً مصلحت کے خلاف سمجھا گیا ہے اور جو باتیں بتائی گئی ہیں وہ باہم متعارض ہونے کی بنا پر زیادہ قابل اعتماد نہیں ہیں لیکن اس کا سرسری اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ابھی حال میں حکومت بنگال نے ڈی آئی آر کے تحت گرفتار شدگان میں سے کچھ کو چھوڑ کر بقیہ کو رہا کیا ہے جو سرکاری اعلان کے مطابق رہا ہونے والوں کی آخری قسط تھی لیکن پھر بھی ان کی تعداد چھ سو سے بھی زیادہ تھی اور ان کے بارے میں خود اعلان میں کہا گیا ہے کہ وہ بیشتر اقلیتی گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔

تعداد کے بعد سمجھنے کی بات یہ ہے کہ انہیں کس حال میں گرفتار کیا گیا اور کس طرح جیلوں میں رکھا گیا

اور اب جب وہ رہا ہو رہے ہیں تو ان کا حال کیا ہے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ اگر ان باتوں کی باقاعدہ تحقیقات کی جائے تو نہایت دل دوز واقعات سامنے آئیں گے۔ ہم مختصراً عرض کرتے ہیں کہ ہمیں کتنے ایسے خاندانوں کا علم ہے جن کی کفالت تنہا کسی ایک فرد کے ذمہ تھی اور یہ تنہا کفالت کرنے والے اس حال میں گرفتار کیے گئے کہ ان کے بیوی اور بچے بیمار تھے اور انھوں نے اپنی عسرت اور تنگی کی بنا پر کوئی پس ماندہ رقم بھی نہیں چھوڑی تھی جو اس طرح کے مشکل حالات میں کچھ کام آتی۔ اس لیے ان کے بعد ان کے اہل وعیال کو پانچ پانچ چھ چھ ماہ کی مدت اس طرح گزارنی پڑی ہے کہ یا تو دوستوں اور عزیزوں کی اعانتوں پر تکیہ کریں یا ان کی خودداری اور عزت نفس اسے گوارا نہ کرے تو فاقوں پر فاقہ کریں یا قرض لے کر کسی طرح جان بچائیں۔ بعض ریاستوں میں ایسا ضرور ہوا ہے کہ کچھ گرفتار شدگان کو فیملی الاؤنس دیے گئے ہیں لیکن ایسے خوش قسمت لوگ استثنائی مثال کی حیثیت رکھتے ہیں اور بالعموم انہیں جو رقم دی جاتی رہی ہے وہ بس سد رمق ہی کا کام دے سکتی تھی اور اکثر حالتوں میں تو تریاق از عراق آورده شود ہی کا معاملہ رہا ہے اور اکثر ریاستوں میں گرفتار ہونے والے اس قسم کی سہولت سے کلیۃً محروم رہے ہیں کم از کم مسلمان گرفتار ہونے والوں کا تو یہی حال رہا۔

ہمیں گرفتار ہونے والوں میں کتنے ایسے لوگوں کے نام معلوم ہیں جن کا ذریعہ معاش ملازمت تھی یا کوئی چھوٹا موٹا کاروبار اور اب جب وہ رہا ہو کر آئے ہیں تو وہ اپنی ملازمتوں سے اس لیے محروم ہو گئے ہیں کہ حکومت یا غیر مسلم کسی "مشتبہ" شخص کو دوبارہ ملازم رکھنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور مسلمان اس لیے انہیں دوبارہ جگہ دینے سے کترا رہے ہیں کہ "مشتبہ" لوگوں کو دوبارہ ملازم رکھ کر انہیں خود "مشتبہ" شمار کیے جانے کا خطرہ لاحق ہے اور اگر وہ کوئی کاروبار کرتے تھے تو وہ اس مدت میں بند پڑے رہنے کی بنا پر دم توڑ چکا ہے اور اسے از سر نو زندہ کرنے کے لیے نئی کوشش اور سرمایہ کی ضرورت ہے۔

اور اس مخصوص واقعہ کا ذکر تو اخبارات میں بھی آچکا ہے کہ ہمارے حلقہ بمبئی کے امیر اور ان کی اہلیہ محترمہ جو عرصے سے بیمار چلی آرہی تھیں، بہ یک وقت گرفتار کر لیے گئے تھے اور ان کی دس بارہ برس کی اکلوتی بچی اپنے والدین کی جدائی کا صدمہ برداشت کرنے کے لیے تنہا چھوڑ دی گئی تھی اور یہ تو ہمارے علم میں ایسے واقعات بھی ہیں کہ اندھوں اور اسی اسی برس کے بوڑھوں سے بھی ملکی آزادی و سالمیت کے لیے خطرہ محسوس کیا گیا اور انہیں بھی جیلوں میں پہنچا کر ہی دم لیا گیا اور اگر وہ چلنے پھرنے سے معذور تھے تو

انہیں جیل تک پہنچانے کے لیے کمپیوٹر کی مدد حاصل کی گئی اور اس ضمن کی پُر لطف بات یہ ہے کہ بعض مقامات پر ایسے لوگوں کے خلاف بھی گرفتاری کے وارنٹ جاری کر دیے گئے جو آج سے چار پانچ سال پہلے اس دنیا کو چھوڑ کر عالم بالا میں پہنچ چکے ہیں یا انتقالِ مکانی کر کے کسی دوسرے ملک کے باقاعدہ شہری بن چکے ہیں۔ ایسے دو وارنٹ خود ہمارے دو سابق رفیقوں کے نام جاری ہوئے تھے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وطن دشمنوں کی تحقیق میں کتنی محنت اور جاں فشانی سے کام لیا گیا ہے اور ان کو کہاں کہاں سے ڈھونڈ ھ نکالنے اور کھینچ بلانے کا ارادہ کیا گیا تھا۔

غور کرنے کی بات ہے کہ اس نوع کی گرفتاریوں نے گرفتار ہونے والوں پر جو بہر حال گوشت پوست کے بنے ہوئے انسان ہیں کیا اثرات ڈالے ہوں گے اور ظاہر بات ہے کہ یہ اثرات صرف ان لوگوں ہی تک محدود نہیں رہ سکتے۔ ان سے کم و بیش ان سب لوگوں کا متاثر ہونا قطعی ہے جن کا ان سے دور و قریب کا کوئی تعلق ہوگا یا جن کے علم میں یہ واقعات آئے ہوں گے۔

ہمارے خیال میں اس طرح کے تمام واقعات کی نہ صرف تحقیق ضروری ہے بلکہ ساتھ ہی ان کے تدارک کی مناسب صورتیں بھی اختیار کی جانی چاہییں۔ اور اس سلسلے میں سب سے پہلا ضروری کام یہ ہے کہ جو لوگ ابتک بھی رہا نہیں کیے گئے ہیں ان کو فوراً رہا کیا جائے محض شبہے کی بنا پر اتنے دنوں تک لوگوں کو مقید رکھنا اور وہ بھی ایسی حالت میں کہ جنگ کو عملاً ختم ہوئے مدت ہوئی اور اس وقت بظاہر جنگ کا کوئی خطرہ بھی درپیش نہیں ہے سراسر ظلم و زیادتی کی بات ہے لیکن اگر حکومت اس کے لیے تیار نہیں ہے تو اس میں اسے پس و پیش نہیں ہونا چاہیے کہ ایسے لوگوں کے خلاف عدالت میں باقاعدہ مقدمہ قائم کرائے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ وہ واقعی جیل ہی میں رکھے جانے کے قابل ہیں اور یہ واضح ہو جانے کے بعد یقیناً نہ کسی کو ان کے ساتھ ہمدردی ہوگی اور نہ حکومت سے کوئی شکوہ۔

دوسری ضروری بات یہ ہے کہ جو لوگ رہا کیے جا چکے ہیں انصاف کا تقاضا تو یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو اس مدت میں جن مالی نقصانات سے دوچار ہونا پڑا ہے انہیں ان کا پورا معاوضہ دیا جائے لیکن اگر انصاف کے اس تقاضے کو پورا کرنے کے لیے حکومت تیار نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ تیار نہیں ہوگی کیونکہ اگر انصاف کا اتنا پاس و لحاظ ہوتا تو اتنے ناکردہ گناہ لوگ اتنے دنوں تک قید و بند

کی مصیبت ہی کیوں جھیلتے ۔ اس کے اطمینان کے لیے تو بس اتنی بات کافی ہے کہ ایمرجنسی جیسی سب کچھ کرسکنے کی مجاز ہے اور کسی قانون نے کوئی غلط کام کرنے پر اس کا معاوضہ ادا کرنے کا اسے پابند نہیں ٹھہرایا ہے ۔ تو کم از کم اتنے کے لیے تو اسے راضی ہی ہو جانا چاہیے کہ انہیں اپنی مدت اسارت میں جو فیملی الاؤنس مل سکتا تھا اور جس سے انہیں محروم رکھا گیا ہے وہ تو ضروری ادا کر دیا جائے ۔ اگر چند اشخاص کا معاملہ ہوتا تو انہیں نظر انداز کر دینا آسان ہوتا لیکن ہزاروں اشخاص کو جن کا حال اوپر معلوم ہو چکا ہے یونہی قسمت کے حوالے کر دینا مصلحت کے بھی سراسر خلاف ہے

اور ہمارے نزدیک اس سے بھی زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ اس موقع پر ان لوگوں کو بے وجہ گرفتار کر لینے سے ان کی عزت و شہرت کو جو نقصان پہنچا ہے اور پبلک میں خواہ مخواہ ان کے بارے میں جو سوء ظن پیدا ہوا ہے اسے دور کرنے اور اس کی تلافی کرنے کی پوری پوری کوشش کی جائے ۔ یہ گرفتار ہونے والے بالعموم ایسے ہی حضرات ہیں جو پبلک میں اپنی خدمات یا مقام و مرتبے کے لحاظ سے عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے لیکن گرفتاری سے ان کے بارے میں ذہنوں میں بے وجہ شکوک و شبہات پیدا ہو گئے ہیں جن سے لازماً انہیں طرح طرح کے نقصانات اٹھانے پڑیں گے جن میں ایک بڑا نقصان یہ بھی ہے کہ اس کی بنا پر انہیں اپنے سابقہ کاموں کے انجام دینے میں رکاوٹ پیش آسکتی ہے ۔ اس لیے اس کی تلافی نہایت ضروری ہے اور یہ مقصد محض چپکے سے انہیں رہا کر دینے سے ہرگز پورا نہیں ہو سکتا بلکہ ان کی بے گناہی اور ان کو گرفتار کرنے کی غلطی کا صاف صاف اعتراف کیا جائے اور ساتھ ہی جو لوگ ان کی گرفتاری کے ذمہ دار ہیں ان سے باقاعدہ باز پرس کر کے ان کو مناسب سزائیں بھی دی جائیں تاکہ ایک طرف یہ ان لوگوں کے بے گناہ ہونے کا ثبوت ہو اور دوسری طرف آئندہ ایسے واقعات کے اعادے کا کچھ سدباب ہو سکے ۔

یہاں اس ضمن میں مہاراشٹر کے ایک مسلم وزیر جناب رفیق زکریا صاحب کی ایک تازہ تقریر پر اظہار افسوس کے بغیر ہم نہیں رہ سکتے ۔ انھوں نے ایک پبلک جلسے میں فرمایا ہے کہ وہاں کے وزیر اعلیٰ کو مسلمانوں کی گرفتاری پر بڑی تشویش تھی لیکن محکمہ پولس نے اس انداز میں رپورٹ مرتب کی تھی کہ چند مسلمانوں کو گرفتاری کے بغیر چارہ نہیں تھا اور بہت سے مسلمانوں نے مسلمانوں کے خلاف انہیں گرفتار کرنے کے لیے پولس میں خود ہی درخواستیں دیں اور ایسی ترکیبیں کیں کہ ان کا ہمارے پاس کوئی علاج نہیں تھا ۔

مہاراشٹر میں جو مسلمان جنگ کے موقع پر گرفتار کیے گئے تھے ان کی تعداد سیکڑوں سے تو یقیناً متجاوز

(باقی صفحہ ...)

تبلیغ دین

قسط ۳

مولانا محمد یوسف اصلاحی

داعیِ حق کے اوصاف

دین کی قدر و عظمت

وَلَقَدْ اٰتَیْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ ۝ لَا تَمُدَّنَّ عَیْنَیْكَ اِلٰی مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ (الحجر ۸۷، ۸۸)

اور ہم نے آپ کو سات دہرائی جانے والی آیتیں اور عظمت والا قرآن عطا فرمایا ہے تو آپ اس فانی متاع کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھیے جو ہم نے ان کے مختلف طبقوں کو دے رکھا ہے

رسول سے خطاب کرتے ہوئے مسلمانوں سے کہا جا رہا ہے کہ بلا شبہ تم بے سرو سامان اور بے کس و مظلوم ہو لیکن خدا نے تمہارے دلوں کو قرآن جیسی باعظمت دولت سے غنی کر رکھا ہے بھلا اس کے مقابلے میں اس دولت اور شان و شوکت کی کیا قیمت جو چند روز کی بہار ہے — وہ تو دونوں جہان کی عزت و سربلندی کا سرمایہ ہے۔ تم تو اس ناپائیدار دولت کو آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھو

نصب العین کی اہمیت کا احساس

قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰی شَیْءٍ حَتّٰی تُقِیْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ (المائدہ ۶۸)

اے اہل کتاب! تم کچھ نہیں ہو جب تک کہ تم توراۃ اور انجیل اور ان دوسری کتابوں کو قائم نہ کرو جو تمہارے رب نے نازل فرمائی ہیں

یعنی تمہاری عظمت و رفعت کا راز یہ ہے کہ تم اس مقصد کو پورا کرنے میں جی جان سے لگے رہو جس کے لیے تمہیں پیدا کیا گیا ہے ــــ یہ خطاب تو اہل کتاب سے کیا گیا ہے لیکن یہ عملی ہدایت اس امت کے لیے بھی ہے جس کو عالم کی رہنمائی اور دین کی اقامت کے لیے اٹھایا گیا ہے

اصلاحِ حال کی تڑپ

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ (الکہف)

تو اے رسول! شاید آپ ان کے پیچھے غم کے مارے اپنی جان ہلکان کر ڈالیں گے۔ اگر یہ اس تعلیم پر ایمان نہ لائے۔

حق کی بصیرت

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ (یوسف ۱۰۸)

اے رسول! آپ ان کو صاف صاف بتا دیجیے کہ میں یقین اور بصیرت کی پوری روشنی کے ساتھ خدا کی طرف دعوت دے رہا ہوں اور وہ لوگ بھی جو میری پیروی میں کام کر رہے ہیں۔

صبر و ثبات

وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (لقمان ۱۷)

نیک کام کا حکم دیتے رہنا اور برے کام سے روکتے رہنا اور آنے والی مصیبت کو صبر و ثبات کے ساتھ برداشت کرنا بلاشبہ یہ بڑی ہمت کے کام ہیں

بے لوثی

قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا (الفرقان ۵۷)

ان سے کہہ دیجیے کہ میں تم سے کوئی معاوضہ نہیں چاہتا سوائے اس کے کہ جو چاہے اپنے رب کا راستہ اپنا لے

یعنی میری دوڑ دھوپ کے پیچھے کوئی مادی غرض نہیں، میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ خدا کے بندے خدا کی راہ پر آ جائیں۔

خدا کی نصرت پر یقین

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ (العنکبوت ۶۹)

جو لوگ ہماری راہ میں جد و جہد کریں گے انہیں ضرور ہم اپنی راہیں دکھائیں گے اور یقیناً اللہ نیکوکاروں کے ساتھ ہے

یعنی جو لوگ خدا کی راہ میں دوڑ دھوپ کرتے ہیں خدا زندگی کے ہر موڑ پر ان کی رہنمائی فرماتا ہے اور اپنی توفیق و نصرت سے نوازتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا	اے مومنو! اگر تم اللہ کی مدد کرو گے
إِنْ تَنْصُرُوا اللَّهَ يَنْصُرْكُمْ	تو اللہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے
وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ (محمد: ۷)	قدموں کو جما دے گا۔

اللہ کی مدد کرنے سے مراد اس کے دین کی مدد اور اس کو غالب کرنے کی جد و جہد ہے۔

داعیِ حق اور مخالفین

داعیِ حق کا وجود دنیا کے لیے سر تا سر رحمت ہے حتّٰی کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ بھی عدل و انصاف اور سچی خیر خواہی کا معاملہ کرتا ہے۔ جو اس کے اور اس کی دعوت کے دشمن ہوتے ہیں

کشمکش میں داعی کا حکیمانہ کردار

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا	بھلائی اور برائی برابر نہیں
السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي	ہو سکتی۔ برائی کا جواب ایسے طریقے سے
بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ	دو جو انتہائی اچھا ہو اور یہ بات انہی لوگوں کو
وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ (حم السجدہ: ۳۴-۳۵)	ملا کرتی ہے جو برداشت کرتے ہیں اور انہی کو نصیب ہوتی ہے جو بڑے نصیبے والے ہیں

یعنی داعیِ حق انتہائی عالی ظرف اور وسیع القلب ہوتا ہے، وہ اپنے مخالفین کے لیے انتقامی جذبات نہیں پالتا۔ بلکہ وہ ان کی برائیوں اور زیادتیوں کے جواب میں بھی خیر خواہی اور ہمدردی کا سلوک کرتا ہے اور داعیِ حق کی یہی روش اس کو مخالفین میں عزت و عظمت بخشتی ہے اور مقبول و محبوب بناتی ہے۔

اسلام کا برملا اظہار

وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا	اور اس شخص سے زیادہ بھلی بات
مِمَّنْ دَعَا إِلَى اللَّهِ	کہنے والا اور کون ہوگا جو اللہ کی طرف دعوت
وَعَمِلَ صَالِحًا وَقَالَ إِنَّنِي مِنَ	دے اور خود بھی نیک عمل کرے اور برملا
الْمُسْلِمِينَ (حم السجدہ: ۳۳)	کہے میرا تعلق ان لوگوں سے ہے جو مسلم ہیں

(حٰم سجدہ ۳۳) مسلم اور فرماں بردار ہیں۔

یعنی دنیا میں بہترین بات کہنے والا وہ داعی حق ہے جو اللہ کی طرف دعوت دے جس کی زندگی اعمالِ صالحہ سے آراستہ اور اپنی دعوت کا مکمل نمونہ ہو اور جو حالات کی تمام سنگینوں کا خندہ پیشانی سے استقبال کرتے ہوئے فخر و یقین کے ساتھ اپنے اسلام کا برملا اعلان و اظہار کرے

ملامت و مخالفت سے بے نیازی

يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ۔ (المائدہ) — جو اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا انہیں خوف نہ ہوگا۔

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ إِنَّا كَفَيْنَاكَ الْمُسْتَهْزِئِينَ ۝ (الحجر ۹۴) — جو کچھ آپ کو حکم دیا گیا ہے اسے کھلم کھلا بیان کیجیے۔ اور مشرکوں کی طرف سے بالکل بے پرواہ ہو جائیے۔ آپ کی طرف سے ہم ان استہزاء کرنے والوں کی خبر لینے کے لیے کافی ہیں۔

یعنی آپ مخالفینِ حق کی ملامت، طعن و تشنیع، استہزاء اور مخالفت سے بے نیاز ہو کر کھلم کھلا حق کی دعوت دیتے رہیے اور ان کا معاملہ اس کے سپرد کیجیے جو ان کی خبر لینے کے لیے کافی ہے۔

مداہنت سے کامل اجتناب

فَلِذَٰلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ وَقُلْ آمَنْتُ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنْ كِتَابٍ وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمُ اللَّهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ — (اے رسولؐ!) آپ اسی دینِ حق کی برابر دعوت دیتے رہیے اور جس طرح آپ کو حکم دیا گیا ہے۔ اسی پر مضبوطی کے ساتھ جمے رہیے اور ان لوگوں کی خواہشات کے پیچھے نہ چلیے۔ ان سے کہہ دیجیے کہ میں اس کتاب پر ایمان لایا ہوں جو اللہ نے نازل فرمائی ہے۔ مجھے یہ حکم ہوا ہے کہ میں تمہارے درمیان انصاف کروں۔ خدا ہمارا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔ ہمارے اعمال

اَللّٰہُ یَجْمَعُ بَیْنَنَا وَ اِلَیْہِ الْمَصِیْرُ ۝ (الشوریٰ ۱۵)

ہمارے لیے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لیے۔ ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں۔ خدا ایک دن ہم سب کو جمع کرے گا اور اسی کی طرف ہم سب کو جانا ہے

یعنی صاف صاف کہہ دیجیے کہ تمہاری خوشنودی، مروت اور خوف میں ہم ہرگز کوئی ایسی روش اختیار نہیں کرسکتے جو دین کے خلاف ہو۔ ہم سے بے جا رواداری کی قطعاً کوئی امید نہ رکھو ہم خدا کی کتاب پر ایمان لائے ہیں اور ہر حال میں اسی پر مضبوطی کے ساتھ جمے رہیں گے۔

اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ (الفتح)

وہ کافروں پر نہایت سخت ہیں

یعنی وہ اپنے اصولوں پر اتنے سخت اور مضبوط ہیں کہ اہلِ باطل کو ان سے مداہنت یا بے جا رواداری کی امید نہیں ہوسکتی۔

جرأت و بے خوفی

یٰٓاَیُّہَا النَّبِیُّ اتَّقِ اللّٰہَ وَلَا تُطِعِ الْکٰفِرِیْنَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیْمًا حَکِیْمًا (الاحزاب ۱)

اے نبی اللہ سے ڈریے اور کفار ومنافقین کا کہا نہ مانیے حقیقت میں علیم و حکیم خدا ہی ہے۔

نبی کے واسطے سے تمام مسلمانوں کو ہدایت دی جارہی ہے کہ صرف خدا ہی کا خوف رکھو اور اسی کے دین کی پیروی کرو۔ یہ بات ایمان کے قطعاً منافی ہے کہ تم کفار و منافقین سے ڈرنے لگو اور ان کی ہر جا و بے جا بات ماننے لگو ایمان کا تقاضا تو یہ ہے کہ تمہارے دل میں صرف خدا کا خوف ہو اور تم جرأت کے ساتھ صرف خدا ہی کے لیے اطاعت گزاری کرتے رہو۔

ہر حال میں پورے دین کی دعوت

وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْہِمْ اٰیَاتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ ھٰذَآ اَوْ بَدِّلْہُ قُلْ مَا یَکُوْنُ لِیْٓ اَنْ اُبَدِّلَہٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ

اور جب ان کو ہماری کھلی کھلی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو جو لوگ ہماری ملاقات کا یقین نہیں رکھتے۔ کہتے ہیں اس کے بجائے کوئی دوسرا قرآن لائیے یا اسی میں کچھ تغیر تبدل کر دیجیے۔ آپ فرما دیجیے کہ میں اپنی طرف سے اس میں ہرگز کوئی کمی

اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوحٰى اِلَيَّ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ (یونس: ۱۵)

میں نہیں کر سکتا۔ میں تو خود اس وحی کا پیرو ہوں جو میری طرف بھیجی جاتی ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب کا ڈر ہے۔

ایذا رسانی پر صبر

وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا (ابراہیم ۱۲)

اور جو تکلیفیں تم ہم کو دے رہے ہو ہم ان پر صبر ہی کریں گے۔

نرم اندازِ بیان

فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى (طٰہٰ: ۴۴)

پس اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا شاید کہ وہ نصیحت قبول کرے یا اس میں خشیت پیدا ہو

ہر حال میں بھلی بات

وَقُلْ لِّعِبَادِيْ يَقُوْلُوا الَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (بنی اسرائیل: ۵۳)

اور (اے رسول!) میرے بندوں سے کہیے کہ ایسی بات کہا کریں جو انتہائی پسندیدہ ہو

یعنی اگر تمہارے مخالفین اپنی نادانی اور جاہلی حمیت کے جوش میں کچھ نازیبا باتیں کرنے بھی لگیں تب بھی ٹھنڈے دل سے جچی تلی بات کہو اور خوش گوار فضا میں دینِ حق کی ترجمانی کرتے رہو۔

مذہبی جذبات کا پاس لحاظ

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًاۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ (الانعام ۱۰۹)

یہ لوگ خدا کے سوا جن لوگوں کو پکارتے ہیں ان کو گالیاں نہ دو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ بھی جہالت میں حد سے بڑھ جائیں اور خدا کو گالیاں دینے لگیں

یعنی داعی کو چاہیے کہ وہ دوسروں کے مذہبی جذبات کا پاس لحاظ رکھے اور کبھی جوش دعوت میں ان لوگوں کو برا نہ کہہ بیٹھے جن کو اہلِ باطل اپنا معبود قرار دیتے ہیں اور جن سے عقیدت رکھتے ہیں ـــــ ایسی روش کے نتیجے میں حق کو قبول کرنا تو دور کنار الٹا یہ اندیشہ ہے کہ وہ جہالت کی بنا پر خدا کی شان میں ناشائستہ کلمات کہہ بیٹھیں۔

جبر سے اجتناب

نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا

یہ جو کچھ کہتے رہتے ہیں ہمیں خوب معلوم

يَقُولُونَ وَمَا أَنتَ عَلَيْهِم بِجَبَّارٍ فَذَكِّرْ بِالْقُرْآنِ مَن يَخَافُ وَعِيدِ ۝ (ق-۴۵)

اور آپ ان پر جبر کرنے والے نہیں ہیں آپ تو ان لوگوں کو قرآن کے ذریعے سمجھاتے رہیں جو میرے ڈراوے سے ڈرتے ہیں

یعنی قرآن کی دعوت نہ آپ زبردستی منوا سکتے ہیں اور نہ یہ آپ کا کام ہے۔ آپ تو دل سوزی اور انہماک کے ساتھ لوگوں کو یاددہانی کراتے رہیے جن کے دلوں میں نرمی ہوگی وہ خود آگے بڑھ کر قبول کرلیں گے۔

دین میں کوئی زبردستی نہیں

لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَن يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِن بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انفِصَامَ لَهَا وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (البقرہ-۲۵۶)

دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں۔ ہدایت کی بات گمراہی سے بالکل الگ نمایاں ہوگئی ہے۔ اب جو طاغوت کا انکار کرکے اللہ پر ایمان لے آیا اس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں۔ اور اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے

مطلب یہ ہے کہ مسلمان جس دین کے پیرو ہیں اس کی دعوت دینے اور اسے قائم کرنے کی ذمہ داری ان پر ضرور ڈالی گئی ہے لیکن اس کا مطلب ہرگز نہیں کہ وہ زبردستی اس دین کو کسی کے دل میں اتار دیں۔ دلوں کا پھیرنا صرف اللہ کے اختیار میں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ہدایت کی دولت سے اسی کو نوازتا ہے جو اس کا طالب ہوتا ہے اور کھلے دل و دماغ سے اس کو قبول کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔

درگذر کی روش

قُل لِّلَّذِينَ آمَنُوا يَغْفِرُوا لِلَّذِينَ لَا يَرْجُونَ أَيَّامَ اللَّهِ (- -)

(اے رسول!) مسلمانوں سے کہیے کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ درگذر کی روش رکھیں جو اللہ کے دنوں کا یقین نہیں رکھتے۔

اللہ کے دنوں سے مراد وہ دن ہیں جن میں خدا کسی قوم کو انعام واکرام سے نوازے اور کسی قوم پر ہولناک عذاب بھیجے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ خدا کی رحمت اور اس کے عذاب سے بالکل بے فکر ہیں اور تمہارے ساتھ ناروا سلوک کر رہے ہیں۔ وہ قابلِ رحم ہیں ان کے ساتھ درگذر کا معاملہ کیجیے

بے آزار لوگوں سے حسنِ تعلق

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ (الممتحنۃ)

جن لوگوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ نہیں کی نہ تم کو تمہارے گھروں سے نکالا، ان کے ساتھ حسن سلوک اور انصاف سے خدا تمہیں نہیں روکتا۔ یہ حقیقت ہے کہ خدا انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اگر کچھ مخالفینِ حق تم پر ظلم و زیادتی کرنے لگیں اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکال دیں تو تم اس ظلم کے نتیجے میں سب سے بے تعلق نہ ہو جاؤ بلکہ دوسرے غیر مسلموں کے ساتھ تم بھلائی اور انصاف ہی کا سلوک کرتے رہو۔ ظلم کا بدلہ دوسرے بے گناہوں کو نہیں بلکہ ظالموں ہی کو ملنا چاہیے۔

ہجرت

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ ۝ (العنکبوت)

اے میرے مومن بندو! میری زمین وسیع ہے پس تم میری ہی بندگی کرو۔

مومن کا کام بہرحال یہ ہے کہ وہ خدا کی بندگی کرے اور اگر کسی ملک میں اس کے لیے اس کے مواقع نہ رہیں تو اسے چاہیے کہ وہاں سے ہجرت کر جائے۔ ہجرت کے معنی ہیں "خدا کی خاطر قطعِ تعلق کرنا" مومن کو ہر اس چیز سے بے تعلق ہو جانا چاہیے جو خدا کی محبت کے منافی ہو، خواہ وہ ماں باپ، عزیز و اقارب ہوں یا مال و دولت اور وطن ہو۔

حضرت ابراہیمؑ کی ہجرت

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ڛ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۝ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْــــًٔا ۝ يٰٓاَبَتِ اِنِّىْ قَدْ جَاۗءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْٓ

اور اس کتاب میں ابراہیمؑ کا قصہ بیان کیجیے۔ بلاشبہ وہ ایک سچے نبی تھے (لوگوں کو اس وقت کا ذکر سنائیے) جب انھوں نے اپنے باپ سے کہا۔ ابا جان! آپ ان چیزوں کی عبادت کیوں کر رہے ہیں جو نہ سنتی ہیں اور نہ دیکھتی ہیں اور نہ آپ کے کسی کام آ سکتی ہیں۔ ابا جان! میرے

اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ۝ يٰٓاَبَتِ
لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ
اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ
لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ۝ يٰٓاَبَتِ
اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ
مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ
وَلِيًّا ۝ قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ
عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰٓاِبْرٰهِيْمُ لَئِنْ
لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ
وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا ۝ قَالَ سَلٰمٌ
عَلَيْكَ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ
رَبِّيْ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ۝
وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْا
رَبِّيْ عَسٰٓى اَلَّآ اَكُوْنَ
بِدُعَآءِ رَبِّيْ
شَقِيًّا ۝

پاس وہ علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں
آیا ہے۔ آپ میرے کہنے پر چلیں۔ میں آپ کو
سیدھی راہ پر چلاؤں گا۔ ابا جان! آپ
شیطان کی بندگی نہ کیجیے، شیطان تو رحمٰن کا
بڑا نافرمان ہے۔ ابا جان! مجھے ڈر ہے (کہ
اگر آپ ایسی روش پر رہے تو) رحمٰن کا عذاب
آپ کو آ پکڑے اور آپ شیطان کے ساتھی
بن کر رہ جائیں۔ باپ نے کہا "ابراہیم
کیا تم میرے معبودوں سے پھر گئے ہو۔ اگر
تم باز نہ آئے تو میں تمہیں مار مار کر ہلاک کر دوں
گا اور جاؤ ہمیشہ کے لیے مجھ سے دور ہو جاؤ"
ابراہیم نے کہا: آپ کو میرا سلام ہے۔ میں اپنے
پروردگار سے دعا کروں گا کہ وہ آپ کی
بخشش فرما دے۔ بیشک میرا رب مجھ پر بڑا ہی
مہربان ہے۔ میں آپ لوگوں سے بھی کنارا
کرتا ہوں اور ان ہستیوں سے بھی جن کو تم خدا کو
چھوڑ کر پکارا کرتے ہو۔ میں تو اپنے رب ہی کو
پکاروں گا۔ مجھے پوری امید ہے کہ میں اپنے
رب کو پکار کر ہرگز نامراد نہ رہوں گا۔

(مریم: ۴۳، ۴۸)

خدا کی راہ میں جہاد

دعوتِ حق کی مخالف طاقتوں سے ٹکر لینے کے لیے مومن جو کوشش بھی کرتا ہے، وہ جہاد ہے اور اس کا انتہائی مرحلہ یہ ہے کہ اگر ضرورت آپڑے تو خدا کا بندہ محض خدا کی رضا کے لیے اپنی جان کی قربانی دینے کے لیے بھی میدانِ جنگ میں کود پڑے۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ

اور تم لوگ جہاں تک تمہارا بس چلے

مِنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ (انفال ۶۰)

زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے ان کے مقابلے کے لیے مہیا رکھو تاکہ اس کے ذریعے سے اللہ کے دشمنوں پر اور تمہارے دشمنوں پر تمہارا رعب و ہیبت چھائی رہے

معیارِ ایمان

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ِۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝ (التوبہ)

(اے رسول) کہہ دیجیے کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے عزیز و اقارب اور تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور تمہارے وہ کاروبار جن کے ٹھپ ہو جانے کا تم کو ڈر ہے اور تمہارے وہ مکانات جو تم کو پسند ہیں تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ عزیز ہیں تو انتظار کرو۔ یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ سامنے لے آئے اور اللہ فاسق لوگوں کی رہنمائی نہیں کرتا

یعنی خدا کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ اپنے جان و مال اور دنیوی رشتوں کو عزیز رکھنا خدا کی کھلی ہوئی نافرمانی ہے۔ اور ایسے ڈھیٹ نافرمان ہدایتِ الٰہی سے محروم رہتے ہیں۔

خدا کی راہ میں نکلنے کی تڑپ

وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ ۝ (التوبہ ۹۲)

اور نہ ان (بے سروسامان) لوگوں پر الزام کا موقع ہے جو خود آپ کے پاس آئے کہ آپ ان کے لیے سواریاں مہیا فرما دیں۔ اور جب آپ نے کہا کہ میں تمہارے لیے سواریوں کا انتظام نہیں کر سکتا تو وہ اس حال میں واپس ہوئے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور غم تھا کہ ان کے پاس جہاد میں شریک ہونے کے لیے خرچ کرنے کو کچھ بھی نہیں

استکبار فی الارض

عالمگیر بے چینیوں کی واحد جڑ

(مولانا عبدالمجید اصلاحی)

استکبار فی الارض نفسِ انسانی کا ایک انتہائی مہلک مرض ہے جو استعمار پسندانہ ذہنیت کا خالق ہے اور واقعات وحوادث کی زبان میں یہ مسلم الثبوت حقیقت ہے کہ استعمار پسندی قومی اور بین الاقوامی بے چینیوں کی واحد جڑ ہے۔ حریت، مساوات، اخوت، بقاء باہم، وفاقی نظام، عالمی سماج، فرقہ وارانہ یک جہتی، انسدادِ جرائم، پنچ شیل، سیکولرزم، کانفڈریشن، ناوابستگی اہنسا اور عدم تشدد اور اسی نوعیت کے خوش نما عنوانات مقامی اور عالمی اصلاح کے لیے انسان اپنے ذہن وفکر کے گوشوں سے کرید کرید کر نکال رہا ہے، لیکن طوفان بلا ہے کہ کم ہونے کا نام نہیں لیتا۔ بلکہ انسان کی بے چینیوں میں ہر دن اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے۔ عالم حیرت ہے کہ کچھ مسائل ابھی تحلیل وتجزیے کے عرصے میں ہوتے ہیں یا انہیں حل کی منزلوں سے گزارا جاتا ہے کہ کچھ دوسرے مسائل انہی کی کوکھ سے پیدا ہو جاتے ہیں۔

ہمیں کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ دنیا زبردستی قرآن کی جانب دھکیلی جارہی ہے اور ریاضی کے اٹل، غیر متزلزل اور ناقابل تردید حقائق کی طرح یہ حقیقت بھی مسلم ہے کہ یہ انسانی دنیا افراط وتفریط کے جھولوں میں اس وقت تک یوں ہی جھولتی رہے گی جب تک وہ اپنے مسائل کو حل کرنے کے لیے قرآن کی طرف مائل نہ ہوگی۔

قرآن پاک کا مطالعہ بتاتا ہے کہ فتنہ وفساد اور بے چینیوں کا شاندار تماشہ اور

بدنظمیوں کا تمام طوفان استکبار فی الارض اور انسان کی مغرورانہ روش کا نتیجہ ہے ۔
حسب ذیل آیات پر غور فرمائیں ۔

كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِطَغْوٰهَا اِذِ انْبَعَثَ	ثمود نے اپنی سرکشی سے جھٹلایا جب کہ
اَشْقٰهَا فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ	ان کا بدبخت انسان کھڑا ہوا اور پیغمبر خدا
نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا فَكَذَّبُوْهُ	نے ان سے کہا۔ خبردار خدا کی اونٹنی اور
فَعَقَرُوْهَا	اس کی پانی پینے کی باری سے سو انہوں
(الشمس)	نے پیغمبر کو جھٹلایا اور اونٹنی کو ہلاک کر دیا

چھٹی صدی عیسوی میں قرآن کی اس تاریخی شہادت سے پہلے ثمود کی اس متکبرانہ چال اور سرکشی اور علو پسندی کا واقعہ بالکل معلوم تھا۔ چنانچہ قدار جو ثمود کا طاغوت اعظم تھا۔ شعراء عرب کا زبان زد عام تھا۔ خنساء کا قول ہے :۔

ولاقاه من الایام یوم   کما من قبل لم یخلد قدار

اور اسے گردش ایام نے اس طرح فنا کر دیا جس طرح اس سے پیشتر قدار کو دوام نہ حاصل ہوا

جاہلی شاعر افوہ اودی کی زبان سے سنیے

اضحوا کقیل بن عمرو فی عشیرتہ   اذا هلكت بالذی سدی لها عاد

ان کا حال وہی ہے جو اپنی قوم میں قیل بن عمرو کا تھا کہ اس کی بدولت عاد ہلاکت کو پہنچے

او بعده کقدار حین تابعه   علی الغوایة اقوام فقد بادوا

یا اس کے بعد قدار کا جس کی گمراہی میں لوگوں نے پیروی کی اور ہلاک ہو گئے ۔

یہ متکبر مطلق العنان اور علمبردار ضلالت قدار ہی تھا جس نے اللہ کی اونٹنی کو گزند پہنچایا اور نتیجہ میں ساری قوم کی قوم ہلاکت کے گڑھے میں جا گری۔ اس کے علاوہ قوم عاد کے طاغوت اعظم قیل بن عمرو کا استکبار فی الارض پوری قوم عاد کو طوفان برق و باد کی نذر کر گیا۔ استکبار کے اس احمر اعظم کو زہیر بن سلمیٰ کے شعر میں پڑھیے :۔

فتنتج لکم غلمان اشأم کلهم   کاحمر عاد ثم ترضع فتفطم

پس یہ لڑائی تمہارے لیے بچے جنے گی جو سب کے سب منحوس ترین احمر عاد کے مانند ہوں گے اور انہیں دودھ پلا کر

پرمان چڑھاتی گئی ۔

شعر میں احمر عاد سے مراد یہی قیل بن عتر ہے۔ قدار احمر ثمود تھا جو ثمود کا سربراہ تھا۔ عاد و ثمود کی قومی اور ملکی بربادی و ہلاکت کا حقیقی سبب ان کے یہی دونوں احمرین تھے جن کے دماغوں میں تمرد، سرکشی، طغیان اور متکبرانہ ذہنیت ہر وقت چٹکیاں لیا کرتی تھی۔ تکبر و سرکشی کا یہ نشہ ناقۃ اللہ کو قتل کر دینے ہی پر ختم نہیں ہوا بلکہ اور آگے دیکھیے۔

قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ	انھوں نے کہا آؤ آپس میں قسم کھاؤ
لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ	کہ ہم ضرور رات کو صالحؑ اور اس کے
لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ	گھر والوں پر چھاپہ ماریں گے۔ پھر اس کے
اَهْلِهٖ وَاِنَّا	وارث سے کہدیں گے کہ اس کے آدمی کے
لَصَادِقُوْنَ ۝	مارے جانے کے وقت تو ہم موجود ہی نہ تھے
(النمل)	اور ہم بالکل سچے ہیں ۔

حضرت صالح علیہ السلام کی زندگی صاف و شفاف جیسے آئینہ۔ معصوم جیسے نوزائیدہ بچہ ــــ پاکیزہ، بے عیب جیسے شبنم کا قطرہ ــــ رحم و رافت کا مجسمہ ــــ پھر آخر کیا قصور تھا اُن کا؟ جس کی پاداش میں ان کی قوم درپئے آزار اور قتل کر دینے کے لیے بالکل بے قرار اور بے چین تھی۔ یہ تکبر و غرور اور طغیان و سرکشی کے علاوہ اور کیا چیز تھی۔

لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ	انھوں نے اپنے نزدیک خود بڑا بننا
وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا (الفرقان۔ ۲۱)	چاہا اور بہت سخت سرکشی کی

اور آگے ملاحظہ فرمائیں :۔

وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا	اور یاد کرو جب کافر تم پر داؤ پیچ
لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ	ڈال رہے تھے کہ تمہیں قید کر لیں یا قتل کر دیں
وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ	یا جلاوطن کر دیں اور وہ اپنا داؤ کر رہے
الْمَاكِرِيْنَ ۝	تھے اور اللہ اپنی تدبیر کر رہا تھا اور اللہ
(الانفال)	بہترین تدبیر کرنے والا ہے

آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے پاکیزہ اوراق کس کے سامنے روشن ہو کر نہیں کھلے تھے، خود ابوسفیان جو سازش کرنے والوں میں تھے قیصر روم ہرقل اعظم کے روبرو آپ کی پاکیزگی، صداقت، شرافت، عالی نسبی اور عظمت کردار کا اعتراف مکمل کر چکے تھے، پھر آخر کیوں یہ لوگ آپ کے درپے آزار تھے، کون سا جرم آپ نے کیا تھا، کیا قصور آپ کا علاوہ علو پسندی اور کبریائی کے نشے کے علاوہ آخر اور کیا بات ہو سکتی تھی ——

ذَالِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا	یہ اس وجہ سے کہ وہ اللہ کی آیات
يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ	کا انکار کرتے تھے اور نبیوں کو ناحق قتل
النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ذَالِكَ بِمَا	کرتے تھے۔ یہ اس وجہ سے کہ انھوں نے
عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ (البقرہ)	نافرمانی کی اور حد سے تجاوز کر جاتے تھے۔

اس آیت میں قرآن پاک نے انبیاء علیہم السلام کے ناحق قتل کا صرف ایک ہی سبب قرار دیا ہے اور وہ ہے عصیان اور اعتدار آگے اس سبب کی مزید توضیح ملتی ہے۔

اَفَكُلَّمَا جَاۗءَكُمْ رَسُوْلٌ	کیا جب جب تمہارے پاس کوئی رسول
بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ	تمہاری خواہشوں کے خلاف کوئی بات لیکر
فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيْقًا	آیا تو تم اکڑ بیٹھے پھر بعض کو تم نے جھٹلایا
تَقْتُلُوْنَ ۝ (البقرہ)	اور بعض کو قتل کیا۔

یہاں بالکل صاف طور پر قتل انبیاء کا سبب استکبار کو قرار دیا جا رہا ہے جو عصیان و اعتدار کا اصل محرک ہے۔

استکبار فی الارض نے جب انبیاء جیسی معصوم ہستیوں کو نہیں بخشا تو پھر ان سے نیچے کے لوگ کس شمار و قطار میں ہیں۔ سورہ بقرہ ہی میں دوسری جگہ یہ آیات تلاوت کیجیے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ	بے شک جو لوگ اللہ کی آیات کا
اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ	انکار کرتے ہیں اور انبیاء کو ناحق قتل کرتے
حَقٍّ وَّيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ	ہیں اور ان لوگوں کو قتل کرتے ہیں جو لوگوں
بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ	میں سے عدل کا حکم دیتے ہیں تو ان کو دردناک

اٰیٰتِہٖ ہ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ حَبِطَتْ	عذاب کی خوش خبری پہنچا دو۔ یہ وہی ہیں
اَعْمَالُھُمْ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ وَ	جن کے اعمال دنیا و آخرت میں برباد گئے
مَالَھُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ ہ	اور ان کا کوئی مددگار نہیں ہے۔

یہ حضرات یہود کی تصویر ہے۔ بے گناہ اور بے داغ سیرتوں کو تہ تیغ کر دینا ان کے مفسدانہ کاموں اور تمرد و سرکشی کا انتہائی عنوان تھا۔ ان آیات کے اندر صاف صاف اس حقیقت کا اظہار ہے کہ قتل انبیاء اور قتل صالحین کا واحد سبب استکبار تھا۔

ایک برائی ہزاروں برائیوں کا دروازہ کھول دیتی ہے۔ استکبار ایک برائی ہے۔ اس کے نتیجے میں دوسری برائی انکار حق، تیسری برائی ذلت و مسکنت، چوتھی برائی عداوت و بغض، پانچویں برائی شعور و احساس پر قفل چڑھ جانا اور پھر ان برائیوں کی کوکھ سے مزید برائیاں پیدا ہوتی چلی جاتی ہیں۔ بعض نمونے ملاحظہ فرمائیں :۔

انہی متکبر اور سرکش یہود کے متعلق قرآن تبصرہ کرتا ہے۔

وَاِذَا قِیْلَ لَھُمْ لَا تُفْسِدُوْا	اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ دنیا
فِی الْاَرْضِ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ	میں فساد نہ مچاؤ تو کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح
اَلَآ اِنَّھُمْ ھُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَ	کر رہے ہیں۔ دیکھو یہی فساد کرنے والے ہیں
لٰکِنْ لَّا یَشْعُرُوْنَ (البقرہ)	مگر انہیں احساس نہیں ہے۔

ایک شخص یا ایک خاندان سے لے کر بڑی سے بڑی حکومت کے سربراہ کاروں سے جو فساد فی الارض کے مجرم ہوا کرتے ہیں۔ اگر آپ پوچھیں کہ آخر یہ بگاڑ کیوں ہے؟ یہ جرائم کا سیلاب کیوں ہے تو نہایت دیدہ دلیری کے ساتھ جواب ملے گا کہ جی! ہم بگاڑ نہیں بلکہ بناؤ اور تعمیر کا کام کر رہے ہیں۔ دنیا میں امن قائم کرنے کے لیے ہمارے پروگرام اور ہمارے اصول و نظریات نہایت ضروری ہیں۔ بگاڑ پسند تو دوسرے ہیں ہم تو امن و آشتی کے علمبردار ہیں، مگر عقلمند اور دانائے راز جس کی نگاہیں انسان کی کھوپڑی کے اندر جھانکتی ہیں خوب اچھی طرح دیکھتا ہے کہ یہ صرف استکبار اور ہم چوں ما دیگرے نیست کا کرشمہ ہے اور یہ نادان جو اپنے علاوہ تمام عالم کو احمق اور بیوقوف سمجھتے ہیں بڑی چابک دستی سے امن و انسانیت کی راہ کی طرف دعوت دینے والوں کو جواب

دیتے ہیں کہ ہمارا راستہ وہی ہے جو امن و انسانیت کی راہ ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ آمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝
بعض ایسے لوگ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ اللہ اور آخرت کے دن پر ہمارا ایمان ہے حالانکہ ان میں ایمان نہیں ہوتا۔

یہ ہوشیار سیدھے سادے انسانوں کو دھوکے میں مبتلا رکھتے ہیں لیکن درحقیقت خود دھوکے میں رہتے ہیں اور یہ دھوکہ بھی خود ان کے اوپر ظاہر ہو جائے مگر مصیبت تو یہ ہے کہ یہاں استکبار کے نتیجے میں عقل و شعور مقفل ہوتے ہیں۔

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝ (البقرہ)
وہ اللہ اور مسلمانوں کو دھوکے میں ڈالتے ہیں حالانکہ خود دھوکہ کھا رہے ہوتے ہیں مگر انہیں احساس نہیں ہو پاتا۔

قرآن پاک تبصرہ کرتا ہے کہ یہ ساری باتیں صرف اس وجہ سے ہیں کہ ان کے دلوں میں ایک بیماری ہوتی ہے اور وہ بیماری طغیان و سرکشی کی بیماری ہوا کرتی ہے جو ہر وقت مفاد پرستی کی راہ سجھاتی رہتی ہے۔

فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ (البقرہ)
ان کے دلوں میں ایک بیماری ہے

اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝ (البقرہ)
اللہ ان کا مذاق اڑاتا ہے اور انہیں ڈھیل دیتا ہے کہ اپنی سرکشی میں سرگرداں رہیں

کبر و نخوت اور غرور کے یہ بندے جب حالات ان کے بالکل مخالف پڑ جاتے ہیں اور ان کے مقابلے میں ایک ایسا اصولی نظام العمل آ دھمکتا ہے جو ذرہ برابر لچک گوارا نہیں کرتا ہے تو ان کے دلوں میں سختی اور قساوت اور زیادہ آ جاتی ہے جو بالآخر ان کی تباہی اور انحطاط کا باعث بنتی ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ ۝
ہم نے تم سے پہلے اور قوموں کی طرف بھی پیغام بھیجا تھا پھر ہم نے انہیں تنگیاں اور مصیبتیں دیکھنے کو دیں کہ عاجزی کریں

فَلَوْلَآ إِذْ جَآءَهُمْ بَأْسُنَا تَضَرَّعُوْا — ڈالی ہوئی سختی ہی وہ گڑگڑا رہے ہوتے تو کیوں

وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ — نہ گڑگڑائے۔ اس کے برعکس ان کے دلوں

لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ — میں سختی آگئی۔ شیطان نے ان کی کارگزاریوں

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا — کو سراہا پس جب وہ یاددہانی کو فراموش

عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتّٰٓى — کر بیٹھے تو ہم نے ان کے اوپر ہر شے کے دروازے

اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا — کھول دیے حتیٰ کہ جب وہ ملی ہوئی چیزوں پر

اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ — خوش ہونے لگے تو اچانک ہم نے انہیں گرفتار

مُّبْلِسُوْنَ ۝ (الانعام) — کرلیا پس وہ سخت مایوس ہوگئے۔

استکبار فی الارض کی شعبدہ بازیوں میں ایک موجودہ سیاست بھی ہے، وہی سیاست جس کے متعلق مصر کے مفتی محمد عبدہ نے کیا خوب کہا ہے۔ لعنۃ اللہ علی السیاسۃ وعلی کل ما اشتق منہا السائس والمسوس وغیرہ" سیاست اور سیاست کے جملہ مشتقات سیاستدان اور زیرِ سیاست عوام وغیرہ سب پر اللہ کی لعنت۔ لوگ کہتے ہیں کہ سیاست میں نہ پڑنا چاہیے۔ بالکل بجا کہتے ہیں۔ ان کے اس قول کا تجزیہ کیجیے تو آخر میں نتیجہ یہ نکلے گا کہ استکبار اور سرکشی کے میدان سے دور رہنا چاہیے۔ سیاست یا سیاست دان کا سب سے بڑا شعبدہ یہ ہے کہ وہ آرزوؤں، وعدہ اور تمناؤں کا نہایت حسین اور سبز باغ دکھا کر اس طرح دھوکہ دیتا ہے کہ بے چارے عوام سالہا سال تک ان کی ٹیسیں محسوس کرتے ہیں۔ یہ سیاسی پارٹیوں کی منشور بازی یہ چھوٹے اور بڑے سیاست دانوں کی خفیہ اور علانیہ وعدے اور امدادی قسطوں کی پیش کش اور اپنے جال میں پھانس لینے کے لیے بعض عملی اقدامات بھی۔ سب سیاست اور چال بازی کے تانے بانے ہوا کرتے ہیں اور عوام کالانعام بے چاروں کا یہ حال ہوتا ہے کہ

تاول کا پھندا اگر صیاد لگا دے — یہ شاخ نشیمن سے اترتا ہے بہت جلد

یہ بڑی آسانی کے ساتھ آزادی اور حریت کی شاخ سے اتر کر غلامی اور محکومیت کا طوق زیب گلو کر لیتے ہیں پھر تو صیاد اپنی انگلیوں کے اشارے سے نچاتا پھرتا ہے اور جب چاہے اسی کے ہر حکم اور منشا کے مطابق قول و عمل کو اپنے سارے تمنا تصور کرتے ہیں۔ یہ سیاسی لیڈروں

کے دماغ میں غرور اور استکبار کو اور زیادہ تقویت پہنچائی ہے۔ اب وہ اپنے حریف کو مات دینے کے لیے اپنے شاگردوں کو جیسے چاہتا ہے آلۂ کار بناتا ہے، کہیں وہ کسی کے کان کاٹ لیتے ہیں، کہیں حقائق کا چہرہ مسخ کر کے بدگمانیوں کا طوفان کھڑا کرتے ہیں، نورِ حق سے چمکتے ہوئے جوہر پر غلط فہمیوں کے توبرتو پردے بڑی آسانی سے ڈال دیتے ہیں اور اُن کے بعد دو عالم کو اپنی شاگردی کے حلقے میں رے لینے کے لیے کہیں جنگ کے شعلے بھڑکاتے ہیں، کہیں سرد اعصابی حملے ہوتے ہیں، کہیں ملکی اور بین الاقوامی عدالتوں کی بساطیں بچھتی ہیں اور پھر سیاست دانوں کے لبوں پر مسکراہٹوں کا ایک طوفان اٹھتا ہے۔

یہ ساری باتیں جو سیاست کے نام پر دنیا کے اندر رونما ہو رہی ہیں عین مطابق ہیں قرآن پاک کے تبصرے کے۔ چنانچہ حسبِ ذیل آیات قابلِ غور ہیں۔ دشمنِ انسانیت ابلیس کا پروگرام قرآن کے الفاظ میں یہ ہے:-

ولاضلنهم ولامنينهم	اور میں ضرور انہیں گمراہ کروں گا اور
ولامرنهم فليبتكن اذان	انہیں آرزوؤں میں ڈالوں گا اور انہیں حکم
الانعام ولامرنهم فليغيرن	دوں گا پس وہ جانوروں کے کان کاٹیں گے
خلق الله ومن يتخذ الشيطن	اور میں انہیں حکم دوں گا پس وہ اللہ کی خلقت کو
وليا من دون الله فقد خسر	تبدیل کر ڈالیں گے اور جو کوئی شیطان کو اپنا دوست
خسرانا مبينا يعدهم ويمنيهم	اللہ کو چھوڑ کر بنائے گا تو اسے کھلا ہوا گھاٹا اٹھانا
وما يعدهم الشيطان	پڑے گا وہ انہیں وعدوں اور آرزوؤں میں مبتلا رکھتا ہے اور یہ شیطانی دھوکہ اور فریب کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا
الا غرورا ٥	
قال فبما اغويتني لاقعدن	اس نے کہا چونکہ تو نے مجھے گمراہ کر دیا
لهم صراطك المستقيم ثُمَّ	ہے لہٰذا ان کے لیے میں تیری سیدھی راہ پر
لَاٰتِيَنَّهُمْ مِنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَ	بیٹھوں گا اور پھر ان کے آگے سے، پیچھے سے
مِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَ	دائیں سے اور بائیں سے ان کے پاس سے
عَنْ شَمَآئِلِهِمْ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ	آؤں گا اور تو ان میں اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا

غور فرمائیں، سیاست کی ساری گرم جوشیاں ٹھیک اسی شیطانی پلان کے تحت عمل میں آ رہی ہیں اور یہ شیطان کون ہے وہی تو ہے جس نے آدم یا آدمیت کے آگے سجدہ ریز ہونے سے انکار کرتے ہوئے اصل وجہ ظاہر کی کہ انا خیر منہ خلقتنی من نار وخلقتہ من طین۔ (میں اس سے بہتر ہوں۔ تونے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اُسے (آدم) مٹی سے۔ اور یہ "انا خیر منہ" ٹھیک ٹھیک تکبر کا مفہوم رکھتا ہے۔

قال فاھبط فیھا فما یکون — کہا جا نیچے یہاں سے۔ اس کے اندر
لک ان تتکبر فیھا فاخرج انک — تجھے تکبر کرنے کا حق نہیں ہے۔ پس نکل جا بے شک
من الصاغرین۔ — تو ذلیلوں میں سے ہے

اور یہ "انا خیر منہ" غور کیجیے تو باہمی کشاکش کی اس دنیا میں کیا تعلیم یافتہ کیا جاہل اور کیا عالم سبھی کے دماغوں میں موجود ہے۔ گاؤں، ضلع، صوبہ، ملک اور پوری دنیا اور معمولی اداروں سے لے کر بڑی بڑی اجتماعی ہیئتوں کے نظم ونسق کے سلسلے میں "انا خیر منہ" کے بنیادی فارمولے کے تحت، وعدوں، آرزوؤں اور آگے پیچھے، دائیں بائیں کے سارے سیاسی پروگراموں کی ساری مشینری ہمہ دم وہمہ آن رواں دواں ہے اور چونکہ اس داؤں پیچ اور اکھاڑ پچھاڑ میں ایک برائی ہزاروں برائیوں، ایک جھوٹ ہزاروں جھوٹ، ایک پروپیگنڈہ ہزاروں پروپیگنڈوں اور ایک بے گناہ قتل ہزاروں قتل کو جنم دیتا ہے۔ اس لیے "انا خیر منہ" کی اس کش مکش کے اندر کامیاب "انا خیر منہ" بھی ناکام ہو جاتا ہے۔ بات کسی طرح بنتی نہیں۔ گول دائرے میں چوکور چیز آخر فٹ کیوں کر ہو سکتی ہے لیکن "انا خیر منہ" کی خیریت اسی میں ہے کہ زندگی بھر وہ لوگوں کے سامنے اسے فٹ ہوتا ہوا دکھانے کی کوشش کرتا رہے چاہے اس کے لیے ہزاروں جھوٹ بلکہ جھوٹستان ہی آباد کیوں نہ کرنا پڑے

لاتجد اکثرھم شاکرین — تم ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پاؤ گے

دنیا کے اندر امن واطمینان اور ناجنگ فضا پیدا ہونے کی راہ اس کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے کہ حقوق وواجبات کو جوں کا توں تسلیم کر لیا جائے۔ کتمانِ حق ذرا بھی نہ کیا جائے۔ سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ بالکل نہ کہا جائے۔ تصدیق کے موقع پر تصدیق اور تکذیب کے موقع پر تکذیب لیکن استکبار اور "انا خیر منہ" کے لیے یہ بات موت کے مترادف ہے۔ لہٰذا وہ نہ صرف یہ کہ خود اس

برعکس اقدامات کرے گا بلکہ دس آدمیوں کے اندر بھی بات ایسی ہی کرنے کی کوشش کرے گا جس سے لوگوں کے گمان خراب ہوں اور حق کی طرف سے نگاہیں پھیر کر اس "انا ربکم الاعلیٰ" کی طرف مرکوز ہو جائیں۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ مَا عَلِمْتُ لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرِي فَأَوْقِدْ لِي يَا هَامَانُ عَلَى الطِّينِ فَاجْعَل لِّي صَرْحًا لَّعَلِّي أَطَّلِعُ إِلَىٰ إِلَٰهِ مُوسَىٰ وَإِنِّي لَأَظُنُّهُ مِنَ الْكَاذِبِينَ وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَجُنُودُهُ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ إِلَيْنَا لَا يُرْجَعُونَ

اور فرعون نے کہا۔ اے سردارو! اپنے علاوہ تو اور کوئی خدا مجھے معلوم نہیں۔ پس ہامان! میرے لیے مٹی دہکا اور ایک محل بنا کہ میں چڑھ کر موسیٰ کے خدا کو دیکھوں مجھے تو یقین ہے کہ وہ جھوٹ بولنے والوں میں سے ہے۔ اس فرعون نے اور اس کے لشکر نے زمین میں ناحق تکبر کیا۔ ان کا خیال تھا کہ ہمارے پاس انھیں واپس نہیں آنا ہے۔

فرعون کو جس نے اللہ تعالیٰ کی زمین کو فساد سے بھر دیا تھا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعوت حق دی تو اسے رد کرنے کے لیے دیکھیے کیا کیا پینترے بدلتا ہے۔

قَالَ أَلَمْ نُرَبِّكَ فِينَا وَلِيدًا وَلَبِثْتَ فِينَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِينَ وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِي فَعَلْتَ وَأَنتَ مِنَ الْكَافِرِينَ ○

اس نے کہا کیا ہم نے تیری پرورش بچپن میں نہیں کی ہے اور تو نے اپنی عمر کے چند سال ہمارے اندر گزارے ہیں اور وہ حرکت کا والی کی ہے جو کی ہے اور تم ناشکروں میں سے تھے۔

یعنی تمہاری بات خواہ حق و صداقت ہی پر مبنی کیوں نہ ہو اس لیے نہیں مانی جا سکتی کہ تمہاری گردن پر ہمارے زبردست احسانات ہیں، اس کے علاوہ تم ہمارے نزدیک مجرم کی پوزیشن میں بھی ہو حضرت موسیٰ نے فرعون کے انکار حق کی اس وجہ کی کاٹ کرتے ہوئے کہا۔

قَالَ فَعَلْتُهَا إِذًا وَأَنَا مِنَ الضَّالِّينَ فَفَرَرْتُ مِنكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِي رَبِّي حُكْمًا وَجَعَلَنِي

کہا۔ ہاں میں نے یہ کام کیا تھا جبکہ میں غلطی پر تھا۔ چنانچہ جب مجھے تم سے خطرہ محسوس ہوا تو تم سے فرار اختیار کیا۔ پھر میرے

مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ وَتِلْكَ نِعْمَةٌ	پروردگار نے مجھے حکم بخشا اور مجھے پیغام بر
تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ	بنایا اور یہ احسان ہے تمہارا جسے تم مجھ پر
بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ (الشعراء)	جتاتے ہو جبکہ تمام بنو اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے

فرعون کے تکبر نے ایک دوسرا انداز یہ اختیار کیا۔

قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ	فرعون نے کہا رب العلمین کیا چیز ہے

موسےٰ علیہ السلام نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	کہا (رب العلمین) آسمانوں اور زمین
وَمَا بَيْنَهُمَا اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ۝	اور مابین کا پروردگار ہے اگر تم یقین کرو

فرعون نے پہلو بدلتے ہوئے کہا:۔

قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗٓ اَلَا	اس نے اپنے گرد و پیش کے لوگوں سے
تَسْتَمِعُوْنَ	کہا۔ ارے سن رہے ہو؟

قبل اس کے کہ فرعون آگے اور کچھ کہے حضرت موسیٰ نے بات اور صاف انداز میں کہہ دی۔

قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ	کہا تمہارا اور تمہارے اگلے آباء کا
اٰبَاۗىِٕكُمُ الْاَوَّلِيْنَ	پروردگار ہے۔

فرعون کے پیروں سے زمین سرکتی ہوئی نظر آئی۔ چنانچہ بے دلیل لوگوں کا انداز اختیار کرتے ہوئے کہا:۔

اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ	بے شک تمہارا رسول جو تمہارے پاس
اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ۝	بھیجا گیا ہے دیوانہ ہے

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بے خوف و بے محابا پھر بات کہی۔

قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ	کہا مشرق و مغرب اور مابین کا پروردگار
وَمَا بَيْنَهُمَا اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝	ہے۔ اگر فہم و ادراک میں لا سکو

اب یہ فرعون جابر و متکبر انسان کا آخری حربہ ہے۔

قَالَ لَىِٕنِ اتَّخَذْتَ اِلٰــهًا غَيْرِيْ	کہا اگر میرے علاوہ کسی اور کو خدا جانو گے

لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ۝ تو میں تمہیں قیدیوں میں کردوں گا۔

کسی حق یا حقیقت کے انکار کی صورت میں ذرا چشم تصور میں لائیے سماج کے اندر پیدا ہو جانے والی افراتفری اور بے چینیوں کو۔ قرآن پاک نے فرعون اور یہود کی شرارتوں اور بدمعاشیوں کی ایک لمبی چوڑی فہرست پیش کی ہے چنانچہ نوزائیدہ بچوں کا قتل، عوام کی محکومیت اور ذلت آمیز غلامی، حق پرستوں کے جسموں کا مثلہ کر دینا، رشوت خوری، اشترا آیات، قتل انبیاء، قتل صالحین، کمزوروں پر قانون کا ڈنڈا، شہ زوروں سے درگزر، اپنے لوگوں کو جلا وطن کر دینا، حلال کو حرام حرام کو حلال، بے وفائی، کتمانِ حق، تلبیس حق، لوگوں کو نیکی کا وعظ اور خود فراموشی، گئوسالہ پرستی لہو و لعب اور شر و فساد کا بازار گرم کرنا، سبت کی خلاف ورزی، حجت و تکرار بے جا، قساوت قلبی، تحریف، خوں ریزی، بدسلوکی، خواہشاتِ نفسانی کی برملا پیروی، عداوت، میاں بیوی کے مابین تفریق پیدا کر دینے والے علم کا حصول، حسد، اپنی محبوبیت اور نجات اخروی کا دعویٰ، جنت کو اپنی جاگیر تصور کر بیٹھنا، اکل حرام، اللہ تعالیٰ کو باپ تصور کر لینا وغیرہ۔

یہ ساری کی ساری باتیں غور کیجیے۔ استکبار" اناخیر منہ اور انا ربکم الاعلیٰ کی خبیث ذہنیت کے سوا اور کسی چیز کی پیداوار ہے۔ بعینہ یہی تصویر ہمارے پیش نظر اس وقت بھی ہے۔ افراد سے لے کر جماعتوں تک اور عوام سے لے کر حکومتوں تک کی رگوں میں بالکل یہی خبیث اور فاسد خون گردش کر رہا ہے۔ جہلاء سے لے کر علماء تک سب اسی ایک راہ کے راہی ہیں کہیں اقتصادی برتری پر فخر کیا جا رہا ہے، کہیں فوجی ساز و سامان پر ناک اونچی کی جا رہی ہے، کہیں کثرت تعداد و سرمایہ ناز ہے اور کہیں علمی تفوق کا راگ الاپا جا رہا ہے۔

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۝ حَتّٰى تمہیں کثرت پر فخر نے غافل کر دیا،

زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝ حتی کہ قبروں تک جا پہنچے ہو

زندگی سے موت تک کا سفر اسی تفاخر میں طے ہو جاتا ہے۔ مسائل پہ مسائل امڈتے ہیں۔ ہر شخص اپنی جگہ بے چین رہتا ہے۔ مصائب کا فلسفہ سوچنے لگتا ہے، نہ روح کو سکون، نہ عقیدے کو عافیت اور نہ بندگی میں کوئی لطف اور مزہ۔ غور فرما کر دیکھیں تو یہ سارا تفاخر اسی استکبار کے بطن ناپاک سے جنم لیتا ہے۔

یہ استکبار اور علو پسندی نہ صرف یہ کہ خارجی حقائق کو قبول کرنے سے منکر ہوتا ہے اور اپنی نفسا
خواہشات کی راہ ہی کو حق تصور کرتا ہے بلکہ اس کے نزدیک اپنی غلطیاں اور ضلالت انگیز کر و فریب
کی باتیں بھی حق اور حقیقت کے شیشے میں ڈھلی ہوئی نظر آتی ہیں۔

بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا	بلکہ کافروں کے لیے ان کی چال آراستہ
مَكْرُهُمْ وَصُدُّوا عَنِ السَّبِيلِ	کر دی گئی ہے اور وہ اصل راستے سے ہٹے
(الرعد)	گئے ہیں۔

ابلیس آدمیت کے دشمن ازلی کی سب سے کامیاب چال یہی ہوتی ہے کہ سب سے پہلے وہ
غلطیوں خطا کاریوں اور معائب کو کمالات اور ہنر مندیوں کی شکل میں پیش کرتا ہے اور راہِ حق پر
پردہ ڈال دیتا ہے اور پھر انسان کو نخچۂ کا ہجو کر چھوڑ دیتا ہے کہ اب وہ فرعونیت کے سارے داؤں پیچ
چل سکتا ہے۔ اس حقیقت کو ابلیس کے تصور سے ہٹ کر یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ انسان اپنی کوتاہ بینی
در محدود علمی کی بنا پر اپنی غلطیوں کے اعتراف کو اپنا انحطاط تصور کرتا ہے۔ چونکہ اس کی نظر ظاہر بیں
ور عاجلہ پسند ہے اس لیے اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کا اعتراف اس کے مقام کو مختلف پہلوؤں سے
گرا دے گا اور مجموعۂ انسانی میں غیر معروف یا ناقابل اعتنا بن کر رہ جائے گا۔ اس تصور کے آتے ہی
س میں اپنی غلطیوں کی تاویل کر کے انہیں ہنر مندی ثابت کر لینے کا داعیہ ابھرتا ہے اور پھر یہیں سے استکبا
کا بیج پڑتا ہے جو خارجی مدافعتوں سے پرورش پا کر ایک تناور درخت بن کر اپنے کڑوے کسیلے پھلوں
سے نوازنے لگتا ہے۔

وَعَادًا وَثَمُودَ وَقَدْ تَبَيَّنَ	عاد و ثمود جن کے مسکن تمہارے لیے
لَكُمْ مِنْ مَسَاكِنِهِمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ	ظاہر ہیں اور جن کے لیے شیطان نے ان کے
الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ	اعمال آراستہ کر دیے تھے اور ان کو راہ سے
السَّبِيلِ وَكَانُوا مُسْتَبْصِرِينَ	روک دیا تھا حالانکہ یہ سوجھ بوجھ کے تھے اور
وَقَارُونَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَ	قارون فرعون اور ہامان جن کے پاس بھی روشن
لَقَدْ جَاءَهُمْ مُوسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ	دلائل لے کر آئے تھے لیکن ان سبھوں نے زمین
فَاسْتَكْبَرُوا فِي الْأَرْضِ وَمَا كَانُوا سَابِقِينَ	میں استکبار کیا اور وہ ہم سے جیتنے والے نہ تھے

ایک غلطی کا اعتراف نہ کرنے یا کسی حق کا انکار کر دینے کی صورت میں اپنی پوزیشن کو بچانے کے لیے کبر و نخوت کا یہ بندہ اب پوری طرح حرکت میں آجاتا ہے اور اپنی حمایت کے لیے ہر طرح کے ہتھکنڈے استعمال میں لاتا ہے۔ اپنی حمایت کے لیے وہ ہزاروں جھوٹ بولتا ہے، ہزاروں جھوٹے وعدے کرتا ہے۔ دوسروں کو فائدہ پہنچا کر اپنی راہ کبریائی کو صاف کرنے کے لیے ان سے کام لیتا ہے۔ اور وہ اس طرح کہ بھئی تم یہ کام کر ڈالو۔ پاداش عمل کے ذمہ دار ہم ہیں تم پر اس کی ذرہ برابر آنچ نہ آنے پائے گی۔ آگے جو کچھ بھی آئے گا اسے سنبھال ہم لیں گے۔ ڈرنے اور گھبرانے کی مطلق ضرورت نہیں ہے۔ سیدھے سادے لوگ شیطان کے ان فرزندوں کے جال میں آجاتے ہیں۔ حالانکہ پاداش عمل کی لی جانے والی ذمہ داری کا وعدہ بالکل جھوٹا سراسر فریب اور پر از افترا ہوتا ہے پاداش عمل سے صاحب عمل تو بچ ہی نہیں سکتا۔ ہاں اس پاداش کا اتنا ہی بوجھ اس شیطان کے سر پر بھی آپڑتا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ	اور کافروں نے مسلمانوں سے کہا کہ ہماری
اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا وَلْنَحْمِلْ	راہ کے پیرو بن جاؤ۔ ہم تمہاری غلطیوں کو اٹھا لیں
خَطٰيٰكُمْ وَمَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ	گے۔ یہ لوگ ان کی غلطیوں میں سے کچھ بھی
خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ	نہیں اٹھانے والے ہیں۔ یہ بالکل جھوٹے ہیں
وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ	اور اپنے بوجھ ضرور اٹھائیں گے اور قیامت
اَثْقَالِهِمْ وَلَيُسْئَلُنَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ	کے دن ان کی اس افترا پردازی سے متعلق
عَمَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ	باز پرس ضرور ہوگی۔

یوم آخرت کے موقع پر تو معاملہ بالکل واضح ہوگا ہی خود اس دنیا میں بھی پاداش عمل کی گھڑی جب آجاتی ہے اور بچنے بچانے کی ساری راہیں روپوش نظر آتی ہیں تو نہایت بے نیازی کے ساتھ ہمارا یہ شیطان ہم سے برأت اختیار کر لیتا ہے۔ ہم لاکھ اسے یاد دلائیں کہ اس نے وعدہ ہماری غلطیوں میں ساتھ دینے کا کیا تھا لیکن وہ اس طرح برأت کر کے نکل جاتا ہے جیسے کبھی کی کوئی ملاقات ہی نہ رہی ہو یا پھر علی سبیل التنزل جواب دے دیتا ہے کہ بھائی میرا کیا قصور ہے؟ میں نے ایک درخواست تم سے کی تھی تم نے اسے منظور کر لیا اب اس بات کا خمیازہ تمہارے سامنے آیا تو میں کیا کروں تم

منظور ہی کب ہے کو کیا تھا؟

وبرزوا للہ جمیعا فقال الضعفؤا للذین استکبروا انا کنا لکم تبعا فھل انتم مغنون عنا من عذاب اللہ من شیءٍ قالوا لو ھدٰنا اللہ لھدینٰکم سواءٌ علینا اجزعنا ام صبرنا ما لنا من محیصٍ وقال الشیطٰن لما قضی الامر ان اللہ وعدکم وعد الحق ووعدتکم فاخلفتکم وما کان لی علیکم من سلطٰنٍ الا ان دعوتکم فاستجبتم لی فلا تلوموني ولوموا انفسکم ما انا بمصرخکم وما انتم بمصرخی انی کفرت بما اشرکتمون من قبل ان الظلمین لھم عذابٌ الیمٌ ۝

اور اللہ کے سامنے وہ سب کے سب آئیں گے پس کمزور کہیں گے ان لوگوں سے جو بڑے بنے ہم تمہارے پیرو تھے تو کیا آج اللہ کے عذاب کے مقابلے میں تم ہمارے کچھ بھی کام آسکتے ہو، وہ کہیں گے اگر اللہ نے راہ حق ہمیں دکھائی ہوتی تو ہم بھی تمہیں دکھاتے۔ چاہے ہم صبر کریں یا بے چین ہوں برابر ہے ہمارے لیے راہ نجات کوئی نہیں اور شیطان کہے گا۔ بے شک اللہ نے تم سے برحق وعدہ کیا تھا۔ میں نے بھی وعدہ کیا تھا لیکن میں نے اس کے خلاف کیا۔ میرا تو تم پر کوئی بس تھا نہیں سوائے اس کے کہ میں نے تمہیں دعوت دی اور تم نے اسے میری خاطر قبول کر لیا پس مجھے ملامت نہ کرو بلکہ خود اپنے آپ کو ملامت کرو میں تمہیں بچا نہیں سکتا اور نہ تم ہی مجھے بچا سکتے ہو۔ میں اس شرک سے بالکل منکر ہوں جو اس سے پیشتر تم نے کیا ہے بے شک ظالمین کے لیے دردناک عذاب ہے

تمرد و سرکشی کے ان شیاطین فی الارض کو جب اپنے شاگردوں کی ایک معتد بہ جماعت فراہم ہو جاتی ہے تو وہ باہم سازشیں کر کے اور ایک دوسرے کو دھوکہ و فریب میں مبتلا کر کے انسانی سوسائٹی کے اندر ایسے ایسے گل کھلاتے رہتے ہیں جن کے دیکھنے والوں کا بظاہر کوئی اتہ پتہ نہیں ہوتا لیکن سوسائٹی کے اندر دوڑ دھوپ کرنے کے تصرف و تقلب اور ان کے چہروں پر ایک آن جانے اندیشہ اور خوف کے آثار سے انہیں بخوبی پہچانا جا سکتا ہے

اَفَاَمِنَ الَّذِیْنَ مَکَرُوا	آیا وہ لوگ جو بری چالیں کیا کرتے ہیں
السَّیِّئَاتِ اَنْ یَّخْسِفَ اللّٰہُ بِھِمُ	محفوظ ہیں اس بات سے کہ اللہ انھیں زمین میں
الْاَرْضَ اَوْ یَاْتِیَھُمُ الْعَذَابُ	دھنسا دے یا عذاب اُن پر ایسے مقام سے
مِنْ حَیْثُ لَا یَشْعُرُوْنَ اَوْ یَاْخُذَھُمْ	آ دھمکے جہاں انہیں سان و گمان تک نہ ہو یا
عَلٰی تَخَوُّفٍ فَاِنَّ رَبَّکُمْ لَرَءُوْفٌ	انہیں اندیشے کی حالت میں گرفتار کرے پس
رَّحِیْمٌ اَوَلَمْ یَرَوْا اِلٰی مَا خَلَقَ	بے شک تیرا پروردگار بڑا مہربان اور رحم
اللّٰہُ مِنْ شَیْءٍ یَّتَفَیَّؤُا ظِلٰلُہٗ عَنِ	کرنے والا ہے۔ کیا وہ دیکھتے نہیں کہ جو چیز بھی اللہ
الْیَمِیْنِ وَالشَّمَائِلِ سُجَّدًا لِّلّٰہِ	نے پیدا کی ہے اس کے سایے دائیں اور بائیں
وَھُمْ دَاخِرُوْنَ وَلِلّٰہِ یَسْجُدُ مَا	سے اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہوئے جھکتے
فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ	ہیں۔ آسمانوں اور زمین میں جو جانور بھی ہے اور
مِنْ دَابَّۃٍ وَّالْمَلٰئِکَۃُ وَھُمْ لَا	فرشتے اللہ کا سجدہ کرتے ہیں اور بڑے نہیں
یَسْتَکْبِرُوْنَ یَخَافُوْنَ رَبَّھُمْ مِّنْ	بنتے۔ وہ اپنے پروردگار سے اپنے اوپر ڈرتے
فَوْقِھِمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ (النحل)	ہیں اور جو حکم انہیں دیا جاتا ہے اسے بجا لاتے ہیں

ان سازشوں اور زمین کے اندر بدمعاشانہ چالوں کی کوکھ سے جنم لینے والی مختلف اقتصادی، اجتماعی اور روحانی واعصابی تشویشات کا اندازہ آپ بخوبی لگا سکتے ہیں۔ غزوہ بنی المصطلق کے موقعہ پر اسلامی معاشرہ کچھ ان ہی قسم کی تشویشات سے دوچار ہو گیا تھا چنانچہ ان تشویشات کے پس پردہ کی جانے والی سازشوں اور اتہامات کا پردہ زبان وحی کو چاک کرنا پڑا ورنہ یہ سازشیں کچھ اس نوعیت کی تھیں کہ ان کی بدولت اسلامی سوسائٹی کا ٹھوس اور مستحکم قلعہ اپنی جگہ سے سرکتا ہوا نظر آنے لگا تھا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ جَآءُوْا بِالْاِفْکِ	جن لوگوں نے بہتان تراشا ہے وہ تم ہی
عُصْبَۃٌ مِّنْکُمْ لَا تَحْسَبُوْہُ شَرًّا	میں سے ایک جماعت ہے اس بہتان کو اپنے
لَّکُمْ بَلْ ھُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ لِکُلِّ	لیے برا نہ تصور کرو بلکہ یہ تمہارے حق میں خیر کا
امْرِیٍٔ مِّنْھُمْ مَّا اکْتَسَبَ مِنَ	حکم رکھتا ہے۔ ان میں سے ہر شخص کے لیے گناہ کا

اِلْاِثْمِ وَالَّذِیْ تَوَلّٰی كِبْرَهٗ	اتنا حصہ ہے جتنا اس نے ارتکاب کیا ہے
مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۝	اور جس نے اس کا بڑا حصہ اپنے سر لیا اس کے
لَوْلَاۤ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ	لیے بڑا عذاب ہے جس وقت اس بہتان کو
وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَیْرًا ۙ	تم نے سنا آخر مسلمان مرد اور عورتوں نے
وَّ قَالُوْا هٰذَاۤ اِفْكٌ مُّبِیْنٌ	اپنے بارے میں نیک گمان کیوں کیا اور کیوں نہ
(النور)	کہا کہ یہ کھلا ہوا بہتان ہے۔

سرکشی و تمرد، بے خوف و بے محابا سماجی اور شخصی حقوق کی پامالی، حقیقت پسندی سے بُعد، نسل کشی، سازشوں کے طوفان اور استکبار فی الارض کی بے پناہ تشویشوں سے حضرت نوح علیہ السلام کا قومی معاشرہ کچھ ایسا بھر چکا تھا کہ دن رات دل سوزی اور اخلاص و محبت کے ساتھ سمجھانے بجھانے کے باوجود جب اس نے ان کی دعوت کو یکسر رد کر دیا تو حضرت نوح نے کہا :۔

رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ	پروردگار! میں نے اپنی قوم کو رات
لَیْلًا وَّ نَهَارًا ۙ فَلَمْ یَزِدْهُمْ	دن پکارا لیکن میری پکار انھیں اور زیادہ
دُعَآءِیْۤ اِلَّا فِرَارًا ۝ وَاِنِّیْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ	فرار اختیار کرنے پر مجبور کرتی رہی اور میں
لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْۤا اَصَابِعَهُمْ	نے جب بھی انہیں پکارا کہ تو انہیں بخشے انھوں نے
فِیْۤ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِیَابَهُمْ	اپنے کانوں میں اپنی انگلیاں ڈال لیں اور
وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ۝	اپنے کپڑوں میں چھپ رہے اور وہ ضد کرتے
(نوح)	رہے اور بری طرح بڑے بنتے رہے۔

تو بالآخر انھیں بددعا کرنی پڑی۔

قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ اِنَّهُمْ	نوح نے کہا۔ پروردگار! انھوں نے
عَصَوْنِیْ وَاتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ یَزِدْهُ	میری نافرمانی کی اور پیروی اس کی کی جس کے
مَالُهٗ وَوَلَدُهٗۤ اِلَّا خَسَارًا ۝ وَمَكَرُوْا	مال اور اولاد اسے گھاٹے کے علاوہ اور کچھ
مَكْرًا كُبَّارًا ۝ وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا	نہیں دے سکتے۔ اور انھوں نے بڑی بڑی چالیں
سُوَاعًا ۙ وَّلَا یَغُوْثَ وَیَعُوْقَ وَنَسْرًا ۝	چلیں اور کہا اپنے معبودوں کو چھوڑنا نہیں

وَقَدْ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا ۚ وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا ضَلٰلًا ....
وَقَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ۝ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ۝

اور نہیں چھوڑنا ود کو سواع کو اور نہ یغوث کو اور نسر کو اور انھوں نے کافی گمراہ کیا اور تو ظالموں کو گمراہی میں بڑھاتا ہی جا۔ اور نوح نے کہا پروردگار! زمین پر کافروں میں سے کسی مکین کو نہ چھوڑنا۔ اگر تو انھیں چھوڑے گا تو تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور صرف فاجر اور بڑے ہی ناشکری اولاد پیدا کریں گے۔

آپ نے دیکھا کہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم استکبار فی الارض کے فرعونی نشے سے سرشار ہو کر اپنے گرد و پیش کے سماج کو فسق و فجور، مکر و فریب، کفر و ضلالت اور ظلم و عدوان کے کیسے کیسے تحفے دے رہی تھی اور بالآخر کس طرح انہی تحائف کے سیلِ عظیم میں انھیں غرق ہو کر نیست و نابود ہونا پڑا۔

مِمَّا خَطِيْٓئٰتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا فَلَمْ يَجِدُوْا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا ۝

ان کے کرموں کی بدولت انھیں غرق کر دیا گیا پس انہیں جہنم میں داخل کر دیا گیا۔ پس انھوں نے اللہ کے مقابلہ میں مددگار نہیں پائے۔

ٹھنڈے دل و دماغ سے غور فرمائیے کیا بعینہٖ یہی نقشہ اس وقت عالمِ انسانی میں نظر نہیں آ رہا ہے؟ یہ اپنے حریفوں کو سیاسی اور معاشی میدانوں میں مات دینے کے لیے ان پر رشوت خوری، جلبِ منفعت اور ناجائز جنسی تعلقات کے سنگین اتہامات اور ان کی حیثیتِ عرفی کو زائل کر دینے کے بے سر و پا الزامات کا طوفان، یہ دیدہ و دانستہ سرحدی حقائق سے گریز در گریز، ناجائز قبضے اور توسیع پسندانہ معرکہ آرائیاں، یہ کسی قوم کی آزادی و خود مختاری کو اپنے دامِ تزویر میں محبوس رکھنے کے لیے سب و شتم اور ضرب و حرب کے مختلف وسائل، زہریلے پروپیگنڈوں کے بالکل جھوٹے اور باطل ہتھیاروں کا بے دھڑک استعمال اور یہ نازک موقعوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے غلوں اور سامانوں کا احتکار، بلیک مارکٹنگ، اسمگلنگ، کیا یہی استکبار فی الارض کے مہیب سائے نہیں ہیں جو عالمِ انسانی کو لپیٹ میں لیے ہوئے ہیں۔

اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى مَا كُنْتُمْ بِهٖ

چلو اس کی طرف جسے تم جھٹلاتے رہے ہو

تُكَذِّبُوْنَ ۝ اِنْطَلِقُوْۤا اِلٰى ظِلٍّ
چلو تین طرف پھوٹنے والے سایہ کی طرف جو نہ

ذِىْ ثَلٰثِ شُعَبٍ ۝ لَّا ظَلِيْلٍ وَّ لَا
سایہ ہے اور نہ ہی لپٹ سے بچت' وہ محل

يُغْنِىْ مِنَ اللَّهَبِ ۝ اِنَّهَا تَرْمِىْ بِشَرَرٍ
کی مانند چنگاری پھینک رہا ہے جیسے زرد زرد

كَالْقَصْرِ ۝ كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ ۝
اونٹ..................

...... كُلُوْا وَتَمَتَّعُوْا قَلِيْلًا اِنَّكُمْ
کھا لو اور نفع اٹھا لو تھوڑا، بے شک تم مجرم ہو

مُّجْرِمُوْنَ ۝ .... وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ
.... اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ رکوع

ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ ۝
کرو تو رکوع نہیں کرتے۔

اور اس سے قبل کی آیات میں

اَلَمْ نُهْلِكِ الْاَوَّلِيْنَ ۝ ثُمَّ
کیا ہم نے پہلوں کو ہلاک نہیں کیا پھر ان

نُتْبِعُهُمُ الْاٰخِرِيْنَ ۝ كَذٰلِكَ نَفْعَلُ
کے بعد دوسروں کو لے آئے، ہم ایسا ہی مجرموں

بِالْمُجْرِمِيْنَ ۝ (المرسلات)
کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔

خدا بیزاری' آخرت فراموشی اور اتلاف حقوق بندگان الٰہی' جرم و استکبار فی الارض کے یہی وہ بھیانک سایے ہیں جو مجبور و بے کس انسانیت کو ہر سمت سے اپنی لپٹ اور لپیٹ میں لیے ہوئے ہیں۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ
اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ

الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ
سے ڈر تو غرور اس کو گناہ پر آمادہ کرتا ہے۔

جَهَنَّمُ ؕ
پس اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔

ابلیس کا سجدۂ آدم سے انکار' قوم نوح کا نوح علیہ السلام کی دعوت عبودیت الٰہی سے اعراض اور اپنی مفسدانہ روش پر اصرار' فرعون کا موسیٰ علیہ السلام کی دعوت حق پرستی کو رد کر دینا اور بنی اسرائیل کو غلامی کی بیڑیوں سے آزاد کر کے ان کے پیدائشی اور فطری حق خود ارادیت کو ماننے سے انکار' بنی اسرائیل کا حق اور خدا پرستی کی ہر بات اور حقیقتاً دراصلیت پسندی کو نہ صرف یہ کہ رد کر دینا جھٹلانا بلکہ اسے ہزل بول دینا' قرآن کے بیان کردہ اسی قسم کے بیان کردہ دیگر تاریخی واقعات کی تہ میں اتر کر دیکھیے تو اسی استکبار فی الارض کی مجرمانہ و باغیانہ جسارت کے کرشمے نظر آئیں گے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا
ان لوگوں نے کہا جنہیں امید آخرت

لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ
نَرٰى رَبَّنَا لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِیْٓ
اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْا عُتُوًّا كَبِيْرًا (الفرقان)

نہیں ہے کہ کیوں ہم پر فرشتے نہیں اتارے
جاتے یا ہم پروردگار کو نہیں دیکھتے۔ انھوں
نے اپنے تئیں تکبر کیا اور بڑی ہی سرکشی کی۔

حضرت ابراہیم کو نمرود کا آتش میں ڈال دینا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ماننے والوں کو فرعون کا مثلہ بنا دینا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہود کا طمانچہ مارنا اور بالآخر سولی پر چڑھا دینا، آنحضور اور بے کس مسلمانوں کو مشرکین مکہ کا ستانا، قوم ثمود اور دوسری قوم بائدہ کا اپنے پیغمبروں سے معجزات کا طلب کرنا اور ان سے کہنا کہ خود ہمیں اللہ نے اپنا فرستادہ کیوں نہیں بنایا اور یہ انسان کا نیکی کی ہر بات سے دور رہنا، رکوع و سجود اور انکسار و پرہیزگاری اور طہارت و نیکوکاری سے محترز رہنا اور یہ کہنا کہ روزہ نماز اور صلاح و تقوے ان لوگوں کا حصہ ہیں جن کے ہاتھوں سے دنیا نکل چکی ہے۔ معیار زندگی کو اونچے سے اونچا کر دینا، اخراجات بے جا، اسراف اور فضول خرچی۔ آخرت فراموشی ـــــ کے یہ سارے کے سارے مظاہرے جھانک کر دیکھیے تو یہاں بھی وہی استکبار موجود نظر آئے گا۔

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً
لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ
اَشْرَكُوْا وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ
مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا
اِنَّا نَصٰرٰى ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ
قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ (المائدہ)

تم لوگوں میں مسلمانوں سے سب سے شدید
دشمنی رکھنے والے یہود کو اور مشرکین کو پاؤ گے
اور تم سب سے زیادہ مسلمانوں سے محبت
رکھنے والے عیسائیوں کو پاؤ گے۔ اس کی وجہ
یہ ہے کہ ان میں علماء اور راہب ہیں اور اس
لیے کہ وہ بڑے نہیں بنتے ہیں۔

بندگان خدا سے نفرت، ان کے عرصۂ حیات کو ان پر تنگ کر دینے کی سعی و کوشش، دلوں میں ان سے بغض و عداوت اور کدورت کا جذبہ، بخل اور انقباض، غرباء اور مساکین سے اعراض و غفلت، بے کسوں کے حقوق کو ہڑپ کر لینا، تنگ دستی، غربت اور مفلوک الحالی سے مجبور بے کس انسانوں کو اپنے شکنجۂ ظلم میں کس کر ان کی رگوں کا ایک ایک قطرۂ خون نچوڑنا، یہ ساری کی ساری باتیں استکبار کے عوارض، علامات اور نشانیاں ہیں۔

مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ ۝ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّينِ ۝

کون سی چیز تمہیں دوزخ میں لے آئی؟ کہیں گے ہم نہ نماز پڑھا کرتے تھے اور نہ مسکین کو کھانا کھلایا کرتے تھے، جو لوگ بیہودہ بکواس کرتے ان کے ساتھ ہم بھی بے ہودہ بکواس کیا کرتے تھے اور روز جزا کا انکار کرتے تھے۔

سورۂ ق میں ہے :-

أَلْقِيَا فِي جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيدٍ ۔ مَنَّاعٍ لِلْخَيْرِ مُعْتَدٍ مُرِيبٍ الَّذِي جَعَلَ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ فَأَلْقِيَاهُ فِي الْعَذَابِ الشَّدِيدِ

ڈال دو جہنم میں ہر ناشکرے سرکش بھلائی سے روکنے، حد سے بڑھنے، شک میں پڑنے والے کو جس نے اللہ کے ساتھ دوسرا معبود ٹھیرایا پس اس کو ڈال دو سخت عذاب میں۔

اور یہ دیکھیے :-

وَأَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنَىٰ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنَىٰ فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْعُسْرَىٰ ۝

اور جس نے بخیل کی، بے نیازی برتی اور اچھی بات کو جھٹلایا اس پر آسان کر دیں گے مشکل میں ڈالنے والی۔

سوسائٹی کا ہر فرد جب مشکلات کے ان ہیبتناکیوں کو دیکھتا ہے اور پھر اپنے لوگوں کے طور و طریق پر بھی نظر جاتی ہے تو سمجھتا ہے کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ جاہل سے لے کر تعلیم یافتہ تک سب کی زبانوں پہ یہ ہوتا ہے کہ ایسا بالکل نہیں ہونا چاہیے لیکن عملاً کوئی انسان ان باتوں سے مجتنب ہوتا ہے تو ہماری اس سوسائٹی میں اسے بے وقوف، احمق، ابلہ، مغفل اور سیاسی شعور نہیں رکھنے والا اور نہ جانے کن کن القاب و آداب سے نوازا جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ استکبار غیر شعوری طور پر ہر انسان کی جبلیت (Mentality) بن چکا ہے اور اخلاقی شعور (Moral sense) اس گراں بار ہیبت سے دبے ہوئے انسان کا فرم و لپیں یا پھر تکبر زدہ انسان کا ایک سیاسی ہتھکنڈہ بن کر رہ گیا ہے۔

لَقَدِ اسْتَكْبَرُوا فِي أَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْا عُتُوًّا كَبِيرًا ۔

یہ استکبار نفسیت کا مقام حاصل کر چکا ہے لہٰذا اس کے برعکس ہمدردی، مواسات، مخلصانہ طرز عمل

(باقی ــــ پر ملاحظہ ہو)

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کا مکتوب گرامی

زندگی کے گزشتہ شمارے (فروری ۶۶ء) میں ایک مضمون "کتاب اللہ کے اہم تراجم کی تاریخ" شائع ہوا تھا۔ مولانا نے اسی مضمون کے سلسلے میں بقیہ صفحہ زندگی بعض غلطیوں کی تصحیح اور مزید معلومات ارسال فرمائی ہیں۔ یہ مکتوب ہمیں اس وقت ملا جب زندگی کے بیشتر صفحات لکھے جا چکے تھے۔ ہم شکریہ کے ساتھ اسے یہاں نقل کر رہے ہیں۔ (ادارہ)

تازہ زندگی میں "کتاب اللہ کے اہم تراجم کی تاریخ" کے عنوان سے ایک مضمون الاعتصام سے منقول نظر سے گزرا۔ انگریزی، فارسی اور اردو ترجموں کی حد تک چند مختصر باتیں اگر مناسب سمجھیے تو اپنے ناظرین تک پہنچا دیجیے۔

۱۔ ص۲۲ قریب ختم صفحہ مقدمہ نویس کا صحیح نام سر ڈینیسن راس (SIR DENISON ROSS) ہے۔

۳۔ ص۲۳ شروع۔ ترجمہ پامر کا صرف پہلا اڈیشن دو جلدوں میں نکلا تھا ۱۸۸۰ء ترجمہ مذکور کا جو چھوٹا یک جلدی اڈیشن ۱۹۲۸ء میں پہلی بار نکلا وہ دوبارہ ۱۹۳۳ء میں بھی شائع ہوا۔ اس پر مقدمہ ڈاکٹر نکلسن کے قلم سے ہے۔

۴۔ ص۲۳ ڈاکٹر عبدالحکیم (ایم بی) پٹیالوی ثم رامپوری کا ترجمہ اس وقت کا کیا ہوا ہے جب وہ احمدی یا قادیانی تھے۔

۵۔ ص۲۵ مرزا ابوالفضل (شیعی) کے ترجمے کے لیے یہ کہنا کہ وہ مقبول ہوا یہاں تک کہ متعصب لوگوں نے بھی تعریف کی: "تاریخ کی حد سے نکل کر "تبصرہ" کی حد میں داخل ہو جاتا ہے۔ ص۲۵ مرزا حیرت کا ترجمہ تین جلدوں میں نکلا تھا تفسیری حواشی کا وجود صرف جلد اول میں ہے۔ باقی جلدوں میں ان کا وجود مثل عدم کے ہو گیا ہے۔ میرے پاس جو نسخہ ہے اس پر سن طبع درج نہیں۔

۷۔ ص۳۵ حافظ غلام سرور جن کا ترجمہ نظم میں ہے غالباً لاہوری احمدی تھے۔ گو میں جزم کے ساتھ نہیں کہہ سکتا۔

۸۔ انگریزوں کے کیے ہوئے متعدد اہم ترجموں کے نام چھوٹ گئے ہیں۔ مثلاً پکتھال، پل، آربری۔ پکتھال کا ترجمہ مقبولیت کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے۔ متعدد اڈیشن اب تک نکل چکے ہیں۔

۹۔ محمد علی (امیر جماعت احمدیہ لاہور) کا ترجمہ (۱۹۱۷ء) شہرت و مقبولیت میں کسی اور سے کم نہیں۔ اس کا اور احمدیہ قادیان کا ترجمہ، دونوں کے نام رہ گئے ہیں۔ ایک ترجمہ ایک شیعی انجمن لکھنؤ کی طرف سے ہو رہا تھا تکمیل کا علم نہیں۔

۱۰۔ ص۳۵ وسط۔ فارسی ترجمہ کی نسبت شیخ سعدیؒ کی طرف کرنا خلاف تحقیق ہے۔

۱۱۔ اردو ترجموں میں حضرت حکیم الامۃ تھانویؒ کے مشہور عالم ترجمہ کا نام چھوٹ جانا حیرت انگیز ہے اور اس سے کچھ ہی کم حیرت، شیخ الہند محمود حسن، عبدالحق حقانی دہلوی، ثناء اللہ امرتسری، فتح محمد تائب لکھنوی (صاحب خلاصۃ التفاسیر) امیر علی ملیح آبادی (صاحب مواہب الرحمٰن ۳۰ جلد) کے ناموں کے رہ جانے پر ہے۔

۱۲۔ سید احمد خاں کے ترجمہ تفسیر احمدی، محمد علی لاہوری کے ترجمہ تفسیر بیان القرآن اور شیعہ تراجم (جن میں دو خاص طور پر معروف ہیں ایک مولوی فرمان علی کا، دوسرا مولوی مقبول احمد کا) کے نام تو غالباً قصداً نظر انداز کر دیے گئے ہیں۔ حالانکہ مضمون کا عنوان محض "تاریخ" کا ہے۔

۱۳۔ مولوی حکیم سید انیس شاہ کے ترجمہ کے اعلیٰ مقام سے تو کیا، نام سے بھی پہلی بار واقفیت ہوئی۔

۱۴۔ ص۵ وسط۔ "عواجدانیہ" یہ لغت سمجھ میں نہ آیا۔

والسلام

عبدالماجد

نوٹ:۔ علالت کی وجہ سے الاعتصام والا مضمون میں نے دوبارہ پڑھے بغیر زندگی میں اشاعت کے لیے دے دیا تھا۔ اس مضمون میں انگریزی اور اردو تراجم کے ذکر میں خود محترم مکتوب نگار کے انگریزی اور اردو ترجموں کا ذکر نہ کرنا بھی حیرت انگیز ہے۔ (مدیر)

صدر ناصر کی تحریک اور تحریک اخوان المسلمین

(مغربی ذہن کا ایک تبصرہ)

۱۸ جنوری ۱۹۶۶ء کے اسٹیٹسمین میں اس اخبار کے مغربی ایشیا کے نمائندے جی ایچ جانسن نے صدر ناصر اور اخوان المسلمین پر ایک مفصل تبصرہ شائع کیا ہے۔ یہ تبصرہ مغربی ذہن کی پوری نمائندگی کرتا ہے۔ اسٹیٹسمین میں اس تبصرے پر جو عنوان لگایا گیا ہے وہ یہ ہے:-

مصری نوجوانوں کو ایک نظریے کی تلاش

تحریک اخوان جزوی طور پر ناصر کے نظریۂ عملیت (پریگمیٹزم) کا نتیجہ ہے۔

اس عنوان ہی سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ مغربی ایشیا کا یہ مغربی نمائندہ اخوان المسلمین کی تاریخ سے کس درجہ ناواقف ہے۔ بہرحال مغربی ذہن کے مطالعے کے لیے یہ تبصرہ ایک اچھا نمونہ ہے اور ہم اسی حیثیت سے ذیل میں اس کی تلخیص درج کر رہے ہیں۔

(ادارہ)

قاہرہ کی عدالت میں اخوان المسلمین کے ممبروں پر ایک تازہ مقدمہ اس الزام میں چل رہا ہے کہ انھوں نے صدر ناصر کو قتل کرنے اور ان کی حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کی ہے۔ اس مقدمے نے انکشاف کیا کہ وہ سیاسی و سماجی تشخص جسے لوگ "ناصر کے مصر" سے جانتے ہیں اس تحریک کی جانی بوجھی بیماری سے نقصان اٹھا رہا ہے۔ مصر میں سماجی سیاسی نظریات کا خلا ہے۔ یہ حقیقت اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ سازش کرنے والوں میں تعجب انگیز تعداد نوجوان اور تعلیم یافتہ لوگوں کی ہے۔ یہ وہ نوجوان ہیں جنہیں "ناصر کی پود" کہنا چاہیے۔ تیرہ سال پہلے ۱۹۵۲ء میں جب ناصر نے مصر کی باگ اپنے ہاتھ میں لی تو یہ نوجوان بالکل بچے یا بہت کم عمر ہوں گے لیکن چونکہ انسانی دماغ یا روح خلا کو ناپسند

کرتی ہے اس لیے ایک دوسرا نظریہ آگے بڑھا اور اس نے خلا کو بھر دیا۔ ان نوجوانوں کے معاملے میں یہ کام اخوان کے دقیانوسی عقائد نے کیا۔ یہاں اخوان کی آئیڈیالوجی کو جانچنا مقصود نہیں ہے بلکہ ان حالات پر گفتگو مقصود ہے جنھوں نے یہ خلا پیدا کیا۔ یہ پہلا موقع نہیں ہے کہ اخوان المسلمین نے یہ ثابت کیا ہو کہ مصر کے تعلیم یافتہ طبقے میں اس کے اثرات ہیں۔ ۱۹۵۴ء میں جب ان لوگوں نے پہلی بار صدر ناصر کو ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی تو اس وقت کی تحقیقات نے بھی یہ ثابت ثر ظاہر کیا تھا کہ مصر میں اس تحریک کی طرف میلان پایا جاتا ہے اور اس دفعہ تو اس کے برے اثرات پہلے سے زیادہ اعلیٰ سطح تک پہنچے ہوئے ہیں۔ اس دفعہ اس تحریک کے ماننے والوں اور پیروی کرنے والوں میں صرف دفاتر حکومت اور فوج کے افسران ہی شامل نہیں ہیں بلکہ اعلیٰ صنعت کے ماہرین، ایک پائلٹ اور ایک ایٹمی سائنس داں بھی داخل ہیں جنہیں "ناصری پود" کے بہترین پھول کہنا چاہیے۔ غالباً سب سے زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ انتہائی ذہین مصری بھی یہ سوچنے پر آمادہ نہیں ہیں کہ وہ حقیقی اور نفسیاتی اسباب کیا ہیں جنھوں نے اس طرح کے افراد کو اخوان جیسی تنظیم تک پہنچایا۔ بہت سے مصریوں بلکہ حکومت کے افراد تک کو اس سازش کی وسعت پر تعجب ہوا صرف ایک طبقہ ایسا ہے جسے کوئی تعجب نہیں ہوا۔ یہ لوگ حکومت کا بایاں بازو یعنی کمیونسٹ ہیں۔ یہ سرکاری مادہ پرست سب سے بہتر طور پر جانتے ہیں کہ انسان صرف روٹی سے زندہ نہیں رہتا۔

اسلام کی قوت

کمیونسٹوں کے علاوہ دوسرے مشاہدین اس سازش کی وجہ اس کے سوا اور کچھ بیان نہیں کر سکتے کہ اس تحریک کی مقبولیت کا سبب یہ ہے کہ مصر میں اسلام مضبوط اور قوی ہے یہ رائے مصری حکومت کی رائے کے موافق بھی ہے لیکن یہ بالکل نامناسب وجہ ہے اس لیے کہ اگر ایسا ہوتا تو مصر کی اکثریت کو ساتھ دینا چاہئے تھا مگر مصر کی اکثریت نے اس تحریک کو نہیں اپنایا ہے۔

ناصری دور کے لیڈر اپنے ملک کے مذہبی احساسات سے چوکنا رہے ہیں لیکن انھوں نے دوسرے تجدد پسند مصلحین کی طرح ان مذہبی احساسات کا احترام نہیں کیا۔ انھوں نے صرف ان کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے۔ مصری دیہاتوں کی مسجدوں میں اور عام طور سے دوسرے ممالک میں حکومت کے طاقتور

محکمہ نشر و اشاعت نے الازہر یونیورسٹی کے وقار کا استحصال کیا ہے اور کر تا رہا ہے لیکن ہر شخص یہ جانتا ہے
کہ صدر ناصر اور ان کا نظام حکومت بنیادی طور پر سیکولر ہیں۔ البتہ اب یہ لوگ مذہبی احساسات کا احترام
کرنے یا غالباً اسے استعمال دینے کی کچھ علامتیں دکھا رہے ہیں۔ بہت بڑی تعداد میں مذہبی براڈکاسٹ
کو بڑھا دینا اسی طرح کا عمل ہے۔ مذہب پہلے استعمال کیا جا رہا تھا اور اب بھی شاید صرف استعمال
کیا جا رہا ہے اس کے باوجود یہ بات ضرور ہے کہ مذہبی تنظیموں کو حکومت کی امداد نے اخوان جیسی تنظیموں
کے لیے اس کا دروازہ کھول دیا کہ وہ اپنی سیاسیات کی بنیاد ہمہ جہتی اور مکمل انداز میں قرآن پر رکھ دے۔
مصر میں دین دار طبقے کے لیے ناصر کا عہد حکومت صرف سیکولر ہی نہیں بلکہ مائل بہ الحاد ہے اس لیے
کہ مصر کی حکومت نے سوشلزم کا اعلان کیا ہے اور کمیونسٹ ممالک سے اس کی دوستی ہے لیکن اب یہ
رخ کچھ بدل رہا ہے۔ ابھی حال میں کچھ رجعت ٹھہری ہوئی ہے۔ کچھ کمیونسٹ یا پرو کمیونسٹ جن کو بڑی
میں بلند پوزیشن دی گئی تھی ہٹا دیے گئے ہیں اور اب بائیں بازو کی آواز دب گئی ہے۔ بن باللہ
الجزائر میں جو کارنامہ انجام دینے میں ناکام ہو گئے اور انھوں نے نقصان اٹھایا اب صدر ناصر اس
کارنامے سے اپنے آپ کو نجات دینے کی فکر میں ہیں۔ اس طرح متحدہ جمہوریہ اس وقت نظریاتی طور
پر بڑی مضبوطی کے ساتھ غیر جانب دار ہے۔

نیشنلزم کمزور

تحریک اخوان کی مقبولیت کی ایک دوسری وجہ۔ اسلام کی قوت کے علاوہ۔ یہ ہے کہ مصر
میں ایک دوسرا بہت طاقتور افرو ایشین (افریقی ایشیائی) احساس نیشنلزم مدھم پڑ گیا ہے۔ مصری
قوم پرست لیڈر ہمیشہ خالص مصری نیشنلزم یعنی وادیٔ نیل کے نیشنلزم کی مخالفت کرتے رہے ہیں اس
لیے کہ ان لیڈروں کو اس بات کا اندیشہ ہے کہ اگر یہ محدود نیشنلزم قوم کا احساس بن گیا تو پھر مصر دنیا
سے علیحدہ ہو جائے گا۔ وجہ جو کچھ بھی ہو مصر کی قومی تحریک ہمیشہ عرب نیشنلزم کے ایک جزء کے طور پر پیش کی
جاتی رہی ہے۔ صدر ناصر اس سے آگے بڑھے ہیں انھوں نے مصر کو ایک طرف عرب اتحاد کی جدوجہد میں سب سے آگے رکھا ہے
اور دوسری طرف اس کو افریقہ کا ایک اہم جزء بنانے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح مصر کے مدھم بلکہ زمین بوس نیشنلزم نے
اخوان کی سیاسی مذہبی تحریک کے لیے کوئی مقابلے کی طاقت فراہم نہیں کی ــــ بہت تعجب انگیز طور پر
چند دوسرے اسباب یہ واضح کرنے کے لیے بیان کیے جا سکتے ہیں کہ ناصری نسل کے نوجوانوں کو کیوں تحریک

خوان کا شکار ہو جانا چاہیے۔

صدر ناصر کی عظیم طاقتوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ ہر معاملے پر صرف اس عملی نقطۂ نظر سے غور کرتے ہیں کہ کون سی چیز مصری قوم کے مفاد میں ہے اور کون سی چیز نہیں ہے۔ جو چیز آج صحیح ہے وہ کل یا کل کے بعد غلط ہو سکتی ہے۔ صرف چند پالیسیاں ہیں جو مستقلاً سیاہ یا سفید باقی رہتی ہیں۔ یہ وہ چیز ہے جسے نوجوان نہیں چاہتے۔ یہ چیز انہیں الجھن میں مبتلا کر سکتی ہے۔ موجودہ نسل کے افراد کسی ایسے واضح عقیدہ و اصول کو ترجیح دیتے ہیں جس میں تمام سوالات کا جواب موجود ہو۔ صدر ناصر اتنے حقیقت پسند ہیں کہ وہ نوجوانوں کو کوئی ایسی چیز نہیں دے سکتے۔ اخوان اور کمیونسٹ دے سکتے ہیں۔

آئڈیالوجی کا فقدان

اسی وجہ سے ناصری تحریک اپنی کوئی قطعی آئڈیالوجی نہیں رکھتی ہے، اگرچہ وہ ہمیشہ آئڈیالوجی کے بارے میں باتیں کرتی رہتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صدر ناصر پر یوگوسلاویہ کا بڑا مضبوط اثر ہے اور یوگوسلاویہ کے لوگ آئڈیالوجی پر باتیں کرنے میں بڑے ماہر ہیں۔ شاید ایک آئڈیالوجی جدید سیاسی فیشن کا ایک حصہ ہے جس طرح آج ہر باعزت حکومت ٹیلی ویژن سسٹم یا اپنی ایک قومی ایرلائن ضروری سمجھتی ہے۔ اس طرح ہر حکومت کے لیے فیشن کے طور پر ایک آئڈیالوجی بھی ضروری چیز بن گئی ہے۔

یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ صدر ناصر کی پہلی اور تنہا کتاب جسے بڑی شان کے ساتھ فلاسفی آف ریوولیشن (فلسفۂ انقلاب) کہا جاتا ہے۔ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ صدر ناصر ابتدا سے ایسے مرتب نقشۂ کار کے شیدائی تھے جس کے پیچھے عقل و ذہن ہو اس کام میں انقلابی فلسفے کی ضرورت بہت ہی کم ہے اور اب تک اس فلسفے کی کوئی بات عالم وجود میں نہیں آئی ہے — آئڈیالوجی کے بارے میں وافر بات چیت نے یہ ظاہر کیا ہے کہ وہ موجود نہیں بلکہ عقلی و ذہنی خلا موجود ہے۔

مصری حکومت نے بہت ہی غیر مرتب انداز میں نوجوانوں کی ضروریات کی طرف توجہ دی ہے۔ یہ ابھی حال میں منکشف ہوا ہے کہ نوجوانوں کی کم سے کم تیرہ الگ الگ اور مقابلے کی تنظیمیں ہیں جنھیں حکومت کی سرپرستی حاصل ہے۔ یہ سب کی سب بالکل الگ الگ خیالات و تصورات پیش کرتی ہیں۔ ان میں سے ایک نے ایک کتاب شائع کی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ عورتوں کو اعلیٰ تعلیم کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بات

سرکاری پالیسی کے بالکل خلاف ہے۔ ایسی تنظیموں میں حکومت جن کی نگرانی اور سرپرستی کرتی ہے اس طرح انتشارِ خیال مصر کو نقصان پہنچا رہا ہے۔

ایک اور کمی

متحدہ عرب جمہوریہ میں کوئی حقیقی سیاسی سرگرمی و جوش موجود نہیں ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ نوجوانوں کے جوش اور ان کی سرگرمی کے لیے کوئی نکاس موجود نہیں ہے حالانکہ مصری نوجوان روایتی طور پر بھی اور اب بھی بہت زیادہ مائل بہ سیاست ہیں۔ حکومت نے جو چند سیاسی تنظیموں کے ڈھانچے بنائے ہیں جیسے لبریشن ریلی، نیشنل یونین اور عرب سوشلسٹ یونین (یہ ابھی حال میں بنی ہے) یہ سب بحیثیت تنظیم ناکام ہیں اس لیے یہ وہی کچھ کرتی ہیں جس کا حکم اوپر سے آتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ حقیقی سیاسی سرگرمیاں زیر زمین (انڈر گراونڈ) چلی گئی ہیں یا تو کمیونسٹ پارٹی کی شکل میں یا تحریک اخوان کی شکل میں —— یہ دونوں تنظیمیں، رہنمائی، یقین، خفیہ سرگرمی کا ہیجان اور کسی پارٹی سے متعلق ہونے کا شعور فراہم کرنے کی اہل ہیں اور یہ چیز نوجوانوں کے لیے بڑی جاذب توجہ ہو سکتی ہیں۔

صدر جمال عبدالناصر کی تیرہ سالہ مخلصانہ جد وجہد کے باوجود جو انھوں نے اپنے ملک اور نوجوانوں کے لیے کی ہیں یہ حقیقت کہ بہت سے نوجوان ان کی پیروی نہیں کرتے بلکہ ان کے مخالف ہیں ان پر ایک بر بسہ ضرب ہے۔ افسوس نہ خود صدر ناصر اور نہ کوئی دوسرا شخص یہ جانتا ہے کہ کس طرح نوجوانوں کو تحریک اخوان کی تنظیم کے پھندے سے باہر نکالا جائے۔ کوئی شخص بس یہ امید کر سکتا ہے کہ اقتصادی محاذ پر مزید کامیابیاں، کے لیے زیادہ مواقع اور ہر طرف نظریاتی گفتگو کی کمی شاید اس خلا اور سوراخ کو بھر سکے جو مصری معاشرے کے دل میں پیدا ہو گیا ہے۔

نوٹ:۔ جی۔ ایچ۔ جانسن کے اس تبصرے میں ناواقفیت، مبالغہ اور تضاد موجود ہے اس کے باوجود اس سے دو حقیقتوں پر کافی روشنی پڑتی ہے ایک یہ کہ مصر میں تحریک اخوان المسلمین نہ صرف یہ کہ موجود ہے بلکہ وہ موجودہ نسل نوجوانوں اور اعلیٰ ترین طبقے پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ اخوان کے شہیدوں کا خون پہلے بھی رائگاں نہیں گیا ہے اور اب تازہ خون بھی انشاء اللہ رائگاں نہیں جائے گا۔ دوسری بات یہ کہ خود صدر ناصر کے بارے میں یہ توقع منقطع نہیں ہے کہ ان کے خیالات میں تبدیلی پیدا ہو جائے اور وہ اسلام کو ایک نظام زندگی کی حیثیت سے قبول کر لیں۔ (ادارہ)

تاشقند اعلان

تاشقند اعلان، جنوری ۱۹۶۶ء کا ایک اہم واقعہ ہے جو تاریخ میں یادگار رہے گا۔ اس پر دستخط کے
ندہی بھارت کے وزیر اعظم آنجہانی شری لال بہادر شاستری کے اچانک انتقال نے اس کی تاریخیت میں
یدا اضافہ کر دیا ہے اور اب ہمارے ملک کے لیے اس اعلان کے احترام میں خود آنجہانی وزیر اعظم کا احترام
شامل ہو گیا ہے۔

اس اعلان پر متعدد پہلوؤں سے گفتگو کی جا سکتی ہے۔ اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ ہندوستان و
لستان کے درمیان دوبارہ جنگ کا فوری خطرہ ٹل گیا ہے۔ دو پڑوسی ملک جو ایک دوسرے سے
نحت برافروختہ تھے، جن کے درمیان خوں ریز جنگ ہو چکی تھی اور جن کی فوجیں چند گز کے فاصلے پر ایک دوسرے
ے سامنے کھڑی تھیں اور جن کے درمیان جنگ بند ہونے کے بعد بھی جھڑپیں جاری تھیں اور ہر وقت
رہتا تھا کہ دوبارہ جنگ شروع ہو جائے۔ ایسے دو ملکوں کے سربراہوں کا اعلان پر متفق ہو جانا،
لیے اتفاق کا سبب جو کچھ بھی ہو، بلاشبہ ایک خوش آیند واقعہ اور ایک عظیم کارنامہ ہے۔ یہی وجہ
ہے کہ دنیا بھر میں اس کا خیر مقدم کیا گیا ہے اور یہ اعلان اس لائق ہے بھی کہ اس کا خیر مقدم کیا جائے
کسی درجے میں یہ بھی توقع کی جا سکتی ہے کہ آئندہ ان دونوں ملکوں کے درمیان جنگ نہ ہو اور ان کے
سائل صلح و امن سے طے ہو جائیں۔

اس اعلان کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس میں جس انداز سے جموں و کشمیر پر گفتگو کا ذکر آیا ہے وہ
انتہائی مبہم اور غیر واضح ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کے ترجمان اس کی کچھ اور تعبیر کر رہے ہیں اور
ہندوستان کے ترجمان کچھ اور۔ جو لوگ تاشقند کی گفتگو میں موجود نہ تھے ان کے بیان اور تعبیر کو چھوڑیے
جو لوگ وہاں موجود اور خود گفتگو میں شریک تھے ان کے بیانات اور ان کی تعبیرات کے درمیان اختلاف

اندیشے سے خالی نہیں ہو سکتا ہے ۔ دنیا جانتی ہے کہ ہندوستان و پاکستان کے درمیان جنگ صرف مسئلہ کشمیر کی پیداوار تھی ۔ اور اگر واقعہ یہی ہے کہ صدر ایوب نے کشمیر کا خیال ترک کر کے اعلان پر دستخط کیے تھے تو یہ بڑی اچھی بات ہے لیکن ان کے بیانات اس کی تصدیق نہیں کرتے اور ابھی وزراء کی میٹنگ کے لیے جو ایجنڈا انھوں نے بھیجا ہے اس نے تو یہ واضح کر دیا ہے کہ حکومت پاکستان کے دماغ سے ابھی کشمیر کا خیال نکلا نہیں ہے ۔ ہندوستان اور پاکستان کے لیڈر اپنے ملک کے عوام کو خوش کرنے کے لیے جو بیانات دیا کرتے یا تقریریں کیا کرتے ہیں انہیں نظر انداز کیا جا سکتا ہے لیکن باضابطہ میٹنگ کے ایجنڈے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا چنانچہ ہندوستان کے ترجمانوں نے اس کو "بیڈ سائن" بری علامت قرار دیا ہے ۔ ہمارے وزیر خارجہ اور وزیر دفاع کہہ رہے ہیں کہ تاشقند میں صدر ایوب پر یہ بات بالکل واضح کر دی گئی تھی کہ کشمیر ہندوستان کا اٹوٹ حصہ ہے اور اس پر کوئی گفتگو نہیں ہو سکتی اور صدر ایوب یہ کہہ رہے ہیں کہ تاشقند گفتگو کا محور مسئلہ کشمیر ہی تھا گویا جہاں تک بیانات کا تعلق ہے صورت حال وہی ہے جو تاشقند اعلان سے پہلے تھی اس کے معنی یہ ہوئے کہ جھگڑے کی جڑ اپنی جگہ قائم ہے اس اعلان نے کچھ پتے اور کچھ شاخیں توڑ دی ہیں لیکن اس طرح کے اعلانات اور معاہدات میں سب کچھ وہی نہیں ہوتا جو کاغذ پر لکھا جاتا ہے بلکہ بہت سی باتیں اندر ہوتی ہیں اور وہ معہود ذہنی کے طور پر کام کرتی ہیں

روس کے وزیر اعظم جو تاشقند کانفرنس کے کرتا دھرتا تھے اور جن کی کوشش نے اخیر وقت میں دونوں ملکوں کے سربراہوں کو اس اعلان پر متفق کیا اور جو تمام باتوں سے واقف ہیں ان سے توقع ہے کہ وہ ان دونوں ملکوں کے تعلقات میں بہتری کے لیے کوشش کرتے رہیں گے اور اگر مسئلہ کشمیر کے سلسلے میں کوئی تعطل پیدا ہوا تو ان کی رہ نمائی کام آئے گی ۔ امریکہ کے صدر بھی خواہشمند ہیں کہ دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات اچھے رہیں بس اسی سے توقع ہوتی ہے کہ شاید چار و ناچار دونوں ملکوں کو کشمیر کے کسی حل پر اتفاق کرنا پڑے ۔ مرکزی کابینہ کے وزیر شری جگ جیون رام نے ادھر جو تقریریں کی ہیں وہ بھی اشارہ کرتی ہیں کہ ملک اس مسئلے کو حل کرنے کی طرف کچھ مائل ہوا ہے ۔

مدیر
۸ر فروری ۱۹۶۶ء

تصحیح گزشتہ شمارے میں جلد نمبر اور شمارہ نمبر لکھنے سے رہ گیا اور فروری کے بجائے جنوری چھپ گیا ہے ۔ خریداران زندگی جلد: ۳۶ شمارہ: ۲ ۔ فروری ۱۹۶۶ء لکھ لیں۔

(ادارہ)

احمد بن بیلو کی شہادت

نائجیریا کا فوجی انقلاب

اللہ تعالیٰ اپنی تکوینی حکمتوں اور مصلحتوں کو خود جانتا ہے۔ ہم جیسے نادانوں کو اس کا علم نہیں اور ہماری نادانی ہی ہے جو ہمیں بعض احوال و کوائف اور بعض واقعات پر حیران و پریشان کر دیتی ہے۔ نائجیریا میں الحاج احمد بن بیلو کی شہادت اسی طرح کے واقعات میں سے ایک واقعہ ہے۔ ہم نے ان سے کیسی کیسی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں۔ الحاج احمد بن بیلو وہ شخصیت جس کے دست حق پرست پر اسی ہزار سے زیادہ عیسائی اور مظاہر پرست ایمان لائے۔ وہ شخصیت جو تاریک افریقہ میں تبلیغ اسلام کا روشن چراغ تھی۔ وہ شخصیت جو تمام دنیا کے مسلمانوں کو خالص اسلامی اساس پر متحد کرنے کے لیے سرگرم کار تھی۔ وہ مرد مومن جو ایک وسیع خطہ کا وزیر اعظم ہوتے ہوئے بھی اسلام کا خادم تھا۔ رابطۂ اسلامی کا نائب صدر اور پورے افریقہ کو اسلام کی روشنی سے جگمگا دینے کے لیے متحرک۔

ایک ایسی شخصیت اور ایک ایسے مرد کار کی اچانک موت کتنی روح فرسا اور جاں گسل ہے۔ حج کا زمانہ قریب ہے وہ رابطۂ اسلامی کے اجلاس میں شریک ہوتے اور اپنی تقریر سے دنیا بھر کے مسلمانوں کا لہو گرم کرتے لیکن اب ان کی آواز کون سنے گا؟ یہ ٹھیک ہے کہ ان کی موت ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاء ولکن لا تشعرون کی مصداق بنی ہوگی اور ان کی روح اللہ کی رحمتوں اور برکتوں سے سرفراز ہوگی۔ رمضان المبارک کی طبعی موت بھی قابل تمنا ہے۔ رمضان میں شہادت کا کیا کہنا! لیکن یہ خیال کہ کہیں ان کی موت سے نائجیریا میں اسلام کا سیل رواں تھم نہ جائے سوہان روح بنا ہوا ہے ——

اے اللہ تو اپنے اس بندے کی روح پر اپنی بے شمار رحمتیں نازل فرما اور اس کی شہادت کے پاک خون سے نائجیریا میں اسلام کی کھیتی کو سرسبز و شاداب کر دے۔ آمین۔

اب یہ بات مخفی نہیں رہی ہے کہ نائجیریا کا فوجی انقلاب اور احمد بن بیلو اور سر ابوبکر کی شہادت امریکہ اور دوسری بیرونی طاقتوں کی سازش کا نتیجہ ہے۔ نائجیریا میں اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت سے یہ حکومتیں گھبرا اٹھیں اور اس کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے الٹی بڑے عیسائی جنرلوں اور مظاہر پرست فوجیوں کی مدد سے اس ملک کا نقشہ بدل دینے کی سازشیں کیں اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی سازش میں کامیاب ہو

لیکن بندۂ مومن کبھی مایوس نہیں ہوتا اور ہم بھی مایوس نہیں ہیں۔ اللہ کی قدرت و رحمت سے کیا بعید ہے کہ یہ انقلاب اسلام کی راہ کا پتھر بننے کے بجائے اس کی مزید قوت و اشاعت کا سبب بن جائے۔

اس فوجی انقلاب کا رخ کیا ہے اس کے بارے میں قاہرہ کے مکتوب نگار شوکت عثمانی لکھتے ہیں

"اہم بات یہ ہے کہ نائجیریا کے تازہ فوجی انقلاب سے فائدہ برطانیہ حاصل کرے گا۔۔

۔۔۔۔۔۔ قاہرہ میں غیر ملکیوں اور مقامی لوگوں کی رائے یہ ہے کہ عیسائی جنرل جو اس وقت نائجیریا پر حکومت کر رہے ہیں۔ اس بات کا خاص خیال رکھیں گے کہ نائجیریا کوئی ایسی شکل اختیار نہ کرے جس سے افریقہ میں کہیں بھی برطانوی مفادات کو نقصان پہنچے"

(ریڈینس، دہلی ۲۰ فروری ۱۹۶۶ء)

احمد بن بیلو کے خاندان اور اس خاندان کی دینی و تبلیغی جد و جہد کی تاریخ بیان کرتے ہوئے معاصر ندائے ملت، لکھنؤ ۴ فروری ۶۶ء رقم طراز ہے:

"نائجیریا کی کل آبادی ۵ کروڑ ۵۶ لاکھ ہے جس میں شمالی علاقے کی ۲ کروڑ ۹۷ لاکھ آبادی شامل ہے جو مسلمان ہے۔ یہاں اسلام اٹھارہویں صدی میں فولانی نسل کے عالم، مجاہد اور مبلغ اسلام عثمان بن فوڈیو نے پھیلایا تھا۔ عثمان بن فوڈیو ۱۷۵۴ء میں پیدا ہوئے۔ وہ فولانی نسل سے تعلق رکھتے تھے جو افریقہ کے حبشیوں کا ایک گروہ ہے۔ عثمان بن فوڈیو نے دینی تعلیم حاصل کی اور پھر سلسلۂ قادریہ میں داخل ہو کر سلوک و تربیت کے مرحلے طے کیے۔ عثمان بن فوڈیو نے ابتدا میں اسلام کا پیام عوام تک پہنچایا پھر اس زمانے کے ہوسہ حکمرانوں پر توجہ کی۔ یہ ہوسہ حکمران نام کے مسلمان تھے۔ پرانے مشرکانہ عقاید پر عمل کرتے تھے اور ان کے درباروں میں اونچ نیچ کے پرانے خاندانی معیار رائج تھے۔ عثمان بن فوڈیو نے اس کی مذمت کی تو ان پر مظالم ہونے لگے۔ وہ ہوسہ حکمرانوں کا علاقہ چھوڑ کر ایک دور کے علاقے میں چلے گئے۔ شاگردوں اور مریدوں کا حلقہ ساتھ تھا۔ ہجرت کے بعد عثمان بن فوڈیو نے ایک اصلاحی تحریک شروع کی جس کی دعوت یہ تھی کہ مسلمان کتاب و سنت کے مطابق پوری زندگی بسر کریں۔"

اس دعوت کی راہ میں ہمیشہ کانٹے بچھائے گئے ہیں اس کو مٹانے اور اس کے داعیوں کو ختم کرنے کی ہمیشہ سعی کی گئی ہے۔ عثمان بن فوڈیو کی تحریک اس سے کیسے بچ سکتی تھی چنانچہ

"اس دعوت پر جو سہ حکمرانوں نے اپنی بدبختی سے فوجی حملہ کیا اور عثمان بن فودیہ کے مریدوں نے لشکر جرار بن کر اس کا بدلہ لیا جب ۱۸۱۷ء میں عثمان بن فودیو نے دنیا سے سفر کیا تو وہ لاکھوں مسلم جانشینوں کے رہنما اور سرکی مسلمین یعنی مسلمانوں کے امیر کا لقب رکھتے تھے۔"

پھر ان کا خاندان سات پشت تک نائجیریا کے وسیع علاقے پر حکومت کرتا رہا آخر کار انگریزوں نے اس حکومت کو ختم کر کے نائجیریا پر قبضہ کر لیا پھر جب نائجیریا آزاد ہوا تو انگریزی کی خواہش تھی کہ جنوبی علاقہ (جہاں عیسائیوں کی اکثریت ہے) پورے نائجیریا کا حکمراں ہو لیکن:۔

"مرحوم الحاج احمد بن بیلو نے یہ نہ ہونے دیا وہ عثمان بن فودیو کی نسل کے ساتویں سلطان کے پوتے تھے۔ ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوئے تھے۔ اسلامی علوم کے بعد جدید مغربی تعلیم پائی تھی اور سامراجی سیاست کو خوب سمجھتے تھے شمالی علاقہ میں تعلیم پھیلانے، سیاسی و دینی شعور پیدا کرنے کا کام وہ ابتدا سے کر رہے تھے .... الحاج احمد بیلو نے وفاقی وزارت پسند نہیں کی اس پر انھوں نے الحاج ابوبکر کو نامزد کیا اور خود شمالی علاقے کی وزارت لے لی وہ اپنے علاقے کے مسلمانوں کی خدمت کرنے اور اسلام کی تبلیغ میں زیادہ دلچسپی لینا چاہتے تھے اور وہ کرتے بھی رہتے تھے۔ اپنے جوش عمل سے انھوں نے نائجیریا میں ایک نئی زندگی کی لہر دوڑادی تھی۔ وہ بہت پکے اور سچے مسلمان تھے کئی بار حج کر چکے تھے نسل پرستی اور دوسرے تنگ نظریوں سے بلند تھے اور خلوص دل چاہتے تھے کہ عالم اسلام کے درمیان خلوص، دوستی اور تعاون کا راستہ کھلے۔ اسی لیے انھوں نے رابطۂ عالم اسلامی کی نائب صدارت قبول کی تھی اور صاف صاف کہا تھا کہ افریقہ کو عرب لیگ کی نہیں اسلامی لیگ کی حاجت ہے۔"

الحاج احمد بن بیلو کے یہی وہ "جرائم" تھے جن کی بنا پر صرف اسرائیل اور برطانیہ ہی ناخوش نہیں تھے بلکہ متحدہ عرب جمہوریہ کی حکومت بھی ان سے ناخوش تھی۔ معاصر تعمیر حیات لکھنو ۱۰ر فروری ۶۶ء میں مولانا عبداللہ عباس ندوی کا ایک مکتوب شائع ہوا ہے۔ مولانا ان دنوں لندن میں ایک خاص علمی ریسرچ کے لیے مقیم ہیں۔ انہیں کے مکتوب سے مرحوم احمد بن بیلو کا صحیح نام بھی معلوم ہوا وہ لکھتے ہیں:۔

"الحاج احمد (جن کے نام احمد کی ذال پر ضمہ ظاہر کرنے کے لیے اہل افریقہ واؤ کے اضافے کے ساتھ لکھا کرتے ہیں۔) نائجیریا ہی نہیں بلکہ پورے افریقی براعظم میں اسلام کے مبلغ تھے وقت

کا بلند قامت، چوڑا چکلا سینہ رکھنے والا مردِ مومن تنہا یہودیوں کے سیلاب کے سامنے ایک بند کا کام کر رہا تھا۔ اس سے انگریز ناراض تھے کہ یہ اسلام کے داعی اور اسلامی قدروں کے مبلغ ہیں۔ یہود اس لیے خفا تھے کہ اسرائیلی نفوذ کو اپنے ملک میں بڑھنے نہیں دے رہے تھے۔ عبدالناصر کے ہمنوا اس لیے جلتے تھے کہ یہ کھلم کھلا اسلامی اتحاد کے داعی تھے۔"

صدر ناصر عرب نیشنلزم کے دیوتا ہیں اور وہ ہر اس سیاست اور ہر اس اتحاد کی مخالفت کو اپنا فرض سمجھتے ہیں جس کی بنیاد اسلام ہو۔ مولانا عبداللہ عباس مزید رقم طراز ہیں:-

"الحاج احمد بن بیلو نے اپنے قلمرو میں یہودیوں کو کام کرنے کا موقع نہیں دیا۔ ہر قسم کی ثقافتی، علمی، صنعتی امداد کو رد کیا جو اسرائیل سے رواداری کے بدلے امریکہ یا برطانیہ سے مل سکتی تھی۔ ان کا وجود ان طاقتوں کی نگاہ میں کھٹک رہا تھا۔"

سامراجیوں نے افریقہ کے اسلامی ملکوں کی کیا گت بنائی ہے اس کو عبداللہ عباس کی تحریر میں دیکھیے

"دوسری طرف بدقسمتی سے افریقہ کے نو آزاد ممالک میں تعلیم کی کمی، غلامی کے اثرات اور سازشی انداز میں مسلمانوں کو جاہل رکھنے کی مہم نے حالت اس طرح کی پیدا کر دی ہے کہ نہ صرف نائجیریا میں بلکہ تمام افریقی ممالک میں جہاں جہاں مسلمانوں کی بھاری اکثریت ہے وہاں بہت سے علاقوں میں ایک مسلمان نہیں ملتا جو اسمبلی کے امیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہو سکے اس لیے خاص مسلمانوں کے حلقے سے کرسچن کھڑے ہوتے ہیں۔ سر احمد بن بیلو کا ایک بڑا جرم یہ تھا کہ وہ مسلمان طلبہ کو آئندہ حکومت کا بار اٹھانے کے لائق بنانا چاہتے تھے۔"

افریقی مسلمانوں کی پس ماندگی کی یہ کتنی عبرتناک روداد ہے۔ سامراجیوں نے احمد بن بیلو کو شہید کر کے اس عبرتناک روداد کو طویل کرنے کی سعی کی ہے لیکن خدا کی رحمت سے کیا بعید ہے کہ ان کی شہادت نائجیریا کے دوسرے مسلمانوں کو اور زیادہ بیدار اور زیادہ سرگرم کر دے اور ان میں کئی ایک احمد بن بیلو اٹھ کھڑے ہوں۔

مدیر

۱۵ ر فروری ۱۹۶۶ء

رسائل و مسائل

عشر کے ایک جزئیے کی توضیح

سوال

جنوری ۱۹۶۶ء کے شمارے میں آپ کا مضمون "زکوٰۃ کے چند اصولی احکام" نہایت ہی مفید ثابت ہوا اس کے مطالعے کے بعد مزید چند زکوٰۃ ہی کے امور کی تشریح مطلوب ہے۔ براہ کرم آئندہ شمارے میں وضاحت فرما کر استفادے کا موقع عطا فرمائیے۔

(۱) عُشر میں جو دس فی صد برسات کی پیداوار میں نکالنا واجب ہے اس پر جو سرمایہ بیج اور کھاد وغیرہ پر صرف ہو گا کیا اس سرمایے کو نکال کر عُشر ادا کرنا یا بغیر خرچ نکالے ادا کرنا ہے۔

مثال کے طور پر ہمارے یہاں کافی (COFFEE) اور آلو (POTATO) کی پیداوار پر تقریباً پچاس فی صد خرچ لگ جاتا ہے۔ مثلاً ایک ہزار روپے کی کافی یا آلو پر تقریباً پانچ سو روپے خرچ ہوتے ہیں اس پر عُشر کیا ہزار روپے پر ادا کرنا ہے یا خرچ منہا کر کے پانچ سو پر؟ قرآن و سنت کی روشنی میں اس کی توضیح فرمائیے۔

نوٹ:۔ بسا اوقات پیداوار خرچ سے بھی بہت کم ہو جاتی ہے کیا اس پر بھی عشر واجب ہو گا؟

جواب

آپ کے سوال کا جواب دینے سے پہلے یہ بات یاد دہانی کے طور پر عرض کر دینی مناسب ہے کہ زکوٰۃ و عُشر نماز کے بعد دوسری اہم عبادت ہے اور اس کے مسائل پر غور کرتے وقت اصلاً اس کی یہی حیثیت سامنے رکھنی چاہیے۔ کاروباری نقطۂ نظر یا مالی نفع و نقصان کو اس کی حیثیت نہ دینی چاہیے۔ زکوٰۃ کی روح عبادت

فیاضی اور رحمت و مواسات ہے۔

آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ زمین بارانی ہو یعنی بارش کے پانی سے سیراب ہوتی ہو یا غیر بارانی ہو یعنی جس کو کنوئیں سے پانی نکال کر یا دور سے پانی لا کر یا پانی خرید کر سیراب کیا جاتا ہو، ہر دو صورت میں اخراجات نکالے بغیر کل غلے کی زکوٰۃ دینی ہوگی۔ پہلی صورت میں عُشر یعنی دسواں حصہ اور دوسری صورت میں نصف عُشر یعنی بیسواں حصہ ۔۔۔ آپ نے جو مثال دی ہے اس میں عُشر ایک ہزار روپیے پورا ادا کرنا ہوگا، پانچ سو پر نہیں۔ اگر پیداوار خرچ سے کم ہو جائے جب بھی اس پر عُشر واجب ہوگا۔

اس ضمن میں ایک بات یہ ذہن میں رکھیے کہ سونا چاندی اور پیداوار کی زکوٰۃ میں اصل یہ ہے کہ وہی چیز نکالی جائے جس کا نکالنا فرض ہوا ہو اس کی قیمت ادا کرنا محض جائز ہے اصل نہیں ہے۔ مثال کے طور پر اگر بارانی زمین سے سو من آلو پیدا ہوا ہے تو دس من آلو نکالنا اصل ہے اس کی قیمت ادا کرنا محض جائز ہے اصل نہیں ہے ۔۔۔ اب میں اپنے جواب کی تھوڑی سی وضاحت کرتا ہوں۔

زکوٰۃ و عشر کے بارے میں بھی قرآن کریم کی آیتیں مجمل ہیں جن کا بیان احادیث میں ملتا ہے۔ فقہائے امت نے قرآن و احادیث کے الفاظ کو سامنے رکھ کر جزئیات مرتب کیے ہیں۔ عام طور سے مفسرین اور فقہاء حبوب و ثمار (غلے اور پھل) کی زکوٰۃ کے بارے میں سورۂ انعام کی آیت ۱۴۱ اور سورۂ بقرہ کی آیت ۲۶۷ سے استدلال کرتے ہیں۔ سورۂ انعام کی آیت کا ترجمہ یہ ہے :۔

> وہ اللہ ہی ہے جس نے طرح طرح کے باغات اور تاکستان اور نخلستان پیدا کیے، کھیتیاں اگائیں جن سے قسم قسم کے ماکولات حاصل ہوتے ہیں، زیتون اور انار کے درخت پیدا کیے جن کے پھل صورت میں مشابہ اور مزے میں مختلف ہوتے ہیں۔ کھاؤ ان کی پیداوار جب کہ یہ پھلیں، اور اللہ کا حق ادا کرو جب ان کی فصل کاٹو اور حد سے نہ گزرو کہ اللہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔
>
> (الانعام رکوع ۱۷)

اس آیت میں وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ (اور اللہ کا حق ادا کرو جب ان کی فصل کاٹو) کا ٹکڑا عُشر کی دلیل ہے اور اس سے عُشر کے متعدد احکام نکلتے ہیں۔ سورہ بقرہ کی آیت کا ترجمہ یہ ہے :۔

> اے ایمان لانے والو! جو مال تم نے کمائے ہیں اور جو کچھ ہم نے زمین سے تمہارے لیے نکالا ہے اس میں سے بہتر حصہ راہِ خدا میں خرچ کرو۔ (البقرۃ ۲۶۷)

اس آیت میں وممآ اخرجنا لکم من الارض (اور جو کچھ ہم نے زمین سے تمہارے لیے نکالا) حبوب و ثمار کی زکوٰۃ کے لیے دلیل ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غلے اور پھلوں کی زکوٰۃ کے لیے دو شرحیں مقرر فرمائی ہیں۔ بارانی زمینوں کے لیے عشر یعنی دسواں حصہ اور غیر بارانی زمینوں کے لیے نصف عشر یعنی بیسواں حصہ فرمایا گیا ہے:۔

فیما سقت الانھار والغیم	جن کھیتوں کو نہریں اور بارش سیراب کریں
العشور وفیما سقی بالسانیۃ	ان میں دسواں حصہ ہے اور جن کو اونٹوں پر پانی
نصف العشر (مسلم شریف)	لاکر سیراب کیا جائے ان میں بیسواں حصہ ہے۔

اس حدیث کو سامنے رکھ کر فقہائے احناف نے متفقہ فیصلہ فرمایا ہے کہ عشر یا نصف عشر ادا کرتے وقت بیج، مزدور، بیل، محافظ اور اس طرح کے دوسرے اخراجات کو الگ نہیں کیا جائے گا بلکہ خرچ نکالے بغیر کل غلے کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ اگر اخراجات کو نکالنا ہوتا تو پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم دو شرحیں الگ الگ مقرر نہ فرماتے بلکہ اخراجات نکال کر ایک ہی شرح مقرر فرماتے۔ حضورؐ نے اخراجات اور محنت و مشقت کا لحاظ فرماتے ہوئے خود ہی دس فی صدی اور پانچ فی صدی کی دو شرحیں مقرر فرما دی ہیں۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کھیت کی سیرابی کو پیداوار کے لیے اصل کی حیثیت دی ہے اور اسی کے لحاظ سے شرحیں مقرر فرما دی ہیں۔

پیداوار میں فقراء و مساکین کے حق کو اللہ تعالیٰ نے اپنا حق قرار دیا ہے۔ اس حق کو ادا کرنے میں ہمیں دنیوی نفع و نقصان سے بلند ہو کر اس کے حکم کی تعمیل کرنی چاہیے۔ (سید احمد قادری)

بقیہ صفحہ ۲۹ | بے لوثی، ایثار، تقویٰ، مروت، وفاداری، ایفائے عہد، عفت مآبی، حفاظتِ حقوق، حق پرستی، انفاق، حلم، عفو و درگذر، اعترافِ گناہ، توبہ و استغفار، اعتذار، زہد و اتقا، لحاظ و ادب وغیرہ یا تو ندہبی یا رہبانی عنوانات کے تحت بے وزن قرار دیے جا چکے ہیں یا ایسے اوصاف کے حامل انسان کو احساس کمتری کا شکار تصور کر لیا گیا ہے۔ اور افسوس تو حق پرستوں اور علمبردارانِ انسانیت پر ہے کہ ان کے نزدیک استکبار فی الارض کی اس آفاق گیر ذہنیت کے اژدہے کے سامنے بیان و صفائی کے گوشوں کا علم رکھتے ہیں جس میں دم مارنے کا یارا موت اور خودکشی کے مترادف ہے۔

تنقید و تبصرہ

انشائیہ ڈاکٹر آدم شیخ ایم اے پی ایچ ڈی۔ صفحات ۲۰۴ مجلد گرد پوش کے ساتھ قیمت دو روپے پچاس پیسے۔ ناشر: رائٹرس امپوریم پرائیوٹ لمیٹڈ خورشید بلڈنگ سرفیروز شاہ مہتہ روڈ بمبئی ۱

اس کتاب کے مرتب بقول ناشر ایک نوجوان ابھرتے ہوئے ادیب ہیں۔ ذوق سلیم سے فیضیاب اور اردو ادب کے متوالے ہیں۔ اس کتاب کے ستر بہتر صفحات میں ادب کی صنف انشائیہ پر تنقیدی مباحث پھیلے ہوئے ہیں اور اس کے بعد اس صنف کی تخلیقات کا حصہ ہے۔ اس حصے میں محمد حسین آزاد سے لے کر احمد جمال پاشا تک سولہ ادیبوں کی تخلیقات کے نمونے جمع کیے گئے ہیں۔ اس صنف ادب کا تعارف کراتے ہوئے سب سے پہلی بات جو فاضل مرتب نے لکھی ہے وہ یہ ہے:-

"انشائیہ ایک فنی اور ادبی چیز ہے لہذا اس کے حدود کا تعین کرنا یا اس کی منطقی اور قطعی تعریف کرنا سعی لاحاصل ہے۔"

لیکن ادب کے ناقدین، ادبا اور انشائیہ نگار حضرات اس سعی لاحاصل سے باز نہیں آئے ہیں اور مرتب نے بھی بڑی فراخ دلی کے ساتھ ان لاحاصل کوششوں کو ۷۰، ۷۲ صفحات میں پھیلا کر بیان کیا ہے۔ ص۳۲ پر مرتب لکھتے ہیں:-

انشائیے کے اس فکری اور فنی جائزے کے بعد اس صنف نثر کی تعریف درج ذیل الفاظ میں کی جاسکتی ہے:-

انشائیہ ایک ایسی جامع اور فکر انگیز تحریر ہوتی ہے جس میں مصنف بے تکلفی و شگفتگی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے اس میں براہ راست تبلیغ یا تشہیر کی گنجائش نہیں ہوتی۔ انشائیہ چند الفاظ

کا بھی ہو سکتا ہے اور طویل بھی۔ کائنات و ماورا کی حقیر ترین یا اعلیٰ سے اعلیٰ شے اس کا موضوع بن سکتی ہے۔ یہ سنجیدہ، مزاحیہ یا طنزیہ ہو سکتا ہے۔ انشائیہ کے لیے لازمی اور بنیادی خصوصیت اس کی بے تکلف اور شگفتہ فضا ہے جو تحریر کو دل نشین اور قابل قبول بنا دیتی ہے۔"

بہر حال صنف انشائیہ جو کچھ بھی ہو فاضل مرتب کی یہ کتاب پڑھنے کے لائق ہے۔ مباحث بھی معلومات افزا ہیں اور اکثر نمونے بھی دلچسپ اور مفید ہیں۔ امید ہے کہ نوجوان مصنف کی یہ کوشش پسند کی جائیگی یہ کتاب مشہور اشتراکی شاعر فیض احمد فیض کی طرف منسوب کی گئی ہے۔

ابن ماجہ اور علم حدیث

مؤلفہ مولانا محمد عبد الرشید نعمانی۔ صفحات ۳۶۰۔ کاغذ، کتابت، طباعت بہتر۔ قیمت مجلد گرد پوش کے ساتھ آٹھ روپیے۔ ناشر: نور محمد کارخانہ تجارت کتب۔ آرام باغ۔ کراچی۔

متوسط سائز کے تین سو ساٹھ صفحات پر پھیلی ہوئی یہ کتاب کہنے کو تو امام ابن ماجہ کی سوانح عمری کتاب ہے لیکن یہ حقیقت میں تدوین حدیث کی تفصیلی تاریخ ہے۔ فاضل مؤلف نے بڑی محنت سے یہ کتاب مرتب کی ہے۔ امام ابن ماجہ اور علم حدیث پر یہ ایک کارآمد ذخیرۂ معلومات ہے۔ شروع میں ایک فہرست اجمالی مضامین کی اور دوسری تفصیلی مضامین کی ہے جس کی وجہ سے کتاب سے استفادہ آسان ہو گیا ہے۔ کتاب کے آخر میں اسماء رجال، اسماء اماکن، اسماء قبائل و جماعات اور اسماء کتب کا ایک مفصل اشاریہ ہے۔ اس کے علاوہ ایک صفحے پر شرق اسلامی کا عربی نقشہ اور ایک صفحے پر عہد عباسی کے صوبوں کا انگریزی نقشہ بھی ہے۔ تیسرے صفحے پر سلسلہ ہجری سے ۳۰۰ھ تک اسلامی فتوحات کا نقشہ ہے۔ اس طرح یہ کتاب خاصی مفید ہو گئی ہے۔ نور محمد کارخانہ تجارت کتب نے یہ کتاب شائع کر کے ایک مفید علمی خدمت انجام دی ہے۔ (ع۔ ق)

قرآن کا مطالعہ کیسے

از محمد اویس نگرامی ندوی شیخ التفسیر دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔ صفحات [illegible] قیمت ایک روپیہ پچیس پیسے۔ ناشر: مکتبہ علمیہ [illegible] ڈیوڑھی آغا میر، لکھنؤ۔

اس کتاب پر پیش لفظ مولانا عبدالماجد دریابادی نے تحریر کیا ہے وہ لکھتے ہیں :-

"ضرورت تھی کہ اس کتاب الٰہی سے مستفید ہونے والوں کے لیے کوئی ہدایت نامہ کسی صاحب فن کے قلم سے موجود ہوتا۔ دلی مسرت اس امر کے اظہار میں ہے کہ اس ضرورت کو ایک ندوی فاضل اور اہل قلم نے پورا کر دیا وہ یہی نہیں کہ دارالعلوم ندوہ میں فن تفسیر کے استاد اور سالہا سال کا تجربہ درس قرآن کا رکھتے ہیں بلکہ اپنے ذوق و وجدان کے لحاظ سے صحیح معنی میں قرآنیات کے عالم و متعلم ہیں۔ ان کا مطالعہ اس باب میں بڑا وسیع اور ان کی نظر اس خصوص میں ماشاء اللہ گہری ہے۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء

مولانا محمد اویس ندوی نے ابن قیم کی جو تفسیر بڑی دیدہ ریزی سے جمع کر کے شائع کی ہے اس نے ان کو صرف ہندوستان میں نہیں بلکہ عرب ممالک میں بھی متعارف کرا دیا ہے اور وہ اس سے بے نیاز ہیں کہ تبصرہ نگار جیسا غیر معروف شخص ان کے بارے میں کچھ عرض کرے۔ قرآن کا مطالعہ کس طرح کیا جائے، اور فہم قرآن کے بنیادی اصول، شرائط و حدود کیا ہیں؟ اس پر اردو میں اچھا خاصہ ذخیرہ جمع ہو گیا ہے مولانا کی یہ کتاب بھی بہت مفید ہے اور اس نے اس موضوع پر اچھا اضافہ کیا ہے۔ علماء و مفسرین کی کتابوں میں جہاں کہیں بھی فاضل مرتب کو، کوئی چیز اس سلسلے کی ملی ہے اسے انھوں نے اس کتاب میں جمع کر دیا ہے۔ اس لیے یہ کتاب معلومات افزا ہو گئی ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ نکل جائے گی

اخیر میں محترم مولانا کی خدمت میں عرض ہے کہ بعض مباحث میں جو طالب علمانہ سوالات و شبہات پیدا ہوتے ہیں، ان کے ازالے کی طرف انھوں نے توجہ نہیں فرمائی ہے۔ آئندہ اڈیشن میں توجہ فرمالیں تو بہتر ہو اس طرح کی دو ایک چیزیں ذیل میں پیش کرتا ہوں

آیت عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ کے سلسلے میں مفردات امام راغب کے حوالے سے یہ بات لکھی ہے کہ اختیان خیانت کرنے کو نہیں بلکہ خیانت کا ارادہ کرنے کو کہتے ہیں اور پھر اس بنیاد پر مولانا نے یہاں تک لکھ دیا کہ "یہ آیت صحابۂ کرام کے مناقب کے ذیل میں آتی ہے کہ باوجود قصد کے ان سے اس کا ارتکاب نہیں ہوا۔" اس پوری بحث کو پڑھ کر ایک سوال تو فوراً یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر 'اختیان' کے معنی خیانت کا ارادہ کرنے کے ہیں اور خیانت کا تصور و خیال کوئی بری بات نہیں ہے اور یہ آیت صحابۂ کرام کے مناقب کے ذیل میں آتی ہے تو پھر تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ کے ساتھ ہی ساتھ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ

جو ٹکڑا ہے اس کا مفہوم و معنی کیا ہوگا ؟ پھر دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ النساء کی آیت ولا تجادل
ن الذین یختانون انفسہم کے معنی کیا ہوں گے ؟ تیسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان صحیح احادیث کا
کیا بنے گا جن میں صحابہ کرام رضوان اللہ تعالے علیہم اجمعین کی لغزش کا ذکر آتا ہے ۔ کیا مفردات کے
ب بے دلیل قول کی بنیاد پر ان تمام چیزوں سے نظر پھیر لی جائے ؟ اگر کوئی فرقہ عمداً اس آیت کو
کر صحابہ کرام رض کے خلاف طعن و تشنیع کی مہم چلاتا ہے تو مولانا کے نزدیک بھی جواب کا صحیح طریقہ یہ نہ ہوگا
کہ ایک ایسی بات کہہ دی جائے جس کی تائید نہ قرآن کے استعمالات سے ہوتی ہے' نہ احادیث سے' نہ عربی
نات سے اور نہ تراجم و تفاسیر سے' صرف ایک امام لغت کے بے دلیل قول کی وجہ سے ان تمام چیزوں
سے صرف نظر کرنا مضحکہ خیز ہوگا ۔

آیت لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ کے سلسلے میں کتاب الطراز کے حوالے سے جو بات
لی گئی ہے اس میں بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کے استعمالات اس فرق کی تائید نہیں کرتے جو صاحب الطراز
نے کسب و اکتساب کے درمیان بیان کیا ہے ۔ قرآن میں کسب کا لفظ خیر و ثواب کے لیے بھی استعمال ہوا ہے
ور شر و گناہ کے لیے بھی ۔ یہی حال لفظ اکتساب کا ہے ۔

ص۲۲ پر ایک سخت غلطی غالباً کاتب سے ہو گئی ہے ۔ سیداً وحصوراً والی آیت حضرت زکریا علیہ السلام
کے بارے میں نہیں ان کے بیٹے حضرت یحییٰ علیہ السلام کے بارے میں ہے ۔ (ع ۔ ق)

شرائط ایجنسی

(۱) ایجنسی کم سے کم ۵ رسائل پر دی جائے گی ۔

(۲) ۔/۵ ایڈوانس جمع کرنے ہوں گے ۔

(۳) ۵ سے ۵۰ پرچوں تک ۲۵٪ کمیشن دیا جائے گا ۔ البتہ ۵۰ سے زائد رسالوں پر کمیشن ۳۳٪ دیا جائیگا

(۴) رسائل کی روانگی کا خرچ دفتر برداشت کرے گا ۔ رجسٹری اور وی پی کا خرچ ایجنٹ صاحبان کے ذمہ ہوگا

(۵) ہر ماہ کا بل باقاعدگی سے ادا کرنا چاہیے ۔

مینیجر "زندگی" رام پور ۔ یوپی

بقیہ اشارات

بھی اور کوئی عجب نہیں کہ وہ ہزاروں کی سرحد کو بھی چھو رہی ہو۔ ایسی حالت میں اتنے وسیع پیمانے کی گرفتاریوں کی تعبیر کے لیے چند کا لفظ استعمال کرنا حقیقت کا منہ چڑانے کے مترادف ہے لیکن غالباً وہ اور ان کے ساتھ وزیر اعلیٰ صاحب بھی اس کے لیے معذور سمجھے جا سکتے ہیں کیونکہ بالانشینوں کو نیچے کی سطح کی باتیں بآسانی معلوم بھی نہیں ہو سکتی ہیں بالخصوص جب کہ ہوا یہ ہے کہ جنگ کے موقع پر گرفتاریوں کا پورا اختیار پولس والوں کو دے دیا گیا تھا اور انھوں نے جس من مانے طریقے سے چاہا ہے گرفتاریاں کی ہیں اور یہ ناواقفیت کچھ مہاراشٹر ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، مجھے تو ایک دوسرے صوبے میں بھی اس کا ذاتی تجربہ ہوا ہے کہ وہاں کے سب سے بڑے ذمہ دار نے یہ بات بڑے اعتماد کے ساتھ کہی تھی کہ ان کے یہاں سے سو سے زیادہ مسلمان گرفتار نہیں ہیں لیکن بعد میں خود ان کے استفسار پر ایک متعلقہ افسر نے ان کی تعداد پانچ سو سے بھی زیادہ بتائی اور وہ بھی اس طرح کہ غالباً وہ بھی اس تعداد کے صحیح ہونے کے بارے میں پوری طرح مطمئن نہ تھے۔ ان کا لب و لہجہ صاف بتا رہا تھا کہ یہ تعداد اس سے بھی زیادہ ہو سکتی ہے ۔

خیر یہ ناواقفیت کچھ زیادہ عجیب بات نہیں ہے لیکن ہمیں اس کا افسوس ہے کہ یہ وزیر صاحب مسلمانوں کی عام گرفتاریوں کے وقت تو ایک لفظ بھی زبان پر نہ لا سکے اور اب جب کہ ان میں سے اکثر رہا ہو چکے ہیں اس وقت بھی وہ خود اپنی طرف سے تو ان گرفتاریوں پر کچھ کہنے کی جرأت نہیں کر سکے ہیں البتہ وزیر اعلیٰ کے بارے میں یہ فرمانا انھوں نے ضروری سمجھا ہے کہ انھیں ان گرفتاریوں سے بڑی تشویش رہی ہے اور وہ یہ ظاہر کر کے غالباً اپنی جگہ مطمئن ہو گئے ہوں گے کہ اس سے مسلمانوں کی کافی سے زیادہ تسلی و تشفی ہو جائے گی لیکن انہیں خود سوچنا چاہیے کہ کیا محض وزیر اعلیٰ کی تشویش تسلی و تشفی کے لیے کافی ہو سکتی ہے ۔

وزیر اعلیٰ اپنے صوبے کا سب سے بڑا با اختیار فرد ہونے کے ساتھ اپنے شہریوں کے بنیادی حقوق کا نگراں و پاسبان بھی ہوتا ہے اس لیے تشویش کے ساتھ اسے خود اپنے اطمینان کے لیے بھی اس کے ازالے کی باقاعدہ کوشش کرنی چاہیے تھی اور وہ اس سلسلے میں کچھ کرنا چاہتے تو بہت کچھ کر سکتے تھے۔

رہی یہ بات کہ پولیس یا خود کچھ غیر ذمہ دار مسلمانوں نے مسلمانوں کو گرفتار کرانے کے لیے غلط رپورٹ

دی تھیں تو ان انکشافات کی حیثیت عذر گناہ بدتر از گناہ سے زیادہ نہیں ہے ۔ ہم یہ مانتے ۔ لیے تیار ہیں کہ حکومت کے ذمہ داروں کو پولس کی رپورٹوں پر بہت کچھ تکیہ کرنا پڑتا ہے کیونکہ وہی ان کی معلومات کا ذریعہ ہیں لیکن کیا ان کا فرض یہ بھی ہے کہ وہ ہر حال میں آنکھیں بند کرکے ان پر اعتماد کرلیں یا اس سے آگے انہیں اپنی من مانی کرنے کے لیے کھلی چھٹی دے دی جائے جیسا کہ جنگ کے موقع پر ہو چکا ہے ۔ پولیس میں بلاشبہ ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے فرائض ذمہ داری کے ساتھ ادا کرتے ہیں لیکن وہ اس بات سے ناواقف نہیں ہو سکتے کہ پولیس کا عام عملہ کتنا فرض شناس ہے اور ان کی فرض شناسی کتنی معمولی معمولی باتوں سے متاثر ہو جایا کرتی ہے ۔ دور جانے کی بھی ضرورت نہیں یہ ذمہ دار حضرات خود اپنے مستقر میں چل پھر کر کچھ تحقیق کرنے کی زحمت گوارا کریں تو انہیں پولس کی کارکردگی اور فرض شناسی کے سلسلے میں نہایت عجیب، حیرت انگیز اور افسوسناک انکشافات سے دوچار ہونا پڑے گا ۔

اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ پولیس کی رپورٹ کو بے گناہ شہریوں کی گرفتاری کے لیے عذر بنانے کی بجائے خود اس کو درست کرنے کی کوشش کی جائے اور آئندہ ان کی ہمت افزائی چھوڑ کر ان کی غلط روی پر انہیں مناسب سزائیں بھی دی جائیں اور مشہور بات تو یہ ہے کہ بسا اوقات پولیس والے بھی جو کچھ کرتے ہیں اس میں اوپر والوں کا بھی اشارہ شامل ہوتا ہے اور جب ایسا ہو تو بے چارے پولیس والے ہی تنہا کیوں مورد الزام قرار دیے جائیں ۔ پھر تو پورے آوے ہی کو سنبھالنے کی ضرورت ہے اور مسلمانوں کے خلاف مسلمانوں کی شکایات بھی بجائے خود کتنی ہی افسوسناک کیوں نہ ہوں لیکن وہ بھی کسی درجے میں ان گرفتاریوں کے لیے کوئی صحیح عذر نہیں ہو سکتیں اور یہ بھی ایک طرح سے پولیس ہی کے کارناموں کا ایک جز ہے اس لیے اس کا علاج بھی اسی کے ساتھ اور اسی طریقے سے ہونا چاہیے ۔ ہم یہ سننے کے منتظر رہیں گے کہ غلط رپورٹوں یا شکایات کی بنا پر کتنے پولیس والوں یا مسلمانوں کے خلاف کچھ کارروائی کی گئی ہے اور اگر ایسا نہیں ہوا تو اس کے صاف معنی یہی ہوں گے کہ ہمارے ڈاکٹر ذکریا صاحب نے اپنے انکشافات کے ذریعے مسلمانوں کے زخم پر کوئی مرہم نہیں رکھا ہے بلکہ الٹے کچھ نمک ہی چھڑکا ہے ۔

ایک اور ضروری مسئلہ گرفتاریوں کے علاوہ یہاں ایک اور بات کا تذکرہ بھی ہم نہایت ضروری سمجھتے ہیں بلکہ یہ ہمارے نزدیک ان گرفتاریوں سے بھی زیادہ اہم مسئلہ ہے

کیونکہ اس کا تعلق مسلمانوں کی ایک عمومی شکایت سے ہے۔

جنگ کے موقع پر ان گرفتاریوں کے علاوہ بھی کچھ ایسی باتیں ہوتی رہی ہیں جن سے مسلمانوں کو بجا طور سے یہ شکایت ہوئی کہ ان کو خواہ مخواہ مشتبہ سمجھ کر ان کے ساتھ کچھ غریبت کا سلوک کیا جا رہا ہے اور اس کی بنا پر ان میں ایک خاص طرح کا احساس کہتری اور اپنے بارے میں عام لوگوں سے کچھ الگ اور مختلف ہونے کا خیال پیدا ہوا۔

پیرا ٹروپر کے جگہ جگہ اترنے کے جو افسانے مشہور کیے گئے اور اس کی بنا پر ہر مسلمان یا داڑھی والے کو پبلک کے ہاتھوں جو تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں اُن کا ہم یہاں کوئی تذکرہ نہیں کرنا چاہتے کہ اس کا تعلق زیادہ تر جاہل عوام سے ہے مگر اس موقع پر دیکھا گیا ہے کہ ذمہ داروں نے بھی عام طور سے مسلمانوں کے ساتھ اشتباہ ہی کا رویہ اختیار کیا۔ حد یہ ہے کہ مسلمانوں نے ملک کی دفاعی کوششوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہا، لیکن انہیں اس سے ہر طرح دور رکھنے کی کوشش کی گئی۔ ہمارے علم میں اس کی بھی متعین مثالیں ہیں کہ اس سلسلے کی پیش کشوں کو بہ لطائف حیل یا بعض اوقات نہایت کھردرے طور پر ٹھکرایا گیا ہے اور یہ باتیں ایسی حالت میں ہیں کہ مسلمانوں کی چھوٹی بڑی تمام جماعتوں نے کھلے طور سے اپنے تائیدی رویے کا اعلان کر دیا تھا اور خود ذمہ دار حضرات بھی اپنی تقریروں اور بیانات میں فخریہ اس کا اعتراف کرتے رہے ہیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ رویہ ہمارے کس ذہن کی ترجمانی کر رہا ہے اور اس سے کیا کیا بدتر نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔ بس اس سے زیادہ اس سلسلے میں ہم اس وقت کچھ عرض کرنا نہیں چاہتے۔ البتہ یہاں پھر اس بات کو دہرانا میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ہمارے لیے یہ بات قابل فخر ضرور ہے کہ یہاں ایک ایسا دستور نافذ ہے جس میں یہاں کے شہریوں کو مذہب و ملت کے کسی امتیاز کے بغیر بنیادی حقوق کی ضمانت دی گئی ہے لیکن یہ ضمانت ابھی زیادہ تر محض اوراق دستور کی زینت بنی ہوئی ہے اور ہم اپنی عملی زندگی میں اسے پوری طرح اپنا نہیں سکے ہیں اور سطور بالا میں جو باتیں بیان کی گئی ہیں وہ اس لحاظ سے ہماری آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہیں۔ کاش ہمارے ذمہ دار حضرات ان پر غور و فکر کرنے کی زحمت گوارا کر سکیں۔

اعلان ملکیت ماہنامہ زندگی رام پور

و دیگر تفصیلات فارم IV رول نمبر ۸

(۱) مقام اشاعت	دفتر زندگی، رام پور۔ یوپی
(۲) مدتِ اشاعت	ماہانہ
(۳) طابع	احمد حسن
وطنیت	ہندوستانی
پتہ	بازار کلاں، رام پور۔ یوپی
(۴) ناشر	احمد حسن
وطنیت	ہندوستانی
پتہ	بازار کلاں رام پور۔ یوپی
(۵) ایڈیٹر	سید احمد عروج قادری
وطنیت	ہندوستانی
پتہ	گھیر سیف الدین خاں رام پور۔ یوپی
مالک کا نام و پتہ	جماعت اسلامی ہند رام پور۔ یوپی

میں تصدیق کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے بہترین علم و یقین کی حد تک صحیح ہیں۔

احمد حسن

صحت کا توازن...
جاڑوں میں ماء اللحم خاص کا استعمال
قوت و توانائی بخشتا ہے۔ اس کے صحت بخش
اجزا آپ کے رگ و پٹھوں میں سرایت
ہو کر نئی جان ڈالتے اور چستی پیدا کرتے ہیں۔
ماء اللحم خاص
غذائیت اور توانائی سے بھرپور بہترین ٹانک
دواخانہ طبیہ کالج
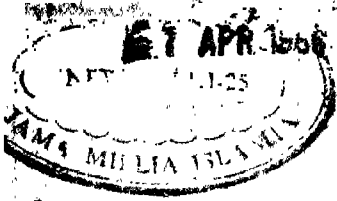
ذی الحجہ ۱۳۸۵ھ
اپریل ۱۹۶۶ء

جلد:- ۳۶
شمارہ:- ۴

زندگی

مدیر:- سید احمد قادری

● خط وکتابت وارسال زر کا پتہ — منیجر زندگی۔ رام پور۔ یوپی
● زرِ سالانہ:- چھ روپیہ۔ ششماہی:- تین روپیہ۔ فی پرچہ:- ۶۰ پیسے
● ممالک غیر سے بارہ شلنگ۔ انٹرنیشنل پوسٹل آرڈر

مالک: جماعت اسلامی ہند۔ ایڈیٹر: سید احمد قادری۔ پرنٹر پبلشر: محمد حسن۔ مطبع: دلی پرنٹنگ [illegible]

مقام اشاعت: دفتر زندگی رامپور یوپی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

مولینا ابو اللیث صاحب اصلاحی

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ مسلمان اس ملک کے باقاعدہ شہری ہیں اور اس پر ان کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا یہاں کے دوسرے باشندوں کا۔ اور اس بات سے بھی انکار نا ممکن ہے کہ یہ ملک اس وقت تک ترقی کے راستے پر آگے نہیں بڑھ سکتا جب تک کہ اکثریت کے ساتھ یہاں کی اقلیتوں کو بھی آگے بڑھانے اور انھیں ساتھ لے کر چلنے کی کوشش نہ کی جائے اور یہاں کا کوئی طبقہ اپنے کو مظلوم سمجھ رہا ہو اور اس کی بنا پر وہ یاس و اضطراب اور اضمحلال دل شکستگی کا شکار ہو رہا ہو تو یہ بات صرف اس طبقے ہی کے مستقبل کے لیے تباہ کن نہ ہوگی بلکہ اس سے بحیثیت مجموعی پورے ملک کا مستقبل متاثر ہوگا۔ چنانچہ اسی بنا پر ہم ایک لمحے کے لیے اسے جائز نہیں سمجھتے کہ مسلمانوں کو حکومت یا اکثریت سے کوئی شکایت پیدا ہو تو وہ احساس کہتری میں مبتلا ہو کر بیٹھ رہیں اور اس شکایت کو زبان پر نہ لائیں۔ انھیں کھل کر اس کا اظہار کرنا چاہیے اور اسے مناسب طور سے دور کرانے کی پوری پوری کوشش بھی عمل میں لانی چاہیے۔

ہمارے یہی احساسات ہیں جن کی بنا پر ہم نے ضروری سمجھا تھا کہ جنگ کے دوران میں مسلمانوں کے ساتھ جو زیادتیاں ہوئی ہیں اپنے ایک مقالے میں جو گزشتہ اشاعت میں شائع ہو چکا ہے ان پر تفصیل و صفائی کے ساتھ گفتگو کریں اور اس سے پہلے بھی بلکہ عین جنگ کے ہنگامی دور میں بھی ہم ایسی باتوں پر کھل کر گفتگو کرتے اور حکومت اور اکثریت کو ان کی طرف متوجہ کرنے کا فرض انجام دیتے رہے ہیں۔

لیکن ہمارے نزدیک جہاں یہ بات ضروری ہے کہ مسلمان اپنی شکایات حکومت اور اکثریت کے علم میں لائیں اور ان کے مناسب تدارک کی طرف انہیں متوجہ کریں وہیں یہ بات بھی نہایت ضروری ہے کہ وہ دوسروں

کی شکایت یا ملامت سے پہلے خود اپنا بھی محاسبہ کریں اور پوری سنجیدگی کے ساتھ اس بات کا جائزہ لیں کہ ان قابلِ شکایت امور کے سلسلے میں ہم خود کس حد تک قصوروار ہیں۔ یہ ایک نہایت تلخ حقیقت ہے کہ بہت سی باتیں جن کے سلسلے میں مسلمان دوسروں کے شاکی ہیں ان کے لیے وہ خود کچھ کم مستحقِ ملامت نہیں، بلکہ اگر وہ کچھ گہری نظر سے جائزہ لیں تو بہت سے معاملات میں حکومت یا اکثریت کے قابلِ شکایت رویے کے حقیقی ذمہ دار بڑی حد تک وہ خود ہیں۔

ان گرفتاریوں ہی کے مسئلے کو لے لیجیے۔ مسلمان ان کے سلسلے میں حکومت سے شکوہ کرنے میں ہر طرح حق بجانب ہیں اور حکومت کو ہرگز اس کا حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اس کی ذمہ داریوں میں دوسروں کو شریک کرکے خود کو بری الذمہ قرار دے کیونکہ ان کی آخری ذمہ داری بہرحال اسی پر عائد ہوتی ہے لیکن ہمارے لیے مسئلے کا یہ پہلو یقیناً بہت زیادہ غور طلب ہے کہ ان گرفتاریوں میں خود مسلمانوں کا اپنا کتنا ہاتھ رہا ہے۔ مجھے گزشتہ چند ماہ کے عرصے میں بہار اور مہاراشٹر کے بہت سے مقامات پر جانے کا اتفاق ہوا ہے اور میں نے تقریباً ہر جگہ لوگوں کو اس کا شاکی پایا ہے کہ خود مسلمانوں نے مسلمانوں کو گرفتار کرانے کے لیے حکام تک خبریں گھڑ گھڑ کر پہنچائی ہیں اور اس سلسلے میں وہ متعین طور سے لوگوں کے نام بھی لیتے رہے ہیں اور خاص طور سے مہاراشٹر کے بارے میں تو وہاں کے ایک وزیر کی زبان سے بھی آپ سن چکے ہیں کہ مسلمانوں کی گرفتاریوں کے لیے خود مسلمانوں نے نہایت ناروا حرکتیں کی ہیں۔

یہ ہو سکتا ہے کہ یہ شکایات تمام تر صحیح نہ ہوں اور اس میں بھی مسلمانوں کے باہمی اختلافات اور رنجشوں یا بدگمانیوں کو بھی بڑا دخل ہو اور یہ بات بھی ممکن ہے کہ مہاراشٹر کے ان وزیر صاحب نے اپنی حکومت کے سر سے الزام ہلکا کرنے کے لیے اس نکتہ کو کچھ بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہو لیکن مسلمانوں کی موجودہ عام روش کو دیکھتے ہوئے یہ شکایات سرے سے بے اصل بھی قرار نہیں دی جا سکتی ہیں۔ مسلمانوں کی شاید ہی کوئی ایسی بستی ہو جہاں چھوٹے بڑے مذہبی، سیاسی یا خاندانی اختلافات اور جھگڑے نہ پائے جاتے ہوں اور تقریباً ہر جگہ یہ دیکھنے میں آرہا ہے کہ معمولی معمولی اختلافات بھی اکثر شدید باہمی جنگ و جدال کا پیش خیمہ بن جاتے ہیں اور لوگ ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کے لیے ہر جائز و ناجائز طریقے بے تکلف اختیار کرنے لگتے ہیں پھر اس پر تعجب کیوں ہو کہ جنگ کے زمانے میں اسے ایک موقع غنیمت سمجھتے ہوئے ایک دوسرے سے دشمنی نکالنے کی بھی پوری کوشش کی گئی ہو جس کا اس وقت نفسیاتی طور سے فضا بھی کچھ ایسی بن گئی تھی کہ ایسی حرکتیں کرنے والے

عقول سے کچھ داد پانے کے بھی متوقع ہو سکتے تھے اور عام لوگوں کی بات تو جانے دیجیے جنگ کے زمانے ہی میں اور گرفتاریوں کے عین شباب کے وقت بعض اچھے خاصے ذمہ دار حضرات کی طرف سے ایسے بیانات شائع ہوئے ہیں جن سے حکومت یا اکثریت کو خواہ مخواہ بہت سے مسلمانوں کے بارے میں شکوک اور بدگمانیاں پیدا ہو سکتی تھیں، ہمارے سامنے اس کی متعدد مثالیں ہیں لیکن ہم بالقصد یہاں ان کا تذکرہ کرنا نہیں چاہتے البتہ ایک خاص واقعہ جو پہلے ہی سے لوگوں کے علم میں ہے اور جو ایک عرصے تک اخبارات کا موضوع بحث بھی رہ چکا ہے بطور مثال یہاں پیش کرتے ہیں۔

ایک صوبے کی وزارت میں اتفاق سے دو مسلمان وزیر ہیں جن کے بارے میں مشہور ہے کہ ان کے بھی تعلقات اچھے نہیں ہیں اس لیے دونوں میں نوک جھونک بھی چلتی رہتی ہے۔ یہ نوک جھونک پہلے تو غالباً ان کے مخصوص دائروں ہی تک محدود تھی لیکن اب نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ ان میں سے ایک صاحب نے عین جنگ کے زمانے میں علانیہ ایک ایسی بات کہہ ڈالی جس کا صاف مفہوم یہی سمجھا گیا کہ وہ اپنے س دوسرے ساتھی کو پاکستان یا صدر ایوب کا ایجنٹ قرار دے رہے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ جو لوگ ن دونوں کے تعلقات کی موجودہ نوعیت سے واقف ہوں گے وہ تو اس بیان کو ان کی باہمی رنجش یا کدورت ہی کا نتیجہ قرار دیں گے اور یوں بھی کوئی شخص بآسانی یہ باور نہیں کر سکتا کہ صدر ایوب کا کوئی ایجنٹ ہندوستان میں کسی کابینہ کا رکن بن سکتا ہے جب کہ کوئی مسلمان تو خاص طور سے بڑی چھان پھٹک کے بعد ہی اس کا مستحق قرار پاتا ہے اور کسی وزیر کے بارے میں اس طرح کی بدگمانی کو دل میں جگہ دینا تو درحقیقت ایک طرح سے خود اس کو وزیر بنانے والوں ہی کے بارے میں پاکستانی ہونے کی بدگمانی کرنے کے ہم معنی ہے لیکن جن لوگوں کی نگاہ دونوں کے تعلقات کے اس پس منظر پر نہ ہوگی یا جو لوگ ایک مسلمان کے بارے میں بے تکی سے بے تکی بدگمانیوں کے لیے گویا تیار ہی بیٹھے رہتے ہیں وہ تو اس "انکشاف" کو ایک امر واقعہ ہی کے طور پر تسلیم کر لیں گے۔ خاص طور سے اس لیے بھی کہ الزام لگانے والے ایک ذمہ دار وزیر بھی ہیں اور ساتھ ہی ایک مسلمان بھی جو اپنے دوسرے ساتھی مسلمان کے حالات سے قدرتاً زیادہ واقف سمجھے جا سکتے ہیں اور ہندوستان میں پاکستانی ایجنٹوں کی موجودگی کی گونج پوری فضا پر چھائی ہوئی بھی ہے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ جب ایک مسلمان وزیر کے بارے میں یہ شبہہ ذہنوں میں جگہ پائے کہ وہ پاکستان کا ایجنٹ ہے تو کیا اس کا نقصان محض اس کی ذات تک محدود

رہے گا' یا اس کی لپیٹ میں الزام لگانے والے حضرت سمیت سارے ہی مسلمان وزیر گورنر وغیرہ اور اس سے بھی آگے عام مسلمان آسکتے ہیں۔ کیا اس کے بعد ان سب کے بارے میں ایسی ہی بدگمانیوں کا دروازہ کھل نہیں جائے گا۔

یہ مثال ایک فرد کی طرف سے دوسرے فرد کی شکایت کی ہوئی جس سے بالواسطہ طور پر عام مسلمانوں کا مفاد بھی مجروح ہوتا ہے لیکن جنگ کے زمانے میں مسلم جماعتوں یا ان میں سے کچھ کو بدنام کرنے کی مہم بھی پوری سرگرمی کے ساتھ جاری رہی ہے اور اس مہم میں حصہ لینے والے بڑے بڑے ذمہ دار حضرات رہے ہیں اور کچھ اخبارات نے جن کے ایڈیٹر خیر سے مسلمان ہی ہیں یہ خدمت اس زمانے میں بہت ذوق شوق کے ساتھ انجام دی ہے جس سے اخبار بیں طبقہ بخوبی واقف ہے اس لیے اس کی مثالیں پیش کرنا یہاں غیر ضروری ہے۔

اس ضمن میں اس بات کو بھی دھیان میں رکھنے کی ضرورت ہے کہ اس پہلو سے صرف وہی باتیں ہمارے لیے اہم نہیں ہو سکتیں جو مسلمانوں نے مسلمانوں یا ان کی جماعتوں کے بارے میں کہی یا لکھی ہیں بلکہ اس سے پہلے ایک دوسرے کو خواہ مخواہ بدنام کرنے کی جو باتیں ہوتی رہی ہیں ان کو بھی نگاہ میں رکھنے کی ضرورت ہے کیونکہ وہ چاہے کتنی ہی پرانی کیوں نہ ہو چکی ہوں حکومت اور اکثریت کے ذہن پر وہ اپنے کچھ نقوش قائم کر چکی ہیں جن کے اثرات روزمرہ کی زندگی میں برابر نمایاں ہوتے رہتے ہیں اور جنگ کا زمانہ تو انہیں اپنا اثر دکھانے کے لیے گویا موسم بہار کی حیثیت رکھتا تھا کیونکہ وہ شبہات کے فروغ پانے کا ایک خاص زمانہ ہوتا ہے اور ایک معمولی بات بھی ہوا نظر آنے لگتی ہے۔

آیئے' اس بات کو ذہن میں رکھ کر ہم اس موقعہ پر ماضی بعید کی نہیں بلکہ جنگ سے کچھ ہی دنوں پہلے کی یاد تازہ کرلیں۔

ایک مسلمان نے جو پہلے وزیر بھی رہ چکے ہیں جنگ شروع ہونے سے کچھ قبل شاید کسی پبلک جلسہ میں یہ ارشاد فرمایا تھا اور ان کا یہ ارشاد بہت سے اخبارات میں موٹی موٹی سرخیوں کے ساتھ شائع ہوا تھا کہ ہندوستان کے پچانوے فی صد کھاتے پیتے تعلیم یافتہ مسلمان پاکستانی ہیں۔

یہ صاحب بھی اسی صوبہ سے تعلق رکھتے ہیں جس کے ایک مسلمان وزیر کے ایک قول کا جواب دوسرے نیق وزارت کے بارے میں تھا اوپر دیا جا چکا ہے اور مشہور بات یہ ہے کہ یہ دونوں وہاں کے گروپ بندیوں میں ایک ہی گروپ سے تعلق رکھنے والے اور حضرات میں ایک دوسرے کی تائید کرنے والے میں سے ہیں

لیے کچھ عجب نہیں کہ یہ دونوں قول باہم ایک دوسرے کے متن اور شرح یا اجمال اور تفصیل کی حیثیت رکھتے ہوں لیکن یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ یہ دوسرا قول اپنے اثرات کے لحاظ سے پہلے قول سے زیادہ بھاری ہے کیونکہ پہلے قول سے عام مسلمانوں کا پاکستانی ہونا کچھ بالواسطہ طور پر لازم آتا تھا اور اس میں واشگاف طور سے ان کی اکثریت کو پاکستانی قرار دے دیا گیا ہے۔

ایک اور ان سے بڑے وزیر ہیں جو خود کو مسلمان کہلانا بھی شاید پسند نہیں کرتے لیکن دن رات مسلمانوں کو نصیحتیں کرنا ان کا خاص دلچسپ مشغلہ ہے۔ وہ عرصے سے مسلمانوں کو ملکی دھارے سے الگ رہنے کے طعنے دے دے کر ان کے بارے میں یہ سوءِ ظن تو پیدا کر ہی رہے تھے کہ وہ ہندوستان میں رہ کر بھی صحیح معنوں میں ہندوستانی نہیں ہیں لیکن مسلم یونیورسٹی علیگڈھ میں اتفاقاً طلبا کی طرف سے ایک ایسے مسئلے پر کچھ گڑبڑ ہوئی جس کا کوئی تعلق پاکستان سے تو کیا مخصوص طور سے مسلمانوں سے بھی نہیں تھا لیکن ان صاحب کی وزارت کی طرف سے یہ بیان شائع ہو گیا کہ مسلم یونیورسٹی پاکستانیوں کا اڈہ ہے۔ مسلم یونیورسٹی واقعی اب تک مسلمانوں کے مرکز اعصاب کی حیثیت رکھتی ہے اور اسی بنا پر وہ غیر مسلموں کی بھی مرکز توجہ ہے اس لیے ہر شخص اس کا بخوبی اندازہ کر سکتا ہے کہ ایک ذمہ دار کی زبان سے اس کی یہ تعریف مسلمانوں کے لیے کن نتائج کی موجب ہو سکتی ہے۔ یہ ضرور ہوا ہے کہ اس بیان کے شائع ہونے کے بہت دنوں بعد وزیر موصوف نے اس سے اپنی بے تعلقی کا اظہار فرمایا ہے لیکن اس کا علم بہت تھوڑے ہی لوگوں کو ہو سکا ہوگا اور اس پہلے بیان کے جو اثرات ہو سکتے تھے وہ ہو کر رہے اور اب بھی اس کا سلسلہ منقطع نہیں ہو سکا ہے۔

جہاں تک جماعتوں کو بدنام کرنے کا تعلق ہے اس کی مہم بھی جنگ سے پہلے بہت باقاعدگی کے ساتھ جاری رہی ہے اور یہ مہم چلانے والے خود اپنے ہی لوگ رہے ہیں ان میں کچھ لوگ تو ایسے ہیں جو اپنا رشتہ اسلام اور مسلمانوں سے توڑ کر کسی اور ازم یا ازم والوں سے جوڑ چکے ہیں اور مصلحتاً اپنے کو مسلمان ظاہر کر رہے ہیں۔ اس لیے ایسے لوگوں کو تو اسلام اور مسلمانوں سے تعلق رکھنے والا کوئی بھی ادارہ یا جماعت پسند نہیں ہے اور وہ بلا استثنا سب کو ہی دن رات مطعون کرتے رہتے ہیں اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو مختلف جماعتوں کے الگ الگ اصول و نظریات میں سے کچھ سے دلچسپی اور کچھ سے اختلاف رکھتے ہیں اور ان کی اس دلچسپی اور اختلاف کا مظاہرہ اس شکل میں ہو رہا ہے کہ جن جماعتوں سے وہ اختلاف رکھتے ہیں ان کا کریا دھرتا تک بھی ان کو گوارا نہیں ہے اور زیادہ حیرت اور افسوس کی بات یہ ہے کہ ان مختلف جماعتوں سے تعلق رکھنے والے

بہت سے لوگ بھی اس بارے میں کچھ ایسی ہی روش پر گامزن ہیں۔ ان اختلافات کا منشا اگر صحیح ہوتا اور وہ اس کے مسلمہ حدود کے پابند ہوتے تو ان پر کسی کو بھی اعتراض نہیں ہو سکتا تھا خود ہمارے نزدیک ہر اختلاف غلط نہیں ہے بلکہ ہم بہت سے حالات میں اختلاف کو ناگزیر بھی سمجھتے ہیں چنانچہ جماعت اسلامی کا قیام بجائے خود اس وقت کی موجودہ تمام جماعتوں سے ایک طرح سے اپنے اختلاف کے اظہار ہی کے ہم معنی ہے اور ہم ناگزیر حالات میں ان پر تنقید بھی کرتے رہتے ہیں لیکن اختلاف اور مخالفت میں جو فرق ہے اور اختلاف کے جو جائز اور ناجائز حدود ہو سکتے ہیں وہ بہر حال سب کے ذہن میں ہونا چاہییں اور ہماری گفتگو اس کے اسی پہلو پر ہے۔

جماعت اسلامی پر اپنوں کی جو مہربانیاں ہیں ان کا تذکرہ بھی یہاں کیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ بہر حال ایک مسلم جماعت ہے اور اس بنا پر اس کے خلاف جو باتیں کہی جائیں گی وہ بالواسطہ مسلمانوں ہی سے متعلق سمجھی جائیں گی اور ان کی بنیاد پر ان کے بارے میں بھی غیر مسلم کم و بیش وہی رائے قائم کریں گے جو وہ جماعت کے بارے میں قائم کر سکتے ہیں لیکن ہم بالقصد اس وقت اسے نظر انداز کرتے ہیں کیونکہ ایک طرح سے وہ ہمارا اپنا ایک ذاتی معاملہ ہے اور بحمد اللہ اپنی حد تک ہمیں نہ اس پر کوئی خاص پریشانی ہے اور نہ ہم اسے اپنے لیے کوئی غیر متوقع بات سمجھتے ہیں۔ ہماری دعوت کی نوعیت ہی کچھ ایسی ہے کہ اس سے بہت سے لوگوں کے مفادات مجروح ہوتے ہیں اور بہتوں کے لیے بس یہی بات اس کی مخالفت کے لیے کافی عذر بن جاتی ہے اور چونکہ معقولیت کے دائرے میں رہ کر اس کا مقابلہ کرنا کوئی آسان بات نہیں ہے اس لیے وہ اس کے خلاف الزام تراشیوں کا سہارا لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ جماعت کے روز اول سے برابر قائم ہے اسی بنا پر روز نئے نئے پہلوان اپنے کرتب دکھانے کے لیے مخالفت کے میدان میں اترتے رہتے ہیں لیکن اللہ کا شکر ہے کہ ان مخالفتوں کے باوجود جماعت اپنی جگہ موجود ہے بلکہ اس کا قدم آگے ہی بڑھ رہا ہے اور ہمیں تو اس کی بھی ایک طرح خوشی ہی ہے کہ آج بہت سے لوگ اس کی مخالفت کر کے کچھ روزی روزگار یا کچھ اونچی بارگاہوں میں تقرب حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہو رہے ہیں کیونکہ یہ بھی ایک طرح سے جماعت کی دعوت کے مؤثر و مقبول ہونے ہی کی ایک دلیل ہے۔

بہر حال جماعت کی مخالفتوں کو ہم اپنا ایک الگ معاملہ سمجھتے ہوئے ہم پر چھوڑیں اور آپ یہ دیکھیں کہ مسلمانوں کی دوسری جماعتوں کے ساتھ اپنوں کا معاملہ کیا رہا ہے۔

مسلم لیگ مسلمانوں کی ایک پرانی جماعت ہے لیکن اس وقت کی مسلم لیگ تقسیم کے پہلے کی مسلم لیگ سے

مختلف ہو چکی ہے کہ بجز نام کے شاید دونوں میں کوئی مشترک بات نہیں ہے اور غالباً اسی بنا پر خود کانگریس کو بھی انتخابات کے موقع پر اس کے ساتھ اشتراک کرنے میں کوئی حرج محسوس نہیں ہوتا لیکن اس کے وجود اس کی فرقہ پرستی کا ڈھنڈورا پیٹنے میں خود مسلمان غیر مسلموں سے پیش پیش ہیں۔ جب الیکشن کے موقع پر کانگریس اور مسلم لیگ میں اتحاد ہوا تھا تو اس پر سب سے زیادہ شور مچانے والے مسلمان ہی تھے اور انہوں نے اس شور میں زور پیدا کرنے کے لیے اس کا حلیہ بگاڑنے کی انتہائی پوری پوری کوشش کی تھی اور یہ تو روزمرہ کی بات ہے کہ ایک مسلمان نے کسی دوسرے مسلمان کو بدنام کرنا چاہا یا اسے بدنام کرکے کسی سرکاری عہدے سے اسے علیحدہ کرانے کا ارادہ کیا تو جھٹ سے اسے مسلم لیگی قرار دے دیا۔ گویا مسلم لیگی ہونا واقعی تمام عیوب میں سب سے بڑا عیب ہے اور جب مسلمان خود ہی ایک بات کو عیب قرار دینے لگیں تو دوسروں سے اس کے بارے میں کیا شکوہ ہو سکتا ہے۔

مسلمانوں کی ایک جماعت جمعیۃ علماء ہے اس کی ہمیشہ سے یہ روش رہی ہے کہ ملکی معاملات میں کانگریس کا ساتھ دیتی رہی ہے اور تقسیم سے پہلے اس کے لیڈروں نے آزادیٔ وطن کے لیے بڑی تکلیفیں بھی اٹھائی ہیں لیکن ابھی کچھ ہی عرصہ پہلے کی بات ہے کہ جبل پور وغیرہ کے فسادات کے بعد جمعیۃ نے مسلمانوں کا ایک کنونشن بلانے کا ارادہ کیا تو وہ بھی فرقہ پرستی وغیرہ کے طعنوں سے مطعون کی جانے لگی اور طعنہ دینے والے زیادہ تر مسلمان ہی تھے۔

مسلمانوں کی ایک نئی جماعت مسلم مجلس مشاورت ہے جو زیادہ تر فسادات کی روک تھام اور فرقہ وارانہ اتحاد و یک جہتی کے قیام کے لیے وجود میں آئی ہے اور اس میں مسلمانوں کی دیگر تمام جماعتوں کے افراد کے ساتھ خود کانگریس کے متعدد نہایت ممتاز افراد شامل ہیں لیکن اس کی مخالفت کرنے اور اس کے خلاف فرقہ پرستی وغیرہ کے الزامات لگانے میں بھی سب سے پیش پیش مسلمان ہی ہیں اور کچھ اخبارات تو خاص اسی مقصد کے لیے نکالے ہی گئے ہیں کہ مسلم جماعتوں پر دن رات حملے کرکے انہیں بدنام کریں اور ایسے اخبارات اگرچہ مسلمانوں پر تو خیر کوئی اثر نہیں ڈال سکتے ہیں کیونکہ ان کا مقصد ان پر واضح ہے لیکن غیر مسلموں بالخصوص ان کے ان حلقوں میں جو مسلمانوں کو بدنام کرنے والی باتوں کی ہر وقت تلاش میں رہتے ہیں اپنا خاصا اثر ڈال رہے ہیں۔ غرض وہ مسلمان ہی ہیں جو ہر جماعت کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہوئے ہیں اور تلخ تر حقیقت یہ ہے کہ ان جماعتوں کے افراد خود بھی اکثر ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کے درپے رہا کرتے ہیں اور پچھلے دنوں

تو یہ بھی ہو چکا ہے کہ مسلمانوں سے متعلق مشترک مسائل پر غور کرنے کے لیے مشترکہ کنونشن کے نام پر ایک جماعت کے افراد کنونشن بلاتے ہیں تو بھی کچھ مخصوص لیبل لگا کر ان جماعتوں میں سے کچھ کو بلایا جاتا ہے اور کچھ کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور یہ سب باتیں ایسی حالت میں ہوتی رہی ہیں کہ ایک طرف آپ جس سے بھی بات کریں حالات کی نزاکت و سنگینی کے اظہار میں وہ سب سے آگے نظر آئے گا اور دوسری طرف وہ اس اعتراف میں بھی کسی سے پیچھے نہ ہوگا کہ وہ سب اس امت مسلمہ کے فرد ہیں جس کو واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا کا سبق دیا گیا ہے اور جسے اختلاف و دشمنی کے وقت بھی عدل و انصاف پر قائم رہنے کی ہدایت ملی ہے ۔

یا ایہا الذین آمنوا کونوا قوامین شہداء بالقسط ولا یجرمنکم شنان قوم علی ان لا تعدلوا اعدلوا ہو اقرب للتقوی واتقوا اللہ ان اللہ خبیر بما تعملون ۔ (اے ایمان لانے والو اللہ کے لیے (انصاف پر) مضبوطی کے ساتھ قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو اور (دیکھو) ایسا نہ ہو کہ کسی گروہ کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ کر دے کہ تم انصاف کو چھوڑ دو انصاف کرو یہی تقوے سے لگتی ہوئی بات ہے اور اللہ سے ڈرو بے شک اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے آگاہ ہے) اور جس کا ہر فرد اپنے دوسرے بھائیوں کے جان و مال عزت آبرو کا گویا امین ہے ۔

المسلم من سلم المسلمون	مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ
من لسانہ ویدہ	سے مسلمان محفوظ ہوں

اور جس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری حج کے موقعہ پر تلقین فرمائی تھی کہ ۔

ان دمائکم واموالکم و	بے شک تمہارا خون تمہارا مال اور
اعراضکم علیکم حرام کحرمۃ	تمہاری عزت تمہارے لیے محترم ہے جس طرح
یومکم ہذا فی بلدکم ہذا فی	تمہارا یہ دن محترم ہے تمہارے اس شہر میں
شہرکم ہذا	اور تمہارے اس مہینے میں

سوچنے کی بات ہے کہ جب ہمارا خود اپنا حال یہ ہو چکا ہو تو اپنے چند سو چند ہزار افراد کی بے گرفتاری تو پھر بھی معمولی بات ہے اس سے بھی بدتر حالات کا ہم شکار ہوں تو یہ کوئی تعجب انگیز بات نہ ہوگی ۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ہر شر سے محفوظ رکھے ۔

مُعاملات

(مولانا محمد یوسف اصلاحی)

انسانی معاملات میں جائز و ناجائز کے حدود مقرر کرنا اور حلال و حرام کے احکام دینا خدا ہی کا حق ہے اور اس حق میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ توحید کا ایک پہلو یہ ہے کہ عبادت خالص خدا کی ہو اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ معاملات میں صرف اسی کے احکام و قوانین کو تسلیم کیا جائے۔ قرآن نہ صرف یہ کہ جملہ معاملات کے لیے واضح قوانین دیتا ہے بلکہ ان کی پیروی کو ایمان کی کسوٹی قرار دیتا ہے۔

قانون حلال و حرام خدا ہی کا حق ہے

اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِيَعْبُدُوْا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ (التوبۃ ۳۱)

انھوں نے اپنے علما اور مشائخ کو اللہ کے سوا اپنا رب بنایا ہے اور اسی طرح مریم کے بیٹے عیسیٰ (علیہ السلام) کو بھی۔ حالانکہ ان کو جو حکم دیا گیا تھا وہ اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ ایک ہی خدا کی بندگی کرو۔ اس کے سوا کوئی بندگی کے لائق نہیں۔ پاک ہے وہ ان مشرکانہ باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔

حضرت عدی بن حاتمؓ پہلے عیسائی تھے جب اسلام لائے تو آپ نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک سوال یہ بھی کیا کہ یا رسول اللہ عیسائیوں کے بارے میں یہ جو الزام ہے کہ انھوں نے اپنے علما اور مشائخ کو اپنا رب بنالیا تھا۔ اس کی حقیقت کیا ہے؟ حضورؐ نے فرمایا۔ جس کو حلال کہہ دیتے تم حلال مان لیتے جس کو حرام کہہ دیتے تم حرام مان لیتے، بس یہی ان کو اپنا رب بنالینا ہے۔ یعنی حلال و حرام کا حکم دینا

ہی کا حق ہے اور کسی دوسرے کو یہ حق دینا اس کو رب قرار دینا ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحَرِّمُوا طَيِّبَاتِ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكُمْ (المائدہ-۸۷)

اے مومنو! جو پاک چیزیں اللہ نے تمہارے لیے حلال کی ہیں انہیں حرام نہ کرلو۔

یعنی حلال و حرام کے مختار تم خود نہ بنو۔ حلال وہی ہے جسے خدا نے حلال قرار دیا ہے اور حرام وہی ہے جسے خدا حرام قرار دے۔

قرآن کا نظریہ حلال و حرام

يَسْأَلُونَكَ مَاذَا أُحِلَّ لَهُمْ قُلْ أُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبَاتُ (المائدہ-۴)

لوگ آپ سے معلوم کرتے ہیں کہ کیا کیا ان کے لیے حلال کیا گیا ہے۔ ان سے فرما دیجیے کہ تمہارے لیے ساری پاک چیزیں حلال کردی گئی ہیں

یعنی خدا نے انسان کے لیے وہ تمام ہی چیزیں حلال رکھی ہیں جو پاک ہیں اور انسانی اخلاق پر اچھے اثرات ڈالنے والی ہیں اور صرف ان ہی چیزوں کو حرام قرار دیا ہے جو اپنے اخلاقی نتائج کے اعتبار سے انسان کے لیے ناپسندیدہ ہیں اور طبعاً ناپاک ہیں۔ آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی امتیازی علامات واضح کرتے ہوئے بھی قرآن نے وضاحت کی ہے کہ وہ ان کے لیے پاک چیزیں حلال کریں گے اور ناپاک چیزیں حرام فرمائیں گے۔

حرام جانور

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيحَةُ وَمَا أَكَلَ السَّبُعُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ (المائدہ-۳)

تم پر حرام کیا گیا مُردار، خون، سؤر کا گوشت، وہ جانور جو خدا کے سوا کسی اور نام پر ذبح کیا گیا ہو اور وہ جو گلا گھونٹ کر مر جائے اور وہ جو چوٹ کھا کر مر جائے اور وہ جو بلندی سے گر کر مر جائے اور وہ جو ٹکر کھا کر مر جائے اور وہ بھی حرام ہے جسے درندے پھاڑ کر کھا جائیں سوائے اس کے جس کو تم نے زندہ پاکر ذبح کرلیا اور وہ جو کسی آستانے پر ذبح کیا گیا ہو

بے حیائی کے کام

قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ

اے رسول! کہہ دیجیے کہ میرے رب نے تو صرف یہ چیزیں حرام ٹھہرائی ہیں بے حیائی کے

مَاظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ (الاعراف - ٣٣)

کے سارے کام خواہ کھلے طور پر کیے جائیں یا چھپا کر کیے جائیں گناہ اور ناحق کی زیادتی ۔

زنا بدترین جرم

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَا اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّسَاءَ سَبِيْلًا (بنی اسرائیل ٣٢)

اور زنا کے قریب بھی نہ پھٹکو حقیقت یہ ہے کہ وہ سراسر بے حیائی ہے اور بدترین راستہ ہے ۔

"زنا کے قریب نہ پھٹکو" اس مؤثر انداز بیان کا مطلب یہ ہے کہ بے حیائی کے ان تمام کاموں سے سختی کے ساتھ بچو جو شہوانی جذبات میں ہیجان پیدا کرنے والی اور زنا کے قریب لے جانے والی ہوں فحش لٹریچر، ناچ گانے، ننگی تصویریں، مرد و زن کا آزادانہ اختلاط، شراب، سینما یہ سب زنا کے محرکات اور اسباب ہیں ـــــ زنا سے بچنے کے لیے لازمی ہے کہ آدمی ان چیزوں سے بھی دور رہے۔

پھر اس حکم کے مخاطب افراد بھی ہیں اور مسلم معاشرہ بھی ۔ معاشرے کا یہ فرض ہے کہ وہ تعلیم و تربیت اور اجتماعی قوت کے ذریعے زنا کے تمام محرکات اور اسباب کا سدباب کرے اور کسی بھی ایسی حرکت کو معاشرے میں برداشت نہ کرے جو اخلاقی آوارگی کا سبب بنتی ہو ۔

زنا کی سزا

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَّلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (النور ٢)

زانی عورت اور زانی مرد دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو اور خدا کے دین کے معاملے میں ان پر ترس کھانے کا جذبہ تم کو دامن گیر نہ ہو اگر تم خدا اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہو اور ان کی سزا کے وقت مسلمانوں کا ایک گروہ موجود رہے [1]

شراب اور جوا

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ

اے مومنو! شراب اور جوا اور آستانے اور پانسے یہ گندے شیطانی کام ہیں ۔ ان سے

[1] سنت رسول کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں یہ مذکور سزا صرف اس زانی یا زانیہ کی ہے جو غیر شادی شدہ ہو ۔ شادی شدہ مسلمان اگر اس جرم کا ارتکاب کرے تو اس کو سنگسار کیا جائے گا تفصیل کے لیے حدیث اور فقہ کا مطالعہ کیجیے ۔

وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ بچے رہو، تاکہ تمہیں فلاح نصیب ہو۔

یہ شراب کی حرمت کا آخری اور قطعی حکم ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "خدا نے لعنت فرمائی ہے شراب پر اور شراب پینے والے پر، پلانے والے پر اور بیچنے والے پر اور خریدنے والے پر اور کشید کرنے والے پر اور کشید کرانے والے پر اور ڈھو کر لے جانے والے پر اور اس شخص پر جس کے لیے ڈھو کر لے جائی گئی ہو"

قتل و غارت

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَکُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْکُمْ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَکُمْ اِنَّ اللّٰهَ کَانَ بِکُمْ رَحِیْمًا ۝ (النساء ۲۹)	مومنو! آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤ۔ ہاں یہ کہ آپس کی رضامندی سے تجارتی لین دین ہو، اور آپس میں ایک دوسرے کو قتل نہ کرو، یقین مانو کہ خدا تمہارے اوپر مہربان ہے۔

باطل طریقوں سے مراد چوری، دغا، فریب، رشوت، سود، لوٹ مار وغیرہ تمام ہی وہ طریقے ہیں جن میں باہمی رضامندی اور مفاد و منافع کے معروف طریقوں کے بغیر دوسرے کے مال پر قبضہ کیا جائے یا اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔

ایک دوسرے کو قتل نہ کرو۔ ایک دوسرے کو قتل کرنا دراصل خود کو قتل کرنا ہے جس کا انجام دنیا میں مسلمانوں کی قومی ہلاکت، تمدنی تباہی اور اخلاقی زوال ہے اور آخرت میں بھڑکتے جہنم کی سخت ترین سزا ہے۔

چوری کی سزا

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَیْدِیَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا کَسَبَا نَکَالًا مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ ۝ (المائدہ ۳۸)	اور چوری کرنے والا مرد ہو یا عورت ان دونوں کے ہاتھ کاٹ دو۔ یہ ان کے کیے ہوئے جرم کا بدلہ ہے اور خدا کی طرف سے عبرتناک سزا اور خدا غالب اور حکمت والا ہے۔

یعنی چور کا ایک ہاتھ کاٹ دیا جائے اور امت کا اس پر اتفاق ہے کہ پہلی چوری میں سیدھا ہاتھ کاٹا جائے گا[1]

توبہ کی تلقین

فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ	پھر جو شخص ظلم کرنے کے بعد توبہ کرلے اور

[1] مزید تفصیلات کے لیے فقہ کی طرف رجوع کیا جائے۔

ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (المائدہ ۔ ۳۹)

اپنی اصلاح کرے، تو خدا کی نظر رحمت اس پر پھر لوٹ آئے گی اور وہ بہت درگذر کرنے والا اور بڑا ہی مہربان ہے۔

ہاتھ کاٹنے کی سزا بلاشبہ بڑی ہی سخت اور عبرتناک سزا ہے لیکن چوری کے گھناؤنے جذبات اور اثرات سے دل کو پاک کرنے کے لیے محض یہ سزا ہی کافی نہیں اس کے لیے ضروری ہے کہ ایسا شخص اپنے کیے پر شرمسار ہو اور دل سے توبہ کرکے ہمیشہ کے لیے اس جرم سے باز رہنے کا عزم کرے اور اپنی زندگی کو سنوارنے میں لگ جائے۔ پھر خدا بھی اس کو اپنی رحمت کے سایے میں لے لیگا۔ اور اس کے لیے نیکی کی راہ اپنی رحمت سے آسان بنا دے گا۔

قتل سے باز رہو

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ

اور اس نفس کو قتل نہ کرو جس کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے مگر حق کے ساتھ

انسانی نفس کو خدا نے محترم بنایا ہے اور اس کو صرف انہی صورتوں میں ہلاک کرنا صحیح ہے جن صورتوں میں ہلاک کرنے کی خدا نے اجازت دی ہے۔

پھر نہ صرف یہ کہ دوسرے کے نفس کو قتل کرنا ہی حرام ہے بلکہ خود اپنے نفس کو ہلاک کرنا اور خودکشی کرنا بدترین جرم ہے۔

دراصل انسانی جان خدا ہی کی ملکیت ہے اور اس نے اس کو محترم قرار دیا ہے اس کو ہلاک کرنا تو درکنار انسان کے لیے تو یہ بھی جائز نہیں کہ وہ اس کو بے جا استعمال کرے۔ جان اور اس کی قوتیں دراصل انسان کے پاس ایک امانت ہیں۔

ایک قتل ساری انسانیت کا قتل ہے

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا (المائدہ ۳۲)

جس شخص نے کسی کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے ناحق قتل کیا تو اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کردیا اور جس نے کسی کو زندگی بخشی اس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخش دی

ایک شخص اگر کسی کو ناحق قتل کرتا ہے تو وہ دراصل انسانی جان کے احترام اور جذبۂ ہمدردی

کو ختم کرتا ہے اور یہ واقعی پوری نوعِ انسانی کا قتل ہے۔ اسی طرح اگر کوئی ایک شخص کی جان بچاتا ہے تو وہ احترام جان اور انسانی ہمدردی کے جذبے کو زندہ کرتا ہے اور یہ پوری انسانیت کی حیات و بقا کا کام ہے۔

مومن کا کام نہیں کہ مومن کو قتل کرے

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَنْ يَقْتُلَ مُؤْمِنًا (النساء)

اور کسی مومن کا کام نہیں کہ کسی مومن کو قتل کرے

قتل مومن کی ہولناک سزا

وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا (النساء ۹۳)

اور جو شخص جان بوجھ کر کسی مومن کو قتل کرے تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہے اور اللہ نے اس کے لیے سخت عذاب مہیا کر رکھا ہے۔

قصاص

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى (البقرۃ ۱۷۸)

مومنو! تمہارے لیے مقتولین کے معاملہ میں قصاص کا حکم لکھ دیا گیا ہے۔

یعنی قتل کے مقدموں میں تمہارے لیے یہ حکم دیا جاتا ہے کہ خون کے بدلے خون لو اور قتل کے جرم میں قاتل کو قتل کی سزا دو۔

قصاص کی حکمت

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (البقرۃ ۱۷۹)

اور اے عقل و خرد والو! قصاص کے حکم میں تمہاری زندگی ہے تاکہ تم (عام خونریزی سے) بچے رہو

معاشرے کو قتل جیسے سنگین جرم سے بچانے اور جان کا احترام پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ قاتل کو قتل کی عبرتناک سزا دی جائے۔ اس ایک قتل میں دراصل نوع انسانی کی زندگی ہے۔

قصاص کو معاف کر دینے کا حق

سورۃ البقرہ کی آیت ۱۷۸ میں قصاص کی نوعیت بیان کرنے کے بعد مقتول کے ولی کو اس بات کا حق دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو قاتل سے قصاص لینے کو معاف کر دے اور خوں بہا لینے پر راضی ہو جائے۔ یہ حق عطا کرنے کے بعد ہوا ہے:

ذٰلِكَ تَخْفِيفٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ — یہ تمہارے رب کی طرف سے تخفیف اور رحمت ہے

ایسے حالات ہوسکتے ہیں کہ قاتل کو قتل کرنے کے بجائے قاتل سے خون بہا لے کر اس کو معاف کر دینا اخلاقی حیثیت سے بھی اور دوسری حیثیتوں سے بھی مقتول کے خاندان کے لیے زیادہ مفید اور قرین مصلحت ہو اس لیے اسلامی قانون تعزیرات میں قتل کے معاملے کو قابل راضی نامہ رکھا گیا ہے۔

انفرادی ملکیت کا تحفظ

وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ (البقرہ ۱۸۸)

(مسلمانو!) تم نہ تو آپس میں ایک دوسرے کے مال ناروا طریقے سے کھاؤ اور نہ حاکموں کے آگے ان کو اس غرض کے لیے پیش کرو کہ تمہیں دوسرے کے مال کا کوئی حصہ جان بوجھ کر ظالمانہ طریقے سے کھانے کا موقع مل جائے۔

قرآن کے نزدیک ہر شخص کی دولت جائداد اور ملکیت پوری طرح محفوظ ہے اور کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ اسے انفرادی ملکیت کے اس حق سے محروم کر دے۔ دھوکہ، دھڑلی، دھاندلی، خیانت، چوری، رہزنی، جوا، سود وغیرہ سے دوسروں کا مال ہتھیانا یا حاکموں کو رشوتوں سے پرچا کر یا عدالتوں میں جھوٹی سفارشیں، جھوٹی گواہیاں اور جھوٹے مقدمات لے جاکر دوسروں کے مال پر قبضہ جمانا بدترین جرم اور سراسر حرام خوری ہے ــــ اسی طرح کسی اقتدار کو یہ بھی یہ حق حاصل نہیں کہ وہ جبر و اکراہ یا قانونی دباؤ سے کسی کو حق ملکیت سے محروم کرکے اس کی ملکیت کو سرکاری ملکیت میں تبدیل کرے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔" میں بہر حال ایک انسان ہی تو ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ تم ایک مقدمہ میرے پاس لاؤ اور تم میں سے ایک فریق دوسرے کے مقابلے میں زیادہ چرب زبان ہو اور اس کے دلائل سن کر میں اس کے حق میں فیصلہ کر دوں۔ مگر یہ سمجھ لو کہ اگر اس طرح اپنے کسی بھائی کے حق میں سے تم میرے فیصلے کے ذریعے کچھ حاصل کرو گے تو دراصل تم دوزخ کا ایک ٹکڑا حاصل کرو گے

سود کی حرمت

وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا (البقرہ ۲۷۵)

اور خدا نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (آل عمران ۱۳۰)

مومنو! یہ بڑھتا چڑھتا سود کھانا چھوڑ دو اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ

ربا یعنی سود سے مراد وہ طے شدہ زائد رقم ہے جو ایک قرض دینے والا اپنے مقروض سے اصل رقم کے علاوہ کسی بھی مقررہ مدت کے بعد وصول کرتا ہے۔ قرآن صاف اور صریح الفاظ میں اس کو قطعی حرام قرار دیتا ہے۔ اور اس کو حلال کہنے والوں کو لرزہ خیز انجام کی وعید سناتا ہے[1]

سود کو حلال کہنے والے کا حشر

اَلَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا کَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا (البقرہ: ۲۷۵)

جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ نہیں اٹھیں گے مگر اس شخص کے مانند جس کو شیطان نے اپنی چھوت سے باؤلا بنا دیا ہو۔ یہ اس وجہ سے کہ انھوں نے کہا تجارت بھی تو سود ہی کی طرح ہے۔ درآں حالیکہ تجارت کو خدا نے حلال ٹھیرایا ہے اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔

شیطان کی چھوت لگنے سے مراد یہ ہے کہ ان کی عقل اور دماغ پر شیطان پوری طرح چھا گیا ہے اور یہ لوگ آسیب زدہ شخص کی طرح بالکل ہی پاگل اور دیوانے ہو گئے۔ نہ انہیں یہ احساس ہے کہ ان کی اس حد سے بڑھی ہوئی زرپرستی کس طرح انسانی سوسائٹی کو تباہ کر رہی ہے اور نہ انہیں اس کا شعور ہے کہ خدا کے خلاف ان کی اس باغیانہ روش کا نتیجہ قیامت میں کیا نکلنے والا ہے

سود خواروں کا دائمی ٹھکانا

وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ (البقرہ ۲۷۵)

اور جو پھر بھی کریں تو ایسے لوگ جہنمی ہیں اور جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔

یعنی سود کی حرمت کا صریح اور قطعی حکم آجانے کے بعد بھی جو لوگ سود کھاتے رہیں تو ایسے باغیوں اور مفسدوں کا دائمی ٹھکانا جہنم ہے۔

سود خواروں کے خلاف خدا کا اعلان جنگ

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ○ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ

ایمان والو! خدا سے ڈرتے رہو، اور جو سود تمہارا لوگوں پر باقی رہ گیا ہے اس کو چھوڑ دو، اگر تم واقعی مومن ہو لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا تو خبردار ہو جاؤ کہ خدا اور اس کے رسول کی طرف سے

[1] سود کا ...

رَسُوْلِهٖ (البقرہ: ۲۷۸، ۲۷۹) تمہارے خلاف اعلان جنگ ہے۔

یعنی اسلامی مملکت کے حدود میں جو لوگ سودی کاروبار جاری رکھیں وہ درحقیقت خدا کے باغی ہیں اور وہ اپنے عمل سے خدا کے قانون کو چیلنج کر رہے ہیں۔ ان کا یہ عمل فوجداری جرم ہے اور اسلامی مملکت ایسے لوگوں کو ہرگز اپنے درمیان برداشت نہ کرے گی۔

مقروض کے ساتھ نرمی کی تاکید

وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ۭ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (البقرہ: ۲۸۰)

اور اگر مقروض تنگ دست ہو تو ہاتھ کھلنے تک اس کو مہلت دے دو، اور اگر تم سمجھ سے کام لو تو تمہارے حق میں زیادہ بہتر یہ ہے کہ ایسے مقروض کو قرض خیرات میں بخش دو۔

جو شخص سودی قرضہ لے چکا ہے اگر وہ تنگ دست اور نادار ہے۔ تو اس کو اتنی مہلت دے دینی چاہیے کہ جب اس کا ہاتھ کھلے تو وہ اصل رقم واپس کر دے اور اگر قرض دینے والا عالی ظرفی سے کام لے کر اصل رقم بھی اس کو بخش دے۔ تو یہ اس کے حق میں اور بہتر اور آخرت میں اجر و ثواب کا باعث ہوگا آیت ایک طرف تو تاکید کرتی ہے کہ نا داروں کے ساتھ نرمی اور فیاضی کا برتاؤ کرنا چاہیے۔ دوسری طرف اس سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ دور رسالت میں سودی قرضے لینے والے صرف محتاج اور نادار لوگ ہی نہ تھے، بلکہ خوش حال لوگ بھی اپنی تجارتوں کو فروغ دینے کے لیے سودی قرضے لیتے تھے دور حاضر کے ایک ممتاز مفسر نے آج سے تقریباً ۵۰ سال پہلے اس آیت کے ذیل میں لکھا تھا۔ ان الفاظ سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ اہل عرب خوش حالوں سے بھی سود لیتے تھے۔ پھر قریش تاجر تھے اور سودی بیوپار ان میں رائج تھا۔

قرض کے لیے دستاویز لکھوانا

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ (البقرہ: ۲۸۲)

ایمان والو! جب کسی مقررہ مدت کے لیے تم آپس میں قرض کا لین دین کرو تو لکھا پڑھی کر لیا کرو۔

یعنی قرض کی مدت بھی متعین ہونی چاہیے۔ اور دستاویز بھی لکھی جانی چاہیے۔ معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا۔

دستاویز کے کاتب کو ہدایت

وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَنْ يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللَّهُ فَلْيَكْتُبْ (البقرۃ: ۲۸۲)

اور کاغذ نویس کو چاہیے کہ فریقین کے درمیان انصاف کے ساتھ دستاویز تحریر کرے اور جس کو اللہ نے لکھنے کی صلاحیت سے نوازا ہے اس کو چاہیے کہ اس کام سے انکار نہ کرے۔

کاغذ قرض لینے والا لکھوائے

وَلْيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئًا فَإِنْ كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا أَوْ ضَعِيفًا أَوْ لَا يَسْتَطِيعُ أَنْ يُمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهُ بِالْعَدْلِ

اور املا اس شخص کو کرانا چاہیے جس پر حق آتا ہے اور اسے خدا، اپنے رب کا خوف رکھنا چاہیے کہ معاملہ میں کوئی کمی نہ کرے لیکن اگر قرض لینے والا خود ناسمجھ یا کمزور ہو یا خود بول کر مضمون لکھوانے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو تو اس کے ولی کو چاہیے کہ انصاف کے ساتھ کاغذ لکھوا دے۔

دستاویز پر گواہیاں

وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ رِجَالِكُمْ فَإِنْ لَمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ أَنْ تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَى (البقرۃ: ۲۸۲)

اور اپنے مردوں میں سے دو آدمیوں کی اس پر گواہیاں کرا لو۔ اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں، جن کو تم گواہی کے لیے پسند کرو تاکہ اگر ایک بہک جائے تو دوسری اس کو یاد دہانی کرا دے۔

"اپنے مردوں میں سے" یعنی یہ کہ گواہ مسلمان ہوں اور مسلمان معاشرے میں اپنی سیرت و اخلاق اور دیانت کے اعتبار سے جانے پہچانے اور قابل اعتماد ہوں۔

گواہوں کا فرض

وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دُعُوا (البقرۃ)

اور گواہوں کو جب بھی گواہی کے لیے طلب کیا جائے تو انہیں انکار نہ کرنا چاہیے۔

یعنی مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ جب بھی انہیں کسی معاملہ میں بحیثیت گواہ طلب کیا جائے تو وہ انکار نہ کریں گواہی دینا ان کا منصبی فریضہ ہے۔ حق کی شہادت کے لیے خدا نے انہیں اٹھایا ہے۔

دستاویز لکھوانے کی حکمت

وَلَا تَسْئَمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا (البقرہ: ۲۸۲)

اور میعاد کے ساتھ دستاویز لکھوانے میں تساہل نہ کرو چاہے معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا خدا کے نزدیک یہ بات زیادہ قرین انصاف ہے اس سے شہادت قائم کرنے میں زیادہ سہولت ہے اور تمہارے شکوک و شبہات میں مبتلا ہونے کا اندیشہ کم سے کم رہ جاتا ہے۔

نقد خرید و فروخت میں دستاویز ضروری نہیں

اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا (البقرہ: ۲۸۲)

ہاں جو تجارتی لین دین تم لوگ دست بدست کرتے ہو۔ اس کا کاغذ نہ لکھنے میں کوئی حرج نہیں۔

یعنی نقد خرید و فروخت دستاویز لکھوانے بغیر بھی کی جا سکتی ہے۔

البتہ گواہ ضروری ہے

وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۪

اور گواہ کر لیا کرو جب آپس میں تجارتی لین دین کرو۔

گواہ اور کاتب کو ستایا نہ جائے

وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ؕ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ

اور کاتب اور گواہ کو ستایا نہ جائے ایسا کرو گے تو گناہ کا ارتکاب کرو گے۔

یعنی ایسے طریقے اختیار نہ کرو کہ کاتب کاغذ لکھتے ہوئے گھبرانے لگے اور گواہ گواہی دینے سے بچنے لگے۔

گواہی چھپانا گناہ ہے

وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ (البقرہ: ۲۸۳)

اور گواہی نہ چھپاؤ اور جو شخص گواہی چھپاتا ہے۔ یقیناً اس کا دل گناہ گار ہوتا ہے۔ اور خدا تمہارے اعمال سے بخوبی واقف ہے۔

سود اور جوا ہر ملک میں حرام ہے

سید احمد قادری

بیمہ (انشورنس) کے بارے میں مجلس تحقیقات شرعیہ لکھنؤ نے جو فیصلہ کیا ہے وہ راقم الحروف کے نزدیک پوری طرح واضح اور اطمینان بخش نہیں ہے لیکن اس میں ایسی بھی کوئی واضح چیز موجود نہیں ہے جو ہمارے مسلمہ اصول کے خلاف ہو اس لیے ہم نے اپنے عدم اطمینان کے اظہار کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

اب دو ماہ کے بعد الفرقان لکھنؤ (فروری ۶۶ء) میں جناب مولانا محمد منظور نعمانی نے جو توضیح فرمائی ہے اور جس چیز پر مجلس کے اتفاق کا ذکر کیا ہے اس پر خاموشی صحیح نہیں ہے اس لیے ذیل میں چند باتیں عرض کر رہا ہوں۔ مناسب ہوگا کہ پہلے مجلس تحقیقات شرعیہ کا فیصلہ نقل کر دیا جائے اس کے بعد مولانا نعمانی کی توضیحات پر اظہار خیال کیا جائے۔ ۲۵ دسمبر ۶۵ء کے تعمیر حیات لکھنؤ میں جو فیصلہ شائع ہوا ہے وہ بلفظہ یہ ہے۔

بیمہ کے مسئلے کے متعلق مجلس تحقیقات شرعیہ کا فیصلہ

"مجلس تحقیقات شرعیہ نے اپنے اجتماع مورخہ ۱۵-۱۶ دسمبر ۱۹۶۵ء میں انشورنس کے مسئلے پر علماء کرام کے ان جوابات کی روشنی میں غور کیا جو مجلس کے سوالنامے کے پیش نظر ان حضرات نے تحریر فرمائے تھے۔ اس غور و خوض کے بعد مجلس جس نتیجے پر پہنچی ہے وہ ایک مختصر تمہید کے ساتھ درج ذیل ہے۔

انشورنس کا مسئلہ شریعت کے شعبۂ معاملات سے تعلق رکھتا ہے۔ معاملات میں ہمیشہ دو فریق ہوتے ہیں اس لیے اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔

اول:۔ دونوں فریق مسلمان ہوں۔ اس صورت میں معاملات کی جو شکلیں شریعت اسلامیہ نے مقرر کی ہیں ان کے علاوہ کسی شکل کا اختیار کرنا کسی حال میں جائز نہیں ہے۔

دوم :- ایک فریق مسلمان ہو دوسرا غیر مسلم ہو۔

صورت دوم میں دو شکلیں نکلتی ہیں۔

(الف) معاملے کی شکل مقرر کرنا مسلمان کے اختیار میں ہو۔ اس کا حکم بھی وہی ہے جو اولیٰ کا ہے۔

(ب) معاملے کی شکل مقرر کرنا اس کے اختیار میں نہ ہو۔

صورت ثانیہ کی شکل (ب) میں وقت ضرورت اسلام کے بعض جلیل القدر ائمۂ فقہاء کے قول کی بنا پر شرعًا اس کی گنجائش نکلتی ہے کہ مسلمان کچھ قیود و شرائط کے ساتھ اس نوع کے معاملات میں حصہ لے سکے۔

انشورنس کا مسئلہ بھی مجلس کے نزدیک اسی شکل کے تحت داخل ہے۔

مجلس یہ رائے رکھتی ہے کہ اگرچہ انشورنس کی سب شکلوں کے لیے ربوٰ و قمار لازم ہے اور ایک کلمہ گو کے لیے ہر حال میں اسلامی اصول پر قائم رہنے کی کوشش کرنا ہی واجب ہے لیکن جان و مال کے تحفظ کا جو مقام شریعت اسلامیہ میں ہے مجلس اسے بھی وزن دیتی ہے۔ نیز مجلس اس صورت حال سے بھی صرف نظر نہیں کر سکتی کہ موجودہ دور میں نہ صرف ملکی بلکہ بین الاقوامی راستوں سے انشورنس انسانی زندگی میں اس طرح دخیل ہو گیا ہے کہ اس کے بغیر اجتماعی اور کاروباری زندگی میں طرح طرح کی دشواریاں پیش آتی ہیں اور جان و مال کے تحفظ کے لیے بھی بعض حالات میں اس سے مفر ممکن نہیں ہوتا۔ اس لیے ضرورت شدیدہ کے پیش نظر اگر کوئی شخص اپنی زندگی یا اپنے مال یا اپنی جائداد کا بیمہ کرائے تو مذکورہ بالا ائمۂ کرام کے قول کی بنا پر شرعًا اس کی گنجائش ہے۔

تنبیہ :- اوپر کی عبارت میں لفظ ضرورت شدیدہ سے مراد یہ ہے کہ جان یا اہل و عیال یا مال کے ناقابل برداشت نقصان کا اندیشۂ قوی ہو۔ ضرورت شدیدہ موجود ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ مجلس کے نزدیک مبتلیٰ بہ کی رائے پر منحصر ہے جو خود کو عند اللہ جواب دہ سمجھ کر علماء کے مشورے سے قائم کرے۔ (۱)

(۱) اس فیصلہ کے نیچے دس علماء کے نام شائع کیے گئے ہیں۔ جناب مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی، جناب مولانا محمد ظفیر الدین صاحب دار العلوم دیوبند، جناب مولانا ابو اللیث صاحب ندوی، جناب مولانا محمد رضا صاحب فرنگی محلی

(باقی اگلے صفحہ پر)

اس فیصلے میں یہ بات صاف طور سے کہی گئی ہے کہ صرف ایک صورت میں کسی مسلمان کے لیے اس کی گنجائش ہے کہ وہ انشورنس کا معاملہ کر سکے اور وہ یہ ہے کہ دوسرا فریق غیر مسلم ہو اور معاملہ کی شکل مقرر کرنا مسلمان کے اختیار میں بھی نہ ہو پھر اس کی گنجائش کو بھی ضرورت شدیدہ کے ساتھ مقید کیا گیا ہے اور جس کو یہ ضرورت شدیدہ پیش آئے اس کو تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ اپنا فیصلہ علماء کے مشورے سے قائم کرے۔

یہ بات ایسی نہ تھی جس پر کسی تشویش کا اظہار ضروری ہوتا کیونکہ اضطرار یا "ضرورت" کی بنا پر رخصت کسی ملک کے ساتھ مخصوص و مقید نہیں ہے۔ اگر بھوک سے کسی مسلمان کی جان نکل رہی ہو اور کوئی حلال غذا موجود نہ ہو تو اس کو حرام غذا کھا لینے کی رخصت حاصل ہے۔ عام از یں کہ وہ دار الحرب کا باشندہ ہو یا دار الاسلام کا۔

مولانا محمد منظور نعمانی صاحب کی توضیح نے مسئلے کی نوعیت بالکل بدل کر رکھ دی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ مجلس کے سوال نامے کے جواب میں علماء کے دو مسلک سامنے آئے۔ کچھ علماء نے بیمہ کی تمام شکلوں کو ہر حال میں ناجائز اور قطعی حرام قرار دیا اور لکھا کہ بیمہ اپنی اصل حقیقت کے لحاظ سے ربوٰ بھی ہے اور قمار بھی اور شرعی نقطۂ نظر سے اس میں اور بھی مفاسد ہیں اس لیے کسی شکل اور کسی حال میں اس کے جواز کی گنجائش نہیں ہے۔ دوسرے اکثر حضرات نے بیمہ کو اصلاً ناجائز ہی قرار دیا لیکن اس کے ساتھ ان حضرات نے یہ بھی لکھا کہ امام اعظم ابو حنیفہ اور امام محمد بن حسن کی تحقیق یہ ہے کہ ربوٰ و قمار جیسے عقود فاسدہ کی حرمت کا حکم دار الاسلام میں ہے۔ جو علاقے دار الاسلام نہ ہوں ان میں ایک مسلمان غیر مسلموں کے ساتھ اس طرح کے معاملات اگر کرے تو وہ اگرچہ صورت میں ربوٰ یا قمار ہے لیکن حقیقت میں ربوٰ یا قمار نہیں ہے اس بنا پر ان علاقوں میں اس طرح کے معاملات ان دونوں اماموں کی تحقیق کی بنا پر ناجائز نہیں ہیں۔ اس لیے ایسے علاقوں کے جو لوگ اپنی املاک وغیرہ کے تحفظ کے لیے اپنے مخصوص حالات میں بیمہ کو ناگزیر سمجھیں ان کے لیے اس مسلک کی بنا پر گنجائش ہے۔ مولانا نعمانی لکھتے ہیں کہ مجلس نے اسی دوسرے مسلک پر اتفاق کیا۔ مولانا کے الفاظ یہ ہیں:-

---

(بقیہ حاشیہ) جناب مولانا شاہ معین الدین صاحب ندوی۔ جناب مولانا فخر الحسن صاحب استاذ دار العلوم دیوبند۔ جناب مولانا شاہ عون احمد صاحب قادری خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف۔ جناب مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی ندوی خانقاہ رحمانیہ مونگیر۔ جناب مولانا محمد اویس صاحب شیخ التفسیر دار العلوم ندوۃ العلماء۔ جناب مولانا محمد اسحاق صاحب کنوینر مجلس تحقیقات شرعیہ

۱۶ دسمبر ۶۵ء کو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مجلس تحقیقات شرعیہ کا اجلاس ہوا ارکان مجلس نے سوال نامہ کے موصولہ جوابات کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے غور و فکر اور باہمی مشاورت سے بنیادی طور پر اسی دوسرے مسلک پر اتفاق کیا جس کا حاصل یہی ہے کہ بیمہ جیسے عقود فاسدہ جن کی شکل ربوٰ اور قمار کی ہے ۔ شریعت اسلامی میں ان کو حرام قرار دیا گیا ہے اس لیے عام حالات میں ان سے احتراز ہی کرنا چاہیے مگر چونکہ متعدد ائمہ (امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ اور ایک حد تک امام مالک بھی) دارالاسلام سے باہر یعنی دارالحرب میں مسلم اور غیر مسلم کے درمیان ان عقود فاسدہ کو ربوٰ اور قمار ہی نہیں سمجھتے اور اس کی اجازت دیتے ہیں اس لیے جن حالات میں بیمہ کے بغیر عظیم نقصانات کا اندیشہ ہو تو دفعِ ضرر کے لیے ان ائمہ کے مسلک پر عمل کیا جا سکتا ہے ۔ فان الضرر مدفوع والضرورات تبیح المحذورات

(الفرقان، فروری ۶۶ء صفحہ)

اس بیان سے واضح ہوا کہ کم سے کم مجلس کے وہ ارکان جن کے نام شائع کیے گئے ہیں ۔ دارالحرب میں ربوٰ و قمار کے مسئلے میں امام ابوحنیفہ اور امام محمدؒ کی رائے کی تائید کرتے اور اسی کی بنیاد پر ہندستان میں مسلمانوں کے لیے بیمہ کی گنجائش کے مسلک پر متفق ہیں ۔ اس توضیح پر راقم الحروف کو تعجب ہوا ۔ اس لیے کہ بعض ارکان مجلس کے بارے میں یہ معلوم تھا کہ وہ ربوٰ و قمار کی حرمت کو دارالاسلام کے ساتھ مقید نہیں مانتے بلکہ جمہور علماء کی رائے کے مطابق وہ دارالحرب میں بھی اس کی حرمت کے قائل ہیں ۔ پھر اسی کے ساتھ اس بات نے بھی الجھن پیدا کی کہ بالفرض اگر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کو بنیاد مانا بھی جائے تو کیا مجلس تحقیقات شرعیہ نے ہندوستان کی حیثیت بھی طے کر لی اس لیے کہ حیثیت طے کیے بغیر اس مسلک کو بنیاد بنانا بے معنی ہے ۔ مجلس تحقیقات شرعیہ کے محترم کنوینر صاحب کو اپنی اولیں فرصت میں اصل صورت حال کو واضح کرنا چاہیے ۔ جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے مجلس تحقیقات نے ہندوستان کی حیثیت طے نہیں کی ہے اس لیے امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے مسلک کو بنیاد بنانے کے کوئی معنی نہیں ہیں ۔ اس کے علاوہ مولانا نعمانی کے بیان میں الضررُ مدفوعٌ اور الضروراتُ تبیحُ المحذورات کے قاعدوں کا بھی حوالہ ہے اور معلوم ہے کہ اضطرار کی بنا پر حرام شے کے استعمال کی رخصت دارالحرب کے ساتھ مقید نہیں ہے بلکہ الضروراتُ تبیحُ المحذورات کے تحت دارالاسلام میں بھی کسی ناجائز کے جواز کی گنجائش نکالی جا سکتی ہے ۔ اس لیے قرینہ یہی ہے کہ مجلس نے دارالحرب اور دارالاسلام کی بحث میں پڑے بغیر اسی قاعدے کو اپنے فیصلے کی بنیاد بنایا ہے

البتہ مجلس کے فیصلے میں بعض جلیل القدر ائمۂ فقہاء کا جو ذکر آیا ہے وہ اشتباہ پیدا کرتا ہے۔ اگر اس سے مراد امام ابوحنیفہ اور امام محمد ہیں اور ان کے قول سے مراد دارالحرب میں ربٰو و قمار سے متعلق ان کا مسلک ہے تو پھر اس کے معنی یہ ہیں کہ مجلس نے ہندوستان کی حیثیت طے کر کے اس مسلک کو بنیاد بنایا ہوگا۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ الضرر یزال اور الضرورات تبیح المحظورات کا قاعدہ موجود ہوتے ہوئے مجلس کو اس کی ضرورت کیا پڑی کہ دارالاسلام اور دارالحرب کی بحث چھیڑے اور امام ابوحنیفہ کے مسلک کو بنیاد بنائے ۔

مجھے اس وقت اس سے بحث نہیں کہ ہندوستان کی حیثیت کیا ہے۔ اس کی حیثیت جو کچھ بھی ہو میرے نزدیک ربٰو و قمار ہر ملک میں حرام قطعی ہے، وہ دارالحرب ہو یا دارالاسلام یا کچھ اور۔ اس مسئلے میں طرفین کا مسلک نہ صرف نصوص شرعیہ کے خلاف ہے بلکہ خود اصول فقہ حنفی کے مسلمات کے خلاف بھی ہے۔ اور یہ مسئلہ ایسا نہیں ہے کہ اس مسلک کی بنیاد پر کوئی فیصلہ یا کوئی فتویٰ میرے لیے قابل تسلیم ہو۔ خود مولانا نعمانی کو اس مسلک کے ضعف کا احساس ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:۔

ظاہر ہے کہ یہ رائے ان ائمۂ کرام نے جب ہی قائم کی ہوگی جب ان کے سامنے اس کی کوئی روشن اور قوی دلیل سامنے آئی ہوگی کیونکہ صرف قیاس اور اجتہاد سے کسی امام کے نزدیک بھی قرآن مجید کے ایسے قطعی، صریح اور مطلق احکام میں تخصیص و استثنا نہیں کیا جا سکتا ۔ ہوسکتا ہے یہ وہی دلائل ہوں جو مبسوط سرخسی وغیرہ میں امام ابوحنیفہ اور امام محمد کے مسلک کی تائید میں ذکر کیے گئے ہیں یا ان کے علاوہ اور دلائل ہوں۔ بہرحال ان ائمۂ کبار کا یہ فتویٰ بجائے خود اس کی دلیل ہے کہ انھوں نے کسی محکم دلیل کی بنیاد پر یہ رائے قائم کی ہے۔"

بعض اہل حدیث حضرات کی کسی کتاب میں راقم الحروف نے یہ پڑھا تھا کہ مقلدین کی سب سے بڑی دلیل ان کے امام کا مجرد قول ہوتا ہے۔ مولانا نعمانی کے اس بیان سے اس کی تھوڑی سی تصدیق ہوتی ہے۔ ایک طرف موجود نصوص شرعیہ کا یقین ہے اور دوسری طرف کسی ناموجود محکم دلیل کا احتمال ہے اور اس احتمال کی بنیاد پر یقین کو ترک کیا جا رہا ہے۔ قرآن مجید ہمارے ہاتھوں میں ہے اور احادیث کا اتنا بڑا ذخیرہ تلاش و تفحص کے بعد اب چھپ کر ہمارے سامنے آچکا ہے جو ہم سے پہلے کے لوگوں کے سامنے نہ تھا لیکن وہ محکم دلیل کہیں موجود نہیں۔ ممکن ہے وہ کسی ایسی کتاب میں ہو جو ابھی برآمد نہیں

ہوئی ہے ۔ مولانا نعمانی نے لکھا ہے کہ بیمہ کے مسئلے پر غور وفکر کے اثنا میں اوپر والی بات سامنے آئی تھی ۔ انھوں نے یہ نہیں لکھا کہ یہ بات کس نے کہی تھی اور یہ کہ مجلس کے ارکان نے اس کا کیا اثر لیا ۔ بہر حال کسی مسئلے پر غور وفکر کے وقت، مجلس تحقیقات شرعیہ کا ایسی باتوں پر دھیان دینا کوئی مسرت بخش خبر نہیں ہے ۔ جہاں تک اجتہادی مسائل واحکام کا تعلق ہے، امام اعظم اور امام محمد بن حسن رحمہما اللہ کا درجہ تو بہت بلند ہے ہم تو علامہ شامی جیسے متاخرین فقہاء کے مجرد اقوال پر بھی عمل کر لیتے ہیں لیکن جہاں نصوص قطعیہ کا معاملہ ہو وہاں بڑے سے بڑے امام کا بھی مجرد قول ہمارے لیے قابلِ قبول نہیں ہے ۔ یہ کہنا کہ ان کے پاس یقیناً کوئی محکم دلیل ہوگی ۔ عقیدت کا غلو' یا ائمہ کو معصوم عن الخطاء قرار دینے کے مترادف ہے ۔

متعدد علماء کے بارے میں غلط تاثر دینے کی کوشش

متعدد علماء کے نام لکھ کر مولانا نعمانی نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ جیسے یہ سب کے سب ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے بیمہ کو چند حدود وشرائط کے ساتھ جائز قرار دینے کے حامی ہیں ۔ حالانکہ صورت واقعہ یہ نہیں ہے ۔ کم سے کم مولانا ولی حسن صاحب اور مفتی محمد شفیع صاحب کے بارے میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ انھوں نے اپنے جواب میں یہ کہیں نہیں لکھا کہ ہندوستان دارالحرب ہے اور نہ یہاں امام ابوحنیفہ اور امام محمد کے مسلک کی بنیاد پر مسلمانوں کے لیے بیمہ کا معاملہ کرنے کی گنجائش ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مجلس کے مرتب کردہ سوالنامے میں ایسا کوئی سوال تھا ہی نہیں جو ہندستان کی حیثیت متعین کرنے سے متعلق ہو اس لیے میرا خیال ہے کہ شاید سوال نامے کے کسی مجیب نے بھی ہندوستان کی حیثیت کے بارے میں کچھ نہ لکھا ہوگا ۔ مفتی شفیع صاحب کا جواب ہم نے "بینات" کراچی سے لے کر "زندگی" میں بھی شائع کیا تھا ۔ مجلس کے سوال نامے میں سوال ۶ یہ تھا :۔

"اگر کوئی مسلمان کسی دارالحرب کا باشندہ ہو (مستامن نہیں) اور کمپنی حربیوں ہی کی ہو تو کیا اس صورت میں یہ معاملہ مسلمانوں کے لیے جائز ہوگا ۔"

اس سوال کا جواب مفتی شفیع صاحب نے یہ دیا ہے :۔

"اگر بیمہ کمپنی حربیوں کی ہے اور کوئی مسلمان اس کا حصہ دار نہیں ہے تو اس کی پالیسی لے کر کوئی نفع' خواہ ربوٰ کا خواہ حادثے کا مسئلہ مختلف فیہا (اختلافی) ہو جائے گا جو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تو جائز ہی ہے مگر دوسرے ائمہ اجازت نہیں دیتے ۔ حنفیہ کے مسلک میں

بھی جائز (جائز ہوتا) اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ کوئی مسلمان اس میں حصہ دار نہ ہو مگر عملاً ایسا ہونا شاذ و نادر ہی ہو سکتا ہے۔"

(زندگی ستمبر ۱۹۶۵ء)

اس جواب میں صرف یہی نہیں کہ ہندوستان کی حیثیت کے بارے میں کوئی اشارہ نہیں بلکہ دارالحرب پر انھوں نے اپنی رائے تک نہیں دی ہے بلکہ صرف ائمہ کا مسلک بیان کر دیا ہے۔ اور یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ حنفیہ کے مسلک پر بھی شرط ایسی لگی ہوئی ہے کہ "عملاً ایسا ہونا شاذ و نادر ہی ہو سکتا ہے۔"
مفتی صاحب کا یہ جواب پڑھنے کے بعد اب مولانا نعمانی کی یہ عبارت پڑھیے۔ لکھتے ہیں:۔

"حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب (سابق مفتی دارالعلوم دیوبند مقیم حال کراچی) کا جواب بھی حسب توقع مفصل مدلل اور فقیہانہ ہے اور اس کا حاصل بھی قریب قریب یہی ہے اور غالباً وہ بھی شائع ہو چکا ہے۔" ص۳۷

ملاحظہ کیجیے کہ مفتی صاحب کے جواب میں اشارتاً بھی یہ نہیں کہا گیا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے امام ابوحنیفہ کے مسلک کی بنا پر بیمہ کے جواز کی گنجائش ہے۔ مولانا ولی حسن صاحب نے بھی یہ کہیں نہیں لکھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے امام اعظم کے مسلک کی بنا پر بیمہ جائز ہو سکتا ہے لیکن مولانا نعمانی الفرقان پڑھنے والوں کو یہ تصور دے رہے ہیں کہ مجلس تحقیقات نے ان علماء کے جواب کی روشنی میں فیصلہ کیا ہے اب اس کو راقم الحروف کیا کہے یہ بات مجلس تحقیقات شرعیہ کے ہر رکن کو پہلے سے معلوم تھی کہ دارالحرب کے بارے میں امام ابوحنیفہ اور دوسرے اماموں کا مسلک کیا ہے۔ اس لیے ان جوابات سے کوئی نئی بات معلوم نہیں ہوئی۔ مجلس کو اصلاً جو بات طے کرنی تھی وہ یہ کہ ہندستان دارالحرب ہے یا نہیں اب اگر مجلس نے طے کیا ہے تو اس کی ذمہ دار صرف وہ ہے۔ اس کے ذمہ دار سوال نامے کا جواب دینے والے علماء نہیں ہیں اور اگر اس نے طے نہیں کیا ہے تو امام اعظم کے مسلک کا حوالہ دینا صراحۃً غلط ہے۔

مولانا نعمانی کی ایک دلیل

مولانا نعمانی نے اپنی توضیح ختم کرتے ہوئے ایک نئی دلیل بھی ارشاد فرمائی ہے جس سے وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ دارالحرب میں مسلمانوں کے لیے عقود فاسدہ کے ذریعہ حربیوں سے مال حاصل کرنے کی گنجائش ہے۔ تحریر فرماتے ہیں:۔

علاوہ ازیں قرآن مجید میں سورۂ نساء میں جہاں خطاءً قتل مومن کے کفارہ اور دیت کا حکم بیان کیا گیا ہے وہاں دارالاسلام کے مقتول مسلم باشندہ اور دارالحرب کے مقتول مسلم باشندے کے حکم میں یہ فرق بتایا گیا ہے کہ پہلے کے قتل کی صورت میں صرف کفارہ دینا ہوگا دیت ادا نہیں کی جائے گی۔ بہرحال جان کی دیت میں یہ تفریق خود قرآن مجید نے کی ہے اور ظاہر ہے کہ مال کا مسئلہ جان کے مقابلے میں بہرحال اہون ہے۔" صلہ

مولانا کی یہ دلیل پڑھ کر راقم الحروف کو سخت حیرت ہوئی۔ مولانا کے علم و فضل کے پیش نظر یہی کہا جا سکتا ہے کہ شاید انھوں نے اس پر غور نہیں کیا۔ یہاں گفتگو یہ نہیں ہے کہ دارالحرب اور دارالاسلام کے احکام میں کہیں کوئی فرق ہے یا نہیں آخر جو ائمہ دارالحرب کے مسلمانوں کے لیے بھی سود اور جوا کو حرام قطعی کہتے ہیں وہ بھی تو بعض احکام میں دونوں کے درمیان فرق تسلیم کرتے ہیں۔ جہاں نص قرآنی دونوں کے درمیان فرق کیا ہے اس کا انکار کون مسلمان کر سکتا ہے۔

سورۂ نساء کی جو آیت مولانا نے پیش کی ہے وہ اسلام کے بین الاقوامی احکام سے بحث کرتی ہے اور بداہتہً اس کے مخاطب دارالاسلام کے مسلمان ہیں بلکہ صحیح معنی میں اس کی مخاطب اسلامی حکومت ہے۔ وہ آیت یہ بتاتی ہے کہ اگر دارالاسلام میں بسنے والا کوئی مسلمان کسی دارالحرب میں بسنے والے مسلمان کو غلطی سے قتل کر کے دارالاسلام چلا آئے تو اسلامی حکومت اس مقتول مسلمان کی دیت ادا کرنے کی ذمہ دار نہ ہوگی اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اس کی جان قابل دیت نہ تھی بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ نہ تو دشمنوں کے ملک میں بسنے والے کسی مسلمان کی ولایت اسلامی حکومت کو حاصل ہے اور نہ دشمن ملک سے دارالاسلام کا کوئی معاہدہ ہے اور اگر معاہدہ ہو تو مقتول مسلمان کی دیت بھی ادا کرنی ہوگی۔ چنانچہ اسی سلسلۂ کلام میں قرآن نے یہ حکم بھی پوری طرح واضح کر دیا ہے۔ ارشاد ہے :-

وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ	اور اگر وہ کسی ایسی قوم کا فرد تھا جس سے
مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ	تمہارا معاہدہ ہو تو اس کے وارثوں کو خون بہا
وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ	دیا جائے گا اور ایک مومن غلام کو آزاد کرنا
(النساء ۴/ آیت ۹۲)	ہوگا۔

اب بتائیے کہ اس مسئلے کا مسئلۂ زیر بحث سے دور کا بھی کوئی تعلق ہے؟ یہاں گفتگو یہ ہے کہ آخر

میں بسنے والے مسلمانوں کے لیے سود اور جوا حرام ہے یا نہیں ؟ اور دلیل یہ دی جارہی ہے کہ اگر دارالاسلام کا کوئی مسلمان، دارالحرب کے کسی مسلمان کو غلطی سے قتل کردے تو اس مقتول مسلمان کی دیت نہیں دی جائے گی لہذا دارالحرب اور دارالاسلام کے مسلمانوں کے درمیان فرق ہوا اور جب فرق ہوا تو دارالحرب میں بسنے والے مسلمانوں کے لیے سود اور جوا جائز ہوگیا گویا سورۂ نساء کے اس حکم نے اَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا کے نص مطلق کو مقید کردیا ۔ کم سے کم راقم الحروف استدلال کی اس نوع سے آشنا نہ تھا۔ خدانخواستہ کل کوئی صاحب یہ نہ کہنے لگیں کہ دارالحرب اور دارالاسلام کے مسلمانوں کے درمیان میراث جاری نہیں ہوتی لہذا آیت میراث کے مخاطب صرف دارالاسلام کے مسلمان ہیں ۔ دارالحرب میں جس طرح چاہو میراث تقسیم کرو ــــ مولانا نعمانی نے یہ جو لکھا ہے کہ " بہر حال جان کی دیت میں یہ تفریق خود قرآن مجید نے کی اور ظاہر ہے کہ مال کا مسئلہ جان کے مقابلے میں بہر حال اہون ہے " اس عبارت کا مطلب واضح نہیں ہوا کیونکہ دیت نہ دینے میں بھی مسئلہ تو مال ہی کا ہوا ورنہ جہاں تک دارالحرب میں مقتول مسلمان کی جان کا تعلق ہے اس کا احترام بھی پوری طرح مدنظر رکھا گیا ہے اسی لیے قاتل پر اپنا گناہ بخشوانے کے لیے ٹھیک اسی طرح کفارہ لازم کیا گیا ہے جس طرح دارالاسلام کے کسی مسلمان کو خطاءً قتل کر دینے کی صورت میں لازم کیا گیا ہے ۔

بہر حال بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ مولانا نعمانی نے سورۂ نساء کی آیت پر غور نہیں فرمایا ۔

آخری گزارش جہاں تک اندازہ ہے مجلس تحقیقات شرعیہ کے فیصلے کی توضیح مولانا نعمانی نے ذاتی طور پر کی ہے مجلس اس کی ذمہ دار نہیں ہے ۔ راقم الحروف نے بھی الفرقان کے ایک قاری کی حیثیت سے ذاتی طور پر اظہار خیال کیا ہے اور آخر میں یہ عرض کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مجلس نے جن الفاظ میں اور جن حدود و شروط کے ساتھ بیمہ کے جواز کی گنجائش نکالی ہے اس سے مجھے اطمینان تو نہیں ہے لیکن اختلاف بھی نہیں ہے اور عدم اختلاف کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مجلس کے فیصلے کی بنا پر ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے عملاً انشورنس کا دروازہ بند ہوگیا ہے اس لیے کہ یہاں شاید ہی کوئی پرائیوٹ بیمہ کمپنی ایسی ہو جس کے حصہ دار مسلمان نہ ہوں اور اب تو انشورنس کمپنیوں پر حکومت کا کنٹرول ہے اور یہ کاروبار خود حکومت کر رہی ہے اور حکومت میں مسلمان بھی شریک ہیں ۔ اس صورت میں کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ انشورنس کا معاملہ کرے ۔ مجلس نے صرف ایک صورت میں جواز کی گنجائش نکالی ہے اور وہ یہ کہ کمپنی خالص غیر مسلموں کی ہو اور معاملہ کی شکل مقرر کرنا مسلمان کے اختیار میں نہ ہو[1]

[1] یہ مضمون لکھا جا چکا تھا کہ مجلس کے محترم داعی کی توضیح شائع ہوئی ۔ اس پر اظہار خیال آئندہ کروں گا ۔ (سعید احمد)

کمیونزم اور اسلام

جناب محمد حسین چشتی (کشمیر)

کمیونزم کیا ہے اور اسلام کیا ہے اور دونوں میں کہاں تک اتفاق اور اختلاف ہے۔ کیا کمیونزم اور اسلام قریب قریب ایک ہیں۔ اگر نہیں تو ان دونوں کے درمیان کیا فرق ہے؟ کیا انسان ایک ہی وقت میں مسلمان اور کمیونسٹ ہو سکتا ہے؟

یہ اور ایسے ہی کئی ایک سوال بعض ذہین انسانوں کے دماغ میں ابھر آتے ہیں اس کے بجائے کہ ہم کمیونزم پر بغیر سمجھے بوجھے لعنت ملامت کریں۔ ضروری ہے کہ ہم ایک مخلص طالب علم کی طرح اس کے بنیادی امور پر غور و فکر کریں اور پھر دیکھیں کہ کس حد تک یہ اسلام کے موافق ہے اور کس حد تک مخالف۔

بعض دوستوں کا خیال ہے کہ اسلام اور کمیونزم بجائے خود ایک ہی ماں کے دو بچے ہیں چنانچہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اگر اسلام سے خدا کا تصور ہٹا دیا جائے تو کمیونزم باقی رہ جاتا ہے یا یہ کہ اگر کمیونزم میں خدا کا تصور بڑھایا جائے تو اسلام بن جاتا ہے۔ گویا یہ ایک قسم کا الجبرائی حل Algebrical solution ہے جس سے ان کے ذہن کے مطابق کمیونزم اور اسلام کا فرق سمجھ میں آجاتا ہے۔ ایسے لوگوں کا خیال ہے کہ جس طرح کمیونزم' سرمایہ داری کو ہٹانا چاہتا ہے اسی طرح اسلام بھی اسے ہٹانا چاہتا ہے اور جس طرح کمیونزم دولت کو ایک جگہ جمع کرنے کا منصوبہ بناتا ہے اسی طرح اسلام بھی اسے بیت المال کے نام سے انفرادی ہاتھوں سے نکال کر اجتماعی ہاتھوں میں دینا چاہتا ہے' یا یہ کہ جس طرح کمیونزم' انفرادی ملکیت کو تسلیم نہیں کرتا اسی طرح اسلام بھی اس کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس انداز فکر کے لوگ کبھی قرآن شریف کی بعض آیات کو توڑ مروڑ کر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام انسان کو صرف وہی کچھ دینا چاہتا ہے جو اسے اپنی ذاتی کوششوں سے حاصل ہو جائے

چنانچہ کئی سال کی بات ہے کہ کمیونسٹوں کے ایک جلسے میں لگتے کے ایک بڑے چارٹ پر ایک شعر لکھا تھا جس میں قرآن شریف کی اس آیت لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی کو شامل کیا گیا تھا اور جس سے یہ اخذ کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ انسان کے لیے صرف وہی روزی یا آمدنی حلال ہے جو وہ صرف اپنے ہاتھوں سے کمائے یا حاصل کرے اور وہ ساری دولت حرام ہے جو اسے دوسروں کے کمانے سے حاصل ہو۔ گویا وراثت سے اگر دولت حاصل ہو جائے وہ بھی حرام ہے یا اگر کسی شخص نے کاروبار میں روپیہ لگایا ہوا اور خود اس میں بے کار حصہ دار (SLEEPING PARTNER) کی حیثیت سے کام کرتا ہو تو اسے جو آمدنی حاصل ہوگی وہ بھی قرآن کی رو سے حرام ہے۔ وغیرہ وغیرہ

ہمیں اس وقت اس سے بحث نہیں کہ آیا ایسے کرم فرما اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے جان بوجھ کر قرآن شریف کی غلط نمائندگی کرتے ہیں یا نہیں لیکن یہ بات واضح ہے کہ اپنے نصب العین کو کامیاب بنانے کے لیے اس طرح قرآن کی کسی آیت کو اس کے مضمون سے کاٹ کر پیش کرنا انصافی اور اخلاقی حدود سے تجاوز کرنا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام اور کمیونزم دو متضاد تصورِ حیات ہیں۔ اگر اسلام کی بنیاد خدا پرستی اور آخرت کی جواب دہی پر مبنی ہے۔ تو کمیونزم خدا بیزاری پر مبنی اور آخرت کے تصور سے خالی ہے۔ اسلام کی ساری تعلیم کا دار و مدار خدا کے وجود اور پیغمبروں کی رہنمائی پر ہے۔ کوئی شخص اس وقت تک مسلمان بن ہی نہیں سکتا جب تک وہ خدا اور اس کے پیغمبروں کی تعلیم پر ایمان نہ رکھتا ہو اور اس کائنات کے بنانے والے خدا کو نہ مانتا ہو۔ اس کے برعکس ایک کمیونسٹ خدا کو اس کائنات کا بنانے والا تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے۔ نہ وہاں آخرت کا کوئی تصور ہے اور نہ نبی اور پیغمبر کا کوئی درجہ۔ کیا یہ دنیا آپ ہی وجود میں آئی یا ڈاروِن کے نظریۂ ارتقاء کے مطابق موجودہ صورت اختیار کر گئی ہے؟

اس سوال کا جواب اگر آپ کمیونسٹوں سے سننا چاہتے ہوں تو بہتر ہے کہ آپ مارکس اور انجلس کی تصانیف پڑھیں۔ یہاں پر اتنا کہہ دینا مناسب ہوگا کہ کمیونزم مابعد الطبیعیاتی تصورات کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے۔ اس سے لازم آتا ہے کہ ان کی نظروں میں فرشتے، ملائکہ، وحی، رسالت، آخرت سب انسانوں کے بنائے ہوئے عقائد ہیں۔ ایک کمیونسٹ اس کو غلط سمجھتا ہے کہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر حضرت جبرئیل

ہوئی لاتے تھے۔ یا یہ کہ آپ نے معراج کی رات میں آسمانوں کی سیر کی۔ دراصل ایک کمیونسٹ ایسی ساری باتوں کو سرمایہ داری نظام یا جاگیردارانہ نظام کے کرشمے سمجھتا ہے۔ وہ تاریخ کے ہر واقعہ کو معاشی اور اقتصادی دوڑ کا پرتو سمجھتا ہے۔ اور یہ خیال کرتا ہے کہ اسلام کی ساری تاریخ منجملہ دوسری تاریخوں کے اقتصادی اور معاشی تگ ودو کا نتیجہ ہے۔ اتنا ہی نہیں، دنیا کا سارا اتار چڑھاؤ۔ یہ سارے تاریخی انقلاب یہ قوموں کا عروج و زوال اور جنگ و جدل، سب کچھ اس کی نظروں میں معاشی اور اقتصادی کش مکش کا انجام ہے۔ ایک کمیونسٹ کی نظر میں دنیا میں انسانوں سے کوئی ایسا واقعہ سرزد ہی نہیں ہوتا جس میں معاشی عوامل (کام نہ کرتے ہوں۔ گویا اگر آپ والدین یا اولاد سے محبت کرتے ہیں تو اس میں بھی کوئی ذاتی منفعت ہی پوشیدہ ہے۔ اگر آپ کسی ہمسایے کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آتے ہیں، اس میں بھی آپ کا کوئی نہ کوئی اقتصادی فائدہ پیش نظر ہے۔ اگر آپ بیوی کے ساتھ محبت اور پیار سے پیش آتے ہیں، وہاں بھی آپ کو مال و دولت یا ایسے ہی کسی فائدے کا لالچ ہے۔ اگر آپ کسی غریب کی مالی امداد کرنا چاہتے ہیں تو وہاں بھی پس پردہ آپ کو اپنا ہی فائدہ مقصود ہے۔

اسلام میں اس تصورِ حیات کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ ایک مسلمان ہر کام اللہ کی رضا کے لیے کرتا ہے۔ اس کے ہر کام اور ہر فعل میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رضامندی کارفرما ہے۔ وہ کوئی کام ایسے کرتا ہے جس میں کسی ذاتی فائدے یا نفع کی گنجائش نہیں۔ اگر وہ کسی غریب کو کھانا کھلاتا ہے تو اس میں اس کا کیا لالچ ہو سکتا ہے۔ اگر وہ زکوٰۃ دیتا ہے تو اس میں کون سے کاروباری فوائد اسے میسر ہیں۔ اگر وہ بنک یا ڈاک خانے سے سود حاصل نہیں کرتا تو اس میں کون سے خود غرضی کے سامان ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اسلام بھی اس بات کا قائل ہے کہ ذاتی مفاد اور معاشی اقتصادی فائدے انسان کے پیش نظر رہتے ہیں۔ لیکن اسلام اس بات کو غلط سمجھتا ہے کہ انسان کا ہر کام اور اس کی ہر کوشش صرف اپنے اقتصادی فائدے کے لیے ہوتی ہے اور معاشی عوامل (Economic Factors) ہی ہر کام میں کارفرما رہتے ہیں۔ معاشی عوامل تو بے شک دیگر عوامل کے ساتھ ساتھ سماج کی صورت گری کرنے میں اپنا پارٹ ادا کرتے ہیں۔ مگر دیگر عوامل ہر حال میں ان کے تابع (Sub-ordinate) نہیں ہوا کرتے۔

اسلام سرمایہ داری کا دشمن نہیں۔ اس لیے کہ سرمایہ اللہ کی عنایت ہے جسے وہ چاہے دے

اگر سرمایہ اور دولت اچھے اور بھلائی کے کاموں پر صرف کی جائے تو وہ اللہ کی رحمت ہے۔ اسلام اگر دشمن ہے تو سرمایہ پرستی کا ہے تاکہ لوگ سرمایہ جمع کر کے اسے غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم نہ کریں اور دولت پر سانپ بن کے نہ بیٹھ جائیں۔ ایک مسلمان کے لیے مناسب ہے کہ وہ سرمایہ جمع رکھے اور اس میں سے اپنے رشتہ داروں، محتاجوں اور غریبوں کا حق بھی ادا کرے۔ زکوٰۃ کی ادائیگی اس کے لیے ایک لازمی امر ہے۔ اگر وہ زکوٰۃ ادا نہیں کرتا تو اپنے ایمان و اسلام میں نقص پیدا کرتا ہے۔ اگر وہ سود خوار ہے تو اسے اللہ کی رحمت حاصل نہیں۔ اگر وہ لوٹ کھسوٹ سے دولت حاصل کرتا ہے اور سٹہ بازی اور لاٹری کو اپنا شعار بناتا ہے تو قوانین اسلام کی خلاف ورزی کرتا ہے۔

اسلام کمیونزم کی طرح انفرادی ملکیت کا مخالف نہیں۔ مگر ساتھ ہی کچھ پابندیاں ہیں تاکہ انسان خود غرض اور سماج دشمن نہ بن جائے۔ انسان کی نظر میں سارے انسان ایک دوسرے کے بھائی ہیں اور انہیں ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہونا ہے۔ اگر ان میں کوئی فرق ہے تو وہ صرف خدا ترسی اور پرہیز گاری کا ہے۔ وہ جس قدر زیادہ اللہ سے ڈرتے ہیں۔ اسی قدر اُن کا درجہ اللہ کے یہاں بڑا ہے۔ ورنہ انسانیت کے لحاظ سے سب ایک جیسے ہیں۔ یہ نماز میں امیر و غریب کا ساتھ ساتھ کھڑا رہنا، یہ حج کے مراسم ادا کرتے کرتے آقا اور غلام کا کندھے کے ساتھ کندھا ملا کر چلنا، یہ اخوت اور برادری کے معاملات میں دولتمندوں کا غریبوں کے ساتھ تعاون کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اسلام کی نظر میں سب انسان برابر ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ انسان ایک دوسرے کی مشکلات کو حل کرنے کی کوشش کریں۔ اپنی دولت اور اپنے مال میں سے غریبوں کا حق ادا کریں۔ وہ زکوٰۃ کی صورت میں ہو یا عام انفاق کی صورت میں۔

لیکن اسلام نے دولت کمانے اور دولت خرچ کرنے کے لیے چند قیود لگا دی ہیں تاکہ انسان کا اقتصادی نظام اپنا فطری رنگ قائم رکھ سکے اور اس میں بے اعتدالی واقع نہ ہو جائے۔ چنانچہ سب سے پہلے سود کو حرام کیا۔ آج کل دنیا کا اقتصادی نظام درہم برہم ہے۔ بعض ملک بہت امیر ہیں اور بعض بہت غریب۔ بعض لوگ دولت میں مست نظر آتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جنہیں دو وقت کی روٹی بھی نصیب نہیں۔ اس خرابی کی بنیادی وجوہات میں سے ایک سود ہے۔ سود کا لفظا

بہت مہذب نظر آتا ہے اور شریف سے شریف لوگ بھی سود کھانا فخر سمجھتے ہیں۔ لیکن ایک سود ہی ہے جس کی وجہ سے اقتصادی توازن ختم ہوجاتا ہے۔ سود تو دوسرے الفاظ میں معاشی استحصال (اکانمک اکسپلائٹیشن) ہے جو ہمارے سماج کو دیمک کے کیڑوں کی طرح اندر اندر سے کھا رہا ہے۔ اسی طرح کاروبار اور تجارت میں بھی اسلام نے حلال و حرام کی پابندیاں لگا دی ہیں۔ ہر وہ کاروبار اور تجارت حرام ہے جس میں نفع اور نقصان (Chance) پر مبنی ہو۔ مثلاً آپ میوے کے ایک باغ کو ایسی صورت میں ٹھیکے پر دیں کہ ابھی درختوں میں شگوفے بھی نہ لگے ہوں، چنانچہ میوہ لگنے پر اولے، بارش اور طوفان سے اس کے میوے ضائع ہوجائیں اور ٹھیکے دار کو نقصان اٹھانا پڑے۔ ایسا معاملہ ناجائز ہے۔ اسلام کی رو سے تو باغ اس وقت ٹھیکے پر دیا جاسکتا ہے جب اس کے میوے پکنے کے قریب ہوں اور وہ سماوی آفات سے محفوظ بن چکے ہوں۔ اسی طرح لاٹری، سٹّہ، انشورنس، معمّے وغیرہ سب اسلام کی نظروں میں ناپسند ہیں۔ اس لیے کہ ان میں ہار جیت ایک اتفاقی امر (چانس) ہوا کرتا ہے۔ شراب پینا، جوا کھیلنا، جانور لڑانا وغیرہ ایسی ساری باتیں اسلام نے ناپسند کی ہیں۔ عیش پرستی فضول خرچی، فیشن پرستی کو بھی اسلام نے ناجائز ٹھیرایا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے کہ انسان کی کتنی دولت آج کل ان باتوں پر صرف ہوتی ہے تو معلوم ہوگا کہ دنیا کی آمدنی کا ایک بڑا حصہ ان باتوں پر صرف ہوتا ہے۔ اسلام نے ان برائیوں کو روکنے اور دنیا میں ایک صالح معاشرہ (آئیڈیالوجیکل سوسائٹی) قائم کرنے کے لیے چند بنیادی اصول طے کر دیے ہیں۔

کمیونزم تو دولت کو انفرادی ہاتھوں میں دینا ہی نہیں چاہتا۔ وہ انسان کو بنیادی طور پر بدنیت اور ناقابلِ اعتبار سمجھتا ہے۔ اسی لیے ساری دولت کو حکومت میں دینا چاہتا ہے۔ وہ سارے کاروبار اور ملک کی ساری دولت کو قومی ملکیت بنانا چاہتا ہے۔ کیونکہ اس کے خیال میں اگر دولت انسان کے انفرادی ہاتھ میں آجائے تو نراج (انارکی) واقع ہوجاتا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ آخر وہاں بھی تو دولت انسان ہی کے ہاتھ میں ہوگی۔ اگر دولت بہت لوگوں کے پاس نہ رہے اور صرف ایک یا چند ہاتھوں میں رہے تو وہاں بھی آخر انسان ہی کا ہاتھ ہے اور وہ واحد یا چند انسان بھی وہی مظالم روا رکھ سکتے ہیں جو دوسرے انسان روا رکھ سکتے ہیں۔ اس لیے ملک کی دولت کو قومی ملکیت بنانے کا تصور سراسر غلط ہے اور فطرت کی راہ سے گریز ہے۔

اسلام میں حکمرانی صرف اللہ کی ہے اور وہی قانون ساز بھی ہے۔ لوگوں کو اسی کی اطاعت کرنی ہے۔ لیکن کمیونزم میں حکمرانی مزدوروں کی ہے اور وہی قانون سازی کا حق بھی رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ مزدور عموماً غیر سنجیدہ اور بے شعور طبقہ ہوتا ہے اور اُن کے ذہنی رجحانات اکثر اُن کی معاشی اور اقتصادی مشکلات کا ردِ عمل ہوتے ہیں۔ اس لیے اہم معاملات میں ان کے فیصلے بھی غیر جانبدار نہیں ہوتے۔ خود مارکس اور انجلس کے خیالات بھی ان جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں جو ان میں سرمایہ دارانہ نظام کے ردِ عمل سے پیدا ہوئے تھے۔ اس کے برعکس جو احکام اللہ نے دیے ہیں وہ بشری کمزوریوں سے پاک ہیں اور ان سے وہ مستحکم اور معتدل نظام قائم ہو سکتا ہے جو انسانی سماج کی سب بیماریوں کے لیے واحد علاج ہو سکتا ہے۔

لیکن ان سب اختلافات کے باوجود کمیونزم اور اسلام میں موافقت بھی ہے۔ جس طرح اسلام ایک تحریک ہے اسی طرح کمیونزم بھی ایک تحریک ہے۔ جس طرح اسلام ایک نظریہ ہے اسی طرح کمیونزم بھی ایک نظریہ کا علمبردار ہے۔ جس طرح اسلام زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنے اصولوں کا قائل بنانا چاہتا ہے، اسی طرح کمیونزم بھی بنانا چاہتا ہے۔ جس طرح اسلام ایک بین الاقوامی انسانی برادری قائم کرنا چاہتا ہے اسی طرح کمیونزم بھی ایک بین الاقوامی برادری کا طالب ہے۔ جس طرح اسلام نے وطنی اور جغرافیائی حدود کو توڑ کر عالمِ انسانیت کو ایک کر دیا۔ اسی طرح کمیونزم بھی مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کے فاصلے کو پھاند کر انسانوں کو ایک کرنے کا داعی ہے۔ اسلام میں بھی وطن کی محبت، نظریہ کی محبت کے تابع ہے (اگرچہ اسلام کی رو سے وطن کی محبت کا جذبہ ایک فطری جذبہ ہے) اور کمیونزم میں بھی۔ اسلام میں بھی حکومت اور سیاست کا تصور ہے (اگرچہ یہ تصور دیگر سیاسی تصورات سے مختلف ہے) اور کمیونزم میں بھی۔ اسلام بھی آفاقی ہے اور کمیونزم بھی۔

یہ سب کچھ ہے مگر جس طرح اقبال چاند سے مخاطب ہو کر موافقت کے بعض پہلوؤں کی نشان دہی کرنے کے بعد کہتا ہے:۔

> پھر بھی اے ماہ مبیں تو اور ہے میں اور ہوں — درد جس پہلو میں ہوتا ہے وہ پہلو اور ہے

اسی طرح اسلام اور کمیونزم بھی دو متضاد نظریہ ہائے حیات ہیں۔ اگر ایک کا رخ مشرق کی طرف ہے تو دوسرے کا مغرب کی طرف۔ اگر اسلام کی کشتی شمال کو جاتی ہے تو کمیونزم کی کشتی جنوب کو جاتی ہے۔ اور جو لوگ دونوں کشتیوں میں سوار ہونا چاہتے ہیں وہ اپنے اوپر بڑا ستم کرتے ہیں۔

ابن خلدون بحیثیت ایک مفکرِ تعلیم

ابو الفتوح محمد التونسی

حالاتِ زندگی

ابن خلدون ۷۳۲ھ میں تیونس میں پیدا ہوا۔ اس کا خاندان اسپین کے مشہور شہر اشبیلیہ سے ترک وطن کرکے یہاں آباد ہوگیا تھا۔ ابن خلدون کے زمانے میں اسپین سے آنے والے علماء کی ایک کثیر تعداد تیونس میں موجود تھی۔ نیز خود ابن خلدون کا اپنا بڑا علمی خاندان تھا اور صدیوں سے اس کے افراد مختلف اسلامی حکومتوں میں عالی عہدوں پر سرفراز ہوتے چلے آرہے تھے۔ یہ ماحول تھا جس میں ابن خلدون نے آنکھیں کھولیں اور نشوونما پائی۔ ابن خلدون نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ اس کے بعد اس نے اسپین سے آنے والے علماء سے پورا استفادہ کیا۔ وہ ابھی بیس سال کا ہی تھا کہ تیونس کے حکمران کا کاتب بن گیا لیکن یہاں وہ زیادہ دیر نہ ٹھیرا۔ تیونس سے وہ شمالی افریقہ کی دوسری امارتوں میں یکے بعد دیگرے منتقل ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ اندلس پہنچا۔ اندلس کے فرمانروا شاہ غرناطہ نے اسے اپنے اہلِ دربار میں شامل کرلیا، اور اپنا سفیر بناکر اسپین کے ایک عیسائی فرمانروا کے پاس بھیجا۔ وہاں سے واپسی پر ابن خلدون کو اندلس بھی چھوڑنا پڑا اور وہ پھر شمالی افریقہ آگیا۔ اس دفعہ پھر شمالی افریقہ میں اسے کہیں چین نہ ملا اور وہ ایک امارت سے دوسری امارت میں قسمت آزمائی کرتا پھرا آخر وہ اس سیاسی زندگی سے تنگ آگیا اور اس نے علمی زندگی اختیار کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ ۷۷۶ھ میں ابن خلدون اپنے ایک دوست قبیلہ بنو عریف کے ہاں پہنچا اور ۷۸۰ھ تک وہیں رہا۔ اس عرصے میں اس نے اپنا وہ مقدمہ تاریخ لکھا جس نے اس کے نام کو زندہ جاوید بنادیا ہے۔ اتفاق سے یہ پرسکون زندگی بھی ابن خلدون کو راس نہ آئی اور وہ گوشۂ تنہائی سے پھر قسمت آزمائی کو نکل پڑا، لیکن

دشمنوں نے اس کو آرام نہ لینے دیا اور آخر وہ مجبور ہو کر حج کے ارادے سے مشرق کی طرف چل دیا اور اس طرح ۷۸۴ھ میں وہ قاہرہ پہنچا۔

قاہرہ پہنچنے سے پہلے ابن خلدون علمی و سیاسی دونوں لحاظ سے کافی پختہ ہو چکا تھا اور اس نے وہ اپنی شہرۂ آفاق تصنیف 'مقدمہ تاریخ' بھی لکھ لی تھی جس زمانے میں وہ قاہرہ پہنچا قاہرہ تاتاریوں کے ہاتھ سے ۶۵۶ھ میں بغداد کی تباہی کے بعد اسلامی عربی ثقافت کا سب سے بڑا مرکز بن چکا تھا اور وہاں علم و علماء کی بڑی قدردانی ہوتی تھی۔ یہ مملوک سلطان برقوق کا زمانہ تھا۔ قاہرہ میں جیسے ہی اس کے قدم جمے، اس نے جامعۂ ازہر میں درس دینا شروع کر دیا، اور اس کے ارد گرد اہل علم کا ایک حلقہ بھی جمع ہو گیا۔ پھر اسے مالکی قضا کا عہدہ مل گیا۔ لیکن یہاں بھی تقدیر کے نشیب و فراز نے اس کا ساتھ نہ چھوڑا وہ کئی بار قاضی بنا اور کئی بار اسے برخاست کیا گیا۔ اسی زمانے میں اسے ایک اور المناک حادثے سے دوچار ہونا پڑا اس کے اہل و عیال تیونس سے سمندری جہاز کے ذریعے مصر آ رہے تھے کہ وہ راستے میں ڈوب گئے۔ ایک دفعہ تاتاری دمشق پر حملہ آور ہوئے تو وہ سلطان مصر کے ساتھ محاذ جنگ پر گیا، اور جب سلطان مذکور بغیر لڑے قاہرہ لوٹ گیا، تو دمشق کو حملہ آوروں کی غارت گری سے بچانے کے لیے وہ تاتاریوں کے فرماں روا امیر تیمور سے ملا۔ اور اس سے دیر تک گفتگو کی۔ ابن خلدون نے اس ملاقات کا ذکر کیا ہے۔

ابن خلدون نے کافی لمبی عمر پائی جو آخر میں تمام تر درس و تدریس و تصنیف و تالیف میں گزری اس نے کئی کتابیں لکھیں۔ ایک کتاب منطق پر تھی، ایک کتاب میں فلسفہ ابن رشد کا اختصار کیا۔ اس نے فقہ، ادب، اور حساب پر بھی تصنیفات کیں لیکن سوائے اس کی تاریخ کے باقی تمام کتابیں ضائع ہو گئیں

تعلیم و تربیت پر بحث فلسفۂ تاریخ کے اصول وضع کرنے میں ابن خلدون کو اولیت حاصل ہے اور اسی طرح وہ پہلا مورخ ہے جس نے علم عمرانیات کی طرح ڈالی۔ اس کے علاوہ ابن خلدون نے اپنے زمانے کے طریقہائے تعلیم و تربیت پر بھی بڑی غائر بحثیں کی ہیں اور اس ضمن میں ایسے افکار پیش کیے ہیں جن کی مدد سے ایک جدید طریقۂ تعلیم و تربیت ترتیب دیا جا سکتا ہے۔

اسلامی تعلیم و تربیت کے پیش نظر دو مقصد ہوتے تھے :- ایک دینی دوسرا دنیوی - قرآن کریم کی آیت "وابتغ فی ما اتاک اللہ الدار الآخرۃ ولا تنس نصیبک من الدنیا" (جو کچھ اللہ نے تمہیں دیا ہے اس میں دار آخرت کو طلب کرو اور اس دنیا کا بھی اپنا حصہ نہ بھولو۔) میں ان دونوں مقاصد کی طرف بڑا جامع اشارہ ملتا ہے ۔ اسی طرح رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حدیث اعمل لدنیاک کانک تعیش ابدا واعمل لآخرتک کانک تموت غدا (اپنی دنیا کے لیے اس طرح کام کرو جیسے تم ہمیشہ کے لیے زندہ رہوگے اور آخرت کے لیے اس طرح کام کرو جیسے تم کل ہی مر جاؤ گے۔) میں اسی کی طرف رہنمائی کی گئی ہے - غرض اسلامی تعلیم و تربیت میں ان دونوں مقاصد کو بڑی خوبی سے جمع کیا جاتا تھا ۔

تعلیم میں قرآن کی مرکزی حیثیت

گو مختلف اسلامی ملکوں میں وہاں کے ماحول کے مطابق تعلیم و تربیت کے طریقے مختلف رہے ہیں، لیکن اس کے باوجود تمام مسلمانوں کا اس بات پر اتفاق تھا کہ قرآن مجید ہی اصل دین اور تمام علوم اسلامیہ کا منبع و مصدر ہے ۔ چنانچہ جہاں تک عربی ممالک کا تعلق ہے ان میں سے ہر ایک میں قرآن ہی تعلیم کا اصل اصول ہوتا تھا اور اسی مرکز کے ارد گرد دوسرے علوم کی تعلیم گھومتی تھی ۔ ابن خلدون اس پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

> اس سے مقصد بچے کے اندر عقائد ایمانی کو راسخ کرنا اور دین کے ذریعے اچھے اخلاق کے اصولوں کو جاگزیں کرنا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ دین نفوس کو مہذب بناتا، اخلاق کو ٹھیک کرتا اور نیکی کے کاموں پر ابھارتا ہے ۔

مسلمانوں کے ہاں تعلیم کے دو درجے ہوتے تھے ۔ ایک ابتدائی، دوسرا عالی ۔ شمالی افریقہ میں بچوں کو ابتدائی درجے میں صرف قرآن حفظ کرایا جاتا تھا ۔ اور اس کے ساتھ اور کچھ نہیں پڑھایا جاتا تھا ۔ اہل اندلس بچوں کو قرآن مجید کے ساتھ ساتھ عربی ادب، نظم و نثر اور اصول و قواعد بھی پڑھاتے تھے، اور انہیں خوش نویسی بھی سکھائی جاتی تھی ۔ باقی رہے اہل مشرق یعنی بغداد اور اس کے آس پاس کے ملکوں کے باشندے، ان کے ہاں بچوں کی تعلیم کا وہی طریقہ رائج تھا جو اہل اندلس میں تھا ۔ وہ قرآن مجید حفظ کرانے کے ساتھ ساتھ دوسرے مضامین بھی پڑھایا کرتے تھے ۔ البتہ اہل اندلس کے مقابلے میں قرآن کی تعلیم

کی تعلیم پر زیادہ زور دیتے تھے۔ مزید برآں ان کے ہاں عام درس سے الگ خوش نویسی سکھانے کا انتظام ہوتا تھا اور اس کے لیے مستقل ادارے تھے۔ چنانچہ جنہیں خاص طور سے خوش نویسی سیکھنی ہوتی وہ ان اداروں کا رخ کرتے۔

ابن خلدون کی تنقید

ابن خلدون ان طریقہ ہائے تعلیم پر تنقید کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اہلِ مغرب و افریقہ کا شروع میں بچوں کو صرف قرآن مجید ہی پڑھانے پر اکتفا کرنا انہیں اپنے خیالات کو اچھی طرح ادا کرنے سے قاصر رکھتا ہے۔ یہ اس لیے کہ وہ اپنے بچوں کو قرآن تو حفظ کرا دیتے ہیں لیکن انہیں ان کی عقلی استعداد کے مطابق قرآن کے اسلوبوں سے واقف نہیں کراتے اور یہی طریقہ تعلیم اس وقت مصر میں رائج ہے۔ اہلِ شمالی افریقہ کے برعکس جیسا کہ اوپر بیان ہوا اہلِ اندلس بچوں کو قرآن کے ساتھ ساتھ ادب عربی، نظم و نثر اور خوش نویسی کی بھی تعلیم دیتے تھے۔ اس ضمن میں ابن خلدون قاضی ابوبکر بن العربی کا ذکر کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ ان کا اپنا ایک طریقہ تھا جس میں انہوں نے بڑی جدت کی تھی۔ ان کے طریقے کا خلاصہ یہ ہے۔ شعر عربوں کا تاریخی صحیفہ ہے چنانچہ تعلیم میں اسے مقدم رکھنا چاہیے۔ اسی طرح درس و تدریس میں عربی زبان مقدم رہے۔ جب بچے کو اس پر قدرت حاصل ہو جائے، تو وہ حساب سیکھے، اس کی مشقیں کرے اور اس کے قوانین کو جانے اس کے بعد وہ قرآن پڑھے۔ ابن العربی کی رائے میں اگر بچے کی اس طرح تعلیم ہو گی تو وہ قرآن مجید زیادہ اچھی طرح سمجھے گا اور اس کے مطالب بھی بچے کے ذہن نشین ہوں گے۔ ابن خلدون نے ابن العربی کے اس طریقہ تعلیم کو بہت سراہا ہے لیکن وہ لکھتا ہے کہ شمالی افریقہ والے اپنے بچوں کو اس طرح تعلیم دینے کے عادی نہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک قرآن مجید سے تعلیم کی ابتدا ثواب و برکت کا موجب ہے اور وہ ڈرتے ہیں کہ اگر بچے نے صغیر سنی میں جب کہ وہ ان کے دباؤ میں ہوتا ہے۔ قرآن نہ پڑھا تو ممکن ہے وہ بڑا ہو کر اس سے محروم رہے اور بعد میں قرآن نہ پڑھ سکے۔

تعلیم کا درجۂ عالی

ابتدائی درجے کے بعد درجہ عالی ہوتا تھا۔ اس میں جو علوم پڑھائے جاتے تھے۔ ابن خلدون نے ان کی دو قسمیں کی ہیں۔ ایک تو وہ علوم جو مقصود بالذات ہیں اور یہ شرعی علوم ہیں جیسے فقہ، تفسیر، حدیث، کلام، طبیعیات، الٰہیات اور فلسفہ۔ دوسرے وہ علوم جو مقصود بالذات نہیں اور ان کی حیثیت پہلے علوم کے لیے ذریعہ اور آلے کی ہے جیسے عربی،

حساب اور منطق ابن خلدون کی رائے میں پہلی قسم کے علوم کی تعلیم کے دائرے کو وسیع اور ان کی جزویات کا احاطہ کرنے کی ضرورت ہے۔ البتہ جہاں تک علوم کی دوسری قسم کا تعلق ہے ان کی تعلیم کا دائرہ صرف اتنا ہی وسیع ہونا چاہیے جتنا کہ اصل مقصد کے لیے ضروری ہو۔ چناں چہ اس نے ان علماء پر سخت نکتہ چینی کی ہے، جو آخر الذکر علوم یعنی علوم آلیہ پر کے دائرۂ تعلیم کو بہت زیادہ وسیع کر دیتے ہیں۔ اس طرح طالب علموں کا وقت ضائع کرتے ہیں اور انہیں اصل مقصد سے بھی محروم رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں ابن خلدون نے علم نحو میں طرح طرح کی موشگافیاں کرنے والوں پر سخت اعتراض کیے ہیں۔ اس کے زمانے میں نظام تعلیم میں علم نحو کو ان علوم پر جو مقصود بالذات ہیں زیادہ اہمیت دی جاتی تھی وہ کہتا ہے۔

علم نحو کی تعلیم نظری نہیں ہونی چاہیے کیونکہ اس سے اصل غرض تو بچوں کو اس قابل بنانا ہے کہ وہ اپنے دلی خیالات کو اچھے انداز میں پیش کر سکیں صحیح عبارت پیش کر سکیں اور جو پڑھیں اسے سمجھ لیں۔ علم نحو اور علم بلاغت کے بارے میں ابن خلدون کی رائے یہ ہے کہ جب تک بچہ مناسب عمر کو نہ پہنچ جائے ان علوم کی اسے تعلیم نہیں دینی چاہیے۔

اخوان الصفا کا طریقہ تعلیم اخوان الصفا درجہ عالی کے نصاب تعلیم میں علوم فلسفہ کا بھی اضافہ کرتے تھے اور اس معاملے میں ان کا اپنا ایک مشہور تعلیمی مکتبِ فکر تھا، جو بہت حد تک جدید تعلیمی مکتب فکر سے ملتا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ تعلیم کی ابتدا معقولات کے بجائے محسوسات سے ہونی چاہیے۔ چنانچہ وہ محسوسات کو ہی عقلی و الٰہیاتی موضوعات کے درس وتدریس کا ذریعہ بناتے تھے۔ چنانچہ اس طرح وہ اپنے زمانے میں اسلامی عقائد کو ایک اچھوتے اسلوب میں دقیق علمی طریقے پر پیش کرنے میں کامیاب ہوئے۔ ان کے طریقۂ تعلیم کا بنیادی فکر دین اور عقل میں باہم مطابقت پیدا کرتا تھا۔ جب ابن خلدون کو نظام تعلیم کے بارے میں اخوان الصفا کے ان خیالات کا علم ہوا۔ تو اس نے ان کے نقطہ نظر کی حمایت کی اور ان ہی خطوط پر خود ایک نظام تعلیم تجویز کیا۔ وہ کہتا ہے کہ تعلیم کا نصاب مقرر کرتے وقت یہ دو بنیادی نکات ملحوظ رہنے چاہییں۔

۱۔ بچوں کی ذہنی استعداد۔

۲۔ حسی معرفت کو مقدم رکھا جائے اور اسے غیر حسی معرفت تک پہنچنے کی اساس بنایا جائے۔

تعلیم کے متعلق ابن خلدون کی آراء

ابن خلدون لکھتا ہے کہ معلم کا معلم بننے کے لیے صرف صاحب علم ہونا ضروری نہیں، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اسے یہ بھی جاننا ہیے کہ وہ کس طرح بچوں کو پڑھا سکتا ہے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک وہ بچوں کی نفسیات سے واقف نہ ہو اور ان کی استعداد اور ذہنی صلاحیت کو نہ جانے اسی صورت میں وہ بچوں کی ذہنی سطح پر نیچے اتر کر ان سے ذہنی اتصال پیدا کر سکتا ہے

ابن خلدون محض لفظی تعلیم پر سخت اعتراض کرتا ہے اور بغیر سمجھائے کسی چیز کو حفظ کرانے کے خلاف تنبیہ کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ اس طرح رٹنے سے ملکۂ فہم کی ترقی رک جاتی ہے۔ وہ ان معلموں کی مذمت کرتا ہے جو رٹانے پر تمام تر اعتماد کرتے ہیں۔ اس کے نزدیک اس سے بچوں کے ذہنوں کے اندر کوئی چیز نہیں جاتی۔ اپنے اس دعوے کی دلیل میں وہ مراکش کے شہروں کی مثال دیتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اگرچہ وہاں تعلیم کی مدت ۱۶ سال ہے لیکن اس کے باوجود نہ تو بچوں میں علمی مہارت پیدا ہوتی ہے اور نہ وہ ملکۂ فہم حاصل کر پاتے ہیں اور یہ اس لیے کہ ان کے مدارس میں تمام تر حفظ کرانے اور رٹانے پر زور دیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس تیونس کا مروجہ نظام تعلیم ہے۔ وہاں مدت تعلیم اگرچہ پانچ سال ہے لیکن اس کے باوجود بچے علم میں ملکہ حاصل کر لیتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں استاد رٹانے کے بجائے بچوں کو سمجھاتے ہیں اور ان سے سوال و جواب کرکے موضوع کو ذہن نشین کراتے ہیں۔ ابن خلدون استادوں کو بچوں کی عقلی نشوونما پر نگاہ رکھنے کی ضرورت بتاتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ بچے کے ذہن میں ابتدا میں پختگی نہیں ہوتی۔ اس بارے میں ابن خلدون لکھتا ہے۔

> ہم نے اپنے اس زمانے میں اکثر استادوں کو دیکھا ہے کہ وہ تعلیم کے طریقوں اور اس کی افادیت سے ناواقف ہیں۔ چنانچہ وہ تعلیم کے شروع ہی میں بچے کے سامنے مشکل مسائل پیش کرتے ہیں اور اس سے ان کو حل کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں اور اسے وہ مشق سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہ صحیح طریقۂ تعلیم ہے۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ بچے میں علم حاصل کرنے کی استعداد بتدریج پیدا ہوتی ہے۔ شروع میں بچہ محسوس مثالوں کے ذریعہ اور صرف اجمالی طور پر ہی چیزوں کو سمجھتا ہے۔ اس کے بعد اس کی ذہنی استعداد بتدریج بڑھتی جاتی ہے۔

ابن خلدون بچوں کی تعلیم کے بارے میں رائے دیتا ہے کہ شروع میں اس کا انحصار اجمالی معلومات

پر ہونا چاہیے۔ اس کے بعد تدریجاً انہیں تفصیلات سے واقف کرایا جائے اور وہ اس طرح کہ پہلے بچوں کو مضمون کے ہر باب کے بنیادی مسائل بتائے جائیں۔ پھر استاد بچوں کی عقلی نشو و نما کا خیال رکھتے ہوئے شرح و توضیح کے ذریعے ان مسائل کو بچوں کے ذہن کے قریب کرے۔ ابن خلدون تعلیم میں محسوس مثالوں سے کام لینے کی ضرورت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ بچہ حصول علم کی ابتداء میں ضعیف الفہم اور قلیل الادراک ہوتا ہے اور محسوس مثالوں کے ذریعے جو کچھ اسے پڑھایا جاتا ہے، وہ اس کو سمجھ لیتا ہے ابن خلدون اس پر زور دیتا ہے کہ بچہ شروع میں حواس کے ذریعے سیکھتا اور معرفت حاصل کرتا ہے اسی سلسلے میں وہ طلب علم کے لیے سفر کی اہمیت پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس سے طالب علموں کو بہت سی چیزوں کے متعلق معلومات حاصل ہو جاتی ہیں اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

> طلب علم اور مشائخ، ماہرین فنون اور علم و تعلیم کے بڑے لوگوں سے ملاقات کے لیے سفر کرنا کمال علم میں اضافے کا باعث ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ انسان علم و معرفت کا اخلاق اور مذاہب و فضائل کبھی تو علم و تعلیم اور بتانے سے سیکھتے ہیں اور کبھی دوسروں کو دیکھنے اور ان کے ساتھ ملنے جلنے سے نیز استادوں سے ملنے جلنے اور ان کی زبان سے سننے سے خاص طور پر جب کہ ایک سے زیادہ اور مختلف الانواع استاد ہوں، علم و معرفت کی زیادہ اچھی طرح تحصیل ہوتی ہے

ابن خلدون کی رائے میں بچے کو ایک وقت میں دو علم نہیں پڑھانے چاہییں۔ کیونکہ اس طرح وہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو بھی حاصل نہیں کر پاتا۔ کیونکہ دونوں طرف اس کا خیال بٹا رہتا ہے اور وہ کسی ایک طرف بھی پوری طرح توجہ نہیں کر پاتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ناکام رہتا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ بچہ پہلے ایک علم کی طرف پوری طرح متوجہ ہو اور اس کے مسائل کو سمجھے پھر وہ آگے بڑھے۔

ابن خلدون کے نزدیک بچے کو اس کے ایک خاص فکری سطح پر پہنچنے کے بعد ہی قرآن مجید کی تعلیم دینی شروع کرنی چاہیے۔ وہ اپنے زمانے کے استادوں اور تربیت دینے والوں کے اس طریقے کی جو اس زمانے میں رائج تھا مذمت کرتا ہے جس میں کہ بچے کی تعلیم حفظ قرآن سے شروع کی جاتی تھی اس خیال سے کہ اس طرح شروع ہی میں قرآن حفظ کرنے سے وہ فصیح عربی لکھنے اور بولنے کا عادی ہو جائے گا اور قرآن بچے کو برائیوں سے بچائے گا۔ ابن خلدون کے زمانے میں عام طور پر تعلیم دینے والوں کا یہ عقیدہ تھا۔ اس لیے وہ اصرار کرتے تھے کہ بچے کی تعلیم کا آغاز حفظ قرآن سے ہو بغیر اس کے معانی سمجھنا

مشکل ہے۔ ان کا خیال تھا کہ ایام طفولیت میں قرآن حفظ کرنے سے انہیں عربی سیکھنے میں مدد ملے گی۔ اس طریقۂ تعلیم پر تنقید کرتے ہوئے ابن خلدون لکھتا ہے :۔

بے شک قرآن اللہ کا کلام ہے جسے اس نے بندوں کے لیے اتارا ہے لیکن جب تک بچہ اس کے معانی نہ سمجھے اور اس کے اندر قرآن کے اسالیب بیان کا ذوق نہ پیدا ہو اس کا زبان سیکھنے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ قرآن کی لغوی و معنوی تاثیر صرف اس وقت ہو سکتی ہے جب بچے اپنی پختگی میں ایک خاص درجے پر پہنچ جائے اور جو وہ پڑھے اس کے معانی سمجھنے لگ جائے

قرآن کے دوسرے زبانوں میں ترجمے کے بارے میں ابن خلدون کی رائے ہے کہ ان القرآن والسنۃ عربیان ولا یمکن ترجمتھما وبخاصۃ القرآن الکریم (بے شک قرآن اور سنت عربی میں ہیں اور ان کا ترجمہ ممکن نہیں اور خاص طور پر قرآن کریم کا۔)

ابن خلدون کی رائے میں دو عوامل جو تعلیم کی راہ میں رکاوٹ بن گئے ہیں ان میں سے پہلی کتابوں کے اختصار کا رواج بھی ہے۔ اس پر بحث کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ علمائے متاخرین کو اس طریقۂ اختصار سے خاص شغف رہا ہے۔ اسی لیے مختصرات اور متون کی بڑی کثرت ہوگئی ہے۔ ان علمائے متاخرین میں سے وہ فقہ اور اصول میں ابن الحاجب اور نحو میں ابن مالک کا نام لیتا ہے۔ ان مختصرات پر تنقید کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے :۔

یہ تعلیم کے لیے وجہ فساد، تحصیل علوم کے لیے باعث اختلال اور مختصر و عسیر الفہم عبارت کے الفاظ کو حل کرنے اور ان سے مسائل کے استخراج کے لیے متعلم کے وقت کو ضائع کرنے کا سبب ہیں۔ اور یہ چیز تعلیم سے جو ملکہ حاصل ہوتا ہے اس کی راہ میں ایک روک بن گئی ہے۔ متاخرین کا مختصرات کی طرف اس لیے رجحان ہوا کہ انھوں نے متعلمین کے لیے ان کا حفظ کرنا آسان دیکھا۔ چنانچہ انھوں نے متعلمین کو اس سخت راہ پر ڈال دیا جو ان میں اور نفع بخش ملکات کے حصول میں حائل ہوگئی ہے

کہا جاتا ہے کہ بعد کے زمانے میں علماء ترک امراء سے تقرب حاصل کرنے کے لیے متون مرتب کیا کرتے تھے۔ کیونکہ ان کی اولاد کے لیے ان متون کے ذریعے علوم کا حفظ کرنا ممکن ہوتا تھا۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ مختصرات کی ترتیب اور متعلمین کو متون حفظ کرانے میں جو اس قدر اہتمام کیا جاتا تھا یہ ایک بڑا قوی محرک تھا اس جمود کا جو ان زمانوں میں ثقافت کے اندر واقع ہوا

ابن خلدون بچوں کے ساتھ نرمی برتنے اور ان پر سختی نہ کرنے کی نصیحت کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ تعلیم کے معاملے میں متعلم پر جبر کرنا اس کی جسمانی صحت کے لیے مضر ہے اور خاص طور سے بچوں پر اس کا برا اثر ہوتا ہے۔ اگر لڑکے پر سختی کی جائے اور اسے دبایا جائے تو وہ تنگ آجاتا ہے اور اس کی چستی و مستعدی ختم ہو جاتی ہے۔ اس کا جھوٹ، تساہل اور مکر و فریب کی طرف رجحان ہو جاتا ہے اور اس صورت میں وہ ظاہر کرنے لگتا ہے جو اس کے ضمیر میں نہیں ہوتا اور اس طرح صغیر سنی ہی سے اس کے دل میں انسانیت کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہتی۔ اس ضمن میں ابن خلدون یہود کی مثال دیتے ہوئے لکھتا ہے:

تم یہود کی طرف دیکھو کہ ان میں (اس سختی اور جبر کی وجہ سے) کتنے برے اخلاق پیدا ہو گئے ہیں یہاں تک کہ ہر جگہ اور ہر زمانے میں وہ مکر و فریب کے ساتھ موصوف کیے جاتے ہیں۔

ابن خلدون معلمین اور والدین کو نصیحت کرتا ہے کہ وہ تعلیم و تربیت میں بچوں کے ساتھ سختی نہ کریں اس سلسلے میں وہ کہتا ہے۔ بہترین طریقہ تعلیم وہ ہے جس کی کہ ہارون رشید نے اپنے بیٹے امین کے استاد اور مربی کو نشان دہی کی تھی۔ ہارون نے کہا تھا:۔ اے احمر! امیر المومنین نے اپنی جان اور اپنے دل کا ٹکڑا تمہارے حوالے کیا ہے۔ اس پر اپنا ہاتھ نرم رکھو، اس کے لیے تمہاری اطاعت لازمی ہے۔ امیر المومنین نے اس کے معاملے میں تمہیں جس مقام پر بٹھایا ہے تم اسی مقام پر رہو۔ اسے قرآن پڑھاؤ تاریخ سے باخبر کرو اسے شعر سناؤ اور شعر کی تعلیم دو۔ کلام شروع کرنے کے آداب اور اس کے موقع محل کا اس کے اندر ذوق پیدا کرو جب بنو ہاشم کے بزرگ آئیں تو ان کی تعظیم کرنا اسے سکھاؤ جب اس کی مجلس میں فوجی سردار آئیں تو انہیں باعزت جگہ دو جو بھی لمحہ گزرے اس سے فائدہ اٹھاؤ اور اس میں اسے کچھ سکھاؤ لیکن اس طرح نہیں کہ یہ اس پر بار ہو اور اس کا ذہن جامد ہو جائے۔ اس سے زیادہ درگذر نہ کرو، اس سے اسے فراغت اچھی لگنے لگے گی اور وہ اس سے مانوس ہو جائے گا جہاں تک ممکن ہو اسے اپنے سے قریب کرکے اور نرمی سے راہ راست پر رکھو اور اگر یہ دونوں چیزیں کام نہ دیں تو اس پر سختی کرو۔

ابن خلدون لکھتا ہے کہ بچے وعظ و نصیحت سے زیادہ دوسروں کو جو کچھ کرتا دیکھتے ہیں اس سے سیکھتے ہیں۔ ابن خلدون نے یہ رائے عمرو بن عتبہ کے اس خط سے لی ہے جو اس نے ایک معلم کے نام لکھا تھا عمرو بن عتبہ نے لکھا تھا:۔

تمہارا میرے بیٹوں کی اصلاح کی طرف پہلا قدم یہ ہونا چاہیے کہ تم خود اپنی اصلاح کرو کیونکہ ان کی آنکھیں تمہاری آنکھ سے مربوط ہیں ان کے نزدیک اچھا وہ ہے جو تم کرو اور برا وہ ہے جس کو تم ترک کر دو۔ انہیں اللہ کی کتاب کی تعلیم دو لیکن اتنی زیادہ نہیں کہ وہ اسے ناپسند کرنے لگیں اور نہ انہیں اللہ کی کتاب کی تعلیم سے اتنا دور رکھو کہ وہ اسے یکسر چھوڑ دیں۔ انہیں اشرف ترین حدیثیں اور پاکیزہ اشعار سناؤ۔ ان کو ایک علم سے دوسرے علم میں اس وقت تک نہ لے جاؤ جب تک وہ پہلے میں پکے نہ ہو جائیں۔ دل میں بہت سی باتوں کا جمع ہو جانا فہم کو مصروف رکھتا ہے۔ انہیں حکماء کے طریقے سکھاؤ اور عورتوں سے باتیں کرنے سے روکو۔ میں نے تمہاری استعداد و قابلیت پر بھروسہ کیا ہے تم میری طرف سے کسی عذر کا خیال نہ کرنا ۔"

ابن خلدون کے نزدیک تعلیم ایک اجتماعی عمل ہے۔ اس بارے میں وہ کہتا ہے۔ "چونکہ علم و تعلیم ان اجتماعی اعمال میں سے ہے جو انسان کے ساتھ مخصوص ہے اس لیے ان کا عمل دخل بدویانہ زندگی سے زیادہ شہری زندگی میں ہے۔ کیونکہ ان کی حاجت اس وقت ہوتی ہے جب اجتماعی زندگی میں ترقی کرتی ہے" ایک اور بڑے پتے کی بات جو ابن خلدون نے کہی وہ یہ ہے کہ تعلیم اپنی زبان میں ہونی چاہیے۔ وہ کہتا ہے کہ ان التدریس بلغۃ اجنبیۃ نصف التدریس (اجنبی زبان میں درس دینا نصف درس کے برابر ہے۔) کسی ایک فن میں مہارت سے مراد یہ نہیں ہوتی کہ اس مہارت کا دائرہ صرف اسی فن تک محدود رہے بلکہ اس فن سے مشابہ جو اور فنون ہوں ان میں بھی انسان کو دسترس ہو جاتی ہے۔ اس ضمن میں ابن خلدون لکھتا ہے :۔ مثال کے طور پر ایک شخص نے خوش خطی میں مہارت کی حاصل کی ہے تو جب وہ دیواروں پر نقش و نگار بنانا سیکھے گا تو اس کی یہ خوش خطی کی مہارت ادھر منتقل ہو جائے گی۔ اس طرح اگر ایک شخص حساب میں مہارت رکھتا ہے تو وہ جبر و ہندسہ بڑی آسانی سے سیکھ سکتا ہے۔

زبان سیکھنے کے متعلق ابن خلدون نے یہ گر بتایا ہے کہ متعلم اس زبان کے فصحاء و بلغاء اور ادباء کے اقوال کثرت سے یاد کرے اور انہیں ازبر کرے لیکن اس کے بعد وہ یہ رائے دیتا ہے —

وعلی المتعلم بعد الحفظ ان ینسی ما حفظ

(ترجمہ: متعلم پر سب حفظ کرنے کے بعد جو کچھ اس نے حفظ کیا ہو اسے بھلا دے۔

عربی سے ترجمہ "الرحیم"

مہادیوی ورما
ترجمہ: محمد فاروق خان

دورِ حاضر کی عورت

ازمنہ وسطی اور دورِ حاضر کے اتصال کے موقع پر عورت نے جب پہلے پہل اپنی حالت پر بے اطمینانی ظاہر کی اس وقت اس کی حالت اس غم زدہ کی سی تھی جس کے ظاہری درد و غم کے غیر محسوس اسباب کی تشخیص نہ ہو سکی ہو۔ اس سے اس کو ناقابل برداشت تکلیف تھی، لیکن اس بارے میں 'کہاں' اور 'کیا' کا کوئی جواب نہ ملتا تھا۔ زیادہ دقیق اسباب کی چھان بین کرنے کا اسے موقع بھی نہ تھا، لہٰذا اس نے مرد سے اپنا مقابلہ کر کے جو فرق پایا اسی کو اپنی افسوسناک حالت کا واضح سبب سمجھ لیا۔ اس عمل سے اسے اپنی تکلیف کے کچھ اسباب بھی ملے، لیکن یہ خیال بالکل بے بنیاد نہیں کہ اس طرح میں کچھ سہو اور غلطیاں بھی ہوئیں۔ دو چیزوں کا فرق ہمیشہ ان کی برتری اور کمتری کی علامت نہیں ہوتا۔ یہ اکثر آدمی بھول جاتا ہے۔ عورت سے بھی یہی مشہور و معروف غلطی ہوئی۔ نفسیاتی نقطۂ نظر سے، جسمانی نشو و نما کے اعتبار سے اور معاشرتی زندگی کے نظم کے لحاظ سے عورت اور مرد میں خاص فرق رہا ہے اور آئندہ بھی رہے گا لیکن یہ ذہنی یا جسمانی فرق نہ کسی کی برتری اور فضیلت کا مظہر ہے اور نہ کسی کی کمتری کا۔

عورت سے بھی یہی مشہور و معروف غلطی ہوئی۔ نفسیاتی نقطۂ نظر سے، جسمانی نشو و نما کے اعتبار سے اور معاشرتی زندگی کے نظم کے لحاظ سے عورت اور مرد میں خاص فرق رہا ہے اور آئندہ بھی رہے گا لیکن یہ ذہنی یا جسمانی فرق نہ کسی کی برتری اور فضیلت کا مظہر ہے اور نہ کسی کی کمتری کا۔ عورت نے واضح اسباب کی عدم موجودگی میں اس فرق کو خاص نقص سمجھا حقیقت صرف اتنی ہی نہیں ہے، بلکہ یہ بھی لگتا ہے کہ اس نے معاشرتی فرق و امتیاز کے سبب کی تلاش میں نسائیت کو مجروح کر ڈالا۔

اس نے تہیہ کیا کہ اس جذبے کا جڑ، بنیاد سے خاتمہ کر ڈالے گی جس کا سہارا لے کر مرد اسے صنف نازک قرار دیتا ہے۔ اس گھر کے قید و بند کو توڑ کر رکھ دے گی جس کی چار دیواری نے اسے مرد کی خادمہ (باقی)

بنا دیا ہے۔ اور اس ملائمت اور نزاکت کا نام بھی نہ رہنے دے گی جس کی وجہ سے خارجی دنیا کی سخت کش مکش سے بچنے کے لیے اسے مرد کی حفاظت میں آنا پڑا ہے۔ عورت نے مجموعی حیثیت سے جتنا مرد کو دیا اتنا اس سے پایا نہیں، یہ بلا بحث و تمحیص کے ثابت ہے لیکن اس لین دین کی ناہمواری میں عورت اور مرد کی فطرت بھی کام کرتی ہے۔ یہ نہ بھولنا چاہیے۔ عورت حد درجہ ایثار اس لیے نہیں کرتی اور وہ حد درجہ متحمل مزاج اس لیے نہیں ہوتی کہ مرد اسے کمتر سمجھ کر اس کے لیے مجبور کرتا ہے۔ اگر ہم بغور دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ اسے یہ وصف صفت بہادری کی تکمیل کے لیے فطرت نے عطا کیے ہیں۔ یہ اچھے ہیں یا برے، اس کے تجزیے کی خاص ضرورت نہیں، جاننا اتنا ہی ہے کہ یہ فطری ہیں یا نہیں۔ اس بارے میں عورت خود بھی اندھیرے میں نہیں ہے۔ وہ اپنی فطری ملائمت اور نرمی کو نقص چاہے سمجھتی ہو لیکن اسے فطری ضرور مانتی ہے، ورنہ اس کی اتنی کوشش کا کوئی معنی نہ ہوتا۔ حالات کے پیدا کردہ عیوب جتنی جلدی مٹ سکتے ہیں اتنی جلدی تہذیب کے پیدا کردہ نہیں مٹتے۔ یہی خیال عورت کو ضرورت سے زیادہ سخت بنے رہنے کو مجبور کر دیتا ہے لیکن یہ سختی اتنی شدید ہوتی ہے کہ عورت خود بھی سکھی نہیں ہو پاتی۔ زرہ باہر کے تیروں کی بارش سے جسم کو بچاتی ہے، لیکن اپنا بار جسم پر ڈالے بغیر نہیں رہ سکتی۔

دورِ حاضر کی عورت نے اپنی زندگی کو اتنی محنت اور کوشش سے جو شکل دی ہے وہ کتنی فطری ہو سکتی ہے، یہ بتانا بھی ممکن نہیں۔ ہاں اتنا کہہ سکتے ہیں کہ وہ بہت حسین مستقبل کی خبر دیتی معلوم نہیں ہوتی۔ عورت کے لیے اگر اسے کسی طرح کا رآمد سمجھ بھی لیا جائے۔ تو مستقبل کے شہریوں کے لیے اس کی افادیت سمجھ سکنا مشکل ہی ہے۔

دورِ حاضر کے ماحول میں پلی ہوئی عورت کی اپنے اغراض و مقاصد میں مرکوز اور کامل شکل دیکھنی ہو تو ہم اسے مغرب میں دیکھ سکیں گے۔ عورت وہاں معاشی نقطے سے آزاد ہو چکی ہے۔ اس لیے سارے معاشرتی پابندیوں پر اس کا شبہ زیادہ غلبہ کہا جا سکتا ہے۔ اسے مرد کی تفریح کا سامان بنے رہنے کی ضرورت نہیں ہے لہٰذا وہ چاہے تو قدیم و روایتی دل آویزی کو ترک کر کے سکھی ہو سکتی ہے لیکن اس کی حیثیت اور حالت کیا اس کا ثبوت بہم پہنچا سکے گی کہ وہ قدیم عورت کی کمزوریوں سے پاک ہے۔ غالباً نہیں۔ زیب و زینت کے اتنے بے شمار سامان شکل و صورت قائم رکھنے کے اتنے مصنوعی اسباب، لبھانے کو جاذبِ نظر بنانے کی مضحکہ خیز کوشش وغیرہ کیا اس بارے میں کوئی شک

شبہہ باقی رہنے دیتے ہیں؟ عورت کی دلآ ویزی کا خاتمہ نہیں ہو سکا۔ چاہے اسے عظمت بخشنے والے اوصاف کا خاتمہ ہو گیا۔ اگر مرد کو بے خود کر دینے والی شکل و صورت کی خواہش نہیں مٹی اسے باندھ رکھنے والی کشش اور جاذبیت کی کھوج نہیں گئی تو پھر نسائیت سے ہی بے اعتنائی کیوں برتی گئی، یہ بتانا مشکل ہے لیکن جذبات کا ہونا ہی باعث ننگ و عار تھا تو اس کا بالکل استیصال کر دینا چاہیے تھا، لیکن دورِ حاضر کی عورت ایسا کرنے سے بھی عاجز رہی۔ جس کام کو وہ بہت کامیابی کے ساتھ کر سکی ہے وہ بس فطرت سے بگاڑ کی طرف جانا ہے۔ وہ اپنی فطرت کو لباسوں کی طرح زندگی کا بس خارجی غلاف بنانا چاہتی ہے، جسے خواہش اور ضرورت کے مطابق جب چاہے پہنا یا اتارا جا سکے باہر کش مکش سے بھری ہوئی زندگی میں جس مرد کو نیچا دکھانے کے لیے وہ سبھی میدانوں میں سخت سے سخت محنت کرے گی۔ گزر اوقات کے لیے ہر ضروری چیز کو اپنے پسینے کے قطروں سے تول کر قبول کرے گی۔ اسی مرد میں عورت کے لیے تجسس اور طلب بیدار رکھنے کے لیے وہ اپنے حسن و جمال اور اعضائے جسمانی کی موزونیت کو باقی رکھنے کے لیے دشوار سے دشوار کام کرنے کے لیے پیش پیش ہے۔ آج اسے اپنی شکل و صورت اپنے جسم اور اپنی کشش اور دلآ ویزی کا جتنا خیال ہے اسے دیکھتے ہوئے کوئی بھی صاحب نظر عورت کو آزاد نہ کہہ سکے گا۔

عورت کے متعلق مرد کی ایک پر اسرار طلب و جستجو تعمیر کائنات کی طرح قدیم بھی ہے، اسے ماننا پڑیگا لیکن یہ طلب و جستجو ان کے تعلق کی ابتدا اور انتہا نہیں۔ قدیم زمانے کی عورت نے مرد سے اپنے تعلق کو ایسی حالت میں پہنچا دیا جہاں ان دونوں کے اغراض و مقاصد ایک ہو گئے اور ان کی شخصیت ایک دوسرے سے وابستہ ہو گئی۔ یہی عورت کی خصوصیت تھی جس نے اسے تفریح کے حسین سامانوں کے درجے سے اٹھا کر باعظمت ماں اور منتظمہ کے منصب پر فائز کر دیا۔

دورِ حاضر کی عورت۔ مرد کے اور اپنے تعلق کو پر اسرار طلب و تجسس سے شروع کر کے اسے وہیں قائم کرنا چاہتی ہے جو شاید اسے کسی دائمی حصول و عطا کا حق نہیں بخشتا۔ شام کے رنگین بادل یا قوسِ قزح کے رنگ ہمیں تھوڑی دیر کے لیے حیرت زدہ اور مسحور کر لیتے ہیں لیکن اس سے زیادہ ان کی کوئی منفعت ہو سکتی ہے۔ یہ سوچنا بھی نہیں چاہیے۔ آج کی حسین و جمیل عورت بھی مرد کے نزدیک اس سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی اس لیے خود بھی اس تلخ حقیقت کا احساس ہوتا ہے مگر وہ اسے صرف حالات کی خرابی قرار دیتی

ہے۔ آج مرد کے نزدیک عورت صرف آراستہ و مزین نسائیت لے کر کھڑی ہے۔ یہ وہ ماننا نہیں چاہتی،
لیکن درحقیقت یہی بات حق ہے۔ پہلے عورت صرف شکل و صورت اور سن و عمر کا نادرا لے کر دنیا کے
سفر کے لیے نہیں نکلی تھی۔ اس نے دنیا کو وہ دیا جو مرد نہیں دے سکتا تھا، لہٰذا اس کی لافانی عطا کا وہ
آج تک احسان مند ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس کی بخشش کو دنیا اپنا پیدائشی حق سمجھنے لگی جس سے بگاڑ بھی پیدا
ہو گیا، لیکن اس کے دفعیہ کے لیے جو تدبیریں کی گئیں وہ اس بگاڑ کو دوسری طرف پھیرنے کے علاوہ اور کچھ
نہ کر سکیں۔

مغرب میں عورت نے بہت کچھ حاصل کر لیا مگر سب کچھ پا کر بھی اس کے اندر کی عورت نہیں بدل سکی۔
مردان کی نسائیت کی طرف سے بے اعتنائی برتے۔ یہ اسے بھی گوارا نہ ہوا اس لیے وہ انتھک دل جمعی سے
اپنی خارجی دلآویزی کو بڑھانے اور قائم رکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ مغرب میں عورت کی حالت کی جو
خصوصیت ہے اس میں مرد کے متعلق مسابقت کے ساتھ ہی اسے اپنی دل کش دل آویزی کے ذریعے مسحور
کرنے کا رجحان بھی کام کرتا ہے۔ مرد بھی اس کے میلان و رجحان سے ناواقف نہیں رہا۔ اس سے اس
کے برتاؤ میں نفسانی خواہش اور بے وفائی کو ہی اولیت حاصل ہے۔ عورت اگر رنگین کھلونے کی طرح
دل آویز ہے تو وہ مسحور و بے خود ہو جائے گا۔ اگر نہیں تو وہ اسے تحقیر و بے اعتنائی ہی کے لائق سمجھ گا
یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ دونوں ہی حالتیں عورت کے لیے ذلت آمیز ہیں۔ مغرب کی عورت کی حالت
کا مطالعہ کر کے اگر ہم اپنے ملک کی دورِ حاضر سے متاثر خواتین کا مطالعہ کریں تو دونوں ہی طرف بے اطمینانی
اور اس کے دفعیہ میں حیرت انگیز حد تک یکسانیت ملے گی۔

ہمارے یہاں کی عورت صدیوں سے اپنے حقوق سے محروم چلی آ رہی ہے۔ کتنے ہی سیاسی اور
معاشرتی حالات نے اس کی حالت میں تبدیلی پیدا کرتے کرتے اسے جس تباہی کی حالت میں پہنچا دیا ہے
اسے افسوسناک حالت کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس حالت کو پہنچ کر بھی جو شخص بے اطمینانی کا
اظہار نہیں کرتا اسے اس حالت کے لائق ہی سمجھنا چاہیے۔ نرم و نازک روئی کی سی چیز بھی بہت دبائے
جانے پر آخر میں سخت معلوم ہونے لگتی ہے۔ بھارت کی عورت بھی ایک دن بغاوت کر ہی اٹھی۔ اس نے
بھی مرد کے غلبہ کا سبب اپنے نازک احساسات و جذبات کو سمجھا اور انھیں کو بدل ڈالنے کی کوشش
کی۔ کتنے ہی معاشرتی رسم و رواج اور قدیم و روایتی تہذیب کے سبب اسے مغرب کی عورت کی

رح نہ آسانیاں ملیں اور نہ اچھا موقع میسر آسکا، مگر اس نے انھیں کو اپنا رہنما بنانے کا فیصلہ کیا۔
تعلیم کے انتہائی فقدان اور حالات کی ناہمواری کے سبب کم عورتیں اس ترقی پسندی کو اپنا سکیں اور جنھوں نے ان رکاوٹوں سے اوپر اٹھ کر انھیں اپنایا بھی انھیں اس کی خارجی شکل بھی زیادہ پرکشش معلوم ہوئی ـــــ بھارت کی عورت نے بھی اپنے آپ کو مرد کی مسابقت میں کامل دیکھنے کا تصور کیا۔ لیکن صرف اسی کی شکل سے اس کے نسائی احساسات کو سکون نہ مل سکا۔ اس کی بھی فطری ملائمت وجود و عدم کے درمیان میں ڈگمگاتی رہی۔ کبھی اس نے پوری طاقت سے اسے دبا کر اپنی ایسی سختی کا اظہار کیا جس سے اس کے تمام نازک اعضاء کے مجروح ہونے کا پتہ چلتا تھا اور کبھی وقتی جوش و اشتعال کی پیدا کردہ سختی اور بے مروتی کے غلاف کو اتار کر بلاوجہ اپنا ہلکا پن ظاہر کیا۔ مرد کبھی اس سے اسی طرح خوف زدہ ہوا جیسے باخبر شخص پاگل سے ہوتا ہے اور کبھی اسی طرح اس پر ہنسا جیسے بڑا شخص بچے کی بچکانہ کوششوں پر ہنستا ہے۔
یہ بتلانے کی ضرورت نہیں کہ مرد کے ایسے برتاؤ سے عورت کی اور زیادہ خرابی ہوئی۔ کیونکہ اس سے اپنی قابلیت کا تعارف کرانے کے ساتھ ساتھ اپنے علم اور بڑے ہونے کا ثبوت دینے کی کوشش بھی کرنی پڑی۔ اس کی ساری کوششیں بے ضرورت ہونے کے سبب ہی کبھی کبھی افسوسناک معلوم ہوتی ہیں، مگر وہ کرے بھی تو کیا کرے۔ ایک طرف روایتی و قدیم رسم و رواج اور تہذیب نے اس کے دل میں یہ تصور پیدا کر دیا ہے کہ مرد فکر، عقل اور طاقت میں اس سے افضل ہے اور دوسری طرف اس کے اندر کا نسائی رجحان بھی اسے جھکنے نہیں دیتا۔ انھیں دونوں تصورات کے درمیان میں اسے اپنی ایسی حیرت انگیز قابلیت کا تعارف کرانا ہے جو اسے مرد کے برابر بٹھا دے۔ اچھا ہوتا اگر عورت حریفانہ مقابلے کے میدان میں بغیر اترے ہی اپنی افادیت کی بنیاد پر حقوق کی مانگ سامنے رکھتی، مگر حالات اس کے لیے سازگار نہیں تھے جو حاصل نہیں ہے اس کا حصول مشکل نہیں ہے مگر جو حاصل تھا اسے کھو کر پھر پانا بہت ہی مشکل ہے۔ ایک میں پلنے والے کی قابلیت متوقع رہتی ہے اور دوسرے میں ناقابلیت۔ اسی لیے ایک کا کام اتنا دشوار نہیں ہوتا جتنا دوسرے کا۔ عورت کے حقوق کے بارے میں بھی یہی بات سچی ہے۔   (باقی)

تاشقند اعلان کے مخالفین

اور

مسلم پریس

ہندوستان میں پارٹی کی حیثیت سے جن سنگھ، ہندو مہاسبھا، راشٹریہ سیوک سنگھ اور ایس ایس پی نے اعلان تاشقند کی مخالفت کی ہے اور انفرادی حیثیت سے خود حکمراں پارٹی کے متعدد افراد نے کھل کر اس سے اختلاف کیا ہے۔ یہاں تک کہ ایک مرکزی وزیر اسی کی بنیاد پر مستعفی ہو گئے۔ بہت سے کانگریسی ایسے بھی ہوں گے جنہوں نے کھل کر مخالفت نہیں کی۔ مخالفت میں سب سے نمایاں جن سنگھ ہے لیکن اس پارٹی کی مخالفت بھی بس برائے نام ہے لیکن اس کے باوجود ہمارے مسلم پریس نے اعلان تاشقند کے مخالفین پر لے دے کرنے، ان کے لتے لینے، ان پر الزامات کی بوچھار کرنے اور حکمرانوں پر مدح وثنا اور تحسین و تعریف کے پھول برسانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور افسوس یہ ہے کہ اس معاملے میں مسلم صحافت کے سنجیدہ ترین حلقے نے بھی ایسی پست سطح پر اتر کر بات کی ہے جو کسی طرح اس کے شایان شان نہیں ہے۔ میں نے اب تک اس مسئلے پر مسلم اخبارات کے جتنے اداریے اور تبصرے پڑھے ہیں (ایک ہفتہ وار کا مختصر نوٹ چھوڑ کر) ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہ تھا جس میں مخالفین کے نقطہ نظر پر اور اعلان تاشقند سے پہلے دونوں حکومتوں نے جو کچھ کیا اور کہا تھا اس پر سنجیدگی کے ساتھ گفتگو کی گئی ہو اور مخالفین و موافقین کو صحیح مشورے دیے گئے ہوں۔ ان میں صرف تین چیزیں پائی گئی ہیں۔ ہندوستانی و پاکستانی حکومتوں کی مدح وثنا — مخالفین کی مذمت اور ان کی نیتوں پر حملے — اعلان تاشقند کی روح کو محفوظ رکھنے اور اس کو ترقی دینے کی رٹ۔ ان تین باتوں کے علاوہ اگر آپ یہ جاننا چاہیں کہ اعلان تاشقند کی روح کیا چیز ہے۔ کیسے پیدا ہوئی یہ روح نیک ہے یا روحِ

یہ بھی ابہام و تفہیم کا نتیجہ ہے یا بیرونی دباؤ کی پیداوار تو ان صحافیان کرام کی تحریروں میں آپ کو ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں ملے گا۔ ان کے نقطۂ نظر سے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ روس کے وزیراعظم مسٹر کوسی جن نے تاشقند میں گنگا جل اور آبِ زمزم بھی مہیا کیا تھا اور تاشقند اعلان پر دستخط کرنے کے بعد ایک وفد گنگا جل میں غوطے لگا کر پاک و پوتر ہو گیا اور دوسرا وفد آبِ زمزم سے غسل کر کے طاہر و مطہر بن گیا۔

اس اعلان سے اختلاف کرنے والوں کا جرم کیا ہے؟ یہی نا کہ وہ حکومت کے سربراہوں کو وہ وعدے یاد دلا رہے ہیں جو انھوں نے پوری صراحت و وضاحت سے کیے تھے۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ کشمیر کو ناقابلِ گفتگو مسئلہ کہا گیا تھا؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ پورے زور و شور سے نعرہ لگایا گیا تھا کہ کرگل، ٹتھوال اور درہ حاجی پیر سے واپسی کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا جب تک پاکستان صراحتاً اس کی ذمہ داری قبول نہ کرے کہ اس نے دراندازی بھیجے تھے۔ جب تک وہ انہیں واپس نہ بلائے اور جب تک وہ اس کا وعدہ نہ کرے کہ آئندہ وہ ایسی حرکت ناشائستہ نہیں کرے گا اس وقت تک ہم درہ حاجی پیر سے واپسی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ مرکزی وزیر تعلیم نے یہ فرمایا تھا کہ پاکستان چھمب کے علاقے سے ہٹ بھی جائے تو ہم درہ حاجی پیر سے نہیں ہٹیں گے۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ کشمیر کے وزیراعظم نے کہا تھا کہ مقبوضہ کشمیر کے جن علاقوں پر ہم نے قبضہ کیا ہے وہ ہمارے اپنے علاقے ہیں ان سے واپسی کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اعلان تاشقند میں کیا ان سب اعلانات اور وعدوں کی خلاف ورزی نہیں کی گئی ہے؟ کیا ہمارے وزیر خارجہ کی تاویلیں تسلی بخش ہیں؟ ان تاویلوں سے تو بہت سے موافقین بھی متفق نہیں ہیں۔ مخالفین کو کیا تسلی ہوگی

ہمارے صحافی یہ کر سکتے تھے کہ وہ حکومت سے یہ کہتے کہ جرأت و وضاحت کے ساتھ اس کو اعلان کرنا چاہیے کہ وہ اپنے وعدوں سے ضرور پیچھے ہٹی ہے لیکن ملک کے مفاد میں پیچھے ہٹی ہے اور مخالفین سے یہ کہتے کہ ملک کے مفاد میں جو پسپائی ہو وہ قابلِ اعتراض نہ ہونی چاہیے۔ اعلان تاشقند میں ہندوستان، پاکستان کے مقابلے میں اپنے موقف سے بہت کم پیچھے ہٹا ہے اس لیے اس کی مخالفت ترک کر کے انہیں اعلان کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے لیکن انھوں نے یہ طریقہ اختیار کرنے کے بجائے مخالفین کی نیتوں پر حملے شروع کر دیے اور حکومت کی بارگاہ میں احسنت و مرحبا کے ترانے الاپنے لگے اور انصاف کی بات یہ ہے کہ مخالفین کو اس شور کے باوجود اس کا پورا حق حاصل ہے کہ وہ اس اعلان کی مخالفت

کے لیے مضر سمجھیں اور اس کے خلاف احتجاج کریں ان پر ہوس اقتدار یا شرارت کا الزام لگانا صریح زیادتی ہے اور یہ ہوس اقتدار کا الزام بھی خوب ہی ہے گویا جو پارٹی برسر اقتدار ہے اس کو ہمیشہ برسر اقتدار رہنا چاہیے اس لیے کہ یہ اس کا پیدائشی اور جائز حق ہے اب کسی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ اس کو اس پیدائشی حق سے ہٹانے کی سعی کرے۔

کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ پاکستان سے جنگ کے زمانے میں حکومت کے تمام ذرائع و وسائل جنگی جنون اور پاکستانی حکومت سے نفرت پیدا کرنے میں لگے ہوئے تھے؟ کسی مصلحت سے سہی لیکن کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہندوستان کی بہادر فوجوں نے لاہور اور سیالکوٹ پر حملہ حکومت کی اجازت سے کیا تھا؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ آں جہانی شری لال بہادر شاستری نے یہ فرمایا تھا کہ یہ جنگ پاکستان کی جارحیت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دے گی؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ کشمیر کے ساتھ عوام کے جذبات کو اتنی شدت کے ساتھ وابستہ کر دینے میں حکومت کا اپنا ہاتھ ہے؟ کیا یہ سب کچھ اعلان تاشقند کی مخالف جماعتوں نے کیا تھا؟ اور اب مخالف جماعتیں پوچھتی ہیں کہ فیصلہ کن مرحلے سے پہلے فوجیں محاذ جنگ سے کیوں ہٹائی جا رہی ہیں تو ہمارے یہ مسلم صحافی جواب میں ارشاد فرماتے ہیں کہ تم لوگ جنگ باز ہو۔ ابھی اسی ہفتے میں ہم نے ایک انگریزی ہفتہ وار کے اداریے میں پڑھا کہ شریمتی اندرا گاندھی اور مسٹر ایوب خاں "فاختہ" ہیں اور مخالف جماعتیں "شکرہ" یعنی وہ دونوں امن کی علامت ہیں اور یہ سب جنگ کی علامت — اور ان دونوں کے ہاتھ میں ان جنگ بازوں کی نگرانی و رہنمائی کی طاقت موجود ہے۔ ناانصافی اور بے جا خوشامد کے اس کثیف مواد کو دیکھ کر ابکائی آتی ہے۔ لطیفہ یہ ہے کہ ہندوستان میں حکمراں پارٹی کے کسی اونچے ذمہ دار شخص کی زبان سے آپ یہ "صلواتیں" نہیں سنیں گے۔ یہ "خدمت" ہمارا مسلم پریس انجام دے رہا ہے یہ نامنصفانہ روش اس حد تک پہنچی کہ ہمارے سنجیدہ اخبارات نے پاکستان کی مخالف جماعتوں پر بھی الزامات لگائے حالانکہ وہاں کے صحیح حالات اور رجحانات کے نقطہ نظر سے انہیں واقفیت بھی نہ تھی ایک انگریزی ہفتہ وار کے اسکینڈیر صاحب نے پاکستان کی چار مخالف جماعتوں کو جن سنگھ، ہندو مہاسبھا، راشٹریہ سیوک سنگھ اور ریمیکت سوشلسٹ پارٹی کے مشابہ قرار دیا تھا۔ شاید وہ اپنے آپ کو غیر فرقہ پرست ثابت کرنا چاہتے ہوں اسی لیے انھوں نے شعر مکمل کرنے کے لیے دوسرا مصرع عرض کرنا بھی مناسب سمجھا ورنہ شعر کیسے بنتا — اور صورت حال یہ ہے کہ اس خوشامدانہ طرز عمل کا دونوں ملکوں کے تعلقات درست کرنے میں ذرہ

، نہیں پڑتا اور نہ آئندہ پڑے گا۔ اگر یہ سچی اور کھری بات کہتے تو دنیا میں نہ سہی آخرت میں ان کا اجر
مل جاتا۔

یہ تبصرہ پڑھنے والوں کے ذہن میں شاید یہ سوال پیدا ہو کہ آخر سنجیدہ ترین مسلم صحافیوں کا کون سا ذاتی مفاد
وابستہ ہے کہ وہ اس سطح پر اتر گئے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ انھوں نے ذاتی مفاد کے تحت نہیں بلکہ ملی
مفاد کے تحت یہ سب کچھ کیا ہے۔ چونکہ ہندوستان و پاکستان کے درمیان امن و صلح ہی میں یہاں کے
مسلمانوں یا بقول تخلص بھوپالی "قوم یتیم" کی خیر ہے ورنہ ردعمل کا فلسفہ ہر وقت ان کی خبر لینے کے لیے تیار
ہے اس لیے ہر ایسے موقع پر اس قوم کے لیڈر (الا ماشاء اللہ) اور صحافی سب سے بلند آواز میں پیغام صلح دینے
لگتے ہیں۔ ان کی بلند آہنگی کا حالات پر کوئی اثر مترتب نہیں ہوتا لیکن یہ چیخنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے
ہیں جس طرح بکری قصاب کی چھری دیکھ کر زور زور سے ممیانے پر مجبور ہوتی ہے۔ اس طرز عمل سے ہندوستان
کے مسلمانوں میں کہتری و مرعوبیت کا جو احساس پیدا ہوتا ہے وہ ان لیڈروں اور صحافیوں کی نگاہ سے
اوجھل ہے۔

ان اخبارات کے مدیران محترم تمام دنیا کے مسلمانوں کے درمیان اتحاد و اشتراک مفاد کی دعوت دیتے
رہتے ہیں لیکن جب ہندوستان و پاکستان کا معاملہ آتا ہے تو یہ صرف یہاں کے مسلمانوں کی خیر منانے لگتے
ہیں اس وقت ان کی "وسیع النظری" تنگ نظری میں بدل جاتی ہے اور لطف یہ ہے کہ اس سے یہاں کے
مسلمانوں کو کوئی فائدہ بھی نہیں پہنچتا۔

ہند و پاک وزراء کی حالیہ کانفرنس سے دونوں حکومتوں کے "خلوص" کی مبالغہ آمیز شاعری کے تار و پود
بکھرنے لگے ہیں۔ میں نے زندگی کے گزشتہ شمارے میں "تاشقند اعلان" کے تحت لکھا تھا کہ وزراء کی کانفرنس
کے لیے پاکستان نے جو ایجنڈا بھیجا ہے اس میں مسئلہ کشمیر کو اولیں مقام دینا اس بات کی علامت ہے کہ پاکستان
نے کشمیر کا خیال ترک نہیں کیا ہے۔ حالیہ کانفرنس نے ثابت کر دیا کہ ایجنڈا مقرر نہ ہونے کے باوجود بات
وہیں رہی جہاں تھی۔ ہمارے وزیر خارجہ شری سورن سنگھ نے راولپنڈی کانفرنس میں مسئلہ کشمیر کے حل پر پاکستان
کے اصرار کو تاشقند اسپرٹ کے خلاف کہا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان کے نزدیک تاشقند اسپرٹ
یا تو کشمیر کے مسئلے کو محض ثانوی حیثیت دے کر پیچھے ڈال دینے کا نام ہے یا اس سے بھی اعلیٰ درجہ کی اسپرٹ
یہ ہے کہ اس کا خیال پاکستان کو ہمیشہ کے لیے ترک ہی کر دینا چاہیے ـــــ میں نے گزشتہ شمارے میں یہ لکھا

لکھا تھا کہ "چونکہ امریکہ کے صدر بھی خواہش مند ہیں کہ دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات اچھے رہیں اس لیے اسی سے توقع ہوتی ہے کہ شاید چار و ناچار دونوں ملکوں کو کشمیر کے کسی حل پر اتفاق کرنا پڑے" حالیہ کانفرنس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دو ایک کانفرنسوں کے بعد پھر روس یا امریکہ کی سرپرستی میں تاشقند کانفرنس کی طرح کسی دوسری چوٹی کانفرنس کی ضرورت پڑے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان و پاکستان کے درمیان جنگ بندی اور تاشقند اعلان، روس و امریکہ کا دیا ہوا تحفہ ہے ورنہ مسٹر کوسی جن کوئی جادوگر نہیں ہیں جنھوں نے چھو منتر سے دونوں کے دل ملا دیے ہوں۔ اگر خدانخواستہ جھگڑے کی جڑ ختم نہ ہوئی تو دونوں ملکوں کے درمیان سرد جنگ کی پھر وہی فضا پیدا ہو سکتی ہے جو ۵ اگست ۱۹۶۵ء سے پہلے تھی۔

ادارہ

۶ مارچ ۱۹۶۶ء

تصحیح

جنوری ۱۹۶۶ء کے شمارے میں ص ۳۲ سطر ۸ میں کاتب صاحب نے ایک پوری عبارت چھوڑ دی ہے۔ اصل عبارت یہ ہے:۔

"تو اب جو رقم بچتی ہے وہ نصاب نہیں ہے اس لیے اس پر زکوٰۃ ادا کرنا واجب نہیں ہے اور اگر تیس روپیے کا مقروض ہے تو اب جو رقم بچتی ہے وہ نصاب یا اس سے زیادہ ہے اس لیے اس کو ستر روپیوں کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔

(ادارہ)

رسائل و مسائل

خطبۂ نمازِ عیدین کے بعد دعا ثابت نہیں ہے

سوال

ہمارے شہر میں نماز عیدین کے خطبے کے بعد دعا مروج ہے۔ آپ وضاحت سے تحریر کریں کہ عیدین کے خطبے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دعا ثابت ہے یا نہیں؟ اگر ثابت نہیں ہے تو اس پر عمل کیسا ہے؟ اور ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

جواب

عیدین کے خطبے کے بعد دعا کا ثبوت تو دور کی بات ہے۔ عیدین کی نماز کے بعد بھی دعا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے ثابت نہیں ہے۔ صحیح احادیث میں عید الفطر اور عید اضحیٰ کے دن نماز سے پہلے اور نماز کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال کا ذکر خاصی تفصیل سے موجود ہے۔ ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ نماز عیدین کے بعد دعا مانگی ہے اور نہ خطبے کے بعد۔ میں ذیل میں صرف بخاری شریف سے دو حدیثیں نقل کرتا ہوں:۔

عن عیاض بن عبد اللہ بن	عیاض بن عبداللہ بن ابی سرح سے روایت
ابی سرح عن ابی سعید الخدری	ہے۔ وہ حضرت خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں
قال کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم	انھوں نے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم عید الفطر اور
یخرج یوم الفطر والاضحی الی المصلی	عید الاضحیٰ کے دن عیدگاہ تشریف لے جاتے
فاول شیئ یبدء ابہ الصلوۃ ثم ینصرف	تھے اور وہاں آپ کا سب سے پہلا کام یہ
فیقوم مقابل الناس والناس جلوس	ہوتا کہ نماز ادا کرتے۔ پھر اس سے فارغ ہو کر

علیٰ صفوفہم فیعظہم ویوصیہم	لوگوں کے سامنے کھڑے ہو جاتے۔ اس حال میں
ویامرہم فان کان یرید ان	کہ لوگ اپنی صفوں پر بیٹھے رہتے پس آپ انہیں
یقطع بعثا اویامر بشیٔ امربہ	نصیحت کرتے اور انہیں (نیکیوں کی) ترغیب
ثم ینصرف	دیتے۔ پھر اگر آپ کا ارادہ کسی سمت فوج
بخاری شریف	بھیجنے کا ہوتا یا کسی خاص بات کا حکم دینا ہوتا
باب الخروج الی المصلی بغیر منبر	تو آپ ایسا کرتے پھر اس کے بعد واپس تشریف
	لے جاتے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز عیدین کے بعد کوئی دوسرا عمل کیے بغیر حضورؐ فوراً خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے اور خطبہ دینے کے بعد واپس تشریف لے جاتے تھے۔ ہاں کبھی کبھی ایسا ہوا ہے کہ خطبہ ختم کرنے کے بعد حضورؐ نے عورتوں کی صفوں میں جا کر خاص طور پر ان کو نصیحت کی ہے اور صدقہ و خیرات کی ترغیب دی ہے جیسا کہ دوسری حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے حضور کے عیدگاہ تک پہنچنے کے بعد کا عمل یہ بیان کیا ہے:۔

فصلی ثم خطب ثم اتی النساء	پس آپ نے نماز پڑھی پھر خطبہ دیا۔ پھر
ومعہ بلال فوعظہن وذکرہن	آپ عورتوں (کی صفوں) کے پاس تشریف
وامرہن بالصدقۃ فرایتہن	لے گئے اور آپ کے ساتھ بلال بھی تھے۔ پس آپ نے
یھوین بایدیہن یقذفنہ فی	نصیحت کی اور صدقے کی ترغیب دی پس میں
ثوب بلال ثم انطلق ھو وبلال	نے عورتوں کو دیکھا کہ وہ بلال کے کپڑے میں (اپنی
الیٰ بیتہ	انگوٹھیاں) ڈال رہی ہیں پھر آپ اور بلال
(بخاری باب العلم الذی بالمصلی)	اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

اس حدیث میں صراحت کے ساتھ مذکور ہے کہ خطبے کے بعد آپ نے عورتوں کو نصیحت کی اس کے بعد کوئی دوسرا کام نہیں کیا اور سیدھے اپنے گھر تشریف لے گئے۔ حضور کے بعد خلفائے راشدین کے دور میں یا تابعین کے دور میں یا اس کے بعد کہیں سے بھی خطبے کے بعد دعا کا ثبوت نہیں ملتا اور یہی وجہ ہے کہ یہاں بعد و صغار میں بھی ایسے علاقے کم ہی ہوں گے جہاں خطبے کے بعد دعا مانگی جاتی ہو۔ راقم الحروف

رحم میں پہلی بار میں نے یہ دیکھا کہ عیدین کے خطبے کے بعد با قاعدہ دعا مانگی جاتی ہے۔ پہلی بار تو تعجب ہوا تھا اور اب بھی جب ایسا ہوتا ہے انقباض محسوس کرتا ہوں۔ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند میں بھی عیدین کے خطبے کے بعد دعا کو ناجائز لکھا ہے اور دلیل یہی دی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول یا عمل کسی سے بھی اس کا ثبوت نہیں ملتا۔

اس سلسلے میں میری رائے یہ ہے کہ جہاں اپنا کچھ اختیار ہو وہاں عیدین کے نمازیوں کو انتہائی نرمی کے ساتھ مسئلہ بتایا جائے اور اگر وہ اس خلافِ سنت عمل کے ترک پر آمادہ ہو جائیں تو وہاں اس کو ترک کر دیا جائے۔ اس مسئلے میں اگر کسی معمولی خلفشار کا بھی اندیشہ ہو تو ترک پر اصرار نہ کیا جائے اور صبر و تحمل کے ساتھ مسئلے کو واضح کرتے رہنے کی سعی کی جائے۔

عیدین کی نماز کے بعد دعا کے بارے میں بھی میری رائے یہ ہے کہ اس کو بھی ترک کرنا چاہیے لیکن اس کا معاملہ خطبے کے بعد کی دعا کے معاملے سے ہلکا ہے۔

زکوٰۃ کی رقم سے تبلیغِ دین

سوال

اگر کوئی مسلمان زکوٰۃ کی رقم سے ہندی ترجمۂ قرآن خرید کر پڑھے لکھے مال دار غیر مسلموں کو محض تبلیغِ دین کی نیت سے دے تو یہ جائز ہے یا نہیں؟

جواب

زکوٰۃ کے مصارف میں ایک مصرف فی سبیل اللہ بھی ہے اور تبلیغ دین پر فی سبیل اللہ کا اطلاق بدرجۂ اولیٰ ہوگا۔ اس لیے میرے خیال میں پڑھے لکھے غیر مسلموں کو عام ازیں کہ وہ مال دار ہوں یا نہ ہوں اور ایسے ہندی داں مسلمانوں کو جو صاحبِ نصاب نہ ہوں مستند ہندی ترجمۂ قرآن، زکوٰۃ کی رقم سے خرید کر دینا جائز ہوگا لیکن اس کا ضرور خیال رکھا جائے کہ جس کو بھی زکوٰۃ کی رقم سے خرید کر ترجمۂ قرآن دیا جائے اس کے بارے میں ظنِ غالب اطمینان ہو کہ وہ اس کو پڑھے گا۔ ایسا نہ ہو کہ وہ اس کو ڈال رکھے اور رقم ضائع ہو۔

اردو زبان میں جمعہ کا خطبہ بلا کراہت جائز ہے

سوال

یہاں اختلافات پیدا ہو گئے ہیں اس لیے براہ کرم جواب دیجیے کہ خطبۂ جمعہ غیر عربی میں پڑھنا کیسا ہے اور امام اعظم رضی اللہ عنہ نے اس مسئلے میں کیا وضاحت فرمائی ہے۔

جواب

غیر عربی زبان میں خطبۂ جمعہ اور لاؤڈ اسپیکر پر خطبہ و نماز کے جواز و عدم جواز نیز ریڈیو اور ٹیلی فون سے چاند کی خبروں کے اعتبار و عدم اعتبار پر عرصۂ دراز سے مقالے اور رسالے لکھے جا رہے ہیں۔ علماء کی ایک جماعت اردو زبان میں خطبۂ جمعہ اور لاؤڈ اسپیکر پر خطبہ و نماز کے جواز کی قائل ہے۔ نیز وہ ریڈیو اور ٹیلی فون سے چاند کی خبروں کا اعتبار کرتی ہے۔ علماء کی دوسری جماعت ان تمام مسئلوں میں پہلی جماعت سے اختلاف رکھتی ہے۔ دونوں جماعتوں نے اپنے اپنے مسلک پر مقالے اور کتابیں لکھی ہیں۔ راقم الحروف ان سب مسائل میں پہلی جماعت کے ساتھ ہے۔ میرے نزدیک بھی اردو زبان میں خطبۂ جمعہ اور لاؤڈ اسپیکر پر عیدین اور جمعہ کے خطبے اور نمازیں بلا کراہت جائز ہیں۔ اسی طرح ریڈیو اور ٹیلی فون سے اگر مستند اداروں یا مستند اشخاص کی طرف سے رویت ہلال کی خبریں دی جائیں تو ان کا اعتبار کیا جانا چاہیے۔ میں ذیل میں خطبۂ جمعہ کی زبان کے بارے میں تھوڑی سی وضاحت کر رہا ہوں۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک غیر عربی زبان میں خطبۂ جمعہ نہ ناجائز ہے نہ مکروہ تحریمی ہے بلکہ بلا کراہت جائز ہے۔ جو لوگ اس کو ناجائز یا مکروہ تحریمی کہتے ہیں ان کا خیال میرے نزدیک صحیح نہیں ہے فقہ حنفی کی متداول کتابوں میں امام صاحب کے مسلک کی بنا پر نہ اس کے عدم جواز کی دلیل ملتی ہے نہ اس کے مکروہ تحریمی ہونے کی کوئی سند دستیاب ہوتی ہے بلکہ اس کے برعکس ان کتابوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ غیر عربی زبان میں خطبۂ جمعہ امام ابو حنیفہ رحمہ کے نزدیک بلا کراہت جائز ہے۔

یہ بات اہل علم کو معلوم ہے کہ امام صاحب کے نزدیک قرأت قرآن سے لے کر اندرون نماز کے تمام اذکار و ادعیہ فارسی زبان میں جائز ہیں اور صاحبین (امام ابو یوسفؒ و امام محمدؒ) نیز دوسرے ائمہ کے نزدیک ناجائز۔ قرأت قرآن کے بارے میں امام صاحب نے اپنے دونوں شاگردوں کے مسلک کی طرف

رجوع کر لیا اس لیے کہ قرأت کے معاملے میں صاحبین کی دلیل قوی تھی لیکن جہاں تک نماز کے دوسرے اذکار کا تعلق ہے وہاں امام صاحب کا اپنے مسلک سے رجوع ثابت نہیں۔ بلکہ صاحب درمختار نے پوری قوت کے ساتھ لکھا ہے کہ قرأت کے بارے میں امام صاحب نے صاحبین کے مسلک کی طرف رجوع کیا اور نماز کے دوسرے اذکار کے بارے میں صاحبین نے اپنے استاذ کے مسلک کی طرف رجوع کیا۔ فتاوی تتارخانیہ سے بھی صاحب درمختار کی تائید ہوتی ہے۔ علامہ شامی نے اس کی یہ عبارت نقل کی ہے:۔

وفی شرح الطحاوی ولو کبر	اور شرح طحاوی میں ہے کہ اگر فارسی میں
بالفارسیۃ عند الذبح او لبی عند	تکبیر کہے یا ذبح کے وقت فارسی میں بسم اللہ اللہ اکبر
الاحرام بالفارسیۃ او بای لسان	پڑھے یا احرام کے وقت فارسی میں تلبیہ (لبیک)
کان یحسن العربیۃ او لا جاز	کہے یا کسی زبان میں بھی وہ عربی پر قادر ہو یا نہ ہو
بالاتفاق (شامی ج ۱)	بہر دو حال بالاتفاق جائز ہے۔

علامہ شامی نے یہ احتمال پیدا کیا ہے کہ تکبیر سے مراد تکبیر تشریق یا ذبح کے وقت اللہ اکبر کہنا ہو سکتا ہے اس میں تکبیر تحریمہ کی صراحت نہیں ہے۔ اس احتمال پر انھوں نے دلیل یہ دی ہے کہ تکبیر کے بعد جتنی چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ سب نماز سے باہر کی چیزیں ہیں اس لیے تکبیر کو بھی نماز سے باہر کی تکبیر ہونا چاہیے۔ اس احتمال کے جواب میں ادب کے ساتھ عرض کیا جا سکتا ہے کہ شارح طحاوی کا مقصد یہ تھا کہ قرأت کے سوا نماز کے اذکار ہوں یا غیر نماز کے' دونوں صورتوں میں ان کو غیر عربی زبان میں ادا کرنا بالاتفاق جائز ہے۔ اذکار نماز کے لیے انھوں نے تکبیر تحریمہ کو بطور مثال ذکر کیا۔ اس کے بعد نماز سے باہر کے اذکار لکھے اور اگر اس احتمال کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو اتنی بات تو ثابت ہی ہوتی ہے کہ نماز سے باہر کے اذکار کو غیر عربی زبان میں ادا کرنا امام ابو حنیفہ' امام ابو یوسف اور امام محمد سب کے نزدیک جائز ہے اور جب خطبۂ جمعہ نماز سے باہر کے اذکار میں داخل ہے تو پھر اس کا غیر عربی زبان میں ادا کیا جانا صاحبین کے نزدیک بھی ناجائز کیوں ہوگا لہٰذا اس عبارت سے ثابت ہوا کہ خطبۂ جمعہ غیر عربی زبان میں بالاتفاق جائز ہے۔

جو لوگ غیر عربی زبان میں خطبۂ جمعہ کو مکروہ تحریمی کہتے ہیں وہ بھی ایک بے دلیل بات کہتے ہیں اس لیے کہ امام صاحب کے مسلک کے لحاظ سے کراہت وعدم کراہت کی ساری بحث نماز کے اندر ...

ادعیہ کے بارے میں ہے۔ نماز سے باہر کے اذکار یا وعظ و نصیحت کے بارے میں نہیں ہے۔

خطبۂ جمعہ نماز سے باہر کے ذکر و نصیحت میں ہے۔ اس لیے امام صاحب کے مسلک پر غیر عربی میں اس کے مکروہ ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ راقم الحروف نے بعض فتووں میں پڑھا کہ مفتی صاحب نے علامہ شامی کے قول لکن سیاتی کراھتہ الدعاء بالاعجمیۃ (عنقریب عجمی زبان میں کراہت کا بیان آرہا ہے) سے غیر عربی زبان میں خطبۂ جمعہ کی کراہت تحریمی پر استدلال کیا ہے۔ یہ استدلال دیکھ کر تعجب ہوا کیونکہ جہاں اس کا بیان آیا ہے وہاں نماز کے اندر کی دعا کا ذکر ہے اور علامہ شامی نے اس پر پوری بحث کی ہے اور نماز کے اندر کی دعا کے بارے میں بھی بعض کتابوں کے حوالے دے کر لکھا ہے کہ اس سے کراہت تنزیہی نکلتی ہے اور آخر میں کمزور الفاظ میں اپنی یہ رائے دی ہے۔

ولا یبعد ان یکون الدعاء	(ردالمحتار)	یہ بعید نہیں ہے کہ فارسی میں دعا نماز کے
بالفارسیۃ مکروھا تحریما فی الصلوٰۃ		اندر مکروہ تحریمی اور نماز سے باہر مکروہ تنزیہی ہو
وتنزیھا خارجھا فلیتامل ولیراجع		بس غور کرنا چاہیے اور کتابیں دیکھنی چاہییں۔

اس سے معلوم ہوا کہ نماز کے اندر فارسی زبان کی دعا کو بھی مکروہ تحریمی کہنا مشکل ہے اور نماز سے باہر کی فارسی دعا کو مکروہ تنزیہی کہنا بھی آسان نہیں۔ ان دونوں میں کسی بات پر علامہ شامی کو اطمینان نہ تھا یہ ہے علامہ شامی کے قول لکن سیاتی کراھتہ الدعاء بالاعجمیۃ کی حقیقت۔ اس قول سے غیر عربی خطبۂ جمعہ کی کراہت تحریمی پر استدلال کرنا عجیب و غریب چیز ہے۔ بہرحال امام ابوحنیفہ کے مسلک کی بنا پر غیر عربی میں خطبۂ جمعہ کو مکروہ تحریمی کہنے کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔

ایک اور پہلو سے اس مسئلے پر غور کیجیے۔ یہ بات ثابت ہے کہ جو شخص عربی زبان پر قادر نہ ہو اس کے لیے نماز کے اذکار تک کو غیر عربی میں ادا کرنا بالاتفاق اور بلا کراہت جائز ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اب یہ دیکھیے کہ ہندستان میں جمعہ کے کتنے خطیب ایسے ہیں جو عربی زبان میں خطبہ دینے پر قادر ہوں۔ شاید چند فی صدی بھی ایسے خطیب نہ نکل سکیں تو پھر ایسے خطیبوں کا اردو زبان میں یا کسی غیر عربی زبان میں خطبۂ جمعہ دینا صاحبین کے مسلک کی بنا پر بھی بلا کراہت جائز ہوگا۔ اگر کوئی صاحب کہیں کہ عام طور سے ہمارے خطیبان جمعہ عربی زبان پر قادر نہ ہوں لیکن عربی کے چھپے ہوئے خطبوں کو کتاب سے دیکھ کر پڑھنے پر تو قادر ہیں تو میں سوال کروں گا کہ کس صحابی یا کس تابعی اور کس تبع تابعی نے کتاب میں دیکھ کر (باقی صفحہ ۲۷)

دارالعلوم دیوبند مرتبہ مولانا محمد طیب صاحب۔ صفحات ۱۲۸، قیمت مجلد گرد پوش کے، ایک روپیہ آٹھ آنے، علاوہ محصول ڈاک۔ ملنے کا پتہ :۔ دفتر اہتمام دارالعلوم دیوبند۔

دارالعلوم دیوبند کے محترم مہتمم صاحب نے بہت عمدہ کاغذ کتابت و طباعت کے ساتھ دارالعلوم کی صد سالہ زندگی کا تعارف شائع فرمایا ہے۔ یہ کتاب دارالعلوم کی تاسیس، وجہ تاسیس، تعلیمی، تبلیغی، انتظامی اور عام افادی کوائف و احوال کا مختصر مگر جامع مرقع ہے۔

دارالعلوم دیوبند عربی علوم و فنون اور اسلامی تعلیمات کی ایک عظیم درس گاہ ہے جس نے ہند و پاک میں تو اپنی روشنی پھیلائی ہی ہے۔ بیرون ہند کے بھی بہت سے اسلامی علاقے اس روشنی سے فیضیاب ہوئے ہیں۔ ہندوستان پر انگریزی حکومت کے انتہائی تاریک اور مستبدانہ دور میں دارالعلوم کی تخیل بلاشبہ بڑا مبارک تخیل تھا اور اس نے اسلامی علوم و فنون کے تحفظ اور مسلمانوں میں اسلامیت کی حفاظت و بقا کا عظیم کارنامہ انجام دیا ہے۔ ایک عام قاری کے لیے زیر تبصرہ کتاب میں دارالعلوم کا جامع تعارف موجود ہے۔ تبصرہ نگار کی حیثیت بھی ایک عام قاری ہی کی ہے اس لیے کہ وہ دارالعلوم کے اندرونی احوال و کوائف کا کوئی ذاتی علم نہیں رکھتا۔ ویسے جس انداز اور جن الفاظ میں دارالعلوم کی تعریف کی گئی ہے اس میں کہیں کہیں خاصہ مبالغہ محسوس ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ کہنا کہ انگریزوں کی حکومت ہندستان میں اسپین کی تاریخ دہرانا چاہتی تھی اور دارالعلوم کی تحریک نے اس کا رخ موڑ دیا بہت مبالغہ آمیز ہے۔ انگریز اتنے بے وقوف نہیں تھے کہ یہاں اسپین کی تاریخ دہرانے کی سعی کرتے۔ بہر حال اس کتاب سے دارالعلوم کے روشن پہلو سامنے آگئے ہیں اور اس کے ذریعے دارالعلوم کی اچھی خدمت انجام دی گئی ہے۔ اس سے دارالعلوم کے عام تعارف میں بڑی مدد ملے گی۔

ماہنامہ جلیس

ادارۂ تحریر: رائے حبیب الرحمٰن، نسیم بینا نگری، صفحات ۹۸ زرسالانہ سات روپے
فی شمارہ: ۷۵ پیسے۔ پتہ:- ۳۰ موتی تالاب۔ مالیگاؤں ضلع ناسک۔

ماہنامہ جلیس نے کے نیچے ایک معلوماتی، معیاری اردو ڈائجسٹ لکھا گیا ہے۔ میرے سامنے اس کا پہلا شمارہ ہے۔ ایک حد تک یہ معلوماتی تو ہے۔ معیاری بنانے کے لیے کوشش جاری رکھنی ہوگی۔ اس کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ مختلف پسند کے ہر حلقے کو خوش کرنے کی کوشش کی گئی ہے یہی وجہ ہے کہ اس میں چند چیزیں ایسی بھی شائع ہو گئی ہیں جو نہ شائع کی جاتیں تو بہتر تھا۔ مثال کے طور پر "سائنس کے کارنامے اور نانی اماں" ایک بچکانہ مضمون ہے جس میں جناب مضمون نگار نے خود اپنی نانیوں اور دادیوں کی جی بھر کر مذمت فرمائی ہے۔ اسی طرح افسانے بھی گھٹیا درجے کے ہیں اور دو افسانے تو تخریبی بھی ہیں۔ پڑھ کر تعجب ہوا کہ ادارۂ تحریر نے آخر کس افادیت کے پیش نظر انہیں شائع کیا ہے۔ یہ لفظ و معنی یا فن و مقصد ہر لحاظ سے بہت ہی پست افسانے ہیں۔

جہاں تک اندازہ ہے اس ماہنامے کے مالک و مدیر جناب رائے حبیب الرحمٰن صاحب اور دوسرے اڈیٹر جناب نسیم بینا نگری تعمیری ذہن رکھتے اور تعمیری ادب پسند کرتے ہیں۔ ان کی خدمت میں گزارش ہے کہ اپنے ماہنامے میں کوئی تخریبی چیز شائع نہ کریں۔ بہرحال ہم اس معاصر کا خیر مقدم کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اردو کی خدمت کے ساتھ ساتھ اس کو دین و اخلاق کی خدمت کرنے کی توفیق بھی نصیب ہو۔

اس شمارے میں دینی مضامین بھی موجود ہیں۔ گزارش کا مقصد یہ ہے کہ خالص ادب کو بھی دین و اخلاق سے علیحدہ نہ ہونا چاہیے۔ (ع ق)

اسلام اور فطرت

مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی، صفحات ۲۰۴ قیمت دو روپیہ پچیس پیسے
ناشر:- ادارۂ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ۔ لاہور

اس کتاب میں فاضل مصنف نے "اسلام دین فطرت ہے" کے دعوے کو اپنے انداز میں ثابت کیا ہے اور فطرۃ اللّٰہ التی فطر الناس علیہا کی تشریح و توضیح کی ہے۔ کتاب کے بڑے حصے پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں نئی ثقافت کا اثر نہیں ہے یا بہت دھندلا ہے۔ مصنف کا

عمداً تحریر ہے طور پر بہت صاف ہوتا ہے لیکن اس کتاب میں "فطرت" کی جو بہت لمبی بحث انھوں نے کی ہے وہ الجھی ہوئی ہے اور اس لفظ کی تشریح میں تضاد تک موجود ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ مصنف نے اس بحث کو بلا ضرورت بہت پھیلا دیا ہے۔ آیت میں یہ لفظ جس مفہوم میں استعمال ہوا ہے اگر وہ اپنی بحث کو اسی حد تک محدود رکھتے تو الجھاؤ نہ پیدا ہوتا۔ باقی رہے لوگوں کے اعتراضات تو بحث کو محدود رکھنے کی صورت میں بھی جواب وہی ہوتا جو انھوں نے دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

اگر انسانی طبائع کہیں اسلام (یا قرآنی احکام) سے گریز کرتی ہیں تو اس وجہ سے نہیں کہ اسلام خلاف فطرت ہے بلکہ گریز کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ جو باتیں فطرت سلیمہ کے مطابق ہوتی ہیں ان سے فطرت سقیمہ کو ابا دانکار ہونا بھی فطرت سقیمہ کی عادت و فطرت ہے۔ (صنا)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:-

"ایک طرف آیت فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا کو رکھیے اور دوسری طرف یہ آیت رکھیے۔ افغیر دین اللہ یبغون ولہ اسلم من فی السموٰت والارض طوعا وکرھا والیہ یرجعون تو صاف نظر آئے گا کہ جس دین کی طرف قرآن بلاتا ہے وہی دین فطرت ہے" (صلا)

مصنف نے اسلامی احکام کو فطرت کے مطابق ثابت کرنے کے لیے ان کی بہت سی مثالیں بھی دی ہیں۔ یہ احکام بہت اختصار کے ساتھ لکھے گئے ہیں اور بعض جگہ بہت گنجلک اور مبہم ہوگئے ہیں۔ تبصرہ نگار کا مشورہ ہے کہ اس کتاب کے پڑھنے والے علماء سے سمجھ کر ان احکام کے بارے میں اپنی تشفی کرلیں۔

(بقیہ صفحہ ۱۶) خطبہ پڑھا ہے؟ اگر اردو زبان میں خطبہ جمعہ اس لیے بدعت ہے کہ یہ سنت کے خلاف ہے تو پھر کتاب میں دیکھ کر خطبہ پڑھنا بدعت اور خلاف سنت کیوں نہیں ہے اور صورت حال یہ ہے کہ کم سے کم پچاس فی صدی خطبائے کرام عربی کے چھپے ہوئے خطبے بھی غلط سلط پڑھتے ہیں۔

میں ان محترم علماء کی خدمت میں جواب بھی غیر عربی زبان میں خطبہ جمعہ کو ناجائز یا مکروہ تحریمی کہتے ہیں یہ گزارش کرتا ہوں کہ وہ اپنے خیال پر نظر ثانی فرمائیں۔

محرم الحرام ۱۳۸۶ھ
مئی ۱۹۶۶ء

زندگی
رامپور

جلد:- ۳۶
شمارہ:- ۵

مدیر:- سید احمد قادری

● خط و کتابت و ارسال زر کا پتہ — منیجر "زندگی" رامپور - یوپی

● زرِ سالانہ:- چھ روپیہ - ششماہی:- تین روپیہ - فی پرچہ:- ۶۰ پیسے
ممالک غیر سے:- بارہ شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر

مالک:- جماعت اسلامی ہند۔ اڈیٹر:- سید احمد عروج قادری۔ پرنٹر پبلشر: احمد حسن۔ مطبع:- دہلی پرنٹنگ ورکس [illegible]
آبادان - مقام اشاعت:- دفتر زندگی رامپور یوپی

اشارات

(فروری ۶۶ء سے پیوستہ)

سید احمد قادری

فروری ۶۶ء کے شمارے میں علامہ شاطبی کی الموافقات کے حوالوں سے اتنی بات منقح ہو گئی تھی کہ مکی سورتوں میں اجمالی طور پر وہ تمام احکام موجود ہیں جن کی تفصیل مدنی سورتوں میں نازل ہوئی ہے مدنی سورتوں میں شاید ہی کوئی ایسا حکم موجود ہو جس کی اصل مکے میں نازل نہ ہو چکی ہو۔ لوگوں کو جس حکم کے بارے میں زیادہ تر اشتباہ پیش آتا ہے وہ قتال فی سبیل اللہ کا حکم ہے۔ علامہ شاطبی نے متعدد مقامات پر لکھا ہے کہ جہاد، امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی اصل کلی کی اعلیٰ ترین فرع ہے اور یہ اصل کلی مکے میں نازل ہو چکی تھی۔ لہٰذا جہاد بھی قواعد کلیہ مکیہ کے تحت مندرج ہے۔ الموافقات کے فاضل محشی نے یہ بحث کی ہے کہ جہاد محض قاعدۂ امر بالمعروف کے تحت درج ہونے کی وجہ سے تشریع مکی نہیں ہے بلکہ یہ ان کلیات میں ہے جو بذات خود مکے میں شروع ہوئی ہیں۔ ہم ان کی یہ فاضلانہ بحث ذیل میں درج کرتے ہیں:

سورۃ العنکبوت میں وَمَن جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ آیا ہے۔ بعض مفسرین یہاں جہاد سے جہاد نفس مراد لیتے ہیں اور بعض جہاد نفس اور جہاد قتال دونوں مراد لیتے ہیں۔ اسی سورہ کے آخر میں ہے۔ وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ اس آیت میں مفسرین کہتے ہیں کہ جہاد کو مطلق اس لیے رکھا گیا ہے کہ دونوں امر (جہاد نفس و جہاد قتال) کو عام ہو جائے۔ بعض مفسرین کے نزدیک یہاں جہاد سے مراد ایمان پر ثبات ہے اور بعض کے نزدیک یہاں جہاد سے مراد صرف جہاد قتال ہے۔ سورۂ عنکبوت پوری مکی ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ دس ابتدائی آیتوں کے علاوہ پوری سورہ مکی ہے اور ایک قول یہ ہے کہ یہ پوری سورہ مدنی ہے۔ جو لوگ پوری سورہ کو مکی کہتے اور آخری آیت

یں جہاد نفس وجہاد وقتال دونوں مراد لیتے ہیں ان کے قول کی بنا پر جہاد کی تشریع کی قرار پاتی ہو اور بذاتِ خود نص صریح کے ذریعہ مکی قرار پاتی ہے (محض آیت امر بالمعروف میں داخل ہونے کی وجہ نہیں) زیادہ سے زیادہ یہاں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ یہ آیت جہاد وقتال کے وقت کے لحاظ سے مجمل ہے ۔ مؤلف (علامہ شاطبی) نے اس بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ دو صورتوں سے خالی نہیں ہے ۔ ان کی بات یا تو اس بنا پر صحیح ہو سکتی ہے کہ اس پوری سورہ کو مدنی مانا جائے یا اس صورت میں صحیح ہو سکتی ہے کہ جہاد سے جہاد وقتال کو خارج تسلیم کیا جائے اور یہ دونوں باتیں کمزور اور مسلک جمہور کے خلاف ہیں ۔ یہاں ایک شبہہ ضرور پیدا ہوتا ہے ۔ وہ یہ کہ مفسرین نے کہا ہے کہ سب سے پہلی آیت جو قتال کے حکم میں اتری ہے وہ سورۂ حج کی آیت اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ہے ۔ سورۂ حج کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ یہ مدنی ہے اور ایک قول یہ ہے کہ یہ مکی ہے اور صحیح تر قول یہ ہے کہ یہ مدنی اور مکی آیتوں سے مرکب ہے ۔ لیکن یہ بات محقق نہیں ہے کہ کون سی آیت مکی ہے اور کون سی مدنی ۔ اور بعض مفسرین کہتے ہیں کہ امر بالجہاد میں سب سے پہلی آیت وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ ہے اور سورۂ بقرہ قطعی مدنی ہے ۔ ان دونوں آیتوں کے بارے میں انھوں نے جو کچھ کہا اور آیات سورۂ عنکبوت کے بارے میں جو کچھ کہا ان دونوں میں تطبیق کی کیا صورت ہے ۔ آیات سورۂ بقرہ کے بارے میں انھوں نے جو کچھ کہا ہے اس سے تو مؤلف (شاطبی) کی بات صحیح معلوم ہوتی ہے ۔ اس شبہے کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ مکے میں جہاد کی فضیلت بیان کی گئی اور اس کی ایسی مدح وثنا کی گئی جو اس کی مشروعیت کو مستلزم ہے اور اس بات کا اشارہ دیا گیا ہے کہ عن قریب جب وقت آجائے گا اور تیاری مکمل ہو جائے گی تو جہاد کا حکم نافذ کر دیا جائے گا ۔ جب اس کا وقت آگیا تو سورۂ حج کی آیت سے جہاد کی اجازت دی گئی جو اب تک رکی ہوئی تھی ۔ مکے میں ایسا ہوتا کہ بعض صحابہ ٹوٹا ہوا سر لے کر آپ کے پاس آتے تھے ۔ بعض مجروح آتے تھے اور بعض کو سخت رسوا کیا جاتا تھا ۔ وہ جہاد کی اجازت طلب کرتے تھے ۔ لیکن آپ فرماتے کہ لم یؤذن لی مجھے اس کی اجازت نہیں دی گئی بلکہ متعدد آیتوں میں اس کی ممانعت موجود ہے ۔

سورۂ حج کی آیتوں کے بعد سورۂ بقرہ کی آیتیں نازل ہوئیں جنھوں نے قتال کا مؤکد حکم دیا اور اس کے احوال کی تفصیلات پیش کیں ۔ چونکہ قتال کی اجازت اور اس کا مؤکد حکم مدینے میں

نازل ہوا۔ اس لیے اس کو مفسرین نے تشریع مدنی قرار دے دیا ہے ورنہ جہاں تک اس کے جہاد کے مکے میں شروع ہونے کا تعلق ہے اس میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

(الافادات ج ۴ ص۱۲۳)

فاضل محشی کی اس تسلی بخش بحث سے یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ قتال فی سبیل اللہ کی اصل کلی یا قاعدۂ کلیہ بھی مکے میں نازل ہو چکا تھا اور یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ مدینہ آکر یکایک قتال کا حکم نازل ہوگیا ہو۔ مزید توثیق کے لیے میں سورۂ عنکبوت کی دونوں آیتوں کے بارے میں چند مفسرین کرام کی عبارتیں نقل کرتا ہوں۔ پہلی آیت یہ ہے:۔ وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ إِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ ۝ اس آیت کے تحت جلالین میں ہے

ومن جاهد جهاد حرب او نفس	اور جو شخص جہاد کرے گا عام از یں کہ وہ جہاد حربیہ ضرب ہو یا جہادِ نفس

تفسیر خازن میں ہے

والجهاد هو الصبر على الاعداء والشدة وقد يكون في الحرب وقد يكون على مخالفة النفس	دشمنوں اور سخت حالات کے مقابلے میں صبر کو جہاد کہتے ہیں۔ یہ کبھی جنگ میں ہوتا ہے اور کبھی نفس کی مخالفت پر

امام نسفی تحریر فرماتے ہیں

ومن جاهد نفسه بالصبر على طاعة الله او الشيطان بدفع وساوسه او الكفار۔	اور جو اپنے نفس سے جہاد کرے گا اللہ کی اطاعت پر صبر کرکے یا شیطان کے مقابلے میں اس کے وسوسوں کو دفع کرکے یا کفار کے مقابلے میں۔

تفسیر سراج المنیر میں ہے۔

ومن جاهد اى بذل جهده في جهاد حرب او نفس	اور جو شخص جہاد کرے گا۔ یعنی جہادِ قتال یا جہادِ نفس میں اپنی کوشش صرف کرے گا

امام بغویؒ لکھتے ہیں

والجهاد هو الصبر على الشدة	جہاد شدت وسختی پر صبر کا نام ہے اور
ويكون ذالك في الحرب وقد يكون	یہ لڑائی میں ہوتا ہے اور کبھی نفس کی مخالفت
على مخالفة النفس ۔	ہوتا ہے ۔

صاحب فتح البیان لکھتے ہیں :۔

ومن جاهد الكفار وجاهد	اور جو کفار سے جہاد کرے گا اور
نفسه بالصبر على الطاعات او	طاعتوں پر صبر کرکے اپنے نفس سے جہاد
جاهد الشيطان بدفع	کرے گا یا شیطان کے وسوسوں کو دفع کرکے جہاد
وساوسه	کرے گا

ان عبارتوں سے معلوم ہوا کہ مفسرین کرام نے عام طور سے اس آیت میں بھی جہاد کو عام رکھا ہے اور جہادِ نفس کے ساتھ خاص نہیں کیا ہے بلکہ متعدد مفسرین نے جہادِ قتال کو جہادِ نفس پر مقدم رکھا ہے ۔ سورۂ عنکبوت کی دوسری آیت یہ ہے ۔ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ۔ اس آیت کے تحت بیضاوی میں ہے :۔

فاطلاق المجاهدة ليعم	مجاہدے کو مطلق رکھا تاکہ جہاد اپنی تمام
جهاد الاعادی الظاهرة والباطنة	انواع کے ساتھ ظاہری اور باطنی دشمنوں کو
بانواعه	عام ہو جائے

صاحب کشاف تحریر کرتے ہیں :۔

اطلق المجاهدة ولم يقيدها	مجاہدے کو مطلق رکھا اور اس کو کسی مفعول
بالمفعول ليتناول كل ما يجب مجاهدته	کے ساتھ مقید نہیں کیا تاکہ وہ نفس اور شیطان اور
من النفس الامارة بالسوء والشيطان واعداء الدين	دشمنانِ دین سب کے ساتھ مجاہدے کو متناول ہوجائے

امام بغوی فرماتے ہیں :۔

الذين جاهدوا المشركين	جو لوگ مشرکین سے جہاد کریں گے ہمارے
لنصرة ديننا	دین کی مدد کے لیے

امام خازن لکھتے ہیں :۔

معناه جاهدوا المشركين لنصرة ديننا	اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ہمارے دین کی مدد کے لیے مشرکین سے جہاد کریں گے

صاحبِ روح المعانی لکھتے ہیں :-

واطلقت المجاهدة لتعم مجاهدة الاعادی الظاهرة و الباطنة بانواعها وقال السدی المعنی والذین جاهدوا بالثبات علی الایمان لنهدینهم سبلنا الی الجنة وقیل المعنی والذین جاهدوا فی الغزو لنهدینهم سبل الشهادة والمغفرة وما ذکر اولاً اولی	مجاہدے کو مطلق رکھا گیا تاکہ وہ ظاہری و باطنی دشمنوں کے ساتھ مجاہدے کو عام ہو جائے اور سدی نے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ایمان پر ثبات کا جہاد کریں گے ہم ان کو جنت کے راستے دکھائیں گے اور ایک قول میں اس کا معنی یہ ہے کہ جو لوگ غزوے میں مجاہدہ کریں گے ہم ان کو شہادت اور مغفرت کے راستے دکھائیں گے اور جو تفسیر پہلے ذکر کی گئی ہے وہی سب سے بہتر ہے ۔

علامہ آلوسی نے ان تین اقوال کو جمع کر دیا جن کا ذکر الموافقات کے محشی نے کیا تھا۔ سدی کے قول میں یہاں مجاہدہ صرف ایمان پر ثبات کے ساتھ خاص ہے اور دوسرے قول کی بنا پر یہاں مجاہدے سے مراد صرف جہاد وقتال ہے ۔ خود صاحب روح المعانی نے عموم کو ترجیح دی ہے ۔ امام بغوی اور امام خازن نے بھی صرف مشرکین کے ساتھ جہاد کا ذکر کیا ہے ۔ اس تفصیل سے اتنی بات تو بلا شبہہ ثابت ہوتی ہے کہ ان آیتوں میں جہاد اور مجاہدے کا جو لفظ استعمال ہوا ہے اس میں جہاد وقتال بھی یقیناً داخل ہے ۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ اصل مسئلے سے متعلق سورۂ عنکبوت سے بھی زیادہ واضح اور صریح آیت سورۂ المزمل میں موجود ہے :-

عَلِمَ اَنْ سَیَکُوْنُ مِنْکُمْ مَّرْضٰی	اللہ کو علم ہے کہ تم میں مریض ہوں گے
وَاٰخَرُوْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ	اور دوسرے لوگ جو اللہ کی راہ میں لڑیں گے ۔

یہ آیت کریمہ واضح کرتی ہے کہ مکے میں پوری صراحت کے ساتھ قتال فی سبیل اللہ کا قاعدہ کلیہ شروع

ہوچکا تھا البتہ اس تشریح کا نفاذ اور تفصیلات مدینے میں نازل ہوئیں ۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ آیت کے
ہیں نہیں بلکہ مدینے میں نازل ہوئی تھی ان کے پاس اپنے دعوے کے لیے کوئی مضبوط دلیل نہیں ہے مفسر
ابن کثیر نے اس آیت اور پوری سورہ کو مکی قرار دیا ہے وہ لکھتے ہیں ۔

وھذہ الآیۃ بل السورۃ کلھا	اور یہ آیت بلکہ پوری سورہ مکی ہے اور
مکیۃ ولم یکن القتال شرع	اس وقت تک قتال مشروع نہیں ہوا تھا لہذا
بعد فھی من اکبر دلائل النبوۃ	یہ نبوت کی دلیلوں میں ایک بڑی دلیل ہے
لانہ من باب الاخبار بالمغیبات	اس لیے کہ اس کا تعلق مستقبل میں چھپی ہوئی چیز
المستقبلۃ	کی خبر دینے سے ہے

جب یہ آیت بتارہی ہے کہ آئندہ اللہ کی راہ میں لڑنا بھی پڑے گا تو قتال کے مشروع نہ ہونے کا مطلب
یہی ہوسکتا ہے کہ ابھی قتال کی اجازت نہیں دی جارہی ہے ۔ وقت آتے ہی یہ امر مشروع نافذ کردیا جائے گا
سورۂ عنکبوت اور سورۂ مزمل کی صریح آیتوں کے علاوہ دوسری سورتوں کی متعدد آیتوں میں واضح اشارے
موجود ہیں جو بتاتے ہیں کہ اس راہ میں قتال کا وقوع لازمی ہے ۔ راقم الحروف نے "اقامت دین" پر جو
اشارات لکھے ہیں ان میں ایسی کئی آیتیں پیش کی ہیں ۔ یہاں انہیں پھر پیش کرنا غیر ضروری ہے ۔

اس تفصیل سے ثابت ہوا کہ قتال فی سبیل اللہ کا قاعدۂ کلیہ کے میں نازل ہوا اور مدینہ پہنچ کر اس
کی تنفیذ عمل میں آئی اور اب الجہاد ماض الی یوم القیامۃ کی اصل نے اس کو قیامت تک کے لیے نافذ قرار
دے دیا ہے ۔ کوئی شخص یا اشخاص کا کوئی گروہ اس کو منسوخ نہیں کرسکتا ۔ اس کی تنفیذ کے لیے اب نہ کسی
نئے حکم کی ضرورت ہے اور نہ کسی شخص کو کسی ملک یا قوم کے ساتھ اس کو مخصوص و مقید کرنے کا حق ہے ۔

یہ بات کتنی عجیب ہے کہ قرآن میں یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی مستشرقین بطور الزام یہ کہتے ہیں کہ کے میں
اسلام کی دعوت محض تبلیغ و نصیحت تھی لیکن مدینہ پہنچ کر جب کچھ طاقت حاصل ہوگئی تو اچانک جہاد و قتال کا
اعلان کردیا گیا ۔ کے میں اسلام صرف "مذہب" تھا اور مدینہ آکر یک بیک "حکومت" بن گیا اور اس
سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ بہت سے پڑھے لکھے مسلمان بھی مستشرقین کے ہم خیال بن گئے ۔

میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ موضوع زیر بحث کی تحقیق کے لیے تمام مکی سورتوں کے احکام امام مرغیانی اور

اور مضامین و مباحث پر تفصیلی نظر ڈالنا اصل کام ہے لیکن یہ ایک لمبا کام ہے ۔ اگر کوئی طالب العلم صرف سورۂ انعام کو تحقیق کے ساتھ پڑھے تو تنہا یہ سورہ بھی اس بات پر شاہد عدل ہوگی کہ مکہ میں اجمالی طور پر وہ سب کچھ نازل ہو چکا تھا جس کی ایک مسلم معاشرے کی تعمیر کے لیے ضرورت تھی ۔

سورۂ انعام کے مکی ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور احادیث سے یہ بات ثابت ہے کہ یہ پوری سورہ بیک وقت نازل ہوئی تھی ۔ ایک لمبی سورہ کا بیک وقت نازل ہونا اس سورہ کی ایک ایسی خصوصیت ہے جس میں شاید کوئی دوسری سورہ شریک نہیں ہے ۔ یہ عقائد و اعمال کے ایسے قواعد کلیہ کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے کہ اس میں کا ہر کلیہ اسلامی معاشرے کی تعمیر میں بنیادی پتھر کی حیثیت رکھتا ہے اس سورہ کے بارے میں علامہ شاطبی کی رائے یہ ہے :۔

> علما نے اس سورہ سے توحید کے وہ تمام قواعد ۔ اثبات واجب الوجود سے لے کر اثبات امامت تک مستنبط کیے ہیں جن پر متکلمین نے کتابیں لکھی ہیں ۔ یہ علماء کا قول ہے اور میں کہتا ہوں کہ اگر تم اس اصولی اور کلی نظر سے اس سورہ کو پڑھو گے جس کے مطابق الموافقات لکھی گئی ہے تو پاؤ گے کہ یہ سورہ شریعت اسلامیہ کے ایسے قواعد کلیہ کی توضیح کرتی ہے کہ اگر ایک قاعدہ بھی کم کر دیا جائے یا توڑ دیا جائے تو پورا نظام شریعت ٹوٹ جائے ۔"

اس سورہ میں نبی علیہ السلام کو تسلی دیتے ہوئے یہ بات دہرائی گئی ہے کہ جس طرح دشمنان حق کے مقابلے میں پہلے رسولوں کی مدد کی گئی تھی ٹھیک اسی طرح اپنے وقت پر تمہاری مدد بھی کی جائے گی اور یہ کش مکش حق کی فتح پر ختم ہوگی ۔ (ملاحظہ ہو آیت ۳۴) اس سورہ میں عقائد اور ان کے دلائل کے علاوہ جو شرعی احکام دیے گئے ہیں اور معاشرے کی تعمیر کے جو اصول بیان کیے گئے ہیں ان کے لیے آیت ۱۱۸ تا ۱۲۱ نیز آیت ۱۳۶ تا ۱۴۵ اور آیت ۱۵۱ تا ۱۵۴ کو تحقیقی نظر سے پڑھنا چاہیے ——— آیت ۱۵۱ تا ۱۵۴ کے اصول کی اجمالی فہرست یہ ہے :۔

(۱) اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو ۔ (۲) والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو ۔ (۳) اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی دیں گے ۔ (۴) بے شرمی کی باتوں کے قریب بھی نہ جاؤ خواہ وہ کھلی ہوں یا چھپی ۔ (۵) کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھیرایا ہے ہلاک نہ کرو مگر حق کے ساتھ ۔ (۶) یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر ایسے طریقے سے جو بہترین ہو یہاں تک کہ وہ اپنے سن رشد کو پہنچ جائے ۔ (۷) ناپ تول میں پورا انصاف کرو ہم ہر شخص پر ذمہ داری کا اتنا ہی بار رکھتے ہیں جتنا اس کے امکان میں ہو ۔ (۸) جب بات کہو انصاف کی کہو خواہ معاملہ اپنے رشتہ داری کا کیوں نہ ہو ۔ (۹) اللہ کے عہد کو پورا کرو ۔

ان چند احکام کی تشریح کے لیے بھی ایک پورے مقالے کی ضرورت ہے ۔

معاملات

(آخری قسط)

(مولانا محمد یوسف اصلاحی)

رہن

وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا	اور اگر تم سفر میں ہو اور دستاویز لکھنے
كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ فَاِنْ	کے لیے کسی کاتب کو نہ پاؤ تو رہن قبضہ میں کرادو
اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي	پھر اگر ایک دوسرے پر بھروسہ کرنے کی شکل پیدا
اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ	ہو جائے۔ تو جس کے پاس امانت رکھی گئی وہ امانت
رَبَّهٗ (البقرہ: ۲۸۳)	ادا کر دے، اور خدا سے جو اس کا رب ہے ڈرے

اگر سفر کی حالت میں دستاویز لکھنے اور گواہیاں حاصل کرنے کا اہتمام ممکن نہ ہو تو پھر قرض دینے والے کے پاس اپنی کوئی چیز امانت رکھ کر قرض لیا جا سکتا ہے۔ البتہ جب قرض دینے والے کے لیے بے اعتمادی کی شکلیں پیدا ہو جائیں تو اس کو چاہیے کہ امانت میں لی ہوئی چیز مقروض کو واپس کر دے۔ اسلامی معاشرے کی امتیازی خوبی ہی یہ ہے کہ اس کے افراد ایک دوسرے کے ہمدرد و خیر خواہ ہوتے ہیں ایک دوسرے پر اعتماد کرتے ہیں۔ اور خوش حال لوگ کمزوروں اور ناداروں کا سہارا بنکر مسرت محسوس کرتے ہیں۔

وصیت کی تاکید

كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ	تم پر فرض کیا گیا ہے کہ جب تم میں سے
الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ	کسی کی موت کا وقت آئے اور وہ کچھ مال

لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ۝ (البقرۃ: ۱۸۰)

چھوڑ رہا ہو تو وہ والدین اور رشتہ داروں کے لیے معروف دستور کے مطابق وصیت کرے خدا سے ڈرنے والوں پر یہ ایک حق ہے۔

یہ حکم میراث کے احکام نازل ہونے سے پہلے عبوری دور کے لیے دیا گیا تھا۔ بعد میں جب میراث کے مفصل احکام آگئے تو خود بخود یہ وصیت کی فرضیت ختم ہوگئی۔ اب نہ تو میراث پانے والے رشتہ داروں کے لیے کوئی وصیت کرسکتا ہے اور نہ کوئی وصیت ایک تہائی مال سے زیادہ میں نافذ ہوگی ـــ البتہ چونکہ وصیت ایک حق ہے جو خدا سے ڈرنے والوں پر عائد ہوتا ہے۔ اس لیے اس سے غفلت نہ برتنا چاہیے اور اپنے خاندان کے ان حاجتمندوں کے لیے جو میراث میں حصہ نہ پاتے ہوں یا باہر کے محتاجوں یا دوسرے رفاہ عام کے کاموں کے لیے وصیت کرنی چاہیے۔

قسم

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ (البقرۃ: ۲۲۴)

اور اللہ کے نام کو اپنی قسمیں کھانے کا نشانہ نہ بناؤ

یعنی خدا کے نام کا احترام کرو۔ اور جا بے جا قسمیں نہ کھاؤ۔

نیکی سے باز رہنے کے لیے قسم نہ کھاؤ

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ (البقرۃ ۲۲۴)

اور اللہ کے نام کو اپنی ایسی قسموں کا نشانہ نہ بناؤ کہ تم نیکی اور پرہیزگاری اور بندگان خدا کی بھلائی کے کاموں سے باز رہو اللہ تعالیٰ سب کچھ سن رہا ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔

یعنی خدا کے پاک نام کو ایسی قسمیں کھانے کے لیے استعمال نہ کرو جن سے تمہارا مقصود کسی نیکی سے رکنا یا بندگانِ خدا کے بھلائی کے کاموں سے باز رہنا ہو۔ احادیث میں ہے کہ اگر کسی نے بھلے کام سے باز رہنے کی قسم کھائی ہو تو اسے اپنی قسم توڑ دینا چاہیے اور قسم کا کفارہ ادا کرنا چاہیے

قسم کا کفارہ

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ

خدا تمہاری لغو اور مہمل قسموں پر تمہاری

فِي أَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُؤَاخِذُكُمْ
بِمَا عَقَّدْتُمُ الْأَيْمَانَ فَكَفَّارَتُهُ
إِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسَاكِينَ مِنْ أَوْسَطِ
مَا تُطْعِمُونَ أَهْلِيكُمْ أَوْ كِسْوَتُهُمْ
أَوْ تَحْرِيرُ رَقَبَةٍ فَمَنْ لَمْ
يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ أَيَّامٍ
ذٰلِكَ كَفَّارَةُ أَيْمَانِكُمْ
إِذَا حَلَفْتُمْ وَاحْفَظُوا أَيْمَانَكُمْ
كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ
آيٰتِهِ لَعَلَّكُمْ
تَشْكُرُونَ ۝
(المائدہ ۷ - ۸۹)

[illegible] کرے گا البتہ ان قسموں پر [illegible]
کرے گا جو تم جان بوجھ کر کھاتے ہو تو ایسی
قسموں (کو توڑنے) کا کفارہ یہ ہے کہ دس
مسکینوں کو وہ اوسط درجے کا کھانا کھلاؤ،
جو تم اپنے بال بچوں کو کھلاتے ہو یا انہیں کپڑے
پہناؤ۔ یا ایک غلام آزاد کرو۔ اور جس کو یہ
میسر نہ ہو تو وہ تین دن کے روزے رکھے
یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جب تم قسم
کھا لو (اور اسے توڑ دو) اپنی قسموں کی حفاظت
کیا کرو اس طرح اللہ تمہارے واسطے اپنے
احکام کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم شکر
کی روش اختیار کرو۔

قسموں کی حفاظت کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ اول تو آدمی بات بات پر قسم کھانے سے بچے اور جب کھالے تو پھر اس کی طرف سے غفلت نہ برتے۔ اور اگر خلاف ورزی ہو جائے تو ذمہ داری کے ساتھ اس کا کفارہ ادا کرے۔

وراثت

مال کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اس کی تقسیم کا دائرہ زیادہ سے زیادہ وسیع ہو اور سوسائٹی کے تمام ہی افراد اس سے فائدہ اٹھائیں۔ اسی غرض کے لیے اس نے میت کے چھوڑے ہوئے مال کو اس کے رشتہ داروں میں تقسیم کرنے کے احکام دیے اور سخت تاکید فرمائی کہ ان احکام کی پوری پوری پابندی کی جائے کیا اس خدا کے مقرر کیے ہوئے حصے ہیں جو انسان کی مصلحتوں کو انسان سے زیادہ بہتر جاننے والا ہے اور اس نے جو احکام بھی دیے ہیں ان میں انسان کی سہولتوں کا پورا پورا لحاظ کیا گیا ہے۔

قانونِ وراثت کی دینی اہمیت

وَمَنْ يَعْصِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ
اور جو اللہ اور رسول کی نافرمانی کرے گا
اور اس کی مقرر کی ہوئی حدود سے تجاوز

وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ (النساء - ۱۴)

کرے گا اس کو خدا آگ میں ڈالے گا جہاں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیے رسوا کن عذاب ہے۔

قانون وراثت کی اہمیت اس سے زیادہ اور کیا ہوگی کہ اس کی خلاف ورزی کرنے والوں کو خدا نے ہمیشہ کے رسوا کن عذاب کی سزا سنائی ہے۔ مگر افسوس کہ مسلمان پھر بھی اس کی طرف سے غفلت برت رہے ہیں اور طرح طرح سے قانون وراثت میں تبدیلیاں کرکے خدا کے غضب کو بھڑکا رہے ہیں۔

قانونِ وراثت خدا ہی کا حق ہے

اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ○ (النساء - ۱۱)

تم نہیں جانتے کہ تمہارے آباء و اجداد اور تمہاری اولاد میں کون فائدے کے لحاظ سے تم سے زیادہ قریب ہے۔ یہ حصے خدا نے مقرر کردیے ہیں اور بلاشبہ خدا تمام حقیقتوں سے واقف اور دانا و بینا ہے۔

یعنی انسان کا علم ناقص اور محدود ہے وہ نہیں جان سکتا کہ کون سے رشتہ اس سے قریب تر ہیں اور آباء و اجداد یا اولاد میں سے کون سے رشتے اس کے لیے زیادہ نفع بخش ہیں۔ خدا ہی کو اس حقیقت کا صحیح صحیح علم ہے، وہی انسان کی تمام مصلحتوں سے بخوبی واقف ہے۔ اور اس کے احکام سراسر حکمت پر مبنی ہیں۔

میراث میں مرد اور عورت دونوں حقدار ہیں

لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ (النساء)

مردوں کا اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو اور عورتوں کا بھی اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو۔

میراث کے سلسلے میں یہ ایک اہم قانونی حکم کی وضاحت ہے کہ میراث صرف مردوں ہی کا حق نہیں ہے۔ بلکہ عورتیں بھی میراث کی حقدار ہیں، اور خدا نے ان کے حصے مقرر کیے ہیں۔ کسی کو حق نہیں

وارثوں کو ان کے حصوں سے محروم کرے یا ان میں کمی بیشی کرے ۔

میراث کی تقسیم بہر حال لازمی ہے

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا. (النساء ۷)

مردوں کا اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو اور عورتوں کا بھی اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو خواہ وہ تھوڑا ہو یا بہت۔ یہ خدا کے مقرر کردہ حصے ہیں ۔

یعنی میت کا چھوڑا ہوا ترکہ چاہے کتنا ہی کم ہو۔ بہر حال اس کو تقسیم کرنا ہوگا ۔ اور حقداروں تک ان کا حق پہنچانا ہی ہوگا ۔ چاہے یہ حق کتنا ہی قلیل ہو ۔

تقسیم ادائے قرض و وصیت کے بعد ہو

مِن بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَا أَوْ دَيْنٍ

میت کی وصیت اور قرض ادا کرنے کے بعد

یعنی ترکے کی تقسیم میت کی وصیت پوری کرنے اور قرض ادا کرنے کے بعد ہوگی ۔

مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے

يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ.

تمہاری اولاد کے بارے میں اللہ تمہیں ہدایت دیتا ہے کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے

ترکے کی تقسیم میں بنیادی ہدایت یہ ہے کہ مرد کا حصّہ عورت سے دوگنا ہے۔ اس لیے کہ مرد کے ذمے معاشی ذمہ داریاں عورت کے مقابلے میں زیادہ ہیں ۔

اولاد کے حصے

لڑکے اور لڑکی کا حصہ

يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ

تمہاری اولاد کے معاملے میں اللہ تمہیں ہدایت کرتا ہے کہ لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے ۔

یعنی جب لڑکے اور لڑکیاں دونوں وارث ہوں تو ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہوگا

صرف لڑکیاں وارث ہوں تو دو تہائی

فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ (النساء ۱۱)

پس اگر میت کی وارث دو سے زائد لڑکیاں ہوں تو انہیں ترکے کا دو تہائی دیا جائے گا

یہی حکم دو لڑکیوں کا بھی ہوگا۔

صرف ایک ہی لڑکی وارث ہو تو آدھا

وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ (النساء

اور اگر ایک ہی لڑکی وارث ہو تو اس کو کل ترکے کا آدھا دیا جائے گا۔

والدین کے حصے

با اولاد میت کے ماں باپ کا چھٹا حصہ

وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ

اور اگر میت صاحب اولاد ہو تو اس کے ماں باپ میں سے ہر ایک کو ترکے کا چھٹا حصہ ملے گا۔

بے اولاد میت کی ماں کا تہائی حصہ

فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ

اور اگر میت صاحب اولاد نہ ہو اور والدین ہی اس کے وارث ہوں تو ماں کو تہائی حصہ ملے گا۔

یعنی اگر صرف ماں باپ ہی وارث ہوں تو ایک تہائی ماں کا حصہ ہوگا اور بقیہ دو تہائی باپ کا ہوگا۔

میت کے بہن بھائی ہوں تو ماں کا چھٹا حصہ

فَاِنْ كَانَ لَهٗٓ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ (النساء

اور اگر میت کے بہن بھائی ہوں تو ماں کو چھٹا حصہ دیا جائے گا۔

زوجین کے حصے

اولاد نہ ہو تو شوہر کا آدھا حصہ

وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ

اور تمہاری بیویوں کے مال میں تمہارا آدھا حصہ ہے اگر وہ بے اولاد ہوں۔

اولاد ہو تو چوتھائی حصہ	فَإِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ	اور اگر وہ اولاد والی ہوں
	فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا	تو ترکے کا چوتھائی حصہ
	تَرَكْنَ (النساء)	تمہارا ہے۔
اولاد نہ ہو تو بیوی کا چوتھائی حصہ	وَلَهُنَّ الرُّبُعُ	اور وہ تمہارے ترکے میں
	مِمَّا تَرَكْتُمْ	چوتھائی حصہ کی حق دار ہیں
	إِن لَّمْ يَكُن لَّكُمْ وَلَدٌ	اگر تم صاحب اولاد نہ ہو
اولاد ہو تو آٹھواں حصہ	فَإِن كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ	اور اگر تم صاحب اولاد ہو
	فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا	تو تمہارے ترکے میں ان کا
	تَرَكْتُم (النساء-۱۲)	حصہ آٹھواں ہوگا۔

بہن بھائی کے حصے

ایک بہن یا بھائی ہو تو ہر ایک کو چھٹا حصہ	وَإِن كَانَ	اور اگر (میت) مرد یا عورت
	رَجُلٌ يُورَثُ	بے اولاد بھی ہو اور اس کے
	كَلَالَةً أَوِ امْرَأَةٌ وَلَهُ أَخٌ أَوْ	ماں باپ بھی زندہ نہ ہوں اور اس کا ایک
	أُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ	بھائی یا ایک بہن زندہ ہو تو اس بھائی
	(النساء-۱۲)	یا بہن کو چھٹا حصہ ملے گا۔
ایک سے زیادہ ہوں تو سب تہائی میں شریک	فَإِن كَانُوا	اور اگر بھائی یا بہن ایک سے
	أَكْثَرَ مِن ذَٰلِكَ	زائد ہوں تو وہ ایک تہائی
	فَهُمْ شُرَكَاءُ فِي الثُّلُثِ	مال میں شریک ہوں گے

یہ ان بھائی بہنوں کا ذکر ہے جو میت کے ساتھ صرف ماں کی طرف سے رشتہ رکھتے ہوں باپ دوسرا ہو

سگی بہن کا آدھا حصہ	يَسْتَفْتُونَكَ قُلِ اللَّهُ	لوگ آپ سے کلالہ کے معاملے
	يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلَالَةِ إِنِ	میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دیجیے کہ اللہ تمہیں فتویٰ
	امْرُؤٌ هَلَكَ لَيْسَ لَهُ وَلَدٌ وَلَهُ أُخْتٌ	دیتا ہے کہ اگر کوئی ایسا شخص مرجائے جس کی

فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ وَهُوَ يَرِثُهَا إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا (النساء)

نہ اولاد ہو نہ ماں باپ اور اس کی ایک بہن ہو تو وہ ترکے میں آدھے حصے کی حقدار ہوگی اور اگر بہن بے اولاد مرے تو بھائی اس کا وارث ہوگا۔

فَإِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثَانِ مِمَّا تَرَكَ (النساء)

تو وہ بہنیں وارث ہوں تو دو تہائی حصہ

اور اگر میت کی وارث دو بہنیں ہوں تو وہ ترکے میں سے دو تہائی کی حق دار ہوں گی۔

وَإِنْ كَانُوا إِخْوَةً رِّجَالًا وَنِسَاءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ۔

کئی بھائی بہنیں ہوں تو مرد کا حصہ دوگنا ہوگا

اور اگر کئی بھائی بہنیں ہوں تو عورتوں کا اکہرا اور مردوں کا دوہرا حصہ ہوگا۔

قتلِ اولاد کی حرمت

"اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو۔ ہم انہیں بھی رزق دیں گے اور تمہیں بھی — درحقیقت ان کا قتل ایک بڑی خطا ہے۔"

یہ آیت ان معاشی بنیادوں کو قطعی منہدم کر دیتی ہے۔ جن پر قدیم زمانے سے آج تک مختلف ادوار میں آج تک مختلف ادوار میں ضبطِ ولادت کی تحریک اٹھتی رہی ہے۔ افلاس کا خوف قدیم زمانے میں قتلِ اطفال اور اسقاطِ حمل کا محرک ہوا کرتا تھا اور آج وہ ایک تیسری تدبیر یعنی منعِ حمل کی طرف دنیا کو دھکیل رہا ہے۔ لیکن منشورِ اسلامی کی یہ دفعہ انسان کو ہدایت کرتی ہے کہ وہ کھانے والوں کو گھٹانے کی تخریبی کوشش چھوڑ کر ان تعمیری مساعی میں اپنی قوتیں اور قابلیتیں صرف کرے جن سے اللہ کے بنائے ہوئے قانونِ فطرت کے مطابق رزق میں افزائش ہوا کرتی ہے۔ اس دفعہ کی رو سے یہ بات انسان کی بڑی غلطیوں میں سے ایک ہے کہ وہ بار بار معاشی ذرائع کی تنگی کے اندیشے سے افزائشِ نسل کا سلسلہ روک دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ یہ انسان کو متنبہ کرتی ہے کہ رزق رسانی کا انتظام تیرے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ اس خدا کے ہاتھ میں ہے جس نے تجھے زمین میں بسایا ہے۔ (تفہیم القرآن)

تناسخ کا تحقیقی جائزہ

جناب سلطان مبین ایم اے (سنسکرت)

تناسخ کا پس منظر عقیدہ تناسخ کس پس منظر میں ابھرا؟ قطعی طور پر بتانا تو ضرور مشکل ہے کہ کن اثرات نے تناسخ کو جنم دیا تاہم تناسخ کی مقبولیت کے اسباب کے بارے میں بہت سی معقول باتیں کہی جا سکتی ہیں۔

۱۔ **وحشت و وہم۔** پرانے زمانے کا انسان تمدن کی لعنتوں سے پاک و صاف تھا۔ وہ دانستہ و بالقصد گناہوں کے ارتکاب میں آج جیسا جری نہیں تھا۔ ہر قوم و ہر معاشرہ۔ اپنی نادانی و جہل کے مطابق۔ نیکیوں کے کسب میں پیش پیش تھا۔ عوام عیش و عشرت کی رنگینیوں و رعنائیوں سے ناواقف تھے۔ ہر ذہن کم و بیش پرسکون اور مطمئن تھا۔ آج جیسے اباحت پسند اور گناہ پرست انسانوں سے دنیا بڑی حد تک خالی تھی ہر شخص اپنے ضمیر و فکر کے اعتبار سے دین دار تھا۔ اس لیے گناہ ان کے لیے اجنبی ہی نہیں بلکہ وحشت انگیز بھی تھا۔ جب کبھی وہ کسی گناہ کو ابھرتا ہوا دیکھتے تو ان کا ذہن متوحش ہو کر اس کے اثرات و نتائج کی تلاش میں لگ جاتا تھا۔ اس لیے دور و نزدیک کسی ناپسندیدہ واقعہ کو اس گناہ سے جوڑ دیتے تھے۔ ان کا متوحش ذہن اور وہم پرست طبیعت اس طریق کار پر پوری طرح مطمئن تھا۔

نگرانی و احتساب جب گناہ دھرتی کی پیٹھ پر کیا جاتا جب گناہ کو سورج، چاند اور ستاروں کی آنکھیں دیکھتی ہوں۔ صبح و شام، روز و شب، ہوا اور پانی انسانوں کی کرتوں کے گواہ ہوں اور یہی گواہ و شاہد جب خداوند بھی ہوں تو آخر وہ کیوں بدکار کو سزا دینے سے اپنے آپ کو روکے رکھیں گے۔ ان کا ڈنڈا مجرم کی کھوپڑی پر ضرور پڑے گا۔ شرک کی آب و ہوا انسان کو اس کی پوری زندگی میں پاگل کتے کی طرح آخر کیوں چھوڑ دے گی۔ پس اصحاب شرک اپنے یقین و اذعان کی رو سے مجبور تھے کہ وہ

گناہ کے اثرات کو گرد و پیش ہی میں تلاش کریں ۔

ہند قدیم کے لوگ اپنے خداوندوں سے بڑی محبت کرتے تھے اور خداوندوں سے محبت و نوازش کی بڑی بڑی امیدیں رکھتے تھے ۔ وہ خداوندوں کے معاملہ میں بڑے خوش فہم تھے ۔ وہ سمجھتے تھے کہ خطرہ و مصیبت کے وقت خداوند سگنل دے دیتے ہیں ۔ فائدہ و یافت کی خوش خبری کے لیے پرندوں کو بھیج دیتے ہیں ۔ چنانچہ گیدڑ اور بلی کے رونے کو موت کی آمد کا سگنل سمجھتے تھے ۔ کوّے وغیرہ کی آواز کو عزیز کی آمد کا مژدہ سمجھتے تھے ۔ اس طرح سے شگون اور فال کا پورا کلٹ ہی وجود میں آگیا تھا ۔ شگون و بدشگون کے آداب نے انسانوں کو فوری اثرات کے مشاہدہ کا عادی بنا دیا تھا ۔

وحشت و وہم نیز خداوندوں کی نگرانی اور سگنل کی وجہ سے قدیم بھارت کا انسان گناہوں کے اثرات کو فوراً دیکھنے کا رجحان رکھتا تھا ۔ اس لیے وہ نزدیک کے ناگوار واقعہ کو پہلے کے گناہ سے جوڑ دیتے تھے ۔ یہ رجحان اتنا ترقی کر گیا کہ اس نے شک و شبہ کو پیچھے چھوڑ دیا اور یقین و اذعان کا درجہ حاصل کر لیا مجرم اور چور کا پتہ لگانے کے لیے یہ طریقہ اختیار کر لیا گیا کہ لوہے کی گرم کلہاڑی[1] کو مشتبہ و ماخوذ آدمی اٹھائے اگر وہ تپتے ہوئے لوہے کو برداشت کر لیتا تھا تو سمجھا جاتا تھا کہ وہ بے گناہ ہے ۔ اگر وہ تپتا ہوا لوہا اس کی قوت برداشت سے باہر ہوتا تھا تو وہ مجرم سمجھ لیا جاتا تھا ۔ سانچ کو آنچ کہاں یہ معاملوں مقدموں میں دو چار دن کے بعد اگر فریق و گواہ کے یہاں موت[2] و آتش زدگی وغیرہ کے واقعات ہو جاتے تھے تو اس

---

[1] اس نے اس کی چوری کی ہے ۔ سرقہ کیا ہے ۔ اس کے لیے کلہاڑی گرم کرو ۔ وہ اگر مجرم ہوتا ہے تو اپنے کو جھوٹا ثابت کرتا ہے ۔ وہ جھوٹ بولتا ہوا آدمی اپنے کو جھوٹ سے چھپا ہوا سمجھتے ہوئے کلہاڑے کو پکڑ لیتا ہے مگر وہ اس سے جل جاتا ہے اور مارا جاتا ہے ۔ اور اگر وہ مجرم نہیں ہوتا ہے تو وہ اسی سے اپنے کو سچا ثابت کرتا ہے ۔ وہ راستباز اپنے کو سچائی کو اوڑھ کر تپتے کلہاڑے کو پکڑ لیتا ہے وہ اس سے نہیں جلتا اور فوراً چھوڑ دیا جاتا ہے ۔ چھاندوگیہ اپ نی شد : ۶ : ۱۶

[2] اگر بیان کے سات دن کے اندر گواہ کو بیماری آگ لگنا یا عزیز کی موت ہو جائے تو قرض دلوایا جائے اور گواہ کو سزا دی جائے ۔ منو : ۸ : ۰۸ جس کو جلتی ہوئی آگ نہ جلائے اور جو پانی میں نہ ڈوبے اور آفت ناگہانی نہ آوے اس کو حلف میں پاک سمجھنا چاہیے ۔ منو : ۸ : ۱۱۵ جس مقدمہ میں کی گئی ہوئی جھوٹی گواہی ثابت ہو جائے تو مقدمہ کو الٹ دیا جائے اور فیصلہ بدل دیا جائے ۔ منو : ۸ : ۱۱۷

معیبت زدہ شخص کو جھوٹا سمجھا جاتا تھا۔ مصیبت کو گناہ کا خدائی سارٹیفکیٹ تسلیم کیا جاتا تھا۔ آگ، پانی ورترازو وغیرہ سے جھوٹ و سچ، حق و ناحق کی تنقیح کے طریقے کی بڑی پذیرائی تھی اور مصیبت ناگہانی کو گناہ کی علامت سمجھا جاتا تھا۔

۳۔ تقاضائے شرک چونکہ شرک کی نظر خداوند کی تلاش میں آسمان سے ٹکرا کر نیچے چلی آتی ہے۔ وہ نگاہ کائنات سے اوپر اٹھنے کی ہمت ہی نہیں کرتی۔ اسی لیے شرک کے خداوند کائنات سے ہوتے۔ موجودات سے الگ و پاک نہیں ہیں۔ اسی لیے اصحاب شرک کی فکر و نظر اس بات کو سمجھ ہی نہیں سکتی تھی کہ اعمال کی پاداش اس کائنات سے الگ تھلگ ہوگی۔ چناں چہ جن پاک نفوس نے یہ سمجھا کہ خدا کا وجود کائنات کے وجود سے بلند و بالا ہے۔ اس کی ہستی اس عالم کون و فساد سے پرے اور پاک ہے۔ انھوں نے یہ صداقت بھی پالی کہ اعمال کی پاداش کی دنیا بھی اس دنیا سے الگ تھلگ ہے۔

۴۔ مقام نیچا خیال نیچا شرک انسان کو اونچا مقام نہیں دیتا ہے۔ نہ وہ انسان کو محکمۂ کائنات تفویض کرتا ہے۔ اس لیے وہ دنیا کے بناؤ اور بگاڑ کی ذمہ داری بھی انسان پر نہیں ڈالتا۔ پس مشرک جب کسی بھوکے کو دیکھتا ہے تو یہ تاثر نہیں ابھرتا کہ اس کو کھانا کھلانا، اس کی تکلیف کو دور کرنا ہماری ذمہ داری ہے بلکہ یہ تاثر ابھرتا ہے کہ ضرور اس کی مسکنت اور عسرت اس کی اپنی کمائی اور کسب کا نتیجہ ہیں۔

۵۔ دنیا ازلی جیون ازلی چونکہ قدیم زمانہ کا انسان مظاہر قدرت کو حیرت و استعجاب سے دیکھتا تھا۔ وہ ان ظاہری خداوندوں کے بارے میں یہ سوچ نہیں پاتا تھا۔ کہ یہ کسی کے پیدا کیے ہوئے ہیں مخلوق ہیں۔ پس وہ اس طرح سوچتا تھا کہ یہ ازل سے چلے آرہے ہیں اور ہمیشہ اپنی شان پر قائم رہیں گے۔ پس جب انھوں نے اپنے مذہبی رجحان کو فلسفیانہ انداز میں بیان کیا تھا تو یہ کہا کہ کائنات ازلی و ابدی ہے۔ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ چنانچہ قدم عالم برہمن اور دہر متکلمین کا مشترک عقیدہ ہوگیا۔ قدم عالم اور تناسخ میں گہرا تعلق ہے نہ دنیا کی پیدائش کی ابتدا ہے، نہ انسان

---

[1] چنڈال سے، پانی سے، سانپ سے، بجلی سے، شیر چیتے سے، درخت کے گرنے سے مرے ہوئے لوگ۔ گناہ کے سبب سے دوزخ کو جاتے ہیں اور بھوت ہوجاتے ہیں۔ گرڈپران۔ پریت کلپ: ۲۹، ۱۸: ۲۹

کے جنم کی ابتدا ہے۔

وحشت، وہم، شگون، انسان کی پستی، حیرانی و سرگردانی، عالم کا قدیم ہونا۔ ہندوستان میں اٹھنے والے جملہ مذہبوں کا مشترک ورثہ ہے۔ اپنی شدوں کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس زمانے کے مفکر، خدا وندوں کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ یگیہ یاگ (نذر و نیاز) سے بیزار ہو چلے تھے۔ گمان غالب ہے کہ اسی زمانے میں کچھ لوگ تھک تھکا کر "خدا و قانون مکافات" کے منکر ہو گئے۔ مگر ان کے لیے وحشت، وہم و گمان، شگون اور فال، گرم کلہاڑی اور اگنی پریکشا (آتشی آزمائش) سے اوپر ہو کر سوچنا مشکل تھا۔ چونکہ عقیدہ قدم کائنات کا خمیر کسی نہ کسی صورت میں موجود تھا اس لیے ان کے لیے نظام عالم کی تشریح کی کوئی ضرورت پیش نہیں آئی۔ البتہ کائنات کے بہاؤ کی تشریح انھوں نے اپنے طور پر پیش کی جس طرح عالم کا قدیم ہونا کسی فاعل کا متقاضی نہیں ہے اسی طرح عالم کا بہاؤ بھی خدا کی ذات سے بے نیاز ہے۔ عالم طبعی طور پر بہتا رہتا ہے۔ ۱۔ جانداروں کی پیدائش و موت کواکب کے طلوع و غروب کی طرح ہے۔ ۲۔ جانداروں کے ہست و نیست۔ پانی کی لہروں کی طرح اٹھتے بیٹھتے رہتے ہیں۔ ۳۔ زندگی ایک مسلسل سفر ہے موت منزل پر قیام اور تکان دور کرنے کے مترادف ہے۔ ۴۔ سانپ جس طرح کینچلی بدلتا رہتا ہے اسی طرح روح بھی جسم بدلتی رہتی ہے۔ ۵۔ جونک جس طرح اپنا منہ اگلی جگہ پر جما کر پچھلی جگہ کو چھوڑ دیتی ہے۔ اسی طرح روح بھی طبعاً متحرک ہے۔ ۶۔ موت کی منزل روح کے لیے خوش گوار ہی ہوتی ہے انسان جس طرح اپنے پرانے کپڑوں کو اتار کر نئے کپڑے پہن کر خوشی محسوس کرتا ہے۔ اسی طرح روح بھی پیکر دیرینہ و جسم پارینہ کو چھوڑ کر پیکر نو میں آکر انبساط و فرحت پاتی ہے۔ چنانچہ

ا۔ جس طرح تارے آسمان میں ڈوب ڈوب کر اگتے رہتے ہیں اسی طرح روحیں بھی دنیا میں بار بار پلٹ پلٹ کر آتی رہتی ہیں۔ مہابھارت: انوشاسن: ۱۴۵؛ ص ۲۳۹۔ ۲۔ درخت کے پھل کی طرح ہر چیز خود بخود پیدا ہوتی رہتی ہے۔ جس طرح (پانی میں) لہریں پیدا ہوتی ہیں۔ اسی طرح عالم کی نمود بھی ہے۔ مہابھارت: انوشاسن: ۱۴۵؛ ص ۲۲۶۔ ۳۔ جس طرح دوسرے گاؤں کو جانے والا انسان باہر ٹھیرتا ہے اور اس منزل کو چھوڑ کر دوسرے دن چل پڑتا ہے۔ رامائن: اجودھیا: ۱۰۸۔ ۵۔ ۴۔ یہاں اس جسم میں سکھ یا دکھ مسلسل نہیں رہتے۔ سانپ جس طرح اپنی پرانی کھال کو چھوڑ کر

(آگے بڑھ جاتا ہے) اسی طرح انگوٹھے کے برابر انسان) گرڈ پران: پریت کلپ ۱۱: ۲۲، ۳۴ (۵) — انگشت مقدار رہا (روح) پہلی صورت کو چھوڑتے ہوئے — جونک کی طرح۔ ایک قدم کو تولتے تو دوسرا قدم اٹھاتی ہے۔ گرڈ: پریت: ۵: ۳۰

حیات و ممات کی یہ تمثیلیں بڑی دل نشین و دل آویز تھیں۔ ملحدوں کی محفوظ کمین گاہیں تھیں منکرین آخرت کی حسین کمندیں تھیں۔ ان کی زد سے اپنا ایمان بچانا دین داروں کے لیے مشکل ہو گیا۔ چنانچہ برہمنی و بودھی مذہب اس دام میں گرفتار ہو گئے۔ اور وہ خوشی و رضامندی سے ایمان بچانے کے لیے ملحدوں کی انہیں کمین گاہوں میں پناہ گزیں ہو گئے۔ ملحدوں کی زیست و مرگ کی یہ تشریح اتنی زوردار ثابت ہوئی کہ ہر برہمنی اور بودھی متکلم اس کو اپنی تشریح سمجھ کر پیش کرنے لگا۔

اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو یہ ستارہ، لہروں، ٹوٹنے اور کوچ کرنے، کینچلی، جونک، پرانے نئے کپڑوں کی تمثیلات پہلے درجے کی الحادی تعبیریں ہیں۔ گو یہ تناسخ کی بڑی دل کش ترجمانی کرتی ہیں مگر ان کا "تناسخ" تناسخ مکافاتی نہیں، بلکہ تناسخ طبعی ہے۔ یہ بھارتی دھرموں کی بڑی بدنصیبی رہی ہے کہ وہ الحاد کے سوانگ کو نہ سمجھ سکے۔ انھوں نے پردہ اٹھا کر جھانکا تک نہیں کہ ان تمثیلات میں "قانون مکافات" کی کوئی ادنیٰ جھلک بھی دکھائی پڑ رہی ہے یا نہیں؟

"تناسخ کے جال میں پھنسنے والے مذہبی متکلمین نے ذرا روشن خیالی سے کام لیا اور کہا کہ نیکی کرتے یا بدی کرتے کرتے انسان کی ایک طبیعت ہو جاتی ہے۔ روح موت کے بعد اسی طبیعت کے مناسب و مطابق جسم کو اختیار کر لیتی ہے۔ یعنی طبیعت ثانیہ یا ملکہ کے مطابق آگے چل کر طبیعت ملتی ہے۔ جیسا سنسکار رہتا ہے ویسا شریر ملتا ہے۔ یعنی عمل اور جنم گائے اور بچھڑے کی طرح ہیں۔ گائے آگے چلتی ہے۔ بچھڑا اس کے پیچھے چلتا ہے۔ گائے اور بچھڑے باہم مماثل و مشابہ ہوتے ہیں۔ جنم و کرم آگے پیچھے چلا کرتے ہیں۔ عمل اور جسم باہم ہم مزاج ہوتے ہیں۔

جس طرح بچھڑا ہزاروں گایوں میں اپنی ماں گائے کو پا لیتا ہے۔ اسی طرح پہلے کیا ہوا عمل، کرنے والے کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ مہابھارت انوشاسن: ۷: ۲۲

سایہ اپنے اصل کا تابع ہوتا ہے۔ جہاں جہاں اصل چیز جاتی ہے، سایہ اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہتا ہے۔ اسی طرح اعمال بھی سایہ کی طرح روح کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں۔ اس لیے یہ ممکن نہیں ہے

ہم اپنے سایے کو اپنے سے علیحدہ کر سکیں۔ اسی طرح روح کے لیے ممکن نہیں ہے کہ وہ اعمال کی پرچھائیں سے بے داغ و بے لوث ہو جائے۔ یہ پرچھائیں ہی جسم کی صورت میں بدل جاتی ہے نیز موت اور جنم کے درمیان کوئی وقفہ نہیں ہے۔ (۷۷) انسان عمر کے اختتام پر اپنے بوسیدہ جسم کو چھوڑ دیتا ہے اور فوراً ہی یونی "قالب" میں جنم لیتا ہے۔ بیچ میں کوئی فاصلہ یا وقفہ نہیں ہے۔ (۷۸) ہمیشہ اس کے اعمال سایے کی طرح پیچھے پیچھے چلتے ہیں اور مؤثر و نتیجہ خیز ہوتے ہیں۔ انسان سکھ بھوگنے کے لیے یا دکھ جھیلنے کے لیے پیدا ہوتا ہے۔ مہابھارت: بن: ۱۸۳: ۷۷، ۷۸

(باقی)

مکتبہ زندگی و کانتی کی ہندی کتابیں

۱۔ وشونایک (رسول اکرم کی سوانح حیات) =/۱

۲۔ حضرت ابوبکر۔ (سوانح حیات) ۹۰ پیسے

۳۔ ایک کہانی (کہانیوں کا مجموعہ) =/۱

۴۔ اسلام کے چاروں ادر (اسلام پر چند اعتراضات کے دلچسپ جواب) ۷۰ پیسے

۵۔ انسان اپنے کو پہچان ۲۰ پیسے

۶۔ نماز اور اس کے اذکار (اردو)

مکتبہ زندگی و کانتی۔ رام پور

(بقیہ صفحہ ۵۶) زیادہ قیمت کا مال حاصل کرنا ہی ان کا مقصود تھا جو بدنصیبی کی وجہ سے انہیں نہ مل سکا اس کاروبار پر آپ اس پہلو سے بھی غور کریں کہ اگر یہ قرعہ اندازی کی شرط نکال دی جائے اور کم قیمت میں ۶۰ روپیہ کی مشین حاصل کر لینے کا موقع ختم کر دیا جائے تو کیا ممبری کا یہ کاروبار چل سکتا ہے؟ نہیں چل سکتا! یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہر ممبر کے سامنے اصل چیز یہ ہوتی ہے کہ کم روپیہ دے کر محض بخت و اتفاق کی بنا پر زیادہ روپیہ کا مال حاصل کرے اور یہی قمار و جوے کی حقیقت ہے۔

نماز اور انفاق

داعیانِ دین سے خطاب

(سید جلال الدین عمری)

اسلام ایک دعوت ہے۔ جو لوگ اس دعوت کو قبول کریں ان پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی ہے کہ وہ اسے ساری دنیا میں پھیلائیں اور جب تک اس روئے زمین پر اس دعوت کا نہ ماننے والا ایک فرد بھی باقی ہے اپنا کام ختم نہ کریں۔ اس بھاری بوجھ کو وہی شخص اٹھا سکتا ہے جس کے اندر دو خوبیاں ہوں۔ ایک یہ کہ جس دین کو اس نے قبول کیا ہے اس پر خود عمل کرے۔ کیونکہ بے عمل انسان خدا کے دین کا داعی نہیں ہو سکتا۔ دوسری خوبی یہ کہ دعوت دین کے لیے جن اوصاف کی ضرورت ہے وہ اس کے اندر موجود ہوں۔ نماز سے یہ دونوں خوبیاں پیدا ہوتی ہیں۔

آئیے پہلے ہم یہ دیکھیں کہ نماز کی وجہ سے انسان میں اس دین پر عمل کی صلاحیت کس طرح پیدا ہوتی ہے جس کا وہ داعی ہے۔

۱۔ دعوت دین کو قرآن نے 'تذکیر' کہا ہے۔ یعنی انسانوں کے اندر خدا کی یاد پیدا کرنا۔ خدا کی یاد پورے دین کی جان ہے۔ دین کا مقصد ہی یہ ہے کہ انسان خدا کو نہ بھولے اور ہر وقت اسے یاد رکھے۔ جو شخص خدا سے غافل ہے اس کے دل کی دنیا ویران ہے۔ وہ ایسا کھنڈر ہے جس میں ہدایت کا چراغ روشن نہیں ہے۔ انسان کا فرض ہے کہ خدا کو ہر دم یاد رکھے کیونکہ وہ اس کا خالق، مالک اور معبود ہے۔ لیکن انسان اپنی غفلت اور نادانی کی وجہ سے، خواہشات کے غلبے اور غلط تعلیم و تربیت کے سبب سے خدا کو بھول جاتا ہے۔ دعوت دین یہ ہے کہ اس کو اس غفلت سے جگایا جائے، اس کی جہالت دور کی جائے اور اسے خدا سے قریب کیا جائے

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہے :-

فَذَكِّرْ إِنْ نَفَعَتِ الذِّكْرَىٰ ۞ سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَخْشَىٰ (الاعلیٰ)

آپ نصیحت کیجیے اگر نصیحت فائدہ دے۔ جس شخص کے دل میں خدا کا خوف ہوگا وہ اس سے فائدہ اٹھائے گا۔

دوسروں کو خدا کی طرف متوجہ کرنے اور ان کے دلوں میں خدا کی یاد پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ خود اس کام کا کرنے والا خدا کو بھلا بیٹھا نہ ہو۔ خدا کی یاد اگر خود اسی کے دل میں اتری ہوئی نہیں ہے تو کسی دوسرے کے دل میں وہ خدا کی یاد پیدا نہیں کر سکتا۔ جو شخص خدا کو یاد رکھنا چاہیے اس کے لیے ضروری ہے کہ نماز نہ چھوڑے۔ کیونکہ نماز خدا کی یاد کا بہترین ذریعہ ہے بلکہ سراپا خدا کی یاد ہے۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے۔

أَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي

نماز قائم کرو میری یاد کے لیے

نماز خدا کے ذکر کا دوسرا نام ہے اور قرآن کے الفاظ میں 'خدا کا ذکر بہت بڑی چیز ہے'۔ حقیقت یہ ہے کہ مردہ دلوں کو زندگی خدا کی یاد سے ملتی ہے اور خدا کی یاد نماز سے حاصل ہوتی ہے۔ نماز انسان کو خدا کی طرف متوجہ کرتی اور اسے خدا سے غافل ہونے نہیں دیتی۔ ظاہر ہے جو شخص خدا سے غافل نہ ہو یہ اسی کا کام ہے کہ دوسروں کو خدا کے ذکر کی دعوت دے اور ان میں خدا کی یاد پیدا کرے۔

۲۔ دعوت دین کو قرآن نے 'شہادت علی الناس' سے بھی تعبیر کیا ہے۔ یعنی انسانوں کے سامنے خدا کے دین کو پیش کرنا اور اس کے حق ہونے کی گواہی دینا۔ اتنا بڑا کام وہی شخص انجام دے سکتا ہے جس کی زندگی دین کے سانچے میں ڈھل چکی ہو۔ جو شخص اپنے عمل سے دین کی گواہی نہ دے سکے ناممکن ہے کہ وہ 'شہادت علی الناس' کا فرض پورا کر دے۔ نماز سے انسان کی زندگی دین کا نمونہ بن جاتی ہے اور انسان اس قابل ہوتا ہے کہ جس دین کو وہ دنیا کے سامنے پیش کر رہا ہے اپنے عمل سے بھی اس کی شہادت دے۔ یہ حقیقت آپ کو سورۂ حج کی آخری آیت سے معلوم ہوگی جس میں شہادت علی الناس کے حکم کے فوراً بعد نماز کی ہدایت کی گئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے :-

لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى

تاکہ رسول گواہ ہو تم پر اور تم گواہ ہو لوگوں پر تو تم نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔

النَّاسِ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ هُوَ مَوْلٰكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ۔

اور اللہ کو مضبوط پکڑو۔ وہ تمہارا سرپرست ہے پس کیا ہی اچھا سرپرست ہے وہ اور کیا ہی اچھا مددگار ہے۔

۳۔ دعوت دین کے لیے قرآن نے ایک اصطلاح امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی استعمال کی ہے۔ اس کا مطلب ہے دنیا کو ان بھلائیوں کا حکم دینا جن کا خدا نے حکم دیا ہے اور ان برائیوں سے روکنا جن سے اس نے منع کیا ہے۔ اس امت کو خیر امت کہا گیا ہے کیونکہ وہ ایک طرف خدا پر ایمان رکھتی اور اس کی اطاعت کرتی ہے اور دوسری طرف دنیا کو معروف کا حکم دیتی اور منکر سے منع کرتی ہے۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر اونچی سیرت اور مضبوط کردار کا تقاضا کرتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ انسان خود بھی معروف پر عمل کرے اور منکر سے بچے۔ جس شخص کے کردار میں کھوٹ ہے اس کے لیے امر بالمعروف ونہی عن المنکر جیسا سخت کام آسان نہیں ہے۔ نماز انسان میں معروف پر عمل کرنے اور منکر سے باز رہنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے۔ اسی وجہ سے خدا کا حکم ہے:۔

اَقِمِ الصَّلٰوةَ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ

نماز قائم کرو۔ یقیناً نماز فحش اور منکر سے روکتی ہے۔

نماز خدا کا سب سے بڑا حکم اور سب سے بڑی نیکی ہے۔ جو شخص نماز جیسی عبادت کو چھوڑ دے اس کے لیے دوسری نیکیوں کا چھوڑنا بہت آسان ہے۔ قرآن نے ایک جگہ بعض جلیل القدر پیغمبروں کے جانشینوں کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:۔

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ

پھر ان کے بعد ایسے ناخلف پیدا ہوئے جنہوں نے نماز کو ضائع کیا اور خواہشات نفس کے پیچھے پڑ گئے

اس سے معلوم ہوا کہ انسان جب نماز کو چھوڑتا ہے تو خواہشات کا غلام بن جاتا ہے۔ ظاہر ہے اس کے بعد وہ بدی کا ایجنٹ تو ہو سکتا ہے خدا کے دین کا خادم نہیں ہو سکتا۔

۴۔ دعوت دین کا کام حقیقت میں اقامت دین کا کام ہے۔ یہ کام اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ انسان پہلے اپنے آپ پر دین قائم کرے۔ جس شخص میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ اپنی ذات پر دین قائم کرے

اس کے بغیر خدا کی زمین پر خدا کے دین کو قائم کرنا ممکن نہیں ہے ۔ نماز انسان کو زندگی کے ہر معاملے میں دین کی اتباع کے قابل بناتی ہے ۔ اس سے یہ قوت اور صلاحیت پیدا ہوتی ہے کہ وہ دین پر پوری طرح عمل کر سکے ۔ چنانچہ حدیث میں ہے : ۔

الصلوٰۃ عماد الدین من	نماز دین کا ستون ہے جس نے نماز
اَقَامَهَا فقد اقام الدین و من	قائم کی اس نے دین قائم کیا اور جس نے نماز
هدمها فقد هدم الدین	کو ڈھایا اس نے دین کو بھی ڈھا دیا

حقیقت یہ ہے کہ نماز کے بغیر انسان نہ دین پر قائم رہ سکتا ہے اور نہ اس کی طرف دنیا کو دعوت دے سکتا ہے ۔

دعوت دین کے لیے جن اوصاف و خصوصیات کی ضرورت ہے وہ بھی نماز ہی سے پیدا ہوتے ہیں ۔ ہم یہاں ان میں سے چند اوصاف کا ذکر کریں گے ۔

خدا سے تعلق خدا کے دین کی خدمت کے لیے ضروری ہے کہ خدا سے آپ کا گہرا تعلق ہو اور یہ تعلق نماز کے ذریعے پیدا ہوتا ہے ۔ نماز کے بغیر آپ خدا سے دور ہوں گے اور جو شخص خدا سے دور رہے اس کے لیے اس کے دین کی خدمت ممکن نہیں ہے ۔

خدا کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ میں نماز خدا سے مناجات اور سرگوشی ہے ۔ گویا نماز میں انسان پر یہ کیفیت طاری ہونی چاہیے کہ وہ خداوند عالم سے بات چیت کر رہا ہے ۔ نماز محض چند مخصوص افعال کو چند مخصوص اوقات میں انجام دینے کا نام نہیں ہے بلکہ اس میں خشوع مطلوب ہے ۔ قرآن میں اہل ایمان کی یہ صفت بیان کی گئی ہے : ۔

اَلَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلٰوتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝	جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں

خشوع یہ ہے کہ آدمی پوری طرح خدا کے سامنے جھک جائے ۔ سرافگندگی اور خاکساری کے جذبات کے ساتھ اپنے آپ کو خدا کے سامنے ڈال دے اور خدا کے جلال و عظمت کا تصور کر کے کانپ اٹھے ۔ خدا کے خوف سے اس کی نگاہیں نیچی ہوں اور وہ عجز مجسم بن کر خدا سے اپنی بات کہے ۔ اس کی صحیح تصویر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دعا میں موجود ہے جسے آپ رکوع میں پڑھتے تھے

اللّٰھُمَّ لَکَ رَکَعْتُ وَ	اے اللہ میں تیرے سامنے پست ہو گیا
بِکَ اٰمَنْتُ وَلَکَ اَسْلَمْتُ خَشَعَ	تجھ پر ایمان لایا، تیری اطاعت قبول کی،
لَکَ سَمْعِیْ وَبَصَرِیْ وَمُخِّیْ	جھک گئے تیرے سامنے میرے کان، میری
وَعَظْمِیْ وَعَصَبِیْ	آنکھیں، میرے جسم کی ساری قوت، میری
(مسلم)	ہڈیاں اور میرے اعصاب

دعوتِ دین کے لیے ہر وقت آپ کو خدا کی مدد کی ضرورت ہے جب نماز میں آپ کی زبان خدا کی حمد کرے، آپ کے ہاتھ پیر خدا کی تعظیم میں لگ جائیں، آپ کے دل و دماغ خدا کے سامنے جھک جائیں، اور جو نماز خدا سے بات چیت کا ذریعہ بن جائے وہ آپ کو خدا کی مدد کا حق دار بناتی ہے۔ اس سے وہ زبردست طاقت حاصل ہوتی ہے جو دین کی خدمت کے لیے ناگزیر ہے۔ اس طاقت کے بغیر دین کے دشمنوں کے درمیان آپ دین کا نام بھی نہیں لے سکتے۔

صبر اور استقلال دین کی دعوت کھیل نہیں ہے۔ اس کے لیے بے پناہ صبر اور پہاڑ کی طرح ثابت قدمی اور جماؤ چاہیے۔ یہ خوبی آپ کے اندر نماز ہی کے ذریعہ پیدا ہو سکتی ہے۔ قرآن میں ہے :-

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا	یقیناً انسان تھڑدلا پیدا کیا گیا ہے
اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا وَّ	جب اس کو تکلیف پہنچتی ہے تو گھبرا جاتا ہے
اِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا	اور جب راحت ملتی ہے تو ہاتھ روک لیتا
اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ۝	ہے۔ سوائے نمازیوں کے کہ وہ اس سے
(معارج)	مستثنیٰ ہیں۔

کسی کام کو چند دن انجام دینا آسان ہے لیکن استقلال کے ساتھ اسے کرتے رہنا آسان نہیں ہے۔ بہت سے لوگ وقتی جوش کے تحت دعوت دین کا کام شروع کرتے ہیں اور بہت جلد اسے چھوڑ بھی دیتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کی نگاہ میں دعوت دین کی کوئی اہمیت نہیں ہے جس وقت انھوں نے دین کی دعوت شروع کی نہ تو اس وقت ان کو احساس تھا کہ وہ کتنا بڑا کام شروع کر رہے ہیں اور نہ اس وقت جب کہ انھوں نے اس دعوت کو چھوڑا ان کو احساس ہوا کہ وہ کتنا اہم کام چھوڑ رہے ہیں

دعوت دین کا جذبہ انسان کے اندر اس طرح داخل ہونا چاہیے کہ مرتے دم تک الگ نہ ہونے دے۔ نماز آپ کے اندر استقلال اور ثابت قدمی کا وصف پیدا کرتی ہے اس لیے اگر صحیح معنی میں آپ نمازی ہیں تو دین کے کام میں آپ کو استقامت نصیب ہوگی ورنہ آپ اس سے محروم رہیں گے۔ قرآن نے نمازیوں کی صفت یہ بیان کی ہے:۔

اَلَّذِیْنَ ھُمْ عَلٰی صَلٰوتِھِمْ دَآئِمُوْنَ — جو اپنی نمازوں میں مداومت کرتے رہتے ہیں

دین کی صحیح ترجمانی — دعوت دین کا ایک تقاضا یہ ہے کہ دین کو بغیر کسی کمی بیشی کے صحیح اور مکمل شکل میں پیش کیا جائے۔ اس کی صلاحیت آپ کے اندر اس وقت پیدا ہوگی جب کہ آپ نماز کو بھی ٹھیک ٹھیک ادا کریں اور اس میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کریں۔ قرآن نے نمازیوں کے بارے میں کہا ہے:۔

وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَلٰی صَلٰوتِھِمْ یُحَافِظُوْنَ — اور جو اپنی نماز کی محافظت کرتے ہیں

نماز کی محافظت یہ ہے کہ نماز اس طرح پڑھی جائے جس طرح اسے پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے، اس کے حقوق پورے کیے جائیں، فرائض و واجبات ہی کا نہیں سنن و مستحبات کا بھی اہتمام کیا جائے، اس کو ناقص شکل میں نہیں بلکہ صحیح اور مکمل شکل میں ادا کیا جائے۔ نماز کی محافظت میں یہ بات بھی شامل ہے کہ ہم کسی کام کو نماز پر مقدم نہ کریں بلکہ ہمارے ہر کام پر نماز مقدم رہے۔ نماز کو پہلے وقت میں ادا کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ اس بات کی دلیل ہوگی کہ نماز کو فی الواقع ہم اہمیت دے رہے ہیں کیونکہ جس کام کو ہم اہمیت دیتے ہیں اسے ٹلاتے نہیں ہیں بلکہ فوراً انجام دیتے ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے نماز کا پہلے وقت میں ادا کرنا بہترین عمل ہے۔ جب آپ اس طرح نماز کے ایک ایک جزء اور ایک ایک تقاضے کو پورا کریں گے تو صحیح معنی میں نماز کے محافظ ہوں گے اور خدا کے دین کو بھی ٹھیک اس طرح دنیا کے سامنے پیش کر سکیں گے جس طرح اسے پیش کرنے کا حکم ہے۔

قرآن و حدیث کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے سب سے زیادہ اہمیت نماز کو دی ہے۔ آپ کی زندگی میں بھی نماز ہی کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہونی چاہیے۔ نماز خدا کا سب سے زیادہ پسندیدہ عمل ہے۔ آپ کا پسندیدہ عمل بھی نماز ہی کو ہونا چاہیے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

فرماتے ہیں نماز میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، ضروری ہے کہ نماز آپ کی آنکھوں کی بھی ٹھنڈک ہو آپ کو اس سے سرور و راحت ملے اور اس کے ایک ایک عمل میں لطف و کیف حاصل ہو۔ جو نماز ان خصوصیات کی حامل ہوگی وہ آپ کی کامیابی کی ضامن ہے، آپ کے لیے خدا کی رحمتیں لاتی ہے اور آپ کو اس قابل بناتی ہے کہ سخت سے سخت ماحول میں اور مخالفت کے طوفان کے باوجود خدا کے دین کو پیش کرنے کی سعادت حاصل کریں لیکن اگر آپ کی نماز ان خصوصیات کی حامل نہیں ہے۔ تو آپ نماز پڑھنے کے باوجود خدا کو بھولے ہوئے ہوں گے۔ جو شخص خدا کو بھول جائے خدا بھی اسے بھول جاتا ہے۔ اس کے لیے ممکن نہیں ہے کہ دعوت دین جیسا عظیم کام انجام دے۔

انفاق

جس شخص کے پاس دولت ہوتی ہے وہ خدا کے بندوں کو اپنا غلام بناتا ہے، عیش و عشرت کی زندگی گزارتا ہے، اپنی نفسانی خواہشات پوری کرتا ہے، عالی شان عمارتیں بناتا اور دنیا والوں میں اپنی اونچی حیثیت کا اظہار کرتا ہے لیکن اسلام نے اسے "انفاق فی سبیل اللہ" کا حکم دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو اپنا مال صرف خدا کی راہ میں خرچ کرنا چاہیے۔ کیونکہ خدا کے بندے کو خدا ہی کی راہ میں خرچ کرنے کا حق ہے۔ اگر کسی دوسری مد میں وہ اپنا مال صرف کرتا ہے تو اپنے حق سے تجاوز کرتا ہے۔ خدا کو ماننے اور اس کی کتاب پر ایمان لانے کے بعد پہلا مطالبہ نماز کا ہے، اس کے بعد دوسرا مطالبہ انفاق فی سبیل اللہ کا ہے۔ چنانچہ سورۂ فاطر میں یہ بات اسی ترتیب کے ساتھ کہی گئی ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يَتْلُونَ كِتَابَ اللَّهِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَنفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً يَرْجُونَ تِجَارَةً لَّن تَبُورَ (فاطر)

بے شک وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کی کتاب کی تلاوت کرتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے دیا ہے اس میں سے خفیہ اور علانیہ خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں وہ ایسی تجارت کی امید کرتے ہیں جس میں کبھی گھاٹا نہیں ہو سکتا۔

سورۃ البقرۃ کا آغاز ہی ان کلمات سے ہوا ہے :-

الٓمّٓ ۚ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ	الم - یہ اللہ کی کتاب ہے اس
لَا رَيْبَ فِيْهِ ۚ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ	میں کوئی شک نہیں ہے - ہدایت ہے ان
الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَ	پرہیزگاروں کے لیے جو غیب پر ایمان لاتے
يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ	ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور جو رزق ہم نے ان
يُنْفِقُوْنَ ۝	کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں ۔

مال و دولت کے لیے تاجر تجارت کرتا ہے' دکان دار اپنی دکان سجاتا ہے' سرمایہ دار کارخانے اور فیکٹریاں کھولتا ہے - اگر یہ ساری کوششیں جائز حدود میں ہوں تو اسلام ان سے منع نہیں کرتا۔ البتہ وہ یہ حقیقت ہمارے سامنے رکھتا ہے کہ محنت سے کمائے ہوئے سرمایے کو اگر انسان خدا کے ہاتھ فروخت کر دے تو آخرت میں اسے جنت جیسی دکھوں سے پاک اور سکھ کی جگہ حاصل ہوگی اور وہ عیش کی زندگی گزارے گا - جو شخص اس جنت کے لیے اپنی جان اور اپنا مال خدا کے حوالے کر دے وہ مومن ہے - خدا کا وعدہ ہے کہ وہ اس کے اس ایثار کے عوض اسے جنت دے گا ۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ	یقیناً اللہ نے مومنوں سے ان کے
اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ	نفس اور ان کے مال جنت کے عوض خرید
الْجَنَّةَ ۔	لیے ہیں ۔

انسان سانپ کی طرح اپنے مال کی حفاظت کرتا ہے اور اس کو ایک مضبوط سہارا سمجھتا ہے۔ ایسا سہارا جو مشکل میں اس کے کام آئے گا - حالانکہ قیامت کے دن جب کہ انسان کو سب سے زیادہ سہارے کی ضرورت ہوگی اس کا مال کچھ بھی اس کی مدد نہ کر سکے گا بلکہ اس کا 'محفوظ سرمایہ' اس کے لیے عذاب بن جائے گا ۔

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ	جو لوگ سونے اور چاندی کو جمع کرتے
وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ	ہیں اور ان کو خدا کی راہ میں نہیں خرچ کرتے
اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ يَّوْمَ	انہیں دردناک عذاب کی خوشخبری دے دو
يُحْمٰى ... بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَ	ایک دن آئے گا جب کہ اسی سونے چاندی

ظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۝

ان کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا۔ یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا پس مزہ چکھو اس دولت کا جسے تم جمع کر رہے تھے۔

دنیا میں عزت اور ذلت کا معیار مال ہے۔ دولت سے انسان کا وقار بلند ہوتا ہے اور امیر کی عزت کی جاتی ہے خواہ وہ خدا کا مطیع و فرماں بردار ہو یا اس کا باغی و سرکش۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگ ابھی اس عزت اور ذلت سے بے خبر ہیں جس کا فیصلہ کل قیامت کے دن ہونے والا ہے جب کہ وہ سب لوگ ذلیل ہوں گے جو دولت دنیا پاکر خدا کو بھول گئے۔ وہاں وہ سرمایہ کام نہیں آئے گا جو جمع کیا گیا بلکہ وہی دولت کام آئے گی جو خدا کی راہ میں خرچ کی گئی۔

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ۝ نِ الَّذِىْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۝ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ ۝ كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِى الْحُطَمَةِ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ ۝ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۝ الَّتِىْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ۝ اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ ۝ فِىْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ۝

خرابی ہے ہر عیب جیں اور طعن و تشنیع کرنے والے کے لیے جو مال جمع کرتا ہے اور گن گن کر رکھتا ہے وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال اس کو ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ ایسا ہرگز نہیں ہے وہ ضرور پھینکا جائے گا 'حطمہ' (جہنم) میں تم جانتے ہو کہ 'حطمہ' کیا ہے؟ وہ خدا کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے جو دلوں پر چڑھتی ہے۔ وہ لمبے لمبے ستونوں میں ان کو بند کیے ہوئے ہوگی۔

خوش نصیب ہیں وہ جو اپنا مال خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور کھلے دل سے خرچ کرتے ہیں کیونکہ ان کا مال بے حساب اضافہ کے ساتھ ان کو لوٹایا جائے گا اور اس وقت لوٹایا جائے گا جب وہ خالی ہاتھ اور سرمایے کے محتاج ہوں گے۔

مَنْ ذَا الَّذِىْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا

کون ہے جو خدا کو اچھا قرض دے تو وہ اس کے قرض کو اس کے لیے کئی گنا

بڑھا دے گا۔

خدا کی راہ میں خرچ کرنا خدا کی رحمت کو دعوت دینا ہے۔ جو شخص محتاج ہے وہ آپ کو اس بات کا موقع فراہم کرتا ہے کہ آپ اس کی مدد کرکے خدا کی رحمت کے مستحق ہو جائیں۔ اسی وجہ سے حدیث میں کہا گیا ہے :۔

الراحمون یرحمھم الرحمٰن	رحم کرنے والوں پر خدا رحم کرتا ہے۔
ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء	تم زمین والوں پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔

خدا نے آپ پر جو بے شمار احسانات کیے ہیں ان کا تقاضا ہے کہ آپ اپنے بھائیوں پر احسان کریں۔ اس کی بہترین شکل ان کی مالی مدد ہے۔ جب آپ کسی محتاج پر اپنی کمائی ہوئی دولت صرف کرتے ہیں تو یہ اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ آپ کو خدا کے انعامات کا احساس ہے اور آپ اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتے ہیں۔ مومن اور کافر میں یہی فرق ہے کہ مومن خدا کا شکر گزار بندہ ہوتا ہے اور کافر احسان فراموش اور خدا کو بھولا ہوا۔ سورۂ بلد میں خدا نے انسان پر اپنے احسانات گنانے کے بعد فرمایا ہے :۔

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ وَمَا اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝ فَكُّ رَقَبَةٍ اَوْ اِطْعَامٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۝	لیکن وہ گھاٹی میں نہیں داخل ہوا۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ وہ گھاٹی کیا ہے۔ وہ ہے غلاموں کو غلامی سے چھڑانا یا بھوک کے دنوں میں قرابت دار یتیم کو یا عاجز مسکین کو کھانا کھلانا

خدا کی راہ میں خرچ کرنا خوفِ خدا کی دلیل ہے۔ خدا نے انفاق کو آخرت کے عذاب سے بچنے کا ذریعہ بتایا ہے۔ اس لیے جس شخص کے دل میں آخرت کا خوف ہوگا وہ یقیناً اپنا مال صرف کرکے آخرت کے خوفناک عذاب سے بچنے کی کوشش کرے گا۔ قرآن کہتا ہے کہ یتیموں اور مسکینوں کو وہی دھکا دے گا جو خدا اور آخرت سے غافل ہے۔ خدا کا خوف اور آخرت کی فکر جس کے دل و دماغ پر چھائی ہوا س سے اس سنگ دلی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۝ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ	کیا تم نے اس شخص کو دیکھا جو قیامت کو جھٹلاتا ہے۔ یہی شخص ہے جو یتیم کو دھکے

الْيَتِيْمَ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝ — دیتا ہے اور مسکین کے کھلانے پر لوگوں کو ابھارتا نہیں ہے۔

اس کے برعکس خدا سے ڈرنے والوں کی یہ صفت بیان کی گئی ہے۔

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۝ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۝ اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا ۝ (الدھر)

وہ کھانے کی خواہش اور ضرورت کے باوجود اسے محتاج، یتیم اور قیدی کو کھلاتے ہیں اور اپنی زبان حال سے کہتے ہیں کہ ہم تم کو صرف خدا کی رضا کے لیے کھلا رہے ہیں، ہم تم سے اس کا بدلہ اور شکر گزاری نہیں چاہتے۔ ہم کو اس سخت اور ہولناک دن کا ڈر ہے جس کا آنا ہمارے رب کی طرف سے یقینی ہے۔

دعوت دین کے لیے انفاق کی اہمیت انفاق فی سبیل اللہ دین کی ایک اہم بنیاد ہے۔ اس کے بغیر دین کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ ساتھ ہی انفاق فی سبیل اللہ مختلف پہلوؤں سے اس دعوت کے لیے بھی بے حد ضروری ہے جس کے آپ داعی ہیں اور جسے آپ کامیاب بنانا چاہتے ہیں۔ میں یہاں ان میں سے چند خاص پہلوؤں پر روشنی ڈالوں گا۔

انسانوں کیساتھ خیر خواہی آدمی کے پاس دولت ہو تو اسے وہ اپنے نفس پر خرچ کرتا ہے، اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں پر خرچ کرتا ہے، اس سے آگے بڑھ کر وہ قوم اور ملک پر خرچ کرتا ہے لیکن اسلام اس کے سامنے انفاق کے لیے بہت ہی وسیع نقطہ نظر پیش کرتا ہے۔ وہ انسان پر بحیثیت انسان خرچ کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اس لیے مسلمان کا فرض ہے کہ جو شخص بھوکا ہے اسے کھانا کھلائے جو ننگا ہے اسے کپڑا پہنائے اور جو محتاج ہے اس کی مدد کرے خواہ وہ اس کا عزیز ہو یا غیر، اجنبی ہو یا شناسا، اس کے دیس کا ہو یا پردیسی۔ ہم مذہب ہو یا کسی دوسرے مذہب کا۔ یہ فرض اس پر صرف اس وقت عائد نہ ہوگا جب کہ وہ کسی حاجت مند کی حاجت پوری کرنے سے معذور ہو۔

جو شخص دعوت دین کا کام کرے اسے انفاق کے معاملے میں اس وسیع نقطہ نظر کو ہمیشہ اپنے

سامنے رکھنا ہوگا ۔ اسے بغیر کسی امتیاز کے ہر اس شخص کی مدد کرنی چاہیے جس کی وہ مدد کر سکتا ہو ۔ دعوت دین انسانوں کو خدا کے عذاب سے بچانے کی کوشش ہے ۔ جو شخص یہ کوشش کرتا ہے وہ نوع انسانی کا بہت بڑا خیر خواہ ہے ۔ اگر وہ اپنے اس کام میں مخلص ہے تو فطری طور پر وہ اس دنیا میں بھی ان کا غم خوار ہوگا اور ان کے دکھ درد میں کام آئے گا ۔ جو آدمی انسانوں کو کل کے عذاب سے بچانے کے لیے بے چین ہے ناممکن ہے کہ وہ آج ان کو اس دنیا کی تکلیف سے بچانے کی کوشش نہ کرے ۔ اگر داعی کے اندر انسانوں کی تکلیف پر جذبۂ رحم نہیں پیدا ہوتا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنی دعوت میں مخلص نہیں ہے ۔ جب آپ انسانوں کے خیر خواہ کی حیثیت سے دنیا والوں کے سامنے آئیں گے تو آپ کی باتوں میں ان کے لیے کشش ہوگی ' آپ کی دعوت کو وہ خلوص کے ساتھ سنیں گے اور اس کی طرف کان دھریں گے ۔ اس طرح انفاق کے ذریعے آپ اپنا ایک فرض بھی پورا کرتے ہیں اور اس دعوت کو بھی فائدہ پہنچاتے ہیں جس کے آپ داعی ہیں ۔

اجتماعیت کا احساس داعی دین کے لیے ان افراد کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے جو اس کے ساتھ مل کر دعوتی کام میں ایک جماعت بن گئے ہیں ۔ ان میں نادار و مفلس بھی ہوں گے ، کم زور اور بے سہارا بھی ہوں گے اور ایسے بھی ہوں گے جو وسائل کے محتاج ہیں ۔ جماعت کے استحکام کے لیے ضروری ہے کہ اس کے اصحاب ثروت ان لوگوں کا تعاون کریں جن کی مالی حالت خراب ہے ۔ انہیں یہ حقیقت نہیں بھولنی چاہیے کہ ان کا تعلق دین کا کام کرنے والی جماعت سے ہے ۔ ان کے اندر الفت و محبت کا وہ رشتہ ہونا چاہیے جو بھائیوں کے درمیان ہوتا ہے ۔ انہیں اپنے ہم سفر رفقاء کے دکھ درد میں اس طرح شریک ہونا چاہیے جس طرح خاندان کا ایک فرد دوسرے افراد کے دکھ درد میں شریک ہوتا ہے ۔ جو شخص اس حال میں زندگی گزارے کہ اس کو اپنے ساتھیوں کی تکلیف و راحت کا خیال نہ ہو اس کے اندر اجتماعیت کا احساس نہیں ہے ۔

دین سے محبت کا ثبوت آپ جانتے ہیں کہ انسان کو مال و دولت سے بے حد محبت ہوتی ہے لیکن خدا کے دین سے اس کی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنی اس محبوب چیز کو اس کی راہ میں خرچ کرے ۔ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۝ (تم ہرگز نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ تم خدا کی راہ میں ان چیزوں میں سے خرچ نہ کرو گے جن کو تم چاہتے ہو ۔)

جو شخص خدا کے دین کے لیے اپنا پیسہ صرف کرتا ہے وہ اس بات کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ اسے مال و دولت عزیز نہیں ہے بلکہ خدا کا دین عزیز ہے۔ اس کے برعکس جب خدا کا دین انسان سے اس کا پیسہ مانگے اور وہ اپنا ہاتھ روک لے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے نزدیک روپیہ پیسے کی قیمت خدا کے دین سے زیادہ ہے۔ وہ خدا کے دین کا نقصان گوارا کر سکتا ہے لیکن اپنی دولت میں کمی برداشت نہیں کر سکتا۔

دعوت کی ضروریات کی تکمیل

یہ دنیا اسباب و وسائل کی دنیا ہے۔ بغیر اسباب کے یہاں کوئی چیز حاصل نہیں ہوتی۔ آپ خدا کے دین کی طرف دعوت دیتے ہیں اور ساتھ ہی اس کو کامیاب دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے آپ کو وہ بہت سے اسباب و وسائل بھی اختیار کرنے ہوں گے جو بغیر پیسے کے فراہم نہیں ہوتے۔ خدا کا دین اپنی دعوت و تبلیغ کے لیے اسباب طالب ہوا اور آپ ان اسباب کو فراہم کرنے کی حیثیت میں ہونے کے باوجود اسے فراہم نہ کریں تو یہ آپکے ایمان کے منافی ہے۔ خدا پر ایمان لانے کے بعد آپ کو اس کے دین کے لیے جہاد کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ جہاد آپ کو اپنے جسم و جان سے بھی کرنا ہوگا اور مال سے بھی۔ اگر آپ نے اس جہاد میں کوتاہی کی تو آخرت میں ناکام ہوں گے بلکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو شخص نہ تو خود جہاد کرے اور نہ کسی مجاہد کو ساز و سامان فراہم کرے اور نہ کسی مجاہد کے گھر والوں کی دیکھ بھال کرے تو دنیا ہی میں اس پر خدا کا عذاب آ سکتا ہے۔

آج دنیا مادی لحاظ سے بہت ترقی کر چکی ہے۔ اس کے پاس کسی بھی نظریے کے پھیلانے اور اسے غالب و سربلند کرنے کے اتنے وسیع وسائل موجود ہیں جو اس سے پہلے کبھی نہیں تھے۔ ان وسائل کو خدا کے دین کی تبلیغ و اشاعت اور اس کے غلبہ و تفوق کی راہ میں صرف ہونا چاہیے لیکن افسوس کہ وہ بدی کے پھیلانے اور نیکی کے مٹانے میں صرف ہو رہے ہیں۔ آج کسی بھی خادم دین میں یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ وسائل و ذرائع کا یہ رخ موڑ دے اور ان کو دعوت دین کے کام میں لگا دے۔ ہاں وہ یہ کر سکتا ہے کہ اس کے پاس جو بھی وسائل ہیں ان کو خدا کے دین کے لیے وقف کر دے۔ بلاشبہ آج کفر و الحاد کو جو بے پناہ وسائل حاصل ہیں ان کے مقابلے میں وہ بہت ہی کم ہوں گے لیکن اگر وہ اپنے انفاق و ایثار میں مخلص ہے تو خدا کا فضل اس کو حاصل ہوگا اور وہ اپنے محدود

وسائل و ذرائع کے باوجود کامیاب اور کفر اپنے وسیع وسائل کے باوجود ناکام ہوگا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُنْفِقُوْنَ	جن لوگوں نے خدا کا انکار کیا ہے وہ
اَمْوَالَہُمْ لِیَصُدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ	اپنے مال خدا کے راستے سے روکنے کے لیے
اللّٰہِ فَسَیُنْفِقُوْنَہَا ثُمَّ تَکُوْنُ	صرف کر رہے ہیں پس یہ اس کو خرچ کریں گے
عَلَیْہِمْ حَسْرَۃً ثُمَّ یُغْلَبُوْنَ ۝	مگر ان کیلیے پچھتاوے کا سبب ہوگا اور وہ مغلوب ہوں گے

خدا کا دین اس وقت بہت ہی نازک دور سے گزر رہا ہے۔ باطل تحریکیں اور غلط نظریات تو ہر طرف پھیل رہے ہیں لیکن خدا کا دین سمٹتا اور سکڑتا جا رہا ہے۔ بے دینی اور عاقبت فراموشی سارے عالم پر چھائی ہوئی ہے لیکن خدا کے دین کو اس کے ماننے والے بھی اپنے گھروں تک سے نکال رہے ہیں۔ اس حالت میں کسی کا اپنے پیسے سے خدا کے دین کو تقویت پہنچانا خدا کے نزدیک بہت زیادہ قدر و قیمت رکھتا ہے۔ عام حالات میں آپ خدا کے دین کے لیے جو کچھ خرچ کریں گے بلاشبہ اس کا اجر بھی بہت ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ اجر و ثواب کے آپ اس وقت مستحق ہوں گے جب کہ خدا کا دین مظلوم ہو اور آپ کی حمایت و نصرت چاہتا ہو۔ یہی بات قرآن کی اس آیت میں کہی گئی ہے۔

لَا یَسْتَوِیْ مِنْکُمْ مَنْ	تم میں سے جن لوگوں نے فتح مکہ سے
اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ	پہلے خدا کی راہ میں خرچ کیا اور اس کے دشمنوں
اُولٰٓئِکَ اَعْظَمُ دَرَجَۃً مِّنَ	سے لڑے وہ ان لوگوں کے برابر نہیں ہیں
الَّذِیْنَ اَنْفَقُوْا مِنْ بَعْدُ	جنھوں نے فتح مکہ کے بعد خرچ کیا اور دشمنوں
وَقَاتَلُوْا	سے لڑے (بلکہ پہلے گروہ کا اجر دوسرے
	گروہ کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے۔

دین کی راہ میں خرچ کرنے کا جذبہ

قرآن و حدیث میں کہیں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ مال رکھنا گناہ ہے اور نہ یہ ہدایت کی گئی ہے کہ انسان اپنا پورا مال خدا کی راہ میں خرچ کر دے بلکہ قرآن نے انسان کو اپنے مال کا ایک خاص حصہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے کا حکم دیا ہے لیکن جب انسان خدا کے حکم سے اپنے مال کا ایک حصہ نکالتا ہے تو اس کے اندر انفاق کا زبردست جذبہ پیدا ہوتا ہے وہ ہر اس موقع پر اپنی (باقی صـــ پر)

"ہدایت" — براہِ راست صرف خدا کا عطیہ

(جناب شمس نوید عثمانی)

پروفیسر اسمتھ آکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا کے صفحہ ۱۹۰ پر اسلام کی فاتحانہ اشاعت پر حسب ذیل باتیں تحریر کرتے ہیں:۔

محمد کے مذہب "اسلام" کا تیز رفتار پھیلاؤ اور وہ ڈرامائی اچانک پن جس کے ساتھ ان کے عقیدے پر کاربند ہونے والے لوگ ایک پرشکوہ اقتدار کے مقام تک جا پہنچے ۔ وہ تاریخ کا ایک عجوبہ یا کہنا چاہیے ۔ تاریخ کا معجزہ تھا ۔ اس کے لیے کوئی بھی تشریح و تعبیر جو پیش کی جا سکتی ہے وہ ان تہلکہ انگیز حقائق کی شافی و کافی توجیہ کے لیے دل کو نہیں لگتی لیکن تاریخ کے دامن میں ایسے جو ناقابل توجیہ عجائبات درج ہیں وہ دوچار نہیں ہیں ۔ اس لیے ہمیں یہ تسلیم کر لینے پر اکتفا کرنا ہوگا کہ ماضی میں جس طرح کہ حال میں ایسی بہت سی باتیں ہیں جو آدمی کی سمجھ سے بالاتر ہیں :

(انگریزی سے ترجمہ)

پروفیسر اسمتھ نے تو اسلام کی حیرت انگیز تیز اشاعت کے لیے ہر قسم کی مادی توجیہ کو ناکافی پا کر اسے صرف تاریخ کا معجزہ قرار دے کر صبر کر لیا ۔ لیکن خود پروفیسر اسمتھ کے اس طرزِ عمل کو آخر کس لفظ سے یاد کیا جائے کہ وہ اس "معجزے" کی ہر توجیہ کو غیر دل نشین تسلیم کر لینے کے باوجود خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش کردہ اس واحد توجیہ کو کیوں نہیں مان سکے کہ "میں خدا کا رسول ہوں اور خود خدا کی غیبی طاقت نے اسلام کی فاتحانہ اشاعت کا یہ کارنامہ انجام دیا ہے ۔"

یہ بات — پروفیسر موصوف کا یہ طرزِ عمل یقیناً تاریخ کا ایک راز سربستہ اور انسانی نفسیات کی ایک زبردست پہیلی ہے اور یہ پہیلی بھی خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے حل کی جب انھوں نے یہ انکشاف فرما

کہ انسان کا دل انسان کے ہاتھ میں نہیں۔ خدا کی دو انگلیوں کے بیچ میں ہے جہاں سے وہ اس کو جدھر چاہتا ہے گھمارہا ہے۔ پھیر رہا ہے۔ اور یہ کہ "ہدایت" کوئی خود کما نہیں سکتا۔ ہدایت خدا ہی خود کسی کو عطا فرماتا ہے اور اسی کو عطا فرماتا ہے جو خدا کے سامنے اس کے لیے دامان طلب پھیلائے۔ دستِ سوال دراز کرے۔ یہ وہ عظیم نعمت ہے جو بغیر مانگے نہیں ملتی۔ دنیا اور اس کی نعمتیں وہ ہر کسی کو دے دیتا ہے۔ بلکہ اپنے دشمنوں کو اپنے دوستوں سے بھی زیادہ دے دیتا ہے۔ لیکن آخرت پر ایمان اور ہدایت کی دولت وہ منتخب مخلصین ہی کو عطا فرماتا ہے۔

شاید پروفیسر موصوف کو اس ہدایت یافتگی کی پیاس نہیں تھی ——— ورنہ ہرگز یہ سانحہ وقوع پذیر نہ ہوتا کہ وہ اسلام کے اس قدر نزدیک سے ہو کر اور اس قدر مرعوب و متاثر ہو کر گذرتے اور پھر بھی اسلام کی صداقت کے یقین سے خالی ہاتھ ہی رہ جاتے۔ یہ ایک بڑا سانحہ تھا لیکن اس سے بھی بڑا سانحہ اسی کتاب میں چند سطور کے بعد ایک اور پیش آیا اور اسے پیش آنا بھی تھا۔

اسلام کی فتوحات کو تاریخ کا معجزہ کہنے اور اس کے لیے ہر توجیہ کو غیر شافی و ناکافی قرار دینے کے بعد انھوں نے تحقیق و تجسس کی فطری خواہشات کی دنیا میں گویا ایک "خلاء" قائم کر لیا تھا۔ اور "خلاء" انسان کو مجبور کرتا ہے کہ اس کو کسی نہ کسی غلط یا صحیح چیز سے پُر کرے ——— اور جب انسان اس خلاء کو صحیح چیز سے بھرنے کے لیے آمادہ ہی نہ ہو تو پھر اس کو کسی غلط شے سے بھرتے ہوئے وہ عقل و استدلال کو کس طرح اپنے ہاتھ سے ذبح کرتا ہے۔

وہی پروفیسر اسمتھ جو ابھی ابھی یہ بات صاف صاف کہہ چکے تھے کہ اسلام کی یہ طوفانی رفتار تاریخ کا ایک معجزہ ہے اور یہ کہ اس کی کوئی بھی توجیہ دل کو نہیں لگتی اور یہ کہ اس قسم کے عجائبات کو سمجھ لینا عقل انسانی کی دسترس سے باہر ہے۔ ہاں وہی پروفیسر اسمتھ اسی اسلام کی فاتحانہ اشاعت کی ایک توجیہ پیش کرنے پر اتر آئے ——— اور توجیہ بھی وہ جو خود مغربی علماء کے نقطہ نظر سے ایک گھسی پٹی توجیہ بن کر رہ گئی ہے ——— اور وہ یہ کہ "اسلام کی طاقت کا راز اس کی تلوار میں مضمر تھا!" ——— چناں چہ اس بے رحمانہ حد تک غیر تاریخی اور غیر علمی تہمت کی طرف وہ اس طرح بڑھے کہ پہلے تو اسلام کی زد میں اس وقت کی عظیم ایرانی و رومی سلطنتوں کی شکست کا ذکر چھیڑتے ہوئے یہ کہا کہ

ریگستان سے اٹھنے والے عربوں کے غضبناک جوش و خروش کے آگے کوئی چیز ٹھیر ہی نہیں

سکتی تھی۔ جن کے حملوں کے سامنے قدیم شاہی تخت لڑکھڑائے اور زمین پر ڈھیر ہو گئے۔

(ترجمہ)

اور پھر :-

"پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات کے بعد اسّی سال کی قلیل مدت میں ان کے عربی پیروکار نہ صرف عربستان بلکہ ایران، مغربی ترکستان، سندھ، مصر اور جنوبی اسپین کے مالک بن گئے۔" (ترجمہ)

اور پھر اچانک جیسے انہیں یہ بات یاد ہی نہ رہی کہ ابھی چند سطور پہلے وہ اسلام کی فاتحانہ اشاعت کو تاریخ کا ایک ناقابل توجیہ معجزہ قرار دے چکے ہیں ـــ یکایک ان کا ہاتھ اٹھا اور ـــ اس کی توجیہ کے طور پر وہ اسلام کی تلوار کی طرف اشارہ کرنے لگے۔

وہ اپنے نئے مذہب کو اپنے ساتھ لے گئے اور اس کو اپنے حریفوں پر یا تو بزور شمشیر مسلط کر دیا یا ان کو مجبور کیا کہ وہ بھاری ٹیکس ادا کر کے جان بخشی کرائیں۔ صلا (ترجمہ)

پروفیسر اسمتھ کی وہ ابتدائی سطور جن میں وہ اسلام کو تاریخی معجزے کا ایسا مقام دے چکے ہیں جس کی کوئی ظاہری توجیہ ان کو لگتی ہی نہیں ـــ اور پروفیسر اسمتھ ہی کی یہ سطور جن میں وہ پھر بھی اس تاریخی معجزے کی توجیہ ـــ وہ بھی جارحانہ توجیہ ـــ کرتے ہیں ـــ ان دونوں سطور کو اگر ایک صفحے پر بالمقابل لکھ کر ان کے نیچے ایک ہی لکھنے والے کا نام لکھ دیا جائے تو سوچنے والا آدمی کیا محسوس کرنے پر مجبور ہوگا؟ یقیناً دیانت اور فراست دونوں کے لیے یہ ایک چکرا دینے والا جھٹکا ثابت ہوگا۔

پروفیسر مذکور کے اس "تضاد مبین" کو سامنے سے ہٹا کر اگر ہم اس موقف کا خالص علمی اور تاریخی جائزہ لے لیں تو یہاں بے حد مفید اور ایمان افروز ثابت ہوگا ـــ مسلمانوں اور مسلمان محققین کو نہیں خود مغرب کے غیر مسلم اور ان میں بھی عیسائی محقق کو اس مسئلے کا جج بنائیے اور پھر دیکھیے کہ اس الزام میں کتنی جان ہے!

اور پھر یہ دیکھ کر عبرت حاصل کیجیے کہ جو دماغ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیدھی سادی اس بات پر ایمان نہیں لا سکا کہ "میں نے خود کچھ نہیں کیا ـــ یہ جو کچھ ہوا ہے خدا کی طاقت اور خدا کی غیبی مدد سے ہوا ہے ـــ وہی شخص اس قطعی بے جان الزام پر کس طرح ایمان لے آیا ہے۔

ابھی حال ہی میں اتفاق سے اسی مسئلے کا ایک ایسا ہی بے لاگ فیصلہ پریس میں آ چکا ہے۔ سردست اسی کو لے لیا جائے۔ فیصلہ کرنے والے کا نام (James A. Mechener) ہے جو ظاہر ہے مسلمان

نہیں عیسائی ہے۔ اور جس رسالے میں یہ فیصلہ شائع ہوا ہے وہ بھی عیسائیوں کا رسالہ ہے۔ اور رسالہ بھی کوئی معمولی نہیں، عالمگیر شہرت کا اونچا رسالہ "ریڈرز ڈائجسٹ" ہے۔ اس رسالے کا شمارہ بابت جون ۱۹۵۵ء اٹھائیے اور اس میں موصوف کا مضمون Islam and the west دیکھ لیجیے۔ رسالہ مذکور کا یہ مضمون ایڈ ٹیلس دہلی نے ڈائجسٹ کے شکریے کے ساتھ شائع کیا ہے۔ ہمارے سامنے اس وقت وہی ہے اس میں ہم ان سطور سے گزرے:۔

وسیع پیمانے پر مغرب یہ یقین کیے ہوئے تھا کہ مذہب کا یہ سیلاب تلوار کے ذریعے ممکن ہوا تھا لیکن کوئی جدید اہل علم شخص اس تصور کو تسلیم نہیں کرتا۔ اور ـــــ قرآن ضمیر کی آزادی کی تائید میں ایک بالکل واضح کتاب ہے۔ اس بات کی مستحکم شہادت ملتی ہے کہ مختلف مذاہب کے لوگوں کی اسلام نے اس وقت تک پزیرائی کی جب تک وہ لوگ ٹھیک ٹھیک پیش آتے رہے اور زائد ٹیکس ادا کرتے رہے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مسلسل مسلمانوں کو یہ تعلیم دی کہ وہ اہل کتاب کے ساتھ اشتراک عمل کریں۔ (عیسائیوں اور یہودیوں کے ساتھ)۔ یہ ٹھیک ہے کہ مسلمانوں اور عیسائیوں یا یہودیوں کے درمیان اکثر لڑائیاں بھی ہوئی ہیں (کبھی کبھی اس لیے کہ ان پرانے مذاہب نے لڑائی پر اصرار کیا) اور ان لڑائیوں کے سلسلے میں قرآن میں ابتدائی تشدد کے اقتباس بھی ملتے ہیں۔ مگر اس کا زبردست ثبوت ملتا ہے کہ اہل کتاب کے ساتھ عموماً شائستہ سلوک کیا گیا اور ان کو ان کی خواہش کے مطابق عبادت کی آزادی اور پناہ دی گئی۔

پروفیسر اسمتھ کا شروع میں ایک خیال پیش کیا گیا ـــ پھر خود ان کا دوسرا خیال ـــ اور دونوں کی باہمی ٹکر ہمارے سامنے آگئی۔ اب پروفیسر موصوف ہی کے ہم مذہب کی زبانی اس الزام کی کھلی ہوئی تردید بھی ہم نے پڑھ لی کہ "اسلام تلوار سے پھیلا"۔ اس کے بعد جیمس اے میکنر نے اپنے محولہ بالا مضمون اسلام اور مغرب میں ہمیں یہ بھی بتا یا ہے کہ یورپ اور مسیحیوں پر مسلمانوں نے ظلم نہیں ڈھائے بلکہ زندگی کے مختلف علمی اور سائنسی، سیاسی اور سماجی گوشوں پر عظیم احسانات کیے ہیں لیکن کیا یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ پروفیسر اسمتھ یا ان جیسے دل و دماغ کے لوگوں پر خود ایک عیسائی کے اس مقالے کا یہ اثر ہوگا کہ وہ اسلام کے خلاف یہ تمام الزامات واپس لے لیں اور حق کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو جائیں؟ ـــ اگر ایسا ہو سکتا تو سب سے پہلے خود جیمس صاحب مذکور اسلام قبول کر لیتے ـــ لیکن کس قدر حیرت کی بات ہے کہ ان کے مسلمان ہو جانے کی کوئی خبر

کم از کم ہم تک نہیں پہنچ سکی! بات گھوم پھر کر اسی جگہ آ جاتی ہے کہ حقیقت کو سمجھ لینا ایک بات ہے اور حقیقت کو قبول کر لینا بالکل دوسری بات — یہ دوسری کیفیت وہ نعمت عظیم ہے جس کا نام "ہدایت" ہے — اور ہدایت! — یہ خدا کے سوا کوئی کسی کو دے نہیں سکتا۔ یہ نعمت اسی کو ملتی ہے جو اس کے لیے خلوص دل سے دست طلب پھیلائے۔

جب ۱۹۳۵ء میں اصلاحات ہند کے بعد پہلی بار ہندوستان کے صوبوں میں کانگریسی وزارتوں کا قیام عمل میں آیا۔ اس وقت گاندھی جی نے ان کانگریسی وزراء کو تعیش اور اسراف سے بچنے اور سادہ زندگی گزارنے کے لیے یہ مشورہ دیا تھا۔

> سادگی پر کانگریسیوں کی اجارہ داری نہیں ہے۔ میں رام اور کرشن کے نام نہیں لوں گا کیونکہ وہ تاریخی ہستیاں نہیں تھے۔ میں مجبور ہوں کہ ابوبکرؓ و عمرؓ کے نام لوں — وہ اگرچہ وسیع و عریض سلطنت کے مالک تھے۔ پھر بھی انھوں نے فقیرانہ زندگی بسر کی۔
>
> (ترجمہ از ہریجن۔ ۲۷ جولائی ۱۹۳۷ء)

ہمیں اس بات میں شک کرنے کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی کہ گاندھی جی نے یہ آرزو محض کہنے کے لیے کی تھی۔ لیکن اگر یہ یقین کیا جائے کہ واقعی وہ ابوبکر و عمر کی زندگی کو قابل تقلید نمونہ تصور کر رہے تھے تو آخر انھوں نے اس "دین" کو قبول کیوں نہیں کیا اور دوسروں کو اس کے قبول کر لینے کا مشورہ کیوں نہیں دیا جس دین نے ابوبکر و عمر کو واقعی ابوبکر و عمر بنایا؟ ان لوگوں کی شخصیت اسلام سے پہلے کچھ بھی نہیں تھی۔ اسلام ہی کی یہ برکت تھی کہ اس کی تعلیمات اور رسول کریم کے عملی نمونے نے ان لوگوں کو اس "فقر" کے بلند ترین مقام تک پہنچا یا جہاں سے دنیا کے کج کلاہ بھی ان کے قدموں کی خاک نظر آتے ہیں۔ ابوبکر و عمر کی تقلید کے لیے گاندھی جی کا یہ پرزور تقاضا اور اسلام قبول کرنے نہ کرنے کے مسئلے میں گاندھی جی کا سکوت — یہ کیسا عجیب معمہ ہے۔ اگر یہ حقیقت سامنے نہ رہے کہ "ہدایت" خاص خدا تعالیٰ ہی کی دین ہے جو اسی کے حصے میں آتی ہے جس کو وہ اس کا مستحق قرار دے لے۔

نپولین بونا پارٹ دنیا کے سیاسی قائدوں میں جو مقام رکھتا ہے وہ تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے وہ عیسائی تھا اور ایک اس قدر بلند سیاسی آدمی کو لفظ "ناممکن" کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے حوصلوں کی توہین

ہوں ہوتی تھی۔ وہ دنیا کی کسی طاقت کو اپنے مقابلے میں خاطر میں نہ لاتا تھا لیکن وہی عیسائی جب
تکیں کھولے ہوئے قرآن کے روبرو ہوا تو قرآنی حقائق کے آگے اس کا فاتح سر جھکا کر رہ گیا۔ اور
اس نے تحریری طور پر اسلام کو وہ خراج عقیدت دیا جو ایک مسلمان ہی سے متوقع ہو سکتا ہے۔ لیکن اس
کے باوجود ـــ تاریخ اس بارے میں ہمیں اس کی کوئی خبر نہیں دیتی کہ اس نے اسلام قبول کر لیا ہو۔ اس
نے اسلام و قرآن اور پیغمبر اسلام کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اسے کوئی دیکھنا چاہے تو Bonaparte
at Islam کتاب دیکھے اور اس کے صفحات 125 - 165 اور صفحہ 240 کا مطالعہ کرے وہ
کہتا ہے :-

موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم کے لیے وجود خداوندی کا انکشاف کیا۔ عیسیٰ (علیہ السلام)
نے رومن دنیا کے سامنے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے قدیم براعظم کے سامنے (ترجمہ)

پھر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف کارناموں کی تعریف کا حق ادا کرنے کی ایک پرخلوص کوشش
کرنے کے بعد وہ قرآن کے متعلق یہاں تک لکھ گیا کہ :-

"مجھے امید ہے کہ وہ دن بہت دور نہیں جب میں اس قابل ہوں گا کہ تمام ممالک کے عقل مند
اور تعلیم یافتہ انسانوں کو متحد کروں اور ایک ایسی واحد حکومت قائم کروں جس کی بنیاد قرآنی اصول
پر ہو کیونکہ یہی وہ حق ہیں اور صرف وہی انسانوں کی خوشی کی طرف رہنمائی کر سکتے ہیں۔

یہ تو ایک عالمی تاریخ کی ٹریجڈی کہلائے گی کہ نپولین کا یہ خواب حسین شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا لیکن
اس سے بھی بڑی نفسیاتی ٹریجڈی یہ ہے کہ جو شخص قرآن اور محض قرآن کو اس قابل سمجھتا تھا کہ اس کے
اصول و قوانین کو قوموں اور ملکوں کی عالمگیر زندگی پر نافذ کرے وہ خود ان قوانین کو اپنی زندگی پر
نافذ نہ کر سکا ـــــــــــ کیوں ؟ آخر کیوں ـــ کیا صرف اس
لیے کہ اس نے حقیقت کو محسوس تو کیا۔ زبان و قلم سے اس کا اقرار بھی کیا مگر "دل" اپنے دل کو تبدیل
نہ کر سکا۔ خدا ہی کی یہ طاقت ہے کہ وہ دلوں کو پھیر دے اور ـــ شاید خدا سے اس نے اس کی
التجا نہیں کی۔

اس مقام پر ہمیں اس انسان کا واقعہ یاد آتا ہے جس نے خدا سے اس بات کی التجا کی تھی اور پھر

راتوں رات ان کا دل تبدیل ہوچکا تھا۔ یہ آدمی آں حضرت کے چچا حضرت امیر حمزہؓ تھے۔ اس دور میں جب مکے والوں نے اسلام اور توحید کے نام لیواؤں پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا وہ ایک شام اپنی کمان اٹھائے ہوئے صحرا سے شہر میں داخل ہو رہے تھے کہ کسی نے ان کو یہ خبر دی کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس جگہ ابوجہل نے تمہارے بھتیجے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بدترین ایذائیں پہنچائیں اور مغلظ ترین گالیاں دی ہیں اور یہ کہ اس کے جواب میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کچھ نہیں کہا۔

یہ واقعہ سنتے ہی ان کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ وہ شدید غصے میں سیدھے کعبے میں پہنچے جہاں ابوجہل اور اس کے تمام ساتھی موجود تھے۔ وہاں جاتے ہی انھوں نے ابوجہل پر حملہ کیا اور اپنی کمان سے اس کو زدوکوب کرتے ہوئے غصے میں یہ اعلان کر دیا۔ آج سے میں بھی محمد کے دین پر ہوں بگاڑ اگر میرا کچھ بگاڑ سکتا ہے!۔۔۔ ابوجہل کے ساتھی چاہتے تھے کہ حضرت حمزہ سے الجھیں، مگر خود ابوجہل نے یہ کہہ کر روک دیا۔ انھیں کچھ نہ کہو۔ واقعہ یہ ہے کہ آج میں نے محمدؐ کو انتہائی شدید اذیت پہنچائی ہے۔

حضرت حمزہؓ نے غصے میں آکر یہ کہہ تو دیا کہ میں مسلمان ہوگیا ہوں لیکن فی الواقع وہ اسلام کی صداقت پر مطمئن نہیں ہوئے تھے۔ اس لیے اس واقعہ کے بعد ان کے اندر ایک زبردست کش مکش اور الجھن کا ہنگامہ برپا ہوگیا۔ اب کیا کیا جائے! وہ بے قرار ہو کر اٹھے اور خدا کے آگے سجدہ ریز ہو کر گڑگڑانے لگے۔

اے پروردگار! سچائی کے لیے میرا سینہ کھول دے اور میرے شک کو دور فرما دے۔

اس رات کے بعد جو صبح ہوئی تو ان کا دل ایمان کی روشنی سے جگمگا اٹھا تھا۔

(بقیہ صفحہ ۵۶) دولت خرچ کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے جب کہ خدا کا دین اس سے خرچ کرنے کا تقاضا کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ آدمی خدا کے حکم پر اپنی تھوڑی سی دولت دے کر اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ اس کی پوری دولت خدا کی ہے اور جب بھی اس کے دین کو ضرورت ہوگی وہ اس کے لیے صرف ہوگی۔ جب یہ جذبہ کسی کے اندر ابھر آئے تو خدا کی راہ میں حضرت عمرؓ کی طرح اپنے گھر کا آدھا سامان دینا بھی آسان ہے اور حضرت ابوبکرؓ کی طرح اپنا کل سرمایہ خدا کے دین کے لیے وقف کرنا بھی ممکن ہے۔

مجلس تحقیقات شرعیہ کی خدمت میں

(سید احمد قادری)

مجلس تحقیقات شرعیہ لکھنؤ کے محترم ارکین کی خدمت میں مؤدبانہ گزارش ہے کہ راقم الحروف آگے جو کچھ عرض کر رہا ہے اس کو طالب علمانہ استفہام سمجھ کر ملاحظہ فرمائیں۔ انشورنس کے بارے میں مجلس نے اپنا جو فیصلہ شائع کیا ہے اس کی ایک توضیح جناب مولانا محمد منظور نعمانی صاحب نے الفرقان میں کی ہے۔ اس پر اظہار خیال زندگی کے گزشتہ شمارے میں کر چکا ہوں۔ دوسری توضیح مجلس کے محترم کنوینر جناب مولانا محمد اسحٰق ندوی صاحب نے کی ہے جو دعوت دہلی مورخہ ۴ مارچ ۶۶ء میں شائع ہوئی ہے۔ اس توضیح سے معلوم ہوا کہ جناب مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اور جناب مولانا ولی حسن صاحب بتصویب جناب مولانا محمد یوسف صاحب نے انشورنس کو مسلمانوں کے لیے ناجائز قرار دیا ہے۔ عام ازیں کہ وہ دارالاسلام میں آباد ہوں یا کسی اور جگہ۔ الفرقان لکھنؤ میں ان دونوں کی طرف جو قول منسوب کیا گیا تھا وہ صحیح نہیں ہے۔ دوسری بات اس سے یہ معلوم ہوئی کہ مجلس کے ارکین نے اضطرار کے قانون کو اپنے فیصلے کی بنیاد نہیں بنایا ہے بلکہ فیصلے کی بنیاد صرف بعض کبار ائمہ سلف کی رائے پر قائم کی گئی ہے۔ اگرچہ محترم داعی نے ان ائمہ کے نام نہیں لیے لیکن انھوں نے بدائع و درمختار رد شامی وغیرہ کتب فقہ کا حوالہ دیا ہے اس سے اہل علم کے لیے ان ائمہ کے نام جان لینا مشکل نہیں ہے۔ الفرقان لکھنؤ میں ان ائمہ کے نام صراحتہً لیے گئے تھے معلوم نہیں محترم کنوینر صاحب نے ان ائمہ کے نام نہ لینے میں کون سی مصلحت مضمر سمجھی۔ جن ائمہ کی رائے کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ میں اس وقت اس کی صحت و عدم صحت پر گفتگو نہیں کروں گا۔ فیصلے کا ماخذ اور محترم کنوینر صاحب کی طرف سے اس کی توضیح سامنے آجانے کے بعد جو چند الجھنیں پیش آئی ہیں انہیں کو بطور استفہام عرض کروں گا۔

(۱) مجلس کے محترم ارکین مجھ سے بہتر طور پر یہ جانتے ہوں گے کہ مسئلے پر غور کرتے وقت کسی امام یا ائمہ

کے مسلک کو اگر بنیاد بنانا ہو تو اس کو صحیح شکل میں سامنے رکھنا ضروری ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو ائمہ
مسلک کے ساتھ انصاف نہ ہوگا اور اپنے فیصلے کو اس مسلک کی طرف منسوب کرنا بھی صحیح باقی نہ رہے گا
ائمہ اسلاف کے درمیان ربا، قمار اور دوسرے حرام معاملات کے ہر جگہ ناجائز یا بعض ملکوں میں مخصوص
شرائط کے ساتھ جائز ہونے کا جو اختلاف پیدا ہوا تھا وہ دارالاسلام اور دارالحرب کی مخصوص اصطلاح
کے پیش نظر تھا جس کے اپنے مخصوص معنی و مطلب اور مخصوص تعریفیں ہیں۔ انھوں نے یہ کہیں نہیں لکھا ہے
کہ جہاں اقتدار اعلیٰ مسلمانوں کو حاصل ہو وہ دارالاسلام ہے اور جہاں انہیں اقتدار اعلیٰ حاصل نہ ہو
وہ دارالحرب ہے۔ مثال کے طور پر ترکی میں اقتدار اعلیٰ مسلمانوں کو حاصل ہے لیکن وہ ائمہ اسلاف کی
اصطلاح میں دارالاسلام نہیں ہے۔ اسی طرح ان کی تعریف کی بنا پر کسی ملک کو دارالحرب قرار دینے
کے لیے اتنی بات کافی نہیں ہے کہ وہاں مسلمانوں کو اقتدار اعلیٰ حاصل نہ ہو۔ محترم کنوینر صاحب نے دونوں
ملکوں کے درمیان مسلمانوں کے اقتدار اعلیٰ ہونے یا نہ ہونے کی بنا پر جو تعریف کی ہے وہ نہ بدائع میں
ملتی ہے، نہ درمختار میں اور نہ شامی میں۔ اور اگر دارالاسلام اور دارالحرب کی اصطلاح استعمال کرنے
سے مصلحۃً اجتناب فرمایا گیا ہے تو میں یہ عرض کروں گا کہ یہ اجتناب زیادہ دنوں باقی نہ رہ سکے گا اور اب تو باقی بھی نہیں ہے
مولانا محمد منظور نعمانی نے اس کو ظاہر فرما دیا ہے جو خود مجلس کے ایک معزز رکن ہیں۔ جب آپ کسی امام کے مسلک کو سامنے
رکھ کر کوئی فیصلہ کریں گے تو آپ ان اصطلاحوں کو کب تک چھپا سکیں گے جن پر اس مسلک کی بنیاد قائم ہے
پھر تو اس خلاف مصلحت مسلک کو اپنے فیصلے کی بنیاد بنانا ہی خلاف مصلحت معلوم ہوتا ہے۔

(۲) دوسری الجھن یہ پیش آئی ہے کہ جب مجلس نے بعض کبار ائمہ اسلاف کے مسلک کو اپنے فیصلے کی
بنیاد بنایا ہے تو پھر اس میں "ضرورت شدیدہ" کی لازمی قید کا اضافہ کہاں سے کیا ہے۔ اس قید نے تو ان
ائمہ کے مسلک کی نفی کر دی ہے اس لیے کہ ان کے نزدیک دارالحرب میں حربیوں سے ناجائز معاملات
کے ذریعے مسلمان جو مال حاصل کرتا ہے وہ اس کے لیے صرف جائز ہی نہیں بلکہ حلال و طیب ہوتا ہے
تو پھر اس کو حاصل کرنے کے لیے ضرورت شدیدہ کی شرط کے کیا معنی؟ اور اگر دارالحرب میں ربا و قمار
کے معاملات صرف شکلاً ربا و قمار ہوتے ہیں حقیقۃً نہیں ہوتے تو پھر بدرجۂ اولیٰ اس میں "ضرورت شدیدہ" کی
قید صحیح نہیں ہے حالانکہ مجلس کے فیصلے میں یہ ایک لازمی قید لگائی گئی ہے۔ اس کے بغیر کسی مسلمان کے لیے بیمہ کا معاملہ کرنا جائز ہی نہ ہوگا۔
واقعہ یہ ہے کہ یہ قید دیکھ کر ہی میں نے یہ سمجھا تھا کہ مجلس نے رخصت اضطرار کی بنیاد پر فیصلہ کیا

ہو گا جس کا اظہار میں گزشتہ شمارے میں کر چکا ہوں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ امام ابو حنیفہ اور امام محمد کے مسلک کی بنیاد پر یہ بات خیال میں بھی نہیں آ سکتی تھی کہ اس پر ایک ایسی شرط کا اضافہ کیا جا سکتا ہے جو اس کی نفی کر دے۔ یہ بات بھی معلوم تھی کہ فقہاء "ضرورت" کا لفظ اضطرار ہی کے معنی میں استعمال کرتے ہیں اور یہاں تو ضرورت کے ساتھ 'شدیدہ' بھی لگا ہوا ہے۔ پھر اس کی تائید مولانا نعمانی کی توضیح سے بھی ہو رہی تھی جس میں انھوں نے "الضرورات تبیح المحظورات" کا ذکر کیا ہے۔ اب جناب کنوینر صاحب نے پرزور تردید فرمائی ہے کہ مجلس کا فیصلہ قاعدۂ اضطرار پر مبنی نہیں ہے، بلکہ صرف بعض ائمہ کبار کے مسلک پر مبنی ہے ان کی یہ تردید پڑھ کر اب میرے لیے مجلس کا فیصلہ ناقابلِ فہم بن گیا ہے اس لیے کہ اب یہ نہ کتاب و سنت کے مطابق ہے اور نہ کسی فقہی مسلک کے مطابق ــــ شاید ارکین مجلس تحقیقات نے غور نہیں فرمایا کہ جس مسلک کو وہ اپنے فیصلے کی بنیاد بنا رہے ہیں اس میں ایک لازمی شرط اپنی طرف سے لگا کر اس کو منسوخ بھی قرار دے رہے ہیں۔ گویا اس فیصلے میں بعض جلیل القدر ائمہ کے مسلک کا اثبات بھی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس کی تردید بھی۔ اس لیے کہ ضرورت شدیدہ کی لازمی شرط کسی جائز اور حلال چیز کی تحصیل کے لیے نہیں لگائی جاتی اور جب یہ لگا دی گئی تو اس کے صاف معنی یہ ہوئے کہ وہ مسلک صحیح نہیں ہے جس کی بنیاد پر فیصلہ کیا گیا ہے۔

(۳) مجلس نے صرف ایک صورت میں ہندوستانی مسلمانوں کے لیے انشورنس کے جواز کی گنجائش نکالی ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ خالص غیر مسلموں کی انشورنس کمپنی اس ملک میں شاید ہی کہیں پائی جاتی ہو۔ اور اب تو انشورنس کا کاروبار زیادہ تر حکومت خود کر رہی ہے۔ اس لیے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہندوستان کے مسلمان حکومت سے بالکلیہ خارج ہیں یا کسی درجے میں سہی وہ بھی اس کے حصہ دار ہیں ان کو بالکل خارج قرار دینا واقعے کے خلاف ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہندوستان میں خالص غیر مسلموں کی انشورنس کمپنی موجود نہیں ہے اس لیے کوئی مسلمان شدید نقصان جان و مال کے اندیشۂ قوی کے وقت بھی انشورنس کا معاملہ نہیں کر سکے گا۔ اس طرح اس فیصلے نے ہندوستانی مسلمانوں کے لیے انشورنس کا دروازہ بند کر دیا ہے۔ حالانکہ مقصود اس کو کھولنا تھا۔

(۴) مجلس کے محترم داعی (کنوینر) نے اپنی توضیح کے آخر میں تحریر فرمایا ہے۔

عوام مسلمین کو اس مسئلے میں وہی رویہ اختیار کرنا چاہیے جو مجتہد فیہ مسائل کے لیے مناسب ہے

یعنی جس رائے پر قلب مطمئن ہو اس پر عمل اور دوسرے پر ملامت و اعتراض سے احتراز خصوصاً رسائل و
اخبارات میں اس مسئلے کو چھیڑنا بہت ہی نامناسب اور بالکل خلاف مصلحت ہے۔

(دعوت دہلی۔ ۴ر مارچ ۱۹۶۶ء)

یہ بات بالکل صحیح ہے کہ ملامت و اعتراض سے احتراز کرنا چاہیے اس کا حق کسی کو نہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ محترم داعی اور محترم اراکین مجلس کے لیے بھی مناسب ہے کہ وہ ہر استفسار اور سنجیدہ تنقید کو اعتراض اور ملامت قرار نہ دیں۔ رسائل و اخبارات میں اس مسئلے کو چھیڑنے پر یہ شدید قدغن بھی سمجھ میں نہیں آتی۔ جب آپ شرعی فیصلے شائع کریں گے تو اس کو سمجھنے اور اس کے دلائل جاننے کے لیے بحث ضرور چھڑے گی۔ یہ انسانی فطرت ہے، اس پر قدغن لگانا مناسب نہیں ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مولانا نعمانی صاحب نے خود آگے بڑھ کر الفرقان میں لوگوں کو مطمئن کرنے کی کوشش شروع کی — آپ نے عوام مسلمین کو مشورہ دیا ہے کہ جس رائے پر قلب مطمئن ہو اس پر عمل کریں۔ اس مشورے کو پڑھ کر خیال پیدا ہوتا ہے کہ پھر مجلس کے فیصلے کا حاصل کیا نکلا؟ ہندوستان میں غیر مسلموں کے ساتھ شرعاً ممنوع معاملات کے جواز کی بحث نئی نہیں ہے اور اس بارے میں دونوں رائیں بھی معلوم و معروف ہیں۔ انفرادی طور پر مسلمان انہیں دونوں رایوں میں سے کسی ایک پر عمل کر بھی رہے ہیں۔ اور ہر اوسط درجے کے مدرسے میں مستقل دارالافتا رکھے ہوئے ہیں اور وہ انشورنس کے بارے میں بھی اپنی اپنی رائے کے مطابق لوگوں کے سوالات کا جواب دیتے رہتے ہیں۔ اب دو سال کی محنت کے بعد مجلس کے فیصلے نے آخر کون سا نیا کارنامہ انجام دیا۔ بظاہر تو یہ فیصلہ تحصیل حاصل ہی معلوم ہوتا ہے۔

یہ الجھنیں ہیں جن کی وجہ سے مجلس کے فیصلے کی افادیت سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ راقم الحروف کے خیال میں یہ الجھنیں اس لیے پیدا ہوئی ہیں کہ مجلس نے اصل مسئلے پر فیصلہ کرتے وقت اجتہاد و تقلید کو خلط ملط کر دیا ہے۔ کسی مسئلے کے متعلق فیصلہ کرنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ اصلاً کتاب و سنت کے نصوص اور دلائل کو سامنے رکھا جائے اور اپنی انتہائی کوشش صرف کر کے ان کی روشنی میں کوئی فیصلہ کیا جائے۔ اس سلسلے میں مذاہب اربعہ اور دیگر مذاہب فقہ کی کتابوں سے استفادہ ضرور کیا جائے لیکن کسی خاص مذہب فقہ کو یا کسی خاص شخصی رائے کو فیصلے کی بنیاد نہ بنایا جائے۔ مجلس تحقیقات شرعیہ، وقت کے جدید مسائل کا حل دریافت کرنے کے لیے قائم کی گئی ہے۔ اس لیے اس مجلس کے لیے یہی طریقہ

مناسب ترین طریقہ ہو سکتا ہے — دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اصلاً کسی مذہب فقہ کو سامنے رکھا جائے اور اسی کے اصول و جزئیات کے مطابق فیصلہ کیا جائے اور اس میں اپنی طرف سے ایسی قیود و شرط نہ بڑھائی جائیں جو اس مذہب فقہ کے کسی اصل یا کسی جزئیے کو عملاً بے کار کر کے رکھ دیں۔ اس طریقے سے کم از کم ان لوگوں کو ضرور فائدہ پہنچے گا جن کے مذہب فقہ کے مطابق فیصلہ کیا گیا ہو — میں بڑے ادب کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ انشورنس کے مسئلے کا فیصلہ کرتے وقت مجلس نے نہ پہلے طریقے کی پیروی کی ہے اور نہ دوسرے طریقے کی۔ اسی وجہ سے وہ الجھنیں پیدا ہو گئی ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

یہ جو کچھ عرض کیا گیا اس کا مقصد اعتراض اور ملامت ہرگز نہیں ہے بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ اگر اس میں کوئی کام کی بات ہے تو محترم ارکین مجلس کو اس پر غور کرنا چاہیے۔ ہم دل سے چاہتے ہیں کہ مجلس اس ملک میں اپنا مقام پیدا کرے اور اس کے فیصلے لائق احترام سمجھے جائیں۔

شرائطِ ایجنسی

۱۔ ایجنسی کم سے کم ۵ رسائل پر دی جائے گی۔

۲۔ -/۵ ایڈوانس جمع کرنے ہوں گے۔

۳۔ ۵ سے ۵۰ پرچوں تک ۲۵٪ کمیشن دیا جائے گا۔ البتہ ۵۰ سے زائد رسالوں پر کمیشن ۳۰٪ دیا جائے گا۔

۴۔ رسالوں کی روانگی کا خرچ دفتر برداشت کرے گا۔ رجسٹری اور وی پی کا خرچ ایجنٹ صاحبان کے ذمے ہوگا۔

۵۔ ہر ماہ کا بل باقاعدگی سے ادا کرنا چاہیے۔

منیجر "زندگی" رام پور یوپی

ہندوستان اور مصر کے تعلقات میں سرد مہری

مصر اور بھارت کے دوستانہ تعلقات، آں جہانی پنڈت جواہر لال نہرو کے زمانے میں اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئے تھے۔ دونوں ملکوں کے تعلقات میں بڑی خوش گواری اور سرگرمی تھی لیکن ان کے بعد رفتہ رفتہ ان تعلقات کی خوش گواری و سرگرمی میں کمی آنے لگی۔ ہند پاک کش مکش کے زمانے میں یہ کمی نمایاں ہوئی اور آج دونوں ملکوں کے تعلقات ایک طرح کی سرد مہری کا شکار ہیں۔ ابھی زیادہ مدت نہیں گزری کہ حکومت ہند کی دعوت پر اخبار "الاہرام" کے ایڈیٹر ہندوستان تشریف لائے تھے اور نو دن یہاں مقیم رہے لیکن سوء اتفاق سے وہ خوش نہیں گئے۔ جس غرض کے لیے بلائے گئے تھے اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ ۱۳ مارچ کے اسٹیٹسمین میں جی ایچ جانسن نے مدیر الاہرام کے دورے پر تبصرہ کیا ہے۔ یہ تبصرہ چونکہ معلومات افزا ہے اس لیے ہم ذیل میں اس کی تلخیص پیش کر رہے ہیں

روزنامہ الاہرام قاہرہ کے ایڈیٹر مسٹر محمد حسین ہیکل نے ماہ فروری ۶۰ء میں نو دن ہندوستان میں صرف کیے اور واپس جا کر انھوں نے اپنے تاثرات تین طویل مقالے لکھے۔ ہندوستان میں یہ ان کا پانچواں دورہ تھا اس کا بڑا حصہ انھوں نے دہلی میں صرف کیا۔ بھارت کے صدر اور وزیر اعظم سے ملاقات کی۔ وہ جے پور کے کانگریس سیشن میں بھی شریک ہوئے — یہ جو حکومت ہند نے انہیں یہاں آنے کی دعوت دی اور یہاں کے ساتھ انتہائی عزت و احترام کا سلوک کیا تو یہ دو وجوں سے قابل تعریف آغاز ہے

اس وقت عرب و ہند کے تعلقات میں سرد مہری پائی جاتی ہے اس لیے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے کہ ان دونوں کے درمیان معقولیت، دوستی اور تعلقات کی وہی فضا پیدا

کی جائے جو پہلے تھی ـــــ مسٹر ہیکل اس کام کے لیے موزوں ترین آدمی تھے اس لیے کہ متحدہ عرب جمہوریہ اور دوسرے عرب ممالک پر ان کا بہت اثر ہے۔ محض ایک اخبار کا اڈیٹر ہونے سے ان کی شخصیت بہت بلند ہے۔ ۱۹۵۲ء سے بھی پہلے جب صدر ناصر برسر اقتدار آئے، مسٹر ہیکل ان کے قریبی دوست تھے اور ۱۹۵۶ء سے وہ صدر ناصر کے معتمد علیہ ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ وہ صدر ناصر کے ترجمان ہیں۔ یہ کہنے میں کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ وہ متحدہ عرب جمہوریہ کے چھ اہم ترین اشخاص میں سے ایک ہیں ـــــ ان کے اپنے پبلشنگ ہاؤس سے روزنامہ کے علاوہ اور بھی نکلتے ہیں اور ابھی حال ہی میں ان کو ایک دوسرے ادارۂ نشر و اشاعت کا انچارج بنایا گیا ہے۔ اس ادارے سے بھی ایک روزنامہ اور متعدد ہفتہ وار نکلتے ہیں۔ وہ متحدہ عرب جمہوریہ کے پریس کے بادشاہ ہیں اور چونکہ مصر کا طاقت ور پریس عرب ممالک پر چھایا ہوا ہے۔ اس لیے جیساکہ کہا گیا یہ عرب کے انتہائی اہم صحافی بن گئے ہیں۔ ہر جمعہ کو مسٹر ہیکل ایک مقالہ لکھتے ہیں جو الاہرام کے پورے ایک صفحے میں آتا ہے اور عام طور سے یہ مقالہ سرکاری پالیسی کی حیثیت سے پڑھا جاتا ہے۔ انھوں نے تین مقالے اپنے دورۂ ہند کے لیے وقف کیے ہیں۔ یہ بات بہت افسوس کے ساتھ کہنی پڑتی ہے کہ یہ مقالے اپنے پڑھنے والوں کو جو آخری تاثر دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ مسٹر ہیکل ہندستان کے بارے میں کوئی بلند خیال نہیں رکھتے۔ یہ مقالے اپنے پڑھنے والوں کو جو آخری تاثر دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ مسٹر ہیکل ہندوستان کے بارے میں کوئی بلند خیال نہیں رکھتے۔ یہ مقالے غیر دوستانہ نہیں ہیں لیکن ہمدردانہ بھی نہیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ یک طرفہ ہیں ان میں نہ صحیح و وسیع معلومات ہیں اور نہ گہرائی ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ انھوں نے پانچویں دورۂ ہند میں جو کچھ دیکھا[1] اس نے ہندوستان کے بارے میں ان کی تشویش بڑھا دی۔ ہندوستان کا ماضی ختم ہو رہا ہے اور حال اس سے بھی زیادہ ـــــ یہ دو اقتباسات ہیں اور اسی طرح کی دل شکستگی اور افسردگی پورے مقالے پر چھائی ہے اس کے اصل ناقدانہ یا مربیانہ اعتراضات ہندوستان کے ذرائع و وسائل کے بارے میں ہیں مثال کے طور پر وہ کہتے ہیں کہ ان سے ایک ہندوستانی ماہر معاشیات نے کہا کہ متحدہ عرب جمہوریہ اس وقت جس معاشی سطح تک پہنچ چکا ہے، وہاں تک پہنچنے کے لیے ابھی ہندوستان کو چند برس

اور چاہیں۔ یہ ایک لغو بات ہے

مسٹر ہیکل نے بڑے اہتمام سے یہ بات لکھی ہے کہ قحط کے زمانے میں بھی ہندوستان کے اندر لاکھوں مویشی بالکل بے کار زندہ رکھے جاتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ ان سے ایک ہندوستانی افسر نے کہا کہ حکومت چاہتی ہے کہ ان مویشیوں کو دوسرے ملکوں میں برآمد کرے لیکن وہ ایسا کرنے سے ڈرتی ہے اس بنا پر کہ ان مویشیوں کے ساتھ ہندوستانی عوام کی مذہبی عقیدت وابستہ ہے وہ انھیں اپنا معبود سمجھتے ہیں۔ یہ بھی مسٹر ہیکل کی ذاتی رائے ہے کہ شاید دوسرے ممالک کے لوگوں کو بھی ضرورت سے کم اور ناقص غذا ملتی ہے لیکن ہندوستان میں اس بیسویں صدی میں بھی عوام بھوک سے مر جاتے ہیں۔ مسٹر ہمبرا ایبنم کو مہربانی کرکے یہ ریمارک نوٹ کر لینا چاہیے

بھوک اور قحط پر گفتگو کرتے ہوئے مسٹر ہیکل کی نگاہ امریکی امداد تک پہنچ جاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ امریکہ ہندوستان کو ہر ماہ دس لاکھ ٹن گیہوں سپلائی کرتا ہے۔ یہ بات اس کو اس پوزیشن تک پہنچا دیتی ہے یا پہنچا سکتی ہے کہ وہ ہندوستان کی پالیسی پر اثر انداز ہو یا اثر انداز ہونے کی کوشش کرے۔

اگرچہ مسٹر ہیکل نے بڑی احتیاط سے اپنی پوزیشن بچانے کی کوشش کی ہے لیکن اس کے باوجود ان کا یہ بیان بہت نقصان دہ ہے ان کے اس بیان کے بعد ہمارے لیے یہ اظہار جائز ہو جاتا ہے کہ متحدہ عرب جمہوریہ میں کئی سال سے چھ روٹیوں میں چار روٹیاں امریکی پی ال ۴۸۰ کے گیہوں سے ملتی ہیں۔ اگر اس حد تک مصری معاشیات کا امریکی امداد پر انحصار اس کی پالیسی کو متاثر نہیں کرتا (یا یہ سمجھا جائے کہ اس نے متاثر کر دیا ہے؟) تو پھر ہندوستانی لیڈروں کے بارے میں یہ کیوں نہ سمجھا جائے کہ وہ اپنی پالیسی میں مستقل رہیں گے۔

شاستری کے بارے میں جو اظہار خیال انھوں نے کیا ہے وہ بہت تعجب انگیز اور قابل تنقید ہے۔ انھوں نے اپنے مقالے میں شاستری جی کی موت کے بارے میں جو افواہ پھیلائی گئی ہے اس کا بھی ذکر کیا ہے۔ ہند پاک کشمکش کے زمانے میں عرب ممالک کے رویے پر ہندوستانی عوام کے تاثر کا ذکر بھی کیا ہے اور بڑی خوش اسلوبی سے اس افسوسناک فضا کا ذکر بھی کیا ہے جو اس وقت عرب دنیا کے تعلقات پر چھائی ہے۔ انھوں نے ہندوستان کی حکومت [illegible]

ہیں۔ حیرت انگیز طور پر تعلقات کی سرد مہری کی بڑی ذمہ داری مسٹر شاستری پر ڈالی ہے۔ انھوں نے اس پہلو سے مسٹر شاستری کے بارے میں جو باتیں کہی ہیں وہ صحیح نہیں ہیں۔ تعجب ہے کہ مسٹر شاستری کے انتقال کے بعد ہی تعدد جدید الزامات مسٹر ہیکل نے ان پر عائد کیے اور یہ بات بھی حیرت انگیز ہے کہ ہندوستان کی وزیر اعظم نے اس کی تردید نہیں کی۔

مسٹر جانسن نے اپنے تبصرے میں تعلقات کو بحال کرنے کے لیے مسٹر ہیکل کی پیش کی ہوئی تدبیر کا ذکر کرکے اس پر تنقید کی ہے اور خود اپنی طرف سے چند تدبیریں پیش کی ہیں اور ظاہر کیا ہے کہ بعض تدبیروں پر عمل کرنے کے لیے سلسلہ جنبانی شروع ہو چکی ہے۔ مثال کے طور پر ایک تدبیر یہ ہے کہ پی ٹی آئی اور مصر کی نیوز ایجنسی کے درمیان خبروں کا تبادلہ ہونا چاہیے۔

اس تبصرے کو پڑھ کر قاری کے ذہن میں ایک سوال بہت نمایاں طور پر ابھرتا ہے مگر اس کا کوئی جواب تبصرے میں موجود نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ مسٹر ہیکل نے مسٹر شاستری کے بارے میں کچھ باتیں غلط لکھی ہوں لیکن یہ تو واضح ہے کہ مصر اور بھارت کے تعلقات میں کمی مسٹر نہرو کے بعد شری شاستری کے زمانے میں آئی ہے۔ مسٹر جانسن کو یہ بتانا چاہیے تھا کہ اس کے اسباب کیا ہیں اور تعلقات میں کمی و سرد مہری کی اصل ذمہ داری کس پر ہے۔ وہ اس پر حیرت کا اظہار کرتے ہیں کہ مسز اندرا گاندھی نے مسٹر ہیکل کی تردید کیوں نہیں کی لیکن وہ خود اس نمایاں ترین سوال کے جواب سے پہلو بچا گئے ہیں۔

چرمِ قربانی کی قیمت سے شفاخانے کا قیام

سوال

یہاں ایک ادارہ چرم قربانی کی تحصیل کا اہتمام کرکے پردہ نشین خواتین کے لیے ایک زچہ خانہ قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس میں پردے کا پورا انتظام کیا جائے گا اور صرف لیڈی ڈاکٹروں کی خدمات حاصل کی جائیں گی۔ آپ یہ بتائیں کہ چرم قربانی سے یہ زچہ خانہ قائم کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ لوگ کہتے ہیں کہ چرم قربانی کی قیمت سے کوئی عمارت بنانا یا کسی کو اس رقم سے معاوضۂ خدمت دینا درست نہیں ہے۔

جواب

جن لوگوں کے نزدیک چرم قربانی کی قیمت سے عمارت بنانا یا کسی کو معاوضہ دینا صحیح نہیں ہے ان کے نزدیک اس کی بنیاد یہ ہے کہ وہ چرم قربانی کی قیمت کے مصارف اور زکوٰۃ کے مصارف میں فرق نہیں کرتے بلکہ ان کے خیال میں جو مصارف وشرائط زکوٰۃ کے ہیں وہی چرم قربانی کی قیمت کے بھی ہیں اور چونکہ فقہ حنفی میں زکوٰۃ کی رقم سے عمارت بنانا یا کسی کو معاوضۂ خدمت دینا صحیح نہیں ہے اس لیے چرم قربانی کی قیمت سے بھی یہ سب کام درست نہ ہوں گے۔ اس لیے سب سے پہلے یہ اصولی بات طے ہونی چاہیے کہ کیا فی الواقع چرم قربانی اور زکوٰۃ کے مصارف و شرائط ایک ہیں۔

جہاں تک میں نے فقہ حنفی کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے مجھے کوئی ایسی دلیل نہیں ملی جس سے دونوں

مصارف کی یکسانی ثابت ہوتی ہو بلکہ ان کتابوں میں متعدد ایسے احکام ملتے ہیں جن سے قربانی کے گوشت اور اس کی کھال کے مصرف اور زکوٰۃ کے مصرف میں فرق ثابت ہوتا ہے۔ میں ذیل میں وہ احکام درج کرتا ہوں۔

(۱) زکوٰۃ میں دی ہوئی کسی چیز کو خود زکوٰۃ دینے والا استعمال نہیں کر سکتا لیکن قربانی کے گوشت اور اس کی کھال سے خود قربانی کرنے والا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ مثلاً وہ قربانی کا گوشت کھا سکتا ہے بلکہ اس کو کھانا چاہیے۔ اسی طرح چرم قربانی سے جائے نماز یا ڈول یا دسترخوان بنا کر فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

(۲) قربانی کرنے والے کے لیے جائز ہے کہ سب کا سب گوشت اپنے مصرف میں لے آئے کیونکہ گوشت کا صدقہ کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ نفل ہے اور اس سے آگے کی بات یہ ہے کہ اگر وہ زیادہ خوش حال نہیں ہے لیکن عیال دار ہے تو اس کے لیے مستحب ہے کہ سب گوشت اپنے خاندان ہی کے مصرف میں لے آئے۔

(۳) مال دار شخص زکوٰۃ کا مستحق نہیں ہے اور اس کو زکوٰۃ کی رقم یا زکوٰۃ میں ادا کی ہوئی کوئی بھی شے دینا صحیح نہیں لیکن اس کو قربانی کا گوشت دیا جا سکتا ہے اور ہدیۃً چرم قربانی دینا بھی جائز ہے۔

(۴) غیر مسلم زکوٰۃ کا مستحق نہیں لیکن اس کو قربانی کا گوشت اور کھال دی جا سکتی ہے۔

(۵) چرم قربانی سے کسی ایسی چیز کا مبادلہ کیا جا سکتا ہے جو باقی رہنے والی ہو۔ مثلاً چرم قربانی کے معاوضے میں پوستین لی جا سکتی اور اس کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔

(۶) قربانی کے گوشت کو بھی کسی ایسی چیز کے بدلے میں فروخت کیا جا سکتا ہے جو باقی رہنے والی ہو۔ مثلاً وہ گوشت کے بدلے میں کپڑے لے سکتا اور اسے پہن سکتا ہے۔ طوالت کے خوف سے میں کتب فقہ کی عبارتیں نقل نہیں کر رہا ہوں۔ یہ احکام ہدایہ، شرح ہدایہ، بدائع، درمختار اور شامی میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان احکام کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ چرم قربانی کے مصرف اور زکوٰۃ کے مصرف میں کوئی مماثلت بھی ہے دونوں کی یکسانی تو دور کی چیز ہے۔ فقہ حنفی میں صرف اتنی بات ملتی ہے کہ چرم قربانی کو روپے پیسے کے بدلے میں بیچ کر خود اس کی قیمت سے فائدہ اٹھانا صحیح نہیں، اس کو صدقہ کر دینا واجب ہے لیکن اس کے بارے میں یہ کہنا کہ اس کا مصرف وہی ہوگا جو زکوٰۃ کا ہے صحیح نہیں

ہے۔ جو لوگ فقہ حنفی کی طرف اس کو منسوب کرتے ہیں معلوم نہیں ان کے پاس اس کی دلیل کیا ہے
جو فقہ قربانی کے گوشت اور اس کی کھال کے بارے میں وہ احکام دیتی ہے جن کا ذکر اوپر گزرا وہی
فقہ کھال کی قیمت کو زکوٰۃ کے مثل کس طرح قرار دے سکتی ہے۔ ہر وہ رقم جس کو صدقہ کرنا واجب ہو
اپنے مصارف و شرائط کے لحاظ سے زکوٰۃ نہیں بن سکتی۔

فرض کیجیے کوئی مسلمان جس کے روپیے بینک میں جمع ہوں سود کی رقم بھی برآمد کرے تو اس
رقم کو خود استعمال کرنا حرام اور صدقہ کرنا واجب ہے تو کیا کوئی فقیہ یہ کہہ سکتا ہے کہ اس رقم کے
وہی مصارف ہوں گے جو زکوٰۃ کے ہیں؟ کسی واجب التصدق رقم کے مصارف کو مصارف زکوٰۃ
کے مثل قرار دینے کے لیے مضبوط دلیل کی ضرورت ہے اور مسئلہ زیر بحث میں ایسی کوئی دلیل موجود
نہیں ہے۔

ان وجوہ سے راقم الحروف کی رائے یہ ہے کہ اگر مسلمان کسی ادارے یا جماعت پر اعتماد
کرکے چرم قربانی اس کے حوالے کر دیں تو وہ ادارہ یا جماعت پردہ نشین خواتین کے لیے باپردہ زچہ خانہ
قائم کر سکتا ہے۔ اس زچہ خانہ میں محتاج خواتین کو تمام سہولتیں مفت بہم پہنچائی جانی چاہئیں۔
البتہ مال دار خواتین سے مناسب فیس لی جانی چاہیے اور پھر اس فیس سے حاصل شدہ رقم کو بھی محتاج
خواتین پر صرف کرنا چاہیے۔

جوئے کی ایک شکل

سوال

حسب ذیل کاروبار کا شرعی حیثیت سے جائز ہے یا نہیں؟ آپ کی گراں قدر رہنمائی
مطلوب ہے۔

زید ایک مشین جس کی قیمت بازار میں ساٹھ روپیے ہے اس مشین کا کاروبار اس طرح
کرتا ہے کہ ساٹھ آدمیوں سے دس دس روپے کی ایک قسط ہر مہینے میں وصول کرتا ہے
اور ساٹھ آدمیوں کے درمیان قرعہ اندازی کرکے جس کے نام قرعہ نکلے اس کو ایک قسط
پر ہی مشین دے دیتا ہے۔ دوسرے مہینے بقیہ لوگوں سے دس دس روپے کی ایک اور

قسط وصول کی جاتی ہے اور پھر ان لوگوں میں قرعہ اندازی کر کے جس کے نام قرعہ نکلے اسے دوسری قسط پر ہی مشین دے دی جاتی ہے۔ اس طرح پانچ مہینوں تک قرعہ اندازی سے ایک ایک آدمی کو مشین ملتی رہتی ہے اور چھٹے مہینے میں بچے ہوئے تمام لوگوں کو زید ساٹھ روپیے فی مشین کے حساب سے بالاقساط رقم جمع ہو جانے پر مشین دے دیتا ہے۔ اس کاروبار کے سلسلے میں زید کا استدلال یہ ہے کہ چھ مہینے تک دس دس روپیے بالاقساط جمع ہونے پر بازار کے نرخ کے مطابق ہی تمام پر مشین مہیا کر دی جاتی ہے، بلکہ بازار کے اس وقت کے دام سے کچھ کفایت کے ساتھ ہی تمام ممبروں کو مشین مل جاتی ہے۔ ممبروں سے اصل قیمت کے علاوہ کچھ بھی زائد نہیں لیا جاتا۔ اس لیے اس میں سود کا تو کوئی شائبہ بھی نہیں ہے۔ نیز کسی ممبر کو کچھ بھی نقصان نہیں ہوتا ان کی جمع کی ہوئی رقم کی مالیت کا پورا مال ان کو مل جاتا ہے اس لیے اس میں جوے کی بھی کوئی شکل موجود نہیں ہے۔ پہلے پانچ آدمیوں کو بالترتیب مشین دے دینے کی وجہ سے زید کو جو نقصان ہوتا ہے اس کا کہنا ہے کہ اس پورے کاروبار پر جو نفع ملتا ہے اس میں وہ ادا کرتا ہے۔ اس نوعیت کا کاروبار جائز ہے یا نہیں۔ مطلع فرما کر ممنون فرمائیں تاکہ اس میں عدم جواز کی کوئی شکل ہو تو اس سے دامن بچا سکیں۔

جواب

آپ نے جس کاروبار کے بارے میں سوال کیا ہے اس میں کھلا ہوا جوا موجود ہے۔ ساٹھ افراد میں سے ہر فرد صرف اس قسمت آزمائی کے لیے ممبر بنتا ہے کہ شاید قرعے میں اسی کا نام پہلے یا دوسرے یا تیسرے نمبر پر نکل آئے اور یہی جوا ہے۔ آپ غور فرمائیے کہ صرف دس روپیے دے کر جس شخص کو ساٹھ روپے کی مشین مل گئی وہ کس صلے میں اور کس شرعی قاعدے کے مطابق ملی ہے؟ نیز یہ کہ پانچ ممبروں کو کم قیمت میں مشین دینے اور باقی ممبروں کو پوری قیمت میں مشین دینے کے درمیان جو فرق رکھا گیا ہے آخر وہ کس شرعی اصول کے مطابق ہے؟ ایک ہی جیسے ممبروں کے حقوق کے درمیان یہ عدم مساوات صریح ظلم ہے۔ پھر یہ بھی دیکھیے کہ جس شخص کو تمام اقساط ادا کرنے کے بعد مشین ملتی ہے وہ اپنے آپ کو بدنصیب سمجھتا ہے یا نہیں اور پھر عام طور سے یہ دیکھا جاتا ہے کہ ایسے لوگ کچھ نقصان اٹھا کر اس مشین کو فروخت کر دیتے ہیں اس لیے کہ فی الواقع انہیں مشین کی ضرورت نہ تھی۔ بلکہ کم قیمت دے کر (باقی صفحہ ... پر)

رُوداد شوریٰ جماعت اسلامی ہند

منعقدہ ۱۱ مارچ ۱۹۶۶ء

جماعت اسلامی ہند کی مجلس شوریٰ کا سالانہ اجلاس زیر صدارت مولانا ابواللیث صاحب امیر جماعت اسلامی ہند بتاریخ ۱۱ مارچ ۱۹۶۶ء بعد نماز جمعہ ۳ بجے سہ پہر سے شروع ہوا اور ۱۷ مارچ ۱۹۶۶ء کی شب میں بحمداللہ بحسن وخوبی اختتام پذیر ہوا۔

اس اجلاس میں جملہ ارکان شوریٰ جن کے نام حسب ذیل ہیں، شریک رہے

جناب کے سی عبداللہ صاحب، کیرلہ۔ جناب عبدالرزاق لطیفی صاحب، حیدرآباد۔ جناب انیس الدین احمد صاحب، بہار۔ نجات اللہ صدیقی صاحب علی گڈھ۔ مولانا سید حامد علی صاحب، میرٹھ مولانا سید احمد عروج قادری صاحب (حلقہ مرکز رامپور) جناب افضل حسین صاحب، مرکز دہلی۔ جناب شمس پیرزادہ صاحب، بمبئی۔ مولانا نظام الدین صاحب، بھوپال۔ جناب محمد شفیع صاحب مونس، میرٹھ جناب عبدالحی صاحب، رام پور۔ مولانا صدرالدین صاحب (حلقہ مرکز رامپور) جناب محمد مسلم صاحب مرکز دہلی۔ جناب حامد حسین صاحب، مرکز دہلی اور محمد یوسف، قیم جماعت

جناب محمد یوسف صاحب صدیقی خصوصی دعوت پر اجلاس کی اکثر نشستوں میں شریک رہے۔

کارروائی کا آغاز تلاوت قرآن پاک سے ہوا۔ اس کے بعد محترم امیر جماعت نے حمد وثنا کے بعد فرمایا کہ اب ایجنڈے کے مطابق کارروائی کا آغاز ہو رہا ہے اور سالانہ اجلاس میں جو مسائل برائے غور فیصلہ پیش کیے جاتے ہیں وہ سامنے آئیں گے۔ اللہ ہماری رہنمائی فرمائے۔ آمین!

گذشتہ روداد شوریٰ کی خواندگی سب سے پہلے شوریٰ منعقدہ جون ۶۵ء کی روداد پڑھ کر سنائی گئی جس پر ارکان شوریٰ نے اپنے توثیقی دستخط ثبت کیے

سالانہ رپورٹ کی خواندگی

اس کے بعد جماعت کی سالانہ رپورٹ کی خواندگی ہوئی ۔ یہ رپورٹ مرکز، تمام شعبہ جات تنظیمی حلقوں اور علاقائی دارالاشاعتوں کی کارکردگی نیز گزشتہ شوریٰ کے فیصلوں کے عمل درآمد کی روداد پر مشتمل تھی ۔

سالانہ رپورٹ میں ڈی آئی آر کے تحت رفقاء کی گرفتاریوں اور جنگ کے دوران میں عام رفقاء جماعت کی حالت کا جو تذکرہ کیا گیا تھا ۔ اس کے سلسلے میں ارکان شوریٰ نے بھی اپنے تاثرات بیان کیے اور آخر میں مجلس نے اس بات پر اظہار اطمینان کیا کہ ہندوستان اور پاکستان کے تصادم کے دوران میں مسلمانوں کے لیے بالعموم اور رفقاء جماعت کے لیے بالخصوص جو ناموافق اور تکلیف دہ حالات پیدا کر دیے گئے تھے ان میں بحمداللہ رفقاء جماعت کا مورال خاصا اونچا رہا ۔ انھوں نے بے جا خوف و ہراس میں مبتلا ہوئے بغیر ایک طرف تو اپنی شہری ذمہ داریوں کو بھی جہاں تک ان کو موقع مل سکا پورا کرنے کی کوشش کی اور دوسری طرف جماعتی پروگرام کو بھی حسب معمول برقرار رکھا البتہ مجلس نے محسوس کیا کہ اس مدت میں کہیں کہیں ان سے کچھ کوتاہیاں بھی سرزد ہوئیں جن کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے ۔ مثلاً بعض مقامات پر کچھ بے وجہ طور پر ہفتہ وار یا ماہانہ اجتماعات باقاعدگی سے جاری نہیں رکھے جا سکے ۔ یا پبلک کے مورال کو بلند رکھنے، شکوک و شبہات کی فضا کو صاف کرنے اور مسلمانوں میں جو خوف و ہراس وقتی طور پر طاری ہو گیا تھا اسے دور کرنے کے لیے بروقت ضروری اقدامات کرنے میں کوتاہی برتی گئی اور گرفتار شدگان کے متعلقین کی امداد کے سلسلے میں بھی نسبتہً محفوظ مقامات کے رفقاء نے توقع کے مطابق سرگرمی نہیں دکھائی ۔

مجلس نے اس بات پر بھی اظہار اطمینان کیا کہ ہمارے جو رفقاء اس موقع پر ڈی آئی آر کے تحت گرفتار کیے گئے تھے ۔ ان کا اور ان کے متعلقین کا طرز عمل بالعموم قابل تعریف رہا ہے جس پر مجلس نے انھیں مبارکباد پیش کرتے ہوئے اللہ تعالےٰ سے دعا کی کہ وہ ان کی قربانیوں کو قبول فرمائے ۔ اور دین و دنیا میں ان کو بہتر اجر عطا فرمائے ۔

مجلس نے مختلف تنظیمی حلقوں کی رپورٹوں اور ان علاقوں میں جماعت کی کارکردگی پر غور کیا اور اس سلسلے میں اپنے مشورے نوٹ کرائے ۔

علاقائی زبانوں میں دینی لٹریچر

شوریٰ میں پہلے یہ طے کیا جا چکا ہے کہ علاقائی زبانوں میں دینی لٹریچر بالخصوص قرآن حدیث اور سیرت کے بارے

میں جو کتابیں پہلے سے موجود ہیں ان کے بارے میں معلومات فراہم کی جائیں کہ ان کے مصنفین کون ہیں کب شائع ہوئی ہیں اور قابلِ حصول ہیں یا نہیں اور کس حد تک قابلِ اطمینان ہیں اور پھر اربابِ خیر کے تعاون سے ان زبانوں میں اسلامی لٹریچر بالخصوص قرآن مجید کو منتقل کرنے کی کوشش کی جائے لیکن گزشتہ سال غیر معمولی حالات کی وجہ سے اس سلسلے میں کوئی خاص پیش رفت نہیں ہو سکی۔ چونکہ یہ ہمارے ملک کی ایک بہت بڑی ضرورت اور مسلمانانِ ہند کی ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے اس لیے فوری نے توجہ دلائی کہ اس کی خاص طور سے فکر کرنی چاہیے اور یہ امید ظاہر کی کہ اس کام میں اصحابِ خیر سے پورا تعاون حاصل ہو سکے گا۔

حسابات اور آڈٹ رپورٹ سال گزشتہ کے بجٹ کی روشنی میں مرکزی بیت المال کی آمد و صرف کی رپورٹ جس کے ساتھ آڈیٹر کی رپورٹ بھی منسلک تھی پیش کی گئی۔ جس کی ارکان شوریٰ نے توثیق کی۔

حالاتِ حاضرہ پر غور مجلس نے حالاتِ حاضرہ پر بھی غور و فکر کیا اور حسبِ ذیل عنوانات پر قراردادیں منظور کیں جو دعوت مورخہ ۱۹ اور ۲۲ مارچ ۶۶ء میں شائع کی جا چکی ہیں۔

(۱) اعلان تاشقند۔ (۲) ایمرجنسی (۳) ڈی آئی آر۔ (۴) غذائی صورتِ حال۔ (۵) مسلم یونیورسٹی علی گڈھ۔ (۶) ملک میں حالیہ بے چینی۔ (۷) ملک کی موجودہ صورتِ حال کا علاج۔ (۸) اردو کی علاقائی حیثیت۔

فسادات کے مسئلے پر غور کرتے وقت یہ بات بھی طے کی گئی کہ حکومت کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی جائے کہ جہاں کہیں فسادات کی وجہ سے شہریوں کو جانی اور مالی نقصانات پہنچیں وہاں حکومت ان کا پورا پورا معاوضہ ادا کرے نیز یہ بھی طے کیا گیا کہ اس سلسلے کی کوششوں میں دوسری جماعتوں سے تعاون حاصل کیا جائے۔

مجلس نے یہ بھی طے کیا کہ ایمرجنسی اور ڈی آئی آر کے خاتمے کے لیے دیگر سیاسی جماعتوں کے ساتھ اشتراک و تعاون کیا جائے۔

داخلی نظم کا استحکام اور تعارفِ دعوت طے کیا گیا کہ تربیت و دعوت اور استحکامِ نظم کے سلسلے میں صورتِ حال کو بہتر بنانے کے لیے آئندہ

سال کے لیے مندرجہ ذیل امور کا اہتمام کیا جائے۔

- ارکان شعبہ تنظیم مجموعی طور پر ملک کے کم از کم ۱۰ ایسے مقامات کا دورہ کریں گے جہاں جماعتیں قائم ہیں اور ہر مقام کا دورہ کم از کم دو دنوں پر مشتمل ہوگا۔ ہر مقام پر ایک ایسا تربیتی پروگرام رکھا جائے گا جو تربیت کے ان مقاصد و ذرائع کی روشنی میں مرتب کیا جائے جن کی نشان دہی کی جاچکی ہے اسی اجتماع میں دعوتی کام کی اہمیت اس کے طریقوں اور اس کے لیے ضروری تیاریوں کی طرف بھی توجہ دلائی جائے گی۔
- رفقاء کے تربیتی مطالعے کے لیے اس عرصے میں دو کتابیں تیار کی جائیں گی۔
- رپورٹوں کا نظم بہتر بنانے کے لیے سعی کی جائے گی
- ہر تنظیمی حلقے میں غیر مسلموں میں دعوتی کام کے لیے تیاری اور اس کی تدابیر پر غور کرنے کے سلسلے میں سال میں ایک بار ایک دو روزہ اجتماع ہوگا جس میں مطالعہ و مذاکرہ کا پروگرام رکھا جائے گا اور جو ارکان غیر مسلموں میں دعوتی کام کا تجربہ رکھتے ہیں وہ اپنے تجربات بیان کریں گے اور ان پر تبادلہ خیال ہوگا مذکورہ بالا مدت میں تمام تنظیمی حلقوں سے بحیثیت مجموعی کم از کم ۵۰ کارکنوں کا انتخاب کیا جائے گا جو اپنے حلقہ کار اور معلومات کی مناسبت سے غیر مسلموں میں دعوتی کام کے لیے خاص طور سے موزوں ہوں

اخبار دعوت اخبار دعوت کے نظم کو زیادہ بہتر بنانے اور اس کے معیار کو بلند کرنے کے سلسلے میں مجلس نے غور و خوض کیا اور اس ضمن میں ارکان مجلس کی جانب سے کئی ایک مفید مشورے آئے جن پر عمل درآمد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ امید ہے کہ ان شاء اللہ اس سال اپنی اشاعت اور افادیت دونوں اعتبار سے اخبار دعوت بہت ترقی کرے گا۔

دعوت کا ہندی اڈیشن ہندی داں حلقے میں دعوت اسلامی کے تعارف کے سلسلے میں ایک ہندی ہفتہ وار کی ضرورت بہت پہلے سے محسوس کی جارہی تھی اور اب اس ضرورت میں مزید اضافہ ہوگیا ہے۔

ہندی جاننے والے مسلمان اور غیر مسلم عوام تک ہماری باتیں نہ پہنچنے کا ایک بڑا اثر یہ ہے کہ اس حلقے میں آسانی سے اسلام اور مسلمانوں اور جماعت اسلامی کے سلسلے میں غلط فہمیاں پیدا کی جاسکتی ہیں۔
ہندی کے ہفتہ وار اخبار کی اشاعت کے سلسلے میں عام اندازہ یہ ہے کہ کم و بیش ۴ ہزار سے [illegible]

کا خسارہ برداشت کرنا ہوگا اور شاید یہ خسارہ ۳-۴ سال تک اٹھانا پڑے۔ بہرحال یہ طے کیا
اس مسئلے میں عام لوگوں کی رائے معلوم ہونے کے بعد ہی کوئی عملی قدم اٹھایا جا[illegible] ہے۔

مارگ دیپ

پونا کے گزشتہ فسادات کے دوران مرہٹی ہفت روزہ "مارگ دیپ" کے دفاتر کو نذر آتش کر دیا گیا تھا جس کی وجہ سے مرہٹی دارالاشاعت اور مارگ دیپ کو ہزاروں کا مالی خسارہ برداشت کرنا پڑا۔ اس لیے طے کیا گیا کہ "مارگ دیپ" کو سردست بند رکھا جائے اور آئندہ جب مالی حالات وغیرہ اجازت دیں تو اس کے اجرا پر اس موقع پر غور و فیصلہ کیا جائے۔

اعلیٰ تعلیم کی درسگاہ کا قیام

یہ ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی تھی کہ جماعت اپنی مکمل تعلیمی اسکیم نافذ کرے تاکہ تکمیل کے بعد طلبہ کالجوں اور دارالعلوموں کی تعلیم کے محتاج نہ رہیں اور تحریک، ملت کی ضروریات کے لیے کار آمد بنائے جا سکیں لیکن غیر معمولی مصارف کا بار، وسائل و ذرائع کی کمی، معتد بہ تعداد میں موزوں طلبہ کی فراہمی میں قلت اور باصلاحیت اساتذہ کے حصول میں دشواریاں مانع رہیں اور اب تک مرکزی درسگاہ میں تعلیم کی تکمیل کا بندوبست کیا جا سکا تھا۔ ادھر چند سال سے اس ضرورت کا احساس شدید تر ہوتا جا رہا تھا چنانچہ شوریٰ نے فیصلہ کیا ہے کہ :-

۱- ابتدائی درسگاہ کو پرائمری اور جونیئر یعنی کل آٹھ درجات تک محدود رکھا جائے گا۔ اور ان میں وہی نصاب تعلیم نافذ کیا جائے گا جو مرکزی درسگاہ کی آٹھویں جماعت تک کے لیے جماعت اسلامی کی طرف سے منظور شدہ ہے۔

۲- اعلیٰ تعلیم کی ایک درسگاہ قائم کی جائے گی جو (نویں تا چودھویں کل) چھ جماعتوں پر مشتمل ہوگی جو درجہ بدرجہ چھ سال میں مکمل ہو جائے گی

معتد بہ تعداد میں موزوں طلبہ کے حصول کے لیے ہر درجے میں کم و بیش دس وظائف کا بندوبست کرنا ہوگا تاکہ ایسے باصلاحیت اور علمی ذوق رکھنے والے طلبہ بھی اعلیٰ تعلیم سے استفادہ کر سکیں جن کی تعلیم میں وسائل کی کمی مانع ہو۔

موزوں طلبہ کے حصول اور وظائف کے لیے فنڈ کی فراہمی کے سلسلے میں تعلیمی حلقوں سے مدد لی جائے گی۔ سوا اہل خیر حضرات تک یہ بات پہنچائیں گے جو اس طرح کی اسکیم سے اتفاق اور

چاہتے ہیں اور اس سلسلے میں کچھ خرچ کرنے کو تیار ہوں

توقع ہے کہ مد[illegible]ں گاہیں بھی موزوں طلبہ کے حصول اور ان کے لیے وظائف کے بندوبست میں تعاون کر سکیں گی۔

کل ہند اجتماع کل ہند اجتماع کے انعقاد کے مسئلے پر بھی غور و خوض کیا گیا۔ اور طے کیا گیا کہ اس مسئلے پر آئندہ شوریٰ میں غور کیا جائے۔

یہ بھی طے کیا گیا ہے کہ اگست میں مجلس شوریٰ کا ایک غیر معمولی اجلاس طلب کیا جائے جس میں کچھ ضروری بنیادی مسائل پر کتاب و سنت کی روشنی میں غور کیا جائے۔

جماعت کے داخلی امور جماعت کے ہمہ وقتی کارکنوں کے مشاہروں اور ضوابط رخصت وغیرہ سے متعلق بعض تجاویز سامنے آئیں جن پر غور و خوض کے بعد مناسب فیصلے کیے گئے

بجٹ آخر میں بجٹ پیش کیا گیا۔ متوقع آمدنی ۷۱,۲۰۰/- اور متوقع مصارف ایک لاکھ (۱,۰۰,۰۰۰/-) اس طرح متوقع خسارہ ۲۸,۸۰۰/- ہوتا ہے جسے قرض لے کر پورا کرنا طے کیا گیا۔ دعا پر اجتماع برخاست ہوا۔

محمد یوسف

ادب اور کمیسار مترجم گوپال متل صفحات ۲۷ کاغذ کتابت، طباعت بہتر قیمت: ایک[illegible]
ناشر: نیشنل اکاڈمی ۹ انصاری مارکیٹ۔ دریا گنج۔ دہلی ۶
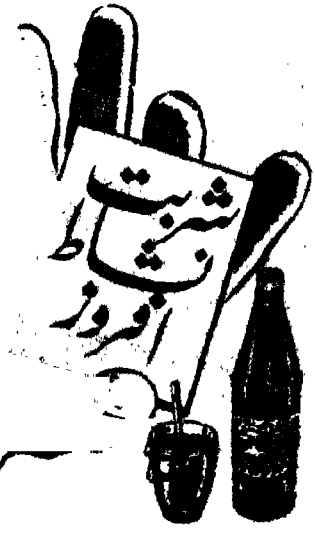
کمیونزم کے بھیانک چہرے سے نقاب اٹھانے میں جناب گوپال متل کے ہاتھوں نے جو چابک دستی [illegible]
ہے وہ ہندوستان میں کسی اور نے نہیں دکھائی۔ انھوں نے اپنی زندگی کا یہی مقصد قرار دے لیا
اور وہ اس میں سرگرم ہیں۔ یہ کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ کتاب ہنگری کے مشہور ادیب
جارج پیلوکزی ہوروتھ کی کتاب کا ترجمہ ہے۔ گوپال متل کے ترجمے کی خوبی یہ ہے کہ کتاب ترجمہ
بجائے اوریجنل معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس کتاب کے مصنف نے جگ بیتی نہیں بلکہ آپ بیتی سنائی۔
گوپال متل اس تصنیف کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

ان کی تصنیف کا اہم ترین پہلو یہ ہے کہ انھوں نے ادب اور کمیونزم کے نزاع باہم کے
تفصیلی مطالعے کے بعد اس حقیقت کو بے نقاب کیا ہے کہ اپنے تمام مظاہرۂ جبروت کے باوجود
کمیونزم ادب کو کبھی زیر نہیں کر سکتا کیونکہ بنیادی نزاع کمیونزم اور ادب میں نہیں بلکہ کمیونزم اور
انسانی سرشت میں ہے۔ سرشت انسانی کی تسخیر جس طرح ماضی کا کوئی اور جابر نہیں کر سکا اسی طرح
کمیونزم اس میں ناکام رہے گا اور سرشت انسانی اور ادب دونوں ہی اپنے دور سے سلامت
بچ نکلیں گے۔

اس پر تبصرہ نگار اتنا اور اضافہ کرتا ہے کہ انسانی سرشت میں خودی کا احساس اور خدا کا تص[illegible]
اتنی مضبوطی کے ساتھ جما ہوا ہے کہ اسے کمیونزم کھرچ کر پھینک دینا کسی انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ اور یہی وا[illegible]
[illegible] کے تمام مظاہرۂ جبروت کے خلاف [illegible]

... کتاب میں ...وں کے ادیبوں کی سرگزشت بیان کی گئی ہے۔ کتاب معلومات افزا اور دلچسپ ہے۔

(ع۔ ق)

عقیدۂ توحید اور انسانیت ابو محمد امام الدین رام نگری۔ قیمت ۸۰ / ناشر: مکتبۂ تحفظات۔ رام نگر۔ بنارس۔ یوپی

ادھر عرصے سے ماہنامہ انوار اسلام رام نگر بنارس میں مختلف مضامین کے بجائے کوئی ایک مقالہ کتابی صورت میں شائع ہو رہا ہے۔ ماہ اگست ۵۰ء کے شمارے میں "عقیدۂ توحید اور انسانیت" کے عنوان سے ایک پورا مقالہ شائع کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے عنوانات یہ ہیں۔

شرک کے مفاسد۔ سچی انسانیت اور عقیدۂ توحید۔ سچی آزادی اور عقیدۂ توحید۔ سچی مساوات اور عقیدۂ توحید۔ سچا انصاف اور عقیدۂ توحید۔ سچا امن اور عقیدۂ توحید ... عنوانات مصنف لکھتے ہیں :۔

"عقیدۂ توحید اور انسانیت" عوام کی استعداد اور نفسیات کے مطابق شگفتہ اور دلنشین ادبی اسلوب میں لکھی گئی ہے۔

امید ہے کہ عوام اس مفید کتاب سے فائدہ اٹھائیں گے۔

مثالی خواتین یونس نگرامی ندوی، صفحات ۸۰ قیمت۔ پچاس پیسے۔ ناشر: مکتبۂ طیبہ ۲۰/۴۸ ڈیوڑھی آغا میر۔ لکھنؤ

اس کتاب پر پیش لفظ جناب مولانا شاہ معین الدین ندوی نے لکھا ہے۔ لکھتے ہیں :۔

"تاریخ اسلام میں سیکڑوں عورتیں ایسی گزری ہیں جو علمی ذاتی دینی و اخلاقی حیثیت سے مردوں کے لیے باعث رشک و قابل تقلید تھیں اس لیے نوجوان ہونہار مصنف نے اس کتاب میں ایسی ہستیوں خواتین کے مؤثر اور سبق آموز واقعات زندگی کو جمع کر دیا ہے جن سے مرد اور عورتیں ... سبق حاصل کر سکتے ہیں خصوصاً عورتیں ان کی روشنی میں اپنی زندگی سنوار سکتی ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ کتاب کو مقبول بنائے۔"

... یہ تحریر اس کتاب کا اچھا تعارف ہے۔ ع۔ ق

زندگی

جلد ۲۶
شمارہ ۶:۸
جون ۱۹۶۶ء

مدیر: سید احمد قادری

● خط و کتابت و ارسال زر کا پتہ: منیجر رسالہ زندگی رامپور - یوپی
● زر سالانہ: - چھ روپیہ - ششماہی - تین روپیہ - فی پرچہ : ۶۰ پیسے
● ممالک غیر سے : دس شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر

مالک: جماعت اسلامی ہند - ایڈیٹر: سید احمد عروج قادری - پرنٹر پبلشر: سید احمد عروج - مطبع: ہلالی پرنٹنگ ورکس محلہ گھیر آزاد خاں
مقام اشاعت: دفتر زندگی - رامپور یوپی

اشارات

سید احمد قادری

دنیا کے تمام مسلمانوں کے درمیان بالعموم اور مسلمانوں کی آزاد مملکتوں کے درمیان بالخصوص اسلام کی بنیاد پر اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کی تمنا کوئی نئی تمنا نہیں ہے۔ عرصہ دراز سے مسلمانوں کی بہت سی ممتاز شخصیتیں اس مقصد کے لیے کوشش کرتی رہی ہیں اور ماضی قریب میں سید جمال الدین افغانی کی شخصیت بہت نمایاں رہی ہے۔ اگرچہ یہ کوششیں اب تک پوری طرح بارآور نہیں ہو سکی ہیں لیکن ان کوششوں کو لاحاصل بھی نہیں کہا جا سکتا۔ خلوص کے ساتھ کسی خیر و صلاح کے لیے جو کوشش بھی کی جاتی ہے وہ کبھی لاحاصل نہیں ہوتی۔ یہ کوششیں اب تک پوری طرح کیوں کامیاب نہ ہو سکیں۔ اس کا تجزیہ اس وقت مقصود نہیں لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ ادھر سو ڈیڑھ سو برسوں سے مغربی قوموں کا استیلا، اور ان کی تہذیب، ان کے تمدن، ان کے نظریۂ زندگی اور ان کے اقدارِ حیات کا حاکمانہ تسلط، مسلمان مملکتوں کے درمیان اتحاد کی راہ روکنے میں سب سے بڑا اور سب سے مضبوط پتھر رہا ہے۔

اس وقت جو آزاد مسلمان مملکتیں موجود ہیں ان میں دو ایک کو چھوڑ کر باقی سب کی سب ایسے مسلمانوں کے زیر اقتدار و زیر انتداب ہیں جو اسلام کی قوت سے ناواقف اور مغربی نظریہ زندگی کے مومن مخلص ہیں۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ جب مذہب آج کہیں بھی مملکتوں، حکومتوں اور قوموں کے درمیان نقطۂ اتحاد و اشتراک نہیں ہے تو وہ مسلمان مملکتوں کے درمیان اتحاد و اشتراک کا مرکز کس طرح بن سکتا ہے۔ یہ بات ان کی سمجھ میں کیوں نہیں آتی؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس دین سے صحیح طور پر واقف ہی نہیں ہیں جس کی پیروی کا وہ دعوے کرتے ہیں لیکن خدا کا شکر ہے کہ مسلسل کوششوں کی وجہ سے اب حالت اتنی مایوس کن نہیں ہے جتنی آج سے دس بیس سال پہلے تھی۔ اس کے دوش بدوش

اسباب ہیں۔ پہلا سبب یہ ہے کہ اب اسلام کے ایک مکمل اور صالح ترین نظام زندگی ہونے کی آواز آفاق گیر بن چکی ہے۔ دنیا کے اکثر و بیشتر ترقی یافتہ اور آزاد ملکوں میں ایسے اہل علم اور صاحب بصیرت لوگ پیدا ہو چکے ہیں جو دوسرے نظامہائے حیات کا تقابلی مطالعہ کر کے اسلامی نظام حیات کی صالحیت و افادیت کو پوری قوت کے ساتھ پیش کر رہے ہیں اور اب یہ آواز اتنی بلند ہو چکی ہے کہ اس کو دبا کر کچل دینا نہ مغربی استادوں کے بس میں رہا ہے اور نہ ان کے مخلص شاگردوں کے بس میں۔

ہر اسلامی ملک میں مسلمان عوام جذباتی طور پر تو ہمیشہ اسلام کے ساتھ رہے ہی ہیں لیکن اب ان کی اسلام پسندی صرف جذبات کا نتیجہ نہیں بلکہ عقل و شعور کا حاصل بھی بن گئی ہے اور بنتی جا رہی ہے ——— دوسرا سبب یہ ہے کہ مغربی جمہوریت، نیشنلزم، سیکولرزم، سوشلزم، اشتراکیت اور اس طرح کے دوسرے نظریے تجربات کی بھٹی میں تپ کر اپنا کھوٹ نمایاں کر چکے ہیں اور روز بروز یہ بات واضح سے واضح تر ہوتی جا رہی ہے کہ ان میں سے کوئی چیز مملکتوں اور قوموں کے درمیان حقیقی اتحاد و اشتراک کا نقطہ نہیں بن سکتی اور نہ ان میں سے کسی کے ساتھ دنیا کی فلاح وابستہ کی جا سکتی ہے اور جہاں تک اسلامی ملکوں کا تعلق ہے حالات بتا رہے ہیں کہ وہاں مغرب پرست طبقہ اپنا وزن کھوتا جا رہا ہے۔

سید جمال الدین افغانی رحمہ نے بہت سعی کی تھی کہ افغانستان یا اسلامی ملکوں کا کوئی فرماں روا اسلامی اتحاد و اتفاق کے اس مقصد کے لیے اٹھ کھڑا ہو جسے وہ پیش کر رہے تھے لیکن اپنی سعی میں وہ اس لحاظ سے ناکام رہے کہ کوئی فرماں روا عملاً اس پر تیار نہ ہو سکا لیکن ان کا پیغام اور ان کی سعی رائگاں نہیں گئی۔ آج سعودی عرب کے سربراہ شاہ فیصل کو اللہ تعالیٰ نے یہ توفیق عطا فرما دی کہ وہ اسلام کی بنیاد پر مسلمان مملکتوں کے درمیان اتحاد و اشتراک پیدا کرنے کی سعی کے لیے اٹھ کھڑے ہوں اور بلاشبہ آج اس مقصد کے حصول کے لیے حالات پہلے سے بہت زیادہ سازگار ہیں۔ اللہ کی مشیت کیا ہے یہ ہمیں نہیں معلوم لیکن حالات کا رخ بتا رہا ہے کہ اگر انھوں نے خلوص کے ساتھ کوشش جاری رکھی تو کامیاب ہوں گے۔

خود عرب قومیت کے سربراہ کی مخالفت مشکلات ضرور پیدا کرے گی لیکن وہ اس تحریک کو روکنے میں کامیاب نہ ہوگی ــــــ یہ بات کتنی عبرت ناک ہے کہ کل مغربی طاقتیں پان اسلامزم کا ہوا کھڑا کرکے اتحاد اسلامی کو ناکام کرنے کی سعی کرتی تھیں اور آج صدر ناصر یہ الزام لگا کر اس کو ناکام کرنا چاہتے ہیں کہ اس سعی اتحاد کی پشت پر مغرب کی سامراجی طاقتیں ہیں اور اس کا مقصد عرب اتحاد اور عرب سوشلزم کو نقصان پہنچانا ہے لیکن اس الزام کے بین السطور میں جو اصل الزام جھلک رہا ہے وہ یہ ہے کہ اسلام کی بنیاد پر اتحاد عالم اسلامی کی یہ کوشش عرب ممالک میں خود صدر محترم کی لیڈرشپ کے خلاف ایک چیلنج بنتی جارہی ہے اور یہ وہ بات ہے جس کو ان کا مزاج برداشت کرہی نہیں سکتا ۔

مئی میں روس کے وزیراعظم مسٹر کوسیجن مصر تشریف لارہے ہیں ۔ یہ دونوں دوست مل کر شاید یہ بھی سوچیں گے کہ اس "خطرے" کو دفع کرنے کے لیے کیا تدبیریں اختیار کی جائیں ۔ اس قیاس کی بنیاد یہ ہے کہ وہ بھی اس اتحاد کے خلاف زہرافشانی کرچکے ہیں ۔ صدر ناصر کی ایک مجبوری یہ بھی ہوگی کہ اسوان کا زبردست ڈیم روس کی امداد سے تعمیر ہو رہا ہے ۔ یمن میں مصری فوجوں کے اخراجات کا بھی سوال ہے اب اگر وہ روس کو ناخوش کریں تو ڈیم کا کیا بنے اور یمن میں مصری فوجوں کے قیام کا بندوبست کیا ہو ۔

شاہ فیصل کئی دفعہ صدر ناصر کے الزام کی تردید کرچکے ہیں لیکن جو الزام کسی کو محض بدنام کرنے کے لیے لگایا جاتا ہے اس کی مدلل سے مدلل تردید بھی الزام لگانے والے کا منہ بند نہیں کرسکتی وہ اپنا الزام دہرائے چلا جاتا ہے ۔

شاہ فیصل نے ۲۷ مارچ ۶۶ء کو مکہ معظمہ میں تمام دنیا کے ممتاز مسلمانوں اور ان کے وفود کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا ۔

برادران محترم ! اگرچہ یہ دعوت بعض حلقوں اور برائی کی طاقتوں مثلاً سامراجیت اشتراکیت اور صیہونیت کو ایک آنکھ نہیں بھا رہی ہے لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ مسلمان ان عناصر کی طرف سے پھیلائے گئے الزامات پر کوئی توجہ نہ دیں گے ۔ عدل و انصاف سے منہ نہ موڑیں گے اور اتحاد تعاون اور استقامت کو برقرار رکھیں گے ــــــ عزیز بھائیو ! جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں ہمارے خلاف بہت زہرافشانی کی گئی ہے ۔ ہم اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتے ہیں کہ وہ ان گمراہ لوگوں کی ہدایت

فرقت ربانی و دستگیری فرمائیے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ ہم یہ اتحاد سامراجی طاقتوں کے اشارے پر عمل میں لا رہے ہیں۔ میں آپ حضرات کی موجودگی میں ہر معترض کو یہ دعوت دیتا ہوں کہ وہ ہمارے ساتھ آگے بڑھ کر اس دعوت کا جائزہ لے اور غیر جانبداری سے بتائے کہ آیا واقعی یہ سب کچھ سامراجیوں کے اشارے سے ہو رہا ہے، یا اللہ کے بندے محض اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے اٹھے ہیں جو کوئی بھی ہماری اس دعوت کی حمایت کرتا ہے ہم اسے خوش آمدید کہتے ہوئے اس یقین کے ساتھ اپنی اگلی صفوں میں جگہ دینے کے لیے تیار ہیں کہ ہم کبھی پسپا نہ ہوں گے کبھی کمزوری نہ دکھائیں گے اور اپنے نصب العین کے خلاف کسی کی بات نہ مانیں گے۔ ہم نے اپنے کو اللہ کے دین کے لیے وقف کر دیا ہے اور جو شخص اپنے آپ کو اللہ کی راہ میں لگا دے کبھی اپنے قول سے پھر نہیں سکتا۔ معترضین کو ناراض ہونے دیجیے۔ اور جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں اللہ تعالیٰ سے ان کی ہدایت کی دعا کے علاوہ اور ہمارے پاس ان کی ناراضی کا کوئی جواب نہیں۔ ہم اللہ کے فضل سے اپنے مقصود کو پس پشت نہ ڈالیں گے۔

شاہ فیصل کی تقریر کا یہ حصہ کس قدر واضح اور کتنا خوش آیند ہے۔ "اللہ کے دین کی سربلندی" یہ ہے وہ نصب العین جس کو صرف مسلمان عوام و خواص ہی نہیں بلکہ مسلمان حکومتیں بھی بھول چکی تھیں اور آج بھی ان کی اکثریت اس کو فراموش کیے ہوئے ہے اور یہی بھول ہمارے زوال کی علۃ العلل ہے۔

ہم دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ اپنے بندے فیصل بن عبدالعزیز کے الفاظ کو قبول فرما! انہیں خلوص کی دولت سے مالا مال کر دے۔ انہیں صبر و استقامت کی چٹان بنا دے اور انہیں توفیق عطا فرما کہ وہ زندگی کے آخری لمحے تک تیرے دین کی سربلندی کے لیے سرگرم عمل رہیں اور اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ اے کائنات کے مالک حقیقی تو دوسرے اسلامی ملکوں کے سربراہوں کو بھی توفیق عطا فرما۔ ان کے دلوں کے دروازے بھی کھول دے۔ انہیں بھی اپنے دین کی سربلندی کا بھولا ہوا نصب العین یاد دلا دے اور انہیں بھی اس کے لیے سرگرم عمل کر دے۔

ہندوستان میں بھی پہلے سال کے پانچ کروڑ مسلمانوں کے درمیان مشترک مسائل میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کی سعی کی جا رہی ہے اور [illegible] نے اپنے کچھ ہمدردوں کے دلوں میں یہ بات ڈالی ہے کہ وہ مجلس

کے مشترکہ مسائل حل کرنے کے لیے انہیں متفق اور ہم آواز بنائیں۔ پانچ کروڑ کی تعداد رکھتے ہوئے بھی ان کی بے وزنی و بے وقری نتیجہ ہے ان کے انتشار و اختلاف کا اور ان کے اس اختلاف و انتشار کا سبب ہے دین اسلام کی تعلیمات سے ان کی بے توجہی۔ اس لیے ضرورت ہے کہ ایک طرف انہیں قولاً و عملاً اسلام کا پیرو بنانے کی سعی کی جائے اور دوسری طرف مشترکہ مسائل کو حل کرنے کے لیے ان کے انتشار و اختلاف کو ختم کیا جائے۔ جب تک مسلمان عملی مسلمان بن کر متحد و متفق نہ ہوں گے ان کے مسائل حل نہیں ہو سکتے۔

یہاں بھی اس سعی کو ناکام کرنے کے لیے خود امت مسلمہ ہی کے کچھ "ترقی یافتہ" لوگ سرگرم ہیں اور اس کوشش پر طرح طرح کے الزامات لگا رہے ہیں اور ان "ترقی یافتہ" لوگوں نے چند علماء کو بھی اپنا ہم نوا بنا لیا ہے۔ حکومت بھی اپنا وزن انہیں ترقی یافتہ لوگوں کے پلڑے میں ڈال رہی ہے اس لیے سعی اتحاد کی کامیابی کوئی کھیل تماشہ نہیں بلکہ بہت صبر آزما کام ہے۔

مشترک مسائل میں ہمارا سب سے اہم مسئلہ۔ جو درحقیقت تمام دوسرے مسائل کی اصل ہے۔ اسلامی تہذیب اور اسلامی انفرادیت کا تحفظ ہے۔ عقائد، مذہبی مراسم و عبادات، پرسنل لا، دینی تعلیم، خواتین کا پردہ، اردو زبان اور اس طرح کے جتنے مسائل ہیں سب کی اصل یہ ہے کہ ہماری اسلامی انفرادیت باقی رہے اور ہم جارحانہ قوم پرستی کے دھارے میں بہہ نہ جائیں۔

جو لوگ ان مسائل کو حل کرنے کے لیے متحدہ پلیٹ فارم کی دعوت دے رہے ہیں ان کے لیے سب سے پہلی اور ضروری چیز یہ ہے کہ وہ عام مسلمانوں کے سامنے بھی اور برادران وطن کے سامنے بھی اس بات کا عملی ثبوت بہم پہنچائیں کہ وہ واقعی اسلامی تہذیب اور اسلامی انفرادیت کا تحفظ چاہتے ہیں۔ یہ بات کتنی مضحکہ خیز ہوگی کہ وہ عبادات کا تحفظ چاہیں اور خود اس سے غافل ہوں وہ پرسنل کا تحفظ چاہیں اور خود اسے توڑتے ہوں وہ دینی تعلیم کا نعرہ لگائیں اور خود اپنے بچوں کو اس سے بے بہرہ رکھیں وہ پردے کی حمایت کریں اور خود ان کی عورتیں بے پردہ ہوں وہ اردو، اردو کی رٹ لگائیں اور ان کا اپنا تمام کاروبار انگریزی میں ہو۔

ہم یہ نہیں جانتے کہ اتحاد کے داعیوں میں یہ تمام خلاف ورزیاں پائی جا رہی ہیں یا نہیں۔ ہم صرف یہ کہتے ہیں کہ نہیں پائی جانی چاہئیں ہمیں اس بات سے پوری طرح چوکنا رہنا چاہیے کہ ہمارا عمل ہمارے قول کے خلاف نہ ہو۔ ہمارے قول و عمل کا اتحاد ہی مسلمانوں کو متحد اور برادران وطن کو متاثر کر سکتا ہے۔

ہجرت کے دوسرے سال

عبادات و معاملات کے لیے قمری مہینوں کا نفاذ

قال عبد الرزاق عن عبد العزیز
ابن ابی رواد عن نافع عن ابن عمر قال
قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جَعَلَ
اللّٰہُ الاَھِلَّۃَ مَوَاقِیْتَ لِلنَّاسِ فَصُوْمُوْا
لِرُؤْیَتِہٖ وَاَفْطِرُوْا لِرُؤْیَتِہٖ فَاِنْ غُمَّ عَلَیْکُمْ
فَعُدُّوْا ثَلٰثِیْنَ ورواہ الحاکم فی مستدرکہ
من حدیث ابن رواد بہ وقال کان
ثقۃ عابدا مجتہدا شریف النسب
فہو صحیح الاسناد ولم یخرجاہ وقال
محمد بن جابر عن قیس بن طلق
عن ابیہ قال: قال رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم جعل اللہ الاہلۃ
فاذا رایتم الہلال فصوموا و
اذا رایتموہ فافطروا فان اغمی
علیکم فاکملوا العدۃ ثلثین وکذا
رواہ من حدیث ابی ہریرۃ ومسلم

ابن عمرؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ نے ہلالوں کو لوگوں کے
لیے میقات بنایا ہے۔ لہٰذا (رمضان کا) چاند
دیکھ کر روزہ رکھو اور (عید کا) چاند دیکھ کر
روزے ختم کرو اور اگر چاند نظر نہ آئے تو
تیس دن پورے کرو۔ یہی حدیث حاکم نے
اپنی مستدرک میں ابن رواد کی سند سے روایت
کی ہے اور کہا ہے کہ وہ ثقہ، عابد، عبادت گزار،
مجتہد اور شریف النسب تھے۔ پس یہ حدیث
صحیح الاسناد ہے اور بخاری و مسلم نے اس کو
روایت نہیں کیا ہے۔ اور قیس بن طلق اپنے
والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے ہلالوں کو مقرر
کر دیا ہے پس تم ہلال دیکھو تو روزہ رکھو
اور جب ہلال دیکھو تو روزے ختم کر دو پس اگر
چاند تم پر مخفی رہے تو تیس کی گنتی پوری کرو

علی بن طالب رضی اللہ عنہ
ابن کثیر جلد اتحت یسئلونک عن الاھلۃ)

اور اسی طرح ابو ہریرہؓ کی حدیث اور علی بن ابی
طالبؓ کے کلام سے بھی مروی ہے۔

مفسر ابن کثیر نے مستدرک حاکم کی جس حدیث کا حوالہ دیا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:-

ثنا نافع عن ابن عمر رضی اللہ عنہما
ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال
ان اللہ قد جعل الاھلۃ مواقیت فاذا
رأیتموہ فصوموا واذا رأیتموہ فافطروا
فان غم علیکم فاقدروا لہ واعلموا
ان الاشہر لا تزید علی ثلثین ھذا
حدیث صحیح الاسناد علی شرطہما
ولم یخرجاہ وعبد العزیز بن
ابی رواد ثقۃ عابد شریف البیت
(المستدرک ج ۱ ص ۴۲۳)

ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے
کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ
نے ہلالوں کو میقات بنا دیا ہے۔ پس جب تم اس
کو دیکھو تو روزہ رکھو اور جب اس کو دیکھو
تو افطار کرو۔ اور اگر وہ تم پر مخفی رہے تو گنتی
پوری کر دو اور جان لو کہ مہینے تیس دن سے
زیادہ نہیں ہوتے۔ یہ صحیح الاسناد حدیث ہے
بخاری و مسلم کی شرط پر اور ان دونوں نے اس
کو روایت نہیں کیا ہے اور عبد العزیز بن رواد
ثقہ عابد مجتہد اور شریف گھرانے کے تھے۔

امام ذہبی نے بھی یہ حدیث نقل کی ہے اور آخر میں لکھا ہے "صحیح" یہ حدیث امام بیہقی نے بھی اپنی سنن کبریٰ میں روایت کی ہے۔ جس آیت نے عبادات و احکام کے لیے قمری مہینوں کو مقرر کیا اور جس کی تشریح و تنفیذ منقولہ بالا احادیث میں ہے وہ یہ ہے:-

یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْاَھِلَّۃِ قُلْ ھِیَ
مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ
(البقرہ ۲۴)

لوگ تم سے نئے چاند کا حال پوچھتے ہیں
تم کہہ دو کہ یہ اوقات مقررہ ہیں لوگوں کے
لیے اور حج کے لیے

اس آیت کی تفسیر میں ابن جریر لکھتے ہیں:-

قال قتادۃ سألوا النبی صلی
اللہ علیہ وسلم عن ذالک لم جعلت
ھذہ الاھلۃ فانزل فیھا ما تسمعون

قتادہ نے کہا۔ لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ
وسلم سے پوچھا کہ یہ گھٹتے بڑھتے چاند کیوں بنائے
گئے ہیں؟ اس کے جواب میں (باقی [illegible])

زکوٰۃ کا مصرف "وفی سبیل اللہ"

سید احمد قادری

اپریل ۱۹۶۶ء کے شمارے میں، میں نے رسائل ومسائل کے حصے میں اپنی یہ رائے دی تھی کہ " وفی سبیل اللہ" کے تحت زکوٰۃ کی رقم سے تبلیغ دین کا کام کیا جا سکتا ہے۔ اس کی تردید میں ایک تعلیم گاہ سے لمبا خط آیا تھا اس کے جواب نے ایک مختصر مقالے کی ضخامت حاصل کرلی ہے۔ اس لیے اس کو مقالات کے حصے میں شائع کر رہا ہوں۔

مکتوب

ماہنامہ زندگی کا اپریل ۶۶ء کا شمارہ نظر سے گزرا " زکوٰۃ کی رقم سے تبلیغ دین" کے تحت آپ کے فتوے کو پڑھ کر سخت حیرت ہوئی۔ سائل کے سوال " اگر کوئی مسلمان زکوٰۃ کی رقم سے ہندی ترجمۂ قرآن خرید کر پڑھے لکھے مالدار غیر مسلموں کو محض تبلیغ دین کی نیت سے دے تو جائز ہے یا نہیں" کے جواب میں آپ نے یہ لکھا ہے کہ " زکوٰۃ کے مصارف میں ایک مصرف فی سبیل اللہ بھی ہے اور تبلیغ دین پر فی سبیل اللہ کا اطلاق بدرجۂ اولیٰ ہوگا۔ اس لیے میرے خیال میں پڑھے لکھے غیر مسلموں کو عام ازیں کہ وہ مالدار ہوں یا نہ ہوں، اُن ایسے ہندی داں مسلمانوں کو جو صاحب نصاب نہ ہوں مستند ہندی ترجمۂ قرآن زکوٰۃ کی رقم سے خرید کر دینا جائز ہوگا" ۔

راقم الحروف کے نزدیک آپ کا یہ جواب خطا پر مبنی ہے۔ مصارف زکوٰۃ جس آیت کریمہ میں بیان کیے گئے ہیں وہ سورۂ توبہ رکوع ۸ کی آیت انما الصدقات للفقراء والمساکین الخ ہے۔ یہ آیت کریمہ جن آٹھ مصارف پر مشتمل ہے ان میں سے ایک مصرف " فی سبیل اللہ" بھی ہے۔ فی سبیل اللہ کے لفظی معنی بہت عام ہیں۔ جو کام اللہ کی رضاجوئی کے لیے

کیے جائیں وہ سب اس میں داخل ہیں۔ جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور ائمہ تفسیر کے ارشادات سے قطع نظر محض لفظی ترجمے سے قرآن سمجھنا چاہتے ہیں ان کو عام طور سے یہ مغالطہ لگا ہے کہ لفظ فی سبیل اللہ کے تحت ان تمام کاموں کو زکوٰۃ کے مصارف میں داخل کر دیا ہے جو کسی حیثیت سے نیکی یا عبادت یا تبلیغ دین میں شامل ہیں لیکن یہ اسلوب قرآن کے لحاظ سے سراسر غلط اور اجماع امت کے خلاف ہے۔

صحابۂ کرام جنھوں نے قرآن شریف کو براہ راست رسول اللہ سے سمجھا، ان کی اسی طرح تابعین کی جتنی تفسیریں اس لفظ کے متعلق منقول ہیں ان میں اس لفظ کو حجاج اور مجاہدین کے لیے مخصوص قرار دیا ہے۔ مبسوط سرخسی میں ہے کہ ایک شخص نے حضور سے فرمایا کہ میں نے اپنا اونٹ "فی سبیل اللہ" وقف کر دیا ہے تو آپ نے حکم دیا کہ اس کو حجاج کے سفر میں استعمال کرو۔ اسی قسم کی روایت سنن ابو داؤد اور نسائی میں بھی ہے۔ ابن جریر اور ابن کثیر جو قرآن کی تفسیر روایت سے کرتے ہیں۔ ان سب نے لفظ "فی سبیل اللہ" کو ایسے مجاہدین اور حجاج کے لیے مخصوص کہا ہے کہ جن کے پاس جہاد یا حج کا سامان نہ ہو۔ فقہائے امت اور ائمہ تفسیر کی تصریحات کے علاوہ اگر اس بات پر بھی غور کیا جائے تو یہ مسئلہ آسانی سے سمجھ میں آ سکتا ہے کہ اگر زکوٰۃ کے مصرف میں اتنا عموم ہوتا کہ ہر قسم کی نیکی اور تبلیغ دین اس میں داخل ہو تو پھر ان آٹھ مصرفوں کا تعین (معاذ اللہ) بالکل فضول معلوم ہوتا ہے۔ معلوم ہوا کہ فی سبیل اللہ کا اطلاق ترجمے سے جو سمجھ میں آتا ہے وہ اللہ کی مراد نہیں ہے بلکہ مراد وہ ہے جو رسول اللہ کے بیان اور صحابہ اور تابعین کی تصریحات سے ثابت ہے اس لیے آپ کا یہ جواب کہ تبلیغ دین پر فی سبیل اللہ کا اطلاق بدرجہ اولیٰ ہوگا لہٰذا قرآن کا مستند ہندی ترجمہ زکوٰۃ کی رقم سے خرید کر غیر مسلم کو دینا جائز ہے۔ راقم الحروف کے نزدیک خطا پر محمول ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسے مسلم کو جو صاحب نصاب نہ ہو قرآن کا ترجمہ زکوٰۃ کی رقم سے خرید کر دینا جائز ہے لیکن یہ فی سبیل اللہ کے تحت نہ ہوگا بلکہ فقراء و مساکین کے تحت داخل ہوگا۔ لفظ فی سبیل اللہ کے تحت صرف حجاج اور غزاۃ ہی داخل ہیں۔ ساتھ ساتھ حیرت تو اس پر ہوتی ہے کہ آپ نے غیر مسلم اور مسلم میں فرق کرتے ہوئے مسلم کے ساتھ یہ قید لگائی ہے کہ وہ صاحب نصاب نہ ہو تو اگر

فی سبیل اللہ کے تحت کا فر مال دار داخل ہو سکتا ہے تو مسلم صاحب نصاب کو بدرجۂ اولیٰ داخل ہونا چاہیے۔ اگر مسلم صاحب نصاب اس لیے داخل نہیں ہو سکتا کہ یہ مسئلہ مسلم ہے کہ مسلم صاحب نصاب کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں تو یہ مسئلہ بھی تو مسلم ہے کہ اگرچہ عام صدقات غیر مسلم کو بھی دیے جا سکتے ہیں لیکن زکوٰۃ غیر مسلم کو دینا جائز نہیں۔ اس لیے کہ حضورؐ نے حضرت معاذ رضؓ کو یمن بھیجتے وقت یہ ہدایت فرمائی تھی کہ مال زکوٰۃ صرف مسلمانوں کے اغنیا سے لیا جائے اور انہیں کے فقرا پر صرف کیا جائے۔ راقم الحروف نے آپ کے جواب کو اپنے نزدیک غلطی پر محمول کرتے ہوئے آپ کو متنبہ کرنا ضروری سمجھا۔ بہت ممکن ہے کہ اس میں اتم الحروف کی ہی غلطی ہو اگر ایسا ہو تو ضرور متنبہ فرمائیں، عنداللہ ماجور ہوں گے۔ ورنہ آپ سے قوی امید ہے کہ آپ اس فتوے سے ضرور رجوع فرمائیں گے۔

جواب

آپ کی تنبیہ پر اظہار خیال سے پہلے دو باتیں عرض کر دوں تو مناسب ہے۔ ایک یہ کہ زندگی کے "رسائل و مسائل" میں جن مسائل کا جواب دیا جاتا ہے اس کی حیثیت "فتوے" کی نہیں ہوتی بلکہ محض اظہار رائے کی ہوتی ہے اور یہ چیز پہلے بھی واضح کی جا چکی ہے۔ دوسری بات یہ کہ مسائل پر اظہار رائے کتابوں کے مطالعے کے بعد کیا جاتا ہے۔

جس مقام سے آپ نے خط لکھا ہے وہاں بہترین مواقع حاصل تھے کہ آپ خود کتابوں کا مطالعہ کر لیتے یا وسیع المطالعہ اساتذہ سے گفتگو کر کے مسئلے کی نوعیت سمجھ لیتے۔ میرا خیال ہے کہ اس کے بعد آپ کی تنبیہ کا رنگ وہ نہ ہوتا جو آپ کے مکتوب میں ہے اور نہ وہ بے دلیل دعوے آپ کے قلم سے نکلتے جو آپ کے مکتوب میں ہیں۔

۱۔ "فی سبیل اللہ" کی تخصیص و تحدید پر اجماع امت کا دعویٰ اور اس مصرف زکوٰۃ عموم کے قول کو اجماع امت کے خلاف کہنا قلت مطالعہ کا نتیجہ ہے۔

۲۔ آپ کی یہ بات بھی صحیح نہیں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے "فی سبیل اللہ" کی تحدید و تخصیص کے لیے کوئی "بیان" منقول ہے۔ مبسوط سرخسی سے جس حدیث کا حوالہ آپ نے دیا ہے وہ ثابت نہیں ہے۔ اور اگر اس حدیث کو کسی درجے میں تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس سے "فی سبیل اللہ

کی تحدید و تخصیص ثابت نہیں ہوتی ۔ اگر آپ صرف فتح القدیر شرح ہدایہ میں اس حدیث پر بحث پڑھ لیتے تو اس کی حقیقت واضح ہو جاتی ۔

مالکی اور شافعی فقہ میں حجاج " فی سبیل اللہ " میں داخل نہیں ہیں حنفی اور حنبلی فقہ میں وہ داخل تو ہیں لیکن دونوں مذہبوں میں یہ ایک ضعیف قول ہے ۔ سنن ابوداؤد اور نسائی میں کوئی ایسی حدیث موجود نہیں ہے جس میں فی سبیل اللہ کی تخصیص و تحدید کی صراحت ہو ۔

۳ ۔ آپ نے لکھا ہے کہ " ابن جریر اور ابن کثیر جو قرآن کی تفسیر روایت سے کرتے ہیں ۔ ان سب نے لفظ فی سبیل اللہ کو ایسے مجاہدین اور حجاج کے لیے مخصوص کیا ہے کہ جن کے پاس جہاد یا حج کا سامان نہ ہو "

آپ کی یہ عبارت پڑھ کر بہت افسوس ہوا آپ نے ابن جریر اور ابن کثیر کو پڑھے بغیر ان کی طرف غلط باتیں منسوب کر دیں ۔ ابن جریر نے تو " وفی سبیل اللہ " کی تفسیر میں حجاج کا سرے سے ذکر ہی نہیں کیا ہے اور ابن کثیر نے صرف اتنا لکھا ہے کہ حدیث کی وجہ سے امام احمد اور حسن اور اسحٰق کے نزدیک حج بھی سبیل اللہ میں داخل ہے ۔ اس کے علاوہ ابن کثیر نے اس لفظ کی تفسیر میں سرے سے کوئی روایت نقل ہی نہیں کی ہے اور ابن جریر نے بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث نقل نہیں کی ہے پھر ان دونوں کی طرف منسوب کرنا کہ جن کے پاس جہاد اور حج کا سامان نہ ہو " ایسا غلط انتساب ہے جس نے بہت برا تاثر پیدا کیا ۔ غزاۃ کو اس مصرف زکوٰۃ سے رقم دینے کے لیے فقر و احتیاج کی شرط فقہ حنفی نے لگائی ہے ۔ ائمہ ثلاثہ ۔ مالک ۔ شافعی ۔ احمد رحمہم اللہ کے مسلک میں یہ شرط نہیں ہے ان سب کے نزدیک مالدار غزاۃ کو بھی اس مد سے رقم دی جاسکتی ہے ۔ آپ جس تعلیم گاہ میں ہیں اس کی بڑی قدر راقم الحروف کے دل میں ہے اور بڑی دل سوزی کے ساتھ آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ بے دلیل دعووں اور غلط انتسابات سے پرہیز کیجیے ورنہ اس تعلیم گاہ کی نیک نامی کو آپ متاثر کر دیں گے ۔

۴ ۔ آپ کا یہ الزام بھی ناواقفیت کی دلیل ہے کہ جو لوگ زکوٰۃ کے مصرف " وفی سبیل اللہ " میں عموم کے قائل ہیں وہ احادیث اور ائمہ تفسیر کے ارشادات سے قطع نظر کر کے محض لفظی ترجمے سے قرآن سمجھنا چاہتے ہیں ۔

آپ نے ان بے دلیل دعووں، غلط انتساب اور بے جا الزام سے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ میں نے

تبلیغ دین کو فی سبیل اللہ میں داخل کر کے غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔ آپ نے یہ سوچنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی کہ میں نے اپنے جواب میں عموم کا پہلو اختیار نہیں کیا ہے جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے ابھی تو میں صرف یہ اشارہ کرنا چاہتا ہوں کہ فی سبیل اللہ کی تخصیص و تعمیم یا عموم و خصوص کی بحث نئی نہیں ہے بلکہ صدیوں سے موجود ہے اور جن لوگوں نے عموم کا قول اختیار کیا ہے وہ بھی معمولی درجے کے لوگ نہیں ہیں۔ یہاں چند حوالے کافی ہوں گے۔

امام رازی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:۔

وفی سبیل اللہ قال المفسرون یعنی الغزاۃ قال الشافعی رحمہ اللہ یجوز لہ ان یاخذ من مال الزکوٰۃ وان کان غنیا وھو مذھب مالک واسحٰق وابی عبید وقال ابوحنیفہ وصاحباہ رحمھم اللہ لا یعطی الغازی الا اذا کان محتاجا واعلم ان ظاھر اللفظ فی قولہ وفی سبیل اللہ لا یوجب القصر علی الغزاۃ فلھذا المعنی نقل القفال فی تفسیرہ عن بعض الفقھاء انھم اجازوا صرف الصدقات الی جمیع وجوہ الخیر من تکفین الموتی وبناء الحصون وعمارۃ المساجد لان قولہ وفی سبیل اللہ عام فی الکل

(تفسیر کبیر ج ۴ ص [illegible])

اور اللہ کی راہ میں مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد غزاۃ ہیں۔ شافعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ غازی کے لیے اگرچہ وہ مالدار ہو یہ جائز ہے کہ وہ مال زکوٰۃ میں سے حاصل کرے اور یہی مالک، اسحاق اور ابو عبید کا مذہب ہے اور ابو حنیفہ اور ان کے صاحبین رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ غازی کو زکوٰۃ نہیں دی جائیگی الا یہ کہ وہ محتاج ہو۔ اور جان لو کہ اللہ کے قول وفی سبیل اللہ میں ظاہر لفظ غزاۃ پر قصر (تحدید) کو ضروری قرار نہیں دیتا اور اسی معنی میں قفال نے اپنی تفسیر میں بعض فقہاء سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے صدقات کو تمام وجوہ خیر میں صرف کرنے کی اجازت دی ہے جیسے مردوں کو کفن دینا قلعے بنانا اور مساجد کی آبادی (مرمت آرائش اور چراغ وغیرہ) اس لیے کہ اللہ کا قول وفی سبیل اللہ سب میں عام ہے۔

واعلم سے آخر تک کی عبارت پر غور کیجیے اگر تخصیص کے قول پر اجماع ہوتا تو کیا امام رازی کے

لیے یہ بات جائز ہوئی کہ وہ بعض فقہا کے خلاف اجماع قول کی تردید کے بجائے اس کی طرف اپنا رجحان ظاہر کریں۔ بعض فقہا کی انھوں نے یہی دلیل تو نقل کی ہے کہ فی سبیل اللہ کا لفظ عام ہے اس لیے تخصیص صحیح نہیں۔ امام رازی نے یہ کیوں نہیں لکھا کہ یہ مسلک احادیث، اجماع امت اور اسلوب قرآن کے خلاف اور قرآن کو لفظی ترجمے سے سمجھنے کی کوشش ہے اس لیے خطا پر مبنی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسی کوئی حدیث موجود نہیں ہے جو فی سبیل اللہ کے مصرف کو غزاۃ یا حجاج کے ساتھ خاص کرنے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی ہو اور جہاں تک اسلوب قرآن کا تعلق ہے تو وہ عموم ہی کی طرف رہنمائی کرتا ہے نہ کہ خصوص کی طرف۔ یہ کون کہہ سکتا ہے کہ قرآن میں یہ لفظ ہر جگہ غزاۃ یا حجاج کے لیے استعمال ہوا ہے بلکہ اس کے برعکس بعض جگہ یہ لفظ بالاتفاق دوسرے امور خیر کے لیے بھی استعمال ہوا ہے اس کی مثال آگے آئے گی۔

امام کاسانی فرماتے ہیں۔

وفی سبیل اللہ عبارۃ عن جمیع القرب فیدخل فیہ کل من سعی فی طاعۃ اللہ وسبیل الخیرات اذا کان محتاجا وقال ابو یوسف المراد منہ فقراء الغزاۃ لان سبیل اللہ اذا اطلق فی الشرع یراد بہ ذالک وقال محمد المراد منہ الحاج المنقطع لما روی ان رجلا جعل بعیراً لہ فامرہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان یحمل علیہ الحاج	اور وفی سبیل اللہ عبارت ہے تقرب الٰہی کے تمام کاموں سے پس اس میں ہر وہ شخص داخل ہے جو اللہ کی طاعت اور نیکیوں کی راہ میں سعی کرے جب کہ وہ محتاج ہو اور ابو یوسف نے کہا کہ اس سے مراد محتاج غازی ہیں اس لیے کہ سبیل اللہ کا لفظ جب عرف شرع میں بولا جاتا ہے تو اس سے مراد یہی ہوتی ہے اور محمد نے کہا کہ اس سے مراد وہ حاجی ہیں جو بے زاد و عاجز ہوگئے ہوں اس لیے کہ روایت کی جاتی ہے کہ ایک شخص نے اپنا اونٹ وقف کیا تو اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ وہ اس پر حاجیوں کو سوار کرے۔

(بدائع ج ۲ ص۴۶)

یہاں دیکھنے کی بات یہ بھی ہے کہ امام کاسانی نے اپنی رائے پہلے بیان کی ہے اور صاحبین کی

اس کے بعد جن حدیث کا انھوں نے حوالہ دیا ہے وہ ثابت نہیں ہے اور جس حدیث سے تخصیص ثابت ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ امام محمد کا قول فقہ حنفی میں ضعیف تسلیم کیا گیا ہے۔

علامہ آلوسی اپنی تفسیر میں غزاۃ و حجاج کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں :۔

وقیل طلبۃ العلم واقتصر علیہ فی الفتاوی الظہیریۃ (روح المعانی)

اور کہا گیا ہے کہ اس سے مراد طلبہ علم ہیں اور فتاویٰ ظہیریہ میں اسی پر اکتفا کیا ہے۔

معلوم نہیں صاحب فتاویٰ ظہیریہ کے بارے میں آپ کیا کہیں گے جنھوں نے غزاۃ و حجاج کو بالکل حذف ہی کر دیا ہے۔ اور شامی نے لکھا ہے کہ امام مرغینانی کے نزدیک بھی "سبیل اللہ" سے طلبہ علم ہی مراد ہیں۔ ان دونوں اماموں کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے غزاۃ و حجاج کے ساتھ طلبۂ علم کو بھی اس میں شامل کیا ہے۔

"الروضۃ الندیہ" میں ہے کہ "فی سبیل اللہ" میں وہ علماء بھی داخل ہیں جو مسلمانوں کے دینی مصالح کی نگرانی کرتے ہیں۔ عام ازیں کہ وہ مالدار ہوں یا محتاج بلکہ صاحب الروضہ ایسے علماء پر اس مد سے زکوٰۃ صرف کرنے کو اہم قرار دیتے ہیں ان کی عبارت یہ ہے :۔

بل الصرف فی ھذہ الجھۃ من اھم الامور لان العلماء ورثۃ الانبیاء وحملۃ الدین وبھم تحفظ بیضۃ الاسلام

[illegible]

بلکہ اس جہت میں صرف کرنا اہم امور میں سے ہے اس لیے کہ علماء انبیاء کے وارث، دین کے حامل اور اسلام و شریعت کے محافظ ہیں

اس قول سے بھی یہ معلوم ہوا کہ صرف غزاۃ و حجاج مراد نہیں ہیں بلکہ علماء بھی اس میں داخل ہیں۔

الاستاذ العلامۃ السید سلیمان ندوی رحمہ اللہ نے سیرت النبی میں "اسلام میں زکوٰۃ کے مصارف ہشتگانہ" کے ذیلی عنوان کے تحت لکھا ہے :۔

"و فی سبیل اللہ (خدا کی راہ میں) ایک وسیع مفہوم ہے جو ہر قسم کے نیک کاموں کو شامل ہے اور حسب ضرورت کبھی اس سے مذہبی لڑائی یا سفر حج یا اور دوسرے نیک کام مراد لیے جا سکتے ہیں"

(سیرت النبی ج ۵ طبع دوم)

اس مسئلے پر انھوں نے ایک حاشیہ بھی لکھا ہے اور وہ یہ ہے :۔

اکثر فقہاء نے فی سبیل اللہ سے مراد صرف جہاد لیا ہے مگر یہ تحدید صحیح نہیں معلوم ہوتی ہے

مَثَلُ الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ — ان لوگوں کی مثال جو اپنے اموال اللہ
فِي سَبِيلِ اللَّهِ (البقرہ ر ۳۶) — کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔

اس آیت میں سبیل اللہ سے مراد کیا ہے؟ مفسر ابن کثیر نے سب سے پہلا قول یہ لکھا ہے :۔

قال سعید بن جبیر یعنی فی طاعۃ اللہ (تفسیر ابن کثیر ج ۱) — سعید بن جبیر نے فرمایا کہ اس سے مراد اللہ کی طاعت ہے۔

علامہ آلوسیؒ لکھتے ہیں :۔

ای فی وجوہ الخیر الشاملۃ للجہاد وغیرہ (روح المعانی) — یعنی وجوہ خیر میں جو جہاد اور غیر جہاد کو شامل ہیں۔

جلالین میں ہے۔ "ای طاعتہ" اس جملے کی شرح میں صاوی لکھتے ہیں۔

ای واجبۃ او مندوبۃ فیشمل الجہاد وطلب العلم والحج والتوسعۃ علی العیال وغیر ذالک وکلما عظمت القربۃ کانت الحسنات فیہا اکثر (صاوی شرح جلالین) — یعنی اللہ کی طاعت واجب ہو یا مستحب لفظ سبیل اللہ جہاد، طلب علم، حج، اہل وعیال پر خرچ میں فراخی اور اس کے علاوہ دوسری نیکیوں کو شامل ہے اور جب قربت وطاعت عظیم ہوگی تو اس میں نیکیاں بھی زیادہ ہونگی

سلیمان جمل مفسر ابو السعود کے حوالے سے لکھتے ہیں :۔

المراد بہا وجوہ الخیر الواجبۃ والمندوبۃ (جمل شرح جلالین) — اس سے مراد واجب اور مستحب وجوہ خیر دونوں ہیں۔

معلوم ہوا کہ سورۂ بقرہ کی اس آیت میں "سبیل اللہ" کا لفظ استعمال ہوا ہے کہ اس میں ہر قسم کی نیکی داخل ہے۔ قابلِ غور پہلو یہ بھی ہے کہ مصارف زکوٰۃ کے زیر بحث مصرف میں اللہ تعالےٰ نے عمومی انداز کیوں اختیار فرمایا اور حرف "فی" کیوں استعمال کیا۔ اگر صرف غزاۃ یا حجاج ہی مراد ہوتے تو وللمجاھدین یا وللحجاج یا اسی قسم کے خاص الفاظ نازل فرما دیے جاتے۔

اب ہمیں تخصیص وتحدید کے قول پر بھی غور کر لینا چاہیے۔ جن فقہائے امت کے نزدیک یہاں فی سبیل اللہ کے لفظ سے مراد جہاد ہے وہ بھی دو گروہوں میں تقسیم ہوگئے ہیں۔ ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ اس سے مراد

آیت گزر چکی۔ للفقراء الذین احصروا فی سبیل اللہ یہاں فی سبیل اللہ سے بالاتفاق صرف جہاد نہیں بلکہ ہر نیکی اور دینی کام مراد ہے۔ اکثر فقہاء نے یہ بھی کہا ہے کہ زکوٰۃ میں تملیک یعنی کسی شخص کی ذاتی ملکیت بنانا ضروری ہے مگر ان کا استدلال جو للفقراء کے لام تملیک پر مبنی ہے، بہت کچھ مشتبہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ لام انتفاع ہو جیسے خلق لکم ما فی الارض جمیعا۔ (سیرت النبی جلد ۵)

سید سلیمان ندوی نے عموم کا قول اختیار کیا۔ اکثر فقہاء کے قول کی تردید کی اور قرآن کی ایک آیت اپنی دلیل میں پیش فرمائی جس میں فی سبیل اللہ کے لفظ سے بالاتفاق صرف جہاد نہیں بلکہ ہر نیکی اور دینی کام مراد ہے۔ مکتوب نگار نے اپنے مکتوب میں یہ بھی لکھا ہے کہ اگر زکوٰۃ کے مصرف میں اتنا عموم ہوتا کہ ہر قسم کی نیکی اور تبلیغ دین اس میں داخل ہو تو پھر ان آٹھ مصرفوں کا تعین (معاذ اللہ) بالکل فضول معلوم ہوتا ہے۔ اس شبہے کا جواب بھی سید سلیمان ندوی سے سنیے، وہ لکھتے ہیں:۔

"یہ آٹھوں مصارف نیکی بھلائی اور خیر و فلاح کی ہر قسم اور ہر صنف کو محیط ہیں۔

(سیرت النبی جلد ۵)

کس قدر بون بعید ہے آپ کے خیال اور سید سلیمان ندوی کے خیال میں۔ ان کا اور دوسرے بہت سے اہل علم و فضل کا خیال یہ ہے کہ ان آٹھ مصارف میں "فی سبیل اللہ" کی مد رکھنے کا مقصد یہ ہے کہ مصارف زکوٰۃ مسلمانوں کے تمام اجتماعی و انفرادی خیر و فلاح پر حاوی ہو جائیں اور آپ کہتے ہیں کہ اگر اس مصرف میں عموم کا پہلو اختیار کیا جائے تو ان مصارف کا تعین ہی فضول ہو جائے۔ سید صاحب نے اپنے خیال کی یہ دلیل پیش کی ہے کہ قرآن میں دوسری جگہ سبیل اللہ کا لفظ ہر قسم کی نیکی کے لیے استعمال ہوا ہے اور آپ نے اپنے خیال کی یہ وضاحت بھی نہیں کی کہ عموم کے قول کی بنا پر ان آٹھ مصارف کا تعین کیوں فضول ہو جائے گا؟

یہ آپ بھی مانتے ہوں گے کہ سید سلیمان ندوی اسلوب قرآن سے بھی واقف تھے اور احادیث پر بھی ان کی نظر وسیع تھی۔ اگر کسی صحیح حدیث سے اس مصرف کی تخصیص ثابت ہو رہی ہوتی تو وہ عموم کے پہلو کو کبھی ترجیح نہ دیتے۔

فی سبیل اللہ کی ایک اور مثال پیش خدمت ہے۔ سورہ بقرہ کے اخیر میں ہے:۔

غزاۃ یعنی راہ خدا میں لڑنے والے اشخاص و افراد ہیں۔ زکوٰۃ کے اس مصرف سے صرف انہیں کو ضرورت دیا جائے گا تاکہ وہ اپنی جنگی ضروریات پوری کریں۔ دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ صرف غزاۃ نہیں ہیں بلکہ جہاد فی سبیل اللہ کے لیے جتنی چیزیں ضروری ہوں گی وہ سب اس میں داخل ہیں۔ مثال کے طور پر حکومت اس مد سے اسلحے اور گھوڑے خرید سکتی ہے تاکہ بوقت ضرورت انہیں قتال فی سبیل اللہ میں استعمال کیا جا سکے۔ اس گروہ کے نزدیک اس مد سے اس کافر کو بھی رقم دی جا سکتی ہے جو جاسوسی کی خدمت انجام دے۔ قاضی ابن رشد لکھتے ہیں:۔

واما فی سبیل اللہ فقال	اور رہا فی سبیل اللہ تو مالک نے کہا
مالک سبیل اللہ مواضع الجہاد	کہ سبیل اللہ جہاد و رباط کے مواضع ہیں اور
والرباط وبہ قال ابوحنیفۃ (بدایۃ المجتہد)	یہی قول ابوحنیفہ کا ہے۔

ظاہر ہے کہ مواضع جہاد و رباط میں وہ تمام چیزیں داخل ہوں گی جو ان دونوں کے لیے ضروری ہیں۔ مثال کے طور پر سرحد کی حفاظت کے لیے اس مد سے فوجی قلعے بھی تعمیر کیے جا سکیں گے۔ یہاں ابن رشد نے امام ابوحنیفہ کی طرف جو قول منسوب کیا ہے وہ فقہ حنفی کی کتابوں میں میری نظر سے نہیں گزرا ممکن ہے ابن رشد کو ایسی کوئی روایت پہنچی ہو۔ اس سلسلے میں مالکیہ کے مذہب کی مزید تفصیل یہ ہے:۔

والمجاهد یعطی من الزکوٰۃ ان	اور مجاہد کو زکوٰۃ میں سے دیا جائے گا۔
کان حرا مسلما غیر ہاشمی ولو غنیا	اگر وہ آزاد مسلمان ہو، ہاشمی نہ ہو اگرچہ مالدار
ویلحق بہ الجاسوس ولو کافرا فان	ہو اور جاسوس بھی اس سے ملحق ہے اگرچہ وہ
کان مسلما فشرطہ ان یکون حرا	کافر ہو پس اگر جاسوس مسلمان ہے تو اس کی شرط
غیر ہاشمی وان کان کافرا	یہ ہے کہ آزاد ہو اور ہاشمی نہ ہو اور اگر کافر
فشرطہ الحریۃ فقط ویصح ان	ہے تو اس کی شرط صرف آزادی ہے اور صحیح
یشتری من الزکوٰۃ سلاح و	ہے کہ زکوٰۃ سے جہاد کے لیے ہتھیار اور گھوڑے
خیل للجہاد ولتکن نفقۃ الخیل	خریدے جائیں اور گھوڑوں کا خرچ بیت المال
من بیت المال (الفقہ علی المذاہب الاربعۃ)	کے ذمے ہونا چاہیے۔

معلوم ہوا کہ مالکیہ کے نزدیک "فی سبیل اللہ" کا لفظ اسلامی مملکت کی حفاظت اور جہاد فی سبیل

کی تمام ضروریات پر حاوی ہے۔

السید رشید رضا نے تفسیر المنار میں ائمۂ فقہ کے مذاہب پر مفصل بحث کرنے کے بعد اپنی جو تحقیق پیش کی ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ ان کے نزدیک یہاں "سبیل اللہ" سے مراد اشخاص و افراد نہیں ہیں بلکہ اس سے مسلمانوں کے وہ مصالح عامہ مراد ہیں جن پر امورِ دین و دولت یعنی مذہب اور حکومت کی اصلاح کا دارومدار ہے اسلام اور اسلامی حکومت کا استحکام جن مصالحِ شرعیہ پر موقوف ہے ان میں سے کوئی مصلحت ایسی نہیں ہے جو سبیل اللہ کے دائرے سے خارج ہو۔ زکوٰۃ کی اس مد سے استعداد للحرب کی تفصیل انھوں نے لکھی ہے جس میں فوجی سڑکوں، ریلوے، قلعوں اور خندقوں کی تعمیر بھی داخل ہے۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:-

ومن اہم ما ینفق فی سبیل اللہ فی زماننا ھذا اعداد الدعاۃ الی الاسلام وارسالھم الی بلاد الکفار من قبل جمعیات منظمۃ تمدھم بالمال الکافی کما یفعلہ الکفار فی (المنار ج ۱۰ [illegible])	اور ہمارے زمانے میں فی سبیل اللہ کے مصرف میں سب سے اہم خرچ اسلام کے داعیوں کو تیار کرنا اور ان کو بلادِ کفار میں بھیجنا ہے ایسی منظم جماعتوں کی طرف سے جو انہیں کافی مال دیں جیسا کہ کفار اپنے دین کو پھیلانے میں کرتے ہیں

سید رشید رضا نے تبلیغ دین کو نہ صرف یہ کہ فی سبیل اللہ میں داخل مانا بلکہ اس مصرف پر خرچ کرنے کو اہم قرار دیا ہے۔ اس مسئلے میں ان کا مسلک مالکیہ کے مسلک سے قریب ہے۔ اس لیے کہ مواضع جہاد کا سب سے پہلا موضوع تبلیغ دین ہی ہے۔ حرب و قتال کا موضع اس کے بعد آتا ہے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے:-

ویدخل فیہ النفقۃ علی المدارس للعلوم الشرعیۃ وغیرھا مما تقوم بہ المصلحۃ العامۃ وفی ھذہ الحالۃ یعطی منھا معلمو ھذہ المدارس ما داموا یؤدون وظائفھم المشروعۃ التی ینقطعون بھا عن کسب آخر ولا یعطی عالم غنی لاجل علمہ	اور اس میں ان مدارس پر خرچ کرنا بھی داخل ہے جن میں علوم شرعیہ اور مصلحت عامہ کو پورا کرنے والے غیر شرعی علوم پڑھائے جائیں اور اس حالت میں زکوٰۃ سے ان مدارس کے معلمین کو دیا جائے گا جب تک وہ اپنے ان مقرر کردہ فرائض کو انجام دیتے رہیں جن کی وجہ سے وہ کوئی دوسرا ذریعۂ معاش

دان حـاـت یلیں الناس	اختیار نہیں کرسکتے اور کسی مالدار عالم کو زکوٰۃ
بـاب	نہیں دی جائے گی اگرچہ وہ اپنے علم سے لوگوں
(المنار ج ۱۰)	کو فائدہ پہنچا رہا ہو۔

رشید رضا مرحوم ومغفور ان علماء میں ہیں جنھوں نے تخصیص کا پہلو اختیار کیا ہے لیکن ان کے
یک فی سبیل اللہ سے مراد صرف لڑنے والے اشخاص وافراد نہیں ہے بلکہ اس سے مراد مسلمانوں
وہ مصالح عامہ ہیں جن پر مذہب اور حکومت کی حفاظت اور ان کا ارتقاء واستحکام موقوف ہے
اسی پہلو سے مدارس کو بھی انھوں نے فی سبیل اللہ کی مد میں داخل کیا ہے :۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے ترجمان القرآن میں فی سبیل اللہ کے ترجمے کے بعد قوسین میں جو عبارت
ائی ہے اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک اس سے مراد صرف غزاۃ نہیں ہیں بلکہ اعلائے
ۃ الحق کے تمام کام اس میں داخل ہیں ان کی عبارت یہ ہے :۔

اور اللہ کی راہ میں (یعنی جہاد کے لیے اور ان تمام کاموں کے لیے جو مثل جہاد کے اعلاء
کلمہ حق کے لیے ہوں)

تبلیغ دین یقیناً اور بلاشبہ اعلائے کلمۂ حق کے کاموں میں داخل ہے بلکہ یہ قتال فی سبیل اللہ کا
ین مرحلہ ہے۔ اس لیے میں نے تبلیغ دین کو فی سبیل اللہ میں داخل کرکے کوئی غلطی نہیں کی ہے بلکہ تبلیغ دین
ر جہاد اور اعلائے کلمۂ حق کے کاموں سے خارج کرنا مبنی بر خطا ہے۔

آپ نے لکھا ہے کہ یہ مسئلہ بھی تو مسلم ہے کہ غیر مسلم کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں۔ آپ کی یہ بات جزوی
ر پر صحیح ہے لیکن آپ نے غور نہیں کیا کہ کیا چیز مسلمہ ہے۔ صرف اتنی بات مسلمہ ہے کہ غیر مسلم کو غیر مسلم
ہونے یا محض محتاج ہونے کی وجہ سے زکوٰۃ نہیں دی جائے گی لیکن مصارف ثمانیہ کی بعض دوسری
دوں سے ان میں سے کسی کے پاس زکوٰۃ کی رقم پہنچ جائے تو یہ ناجائز نہیں ہے۔ مثال کے طور پر
مؤلفۃ القلوب" کی مد سے کسی ایسے کافر کو رقم دی جاسکتی ہے جس کا اسلام سے قریب آنا یا اس کے
ر سے مسلمانوں کا محفوظ رہنا متوقع ہو یا "فی الرقاب" کے مصرف سے کوئی غلام کسی کافر آقا سے
ید کر آزاد کیا جائے تو زکوٰۃ کی رقم اس کو پہنچ سکتی ہے، یا "فی سبیل اللہ" کی مد سے جنگ کی تیاری
ے لیے کافروں سے اسلحہ اور گھوڑے خریدے جائیں تو زکوٰۃ کی رقم ان کو پہنچ سکتی ہے۔

اسی طرح مال دار مسلمان، مال دار ہونے کی وجہ سے مستحق زکوٰۃ نہیں ہے لیکن بالواسطہ یا بعض مصارف
زکوٰۃ کی مد سے اس کو زکوٰۃ دی جا سکتی ہے۔ مثلاً کسی مال دار مسلمان آقا سے غلام خرید کر آزاد کیا
جائے تو زکوٰۃ کی رقم اس کو پہنچ سکتی ہے یا کسی مال دار مسلمان غازی کو فی سبیل اللہ کی مد سے رقم دینا ائمہ
ثلاثہ کے نزدیک جائز ہے۔ حضرت معاذؓ والی حدیث نے فقرا و مساکین کے علاوہ دوسرے مصارف
زکوٰۃ کو منسوخ نہیں کیا ہے۔

اوپر جو صورتیں ذکر کی گئیں ان میں زکوٰۃ کی رقم اگرچہ کسی کافر یا کسی مال دار مسلمان کو ملتی ہے مگر
اس کا اصل فائدہ اسلام اور مسلم معاشرے کو پہنچتا ہے۔ زکوٰۃ کے آٹھ مصارف میں متعدد مصارف کا
تعلق مسلم معاشرے کے مصالح عامہ سے ہے، متعین اشخاص و افراد سے نہیں۔

سائل نے غیر مسلموں کے بارے میں یہ پوچھا تھا کہ ان کو زکوٰۃ کی رقم سے ہندی ترجمۂ قرآن دیا جا سکتا
ہے یا نہیں؟ میں نے جواب میں "اور ایسے ہندی داں مسلمانوں کو جو صاحب نصاب نہ ہوں" کا ٹکڑا
اپنی طرف سے بڑھا دیا تھا اور ذہن میں یہ بات تھی کہ مال دار مسلمان اپنی زکوٰۃ سے ضرورت مند
مسلمانوں کی دنیوی حاجتیں پوری کرنے کا تو خیال رکھتے ہیں لیکن ان کی دینی ضرورتیں پوری کرنے کی طرف
دھیان نہیں دیتے۔ مقصد یہ تھا کہ ان کی توجہ ادھر بھی مبذول ہو اس کا تعلق فی سبیل اللہ کی مد سے
نہ تھا مگر جس جگہ یہ عبارت لکھی گئی ہے اس کے لحاظ سے آپ کی گرفت صحیح ہے اور اب میں نے اس ٹکڑے
کو اپنے جواب سے حذف کر دیا ہے۔

تنظیم کیسے مستحکم ہو؟

(مولانا سید جلال الدین عمری)

تنظیم کو طاقت اندر سے ملتی ہے۔ اگر تنظیم داخلی طور پر مضبوط ہے تو اسے ختم کرنا آسان نہیں ہے لیکن جو تنظیم اندر سے کھوکھلی ہو وہ بغیر کسی مزاحمت کے بھی ختم ہو سکتی ہے۔ تنظیم کا حقیقی سرمایہ اس سے وابستہ افراد ہیں۔ جو شخص تنظیم سے باہر ہے وہ اس کا خیر خواہ تو ہو سکتا ہے لیکن اس کا حقیقی سرمایہ نہیں بن سکتا۔ اس لیے تنظیم کو باقی رکھنا، اسے مضبوط بنانا اور اسے ترقی دینا تنظیم سے باہر کے افراد کا کام نہیں ہے، بلکہ ان لوگوں کا فرض ہے جو اس میں داخل ہیں۔ ہر وہ شخص جو کسی تنظیم سے وابستہ ہو اس کے استحکام کا ذریعہ نہیں بن جاتا بلکہ ان ہی افراد سے تنظیم کو طاقت ملتی ہے جن میں کچھ خصوصیات ہوں۔ یہاں میں ان ہی خصوصیات کو بیان کرنا چاہتا ہوں لیکن میری گفتگو بالکل عام نہیں ہوگی، بلکہ میرے مخاطب اس وقت صرف وہ افراد ہیں جن کا تعلق اس ملک میں ایک ایسی تنظیم سے ہے جو خدا کے دین کی کامل اتباع اور اس کی ہمہ جہتی دعوت کے لیے وجود میں آئی ہے۔

اجتماعیت کا احساس

قرآن نے مسلمانوں کو ہدایت کی ہے:۔

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا	سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑو
وَلَا تَفَرَّقُوا	اور الگ الگ نہ ہو جاؤ۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

علیکم بالجماعۃ وایاکم والفرقۃ — جماعت کو مضبوطی سے پکڑے رہو اور گروہ گروہ ہونے سے بچو۔

اس سے معلوم ہوا کہ خدا اور اس کے رسول نے مسلمانوں کے لیے انفرادی زندگی پسند نہیں کی ہے بلکہ اجتماعی زندگی پسند کی ہے۔ ان کو مختلف جماعتوں میں تقسیم نہیں کیا ہے بلکہ ایک جماعت بنایا ہے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ مسلمان عرصہ دراز سے اس ہدایت کو بھلائے بیٹھے ہیں۔ وہ ایک ملت تھے لیکن گروہوں میں بٹ گئے۔ ان کو ایک منظم جماعت ہونا چاہیے تھا لیکن وہ منتشر اور پراگندہ ہو گئے اس کی وجہ صرف ایک ہے وہ یہ کہ ان کو جوڑنے اور متحد کرنے والی چیز خدا کی کتاب تھی۔ اس کتاب کو انھوں نے اپنی زندگی سے خارج کر دیا۔ اس کے ساتھ انھوں نے اس طرح سلوک کیا جیسے وہ ان کے لیے نہیں ہے۔ خدا کا حکم تھا کہ وہ اپنے اختلافات میں اس کتاب کو حکم بنائیں لیکن انھوں نے اپنے اختلافات کے حل کے لیے وہ سب طریقے اختیار کیے جو دنیا والے اختیار کرتے ہیں اور اس کتاب کی طرف رجوع نہیں کیا۔

۔ان کو حکم تھا کہ وہ اپنی پوری زندگی خدا کی کتاب کے مطابق ڈھالیں لیکن انھوں نے زندگی کی تعمیر کے لیے خدا کے دشمنوں کے بتائے ہوئے طریقے اختیار کیے اور اس کی کتاب کے احکامات چھوڑ دیے ان کو ہدایت تھی کہ عبادت، اخلاق، معاشرت، حکومت غرض ہر کام میں خدا کی کتاب کو راہنما بنائیں۔ لیکن انھوں نے ان تمام معاملات میں اپنے نفس کی، خاندان اور قبیلے کی رسم و رواج کی اور اقتدار پرست حکمرانوں کی اتباع کی اور خدا کی کتاب کو نظر انداز کر دیا۔ ان حالات میں آپ خدا کی کتاب کی بنیاد پر جمع ہوئے ہیں اور مل جل کر اس کی رسی کو مضبوط پکڑنے کا عزم کیا ہے۔ یہ بہت بڑی سعادت ہے جو آپ کو ملت کے اس دور انتشار میں ملی ہے۔ اس کی دل سے قدر کرنا اور اس کو مضبوط بنانا آپ کا فرض ہے۔

آپ کی اجتماعیت کا ایک دوسرا رخ بھی ہے۔ وہ یہ کہ آپ خدا کی کتاب کے ذریعے صرف اپنی زندگی ہی سنوارنا نہیں چاہتے۔ بلکہ دنیا کی ہدایت بھی چاہتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ مسلمان گو کہ خدا کے دین سے بہت دور ہیں لیکن اس کے باوجود آج بھی ان میں خدا کی عبادت اور اس کے دین کی خدمت کرنے والے موجود ہیں۔ ان میں جس چیز کی کمی ہے وہ یہ ہے کہ ان میں اجتماعیت نہیں ہے۔ وہ اس حقیقت کو بھولے

رہتے ہیں کہ انہیں متحد و متفق ہو کر خدا کے دین پر قائم رہنا اور اس کی خدمت کرنا ہے۔ اسی وجہ سے ان کی خدمات کے وہ نتائج نہیں نکل سکے جو فی الواقع نکل سکتے تھے۔ آج بدی اس قدر منظم اور طاقتور ہے کہ کوئی بڑی سے بڑی شخصیت بھی تنہا اسے ختم نہیں کر سکتی۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ نیکی کو بھی منظم کیا جائے۔ یہی کام آپ کرنا چاہتے ہیں۔

جب خدا کے دین کے خادم بکھرے ہوئے ہیں آپ نے دین کی خدمت کے لیے اجتماعیت کا فیصلہ کیا ہے اور جب آپ کے چاروں طرف بدی منظم ہے تو آپ نیکی کے لیے منظم ہوئے ہیں۔ آپ کا یہ اقدام خدا اور اس کے رسول کی مرضی کو پورا کر رہا ہے۔ اس پر خدا کا شکر ادا کیجیے اور استقامت کی دعا کیجیے۔

آپ ایک ایسی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں جو دین کی خدمت کے لیے وجود میں آئی ہے، جو دنیا سے شر کو مٹانا اور خیر کو پھیلانا چاہتی ہے۔ اس کو کسی بھی پہلو سے نقصان پہنچانا دین کو نقصان پہنچانا ہے۔ اس لیے کوئی بھی کام کرنے سے آپ کو یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ جماعت کے لیے نقصان دہ تو نہیں ہے۔ اگر آپ اپنے کاموں میں جماعت کے نفع و نقصان کو بھول جائیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے اندر اس تنظیم کی اہمیت کا احساس نہیں ہے۔

جماعت اس وقت مضبوط ہوتی ہے جب کہ افراد کو اس کے استحکام کی فکر ہو۔ یہ فکر اجتماعیت کے احساس سے پیدا ہوتی ہے۔ اجتماعیت کا احساس جتنا زیادہ ہوگا جماعت سے تعلق بھی اسی قدر مضبوط ہوگا اگر یہ احساس کم ہو جائے تو جماعت سے تعلق بھی کمزور ہو جائے گا۔ اجتماعیت کا احساس زندہ اور قوی ہے تو آدمی نہ صرف یہ کہ جماعت کی خاطر بڑے سے بڑا نقصان برداشت کر لیتا ہے بلکہ وہ ہر اس کوشش کو پوری قوت سے ناکام بنا دیتا ہے جو جماعت کے شیرازے کو منتشر کرنے والی ہے۔ لیکن اگر اجتماعیت کے احساس کی کمی ہے تو معمولی بات پر بھی آدمی جماعت سے الگ ہو جانا چاہتا ہے بلکہ اگر یہ احساس ختم ہو جائے تو انسان جماعتی پابندیوں سے گھبرا کر جماعت سے علیحدگی کے لیے بہانے تلاش کرنے لگتا ہے۔

چنانچہ بعض لوگ جب کوئی بات اپنے مزاج کے خلاف دیکھتے ہیں یا جماعت کا کوئی فیصلہ ان کی رائے اور خواہش کے علی الرغم ہوتا ہے تو وہ جماعت سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ گویا جماعت کے

ساتھیوں کی رفاقت اور [illegible] کے مطابق ہوں۔ وہ کسی شخصیت کو جماعت کی رائے کے مقابلے میں جھکا نہیں سکتے، بلکہ جماعت کو ان کی رائے اور فیصلے کے سامنے جھک جانا چاہیے۔ اگر جماعت کا ہر فرد اس چیز کا مطالبہ کرنے لگے تو جماعت نہ کوئی فیصلہ کر سکتی ہے اور نہ کسی معاملے میں اقدام اس کے لیے ممکن ہے۔

بعض لوگوں کو جماعت سے علیحدگی کے لیے اتنی بات کافی ہوتی ہے کہ ان کو فلاں شخص سے شکایت ہے۔ اگر ان کی اس شکایت کو صد فی صد درست بھی کہا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جماعت کے لیے کسی غلط رویے یا کسی کی سخت کلامی کو بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ ایسے لوگ قطعاً اس قابل نہیں ہیں کہ کسی جماعت کے ہم رکاب ہوں۔ وہ جماعت کے لیے بوجھ ہیں۔ ان کا جماعت سے الگ ہونا خود جماعت کے لیے مفید ہے۔

یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بعض لوگ اپنی شخصی خامیوں کو جماعت کی طرف منسوب کر کے جماعت سے بے زاری کا اعلان کر دیتے ہیں۔ مثلاً اگر ان میں جماعتی مقصد سے انحراف ہے تو اسے وہ اپنی غلطی سمجھنے کے بجائے جماعت کو اپنے مقصد سے منحرف قرار دیں گے۔ اگر ان میں بے عملی ہے ——— تو اس بے عملی کو دور کرنے کے بجائے جماعت ہی کو بے عمل ثابت کریں گے۔ اگر ان میں تقوے، نیکی اور دیانت و امانت کی کمی ہے تو بجائے اپنی اصلاح کے پوری جماعت ہی کو خدا کے خوف سے بے نیاز اور دیانت و امانت سے خالی ثابت کریں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے شخص کو اپنی اصلاح کی فکر سے زیادہ جماعت کو بدنام کرنے کی فکر ہے۔ حالانکہ اگر وہ اپنی اصلاح کر سکیں تو یہ ان کی ذات کے لیے بھی بہتر ہے اور اس جماعت کے لیے بھی جس سے وہ وابستہ ہیں۔

یہ تمام خرابیاں نتیجہ ہیں اس بات کا کہ آدمی میں اجتماعیت کا احساس نہیں ہے اور اگر ہے تو بہت کم ہے۔ اگر اجتماعیت کا شدید احساس ہو اور دین کی خدمت کے لیے انسان اجتماعیت کو ضروری سمجھتا ہو تو وہ اس نعمت کی قدر کرے گا کہ اسے اجتماعیت مل رہی ہے۔ وہ کبھی بھی اس سے بھاگنے کی کوشش نہیں کرے گا بلکہ اس کی کوشش ہوگی کہ وہ ہر حال میں اس سے وابستہ رہے۔ اگر اس میں کوئی ایسی خامی ہے جس کی وجہ سے وہ اس جماعت کے لیے موزوں نہیں ہے تو [illegible] کو دور کرنے کا [illegible] اور کبھی کوئی ایسا اقدام نہیں کرے گا جس سے ایک اچھی تنظیم [illegible]

کے بغیر اس کی عدالت کے لیے آتا ہے ۔

اطاعتِ امر

ہر تنظیم اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اس کا کوئی سربراہ ہو ۔ بغیر سربراہ کے آپ تنظیم کا تصور نہیں کر سکتے کوئی بھی تنظیم اسی وقت وجود میں آتی ہے جب کچھ لوگ کسی کو اپنا حاکم مانیں اور اس کی اطاعت کے لیے آمادہ ہو جائیں ۔ تنظیم کا فطری تقاضا یہ ہے کہ حاکم جو حکم دے تنظیم کے افراد اس کی اطاعت کریں ۔ اگر تنظیم کا کوئی فرد اپنے سربراہ کا حکم نہ مانے تو تنظیم اسے برداشت نہیں کر سکتی ۔ کیونکہ اسے برداشت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ تنظیم ختم ہو گئی اور اب اس میں کوئی حکم دینے والا اور کوئی حکم کا ماننے والا نہیں رہا ۔

ہر تنظیم کے کچھ اصول و نظریات ہوتے ہیں جن کے لیے وہ وجود میں آتی ہے اور عمل کرتی ہے تنظیم کے سربراہ کا فرض ہے کہ خود بھی ان اصول و نظریات پر عمل کرے اور دوسروں کو بھی ان پر چلنے دے جب تک وہ یہ کام کر رہا ہے تنظیم کے ہر فرد کو اس کے ہر حکم کی اطاعت کرنی چاہیے ۔ خواہ وہ اسے پسند ہو یا ناپسند ، خواہ وہ اس کے رجحان کے خلاف ہو یا موافق ۔ بلکہ بعض اوقات اس کے سامنے بہت سی چیزیں ایسی بھی آئیں گی جن کو وہ اپنی ذات کے لیے نہیں بلکہ جماعت کے لیے بھی مضر سمجھے گا ۔ اگر یہ چیزیں ان اصول و نظریات کے تحت ہیں جن پر تنظیم کی اساس ہے تو اسے ان چیزوں کو بھی گوارا کرنا ہو گا ۔ امیر یا سربراہ کی اطاعت سے انحراف کا حق صرف اسی وقت اسے حاصل ہے جب کہ اس کا کوئی حکم ان اصول و نظریات کے صریح خلاف ہو جس کے لیے تنظیم وجود میں آئی ہے ۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ۔

"مسلمان کو اپنے حاکم کی اطاعت کرنی چاہیے ۔ خواہ وہ اس کو پسند ہو یا ناپسند جب تک کہ اس کو معصیت کا حکم نہ دیا جائے ۔ اگر معصیت کا حکم دیا جائے تو اس کے لیے سمع و اطاعت نہیں ہے ۔"

حجۃ الوداع کے موقع پر آپ نے فرمایا :۔

"تمہارا حاکم اگر کوئی غلام بھی ہو جو اللہ کی کتاب سے تم پر اس کی اطاعت کرو اگر وہ تم کو خدا کی کتاب کے مطابق چلائے ۔"

عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں :

"ہم نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی کہ ہم اپنے امیر کا حکم سنیں گے اور اس کی اطاعت کریں گے۔ خواہ ہم اس کے حکم سے خوش ہوں یا ناخوش، خواہ ہم راحت میں ہوں یا تکلیف میں اور خواہ ہمیں نظر انداز کیا جائے اور ہمارے مقابلے میں دوسروں کو ترجیح دی جائے۔

ہم نے اس بات کی بھی بیعت کی کہ ہم اپنے حاکم سے حکومت چھیننے کی کوشش نہیں کریں گے۔

آپ نے فرمایا کہ ہاں اگر تم اس سے صریح کفر دیکھو جس کے کفر ہونے پر تمہارے پاس خدا کی طرف سے کوئی دلیل ہو تو تمہیں اس سے حکومت چھیننے کا بھی حق ہے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان کے لیے دیکھنے کی بات صرف یہ ہے کہ اس کے حاکم کا کوئی حکم خدا اور رسول کے حکم کے خلاف ہے یا نہیں؟ اگر خلاف نہیں ہے تو یقیناً اس کی اطاعت اس کے لیے فرض ہے لیکن اگر اس کا حکم خدا اور اس کے رسول کے حکم کے خلاف ہے تو وہ قطعاً اس کی اطاعت نہیں کرے گا بلکہ اس کو اس کے منصب سے ہٹا دے گا۔

ان حدیثوں میں جس حاکم کا ذکر ہے وہ مسلمان حاکم ہے جس کے ہاتھ میں اقتدار و حکومت ہو اور جو مسلمانوں کے دینی و دنیوی معاملات میں ان کی صحیح قیادت کا ذمہ دار ہو۔ یہاں کسی مسلم جماعت کا وہ راہنما مراد نہیں ہے جس کو سیاسی اقتدار حاصل نہیں ہے۔ لیکن ان حدیثوں سے اس تعلق کی نوعیت ظاہر ہوتی ہے جو مسلمان حاکم اور مسلمان محکوم کے درمیان ہونی چاہیے۔ مسلمانوں کا سیاسی حاکم قوت کے ذریعہ ان پر اپنا حکم نافذ کر سکتا ہے لیکن سیاسی اقتدار کے بغیر جو شخص ان کا حاکم ہوگا اس کے لیے بزور ان پر اپنا حکم چلانا ممکن نہیں ہے۔ اس کا اثر بالکل اخلاقی ہوگا۔ لیکن جب کوئی شخص کسی کو یہ حیثیت دے دے کہ وہ اس کا دینی رہنما ہے تو جب تک اس کی رہنمائی دین کے خلاف نہ ہو اس کے لیے اس کی اطاعت ضروری ہے۔ ورنہ یہ اس عہد کی خلاف ورزی ہوگی جو اس نے اپنے راہنما سے کیا ہے۔ ایک مسلمان کے لیے [illegible] ہے کہ وہ کسی شخص کو [illegible] حاکم قرار دے اور بغیر کسی سیاسی [illegible] اس لیے اس کی اطاعت کرتا ہے کہ خدا نے جماعتی زندگی کو پسند کیا ہے اور جماعت کے [illegible] دین کی صحیح خدمت نہیں ہو سکتی۔ [illegible] بہت [illegible] لیکن جو لوگ دین کی خدمت کے لیے [illegible] جمع ہو گئے ہیں ان کو [illegible] کامیاب ہو

...کے ... ناکامیاب نہیں ہوسکتے۔

حسنِ ظن

آپ جانتے ہیں شریعت نے بدگمانی سے منع کیا ہے۔ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ (کیوں کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں) قرآن کے الفاظ میں اہلِ ایمان بھائی بھائی ہیں۔ بھائیوں کے درمیان جس قسم کا تعلق مطلوب ہے اس کی بنیاد حسنِ ظن ہے۔ اگر حسنِ ظن ختم ہو جائے تو بھائی بھائی کا دشمن بن جاتا ہے اور باپ کو بیٹے پر اعتماد نہیں رہتا۔ حقیقت یہ ہے کہ حسنِ ظن سے بگڑے ہوئے تعلقات سنورتے ہیں اور بدگمانی سے اچھے تعلقات خراب ہوتے ہیں۔

ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان پر اصولاً اعتماد ہونا چاہیے۔ وہ اس کو اپنا خیرخواہ، رازدار، ہمدرد اور امین تصور کرے اور اس کی طرف سے اپنی جان و مال اور اپنی عزت و آبرو کے لیے کوئی خطرہ نہ محسوس کرے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "مسلمان مسلمان کا بھائی ہے وہ نہ تو اس پر ظلم کرتا ہے، نہ اس کو چھوڑتا ہے اور نہ اس کی تحقیر کرتا ہے۔ ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کی ہر چیز حرام ہے، اس کا خون بھی، اس کا مال بھی اور اس کی عزت و آبرو بھی"۔ یہ اعتماد حسنِ ظن سے پیدا ہوتا ہے اور بدگمانی اس اعتماد کو ختم کر دیتی ہے۔

جب کوئی شخص کسی سے بدگمان ہو جائے تو اس کی ہر چیز اسے کھٹکنے لگتی ہے۔ کبھی یہ بدگمانی اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ آدمی جس شخص سے بدگمان ہو اس کی تقریر کو، اس کی تحریر کو، اس کی بات چیت کو، اس کی سعی و جہد کو، غرض اس کی ہر حرکت کو اس نظر سے دیکھنے لگتا ہے کہ وہ اسے نقصان پہنچانے کی تدبیر ہے۔ وہ پہلے سے اپنے ذہن میں یہ مفروضہ قائم کر لیتا ہے کہ اس کی ہر بات اور ہر کام لازماً اس کے خلاف ہوگا۔ پھر وہ اسی مفروضے کے تحت اس شخص سے اپنا رویہ متعین کرتا ہے۔ جب یہ بیماری کسی جماعت میں پیدا ہوتی ہے تو اس کے نظم کو درہم برہم کر کے رکھ دیتی ہے۔ ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ گویا جماعت کا ہر فرد دوسرے کے خلاف سازش کر رہا ہے اور جماعت کسی اونچے مقصد کے لیے مصروفِ عمل نہیں ہے، بلکہ اس کا کام صرف یہ ہے کہ اپنے ساتھیوں کے خلاف سازش تیار اور انھیں بدنام و رسوا کرے۔ یہ چیز جماعت کے وقار اور اس کے کام کو ختم کر کے رکھ دیتی ہے۔

جماعت کے اندر ایسی فضا ہونی چاہیے کہ ہر شخص دوسرے کو اپنا محسن، دوست، بہی خواہ اور ہمدرد خیال کرے۔ یہ فضا حسنِ ظن کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ جماعت کا کوئی بھی فرد کسی فرد کو برا نہ تصور کرے بلکہ نیک سمجھے۔ اگر اس کے خلاف اس تک کوئی بات پہنچے تو فوراً اس پر یقین نہ کرلے بلکہ اس کی کوئی اچھی سی تاویل کر دے، یا اس کو بیان کرنے والے کی غلط فہمی سمجھ کر نظر انداز کر جائے۔ کسی شخص کی خامیوں کے بارے میں اس کو معلومات حاصل کرنا ضروری ہو تو جب تک قطعی معلومات حاصل نہ ہوں ان خامیوں کا ہرگز ذکر نہ کرے۔ کیونکہ بلا تحقیق بات کہنا سخت گناہ ہے۔ اور اگر معلومات حاصل کرنا اس کی دنیا و آخرت کے لیے مفید نہ ہو تو خاموشی اختیار کرلے۔ اسی میں اس کے دین اور اس کی دنیا دونوں کا فائدہ ہے۔

جماعت کے افراد کے درمیان چند خاص پہلوؤں سے حسنِ ظن کا پایا جانا ضروری ہے۔

(۱) جو جماعت دین کی اتباع کے لیے وجود میں آئی ہے اس کے افراد کو ایک دوسرے کے دین، اخلاق اور سیرت و کردار کے بارے میں لازماً حسنِ ظن ہونا چاہیے۔ کیونکہ اس میں جو لوگ بھی داخل ہوتے ہیں وہ اس عزم و ارادے کے ساتھ داخل ہوتے ہیں کہ وہ اپنی زندگی کو دین کے مطابق ڈھالیں گے۔ ہمیں ان کو اپنے اس عزم و ارادے میں مخلص سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ ہمارے پاس ان کے غیر مخلص ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ لیکن یہاں ہمیں اس حقیقت کو نہیں بھولنا چاہیے کہ جماعت میں ضعیف ارادے اور کم زور طبیعت کے لوگ بھی ہوتے ہیں جو خواہش اور کوشش کے باوجود دین پر پوری طرح عمل نہیں کر پاتے۔ ایسے لوگ بھی ہو سکتے ہیں جن کے اندر ایک دینی جماعت سے وابستہ ہونے کے باوجود بعض مخالفِ دین خیالات اور رجحانات غیر شعوری طور پر موجود ہوں اور کبھی ان کا اظہار بھی ہو جاتا ہے۔ یہ اصلاح کی کمی کا نتیجہ ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ کسی کے عزم کی وجہ سے انسان فرشتہ نہیں بن جاتا بلکہ انسان ہی رہتا ہے۔ اس لیے وہ غلطیوں سے بالکل پاک نہیں ہو سکتا۔ اس سے بھول چوک یقیناً ہوگی۔ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اس کے اندر دین کی اتباع کا جذبہ ہے یا نہیں۔ اگر یہ جذبہ ہے تو بڑی سے بڑی غلطی کے بعد بھی وہ دین سے دور نہیں ہوگا بلکہ دین ہی کی طرف پلٹے گا اور کبھی اتنی قوت سے پلٹے گا کہ اپنی تمام کمزوریوں پر قابو پالے گا۔ اس لیے جس شخص کے اندر دین کی اتباع کا جذبہ ہے اس کی کسی غلطی کو دیکھ کر آپ اس کے دین و ایمان کے بارے میں بدگمان نہ ہوں، بلکہ اسے انسانی کمزوری سمجھ کر اس کی اصلاح کی کوشش کریں۔ یہ آپ کے حق میں بھی مفید ہے اور اس کے حق میں بھی۔

(۱) جماعت کے اندر اختلافِ رائے کا پایا جانا فطری ہے۔ یہ اختلاف اگر [illegible] جماعت کے لیے نقصان دہ نہیں ہے، بلکہ جماعت کے فکری ارتقاء کے لیے کسی حد تک ضروری ہے۔ جماعت کے اندر اختلافِ رائے نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جماعت کی فکری قوت ختم ہو گئی ہے۔ جب بھی چار سوچنے سمجھنے والے افراد کسی مسئلے پر بحث کریں گے تو ان کے خیالات میں کامل ہم آہنگی نہیں ہو سکتی۔ وہ اگر کسی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں تو اصول کی حد تک، ان کے درمیان اتفاق ہو گا بلکہ لازماً اتفاق ہونا چاہیے لیکن تفصیلات میں ضروری نہیں ہے کہ اتفاق ہی ہو۔ یہاں اختلاف بھی ہو سکتا ہے۔ اصول میں اختلاف ہو تو جماعت وجود میں نہیں آ سکتی۔ اور تفصیلات میں بھی اختلاف کو مٹا دیا جائے تو لوگوں کی انفرادیت ختم ہو جائے گی اور جماعت میں فکری جمود پیدا ہو جائے گا۔

جماعت میں ایسی فضا ہونی چاہیے کہ جن مسائل میں ایک سے زیادہ رائیں ہوں ان میں ایک دوسرے کی رائے کا احترام کیا جائے اور اس کے بارے میں کسی بدگمانی کو جگہ نہ دی جائے۔ آپ کو یہ حق ہے کہ اپنی رائے کو صحیح اور دوسرے کی رائے کو غلط کہیں لیکن یہ حق نہیں ہے کہ آپ اپنی رائے کو تو مخلصانہ رائے سمجھیں اور دوسرے کی رائے کو اخلاص سے خالی تصور کریں۔ کیونکہ جماعت کے بارے میں جس طرح آپ مخلص ہیں اسی طرح وہ شخص بھی مخلص ہے جس کی رائے سے آپ کو اختلاف ہے۔ اس سے جماعتی معاملات میں اجتہادی غلطی تو ہو سکتی ہے۔ دیدہ و دانستہ انحراف نہیں ہو گا۔ آپ اس پر جماعتی نظریات سے انحراف اور بغاوت کا الزام بھی لگا سکتے ہیں لیکن اس کے لیے مضبوط دلائل کی ضرورت ہو گی۔ محض سوءِ ظن کافی نہیں ہے۔

(۲) عمل کے میدان میں جماعت کے تمام افراد ایک سطح پر نہیں ہوتے۔ بعض سست رفتار ہوتے ہیں، بعض کی رفتار تیز ہوتی ہے۔ بعض جماعت کے کام میں شب و روز مصروف ہوتے ہیں اور بعض اس کے لیے کم وقت نکال پاتے ہیں۔ جماعت میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو جماعت کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر سکتے ہیں اور ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے اندر جذبۂ انفاق کم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جماعت کے تمام افراد اس کے مقصد کو یکساں جذب نہیں کرتے بلکہ ان میں اس پہلو سے کمی بیشی ہوتی ہے۔ اسی کمی بیشی کا اظہار عمل سے ہوتا ہے۔ جہاں یہ کمزوری ہو آپ اس کو دور کرنے کی ضرور کوشش کیجیے لیکن اسے جماعت سے بے وفائی اور عدمِ تعلق کی دلیل نہ بنائیے۔ ہاں اعمال و رجحانات کی یہ کمزوری جماعت سے بے وفائی کا سبب بھی بن سکتی ہے۔ اس وقت یقیناً آپ کو اس پر تنقید کی

جماعت میں مگر فرد سے محفوظ ہے مگر یہ صورت ٹھیک ہے کہ اس کی کمزوری کو اس کی نیت کا بگاڑ نہ دیکھیے اور نیہ نہ سمجھیے کہ ہر خلاف جماعت سے غداری ہے ۔ اس سے کسی کی کمزوری تو دور نہیں ہو گی البتہ اس کی اصلاح کے دروازے بند ہو جائیں گے ۔

خیر خواہی

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں " دین نصیحت اور خیر خواہی ہے " ۔ اس سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جو جماعت دین کی خدمت اور اسلام کے احیاء کے لیے وجود میں آئی ہے اس کے لیے نصیحت اور خیر خواہی پر عمل کس قدر ضروری ہے ۔

خیر خواہی کے معنی محدود نہیں ہیں بلکہ یہ لفظ اپنے اندر وسیع مفہوم رکھتا ہے ۔ آپ کسی ایسے تعلق کو اپنے سامنے رکھیے جو خیر خواہی پر مبنی ہو ۔ اس سے آپ کو اس کی وسعت کا اندازہ ہو گا ۔ آپ جانتے ہیں باپ اپنے بچے کا خیر خواہ ہوتا ہے ۔ اس خیر خواہی کا تجزیہ کیجیے تو معلوم ہو گا کہ وہ بچے کی راحت و آسائش کو اپنی راحت اور آسائش پر مقدم رکھتا ہے ۔ خود تکلیف اٹھاتا اور بچے کو آرام پہنچاتا ہے ۔ اس کی ترقی اس کی تعلیم و تربیت اور اس کی صحت کا فکر مند ہوتا ہے اور پھر یہ کہ ان تمام معاملات میں وہ بے حد مخلص ہوتا ہے ۔ وہ اس کی بے لوث خدمت کرتا ہے اور کسی پہلو سے بھی اس کی برائی نہیں چاہتا ۔

خیر خواہی کا یہ جذبہ اگر جماعت کے اندر ابھر آئے تو ہر طرف محبت ، ہمدردی ، غم خواری اور یگانگت کی فضا چھا جائے اور تعلقات کی وہی نوعیت پیدا ہو جائے جو باپ اور بچے کے درمیان ہوتی ہے ۔ خیر خواہی جماعت کا سرمایہ ہے اس کے بغیر جماعت زندہ نہیں رہ سکتی ۔ جماعت کے اندر مختلف پہلوؤں سے خیر خواہی کا جذبہ ترقی کرتا ہے ۔

نظریات کے ساتھ خیر خواہی

ہر جماعت کے مخصوص نظریات ہوتے ہیں جن کی وجہ سے وہ وجود میں آتی ہے اور دوسری جماعتوں سے ممتاز ہوتی ہے ۔ جب تک یہ نظریات زندہ ہیں جماعت زندہ رہے گی اور اس کا امتیاز باقی رہے گا اور جب یہ نظریات ختم ہو جائیں گے تو جماعت ختم ہو جائے گی یا اگر باقی بھی رہی تو اس کے بعد دوسری جماعت

[illegible] خیرخواہی کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے نظریات کی حفاظت کی جائے اور اس بات کی پوری کوشش کی جائے کہ جماعت اپنے نظریات سے منحرف نہ ہونے پائے اگر آپ نے اس میں کوتاہی کی تو آپ جماعت کے خیرخواہ نہیں بلکہ بدخواہ ہوں گے۔ اگر جماعت اپنے نظریات کو چھوڑ دے اور آپ اس پر خاموش ہو جائیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کو جماعت سے محبت نہیں ہے۔ آپ نہ تو اس کے نظریاتی بقاء سے دلچسپی رکھتے ہیں اور نہ عدم بقاء سے۔ آپ کو جماعت کے ہر اقدام کو اس پہلو سے دیکھنا ہوگا کہ آیا وہ اس کے نظریات کے موافق ہے یا مخالف؟ جہاں آپ جماعت کا کوئی قدم اس کے نظریات سے ہٹا ہوا دیکھیں، آپ کا فرض ہے کہ اسے جماعت کے نظریات کے تابع بنانے کی کوشش کریں۔ جب تک جماعت کے افراد جماعت کے نظریات کی حفاظت کے لیے چوکس نہ ہوں جماعت کا اپنے نظریات پر قائم رہنا دشوار ہے۔

جماعتی کام کے ساتھ خیرخواہی جماعت کے ساتھ خیرخواہی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آپ جماعت کے کاموں میں پورا تعاون کریں۔ جماعت کی خدمت اس طرح انجام دیں جیسے آپ اپنا کوئی ذاتی کام انجام دیتے ہیں۔ جماعت میں آپ کو جس محاذ پر لگایا جائے وہاں ثابت قدمی اور مضبوطی کے ساتھ جمے رہیں اور جو کام آپ کے حوالے کیا جائے اسے دلجمعی، سکون اور اطمینان کے ساتھ انجام دیں۔ آپ جماعت کے بہترین خیرخواہ ہیں، اگر آپ کے دل و دماغ پر صرف ایک فکر چھا جائے ــ وہ یہ کہ جماعت جس دعوت کو لے کر اٹھی ہے وہ دنیا میں پھیلے اور غالب و سربلند ہو۔ اگر آپ کی اس کیفیت میں کمی ہے تو جماعت کے ساتھ آپ کی خیرخواہی مکمل نہیں ہے۔

امیر کے ساتھ خیرخواہی خیرخواہی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آپ اپنے امیر اور حاکم کے خیرخواہ ہوں، اس کی بھلائی چاہیں، اس کی کامیابی کے خواہشمند ہوں۔ اور اس کے لیے دعا کریں، اسے نیک مشورے دیں اور خوش دلی کے ساتھ اس کی اطاعت کریں۔ یہ بھی اس کی خیرخواہی ہے کہ اسے غلط راستے پر دیکھیں تو راہ راست پر لانے کی کوشش کریں۔ جس طرح صحیح کاموں میں اس کی معاونت نہ کرنا اس کے ساتھ بدخواہی ہے اسی طرح غلط کاموں پر اسے نہ ٹوکنا بھی بدخواہی ہے۔

مامورین کے ساتھ خیرخواہی جماعت کے امیر اور حاکم کا بھی فرض ہے کہ وہ جماعت افراد کا

خیرخواہ ہو۔ انہیں دین پر قائم رکھے، ان کی صحیح رہنمائی کرے، ان کے ساتھ مساوات برتے، کسی کو کسی پر فوقیت نہ دے، کسی کی بدخواہی نہ کرے، کسی کے خلاف اپنے دل میں عناد نہ رکھے اور سب کے ساتھ محبت سے پیش آئے۔ ان کے دینی معاملات ہی میں نہیں بلکہ دنیوی کاموں میں بھی ان کا مشیر اور مددگار ہو۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "تمہارے بہترین امام وہ ہیں جن سے تم محبت کرتے ہو اور جو تم سے محبت کرتے ہیں، جن کو تم دعائیں دیتے ہو اور جو تم کو دعائیں دیتے ہیں۔ تمہارے بدترین امام وہ ہیں جن کو تم ناپسند کرتے ہو اور جو تم کو ناپسند کرتے ہیں۔ جن پر تم لعنت بھیجتے ہو اور جو تم پر لعنت بھیجتے ہیں"

عام افراد کے درمیان خیرخواہی

جماعت کے عام افراد کے درمیان بھی خیرخواہی کا جذبہ ہونا چاہیے۔ وہ ایک دوسرے کو معروف کا حکم دیں اور منکر سے روکیں۔ راہ راست پر چلنے کی ترغیب دیں اور دین پر ثابت قدمی رکھنے کی کوشش کریں۔ ایک دوسرے کی دل سے بھلائی چاہیں اور بھائی بھائی بن کر رہیں۔

جب آپ دین کی خدمت کے لیے اٹھے ہیں تو آپ کے اندر انسانوں کے ساتھ خیرخواہی کا بے پناہ جذبہ ہونا چاہیے۔ اس کے بغیر آپ کی خدمت کے اچھے نتائج نہیں نکل سکتے۔ جب تک کوئی شخص آپ کو اپنا خیرخواہ نہ سمجھے آپ کی بات نہیں سنے گا اور سنے گا تو اس سے وہ اثر نہیں لے گا جو لینا چاہیے لیکن اگر خدانخواستہ وہ آپ کو اپنا بدخواہ خیال کرے تو آپ کی بات کا اس پر بالکل الٹا اثر پڑے گا۔ خیرخواہی ایسی چیز نہیں ہے کہ آپ اس کا دعویٰ کریں اور مخاطب اس پر فوراً ایمان لے آئے بلکہ اس کے لیے آپ کو اپنا پورا رویہ بدلنا ہوگا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ اپنی بات چیت سے، اپنے کردار سے اور اپنے ہر عمل سے خیرخواہ ہونا ثابت کریں۔ اصلاح کا وہ انداز اختیار کریں جس میں دل آزاری نہ ہو بلکہ محبت اور رحم دردی ہو اور یہ محسوس ہو کہ آپ فی الواقع اصلاح چاہتے ہیں۔ کسی میں کوئی خامی دیکھیں تو برملا اس کا اظہار نہ کریں بلکہ تنہائی میں اسے بتائیں۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ جو نصیحت تنہائی میں ہو وہ تو یقیناً نصیحت ہے اور جو نصیحت لوگوں کے درمیان ہو وہ فضیحت ہے۔ یاد رکھیے کسی کی پردہ دری کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔ جو شخص کسی کو رسوا کرنا چاہے۔ خدائے تعالیٰ خود اس کو رسوا کر دیتا ہے اور جسے خدا رسوا کرے اس کی آبرو کوئی نہیں بچا سکتا۔

تناسخ کا تحقیقی جائزہ

قسط (۲)

جناب سلطان مبین صاحب ایم اے

تناسخ متماثل

تناسخ کے نظریے کو فطری عمل ثابت کرنے کے لیے قدیم زمانے کے متکلمین نے بڑا زور باندھا ہے اور اس کو فطرت سے ہم آہنگ ثابت کرنے کے لیے مختلف مثالیں دی ہیں۔ مگر مثالوں کی زور بیانی نے کہیں کہیں سرے سے "تناسخ کی افادیت ہی کو ختم کر دیا ہے۔ ہم آہنگی کے التزام نے غیر شعوری طور پر تناسخ کو مکافاتی سلسلے کی جگہ پر" ہم مزاج تبادلہ" بنا دیا ہے جسے وقوف بنانے کو اخلاقاً جائز مان لینے کے بعد ہم" ہم مزاج تبادلہ" کو" ارتقا" کا خوب صورت نام دے سکتے ہیں۔ چناں چہ ہماری صدی کے تناسخ کے ماننے والے ایک علامہ دہر فاضل بزرگ تناسخ کی وکالت کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ " اپنے پچھلے تجربوں سے بنے ہوئے ضمیر[1] کی مثال موت کے لمحے میں جس وقت وہ اس جسم کو چھوڑنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ اس پگھلی ہوئی لیہے کی دھار سے دی جا سکتی ہے جو ایک ایسی نلی کے سہارے نیچے بہتی چلی آئی ہو۔ جو ایک ٹیلے کے پاس آکر رک جاتی ہے۔ اس ٹیلے کی دوسری طرف ایک ایسی دوسری نالی ہے جس کے سرے پر مقناطیس کی بڑی ڈھیری ہے۔ تو وہ ضرور اس دھار کو نئی نالی میں ڈالنے کی قوت رکھتی ہے۔ اسی طرح موت کے وقت ضمیر اپنی طبیعت ثانیہ کے ساتھ زندگی کی حد آخر پر کھڑا رہتا ہے۔ طبیعت ثانیہ کا وہ مقناطیس قریب ترین ہم مزاج والے جسم کھینچ کر پھر اس کی

---

[1] ضمیر کا لفظ اس لیے استعمال ہوا ہے کہ بودھی متکلمین کسی حقیقت ثابتہ' اتما و پرماتما کے قائل نہیں ہیں مگر تناسخ کے قائل ہیں۔

[2] عقائد عقل کے پابند نہیں ہیں وہ جذبات کے پابند ہوتے ہیں۔ اتما و پرماتما کا مذاق اڑانے والا (باقی اگلے صفحہ پر)

ِرائی کارروائی شروع کرا دیتا ہے۔ یہ سلسلہ تب تک جاری رہتا ہے جب تک حرص کی خواہ سے
ِ ہٹ کر عدم محض کو نہ پہنچ جائے۔ اس طرح عمل پاداشِ عمل اور نہ دوسرا جنم ہوتا ہے۔ مقدمہ جم نکلئے ہندی
بات بنانے سے یا زیادہ بولنے سے بھی معاملہ بگڑ جاتا ہے۔ تناسخ کا کیس بھی کچھ دفعات میں
بنا کر۔ یا زیادہ بول کر خراب کر دیا گیا ہے اور تناسخ "پاداش عمل کا قانون" ہونے کے بجائے
ارتقا ہو چلا ہے چناں چہ۔

اوما (پاروتی) نے پوچھا ...... "مردانہ و زنانہ صنفی فرق کے ساتھ روح کا کیا تعلق ہے؟ مرد
ا ور موت روح ہم جنس ہیں یا متغائر جنس ہیں۔ یہ میرا شبہہ ہے۔ خداوندا! اس شبہے کو دور کرنے کے
آپ ہی ہیں۔ شری مہیشور (مہادیو) نے کہا۔

"روح ہمیشہ غیر منقلب شے ہے نہ یہ خود مرد ہے نہ خود عورت ہے۔ عمل کے تنوع و اختلاف سے
ِ الگ الگ صنف میں پیدا ہوتی ہے۔ عورت مردانگی کا کام کر کے مرد کا جنم پاتی ہے اور عمل کے
ب سے زنانہ ذہنیت کی وجہ سے مرد عورت ہو جاتا ہے۔ مہابھارت: انوشاسن: ۱۰/۴ صفحہ ۲۲۴

جس زمانے میں برہمنی مذہب اور بودھی مذہب کی تدوین ہو رہی تھی۔ اس زمانے میں تناسخ کا منکر
ئی با اثر حلقہ نہیں تھا۔ اس لیے قائلین تناسخ کے دلائل میں ذہانت کا فقدان ہے۔ گوشت خوری د
ِ گوشت، رہبانیت اور تناسخ کے میدان میں بڑی کش مکش اور ذہانت کا مظاہرہ ہم کو ملتا ہے مگر
ِ کا میدان ہنگامہ آرائیوں سے خالی ہے۔ کیونکہ ہندوستان سے ابھرنے والے سبھی قدیم مذاہب
سخ کے قائل تھے رہی۔ لیے اثبات تناسخ کی عدم ضرورت کی وجہ سے تناسخ کے دلائل بچکانہ ثابت
ہیں اور مضحکہ خیز بھی ہیں۔ زمانہ جدید کے متکلم ان کو احساس کمزوری و شرمساری کے ساتھ صرف دہراتے
۔ ہاں تو بات یہ چل رہی تھی کہ "روح کا انتقال" طبیعت ثانیہ یا ملکہ ہی کا مشکور و مرہون ہے۔

یہ حاشیہ) یہ متکلم ٹیسٹ ٹیوب اور میگنیٹ لیکر کس طرح تناسخ کا پریکٹیکل کر رہا ہے۔ لطف یہ کہ عقل پرستی کا ڈھنڈورا
ِ کر یہ بات کہی جا رہی ہے۔ یہی بزرگ قیامت کے استحالہ کے بارے میں یوں فرماتے ہیں۔ جو چیز برباد ہو گئی اس کا پھر لوٹ کر
میں آنا محال ہے۔ اور پھر مان لو ایک آدمی دوسرے آدمی کو مار کر کھا گیا اور ایک کے جسم کے ذرات دوسرے کے
ذرات میں تبدیل ہو گئے۔ تو قاتل کا جسم قیامت میں اگر ٹھیک وہی ہو جو کہ دنیا میں تھا تو مقتول کا جسم ویسا ہی نہیں ہو سکتا
(ورش ورگ درشن: مصدر راہل سانکرتاین صفحہ ۱۲۴)

ایسا صاف محسوس ہوتا ہے کہ تناسخ کے موسچے پر بھارتی متکلم کے سامنے جانوروں کی رسیاں، لگام، نکیل، دمچی، بندھن و چھندن، بے بسی و لاچاری سامنے رہتی تھی۔ تناسخ کے میدان میں ان کی سمجھ میں یہ بات آ گئی تھی کہ انسان کا درجہ (باستثناء چند) حیوانات سے برتر ہے۔ اس لیے جب انسان کی سزا کی بات آتی ہے تو وہ نہایت آسانی سے "تنزل" "ڈی گریڈنگ" کی بات کرتا چلا جاتا ہے اور ذرہ برابر غور نہیں کرتا کہ ہم نے کل کیا کہا تھا اور ہمارے اپنے ساتھیوں نے کل کیا بات کہی تھی اور آج کیا کہہ رہے ہیں کیا بدچلنی اور خیانت کی سزا صدر کو نائب بنا دینا، کلکٹر کو تحصیل دار بنا دینا۔ استاد اور رینک کم کر دینا ہے؟ کیا بد دیانت ملازموں اور افسروں پر مقدمہ چلا کر قید و بند کی سزا نہیں دی جاتی؟ کیا تنزل جرم کی سزا ہے یا تساہلی کی؟ ذیل میں مہابھارت کے جس باب کے حوالہ جات ابھی دیے جائیں گے اس سے صاف صاف واضح ہو جاتا ہے کہ متکلم کے سامنے "تنزل" انتقال الی الحیوانات کے سوا دوسری متبادل راہ نہیں اور یہ بات ثابت ہونے لگتی ہے کہ تناسخ جنت و جہنم سے آزاد و بے نیاز مستقل عقیدہ ہے۔ برہمنوں اور بودھوں نے مرعوب ذہنیت کی وجہ سے اس الحادی عقیدے کو بلا تامل قبول کر لیا ہے اس باب کا بہت بڑا حصہ یہ بات بڑی خوبی سے بتاتا ہے کہ تناسخ کی راہ "راہ مکافات اور طریق پاداش نہیں بلکہ راہ میلان اور ساتھ ہی راہ تنزل ہے۔ مزید برآں یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ تناسخ ذات باری سے بے نیاز عمل ہے طبیعت ثانیہ ہی اس کا فاعل و محرک اور علت تامہ ہے۔

(۷) جو تل، ماش، ملتھی، سرسوں، مونگ، گیہوں، السی، اناجوں۔ (۷۲) اور فصلوں کا چرانے والا بیوقوف انسان، بے شرم چوہا ہو کر پیدا ہوتا ہے۔ (۷۳) مہاراج! وہ مر کر پھر سور ہوتا ہے۔ پیدا ہوتے ہی روگ سے مر جاتا ہے۔ (۷۴) راجہ! وہ جاہل اپنی کرتوت سے کتا ہوتا ہے۔ کتا ہو کر پانچ سال زندہ رہ کر انسان ہوتا ہے۔ (۷۷) دوست کی اہلیہ راجہ کے حرم اور استاد کی منکوحہ سے جو شخص از راہ شہوت مجامعت کرتا ہے وہ مر کر سور ہوتا ہے۔ (۹۹) دہی چرانے والا انسان بگلا[1] ہوتا ہے۔ غیر پاکیزہ مچھلیاں چرانے والا مرغابی ہوتا ہے۔ شہد چرانے والا کند ذہن مکھی ہوتا ہے۔ (۱۰۰) پھل قند اور حلوہ چرانے والا چیونٹی ہوتا ہے ..... (۱۰۲) لوہا[2] چور کند ذہن کوا ہوتا ہے۔ کانسہ چرانے والا انسان ہریل ہوتا ہے

[1] تناسخ متماثل میں اس طرح کی مشابہت بہت کافی ہے۔ دہی اور بگلا دونوں سفید ہوتے ہیں۔
[2] لوہا اور کوا دونوں کالے ہوتے ہیں۔ سنسکرت میں لوہا اور کوا میں تجنیس خطی ہے۔

(۱۰۵) کپڑا[1] چرانے والا طوطا ہوتا ہے۔ چاندی چرا کر مرجانے پر الّو ہوتا ہے۔ (۱۰۷) رنگ چرانے والا مور ہوتا ہے..... (۱۰۸) رنگ و بو چرانے والا لالچی انسان چھچھوندر ہوتا ہے۔ (۱۱۱) جو لالچی انسان تیل چراتا ہے۔ راجن! وہ مرکر تیل چٹا ہوتا ہے۔ (۱۱۹) انسان کھانا چرا کر مکھی کا جنم پاتا ہے اور کئی مہینوں تک مکھیوں کے جھنڈ میں رہتا ہے۔ (۱۲۳) کج فہم گوشت و مچھلی چرا کر مکھی کا جنم پاتا ہے۔ (۱۲۴) جو انسان امانت رکھ کر اس کو نہیں دیتا ہے وہ مر کر مچھلی کا جنم پاتا ہے۔ مہابھارت:۔ انوشاسن: ۱۱۱، ۷۷، ۱۲۳

دیگر اوماپاورتی نے کہا۔ گنہگار لوگ مختلف انواع میں کس طرح پیدا ہوتے ہیں؟ شری مہیشور (مہادیو) نے کہا حسینہ! جو تم چاہتی ہو اس کو میں بتاؤں گا۔ سدا روح اعمال کے اختیار میں ہو کر مختلف نوع میں پیدا ہوتی ہے۔ ہ گوشت کا شوقین انسان کوا اور گدھ ہوتا ہے۔ شراب خور انسان یقیناً سؤر ہوتا ہے ہ غیر ماکول چیزوں کا کھانے والا انسان کوے کی برادری میں ہوتا ہے۔ غصہ سے خودکشی کرنے والا انسان پریت ہو جاتا ہے ہ چغل خوری اور غیبت سے انسان مرغ ہو جاتا ہے۔ جو جاہل آخرت کا منکر ہے وہ ہرن کا جنم پاتا ہے۔ شکاری انسان کیڑے[2] مکوڑے کا جنم پاتا ہے..... محرمات اور دوسرے کی بیویوں سے ہم بستری کرنے والا چوہا ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں۔ احسان فراموش، دوست کا قاتل گیدڑ اور بھیڑیا ہوتا ہے۔ احسان فراموش بیٹے کا قاتل نباتات ہوتا ہے۔ مہابھارت۔ انوشاسن: ۱۴۴ صفحہ ۲۲

یقیناً اوپر بیان کی ہوئی مثالیں یہ بات ثابت کرتی ہیں کہ انسان کا مزاج، انسان کی طبیعت یا ملکہ راسخہ زندگی کے اختتام پر اپنی پسند کی دوسری زندگی میں داخل ہو جاتا ہے اور بلاشبہ بھارت کے کئی نظام فلسفہ اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ یہ "ہم مزاج تبادلہ" یہ دل پسند انقلاب کسی خارجی مداخلت کے بغیر چلتا رہے۔ اور ارباب تناسخ نے ماضی اور حال میں جو دلائل دیے ہیں وہ اسی "ہم مزاج تبادلہ" یا "دل پسند" انقلاب کی تائید کرتے ہیں۔

جسمانی، لسانی اور خیالی اعمال سے ان کا پھل پیدا ہوتا ہے[3]۔ اچھے برے عمل کا پھل فوراً نہیں مدت کے بعد ہوتا ہے۔ چونکہ عمل تب تک (مدت کے بعد) ختم ہو چکا ہوتا ہے۔ اس لیے اس سے پھل کیسے

---

[1] کپڑا طوطا میں تجنیس ہے۔
[2] شکاری اور کیڑے بار بار ڈنک چبھوتے ہیں۔
[3] نیائے سوتر: ۱:۱:۲۰

لے گا؟ ایسے شبہہ کی گنجائش نہیں۔ جب ہم گیہوں کے پودے کے برباد ہوجانے پر بھی اس کے بیج سے اگلے سال نئے پودے کو اگتے دیکھتے ہیں۔ اسی طرح کیے ہوئے اعمال سے دھرم اور ادھرم پیدا ہوتے ہیں جن سے آگے پھل ملتا ہے۔ یہ دھرم اور ادھرم اسی روح میں رہتے ہیں جس نے کسی جنم میں اس کام کو کیا ہے

نیائے سوتر: ۴:۱:۴۴ — ۴۷-۵۲

نیائے سوتر تناسخ کو یوں مدلل کرتا ہے۔ ان دلائل کو از ۵۰۰ ق م تا ۲۵۰ ق م کے درمیان کا قیاس کیا جاتا ہے۔ دیگر۔

○ پیدا ہوتے ہی بچے کو خوشی، خوف، غم کرتے ہوئے دیکھا جاتا ہے۔ یہ پہلے جنم کی مشق کے سبب سے ہوتا ہے۔ یہ بات کمل کے کھلنے اور بند ہونے کی طرح طبعی نہیں ہے۔ کیونکہ عناصر خمسہ سے بنے ہوئے کمل وغیرہ کی یہ حالت سردی، گرمی اور بارش کے سبب سے ہوتی ہے۔ پیدا ہوتے ہی بچے کو دودھ پینے کی خواہش ہوتی ہے۔ یہ بھی پہلے جنم کے خورد و نوش کی مشق سے ہی ہوتا ہے۔ نیائے سوتر: ۳:۱:۱۹، ۲۷

یہ تو قبل مسیح کے برہمنی دلائل ہیں۔ ذیل میں اس صدی کے تازہ ترین برہمنی دلائل دیے جا رہے ہیں جو بدقسمتی سے نیائے سوتر کی ترجمانی ہے۔

لڑکا پیدا ہوتے ہی رونے لگتا ہے۔ کبھی ہنستا ہے۔ کبھی روتا ہے۔ کبھی سوتا ہے۔ جب ماتا اس کے منہ میں چھاتی دیتی ہے تو وہ اس سے دودھ کھینچنے لگتا ہے اور دھمکانے پر ڈر سے کانپتا ہوا بھی دیکھا جاتا ہے۔ بچے کے یہ سب عمل جنم سابق کی نشان دہی کرتے ہیں۔ کیونکہ اس جنم میں تو اس نے یہ سب باتیں سیکھی نہیں جنم سابق کی مشق سے ہی یہ سب باتیں اس کے اندر طبعًا ہونے لگتی ہیں جنم سابق میں تجربہ کیے ہوئے سکھ دکھ کی یاد کر کے وہ ہنستا اور روتا ہے۔ جنم سابق کی موت کے سبب سے وہ کانپنے لگتا ہے اور جنم سابق میں کیے ہوئے چھاتی پینے کی مشق سے ہی ماں کی چھاتی کا دودھ کھینچنے لگتا ہے۔

پران تتو ہی مانسا ص۳۸۳، مصنفہ شری کرشن منی ترپاٹھی

تناسخ کی بودھی وکالت ایک فاضل اجل کی زبانی سنیے۔

تانسے گھڑے میں کچھ دن رکھ کر نکال لیے گئے گھی کی طرح — بھول جانے پر بھی جو علم پڑھنے کا سنسکار

ل تو پھر بچھو اور بھڑ کے ڈنک یہ بات یاد دلاتے ہیں کہ وہ جنم سابق میں سوئی لگانے والے ڈاکٹر تھے اور مکڑی کا جالا یہ سرگوشی کرتا ہے کہ مکڑی ایک ماہر بہندس تھی۔

اصطباغ (نکھار) دل کے اندر سما گیا ہوتا ہے۔ وہی تعلیم کا حاصل ہے۔ کالج چھوڑے برسوں ہو جانے اور پڑھی باتوں کو بھول جانے پر بھی ۔ جیسے انسان کی ذہنی آراستگی و سلیقہ پہلے کی علمی مشق کو ثابت کرتا ہے۔ اسی طرح بچپن میں جھلکنے والی ذہانت کو کیوں نہ پہلے کی مشق کا نتیجہ مان لیا جائے۔ در اصل قانون توریث اور ماحول ذہنی استعداد کی جتنے حصے تک سبب بنتے ہیں اور اتنے حصے کافی ہیں (ذہانت کند ذہنی شرافت سنگ دلی وغیرہ کتنے ہی غیر خاندانی وصف انسانوں میں اکثر دکھائی پڑتے ہیں)۔ ان کا سبب پہلے کی زندگی کے بہاؤ میں ڈھونڈھنا پڑے گا۔ ایک نوجوان بڑی تپسیا سے پڑھ کر جس وقت درجہ اول میں ایم اے پاس کرتا ہے اسی وقت اپنی محنت کا انعام پائے بغیر اس کی یہ زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ اس کی یہ محنت جسم کے ساتھ برباد ہو گئی۔ ماننے کی بہ نسبت کیا یہ اچھا نہیں ہے کہ اسے "ذہین بچے" کے ساتھ جوڑ دیا جائے۔ جاہل ماں باپ کے غیر معمولی ریاضی داں اور موسیقی داں بچے دیکھے گئے ہیں۔ اس ڈھرے سے غور کرنے پر ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اس جنم کی زندگی کا بہاؤ ۔۔ ایک بڑے لمبے بہاؤ ۔۔ کا چھوٹا درمیانی حصہ ہے جس کے ماقبل کی رو "مدت مدید" سے آرہی ہے اور مابعد میں بھی مدت مدید تک رہے گی "مدت مدید" ہی ہم کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ ازل[1] سے پہلے ازل سے "جمع کیے ہوئے سرمایہ میں چند سالوں میں جمع کیا ہوا سرمایہ" سندکار "ملکہ" کوئی خاص مقام نہیں رکھتا جیسے کھارے سمندر میں ایک چھوٹی سی مصری کی ڈلی"۔ مقدمہ مجھم نکائے ہندی ترجمہ از راہل سنکر تاین

تناسخ کی بیان کردہ ان تشریحوں سے تین باتیں کھل کر سامنے آتی ہیں۔ ایک یہ کہ تناسخ ایک طبعی فعل ہے جس پر روح و ضمیر بہ رضا و رغبت چلتے رہتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ عمل تناسخ کسی خداوند کے جبر و اعانت کا متقاضی نہیں ہے۔ تیسری بات یہ کہ ایک جسم سے دوسرے جسم تک کی مسافت میں کوئی فصل اور وقفہ نہیں۔ روح کبھی جسم کی پوشاک سے ننگی ہو کر نہیں رہتی۔ زندگی کا بہاؤ مسلسل رواں دواں رہتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کسی زندگی کا بہاؤ "نروان" یا مکتی سے عدم محض کو پہنچ جائے یا مسرت ابدی میں بدل جائے۔

تناسخ کی ایک اور تشریح برہمنی اور بودھی علما پیش کرتے ہیں جس سے دو جنم کے درمیان وقفہ کا پتہ چلتا ہے اور یہ اندازہ ہوتا ہے کہ روح متوفی کی تاک میں بیٹھی رہتی ہے اور دل پسند جسم ملتے ہی جنم لے لیتی ہے ۔ چنانچہ اور جو خانہ دار لوگ گاؤں میں نذر و نیاز کرتے ہیں وہ دھواں کو پہنچتے ہیں۔ دھوئیں سے رات کو رات سے اندھیرے پاکھ کو ۔ اور اندھیرے پاکھ سے ان چھ مہینوں کو جن میں سورج دکھن کے راستے سے جاتا ہے

[1] ہمارا مصنف عالم کی ازلیت کا قائل ہے۔ مگر زندگی کی "ازلیت" کا معتقد ہونے سے گھبرا رہا ہے۔

پہنچتے ہیں۔ وہ لوگ سال کو نہیں پہنچ پاتے۔ دکھن کے چھ مہینوں سے پتری لوگ عالم اجداد کو عالم اجداد سے آکاش (آسمان) کو اور آکاش سے چاند کو پہنچتا ہے۔ یہ چاند راجہ سوم ہے۔ وہ دیوتاؤں کی خوراک ہے۔ دیوتا لوگ اس کو کھاتے ہیں۔ وہاں اعمال کے اختتام ہونے تک رہ کر پھر اسی راستے سے جس طرح گئے تھے اسی طرح لوٹتے ہیں۔ (وے پہلے) آسمان کو پہنچتے ہیں اور آسمان سے ہوا کو۔ ہوا ہو کر وے دھواں ہوتے ہیں اور دھواں ہو کر ابر ہو جاتے ہیں اور ابر ہو کر بادل ہوتا ہے۔ بادل ہو کر برستا ہے۔ تو وے دنیا میں دھان جو، بوٹی، سبزی، تل اور وغیرہ ہو کر پیدا ہوتے ہیں۔ اس طرح یہ اخراج یقیناً ہی بہت تکلیف دہ ہے۔ اس اناج کو جو بھی کھاتا ہے اسی شکل کا ہی وہ جیو ہو جاتا ہے۔ ان (کھائے ہوئے جانوں) میں اچھے چال چلن والے ہوتے ہیں۔ وے جلد ہی اعلیٰ جنم پاتے ہیں۔ وے برہمن کا جنم، کشتری کا جنم یا ویشیہ کا جنم پاتے ہیں اور جو برے چال چلن والے ہوتے ہیں وے فوراً برے جنم کو پاتے ہیں۔ وے کتا کا جنم، سور کا جنم، یا چانڈال کا جنم پاتے ہیں۔ ان میں سے وے کسی راستے کے ذریعے نہیں جاتے۔ وے یہ چھوٹے اور بار بار آنے جانے والے جاندار ہوتے ہیں۔ "پیدا ہو جا اور مر جا" یہی ان کا تیسرا مقام ہے۔ چھاندوگیہ اپنی شد: ۵ : ۱۰ : ۳ - ۸

بعض نصوص سے اندازہ ہوتا ہے کہ چاند ہی "فردوس" ہے۔ وہاں پھر وہ اتنے دنوں تک رہتا ہے جتنے دنوں تک اس کے اعمال ختم نہیں ہوتے۔ عمل کے ختم ہوتے ہی پھر وہ نیچے گرتا ہے اور زمین پر آ کر جنم لیتا ہے۔ یقیناً یہاں موت اور جنم میں وقفہ معلوم ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم پڑتا ہے کہ اعمال کے ختم ہو جانے پر اس کو نیک و بد جنم محض "سنسکار" ہی کی وجہ سے ملتا ہے۔ سابق و لاحق جسموں میں جو وقفہ لگتا ہے اس کی تشریح بودھ متکلم اس طرح کرتے ہیں

ایک جسم کے چھوٹنے دوسرے جسم میں پیدا ہونے تک جس حالت درمیانی میں "ضمیر یا روح" رہتی ہے۔ اسی کو "گندھرو" یا "وجود وسط" کہتے ہیں۔ وجود وسط کو جیسے جسم میں پیدا ہونا ہوتا ہے ویسے ہی اس کی شکل ہوتی ہے۔ وہ اپنے راستے میں ہفتہ بھر تک رہتا ہے۔ ضمیر کو کسی جسم میں پیدا ہونے کے لیے تین باتوں کی ضرورت ہے
ا۔ ماں حائضہ ہو۔ باپ میں بیج موجود ہو اور گندھرو تیار رہے۔ "وجود وسط ماں باپ کے جنسی فعل کو دیکھتا ہے۔ اس وقت اگر "مادہ" "انثیٰ" بننے والا ہوتا ہے تو اس کا میلان مرد کی طرف ہو جاتا ہے اور اگر "نر" بننے والا ہوتا ہے تو اس کا میلان عورت کی طرف ہو جاتا ہے۔

ان سب تفصیلات و تشریحات سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ضمیر و روح کی جبلی طبیعت و افتاد ہوتی ہے

یسی ہی جسم وہ اختیار کر لیتا ہے۔ تناسخ ایک خداآزاد طبعی عمل ہے اور یہ عمل سنسکار و مزاج کے مطابق چڑھتا اترتا رہتا ہے۔ تو پھر اس عمل سے یہ امید رکھنا کہ یہ "سزا و جزا" کا عمل ہو جائے گا۔ خود کو فریب دینا ہے یا دوسروں کو۔ یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ روح چوری کی عادت سے چوہا بن جائے۔ زنا کی کثرت سے سور یا شہوت پرست ہو جائے۔ مٹھائی چور چیونٹی ہو جائے۔ شکاری شیر و بھیڑیا ہو جائے۔ مگر یہ بات تو سمجھ میں نہیں آتی کہ طبعی عمل کے تحت چراغ چرانے والا اندھا ہو جائے۔ شکاری دوسرے جنم میں لنگڑا اور لولا ہو جائے، گٹھیا کا مریض ہو جائے۔ زناکار عورت بیوہ ہو جائے۔ جوانا مرگ ایم اے دوسرے جنم میں غیر معمولی ریاضی داں اور موسیقی داں لڑکا ہوتا تو جانوروں کو خصی (بدھیا) کرنے والے بیطار کو دوسرے جنم میں برتھ کنٹرول کا سرجن ہونا چاہیے نہ کہ نامرد و مخنث[1]

[1] پاروتی نے پوچھا۔ بھگوان! انسان کس عمل کی پاداش میں۔ بدکار، بدنشین، نامرد و مخنث ہوتا ہے۔ شنکر مہادیو نے فرمایا۔ جو جانوروں کو بدھیا اور خصی کرتے ہیں اور اسی پیشے پر زندگی گزار دیتے ہیں .... وے اگر انسان کا جنم پاتے ہیں تو نامرد و مخنث ہوتے ہیں۔ دیوی! عورتوں کو بھی اسی پر قیاس کر لو۔ مہابھارت: انوشاسن: ۱۴۵ : ص ۲۲۲، ۲۲۱

بے وقوفوں کی بے وقوفی کی پانچ علامتیں ہیں۔ ۱۔ وید کی سند۔ ۲۔ وجود خالق۔ ۳۔ نہانے کو دھرم سمجھنا۔ ۴۔ ذات پات کا پندار۔ ۵۔ گناہ دھونے کے لیے تپسیا کرنا۔ دھرم کیرتی کی پرمان وارتک ۱ : ۳۴۲

جناب محمد حسین چشتی

اگر آپ کو کالے رنگ کا کپڑا پسند ہے اور مجھے سفید رنگ کا، تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کپڑوں کے چناؤ میں آپ کی پسند اور ہے اور میری اور۔

اگر آپ سری نگر سے نشاط باغ تک سڑک کے راستے سے گاڑی میں جانا چاہتے ہوں اور میں کشتی میں جھیل ڈل کے راستے سے جانا چاہتا ہوں تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس معاملے میں آپ کا اور میرا ذوق مختلف ہے پسند اور ناپسند کا معیار ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان ایک بھی ہوسکتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک ہی چیز آپ کو بھی مرغوب ہو اور مجھے بھی اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جو چیز آپ کو پسند ہو، وہ مجھے پسند نہ ہو اور ہم ہی سے دونوں اپنے اپنے انتخاب میں حق بجانب ہوں۔

پسند اور ناپسند کے معیار کا یہ اختلاف بعض باتوں میں بے ضرر بلکہ اچھا بھی ہوتا ہے، مگر بعض باتوں میں بہت برا اور مہلک بھی ہوا کرتا ہے۔ اوپر والی مثال کے مطابق اگر آپ کو کالے رنگ کا کپڑا پسند ہے اور مجھے سفید رنگ کا، تو اس میں کیا نقصان ہوسکتا ہے۔ آپ بلا تامل کالے رنگ کا کوٹ پہن سکتے ہیں اور میں سفید رنگ کا پہن سکتا ہوں اور رنگ کے اس اختلاف سے ہماری روزمرہ کی زندگی پر کوئی برا اثر نہیں پڑ سکتا، بلکہ مختلف رنگ کے کوٹ پہننے سے نظر کا ذوق بڑھ سکتا ہے اور دل کو فرحت مل سکتی ہے۔

گل ہائے رنگ رنگ سے ہے زینتِ چمن
اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

لیکن اگر پسند اور ناپسند کا یہ اختلاف روزمرہ کی زندگی کے ہر معاملے میں نمایاں ہوجائے اور

اور ہم بات بات میں ایک دوسرے سے جداگانہ رویہ اختیار کرلیں تو لازمی ہے کہ ہمارے درمیان اختلاف کی خلیج بڑھ جائے اور ہم ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگیں۔

یہ اصول جس طرح دو آدمیوں کے حق میں صادق ہے اسی طرح ایک سماج یا ایک قوم کے حق میں بھی صادق ہے۔ اگر ایک قوم کے افراد ہر بات میں مختلف ڈھنگ پر سوچنے لگیں تو اس قوم میں انتشار واقع ہو جائے گا، اور اس کے افراد میں کبھی ہم آہنگی پیدا نہ ہوگی۔ ایسی قوم یا سوسائٹی ترقی کی راہ پر گام زن ہونے کے بجائے تنزل کی راہ پر چل پڑے گی۔

مثال کے طور پر ایک جمہوری نظام میں جب لوگوں سے رائے پوچھی گئی تو ۴۰ ووٹ نیشنل کانگریس کو آئے۔ ۳۰ ووٹ سوشلسٹوں کو آئے۔ ۲۰ آمریت پسندوں DICTATOR SHIP کو آئے اور ۱۰ کسی دوسری جماعت کو۔ ایسی صورت میں نیشنل کانگریس برسر اقتدار آگئی۔ گویا ۱۰۰ افراد میں سے ۴۰ کو حکومت میں حصہ مل گیا اور ۶۰ ایسے رہ گئے جن کا حکومت میں کوئی حصہ نہ رہا۔

اس مثال سے بخوبی واضح ہو سکتا ہے کہ اختلاف رائے کس قدر مہلک ہو سکتا ہے۔ یہی اختلاف رائے کبھی دو انسانوں کو ایک دوسرے سے الگ کر سکتا ہے اور کبھی دو قوموں کے درمیان نفرت اور عداوت کے بیج پیدا کر کے انہیں جنگ پر آمادہ کر سکتا ہے۔

مگر سوال یہ ہے کہ انسانوں اور قوموں کے درمیان اس اختلاف رائے کو کس طرح دور کیا جائے۔ اور کون سی ایسی صورت اختیار کی جائے جس سے مختلف انسان ایک دوسرے کے ساتھ عموماً اتفاق کریں؟

ایک قوم یا سوسائٹی افراد سے بنتی ہے۔ اگر افراد کے درمیان وحدتِ فکر پیدا ہو جائے تو لازمی ہے کہ قوم یا سوسائٹی میں بھی وحدت فکر پیدا ہو جائے اور پھر مختلف اقوام میں بھی خیالات کی یگانگت پیدا ہو جائے۔

اسلام نے اس کا علاج اس طرح کیا ہے کہ زندگی گزارنے کے لیے کچھ بنیادیں متعین کر دی ہیں۔ جن پر ایک سماج کی تعمیر کی جا سکے۔ ان بنیادوں کو محکمات سے موسوم کیا گیا ہے۔ یہ بنیادیں ایسی ہیں کہ انسان کی آزادی رائے بھی سلب نہیں ہوتی اور اسے بے لگام بھی نہیں چھوڑا گیا ہے۔ انسان کو اختیار ہے کہ جس طرح چاہے، کھائے پیئے، لباس پہنے، مکان بنائے، دولت کمائے اور خرچ کرے، اپنی پسند کے مطابق آرام اور آسائش کے سامان بہم پہنچائے۔ مگر یہ سب کچھ کچھ بندھے ضابطے کے تحت کیا جائے۔ تاکہ انسان

حیوان نہ بن جائے اور عیش پرستی سے فطرت کی راہ نہ چھوڑ دے بہرحال یہ وہ اللہ کی دی ہوئی بنیادوں کو زیر نظر رکھ اور ان حدود میں رہ کر اپنے نفس کی آرزوؤں اور تمناؤں کو پورا کرے۔

ممکن ہے کہ کسی انسان کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو جائے کہ جب زندگی گزارنے کی بنیادیں اللہ کی طرف سے دی گئیں تو انسان کی آزادی کہاں رہی؟ آزادی تو ایسی ہونی چاہیے کہ انسان سب کچھ اپنی مرضی سے کرے اور اس کے خیالات پر باہر سے کوئی تسلط نہ ہو۔ اگر اسلام زندگی کی بنیادیں مقرر کرتا ہے اور انسان کو اپنی بنیادوں پر سوچنے اور عمل کرنے پر مجبور کرتا ہے تو انسان کی آزادی سلب ہوگئی اور وہ ان بنیادوں کے سامنے لاچار ہو گیا۔

مگر یہ صحیح نہیں۔ بنیادیں فراہم کرنے سے انسان کی آزادی رائے سلب نہیں ہو جاتی۔ آپ اس بات کو یوں سمجھ سکتے ہیں کہ آپ سیر سپاٹے کی غرض سے کسی جنگل میں سے گزرتے ہیں۔ وہاں آپ کی سہولت کے لیے حکومت نے دائیں بائیں جنگلوں اور باغوں کے گرد باڑ لگایا ہے اور آپ کے گزرنے کے لیے ایک شاہراہ بنائی ہے تاکہ آپ کا راستہ اچھی طرح متعین ہو جائے اور آپ اپنے مقام سے بھٹک نہ جائیں۔ کیا آپ یہ اعتراض کر سکتے ہیں کہ حکومت نے باڑ لگا کر اور راستہ متعین کر کے آپ کی آزادی سلب کر لی ہے۔ اور آپ اپنی مرضی کے مطابق گھوم پھر نہیں سکتے؟ نہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ آپ کا راستہ متعین کر کے اور باغوں اور جنگلوں کے گرد باڑ لگا کر حکومت نے آپ کے ساتھ تعاون اور ہمدردی کی ہے۔ اگر باڑ نہ لگائی گئی ہوتی تو ممکن تھا کہ آپ اپنی منزل مقصود کھو ڈالتے اور غلط راہ پر چل کر سیر کا لطف اٹھانے سے محروم رہ جاتے۔

اسلام نے بھی اسی طرح نیکی اور بدی کے حدود متعین کرنے کے لیے زندگی کے میدان کے آر پار ایک باڑ لگا دی ہے تاکہ انسان اس میدان کو پار کرتے کرتے اپنی راہ کھو نہ ڈالے اور اپنی منزل مقصود کو آرام سے پہنچ جائے۔ اس لیے بنیادی حدود مقرر کر لینے سے یہ اخذ کر لینا کہ انسان کی آزادیٔ رائے سلب ہو چکی ہے غلط ہے۔ بلکہ ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس طرح حدود متعین کر لینے سے انسان کو بہت سی سہولتیں بہم پہنچائی گئی ہیں۔ زندگی میں اپنا مقام حاصل کرنے کے لیے اس کے لیے ایک شاہراہ بنائی گئی ہے جس پر چل کر وہ آسانی کے ساتھ اپنا مقام حاصل کر سکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ جب زندگی کی بنیادیں مقرر کی جائیں اور لوگ انہی بنیادوں پر اپنے خیالات کی تعمیر کریں تو ایک ایسا سماج پیدا ہوگا جس کے افراد کے درمیان ہم آہنگی اور یگانگت پیدا ہوگی۔ اکثر لوگ ایک ہی طرح کے

زاویوں سے سوچنے لگیں گے اور انتشار دور ہوگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپس میں اچھے تعلقات ہوں گے۔ ایک دوسرے پر اعتبار کیا جائے گا۔ رشک کی نگاہوں سے ایک دوسرے کو نہ دیکھا جائے گا اور ایک پُرامن ماحول پیدا ہوگا۔

اس کی مثال ہمیں آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دور میں ملتی ہے اکثر ایسا واقع ہوتا تھا کہ ایک صحابی دوسرے سے کہتے کہ کل رات میں فلاں معاملے میں اس طرح سوچتا تھا دوسرے صحابی کہتے کہ میں بھی برابر یہی سوچتا تھا۔ دراصل ان میں ایک وحدت فکر پیدا ہوگئی تھی۔ وحدت فکر کا لازمی نتیجہ وحدت عمل ہے۔ اس لیے ان کے عمل میں بھی توافق اور اتحاد ہوا کرتا تھا۔ ان کے دور میں ایک مثالی سماج پیدا ہوا جس کے افراد گویا ایک ہی جان اور جسم تھے۔ بے شک ان کے یہاں اختلافات بھی ہوا کرتے تھے۔ مگر وہ اختلاف چھوٹی چھوٹی اور فروعی باتوں کی حد تک ہوا کرتے تھے اور اس اختلاف کو آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رحمت کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اس لیے کہ بنیادی امور میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا تھا۔

دراصل اسلام نظریات اور اصولوں کے مجموعہ کا حامل ہے۔ یہ اصول ایک مثالی سماج کی بنیاد ڈالتے ہیں۔ سماج کی صورت گری میں یہ اصول کارفرما ہوتے ہیں اور اس سماج کے افراد ان اصولوں کو پروان چڑھانے میں دن رات لگے رہتے ہیں جس طرح کہ شہد کی مکھیاں اپنے چھتے کی چھوٹی سی کائنات کو کامیاب بنانے میں اپنا اپنا پارٹ ادا کرتی ہیں۔ اسی طرح مسلم سماج کے افراد بھی اپنے اصولوں کے گرد پروانہ وار گھومتے رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں وحدت فکر پیدا ہوجاتی ہے۔

مسلم ممالک کے وسائل دولت

ایک جامع جائزہ

زمین کے کرے پر ایک سرسری نظر بھی یہ ظاہر کر دیتی ہے کہ مسلم ممالک دنیا کے ایک وسیع رقبے کو گھیرے ہوئے ہیں۔ مشرق و مغرب میں انڈونیشیا سے مراکش تک اور شمال و جنوب میں ترکی سے ٹانگانیکا تک یہ ممالک نصف کرے کے ایک وسیع حصے کو اپنے دائرے میں لیے ہوئے ہیں۔ فطرت نے انہیں فراوانی کے ساتھ زرعی، معدنی اور صنعتی دولت دے رکھی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ مسلم دنیا فوجی و حربی اہمیت کے نقطۂ نظر سے بھی بہت ہی مناسب مواقع پر آباد ہے۔ یہ معدنیات ہی کے لحاظ سے مال دار نہیں بلکہ افرادی قوت (man power) کے اعتبار سے بھی مضبوط ہے۔

آخری دو صدیوں میں مسلم دنیا اپنے اقتصادی امکانات کی کوئی اچھی مقدار پیش نہ کر سکی۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ مسلم ممالک ذاتی طور پر اس کے لیے نااہل تھے، بلکہ مختلف قومی و بین الاقوامی کش مکش اور دباؤ کے تحت یہ ممالک دوسروں کے ساتھ اچھی طرح مقابلہ نہیں کر سکے۔

مسلم ممالک کی پس ماندگی کا ایک بڑا عامل، نو آبادیاتی حکمرانوں کا ذلیل رویہ ہے۔ انہیں اپنے ماتحتوں کی بہتری اور ترقی سے دل چسپی نہ تھی، انہیں صرف اپنے آپ سے دل چسپی تھی۔ نو آبادیاں ان کے استحصال کے ذرائع تھیں۔ مسلم دنیا نو آبادیاتی حکمرانوں کو خام مواد مہیا کرتی تھی۔ اس خام مواد کو وہ مکمل صنعتی پیداوار میں بدل کر نو آبادیات کو اس سے بھر دیتے تھے اور پھر اس کی نہایت مہنگی قیمت وصول کرتے تھے۔

یہ بات اطمینان بخش ہے کہ مسلم دنیا گہری نیند سے بیدار ہو چکی ہے۔ مسلم نو آبادیات، غلامی کی زنجیریں توڑ رہی ہے جیسے جیسے وقت گزر رہا ہے۔ مسلم دنیا، اقتصادی اعتبار سے زیادہ سے زیادہ مستحکم ہوتی جا رہی ہے۔ دنیا میں تیل کے ذخیروں کا ۶۶ فی صدی مسلم ممالک میں پایا جاتا ہے۔ یہ ممالک دنیا کے قدرتی ربڑ

کا ۷۰ فی صدی پیدا کرتے ہیں۔ اسی طرح جوٹ کا ۸۰ فی صدی کھجوروں کا ۳ ۹ فی صدی دنیا بھر کے تاریل کا تہائی حصہ اور پام آئل کا ۶ ۵ فی صدی ان ممالک میں پیدا ہوتا ہے۔ ٹین کی پیداوار میں مسلم ممالک کا حصہ ۲ ۵ فی صدی ہے۔ ان ممالک میں دنیا کی فاسفیٹ چٹانوں کی ایک تہائی موجود ہے۔

اہم غذاؤں کے معاملے میں بھی مسلم دنیا کی حالت بری نہیں ہے۔ مسلم ممالک دنیا کے گیہوں کا ۱۰ فی صدی اور چاول کا ۲۴ فی صدی پیدا کرتے ہیں۔

جَو

بارلی (جو) پانچ انتہائی اہم اناجوں میں سے ایک ہے۔ جو کے بارے میں پہلے یقین کیا جاتا تھا کہ ابتداءً اس کی کاشت جنوبی مغربی ایشیا کے خشک علاقوں میں کہیں کی گئی تھی لیکن بعد کی تحقیق سے معلوم ہوا کہ جو کی کاشت کا ایک دوسرا ابتدائی مرکز حبشے کے پہاڑی خطوں میں کہیں تھا۔

جو کی پیداوار والے خاص مسلم ممالک یہ ہیں:۔ افغانستان، ایران، عراق، مراکش، شام اور ترکی۔ بارہ مسلم ممالک کی مجموعی پیداوار ۱۹۶۱ میں 6,633,000 میٹرک ٹن تھی جو دنیا کی پیداوار کا 7.5٪ ہوتا ہے۔ دنیا بھر کی پیداوار 87,700,000 تھی۔

پٹرول کے ذخیرے

پٹرول کو سیاہ سونا بھی کہتے ہیں۔ یہ انتہائی مفید معدنی شے ہے جو جدید دنیا میں استعمال کی جاتی ہے۔ مسلم ممالک کے علاقوں میں اس انتہائی مفید پیداوار کے سب سے بڑے ذخیرے ہیں۔ ۱۹۵۸ء میں دنیا کے مصدقہ خام پٹرولیم کے ذخیروں کا اندازہ 263,193 ملین بیرل تھا۔ ان ذخیروں کا تقریباً ۷۸ فی صدی مشرقی نصف کرے میں تھا اور ۲۲ فی صدی مغربی نصف کرے میں۔ مشرقی نصف کرے میں مشرق وسطیٰ کے مسلم ممالک میں ان مصدقہ ذخیروں میں سے 169,566 ملین بیرل تھا۔ مشرق بعید کے ممالک میں مجموعی ذخیرے 8,578 ملین بیرل ہے اس کا تقریباً ۸۷ فی صدی انڈونیشیا میں تھا۔ یعنی 7,463 ملین بیرل۔ افریقہ میں 8,147 ملین بیرل ذخیرہ تھا۔ اس کا ۶۱ فی صدی الجیریا کے میدانوں میں تھا اور بچے ہوئے ۳۹ فی صدی میں سے بڑا حصہ مصر میں تھا۔

کافی

کافی دنیا کی اقتصادیات میں ایک مخصوص پوزیشن رکھتی ہے۔ دوسری زراعتی فصلوں اور پیداوار کے مقابلے میں اگرچہ کافی کوئی بڑی زراعتی پیداوار نہیں ہے لیکن بین الاقوامی تجارتی اشیاء میں کافی سب سے اونچی زراعتی فصلوں میں سے ایک ہے ——— متعدد افریقی ملکوں کے لیے کافی واحد پیداوار ہے جو ملک سے باہر بھیجی جاتی ہے۔ سات مسلم ممالک یعنی کامرون، داہومی، گینیا، انڈونیشیا،

ملیشیا، سیرالیون اور یمن نے ۱۹۶۲ء میں کافی کی عالمی پیداوار کا ۵ فیصدی پیدا کیا۔

ناریل ناریل نہ صرف تجارتی افادیت کے لحاظ سے بلکہ عام استعمال کے اعتبار سے بھی انتہائی مفید ہے انڈونیشیا میں ناریل تین سو سے زیادہ طریقوں سے استعمال کیا جاتا ہے۔ ۱۹۶۲ء میں چھ مسلم ممالک:۔ انڈونیشیا، ملیشیا، جزائر مالدیپ، نائجیریا، پاکستان اور زنجبار نے ناریل کی عالمی پیداوار کا ۲۹٪ پیدا کیا (یعنی ۳,۵۰۰,۰۰۰ میٹرک ٹن ناریل پیدا کرنے میں انڈونیشیا تمام مسلم ممالک میں سب سے آگے ہے۔ انڈونیشیا میں ناریل کی پیداوار ۱۹۵۸ء میں ۷۵۹,۰۰۰ ٹن تھی جو ۱۹۶۲ء میں ۹٪ بڑھ گئی

روئی سندھ (پاکستان) کے بارے میں یقین کیا جاتا ہے کہ وہ دنیا میں روئی پیدا کرنے والا سب سے قدیم علاقہ ہے جہاں اس کی کاشت ۲۵۰۰ بی سی (قبل مسیح) سے بھی پہلے سے کی جا رہی ہے۔ ۲۰ ممالک: افغانستان، الجزائر، کامرون، چاڈ، ڈہومی، مصر، انڈونیشیا، ایران، عراق، مالی، مراکش، نائجر نائجیریا، پاکستان، سعودی عرب، سینیگال، صومالیہ، سوڈان، شام اور ترکی۔ روئی کی اچھی خاصی مقدار پیدا کرتے ہیں اور ان میں کچھ ممالک بہترین قسم کی روئی پیدا کرتے اور بہت زیادہ نفع حاصل کرتے ہیں۔ ۱۹۶۲ء میں مسلم ممالک کی مجموعی پیداوار ۱,۷۵۳,۰۰۰ میٹرک ٹن تھی جو عالمی پیداوار کی ۳۱٪ تھی (یعنی ۱۱,۰۰۰,۰۰۰ میٹرک ٹن تھی (یعنی ۱۱,۰۰۰,۰۰۰ میٹرک ٹن) روئی پیدا کرنے والے مسلم ممالک میں مصر کو مرکزی پوزیشن حاصل ہے۔ مصر کی روئی بہترین قسم کی ہے اور پیداوار کے لحاظ سے بھی اس کا سب سے اونچا مقام ہے۔ ۱۹۶۲ء میں اس کی مجموعی پیداوار ۴۷۹,۰۰۰ میٹرک ٹن تھی۔ مصر کے برآمدی سامان تجارت میں روئی کو خاص مقام حاصل ہے۔

کھجوریں ۱۹۶۲ء میں مسلم ممالک نے کھجوروں کی عالمی پیداوار کا ۹۳٪ پیدا کیا۔ خشک کھجوروں میں ان کے وزن کے لحاظ سے نصف سے زیادہ شکر، تقریباً ۲۰٪ پروٹین، فیٹ اور معدنی جوہر ہوتا ہے۔ کھجوروں کا ہر جز کارآمد اور معاشی اہمیت رکھتا ہے۔

۱۹۶۲ء میں کھجوروں کی عالمی پیداوار ۱,۴۹۰ ہزار میٹرک ٹن تھی جس میں ۱,۳۸۷ ہزار میٹرک ٹن صرف مسلم ممالک کی پیداوار تھی جو ۹۳٪ ہوتی ہے۔ ۱۱ مسلم ممالک: الجزائر، مصر، ایران، عراق، لیبیا، مراکش، نائجیریا، پاکستان، سعودی عرب، سوڈان اور تیونس کھجوریں پیدا کرتے ہیں۔ ۱۹۶۲ء میں مصر اس کی پیداوار میں سب سے اول تھا اس نے ۴۷۹ ہزار میٹرک ٹن پیدا کیا جو عالمی پیداوار کا ۳۳٪ ہے۔

زیادہ کھجوریں پیدا کرنے والے ملکوں میں عراق کا دوسرا نمبر ہے اور عراق بہترین قسم کی کھجوریں پیدا کرتا ہے۔ عراق کے بعد سعودی عرب ہے۔ ۶۲-۱۹۶۱ء میں اس کی پیداوار ۱۹۶ ہزار میٹرک ٹن تھی۔ سعودی عرب کے بعد ایران کا نمبر ہے۔ خوزستان ایران میں کھجوریں پیدا کرنے والا سب سے اہم علاقہ ہے۔ ۶۲-۱۹۶۱ء میں ایران کی پیداوار سو ہزار میٹرک ٹن تھی۔ الجزائر، پاکستان، مراکش اور تیونس کھجوریں پیدا کرنے والے دوسرے اہم ممالک ہیں۔

مونگ پھلی یہ مٹر کے خاندان کا ایک پودا ہے جو عام طور سے ریتیلی زمین میں پیدا ہوتا ہے۔ اس کی افادیت کے امکانات کے پیش نظر سمجھا جا رہا ہے کہ آلو کو چھوڑ کر اس کی کاشت کو زبردست غذائی اہمیت حاصل ہو جائے گی۔ سترہ ممالک :۔ کامرون، داہومی، مصر، گینیا، انڈونیشیا، لبنان، مالی، نائجر، پاکستان، نائجیریا، سینیگال، سیرالیون، صومالیہ، سوڈان، شام، ٹانگانیکا اور ترکی مونگ پھلی پیدا کرتے ہیں۔ ۶۰-۱۹۵۹ء میں ان ممالک کی مجموعی پیداوار ۲,۷۹۲,۰۰۰ میٹرک ٹن تھی جو بڑھ کر ۶۲-۱۹۶۱ء میں ۳,۵۶۰,۰۰۰ میٹرک ٹن ہو گئی جو عالمی پیداوار کا ۲۴٪ ہے (۱۴,۷۱۰,۰۰۰ میٹرک ٹن) نائجیریا ان ممالک میں سب سے اول ہے۔ مونگ پھلی اس ملک کی اقتصادیات کا بہت اہم جز ہے۔ اس کی پیداوار وہاں مسلسل بڑھ رہی ہے۔ ۶۰-۱۹۵۹ء میں ۹۰۰۰۰۰ میٹرک ٹن تھی جو ۶۲-۱۹۶۱ء میں ۱,۲۷۵,۰۰۰ میٹرک ٹن تک پہنچ گئی۔

جوٹ جوٹ، جس کو سنہرا ریشہ کہا جاتا ہے۔ اس کی کاشت ہند پاک برصغیر میں ماقبل تاریخ سے رائج ہے لیکن اتنی لمبی تاریخ کے باوجود اس برصغیر میں انیسویں صدی سے پہلے جوٹ کی کاشت نے ترقی نہیں کی۔ اس صدی میں جب بنگال کے متعلق حصوں میں خام جوٹ سے دستی صنعتیں تیار کی جانے لگیں تو جوٹ کی کاشت نے ترقی کی۔ دنیا کے جوٹ پیدا کرنے والے ممالک میں پاکستان سب سے آگے ہے۔ پاکستان کے علاوہ چند اور مسلم ممالک جوٹ پیدا کرتے ہیں یعنی مصر، انڈونیشیا، ایران، سوڈان اور ترکی۔ ۶۲-۱۹۶۱ء میں مسلم ممالک نے عالمی پیداوار کا تقریباً ۴۰٪ پیدا کیا جبکہ دنیا کی مجموعی پیداوار چھبیس لاکھ بیس ہزار میٹرک ٹن تھی۔

مکئی مکئی کی چھ خاص قسمیں ہیں۔ ڈینٹ کورن۔ (۲) فلنٹ کورن (۳) فلاور کورن (۴) سویٹ کورن (۵) پوپ کورن (۶) پوڈ کورن اور اس غلے کے تین بڑے استعمالات ہیں:۔ (۱) انسانی غذا کے

طور پر (۲) مویشی کے چارے کے طور پر (۳) صنعت و حرفت میں خام مواد کے طور پر۔

۱۹۶۱ء میں مسلم ممالک کی مجموعی پیداوار ۰۰۰ ر ۶۵۲ ر ۷ میٹرک ٹن تھی اور عالمی پیداوار ۰۰۰ ر ۰۰۰ ر ۲۱۶ میٹرک ٹن تھی۔ مسلم ممالک میں انڈونیشیا اس کی پیداوار میں سب سے آگے ہے۔ وہاں چاول کے علاوہ مکئی اصل غذا ہے۔ ۱۹۶۱ء میں وہاں اس کی پیداوار ۰۰۰ ر ۳۸۹ ر ۲ میٹرک ٹن تھی۔

یہ غلے حسب ذیل ۲۴ مسلم ممالک پیدا کرتے ہیں۔

باجرہ، جوار وغیرہ الجزائر، کامرون، داہومی، مصر، ایران، عراق، اردن، لبنان، مالی، موریتانیہ، مراکش، نائجر، پاکستان، نائجیریا، سعودی عرب، سینیگال، سیرالیون، سوڈان، شام، ٹانگانیکا، ٹیونس اور ترکی۔ ۱۹۶۱ء میں ان ممالک کی مجموعی پیداوار ۰۰۰ ر ۷۰۷ ر ۸ میٹرک ٹن تھی جو عالمی پیداوار کی تقریباً ۱۳% ہوتی ہے۔ (۰۰۰ ر ۰۰۰ ر ۶۸ میٹرک ٹن) ان غلوں کی پیداوار میں نائجیریا مسلم ممالک میں سب سے اول ہے۔ ۱۹۶۱ء میں وہاں اس کی پیداوار ۰۰۰ ر ۶۸۸ ر ۲ میٹرک ٹن تھی۔

قدرتی ربر قدرتی ربر فطرت کی ایک اہم پیداوار ہے۔ یہ اپنی اصلی شکل میں ایک درخت سے نکلتا ہے۔ سائنس نے اس کو ہزاروں طریقوں سے استعمال کرنے کے لائق بنا دیا ہے جس کی وجہ سے ربر انسان کے بہت ہی فرماں بردار اور لچک دار خادموں میں سے ایک ہو گیا ہے۔

چار مسلم ممالک، کامرون، انڈونیشیا، ملیشیا اور نائجیریا نیچرل ربر پیدا کرنے میں خاص پوزیشن رکھتے ہیں۔ ان ممالک کی مجموعی پیداوار ۱۹۶۱ء میں ۱۶۹۷ ہزار میٹرک ٹن تھی جو عالمی پیداوار کی ۷۰% سے زیادہ تھی۔ عالمی پیداوار ۲۴۰۵ ہزار میٹرک ٹن تھی ـــــ نیچرل ربر پیدا کرنے والے ممالک میں ملیشیا فرسٹ اور انڈونیشیا سکنڈ ہے۔ ملیشیا اور انڈونیشیا نے ۱۹۶۱ء میں عالمی پیداوار کا 35% اور 31% پیدا کیا۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ۱۹۷۰ء تک ملیشیا کی پیداوار اس وقت کے لحاظ سے 25% زیادہ ہوگی یہ بھی امید کی گئی ہے کہ ملیشیا اور انڈونیشیا کے بازار دنیا میں نیچرل ربر کے مرکز بن جائیں گے۔

گرم مسالے گرم مسالے، کھانا، دوائیں اور عطریات تیار کرنے اور انہیں دل پسند بنانے میں استعمال کیے جاتے ہیں اس کے علاوہ خاص قسم کے کھانوں کو ذائقہ دار اور مرغوب بنانے کے لیے بھی مستعمل ہیں۔ مسلم ممالک مختلف قسم کے گرم مسالوں سے بہت مالدار ہیں۔ انڈونیشیا، ایران، کشمیر (انڈیا)، نائجیریا، پاکستان، سیرالیون، ملیشیا اور زنجبار میں گرم مسالے پیدا ہوتے ہیں۔

سیاہ مرچ گرم مسالوں میں سیاہ مرچ انتہائی اہم گرم مسالہ ہے ۔ ۱۹۳۹ء میں انڈونیشیا نے عالمی پیداوار کی ۳۰٪ سیاہ مرچ پیدا کی ۔ ملیشیا اور نائجیریا بھی سیاہ مرچیں پیدا کرتے ہیں ۔

جائفل اور جوتری انڈونیشیا دنیا بھر میں سب سے زیادہ جائفل اور جوتری پیدا کرتا ہے ۔ ۵۵-۱۹۵۴ء میں اس کی پیداوار ۷۰ ہزار میٹرک ٹن تھی ۔

دار چینی اور تیزپات دار چینی اور تیزپات صرف انڈونیشیا اور ملیشیا میں پیدا ہوتے ہیں ۔

زعفران زعفران سب سے مہنگا گرم مسالہ ہے ۔ یہ کشمیر (انڈیا) اور ایران میں پیدا ہوتا ہے ۔ عرب نے اسپین میں اس کو پہنچایا اور اب تک اسپین زعفران پیدا کرتا ہے ۔

چاول چاول دنیا کی ۶۰٪ آبادی کی اصل اور اہم غذا ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ ہند پاک برصغیر اور جنوب مشرق کے ایشیائی ممالک چاول پیدا کرنے میں سب سے قدیم ہیں ۔ چاول پیدا کرنے میں ایشیا سب سے اہم اور اصل مقام ہے اور یہ مانسون کا عطیہ ہے ۔ چاول کی قسمیں اور پیدا کرنے کے طریقے مختلف ممالک میں مختلف ہیں ۔ ۲۳ مسلم ممالک چاول پیدا کرتے ہیں ۔ البانیا ۔ الجزائر ۔ افغانستان کامرون ۔ داہومی ۔ مصر ۔ گینیا ۔ انڈونیشیا ۔ ایران ۔ عراق ۔ ملیشیا ۔ مالی ۔ مراکش ۔ نائجر ۔ پاکستان ۔ نائجیریا ۔ سعودی عرب ۔ سینیگال ۔ سیرالون ۔ شام ۔ ٹانگانیکا ۔ ترکی اور زنجبار ۔ ۱۹۶۱ء میں ان ممالک کی مجموعی پیداوار ۲۵۳،۸۱۰،۰۰۰ میٹرک ٹن تھی جو عالمی پیداوار کا تقریباً ۱۴٪ ہے ۔ عالمی پیداوار ۲۴۲،۵۰۰،۰۰۰ میٹرک ٹن تھی ۔

لونگ گرم مسالوں میں دوسری اہم چیز لونگ ہے ۔ یہ زیادہ تر زنجبار میں پیدا ہوتی ہے ۔ یہ ملک تنہا عالمی پیداوار کی دو تہائی پیدا کرتا ہے ۔ لونگ کی پیداوار میں انڈونیشیا کا دوسرا درجہ ہے ۔ ملیشیا بھی لونگ پیدا کرتا ہے ۔

ادرک ملیشیا، سیرالون اور پاکستان میں ادرک پیدا ہوتی ہے ۔

سوگر بیٹ (چقندر) بیٹ، پلانٹ (Beta vul garis) کا زراعتی فارم ہے یہ پودا اصلاً بحر روم کے علاقے میں ہوتا ہے ۔ سوگر بیٹ کاشت کیے جانے

والے پودوں میں ایک خاص ندرت رکھتا ہے اس لیے کہ یہ ایک جدید ارتقا (ڈیولپمنٹ) ہے جس کی تاریخ اچھی طرح معلوم ہے۔ سوگربیٹ، بیٹ کی دوسری قسموں میں زیادہ اہم ہے۔ یہ قسم اس طرح کاشت کی جاتی ہے کہ پیداوار زیادہ ہو اور اس کی جڑوں میں شکر کی مقدار بھی وافر ہو۔ چھ مسلم ممالک:- افغانستان، البانیا، الجزائر، ایران، شام اور ترکی سوگربیٹ پیدا کرتے ہیں۔ سنہ ۶۲-۱۹۶۱ء میں ان ممالک کی مجموعی پیداوار 3,681,000 میٹرک ٹن تھی اور عالمی پیداوار 68,600,000 میٹرک ٹن۔ اس کی پیداوار میں ترکی تمام مسلم ممالک میں آگے ہے۔ سنہ ۶۱-۱۹۶۰ء میں اس کی مجموعی پیداوار 3,485,000 میٹرک ٹن تھی جو خراب موسم کی وجہ سے سنہ ۶۲-۱۹۶۱ء میں گھٹ کر 2,877,000 میٹرک ٹن ہوگئی۔

چائے چائے کی دو اصل قسمیں ہیں۔ سیاہ چائے اور سبز چائے۔ نباتاتی طور پر دونوں بالکل ایک ہیں۔ فرق ان کی تدبیر، اصلاح اور خشک کرنے میں ہے۔ مسلم ممالک: انڈونیشیا، ایران، ملیشیا، پاکستان اور ترکی نے ۱۹۶۱ء میں عالمی پیداوار کی ۱۰ فی صدی چائے پیدا کی۔ دنیا کی مجموعی پیداوار 819,000 میٹرک ٹن تھی۔ سنہ ۱۹۵۶ء میں مسلم ممالک کی پیداوار ۷۰ ہزار میٹرک ٹن سے زیادہ تھی جو سنہ ۱۹۶۱ء میں پچاسی ہزار میٹرک ٹن سے زیادہ ہوگئی ——— دوسری جنگ عظیم سے پہلے انڈونیشیا کا نمبر چائے پیدا کرنے والے ممالک میں تیسرا تھا۔ (مین لینڈ چائنا کو چھوڑ کر) لیکن جنگ عظیم ثانی میں وہاں چائے کی انڈسٹری کو نقصان پہنچا۔

تمباکو دنیا کے بہت عام تعیشات میں داخل ہے۔ اس کی بہت سی قسمیں ہیں۔ مٹی اور آب و ہوا کی معمولی تبدیلی تمباکو میں خوشبو، ساخت، لچک، رنگ اور دبازت کے لحاظ سے فرق پیدا کر دیتی ہے۔ تمباکو کی کاشت میں کھیت اور بیجوں کے پلاٹ تیار کرانے میں بڑی دستکارانہ محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کے پودوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے میں، کھیتوں کو خس و خاشاک سے پاک کرنے میں، پانی چھڑکنے میں، پتیاں چھانٹنے میں انہیں خشک کرنے میں، ان کی قسموں کو الگ کرنے میں ان کی درجہ بندی اور انہیں پیک کرنے میں بڑی مہارت اور محنت کی ضرورت پڑتی ہے۔

اٹھارہ مسلم ممالک: البانیہ، الجزائر، کامرون، داہومی، گینیا، انڈونیشیا، ایران، عراق، اردن، لبنان، ملیشیا، نائجر، مالی، نائجیریا، پاکستان، شام، ٹانگانیکا اور ترکی تمباکو پیدا کرتے ہیں۔ سنہ ۱۹۶۱ء میں ان ممالک کی مجموعی پیداوار 378,000 میٹرک ٹن تھی جو عالمی پیداوار کی تقریباً گیارہ فیصدی ہے۔ عالمی پیداوار

3,663,000 میٹرک ٹن)

آلو تازہ غذاؤں کی فصلوں میں آلو فرسٹ پوزیشن رکھتا ہے اور یہ دنیا کے تقریباً ہر ملک میں پیدا ہوتا ہے اور بہت بڑی اقتصادی اہمیت رکھتا ہے ــــــ بارہ مسلم ممالک : البانیہ، الجزائر، مصر، ایران، عراق، اردن، لیبیا، مراکش، پاکستان، شام، ٹیونس اور ترکی آلو پیدا کرتے ہیں۔ ۱۹۶۱ء میں ان ممالک کی مجموعی پیداوار 2,759,000 میٹرک ٹن تھی۔ عالمی پیداوار 280,600,000 میٹرک ٹن تھی ــــ مسلم ممالک میں ترکی کو اس کی پیداوار میں پہلی جگہ حاصل ہے۔ ۱۹۶۱ء میں مسلم ممالک کی مجموعی پیداوار میں ترکی کا حصہ ۵۰ فی صدی سے زیادہ تھا۔

گیہوں گیہوں مختلف آب و ہوا والے ملکوں میں پیدا ہوتا ہے۔ مانسونی ایشیا کو چھوڑ کر گیہوں باقی دنیا کی اصل غذا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ گیہوں کا اصل گھر وادی انڈس (پاکستان) ہے اور اس سے ملحق مشرق وسطیٰ کے علاقے اس کی کاشت کے طریقے مختلف ملکوں میں مختلف ہیں ــــــ اٹھارہ مسلم ممالک :۔ افغانستان، البانیہ، الجزائر، چاڈ، مصر، ایران، عراق، لیبیا، اردن، مالی، نائجر، مراکش، پاکستان، سعودی عرب، سوڈان، شام، ٹیونس اور ترکی گیہوں پیدا کرتے ہیں۔ ۱۹۶۰ء میں ان ممالک کی مجموعی پیداوار 33,470,000 میٹرک ٹن تھی۔ ترکی مسلم ممالک میں فرسٹ اور دنیا بھر میں گیہوں کی پیداوار کے لحاظ سے چھٹا درجہ رکھتا ہے۔ ۱۹۵۹ء میں وہاں گیہوں کی پیداوار 5,010,000 میٹرک ٹن تھی جو بڑھ کر ۱۹۶۰ء میں 8,590,000 میٹرک ٹن ہو گئی۔

پام آئل پام (کھجور یا اس قسم کا کوئی درخت) کے درخت بہت بڑی اقتصادی اہمیت رکھتے ہیں تیل کے علاوہ یہ غذا سایہ، لباس، عمارتی لکڑی، شکر، موم اور رنگ کے مواد مہیا کرتے ہیں اور چھوٹی مصنوعات کا ذریعہ ہیں۔

مسلم ممالک نے ۱۹۶۱ء میں عالمی پیداوار کا تقریباً ۵۹ فی صدی پام آئل پیدا کیا۔ پام آئل میں وٹامن اے کی وافر مقدار موجود ہوتی ہے۔ یہ تیل افریقہ کے مشرقی اور مغربی علاقوں میں ان کی اصل غذا کا ناگزیر جز ہے۔ ۱۹۶۱ء میں مسلم ممالک کی مجموعی مقدار 663,000 میٹرک ٹن تھی ــــــ پام آئل کی پیداوار میں نائجیریا کا پہلا نمبر ہے۔ یہی ملک اس کا اصل مقام ہے۔ اس تیل کی صنعت میں ترقی کی وجہ سے اس کی پیداوار میں اضافہ ہو گیا ہے اور یہ نائجیریا کے درآمدی سامان تجارت میں بہت اہم

پام کا مغز اور پام آئل دونوں کی قیمت میں نائجیریا کی برآمدی تجارت کا ۸۰٪ ہے۔ وہاں ۱۹۶۱ء میں اس کی مجموعی پیداوار ۸۷،۵۰،۰۰۰ ٹن تھی۔

شکر شکر کی مٹھاس ضرب المثل ہے۔ ماقبل تاریخ اور کلاسیکل دور میں کچھ میوے اور شہد بس یہی سب سے بڑی میٹھی غذائیں تھیں۔ موجودہ زمانے میں شکر حاصل کرنے کے بڑے ذرائع گنا اور سوگر بیٹ (میٹھا چقندر جس سے شکر بنائی جاتی ہے) ہے۔

گیارہ مسلم ممالک :۔ افغانستان، البانیہ، الجزائر، مصر، انڈونیشیا، ایران، لبنان، پاکستان، شام، ٹانگانیکا اور ترکی شکر پیدا کرتے ہیں۔ ۱۹۶۲ء میں ان ممالک کی مجموعی مقدار 2،020،000 میٹرک ٹن تھی۔ مسلم ممالک میں اس لحاظ سے انڈونیشیا کا فرسٹ نمبر ہے۔ وہاں جاوا کا چھوٹا سا جزیرہ شکر کی پیداوار کا اصل مقام ہے۔ وہاں ۱۹۶۲ء میں شکر کی مجموعی مقدار 6،75،000 میٹرک ٹن تھی۔

نمک سوڈیم کلورائڈ کی مختلف قدرتی اور صنعتی قسموں کو عام نمک کا نام دیا گیا ہے۔ نمک سمندر میں صاف شفاف چٹانوں کی شکل میں اور قدرتی کانوں میں پایا جاتا ہے۔ اس کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ سمندر ہی ہے۔ چٹانی نمک کے ذخیرے پاکستان اور ایران میں پائے جاتے ہیں۔ دنیا کے پندرہ مسلم ممالک : افغانستان، الجزائر، مصر، انڈونیشیا، عراق، اردن، لبنان، مراکش، پاکستان، سینیگال، سوڈان، شام، ٹانگانیکا، تیونس اور ترکی، نمک پیدا کرتے ہیں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ۱۹۶۰ء میں ان ممالک کی مجموعی پیداوار 2،25،23،000 میٹرک ٹن تھی۔ مصر نمک کی پیداوار میں فرسٹ نمبر رکھتا ہے۔ مصر میں نمک کے قابل لحاظ ذخیرے ہیں اور اس کے اہم اقتصادی وسائل میں سے ایک ہیں۔ ۱۹۵۹ء کے مقابلے میں ۱۹۶۱ء میں مصر کی نمک کی پیداوار کافی بڑھ گئی ہے۔

ٹین ٹین کی اہمیت میں کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ دنیا میں ٹین کا سب سے بڑا بلٹ (حلقہ) جنوب مشرقی ایشیا میں واقع ہے۔ جنوب مغرب چائنا (ین لینڈ) سے پھیلتا ہوا برما، لاؤس، تھائی لینڈ سے ہوتا ہوا یہ حلقہ انڈونیشیا اور ملیشیا تک پہنچا ہے۔ ٹن اوور (ٹین کی کچی دھات) پیدا کرنے میں دنیا کے اندر ملیشیا اور انڈونیشیا کا پہلا نمبر اور دوسرا نمبر ہے۔ تنہا ملیشیا نے ۱۹۶۱ء میں عالمی پیداوار کا ۴۳٪ پیدا کیا۔ چھ مسلم ممالک یعنی ملیشیا، انڈونیشیا، کامرون، مراکش، نائجر اور نائجیریا نے ۱۹۶۱ء میں

(باقی صفحہ ۵۹ پر ملاحظہ ہو)

مہادیوی ورما

ترجمہ:۔ محمد فاروق

دورِ حاضر کی عورت

(۲)

اس وقت ہم جنھیں دورِ حاضر کی نمائندہ کی شکل میں دیکھتے ہیں وہ خواتین تین درجوں میں رکھی جاسکتی ہیں۔ تین ندیوں کے سنگم کی تین رودوں کی طرح وہ ایک جیسی ہوکر بھی اپنی خصوصیات میں مختلف ہیں۔ کچھ ایسی ہیں جنھوں نے اپنی قدیمی حدود سے تجاوز کرکے پچھلے کچھ برسوں میں سیاسی تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے مردوں کی غیر معمولی مدد کی۔ کچھ ایسی تعلیم یافتہ خواتین ہیں جنھوں نے اپنے سازگار حالات میں بھی معاشرتی زندگی کے نقائص کا کوئی مناسب حل نہ پاکر اپنی تعلیم اور بیداری کو معاش اور عام مقاصد کا ذریعہ بنایا اور کچھ ایسی کامیاب خواتین ہیں جنھوں نے تھوڑی سی تعلیم کے ساتھ بہت سی مغربی جدیدیت (Modeanito) کو ملاکر اپنی گھریلو زندگی کو ایک نئے سانچے میں ڈھالا ہے۔

یہ کہنا نامناسب ہوگا کہ ترقی پسند نسواں سوسائٹی کے یہ مختلف طبقے کسی حقیقی فرق کی بنیاد پر قائم ہیں۔ کیونکہ ایسے طبقوں کا انحصار ایسی خصوصیات پر رہتا ہے جو زندگی کی گہری تہہ میں ایک ہوجاتی ہیں یہ سمجھنا کہ ملکی تحریک میں حصہ لینے والی عورتیں دوسرے میدان میں کام نہیں کرتیں یا تعلیم وغیرہ کے میدان میں کام کرنے والی مغربی جدیدیت سے دور رہ سکتی ہیں۔ غلط خیال کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے حقیقت میں یہ درجے ان کے خارجی زندگی کی مماثلت کے اندر کام کرنے والے رجحانات کو سمجھنے کے لیے ہی ہے۔ جدیدیت کی ہم رنگی کو ہندوستان کی بیدار خواتین نے مختلف شکلوں میں اختیار کیا ہے جو فطرتاً ہونا ہی تھا۔ ایسی کوئی جدت نہیں ہے جو ہر ایک شکل کو مختلف شکل میں جدید دکھائی دیتا۔ کیونکہ دیکھنے والے کا مختلف نقطۂ نظر ہی اس کی بنیاد ہوتی ہے۔ ہر ایک عورت نے اپنی دشواری، اپنے آرام اور تکلیف اور اپنی انفرادی زندگی کے اندر سے اس جدت پر نظر ڈالی۔ اس لیے ہر ایک کو اس میں اپنے

قلیل نقائص کے ازالے کی علامتیں نظر آئیں۔

ان سب کے کردار کو مختلف شکل میں متاثر کرنے والے نقطہائے نظر کا الگ الگ مطالعہ کرنے کے بعد ہی ہم ماڈرنٹی کے ماحول میں پروان پائی ہوئی عورت کی مشکلات کو سمجھ سکیں گے۔ ان کی حالت پرانے رسم و رواج کی پابند عورتوں کی حالت سے مختلف معلوم ہونے پر بھی اس کے مقابلے میں اچھی نہیں ہے۔ انہیں پرانے خیالات کے حامل مردوں کی سوسائٹی بے قدری کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ جدید نقطۂ نظر کے حاملین تائید اور حمایت کا جذبہ رکھتے ہوئے بھی عملاً مدد دینے سے قاصر رہتے ہیں اور تیز قسم کے خیالات رکھنے والے حوصلہ افزائی کرکے بھی انھیں اپنے ساتھ لے چلنا دشوار سمجھتے ہیں۔ درحقیقت دورِ حاضر کی عورت جتنی اکیلی ہے اتنی پہلے دور کی عورت نہیں۔ کیونکہ اس کے پاس تعمیر کے محض سامان ہیں کچھ تعمیر شدہ نہیں۔ چوراہے پر کھڑے ہوکر راہ معین کرنے والے شخص کی طرح وہ سب کی توجہ کو منعطف کرتی رہتی ہے۔ کسی سے کوئی ایسی ہمدردی نہیں پاتی جو اسے مدد دے سکے۔ یہ حالت خواہ پرکشش معلوم ہو لیکن راحت بخش نہیں کہی جاسکتی ـــــ ملکی تحریکات میں حصہ لینے والی خواتین نے ماڈرنٹی کو قومی بیداری کی شکل میں دیکھا اور اسی بیداری کی طرف بڑھنے میں اپنی ساری کوششیں صرف کردیں۔ اس کے زمانے میں عورت نے جو کیا وہ غیر معمولی ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی طاقت کا ثبوت تھا۔ اگر اس کی قربانیاں اور اس کے ایثار بھولے جاسکتے ہیں تو اس تحریک کی تاریخ بھی بھولی جاسکے گی۔ اس ترقی سے عام لحاظ سے نسواں سوسائٹی کو بھی فائدہ پہنچا۔ اس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی کمزوری دور ہوگئی۔ اس کی نری جذباتیت ختم ہوگئی اور اس کی نسائیت سے کمزوری کا الزام رفع ہوگیا۔ مرد نے ضرورت سے مجبور ہوکر ہی اسے ساتھ آنے کی اجازت دی۔ لیکن عورت نے اس سے قدم ملاکر چل کر ثابت کردیا کہ مرد نے اس کی حرکت پر پابندی لگاکر بے انصافی ہی نہیں ظلم بھی کیا ہے جو لنگ ہے اس کے ساتھ تو بے حرکتی کی لعنت لگی ہے۔ باحرکت کو لنگ بناکر رکھنا بڑی سنگ دلی ہے۔

ملک و قوم کو آگے بڑھانے میں عورت نے اپنا بھی کچھ بھلا کیا۔ یہ سچ ہے لیکن شہد کے ساتھ کچھ شور بھی ملا تھا۔ اس نے جو پایا وہ بھی بیش قیمت ہے اور جو کھویا وہ بھی بیش قیمت تھا۔ اس قول میں نرالے پن کے ساتھ ساتھ سچائی بھی شامل ہے۔

تحریک کے زمانے میں جن عورتوں نے ماڈرنٹی کی پکار سنی تھی اس میں سب ہی طبقوں کی تعلیم یافتہ

عورتیں رہیں۔ جو خواتین ان کی قائد تھیں ان کے پاس اتنا موقع نہیں تھا کہ وہ ان سب کے ذہنی ارتقار کی طرف توجہ دے سکتیں۔

یہ سچ ہے کہ انھیں سخت تر نظم وضبط سکھایا۔ لیکن وہ فوجیوں کے نظم وضبط کی طرح ایک رخا ہی رہا۔ وہ یہ نہ جان سکیں کہ میدان جنگ میں ہر لمحہ مرنے کو تیار فوجی کا نظم وضبط سماج میں زمانے تک زندہ رہنے کے خواہاں شخص کے ضبط سے مختلف ہے۔ ایک حدود کی حفاظت کے لیے جان دیتا ہے تو دوسرا حدود کے مقاصد کے لیے زندہ رہتا ہے۔ ایک اچھا فوجی مرنا سکھا سکتا ہے اور ایک اچھا شہری جینا۔ ایک میں موت کا جمال ہے اور دوسرے میں زندگی کی عظمت۔ لیکن اچھے فوجی کا اچھا شہری ہونا اگر لازم ہوتا تو شاید زندگی زیادہ حسین بن گئی ہوتی۔

فطری طور پر فوجی کی زندگی میں جوش غالب ہوگا اور شہری کی زندگی میں ہمدردی اور دردمندی اسی سے ایک کے لیے جو آسان ہے وہ دوسرے کے لیے ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔

تحریک کے زمانے میں عورتوں نے فوری ضبط اور اس سے پیدا شدہ سختی کو زندگی کا ضروری جزو مان کر قبول کیا۔ اپنے پیش نظر مقصد کے حصول کا محض ذریعہ مان کر نہیں۔ اس سے ان کی زندگی میں جو ایک خشکی پھیل گئی ہے اس نے انھیں تک محدود نہ رہ کر ان کے محفوظ عائلی زندگی کو بھی مس کیا ہے حقیقت میں ان میں سے اکثر خواتین رسم ورواج کے بارے دبی جا رہی تھیں اس لیے ملک کی بیداری کے ساتھ ساتھ ان کے انقلاب کو بھی اپنے اشتہار کا موقع اور اس کے موزوں ذرائع حاصل ہو گئے۔ وہاں ان حالات میں فطری بھی تھا لیکن وہ یہ یاد نہ رکھ سکیں کہ بغاوت صرف زندگی کے خاص ارتقار کا ذریعہ ہو کر ہی کارآمد رہ سکتی ہے وہ سماجی قوت کا تعارف نہیں اس کے صبر کا اظہار ہے۔

اس دردانگیز دور کے افتتاح میں حصہ لینے والی عورتوں نے زندگی کے سارے لطیف و نازک آرٹ ضائع کرکے دنیا کی جنگ میں بغاوت کو اپنا بے خطا ہتھیار بنایا۔ سماج ان کے ایثار کا احترام کرتا ہے لیکن ان کی بغاوت آمیز خشک مزاجی سے خوف زدہ ہے۔ زندگی کی پہلی سی حسین اور کامل تصویر ان میں نہیں ملتی۔ اس لیے مختلف جدیدیت کے حامی بھی انہیں شبہہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ شروع ہی سے عورت کی زندگی رقیق شے کی طرح سبھی حالات کے مناسب حال بنتی آرہی ہے۔ اس لیے اس کی دشواری حیرت اور خوف کا سبب بن گئی ہے۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ مطلق العنانی کو چھوتی

[illegible] زادی ہر ایک اچھی بری پابندی کے بارے میں نفرت و بے اعتنائی کا جذبہ، متعدد اچھے برے انھوں سے رفاقت اور بلا سبب سختی و شدت وغیرہ ان کی خصوصیات ہیں۔ اس خیال میں غلط فہمی بھی شامل ہے لیکن یہ بالکل بے بنیاد نہیں کہا جا سکتا۔ متعدد خاندانوں میں زندگی کی تلخی کا اظہار عورتوں کی سختی کا انتہا کو پہنچ جاتا ہی ہے۔ یہ سچ ہے لیکن اس کے لیے صرف عورتیں ہی قصوروار نہیں ٹھہرائی جا سکتیں۔ حالات اتنے سخت تھے کہ انھیں ان پر قابو پانے کے لیے سخت ترین ہتھیار اختیار کرنا پڑا۔ ان میں جو سوچنے سمجھنے والی تھیں انھوں نے قدیم عورت کی طرح تلوار سے کنگن کا میل کرا دیا۔ جو نہیں تھیں انھوں نے اپنی نسائیت سے زیادہ بغاوت پر یقین کیا۔ انہیں جینے کا آرٹ نہیں معلوم ہے، لیکن کشمکش کے فن سے واقف ہیں جو حقیقت میں ناقص اور نامکمل ہے۔ کشمکش کا فن لے کر تو انسان پیدا ہی ہوا ہے، اسے سیکھنے کہیں جانا نہیں پڑتا۔ اگر حقیقت میں انسان نے اتنے زمانوں میں کچھ سیکھا ہے تو وہ جینے کا فن کہا جا سکتا ہے۔ کشمکش زندگی کی ابتدا ہو سکتی ہے، آخر نہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ کشمکش سے پاک زندگی ہی زندگی ہے۔ حقیقت میں نوع انسانی ہلاکت خیز کشمکش سے اپنے آپ کو بچاتی ہوئی ارتقاء پذیر کشمکش کی طرف بڑھتی جاتی ہے۔

سماجی ارتقاء کا مطلب بھی یہی ہے کہ انسان اپنی افادیت بڑھانے کے لیے ساتھ ہلاکت خیز امکانات کو کم کرتا چلے۔ کسی حالت میں وہ برف کی طرح اپنے مقام پر ٹھہر جاتا ہے اور کسی حالت میں وہ پانی کی طرح رقیق ہو کر نامعلوم سمت میں بہ چلتا ہے۔ عورت کی زندگی بھی اپنے ارتقاء کے لیے ایسی ہی موافقت چاہتی ہے لیکن سماجی زندگی میں حالات کی موافقت میں یکسانیت نہیں ہے۔ ہم اپنا ایک ہی مرکزی نقطہ بنا کر کشمکش حیات میں نہیں ٹھہر سکتے، اور نہ فلاح پا سکتے ہیں۔ عورت کی قوت حیات میں زوال اسی وجہ سے آیا کہ وہ اپنے موافق یا ناموافق حالات کے مطابق بنانے میں قاصر رہی۔ اس نے ایک مرکزی نقطے پر اپنی نگاہ کو اس وقت تک جمائے رکھا جب تک کہ چاروں طرف کے حالات نے اس کی نگاہ کو نہیں روک لیا۔ اس حالت میں روشنی سے اچانک اندھیرے میں آتے ہوئے شخص کی طرح وہ کچھ بھی نہ دیکھ سکی۔ پھر بھی فطری حالت میں آنے پر اس نے اسی پچھلے تجربے کا اعادہ کیا۔

زمانہ بیداری کی پرستار خواتین کی زندگی بھی اس نقص سے پاک نہیں رہی۔ انھوں نے اپنی نگاہ کا ایک ہی مرکز بنا رکھا ہے اس لیے انہیں اپنے چاروں طرف کے مشکوک و مشتبہ ماحول کو دیکھنے کی نہ فرصت ہے

اور خود غرض۔ وہ سمجھتی ہیں کہ وہ قومی وملکی بیداری کی قاصد کے علاوہ اور کچھ نہ بن کر بھی اپنی زندگی کو کامیابی کی آخری منزل تک پہنچا دیں گی۔ اس سمت میں ان کی حرکت میں رکاوٹ ڈالنے والوں کی تعداد کم نہیں رہی۔ یہ سچ ہے۔ لیکن اسی لیے وہ اپنی واقعی اپنانے والی راہ بھی نہیں دیکھنا چاہتیں۔ یہ کہنا بہت غلط نہیں کہا جا سکتا۔ ایسا کوئی ایثار یا قربانی نہیں جس کا سرچشمہ نسائیت نہ رہی ہو۔ اس لیے صرف ایثار کے حق کو پانے کے لیے اپنے آپ کو ایسا خشک مزاج بنا لینے کی کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

جن تعلیم یافتہ خواتین نے گھر کی پابندیوں کی بے حرمتی کر کے عام میدان میں اپنا راستہ ہموار کیا ان کی کہانی بھی بہت کچھ ایسی ہی ہے۔ ان کے آگے دورِ جدید کی پکار اور پیچھے قدیم رسم ورواج کا بار رکھا۔ کسی خاص ایثار یا قربانی کا جذبہ لے کر وہ زندگی کے نئے ازم میں آگے بڑھی تھیں۔ یہ کہنا صحیح نہ ہوگا حقیقت میں گھر کے حدود کے اندر ان سے اتنے زیادہ ایثار اور قربانی کا مطالبہ کیا گیا کہ انھوں نے اس کے خلاف بغاوت کی۔ برضا ورغبت دی ہوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی انسان کی عطا کہلاتی ہے لیکن ناپسندیدگی کے ساتھ دیا ہوا کثیر سے کثیر مال بھی انسان کا ذلیل محکومیت ٹیکس ہی سمجھا جائے گا۔ عورت کو جو کچھ جبراً دینا پڑتا ہے وہ اس کی عطا کی عظمت نہ بڑھا سکے گا۔ یہ تعلیم یافتہ عورت اچھی طرح جان گئی تھی مستقبل میں ہندوستانی سماج کا کیا نقشہ ہو، اس میں عورت کا کیا مقام ہو، اس کے اختیارات کے کیا حدود ہوں، وغیرہ مسائل کا حل آج کی بیدار اور تعلیم یافتہ عورت پر منحصر ہے۔ اگر وہ اپنی برہمی کی وجوہ واسباب کو یاد رکھ سکے اور مرد کی خودغرضی کو فراموش کر سکے تو آئندہ سماج کا خواب حسین اور سچا ہو سکتا ہے لیکن اگر وہ اپنی مخالفت کو ہی آخری مقصد مان لے اور مرد سے سمجھوتے کے سوال کو شکست کا ہم معنی سمجھ لے تو زندگی کا نظم غیر متعین اور انتشار کا سلسلہ ڈھیلا ہوتا جائے گا۔

انقلاب کی قاصد اور آزادی وحریت کی علم بردار عورت کا کام زندگی کے صحت مند تعمیر میں پورا ہوگا صرف تخریب وانہدام میں نہیں۔ (ختم شد)

صفحہ ۵۴ کا بقیہ) عالمی پیداوار کا 52٪ پیدا کیا۔

کوکو کوکو ایک صحیح مشروب اور مقوی ولذیذ غذا ہے۔ عام طور سے یہ چاکلیٹ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ دنیا کے بہت کم ملک کوکو پیدا کرتے ہیں۔ اس لیے کہ اس کے لیے مخصوص قسم کی

آب و ہوا اور مخصوص حالات کی ضرورت پڑتی ہے۔ چار مسلم ممالک کامرون، انڈونیشیا، نائجیریا اور سیرالیون کوکو پیدا کرتے ہیں۔ سنہ ۶۱ء میں ان ممالک کی مجموعی پیداوار عالمی پیداوار کی ۲۳ فی صدی سے زیادہ تھی۔
(ریڈینس، دہلی، خاص نمبر سے ترجمہ)

(بقیہ ارشادات رسول)

هي مواقيت للناس فجعلها لصوم المسلمين ولافطارهم ولمناسكهم وحجهم ولعدة نسائهم ومحل دينهم في اشياء والله اعلم بما يصلح خلقه

(ابن جریر ج ۲)

وہ آیت نازل ہوئی جو تم سنتے ہو پس اللہ نے ان کو مسلمانوں کے روزے کے لیے اور افطار کے لیے ان کے مناسک اور حج کے لیے ان کی عورتوں کی عدت شمار کرنے کے لیے اور ان کے قرض دین کی ادائیگی کا وقت بتانے کے لیے مقرر کیا ہے اور اس کے علاوہ بھی بہت سے فائدوں کے لیے اور اللہ زیادہ جانتا ہے کہ اس کی مخلوق کے لیے کیا بہتر ہے۔

ابن جریر نے دوسری آیت یہ نقل کی ہے:-

عن ابن جريج قال: قال الناس لم خلقت الاهلة فنزلت يسئلونك عن الاهلة قل هي مواقيت للناس لصومهم وافطارهم وحجهم ومناسكهم قال قال ابن عباس وقت حجهم وعدة نسائهم وحل دينهم

(ابن جریر ج ۲)

ابن جریج سے روایت ہے کہ لوگوں نے کہا۔ یہ گھٹتے بڑھتے چاند کیوں پیدا کیے گئے ہیں پس یہ آیت نازل ہوئی کہ لوگ تم سے چاند کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ تم ان سے کہہ دو کہ یہ لوگوں کے صوم و افطار اور حج و مناسک کے اوقات متعین کرنے کے لیے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ ان کے حج کا وقت اور ان کی بیویوں کی عدت اور ان کے ادائے دین کے پورے ہونے کا وقت بتانے کے لیے

حضرت علیؓ کی جس روایت کا حوالہ ابن کثیر نے دیا ہے ابن جریر نے اس کی روایت ان الفاظ میں کی ہے

عن علی انہ سئل عن قولہ مواقیت للناس قال مواقیت اللہ ھکذا وھکذا وقبض ابھامہ فاذا رایتموہ فصوموا واذا رایتموہ فافطروا فان غم علیکم فاتموا ثلثین	حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ ان سے اللہ کے قول مواقیت للناس کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے کہا ان ہلالوں سے اوقات معلوم ہوتے ہیں۔ مہینہ اس طرح ہوتا ہے اور اس طرح ہوتا ہے اور اس طرح ہوتا ہے اور انھوں نے اپنے ہاتھ کے انگوٹھے کو پکڑا پس جب تم چاند دیکھو تو روزہ رکھو اور جب چاند دیکھو تو افطار کرو اور تم کو چاند نظر نہ آئے تو تیس دن پورے کرو۔
(ابن جریر جلد ۲)	

سورۂ بقرہ کی اس آیت اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح و تنفیذ اور ان تفسیری تفصیلات سے یہ بات متحقق ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی عبادات اور ان کے معاملات کے اوقات کی تعیین کے لیے خالص قمری مہینوں اور چاند کے حساب کو مقرر کیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو نافذ کر دیا اور اس وقت سے لے کر آج تک مسلمان اپنی عبادات اور عورتوں کی عدت کے شمار اور اسی طرح کے دوسرے احکام میں اسی پر عمل کر رہے ہیں اور تمام علمائے امت اس پر متفق ہیں کہ ہجرت نبوی کے ابتدائی دور ہی سے مسلمانوں میں قمری سال رائج اور نافذ ہے۔ اور اس بات پر بھی سب کا اتفاق ہے کہ رمضان المبارک کے روزے ہجرت کے دوسرے سال فرض ہوئے ہیں۔ سورۂ بقرہ کی یہ آیت صوم و اعتکاف سے متعلق آیات کے فوراً بعد ہی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ آیت آیات صوم کے ساتھ ہی یا اس سے بالکل قریب زمانے میں آگے پیچھے نازل ہوئی ہے۔

اس آیت میں خاص طور پر حج کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ سوال یہ پیدا ہوا کہ مواقیت للناس کہنے کے بعد خاص طور پر عبادت حج کا ذکر کیوں کیا گیا جب کہ حج بھی مواقیت کے عموم میں داخل تھا۔ اس سوال کے جواب میں امام رازیؒ فرماتے ہیں:۔

واحسن الوجوہ فیما ذکرہ	اس کی سب سے بہتر توجیہ وہ ہے جس کا ذکر

القفال رحمہ اللہ وھو ان افراد الحج بالذکر انما کان لبیان ان الحج مقصور علی الاشھر التی عینھا اللہ تعالیٰ لفرضہ وانہ لا یجوز نقل الحج من تلک الاشھر کما کانت العرب تفعل ذلک فی النسی (تفسیر کبیر ج ۲ ص ۱۶۰)

قفال رحمۃ اللہ نے کہا ہے کہ حج کا الگ سے ذکر یہ واضح کرنے کے لیے کیا گیا ہے کہ حج انہی مہینوں تک محدود ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے اس فرض کے لیے معین فرمایا ہے اور حج کو ان مہینوں سے دوسرے مہینوں کی طرف منتقل کرنا جائز نہیں ہے جیسا کہ عرب نسی کے قاعدے سے ایسا کرتے تھے

معلوم ہوا کہ قرآن نے ہجرت کے دوسرے ہی سال نسی کے باطل ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے بھی حج کے مستقلاً ذکر کی توجیہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے :-

اور حج کے خاص بیان فرمانے کی یہ بھی وجہ ہے کہ ذی قعدہ، ذی الحج، محرم، رجب، یہ چار مہینے اشہر حرام تھے ان میں لڑائی کرنا کسی کو قتل کرنا حرام تھا۔ اہل عرب کو ان مہینوں میں لڑائی پیش آتی تو مہینوں کو مقدم موخر کر کے لڑائی کرتے مثلاً ذی الحجہ یا محرم میں لڑائی پیش آتی تو اس کو صفر بنا لیتے اور صفر آتا تو اس کو ذی الحجہ یا محرم ٹھہرا لیتے ان کے اس خیال کے ابطال کی غرض سے یہاں حج کی تصریح فرما دی کہ جو ایام حج کے لیے اللہ نے مقرر فرمائے ان میں تقدم تاخر ہرگز جائز نہیں۔

(برحاشیہ ترجمہ شیخ الہندؒ)

معلوم ہوا کہ اہل جاہلیت کا نسی کا قاعدہ جو قمری شمسی تقویم سے مرکب تھا (جیسا کہ بعض مورخین مفسرین کہتے ہیں) ہجرت کے دوسرے ہی سال باطل قرار دیا جا چکا تھا اور مسلمانوں کی عبادات و معاملات کے لیے خالص قمری مہینے نافذ کر دیے گئے تھے۔ سید رشید رضا تفسیر المنار میں لکھتے ہیں :-

یعنی یہ نئے چاند لوگوں کے لیے عبادات میں سے صوم و حج وغیرہ کے اوقات کی تعیین کے ذریعے ہیں اور معاملات میں سے مثال کے طور پر عورتوں کی عدت اور معاہدات کی مدتوں کی تعیین کے ذریعے ہیں۔ اس لیے کہ چاند سے توقیت حساب جاننے والے اور نہ جاننے والے، دیہاتی اور شہری سب کے لیے آسان ہے۔ لہذا یہ چاند تمام لوگوں کے لیے اوقات کی تعیین کا ذریعہ ہیں۔ رہے شمسی سنہ تو ان کے مہینے حساب سے معلوم ہوتے ہیں اور وہ صرف حساب داں کے لیے مناسب ہیں اور حساب جاننے والے بھی شمسی سنہ کو اس وقت ضبط کر سکے جب طویل زمانے کی محنت سے علوم ریاضی نے

تمام کرلی۔ (تفسیر المنار ج ۲ ص ۲۰۲)

اس بات پر پوری امت مسلمہ متفق ہے کہ رمضان کے روزے بالکل ابتدا ہی سے خالص قمری مہینوں کے حساب سے فرض کیے گئے اور اسی کے مطابق نبی علیہ السلام نے روزے رکھے اور آج تک مسلمان اسی کے مطابق روزے رکھ رہے ہیں۔

ان احادیث سے جن کا ذکر اوپر گزرا' دوسری بات یہ واضح ہوتی ہے کہ شریعت نے رمضان کے روزے شروع کرنے اور انہیں ختم کرنے کو رویت ہلال سے متعلق کیا ہے۔ حسابی طور پر محض امکان رویت نہ روزوں کے لیے کافی ہے اور نہ اختتام کے لیے۔ یہ بات اپنی جگہ خود واضح ہے کہ رویت ہلال کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر مسلمان خود اپنی آنکھ سے اس کو دیکھ لے بلکہ مطلب یہ ہے کہ رویت ثابت ہو جائے۔ اسی سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ جب محض امکان رویت رمضان اور عید کے لیے کافی نہیں ہے تو جہاں رویت کا امکان بھی نہ ہو وہاں رمضان کے شروع ہونے اور عید منانے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ایک ملک کی رویت کسی دوسرے ایسے ملک کے لیے ثبوت نہیں بن سکتی جہاں رویت کا امکان ہی نہ ہو۔

(صلا کے بعد)

جانوروں کی نفسیاتی کہانیاں سید رفیق حسن۔ صفحات ۱۹۲۔ قیمت دو روپیے
ناشر: کتاب کار پبلیکیشنز۔ رام پور۔ یوپی

ناشر نے اشاریہ میں لکھا ہے کہ جانوروں کی نفسیات سے متعلق کہانیاں اردو میں بہت کم ہیں اور یہ کہ اس مجموعے کا ہر افسانہ ایک جواہر پارے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ناشر کے اس خیال کی میں نہ نفی کر سکتا ہوں نہ اثبات۔ اس لیے کہ مجھے جانوروں کی نفسیات کا علم نہیں۔ اتنی بات ضرور محسوس ہوئی کہ ان کہانیوں میں جگہ جگہ مذہبی معتقدات کی غلط ترجمانی کی گئی ہے اور فن کار نے مضحکہ اڑانے سے بھی پرہیز نہیں کیا ہے۔ یہ شاید جانوروں کی نفسیات میں استغراق کا نتیجہ ہو۔ ان "جواہر پاروں" کی اشاعت بھی تبصرہ نگار کے نزدیک ضروری نہ تھی۔ ایسا فن جو مذہبی معتقدات کو مجروح کرے تعمیری فن نہیں ہے۔

معذرت افسوس ہے کہ مقالہ "زکوٰۃ کا مصرف و فی سبیل اللہ" کے صفحات ۱۶ و ۱۷ الٹ چھپ گئے ہیں۔ مہربانی فرما کر قارئین صفحات لگا کر ملاحظہ فرمائیں اور ہماری معذرت قبول کریں۔

تنقید و تبصرہ

تعلیم کا مسئلہ مولانا سید حامد علی۔ صفحات ۴۰ کاغذ، کتابت، طباعت بہتر۔ قیمت مع محصولڈاک ۴۰ پیسے۔ ناشر:۔ ادارۂ شہادت حق (وقف) خیر نگر گیٹ۔ میرٹھ۔ یوپی

ادارۂ شہادت حق کے سلسلۂ مطبوعات سے قارئین زندگی خوب واقف ہیں۔ یہ پمفلٹ اسی سلسلے کی سولھویں کڑی ہے۔ یہ کتاب دراصل ایک مقالہ ہے جو اسلامیہ کالج شانت پرم (دارالسلام) پٹی کا روڈ، پالی گھاٹ کیرلہ کے سالانہ اجتماع کے موقع پر دس بارہ ہزار افراد کے مجمع میں پڑھا گیا۔ اسی مقالے کو نظر ثانی کے بعد کتاب کی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے تعلیم کے مسئلے کو سمجھنے کے لیے یہ مختصر رسالہ بہت مفید ہے۔ ۱۶ عنوانات کے تحت اس مسئلہ کے وسیع مضمون کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مصنف نے خود اس مقالے کے بارے میں لکھا ہے کہ:۔

یہ مقالہ تعلیمی بھی ہے اور دعوتی بھی، دینی بھی ہے اور سیاسی بھی۔

اس مختصر رسالے میں مولانا نے سیکولرزم پر بھی بحث کی ہے اور یہ بحث بھی پڑھنے کے لائق ہے۔

پری خانہ مترجمہ تحسین سروری۔ صفحات ۱۹۲۔ قیمت دو روپیہ۔ ناشر:۔ کتاب گھر پبلیکیشنز رامپور یوپی۔

اس کتاب میں واجد علی شاہ اختر (لکھنؤ) نے اپنی جنسی ہوس کی روداد بزبان فارسی لکھی تھی جناب تحسین سروری صاحب نے کبھی اس کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ اب کتاب گھر رامپور نے اسے پھر شائع کیا ہے۔ اس کو دوبارہ شائع کرنے کی وجہ تجارتی افادیت کے سوا سمجھ میں نہیں آئی، یا شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ رامپور بھی نوابوں کا گڑھ رہ چکا ہے۔ یہ کتاب گندگی کی ایک پوٹ ہے جسے زمین میں دفن رہنا چاہیے تھا اس کو کرید کر باہر نکالنا اور پھیلانا ذوق سلیم کی توہین ہے۔ (باقی بر ص ۶۳)

مالک: جماعت اسلامی ہند۔ ایڈیٹر سید احمد عروج قادری۔ پرنٹر و پبلشر: احمد حسن۔ مطبع: دہلی پرنٹنگ پریس

ماہنامہ

زندگی رامپور

ربیع الاول ۱۳۸۶ھ
جولائی ۱۹۶۶ء

جلد : ۳۷
شمارہ : ۱

مدیر: سید احمد قادری

- خط و کتابت و ارسال زر کا پتہ — منیجر رسالہ زندگی رام پور - یوپی
- زر سالانہ :- چھ روپیے — ششماہی :- تین روپیے — فی پرچہ :- [illegible] پیسے
- — ممالک غیر سے دس شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر [illegible]

مالک :- جماعت اسلامی ہند ایڈیٹر :- سید احمد قادری - پرنٹر پبلشر :- احمد حسن - مطبع [illegible]
مقام اشاعت :- دفتر زندگی رامپور یوپی

اشارات

(سید احمد قادری)

اے ایمان لانے والو۔ اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔ تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔ سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور تفرقہ میں نہ پڑو۔ اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو جو اس نے تم پر کیا ہے۔ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے اس نے تمہارے دل جوڑ دیئے اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے۔ تم آگ سے بھرے ہوئے ایک گڑھے کے کنارے کھڑے تھے۔ اللہ نے تم کو اس سے بچا لیا۔ اسی طرح اللہ اپنی نشانیاں تمہارے سامنے روشن کرتا ہے۔ شاید کہ ان علامتوں سے تمہیں اپنی فلاح کا سیدھا راستہ نظر آ جائے۔

(آل عمران ۱۰۲ - ۱۰۳)

اسلام سے پہلے، عرب جاہلیت کی تاریخ سے واقف کوئی بھی مسلمان جب ان آیتوں کو پڑھتا ہے تو عربوں کے باہمی اختلافات و نزاعات اور قتل و غارت کی ایک خوں ریز داستان اس کے سامنے آجاتی ہے، جہاں خون کا رشتہ رکھنے والے قبیلے بھی آپس میں اس طرح دست و گریباں تھے کہ ان کی قومی ہلاکت کی منزل قریب آگئی تھی خود مدینے میں جہاں یہ آیتیں اتریں اوس و خزرج کے قبیلے ایک دوسرے کی اس طرح گردن مار رہے تھے کہ اگر اسلام آکر انہیں بچا نہ لیتا تو یہ دونوں آتش عداوت میں جل مرتے لیکن ان قبیلوں نے جب اللہ کے دین کی ڈور مضبوطی سے تھام لی تو پھر ان کے درمیان ایسا پائدار اتحاد پیدا ہوا جس کی تاریخ میں کوئی نظیر نہیں ہے۔ صرف یہی نہیں کہ اوس و خزرج کے قبیلے آپس میں متحد ہو گئے بلکہ انھوں نے مکے سے آنے والے اپنے دینی بھائیوں کے ساتھ حسن سلوک کی وہ مثال قائم

کی جو سگے بھائیوں میں بھی کم ہی ملتی ہے۔ دنیا نے اسلام کی زندہ و پائندہ نعمت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور وہ عش عش کر اٹھی۔

ان میں یہ پائیدار اتحاد کیسے پیدا ہوا، وہ کون سی چیز تھی جس نے انہیں سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنا دیا؟ اس سوال کا جواب کوئی الجھی ہوئی منطق نہیں جسے سمجھنا دشوار ہو۔ سادہ سی بات ہے جس کو علم و فن سے ناآشنا دیہاتی بھی سمجھ لیتا ہے، سمجھ سکتا ہے۔ وہ چیز تھی زندگی کا بلند ترین مقصد اللہ کی رضا کا حصول، اس کے دین کی سربلندی کا جذبہ، اس کی محبت کا سوز، اس کی نظر کرم کی آرزو، اس کی نگاہ غضب کا خوف، فلاح آخرت کی طلب اور اس کی بنائی ہوئی جنت کا شوق۔ قرآن نے ان سے کہا:-

ماعندکم ینفد وماعند اللہ باقٍ۔ جو کچھ تمہارے پاس ہے ختم ہو جائے گا اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہی باقی رہے گا۔

اور یہ حقیقت ان کے دل میں اتر گئی ــــ اس بلند ترین مقصد زندگی نے ان کی کایا پلٹ دی کل وہ ایک دوسرے کے دشمن تھے، آج دوست ہو گئے اور اس دوستی کی بنیاد تھی اس ذات کی فرماں برداری اور اس کے حکم کی تعمیل جو ان کی تمام آرزوؤں کا مرکز تھی۔ وہ ایک دوسرے کے دوست تھے اس لیے کہ وہ خدا کے فرماں بردار بندے تھے اور دونوں ہی اس کی خوشنودی کے طالب ــ انھیں جوڑنے والی چیز دنیا کا کوئی مفاد نہ تھا کہ جب اس میں فرق آئے تو جوڑ ڈھیلا پڑ جائے۔ ان کے اتحاد کی بنیاد نسل، رنگ، زبان اور وطن پر بھی نہ تھی کہ یہ بنیادیں انتہائی بودی اور کمزور ہیں۔ ان میں کوئی ایسی نہیں جس پر عالمی اتحاد قائم ہو سکے۔ عالمی اتحاد تو دور کی چیز ہے ان میں کوئی ایسی بھی نہیں جو کسی ایک ملک کے باشندوں کو صحیح طور پر جوڑ سکے۔ رب العٰلمین کے بندے دنیا کے گوشے گوشے میں موجود ہیں اور ان کے آقا کا مطالبہ یہ ہے کہ وہ سب کے سب، صرف اسی کی بندگی و غلامی پر متحد ہو جائیں۔ اسلام کی بنیاد پر اتحاد ایک ایسی چٹان ہے جس سے ٹکرا کر ہر قوت ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے۔ یہی اتحاد تھا جو چودہ سو سال پہلے عرب کے باشندوں میں پیدا ہوا تھا اور اس سے ٹکرا کر دنیا کی دو سب سے بڑی طاقتیں چور چور ہو گئی تھیں۔ جب تک اتحاد کی بنیاد اسلام تھا مسلمانوں کا پرچم اقبال بلندیوں پر لہراتا رہا۔ اور جب اتحاد و اتفاق اور دوستیوں کی بنیاد بدل گئی تو ان کی عزت و شوکت کا علم سرنگوں ہو گیا۔ آقا نے اپنی نظر کرم ان سے پھیر لی۔ دنیا کی قومیں

ان پر چڑھ دوڑیں اور یہ انھیں قوموں کی نظر کرم کے محتاج بن کر رہ گئے — جب تک یہ آخرت کو دنیا پر ترجیح دیتے رہے۔ دنیا ان کے ماتحت رہی اور جب یہ دنیا کی طرف مائل ہوئے تو وہ ان کے ذہنوں میں نکیل ڈال کر ان پر سوار ہوگئی۔ پھر ان کا حال یہ ہوا کہ کبھی اس در کی جبہ سائی پر مجبور تھے اور کبھی اس در کی۔ کبھی ان کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے تھے اور کبھی ان کے۔ افسوس کہ آج ہم مسلمان دنیا کے اسی جال میں پھنسے ہوئے ہیں۔

دنیا کے نقشے پر آج بھی کثیر التعداد مسلم حکومتیں موجود ہیں اور ان کے علاقے فوجی پوزیشن کے اعتبار سے بھی اور وسائل دولت کے لحاظ سے بھی بہت اہمیت رکھتے ہیں مگر حال یہ ہے کہ ان میں سے کوئی امریکہ کا دست نگر ہے اور کوئی روس کا اور جو زیادہ چالاک سمجھے جاتے ہیں وہ دونوں کے سامنے ہاتھ پھیلائے ہوئے ہیں۔ یہ وہ خلف ہیں جن کے سلف دنیا کے مرکز توجہ تھے اور جن کے قدموں میں قیصر و کسریٰ نے اپنے تاج رکھ دیے تھے۔

گھپ اندھیرے میں مکے کا رابطۂ عالم اسلامی روشنی کی ایک کرن بن کر چمک رہا ہے اور اللہ نے اپنے بندے فیصل بن عبدالعزیز کو یہ توفیق بخشی ہے کہ وہ دنیا کے مسلمانوں کو پھر اسی بنیاد پر متحد کرنے کی سعی کریں جس پر چودہ سو سال پہلے وہ متحد ہوئے تھے لیکن افسوس کہ اس کوشش کو ناکام کرنے کی قیادت ایک مسلمان حکومت ہی کر رہی ہے۔

زندگی کے گزشتہ شمارے میں اس اندیشے کا اظہار کیا گیا تھا کہ روس کے وزیر اعظم مسٹر کوسی گن متحدہ عرب جمہوریہ کے دورے پر تشریف لا رہے ہیں اور تعجب نہیں کہ ان کے دورے کا ایک ہدف اتحاد اسلامی کی تخریب بھی ہو۔ یہ بالکل سامنے کا اندیشہ تھا اور وہ پورا ہوا۔

اخبارات میں اس اصل گفت و شنید کی روداد تو نہیں آسکی جو صدر ناصر اور مسٹر کوسی گن میں ہوئی ہوگی لیکن جو کچھ شائع ہوا ہے وہ بھی اندازہ لگانے کے لیے کافی ہے۔ مصر میں روس کے سفیر نے مسٹر کوسی گن کی آمد سے چند گھنٹے پہلے یہ بیان جاری کیا

ناصر اور کوسی گن کی گفت و شنید اس اعتبار سے بہت اہم ہوگی کہ رجعت پسندوں اور سامراجیوں نے افریقہ اور ایشیا کی طاقتوں کے خلاف ایک محاذ قائم کرنے کی کوشش کی ہے

اس لیے دونوں لیڈر کوشش کریں گے کہ محنت کش اور ترقی پسند عوام کو سامراجیوں کے مقابلے پر متحد کریں۔"

جاننے والے جانتے ہیں کہ اس میں جس محاذ کا ذکر کیا گیا ہے اس سے مراد کیا ہے اور رجعت پسند سے کون لوگ مراد ہیں۔ مسٹر کوسی گن جب ہشت روزہ دورے پر مصر آئے اور ان کا ہوائی جہاز اڈے پر اترا تو صدر ناصر نے ان کے بازو تھام لیے اور کہا:— "سرزمین مصر میں آپ کا آنا مبارک ہو میرے دوست۔" اس کے جواب میں ایک موقع پر مسٹر کوسی گن نے صدر ناصر کو مخاطب کر کے کہا:—

"ہمارے دوست! آپ عرب دنیا اور افریقہ کی تحریک آزادی کے قائد ہیں۔"

افسوس، یہی عرب دنیا اور افریقہ کی قیادت کا خواب، مصری سربراہ کو بالکل غلط رخ پر بہائے لیے چلا جا رہا ہے۔ ایک دعوت کے موقع پر صدر ناصر نے روس کی تعریف کی اور نہر سوئز پر حملہ کے وقت روس کی مدد کا شکریہ ادا کیا اور اپنی احسان مندی کا اظہار فرمایا۔ صدر ناصر امریکہ کے احسان کو بھول گئے جس نے برطانیہ اور فرانس کی حمایت نہیں کی بلکہ ان کے حملے کی مخالفت کی تھی اور اس سے بھی بڑھ کر وہ سعودی عربیہ کے احسان کو بھی نہ صرف بھول گئے، بلکہ آج اس کو کچل دینے کی دھمکی دے رہے ہیں۔ سعودی عربیہ نے اس نازک موقع پر جو رول ادا کیا تھا وہ یہ تھا کہ جس رات سوئز پر حملہ ہوا اسی رات کی صبح کو شاہ سعود نے اعلان کیا:—

"ہمیں آج صبح ہی یہ اطلاع ملی ہے کہ اسرائیل نے مصری علاقوں پر حملہ کیا ہے۔ ہمارے لیے یہ چیز تعجب کا باعث نہیں ہے کیونکہ ہم غدار یہودیوں کے بارے میں یہ یقین رکھتے ہیں کہ ان کا اصل ہدف تمام ممالک عربیہ ہیں اور ہم امید رکھتے ہیں کہ تمام عرب اقوام بلا تاخیر اس فتنے کے استیصال اور ممالک عربیہ کے احترام کے قیام کے لیے مستعد ہو جائیں گی۔ ہم نے اپنے یہاں حکم دے دیا ہے کہ اس یہودی تجاوز کے دفاع کے لیے مستعد ہو جاؤ اور ہم اللہ سے امید رکھتے ہیں کہ وہ اپنے دین کی مدد فرمائے گا، اپنے کلمے کو بلند کرے گا اور باغی و سرکش انسانوں پر ان کے اعمال کی ہلاکتیں وارد ہوں گی۔"

شاہ سعود نے صدر ناصر کو یہ تار بھیجا:—

مجھے ابھی معلوم ہوا ہے کہ یہود نے ارض مصر پر حملہ کر دیا ہے۔ ہم ہماری افواج اور ہمارے تمام وسائل آپ کی معاونت اور یہود کی سرکوبی کے لیے حاضر ہیں اور حاضر رہیں گے۔ بےشک یہود نے حملہ کر کے ظلم کا آغاز کیا ہے اس لیے ان پر تباہی آئے گی۔

اذن للذین یقاتلون	ان لوگوں کو لڑائی کی اجازت دی
بانھم ظلموا وان اللہ علیٰ	گئی کیونکہ ان پر ظلم کیا گیا ہے اور بلاشبہ اللہ
نصرھم لقدیر ۰	تعالیٰ ان کی مدد پر قادر ہے۔

سعودی عربیہ کی وزارت دفاع نے تمام فوجی ملازمین کی رخصتیں منسوخ کر دیں اور عملاً اپنی چھاؤنی کو شرق اردن کی سرحدوں پر جمع کر دیا۔ ان ایام میں سعودی امراء اور شاہی خاندان کا جوش جہاد قابل دید تھا .... یہودی حملے کے بعد جب برطانیہ اور فرانس بھی مصر پر ٹوٹ پڑے اور صورت حال بے حد نازک ہو گئی تو بلاتاخیر شاہ سعود نے صدر آئزن ہاور کو متوجہ کیا اور انہیں اس بات پر مجبور کیا کہ وہ ان ظالم حملہ آوروں کو روکیں۔ انھوں نے آئزن ہاور پر غیر مبہم الفاظ میں واضح کیا کہ:

اگر دولت متحدہ نے اس وقت کوئی مثبت موقف اختیار نہ کیا اور آزادی اقوام کے فرض سے وہ اس نازک لمحے میں عہدہ برآ نہ ہوئی تو اس امر میں ذرہ برابر شبہ نہیں کیا جاسکتا کہ یہ صورت حال مشرق اور مغرب کے درمیان ایک ایسی خلیج پیدا کر دے گی جس کا پاٹنا ممکن نہ ہوگا۔

سعودی عربیہ نے فوراً پٹرول کی سپلائی روک دی اور جتنے جہاز جدہ میں کھڑے تھے سب کو پابند کر دیا۔ سعودی عربیہ نے اس مسئلے پر پورے عرب میں ایک آگ بھڑکا دی اور سب سے بڑی بات یہ کہ شاہ سعود نے صرف اسلحہ نہیں بلکہ اپنے خزانے میں جمع سونے کے ذخائر تک صدر ناصر کے حوالے کر دیے اور جاننے والے جانتے ہیں کہ اس واقعہ کے پانچ سال بعد تک سعودی حکومت اپنی کرنسی کے توازن کو بحال نہیں کر سکی۔ (المنبر)

سعودی عربیہ کو اس احسان کا بدلہ صدر ناصر یہ دے رہے ہیں کہ جب مسٹر کوسی گن آئے تو ان کی مدد کے موقع پر وہ نعرے لگاتے:۔

عالم اسلام کے اتحاد کی تحریک کچل کر رکھ دی جائے گی: سعودی عرب کے جن شہروں سے علم بغاوت

ین کی حمایت کی جاتی ہے اس پر قبضہ کرلیا جائے گا۔

یہی نہیں ان کے گھمنڈ کا پارا اتنا چڑھا کہ انھوں نے کہا:۔ سعودی عرب کے تمام جیٹ جہاز پانچ منٹ کے اندر مار گرائے جائیں گے اور اب وہ یہ تمسخر کر رہے ہیں کہ اتحاد عالم اسلامی کا اجتماع داڑھی والوں کا اجتماع ہے۔

فرعونی تہذیب کے امام سے اس احسان ناشناسی، اس گھمنڈ اور ردیگی کے ساتھ اس تمسخر کے سوا اور کیا توقع کی جاسکتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ مصر کے تمام باشندوں کی آواز ہے؟ کیا مصر کے عوام یہ چاہتے ہیں کہ شاہ فیصل کی سعیِ اتحاد ناکام ہو جائے؟ اس سوال کا جواب گزشتہ تجربات اور موجودہ حالات، نفی میں دیتے ہیں۔

یہ سعیِ اتحاد کامیاب ہوگی یا نہیں اس کا علم اللہ کو ہے لیکن یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ مصر کے عوام ہرگز اس سعیِ اتحاد کے خلاف نہ ہوں گے۔ مغرب پرستوں کی ہزار کوششوں کے باوجود دنیا کے مسلمان عوام اسلام سے برگشتہ نہیں ہوئے ہیں۔ مصطفیٰ کمال کی زندگی میں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ پورا ترکی مغرب پرست بن گیا ہے لیکن ان کی موت کے بعد معلوم ہوا کہ یہ احساس غلط تھا ابھی چند ماہ گزرے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ پورا انڈونیشیا کمیونسٹ اور چین نواز ہو گیا ہے لیکن اب ہر شخص جانتا ہے کہ یہ احساس غلط تھا۔ مصر کے بارے میں بھی یہ سمجھنا کہ وہاں کے عوام فرعونی تہذیب کے متوالے بن گئے ہیں۔ غلط ہے اور یہ بات صدر ناصر کی موجودگی میں بھی ہمیں معلوم ہے۔ ان کی مقبولیت کا ستارہ اپنی چمک دمک کھو رہا ہے۔ مصری عوام کی بے چینی اور ناصری حکومت کا اضطراب چھپائے نہیں چھپ رہا ہے۔ خود حکومت مصر کے اقرار کے مطابق اخوانیوں کا اثر مصری فوج میں بھی پہنچ گیا ہے اور کئی فوجی افسر گرفتار کر لیے گئے ہیں۔ اخوانیوں پر قاہرہ میں جو مقدمات چل رہے ہیں اور ان میں جس درجے کے لوگ ہیں اس کا علم بھی معلوم ہے اور ابھی ۱۲ رمئی کے اسٹیٹسمین میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ:۔

قاہرہ میں اب تاجروں، وکیلوں، سابق وزیروں اور پاشاؤں کی نقل و حرکت پر پابندی عائد کر دی گئی ہے۔ متحدہ عرب جمہوریہ کی حکومت نے اس اچانک اقدام کی کوئی وجہ نہیں بتائی ہو لیکن باخبر ذرائع کہہ رہے ہیں کہ ان لوگوں کو دیہاتوں میں کئے جانے سے اس اندیشے کی بنا پر روکا گیا ہے کہ کہیں وہ عوام کو اپنے سیاسی خیالات سے متاثر نہ کریں۔ یہ لوگ پولس کی اجازت سے

صرف قاہرہ اور اسکندریہ کے درمیان نقل و حرکت کر سکتے ہیں۔ گزشتہ ہفتہ حکومت مصر نے ۹۱ زمینداروں پر بھی اسی قسم کی پابندی عائد کی ہے"

یہ چھوٹی سی خبر اپنے اندر بہت کچھ چھپائے ہوئے ہے۔ آخر ان ۱۷ اور ۹۱ ممتاز افراد کے وہ کون سے سیاسی خیالات ہیں جن کی اشاعت سے حکومت مصر لرز رہی ہے اور یہ اقدام اس وقت کیا گیا ہے جب ابھی مسٹر کوسی گن کی واپسی پر چند دن بھی نہیں گزرے ہیں ۔۔ خود صدر ناصر کی جھنجلاہٹ، ان کی دھمکیاں اور پھبتیاں ان کے اندرونی اضطراب کا پتہ دے رہی ہیں۔ مسٹر کوسی گن کی ہدایت کے مطابق شام سے دوستی کا ہاتھ ملانا بھی اب انہیں عرب ممالک کی قیادت عطا نہیں کر سکے گا اور ان کے نائب مارشل عبدالحکیم عامر کی یہ پیشین گوئی کہ اتحاد اسلامی کی سعی ناکام ہو چکی ہے انشاء اللہ صدا بصحرا ثابت ہوگی۔

۲

۱۵ سے ۱۷ مئی تک گوالیار میں آل انڈیا ہندو مہاسبھا کی گولڈن جبلی کے جلسے ہوتے رہے۔ اس اجلاس میں شری ستیہ نرائن بنرجی نے جو خطبۂ صدارت پڑھا ہے اس کے چند جملے یہ ہیں :۔

اسرائیل مسلم ممالک کا پیدائشی دشمن ہے اس لیے وہ قدرتی طور پر ہمارا دوست ہے۔ ہمیں اس ملک سے دوستانہ تعلقات میں اضافہ کرنا چاہیے"

دعوت دہلی۔ ۲۹ مئی ۱۹۶۶ء

یہ پالیسی مسلم دشمنی کی انتہا ہے۔ اب تک تو یہ سمجھا جا رہا تھا کہ ہندو مہاسبھا اور اس جیسی دوسری جماعتوں کی پالیسی ہند و پاک کے مسلمانوں کی دشمنی پر مبنی ہے لیکن اب ہندو مہاسبھا نے پوری صراحت کے ساتھ بتا دیا کہ اس کی مسلم دشمنی کا دائرہ تمام مسلم ممالک تک وسیع ہے اور یہ دشمنی اس حد تک پہنچی ہوئی ہے کہ کسی ملک سے دوستی میں اضافے کی صرف اتنی وجہ کافی ہو سکتی ہے کہ وہ ملک مسلمانوں کا دشمن ہو۔ اسرائیل مسلم ممالک کا پیدائشی دشمن ہے اس لیے وہ قدرتی طور پر ہمارا دوست ہے۔ ان الفاظ میں مسلم دشمنی کا ایک الاؤ بھڑک رہا ہے۔ اس سے متحدہ عرب جمہوریہ کو بھی مستثنیٰ نہیں کیا گیا کیونکہ "ایں ہم بچۂ شتر است" اس پر بھی صادق ہے۔ اس کے علاوہ جب دشمنی کی بنیاد اسلام ہو تو مصر اپنی تمام ہند دوستی کے باوجود اس سے مستثنیٰ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ وہاں کے عوام مسلمان ہی تو ہیں۔

ہندو مہاسبھا، جن سنگھ اور آر ایس ایس قابل تعریف تنظیمیں ہیں کہ انھوں نے (باقی ص۶۳ پر)

حل التضاد کا مختصر تنقیدی جائزہ

سید احمد قادری

ہمارے محترم دوست، جناب اسحاق النبی صاحب نے "حل التضاد فی تواریخ سیرۃ خیر العباد" کے نام سے ایک ضخیم کتاب تصنیف کی ہے۔ اس کتاب کے چار مقالے یا چار ابواب "واقعات سیرت میں توقیتی تضاد اور اس کا حل" کے عنوان سے ماہنامہ برہان دہلی کے آٹھ شماروں (مئی ۴۶ء تا دسمبر ۴۶ء) میں شائع ہوئے ہیں۔ اسی سلسلے کی ایک ضمنی بحث "سن عیسوی و ہجری کی تطبیق کے اصول" کے عنوان سے ماہنامہ زندگی جون ۴۶ء میں بھی شائع ہوئی تھی۔ ادارۂ زندگی نے اس پر یہ مختصر نوٹ لکھا تھا:-

سیرت کی کتابوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح حیات اور دیگر واقعات کے بیان میں تاریخ و سنین اور ایام کے جو تضادات پائے جاتے ہیں ان کو حل کرنے کے لیے جناب اسحاق النبی علوی صاحب نے ایک بہت ہی قابل قدر کتاب تصنیف کی ہے۔ ہم اس کتاب کا ایک حصہ زندگی کے صفحات میں شائع کر رہے ہیں۔ کتاب کا یہ حصہ اپنی مستقل افادیت رکھتا ہے۔

برہان میں موصوف کے مقالات کی اشاعت کے بعد ان کی اس علمی خدمت کی تعریف ریڈینس دہلی، دعوت دہلی اور دوسرے اخبارات و رسائل میں شائع ہوئی لیکن زندگی میں ان مقالات کے بارے میں الگ سے کوئی چیز شائع نہ ہو سکی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ راقم الحروف ان مقالات کو غور سے پڑھ نہیں سکا تھا۔ ہمارے محترم دوست نے کئی بار فرمایا کہ تم انہیں غور سے پڑھو لیکن مشغولیت کی وجہ سے موقع نہ مل سکا۔ آخر ایک دن انھوں نے اپنے ان چار مقالات کا تصحیح کردہ نسخہ مجھے عنایت کیا اور فرمایا کہ انہیں پڑھ کر زندگی میں اظہار خیال کرو۔ جب میں نے انہیں غور سے پڑھا تو متعدد اشکالات و شبہات پیدا ہوئے اور میں نے انھیں قلم بند کر کے موصوف کو دے دیا۔ انہیں حل کرنے کے لیے زبانی گفتگو بھی ہوتی رہی لیکن میرے

شبہات دور نہیں ہوئے۔ اب ان کی خواہش ہے کہ میں اپنے خیالات زندگی میں شائع کردوں۔
میں اپنے فاضل دوست کا شکر گزار ہوں کہ ان کے اصرار کی وجہ سے اس موضوع پر غور وفکر کے
لیے مجھے وقت نکالنا پڑا اور اب جو رائے بنی وہ غور وفکر کا نتیجہ ہے۔ میں ان کے خلوص کا بھی معترف ہوں
کہ وہ خود اپنے اشکالات وشبہات کی اشاعت چاہتے ہیں۔ غالباً اس کا مقصد یہ ہوگا کہ جب مرتب
شکل میں کوئی چیز سامنے آئے گی تو وہ خود اس پر اچھی طرح غور کرسکیں گے اور دوسرے اہل علم بھی ادھر
متوجہ ہوں گے۔

دو تقویمی نظریے کا مختصر تعارف

اظہار خیال سے پہلے ضروری ہے کہ قارئین زندگی سے اس نظریے کا مختصر تعارف کرا دیا جائے جس کے ماتحت ہمارے فاضل دوست نے روایات سیرت کے توقیتی تضادات حل کرنے کی سعی کی ہے۔

موصوف نے پہلے ان تضادات کی مثالوں کے ساتھ تشریح وتفصیل کی ہے جو سیرت کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔ موصوف لکھتے ہیں:۔

> یہ تاریخی تضادات اتنے گوناگوں ہیں کہ (کتابتی سہو اور تصحیفی غلطیوں کو چھوڑ کر) مندرجہ ذیل پانچ قسموں پر تقسیم کیے جاسکتے ہیں:۔
>
> اولاً: ایسی تاریخیں ملتی ہیں جو روایتی ایام سے مطابقت نہیں کرتیں
>
> ثانیاً: ایسی تاریخیں موجود ہیں جو روایتی موسموں کا ساتھ نہیں دیتیں۔
>
> ثالثاً:۔ ایسی تاریخیں نظر آتی ہیں جن کی تکذیب دوسرے علمی ذرائع سے ہوجاتی ہے۔
>
> رابعاً: ایک ہی واقعہ کے متعلق دو مختلف اور متضاد تاریخیں نظر آتی ہیں۔
>
> خامساً: واقعات کی ترتیب زمانی میں مورخوں کے اختلاف موجود ہیں۔
>
> مگر اس کے ساتھ ہی یہ عجیب بات ہے کہ بہت سی تاریخیں ہر اعتبار سے صحیح بھی نظر آتی ہیں اور اگرچہ ان کی تعداد اور تناسب کم ہے تاہم اس یقین دہانی کے لیے کافی ہیں کہ واقعات سیر کے جمع کرنے میں ابتدائی مدونین کے سامنے کوئی بنیادی ہوا د ضرور موجود تھا، ورنہ اصولاً یہ بھی غلط ثابت ہوتیں۔ (برہان، دہلی۔ مئی ۴۳ء، ص ۲۶۶-۲۶۷)

اس کے بعد موصوف نے ہر قسم کے تضاد کی متعدد مثالیں تفصیل سے پیش کی ہیں۔ اسی طرح جو تاریخیں ہر اعتبار سے

صحیح ہیں ان کی مثالیں بھی بیان کی ہیں۔ اس کے بعد ان کوششوں کا ذکر کیا ہے جو ان تضادات کو حل کرنے کے لیے دو ایک علمائے مغرب (مستشرقین) نے کی ہیں لیکن موصوف نے اپنے دلائل کی بنیاد پر انہیں رد کر دیا ہے۔ اسی طرح آپ نے چند علمائے مشرق کی کوششوں کا بھی ذکر کیا ہے اور انہیں بھی اپنے دلائل کی بنا پر قبول نہیں کیا ہے۔ پھر یہ دو تقویمی نظریہ کہاں سے آیا؟ اس کا جواب موصوف کے اپنے الفاظ میں پڑھیے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

دو تقویمی نظریے کا ماخذ

اس سلسلے میں سب سے اہم نظریہ شاید ونکلر (Winckler) نے پیش کیا تھا جس کی تفصیلات بدقسمتی سے میرے پیش نظر نہیں۔ صرف مارگولیتھ کا یہ بیان ہے کہ:۔

"اور ونکلر کی طرف سے یہ بات پیش کی گئی ہے کہ مدینے کی تقویم (CALANDER) مکہ کی تقویم سے غالباً مختلف تھی۔ دونوں شہروں میں ایک ہی نام کے مہینے مختلف اقدار زمانی رکھتے تھے اس کی عربی تقویم کی اصلیت کے متعلق تحقیقات جن کو (NIELSEN) نے اور وسعت دی۔ ہجرت کے ابتدائی سالوں کے واقعات کی تاریخیں متعین کرنے میں کوئی عملی اہمیت نہیں رکھتیں۔"

اس بیان سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ونکلر کی رائے میں واقعات سیر پر دو تقویموں کی کارفرمائی تھی جو میری رائے میں قطعاً قابل قبول ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ مارگولیتھ نے ایسی کوئی تشریح نہیں کی کہ ونکلر کی رائے میں ان دو تقویموں کی ابتدا اور انتہا کس نقطے سے ہوئی تھی صرف اس قدر بیان کیا ہے کہ ونکلر کا نظریہ ہجرت کے ابتدائی سالوں کے واقعات متعین کرنے میں کوئی عملی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس مستشرق کے نظریے کو قبول عام حاصل نہ ہو سکا جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ یہ شاید بعض پیچیدہ حسابات پر مبنی تھا۔ تاہم مجھے انتہائی ممنونیت سے اس کا اعتراف کرنا ہے کہ میرا دو تقویمی نظریہ ونکلر کے اس اشارے کا نتیجہ ہے جس کی اگرچہ ادنیٰ ترین تفصیل بھی میرے پیش نظر نہیں اور ہو سکتا ہے کہ اس مستشرق کے تصورات کی گزرگاہ میری راہ فکر سے بالکل جدا ہو تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ دو تقویمی نظریہ واقعات سیر کی بالاستیعاب جانچ کا منطقی نتیجہ ہے۔

آپ دیکھ چکے ہیں کہ تقریباً ایک تہائی واقعات سیر سے جن میں ایام و تواریخ کی تفصیلات

بھی مل ہیں جو کئی طرح ہیں بھی موجود ہیں اور فلکی حسابات کے ساتھ عصری تاریخ کی شہادتیں بھی ملتی ہیں۔ عام قمری تقویم سے منطبق ہو کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ عہد رسالت میں کوئی اور کیلنڈر موجود ہو یا نہ ہو لیکن ہمارا مروجہ قمری کیلنڈر ضرور رائج تھا اور اگرچہ اس سے کتنا ہی کم کام لیا جاتا ہو مگر اس کے وجود سے انکار ممکن نہیں۔ اب رہیں دو تہائی واقعات کی توقیتی صراحتیں تو میرے نزدیک یہ مکی تقویم کے بموجب ریکارڈ کی گئی ہیں جو عہد رسالت میں سنہ ۱۰ھ تک رائج رہی۔

(برہان مئی سنہ ۶۴ء ص ۲۹۲)

موصوف کی اس تحریر سے معلوم ہوا کہ ونکلر کے جس نظریے کو خود مستشرقین میں قبول عام حاصل نہ ہو سکا سے موصوف نے قبول کر لیا اور اپنی تمام تحقیقات کی بنیاد اسی پر رکھ دی۔ اس عبارت سے ہمارے محترم دوست کا پسندیدہ نظریہ معلوم ہو جاتا ہے لیکن انھوں نے اپنے نظریے کو اس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ لکھا ہے اسے بھی پڑھ لینا چاہیے۔ لکھتے ہیں :-

اس سلسلے میں راقم الحروف کا نظریہ، یہ ہے جس کو علماءِ تاریخ کے سامنے اس لیے پیش کیا جاتا ہے کہ ان کے غور و فکر کی کسوٹی پر اس کی آزمائش ہو سکے۔ اس نظریے کا مختصر الفاظ میں خلاصہ یہ ہے

ظہور اسلام کے وقت جزیرہ نمائے عرب میں متعدد تقویمیں رائج تھیں۔ مکے میں جو تقویم رائج تھی وہ قمری شمسی تقویم (LUNISOLAR) تھی اور ایک خاص نقطہ فصلی سے شروع ہو کر اسی نقطے پر ختم ہوتی، اس تقویم میں وقتاً فوقتاً کبیسہ کے مہینے اضافہ ہوتے رہتے تھے اس کے مقابلے میں مدینے کے اندر ایک دوسری تقویم رائج تھی جو خالص قمری تھی مگر دونوں تقویموں کے مہینے ہم نام تھے۔ مہاجرین مکہ جب مدینہ پہنچے تو اپنے ساتھ مکی تقویم بھی لے گئے۔ اس طرح ہجرت کے بعد مدینے میں بیک وقت دو تقویمیں رائج ہو گئیں جس کے نتیجے میں بعض لوگوں نے مکی تقویم کے بموجب یادداشتیں مرتب کیں اور بعض نے مدنی کیلنڈر کے مطابق اس بنا پر ابتدائی مدونین سیر یا ان کے رواۃ کو جو تاریخیں مل سکیں وہ دونوں تقویموں پر مبنی تھیں، ان میں سے مکی تقویم اس وقت ناپید ہے جس کی وجہ سے واقعات سیر کی مکمل توقیتی تشریح ممکن نہیں۔ اگر مکی تقویم کی بازیافت کر لی جائے تو ہر قسم کی توقیتی الجھنیں ختم ہو جائیں گی۔

برہان مئی ص ۲۹۵

یہ ہے وہ نظریہ جس کی بنیاد پر موصوف نے بڑی محنت سے سلہ تا سلہ کا دس سالہ کیلنڈر مرتب کیا ہے۔ یہ بات اس عبارت اور اس سے پہلے کی عبارت میں آچکی ہے کہ مدینہ منورہ میں بھی سلہ تک کی تقویم مروج رہی لیکن اب تک یہ بات صاف نہ تھی کہ مدینہ میں کبیسہ کے قاعدے پر مبنی تقویم، صرف تاریخی واقعات ریکارڈ کرنے کے لیے مستعمل تھی یا اسی کو دینی اور شرعی حیثیت بھی حاصل تھی۔ اس ابہام کو موصوف نے پوری وضاحت سے دور کر دیا ہے۔ لکھتے ہیں :-

یہ تقویمیں کم سے کم سنہ ۱۰ھ تک پہلو بہ پہلو چلتی رہیں حتیٰ کہ ۹ھ تک کی تقویم کو مسلمانوں کی دینی تقویم کا مرتبہ بھی حاصل رہا اور تمام مہاجر و انصار اسی کے ماہ محرم میں صوم عاشورہ اور اسی کے ماہ رمضان میں روزے رکھتے رہے۔ ۹ھ کے بعد اور ۱۰ھ کی ابتدا میں جب پیغمبر اسلام نے اس تقویم کی تنسیخ کا اعلان فرمایا تو مسلمانوں کا مذہبی سنہ بجائے مکی کے مدنی بن گیا جو آج تک اسی طرح قمری چلا آرہا ہے۔ (برہان، جولائی ۱۹۶۲ء صفحہ ۲۵)

انتہائی افسوسناک

موصوف کی یہ عبارت پڑھ کر سخت صدمہ پہنچا۔ یہ واقعات سیرت کے توقیتی تضادات کو دور کرنے کی کوشش کا انتہائی افسوسناک انجام ہے۔ مقصد یہ تھا کہ واقعات کے موسم اور تاریخیں صحیح ہو جائیں اور نتیجہ یہ نکلا کہ عبادتیں تک غلط ہوگئیں۔ قرآن[1]، احادیث، اجماع امت اور اسلامی تاریخ سبھی اس پر گواہ ہیں کہ مسلمانوں کی دینی تقویم ابتدائے ہجرت سے خالص قمری رہی ہے۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ ڈنکر بھی جس کے خیال کو موصوف نے لیا ہے۔ یہ جرأت نہ کرتا جو وہ کر گزرے ہیں۔

عہد رسالت کے رمضان

موصوف کا مرتب کردہ کیلنڈر اور وستنفیلڈ کا ہجری کیلنڈر سامنے رکھیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ۹ھ تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کو خالص قمری حساب سے ایک رمضان بھی نصیب نہیں ہوا اور یہ سب کبیسہ والے رمضان میں روزے رکھتے رہے یعنی خالص قمری حساب سے۔

۲ھ تا ۹ھ میں انھوں نے ذوالحجہ اور محرم میں روزے رکھے۔

[1] ماہنامہ زندگی جون ۱۹۶۹ء میں ارشادات رسول کے تحت ہجرت کے دوسرے سال عبادات و معاملات کے لیے قمری مہینوں کا نفاذ کے عنوان سے میں نے ایک مضمون شائع کیا ہے۔ قارئین زندگی اس پر دوبارہ نظر ڈال لیں۔

سنہ تا سنہ میں انھوں نے صفر و ربیع الاول میں روزے رکھے۔

سنہ میں انھوں نے ربیع الاول و ربیع الآخر میں روزے رکھے۔

اب اس پر عیدین کی نماز قربانی اور دیگر عبادات و معاملات کو منطبق کیجیے۔ کم سے کم اپنی حد تک تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میرے نزدیک حل تضاد کی کوشش کا یہ نتیجہ قطعاً ناقابل قبول ہے

قرآن سے غلط استدلال

اوپر آپ نے موصوف کی عبارت میں پڑھا ہے کہ ۹ھ میں جب پیغمبر اسلام علیہ السلام نے مکی تقویم کی تنسیخ کا اعلان کیا تب مسلمانوں کا مذہبی سنہ بجائے مکی کے مدنی بن گیا اور آج تک اسی طرح قمری چلا آرہا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مدینے کی مکی تقویم کو منسوخ کرنے کا اعلان کہاں کیا گیا ہے؟ تو اس کا جواب ہمارے محترم دوست کے نزدیک یہ ہے کہ سورۂ توبہ کی آیت ۳۶-۳۷ میں اس تنسیخ کا اعلان کیا گیا ہے یعنی انما النسئی زیادۃ فی الکفر کہہ کر اللہ تعالیٰ نے جس حساب کو باطل قرار دیا اس پر اس آیت کے نزول تک صرف مشرکین مکہ ہی نہیں بلکہ (نعوذ باللہ) خود رسول خدا بھی عمل کر رہے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ موصوف کے نزدیک توفیقی تضادات کا حل یہ حیثیت اختیار کر گیا ہے کہ چاہے دینی و شرعی اعتبار سے کتنی ہی قباحتیں کیوں نہ لازم آرہی ہوں، غزوات و سرایا کے موسم ٹھیک ہو جانے چاہییں۔ اپنے محترم دوست سے میری درخواست ہے کہ وہ ٹھنڈے دل سے اس پر غور کریں کہ کیا توفیقی تضادات کا کوئی ایسا حل مناسب ہوگا جو اس طرح کی دینی و شرعی قباحتیں پیدا کر دے؟ یہ تو بارش سے بھاگ کر پرنالے میں جا گرنے کے مترادف ہے۔ سورۂ توبہ کی یہ آیتیں تو اس بات کی واضح اور قطعی دلیل ہیں کہ مدینے میں نسی کا طریقہ کبھی بھی نافذ نہیں رہا۔

ایک اور دعویٰ

چونکہ اسلامی تاریخ میں مدینہ منورہ کے اندر مکی تقویم کے وجود کا کوئی نشان نہیں ملتا اس لیے موصوف کو یہ عجیب و غریب دعویٰ بھی کرنا پڑا ہے کہ عہد تابعین تک مسلمان مکی تقویم کو بالکل بھول چکے تھے، بلکہ عمرۂ رجب کا واقعہ بتاتا ہے کہ خود صحابہ کے ذہن سے بھی وہ محو ہو چکی تھی حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ مدینے میں مکی تقویم کبھی تھی ہی نہیں جو کسی کو یاد رہتی۔ (عمرۂ رجب کی تشریح آگے آئے گی۔)

چند واقعات کی جانچ

موصوف کے مفروضہ دو تقویمی نظریے سے جو دینی و شرعی قباحتیں پیدا ہوتی ہیں ان سے تھوڑی دیر کے لیے قطع نظر کر کے دیکھنا چاہیے کہ :۔ (الف) واقعات کے مختلف تضادات کو حل کرنے کے لیے انھوں نے کون سا طریقہ کار اختیار کیا ہے۔ (ب) اس طریقہ کار کے مطابق جو حل پیش کیے گئے ہیں کیا وہ اطمینان بخش ہیں۔ (ج) کیا ان حلوں کو درست مان لینے کے بعد قدیم سے قدیم کتب سیرت کا کوئی تاریخی وزن باقی رہ جاتا ہے۔ (د) موصوف نے کتب سیرت کے بارے میں متعدد مقامات پر جو کچھ کہا ہے اور پھر واقعات کے تضاد دور کرنے میں جو طریقہ کار اختیار فرمایا ہے کیا ان دونوں میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے (ہ) اختلافات کو دور کرنا اصل مقصد ہے یا دو تقویمی نظریہ کو ثابت کرنا۔

میں ذیل میں چند مثالیں پیش کرتا ہوں جن سے اندازہ ہوگا کہ صورت حال کیا ہے ؟

(۱) ہجرت نبوی یہ بات بنیادی اہمیت رکھتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کس مہینے میں تشریف لائے، وہ مکہ اور مدینہ دونوں کا مشترک مہینہ تھا یا مکے کا کچھ اور مدینے کا کچھ اور ۔ نیز یہ کہ کیا مسلمانوں کی مرتب کردہ سیرت و تاریخ کی جو قدیم کتابیں موجود ہیں ان سے یہ متعین نہیں ہوتا کہ جب حضور مدینہ تشریف لائے تو قمری حساب سے وہ کون سا مہینہ تھا ؟ پھر قابل غور بات یہ بھی ہے کہ پونے چودہ سو سال تک تمام مورخین، محدثین اور علماء اس پر متفق رہے ہیں کہ حضور کی ہجرت قمری حساب سے ماہ ربیع الاول کا واقعہ ہے ۔ مدینہ میں وہ ربیع الاول ہی کا مہینہ تھا جب آپ تشریف لائے ہیں کوئی دوسرا مہینہ نہ تھا لیکن اب ہمارے محترم دوست کے نزدیک اس تاریخی اتفاق کی کوئی اہمیت نہیں وہ کہتے ہیں کہ جب حضور ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو وہ مکی حساب سے ربیع الاول کا مہینہ اور مدنی حساب سے جمادی الاولیٰ کا مہینہ تھا ۔ جب راقم الحروف نے یہ پڑھا تو ذہن میں یہ سوال ابھرا کہ واقعات سیرت کے اختلافات کو دور کرنے کی یہ کیا خوب کوشش ہے کہ اختلافات تو دور نہیں ہوتے مگر متفق علیہ مسئلہ مختلف فیہ بن جاتا ہے ۔

میں پہلے حضور کے ورود قبا کی تاریخ اور دن کے اختلافات یہاں نقل کرتا ہوں ۔ اس کے بعد موصوف کی تحقیق پر چند باتیں عرض کروں گا ۔ سب سے پہلے یہ دیکھیے کہ مہینے میں کوئی ادنیٰ اختلاف بھی موجود نہیں ہے ۔

ن یا وقت رات میں اختلافات ہیں اور ایک اختلاف یہ بھی ہے کہ آپ قبا دن کے وقت پہنچے تھے یا رات کے وقت ـــــ امام بخاری نے باب ہجرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ الی المدینۃ میں حضرت عائشہؓ کی جو طویل حدیث روایت کی ہے اس میں صرف اتنا ہے کہ حضور ربیع الاول کے مہینے میں پیر کے دن قبا میں تشریف فرما ہوئے تھے۔ اس صحیح ترین حدیث میں تاریخ کا ذکر نہیں ہے۔ علامہ ابن حجر نے اسی روایت کو معتمد قرار دیا ہے اور جس نے جمعہ کا دن لکھا ہے اس کے قول کو شاذ کہا ہے۔ اس کے بعد تاریخ کے جو اختلافات انھوں نے نقل کیے ہیں وہ یہ ہیں :-

۱۔ موسیٰ بن عقبہ بروایت امام زہری	یکم ربیع الاول
۲۔ جریر بن حازم متوفی ۱۷۰ھ بروایت ابن اسحٰق	۲ ر ر
۳۔ ابراہیم بن سعد بروایت ابن اسحٰق	۱۲ ر ر
۴۔ ابوبکر بن حزم متوفی ۱۲۰ھ	۱۳ ر ر
۵۔ ہشام بن محمد الکلبی و حافظ مغلطائی	۸ ر ر
۶۔ قائل کا نام مذکور نہیں۔	۷ ر ر
۷۔ ابن شہاب زہری فی "خبر المدینہ"	۱۵ ر ر
۸۔ ابوسعد نیشاپوری بروایت حضرت عمر	۲۸ ر ر

یہ اختلافات المواہب اللدنیہ اور اس کی شرح زرقانی میں بھی نقل ہوئے ہیں۔ میں نے فتح الباری اور زرقانی دونوں کو سامنے رکھا ہے ـــــ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ امام بخاری کی صحیح ترین روایت سے صرف اتنا ثابت ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ربیع الاول کے مہینے میں پیر کے دن قبا میں تشریف فرما ہوئے تھے۔ مہینے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ دن کی تعیین میں بھی صرف ایک شاذ قول جمعہ کا ہے ورنہ اکثریت پیر کے دن پر بھی متفق ہے۔ اختلاف جو کچھ ہے وہ تاریخ میں ہے اور آپ یہ دیکھ رہے ہیں کہ اس میں ایک دو نہیں آٹھ اقوال ہیں۔ ان اختلافات کو دور کرنے کے لیے کوئی بھی دو تقویمی کیلنڈر ہے کار ہے۔ تطبیق و ترجیح کے سوا کوئی طریقہ مفید نہیں ہے اور محدثین و مورخین نے اسی پر عمل بھی کیا ہے۔ ان اقوال میں دو قول مرجح قرار پائے ہیں۔ ۱۲ ر اور ۸ ر

ہمارے فاضل دوست نے جو کیلنڈر مرتب کیا ہے اور وسٹنفیلڈ کا جو ہجری کیلنڈر نقل کیا ہے

اس کے لحاظ سے حضورؐ کی آمد قبا کی تاریخ قمری حساب سے ۱۲ ربیع الاول یوم دوشنبہ سنہ ۱ ہجری مطابق ۲۴ ستمبر ۶۲۲ء اور مدنی حساب سے ۱۲ جمادی الاولیٰ یوم دوشنبہ سنہ ۱ ہجری مطابق ۲۴ نومبر ۶۲۲ء تھی اور یہیں پر یہ بھی جان لینا چاہیے کہ وسٹنفیلڈ کے قمری ہجری کیلنڈر کے لحاظ سے مدنی ربیع الاول سنہ ۱ھ دوشنبہ کو شروع ہوا تھا اور ۱۳ ستمبر ۶۲۲ء سے مطابق تھا۔

قارئین زندگی اوپر پڑھ گئے ہیں کہ موصوف کے خیال میں واقعات سیرت کے توقیتی تضادات کی وجہ یہ ہے کہ مدینے میں دو تقویمیں رائج تھیں۔ مکی اور مدنی۔ بعض راویوں نے واقعات کی تقویم سے بیان کیے اور بعض نے مدنی تقویم سے۔ بعد کو یہ دو دستاویزی ریکارڈ خلط ملط ہو گیا اور مصنفین کو پتہ نہ چلا کہ کون واقعہ کس تقویم سے ریکارڈ کیا گیا ہے۔ اگر مکی تقویم معلوم کر لی جائے تو ہر قسم کی توقیتی الجھنیں دور ہو جائیں گی۔ اب پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مکی تقویم کی بازیافت کے بعد تاریخ ہجرت کے آٹھ اقوال میں کتنے حل ہوئے؟ دوسرا بڑا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضورؐ کی آمد مدینہ کا مدنی ریکارڈ کہاں ہے؟ حضورؐ کی آمد مدینہ انصار کے لیے سب سے بڑا سرمایہ فخر ہے۔ کیا یہ بات قابل فہم ہے کہ دوسرے واقعات تو انھوں نے مدنی تقویم کے لحاظ سے ریکارڈ کیے لیکن اس سب سے بڑے سرمایہ فخر کو مدنی مہینے سے ریکارڈ کرنا بھول گئے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہجرت کو مدنی جمادی الاولیٰ کا واقعہ قرار دینے کے لیے موصوف کا مکی کیلنڈر دعویٰ بھی اور خود ہی اس کی دلیل بھی ہے کیونکہ کوئی ایسی شہادت موجود نہیں ہے جس سے معلوم ہو کہ ہجرت کا واقعہ جمادی الاولیٰ کا ہے۔

بہرحال واقعہ ہجرت کی تاریخ متعین کرنے میں بات پھر تطبیق و ترجیح کے اصول کی آگئی جن کو تاریخ اسلام کے سلسلے میں مورخین و محدثین نے اختیار کیا ہے۔ اس لیے اب دیکھنا یہ چاہیے کہ موصوف کے نزدیک وجہ ترجیح کیا ہے ــــ انھوں نے لکھا ہے کہ تمام متقدمین کا اس پر اتفاق ہے کہ آپ ۱۲ ربیع الاول دوشنبہ کو وارد قبا ہوئے تھے۔ اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

البتہ البیرونی اور اس کے بعد چند نے مصنفین سیرت مثلاً مارگولیتھ، ایچ۔ جی ویلز، مولانا شبلی وغیرہ کے نزدیک یہ تاریخ ۸ ربیع الاول مطابق ۲۰ ستمبر ۶۲۲ء تھی جس کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ عام قمری حساب سے ۱۲ ربیع الاول سنہ ۱ھ کو دوشنبہ ممکن نہیں۔ خالص قمری تقویم کی جدول کے مطابق دوشنبے کا دن صرف ۸ ربیع الاول کو پڑتا ہے اس لیے آج کل یہی تاریخ مقبول ہوتی جا رہی ہے۔

مگر میرے نظریہ تقویم کے بموجب ۱۲ ربیع الاول سلہ کو دوشنبہ ہی کا دن تھا کیونکہ اس سال کی ماہ ربیع الاول کی پہلی تاریخ پنجشنبہ ۱۱ نومبر ۶۲۲ء کے مطابق تھی جس کے حساب سے ۱۲ ربیع الاول کو دوشنبہ کا دن اور جولین تاریخ ۲۲ نومبر ۶۲۲ء ہونا چاہیے۔

(برہان، اکتوبر ۱۹۷۱ء ص۲۱)

قارئین زندگی پہلے پڑھ چکے ہیں کہ متقدمین کا ۱۲ ربیع الاول پر اتفاق نہیں ہے۔ امام زہری سے دو روایتیں منقول ہیں۔ یکم ربیع الاول اور ۱۵ ربیع الاول۔ خود ابن اسحٰق سے دو روایتیں منقول ہیں۔ ان کے شاگرد جریر بن حازم نے ۲ ربیع الاول روایت کیا ہے اور ابراہیم بن سعد نے ۱۲ ربیع الاول اور ابوبکر بن حزم متوفی ۱۲۰ھ سے ۱۳ ربیع الاول منقول ہے۔ ۸ ربیع الاول کی روایت بھی بے تائید نہیں ہے۔ نہ صرف مشہور محدث و سیرت نگار حافظ مغلطائی نے اس کا ذکر کیا ہے بلکہ سیرت ابن ہشام کے مصری محشی نے امام سہیلی کے واسطے سے ۸ ربیع الاول کی تاریخ کو ۱۲ کے بالمقابل لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "وقال غیر ابن اسحٰق قدمها لثمان خلون من ربیع الاول"

علامہ شبلی نے اس تاریخ پر اکثر مورخین کا اتفاق نقل کیا ہے۔

اور ابن حجر لکھتے ہیں کہ ابوبکر بن حزم نے یقین کے ساتھ بیان کیا ہے کہ حضور مکے سے ۲۶ صفر کو نکلے تھے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ آپ یکم ربیع الاول یوم دوشنبہ کو غار ثور سے مدینے کی طرف روانہ ہوئے۔

خود موصوف نے لکھا ہے کہ البیرونی جیسے ریاضی داں نے بھی ۸ ربیع کی روایت اختیار کی ہے اس لیے محض اتنی بات کہ کسی کیلنڈر کے اعتبار سے ۱۲ ربیع الاول کو یوم دوشنبہ پڑتا ہے اس کو مرجح قرار دینے کے لیے بالکل ناکافی ہے خصوصاً اس حال میں کہ یہ مفروضہ کیلنڈر ایک ایسی تاریخی حقیقت کی تردید و تغلیط کرتا ہے جس پر آج تک تمام مورخین متفق ہیں۔ یعنی یہ کہ حضور خالص قمری مہینے کے لحاظ سے ماہ ربیع الاول میں وارد قبا ہوئے تھے اور کسی مستشرق نے بھی آج تک اس کا انکار نہیں کیا۔

یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ امام زہری سے ایک روایت ۱۵ ربیع الاول کی بھی ہے۔ اس تاریخ کو بھی دوشنبے کا دن پڑتا ہے۔

میور نے عیسوی سن کے لحاظ سے تاریخ ورود قبا ۲۸ جون قرار دی ہے۔ اس کی تردید کرتے ہوئے موصوف نے لکھا ہے کہ یہ واقعہ جون کا نہیں ہو سکتا اور دلیل میں دو روایتیں پیش کی ہیں ایک یہ

چن [illegible] تھے' یا یہ کہ فصل خریف کمیٹی جا رہی تھی' کسی طرح صحیح نہیں ہے ۔ اس کا مفہوم صرف اتنا ہے کہ وہ اپنے گھر والوں کے لیے کھجوریں توڑ رہے تھے یا چن رہے تھے ۔ یخترف کے یہی معنی لغت میں بھی ہیں اور یہی ابن حجر نے بھی بیان کیے ہیں ۔ یخترف لھم ای یجتنی من الثمار ۔ لسان العرب میں اخراف کا لفظ درخت سے گری ہوئی کھجوروں کے لیے بھی استعمال ہوا ہے ۔ عام ازیں کہ وہ گدر ہوں یا رطب ہوں لاخترافت اللقط بسرا کان او رطبا ۔ مدینے میں عام غذا چونکہ کھجور تھی اس لیے گدر ہونے کے بعد ہی بلکہ اس سے پہلے سے لوگ کھجوریں توڑ توڑ کر اپنی ضرورت پوری کرنے لگتے تھے حضرت ابن سلام بھی یہی کام کر رہے تھے کہ ان کو حضور کی آمد کی خبر ملی ۔ اس ٹکڑے کے بعد یہ بھی اسی حدیث میں ہے کہ وہ تھوڑی سی توڑی ہوئی کھجوریں لیے ہوئے گھر جانے کے بجائے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں حاضر ہو گئے ۔

اب یہ دیکھیے کہ ہجرت کے وقت موسم کے گرم ہونے کی جو شہادتیں روایتوں میں موجود ہیں انہیں موصوف نے چھوا بھی نہیں ہے ۔ تمام روایتیں متفق ہیں کہ جب آپ مدینے پہنچے ہیں تو موسم گرم تھا ۔ انصار صبح ہی سے آپ کے انتظار میں بمقام حرہ جمع ہو جاتے اور جب دھوپ ناقابل برداشت ہو جاتی تو اپنے گھروں میں داخل ہو جاتے ۔ ابن سعد کی ایک روایت ہے ۔ فاذا احرقتھم الشمس رجعوا الی منازلھم ۔ جب دھوپ انہیں جلانے لگتی تو وہ اپنے گھروں کی طرف پلٹ جاتے اور ابن ہشام نے اس سے بھی زیادہ صریح الفاظ استعمال کیے ہیں " وذالک فی ایام حارۃ " اور یہ واقعہ گرم دنوں میں پیش آیا ۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ہجرت کو ۲۲ نومبر کا واقعہ قرار دینا ان صریح روایتوں کے خلاف بھی ہے ۔

تاریخ ہجرت کی تعیین

اس ضمن میں مزید اطمینان کے لیے یہ دیکھ لینا چاہیے کہ مورخین سیرت کے بیان سے واقعہ ہجرت کی تاریخی تعیین ہوتی ہے یا نہیں ۔

سیرت ابن ہشام میں " تاریخ الہجرۃ " کا عنوان مقرر کر کے اس کے تحت لکھا گیا ہے ۔

ابن اسحٰق نے کہا :۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ پیر کے دن پہنچے ۔ جب دھوپ سخت ہو گئی تھی اور آفتاب نصف النہار کے قریب تھا اور ۱۲ ربیع الاول کی تاریخ تھی (اور ابن ہشام کے نزدیک بھی یہی تاریخ تھی) ابن اسحٰق نے کہا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دن ۵۳ سال کے

اور ہجرت بعثت کے تیرہ سال بعد ہوئی۔ پس آپ مدینے میں ربیع الاول کے باقی ایام اور ربیع الآخر، دونوں جمادی اور رجب، شعبان، رمضان، شوال، ذی قعدہ، ذی الحجہ اور اس سال کا حج مشرکین کی تولیت میں ہوا اور محرم مقیم رہے۔ پھر آپ غزوے کو نکلے صفر۔ قدوم مدینہ کے بارہویں مہینے کی ابتدا میں۔ ابن ہشام نے کہا اور سعد بن عبادہ کو مدینے کا عامل بنایا۔

اس تفصیلی بیان سے متعین ہو گیا کہ آپ کی ہجرت خالص قمری حساب سے ماہ ربیع الاول میں ہوئی تھی۔ کیونکہ کبی کیلنڈر سے صفر بارھواں مہینہ نہیں ہوتا بلکہ صرف قمری حساب کے ربیع الاول سے صفر بارھواں مہینہ ہوتا ہے۔ ابن اسحاق کی تصریح تاریخی بیان واقعہ ہے اس میں قیاس کا دخل ممکن نہیں ورنہ تمام تاریخی صراحتیں ناقابل اعتماد ہو جائیں گی۔

صومِ عاشورا صوم عاشوراء کی احادیث کو ہمارے فاضل دوست نے اپنے نظریے کے لیے بہت بڑا ثبوت قرار دیا ہے۔ ان احادیث سے ان کے نزدیک یہ بالکل ثابت ہو جاتا ہے کہ مدینہ منورہ میں کبیسہ والی کی تقویم جاری رہی ہے۔

بلاشبہ ان احادیث سے متعدد اشکالات پیدا ہوتے ہیں اور انہیں دور کرنے کے لیے محدثین نے بڑی تفصیل سے ان پر گفتگو کی ہے۔ یہاں ان تفصیلات کو پیش کرنا اور تمام مسائل پر گفتگو کرنا بالکل غیر ضروری ہے۔ ایک بڑی مشکل ان لوگوں کو پیش آئی ہے جنھوں نے یہ سمجھا کہ یہودیوں کے صوم عاشوراء کا قصہ ربیع الاول سلہ میں پیش آیا تھا جب حضور مدینہ تشریف لائے تھے لیکن صحیح بات یہ ہے کہ یہ واقعہ محرم سلہ کا ہے موصوف نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے اس لیے ہم اس بحث کو بھی نظر انداز کرتے ہیں — توقیتی نقطۂ نظر سے موصوف نے جو تحقیق پیش کی ہے ہم صرف اسی کے بارے میں چند باتیں عرض کریں گے۔

پہلی بات یہ کہ ابوریحان البیرونی نے صحیح احادیث کی تغلیط جس بنیاد پر کی ہے وہ انتہائی بودی ہے انہیں سب سے پہلے تاریخی حوالوں سے یہ ثابت کرنا تھا کہ یہودیان مدینہ کا حساب بھی کبیسہ والا شمسی قمری حساب تھا اور اسی حساب سے وہ صوم عاشوراء رکھتے تھے۔ محض یہ بات کہ ایران یا کسی اور مقام کے یہودیوں کا حساب قمری شمسی تھا اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ یہودیان مدینہ کا حساب بھی قمری شمسی ہو جائے۔ یہ بات معلوم ہے کہ بائبل میں کبیسہ کا ذکر نہیں ہے اور سال کے صرف بارہ مہینے مذکور ہیں اس لیے کبیسہ کا حساب شریعت موسوی میں الحاقی تحریف ہی کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ دنیا میں جو یہودی آ[illegible]

سنین کا حساب یکساں نہ تھا بلکہ مختلف تھا اس لیے جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ یہودیانِ مدینہ میں بھی کبیسہ والا حساب رائج تھا اور وہ صوم عاشورا اسی حساب سے رکھتے تھے اس وقت تک احادیث کی تغلیط قرین عقل و انصاف نہیں ہے۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ مکہ میں قریش، کبیسہ کے حساب پر عامل تھے تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوگا کہ مدینے کے یہودی بھی اس پر عامل تھے بلکہ سادہ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح اوس و خزرج کے قبیلوں میں خالص قمری حساب رائج تھا ٹھیک اسی طرح بنو قریظہ، بنو قینقاع اور بنو نضیر میں بھی رائج تھا ان کے مہینے بھی وہی تھے اور سال کا حساب بھی وہی تھا۔

دوسری بات یہ کہ ہمارے فاضل دوست سے بھی وہی غلطی ہوئی ہے جو البیرونی سے ہوئی تھی انھوں نے بھی یہ کہیں ثابت نہیں کیا کہ یہودیانِ مدینہ کا پہلا مہینہ تشری ہوتا تھا اور اسی ماہ کی ۱۰ تاریخ کو وہ صوم عاشورا رکھتے تھے۔ لطف یہ ہے کہ موصوف نے اپنے مقالوں میں متعدد مقامات پر لکھا ہے کہ یہودیوں کے سال کا حساب ہر جگہ یکساں نہ تھا ایک جگہ ماہ تشری سے ابتدا کے بارے میں اپنا خیال تحریر کرکے حاشیے میں البیرونی کے خیال کی تردید ان الفاظ میں کرتے ہیں

> لیکن البیرونی نے آثار الباقیہ ر ۱۴۱ (سخاؤ) میں بیان کیا ہے کہ یہودی سال کی ابتدا ایسے چاند سے ہوتی جس کی رویت ۲۷ آب (اگست) سے لے کر ۲۴ ایلول (ستمبر) تک ممکن ہوتی تاریخی نقطۂ نظر سے البیرونی کی یہ شہادت بظاہر نہایت اہم معلوم ہوتی ہے اور اس سے اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ کم از کم البیرونی کے زمانے میں یہودی سال ۷ اگست سے شروع ہو سکتا تھا مگر میرا خیال ہے کہ یہ طریقہ شاید ایران اور عراق کے یہودیوں تک محدود ہوگا (جہاں فصلیں پہلے تیار ہو جاتی ہیں) ورنہ شام اور فلسطین کے یہودی اس تاریخ سے ابتدا نہیں کر سکتے تھے اس لیے کہ فلسطین میں جو کی فصل وسط اپریل سے پہلے تیار نہیں ہوتی جس کی وجہ سے عید فسح جو ہمیشہ ساتویں مہینے (یعنی نیسان) کی ۱۴ تاریخ کو منائی جاتی اپریل کے لگ بھگ ہونا چاہیے کیونکہ اس تیوہار میں کھیتوں کا اولین حاصل خداوند کی نذر کیا جاتا۔ چنانچہ جوزیفس نے یہودی ماہ نیسان کو مقدونی مہینے (ANTHECUS) اور مصری مہینے (PHARMUTH) سے مطابق کیا ہے (برہان جون ۱۹۶۷ء حاشیہ ص ۳۲۲)

علامہ معاکبیسہ کے مختلف طریقوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

البیرونی نے یہودیوں کے ایک فرقے کے متعلق بیان کیا ہے کہ ان میں عید فصح منانے کے لیے یہ دستور تھا کہ ایک متدین عالم ۲۹ شباط کو شہر سے باہر جاتا اور جو کے کھیتوں کا معائنہ کرتا اگر جو کی بالوں میں کونپلیں نکل آتیں تو اس تاریخ سے پچاس دن شمار کر کے عید فصح کا تیوہار مقرر کر دیتا ورنہ سال رواں میں ایک ماہ کا اضافہ ضروری تھا۔

برہان جون ص۳۴۲

وہ یونانی طریقے کی تفصیل اور اس کی مقبولیت کا حال بتاتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

چناں چہ البیرونی کے بقول شام و عراق کے یہودی اسی طریقے پر کاربند تھے۔ (ص۳۴۳)

وہ ایک جگہ اور لکھتے ہیں :۔

مگر میری رائے میں یہ طریقہ اس لیے مناسب نہ تھا کہ ظہور اسلام کے وقت اس میں موجودہ یکسانیت اور ہم آہنگی نظر نہیں آتی اور مختلف مقامات پر کبیسا لوں کے بالکل مختلف فارمولے رائج ملتے ہیں۔ البیرونی نے بڑی صراحت سے ان اختلافات کو بیان کیا ہے جنہیں دیکھنے کے بعد یہ فیصلہ دشوار ہو جاتا ہے کہ مدینے اور حجاز میں کون سا فارمولا رائج تھا اور حیرت ہوتی ہے کہ ایک چھوٹی سی قوم میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اتنے مختلف اصول کس طرح قابل عمل تھے۔

(برہان جولائی ص۱۵)

یہ سب کچھ لکھتے ہوئے تعجب ہے کہ موصوف کی نگاہ اس طرف کیوں نہیں گئی کہ آخر کس دلیل کی بنا پر وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ مدینے کے یہودی یوم عاشورا ماہ تشری کی ۱۰ تاریخ کو رکھتے تھے پہلے یہ ثابت ہونا چاہیے کہ ان کے یہاں بھی حساب قمری شمسی تھا۔ پھر یہ ثابت ہونا چاہیے کہ ان کے یہاں کبیسہ کا فارمولا کیا تھا۔ پھر یہ ثابت ہونا چاہیے کہ ان کے مہینوں کے نام عربی ناموں سے مختلف تھے اور پھر یہ ثابت ہونا چاہیے کہ ان کے سال کا پہلا مہینہ تشری تھا ان میں سے کسی بات کا ثبوت موجود نہیں اور دعویٰ یہ ہے کہ وہ روزہ ماہ تشری کی ۱۰ تاریخ کو رکھتے تھے اور اس کی مطابقت کی ہی تقویم کے محرم کی ۱۰ تاریخ سے ممکن ہے۔ لہذا ثابت ہو گیا کہ مدینہ میں کی تقویم رائج تھی حیرت ہوتی ہے کہ موصوف کس طرح اس طرز استدلال سے مطمئن ہو گئے۔

موصوف نے حضور کی آمد سے پہلے مدینے میں خالص قمری تقویم کے رائج ہونے کی جو دلیلیں دی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے۔

> اس خیال کو مزید تقویت یوں ہوتی ہے کہ جن مقامات پر قمری شمسی تقویم کا رواج تھا وہاں اس کے حسابات درست رکھنے کے لیے مستقل عہدے دار مقرر کیے جاتے۔ چنانچہ رومیوں یہودیوں اور خود اہل مکہ کے متعلق آپ پڑھ چکے ہیں کہ ان میں "نساۃ" کے محکمے بالکل مستقل تھے۔ مدینے کے لوگ اگرچہ مذہباً اہل مکہ سے بہت کچھ مختلف اور آزاد تھے۔ تاہم تاریخ میں ایسی کوئی شہادت نہیں کہ ان کے یہاں بھی یہ محکمہ یا نسی کہنے والوں کا عہدہ موجود تھا۔ حالانکہ اس شہر کے متعلق ظہور اسلام کے زمانے کے حالات کافی محفوظ ہیں۔
>
> (برہان جولائی ص۲۶)

یہ موقع تھا کہ موصوف سوچتے کہ کیا یہودیان مدینہ کے قبیلوں میں نساۃ کے محکمے کا وجود ملتا ہے یا ان میں نسی کرنے والوں کا عہدہ موجود تھا۔ یہودیان مدینے کے بھی کافی حالات محفوظ ہیں لیکن یہ کہیں مذکور نہیں کہ ان کے یہاں کوئی نسی کا عہدہ دار موجود ہو جو کبیسے کا اعلان کیا کرے۔

موصوف ایک اور دلیل دیتے ہیں:-

> اس میں کوئی شک نہیں کہ مورخین اسلام نے بڑی صراحت سے متعدد جاہلی سنین اور شہور کے نام گنائے ہیں جو مختلف قبائل میں رائج تھے اور یہ نام عربی تقویم کے مروجہ ناموں سے بالکل مختلف بھی ہیں بلکہ ان کے دنوں تک کے نام الگ الگ نظر آتے ہیں لیکن ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ یہ نام مدینے میں رائج تھے۔
>
> (برہان جولائی ص۲۶-۲۷)

موصوف کے لیے یہ بھی ایک قابل غور موقع تھا وہ یہ سوچتے کہ کیا ایسی کوئی روایت و شہادت ملتی ہے جس سے معلوم ہو کہ یہود مدینہ کے مہینوں کے نام مروجہ عربی مہینوں کے ناموں سے مختلف تھے۔ جب مدینے کو مکے پر اور مدینے کے باشندوں کو مکے یا حجاز کے دوسرے قبیلوں پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے بلکہ تاریخی شہادت کی ضرورت ہے تو آخر یہود مدینہ کے سنین و شہور کے لیے تاریخی شہادت کی ضرورت کیوں نہیں ہے اور یہاں مجرد قیاس کی بنیاد پر موصوف نے اتنے بڑے دعوے کو کس طرح صحیح سمجھ لیا۔

جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے کہ سادہ حقیقت یہ ہے کہ یہود مدینہ کے سنین و شہور وہی تھے جو اہل مدینہ کے تھے اور وہ صوم عاشورہ خالص قمری حساب سے ۱۰ محرم کو رکھتے تھے اور [illegible]

میں ابن اسحٰق کا بیان پڑھیے۔ وہ یہ بھی منقول کرتا ہے کہ یہود مدینہ کے صوم عاشورا کا واقعہ حضور کے قدوم مدینہ سے گیارھویں مہینے محرم میں ہوا تھا۔ صفر بارھویں مہینے میں آپ غزوے کے لیے نکلے اور محرم کیا مہینے میں آپ نے عاشورا کا روزہ رکھا۔

موصوف نے خود جو احادیث پیش کی ہیں ان میں ایک حدیث ایسی ہے کہ اگر وہ اس پر غور کرتے تو یہ معلوم ہو جاتا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم قمری حساب سے ۱۰ محرم کو روزہ رکھتے تھے۔ بلکہ یہ حدیث اس بات کی بھی ایک بڑی دلیل ہے کہ مدینے کے یہودی بھی قمری ہی حساب سے صوم عاشورا رکھتے تھے۔ وہ حدیث یہ ہے:-

الحکم بن الاعرج کہتے ہیں کہ میں ایک بار عبداللہ بن عباس کے پاس آیا تو وہ زمزم سے تکیہ لگائے بیٹھے تھے۔ میں بھی بیٹھ گیا اور ان سے عاشورا کے متعلق سوال کیے۔ میں نے کہا یوم عاشورا کے متعلق مجھے بتائیے تو فرمایا کہ اس کے متعلق کیا دریافت کرتے ہو۔ میں نے کہا اس کے روزے کے متعلق۔ فرمایا۔ جب تم محرم کا چاند دیکھو تو اس سے حساب لگاؤ اور جب نو کی صبح ہو جائے تو اسی صبح کو روزہ رکھو۔ میں نے عرض کیا رسول اللہ یونہی روزہ رکھتے تھے؟ فرمایا۔ ہاں۔

(برہان، جولائی صفحہ ۱۲)

کھلی بات ہے کہ حضرت ابن عباس سے صوم عاشورا کے بارے میں یہ سوال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کیا گیا تھا۔ ابن عباسؓ جواب دیتے ہیں کہ جب محرم کا چاند دیکھو تو دن شمار کرو اور نویں دن روزہ رکھو۔ سائل پوچھتے ہیں کہ کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی یوں ہی روزہ رکھا کرتے تھے وہ جواب دیتے ہیں۔ ہاں۔ موصوف کے نظریے کے مطابق کی تقویم حضور کی وفات سے پہلے منسوخ ہو چکی تھی۔ اب اگر یہ مانا جائے کہ مسلمان یہودیوں کے ماہ تشری کے مطابق روزہ رکھتے تھے تو حضرت ابن عباس کا یہ جواب صحیح نہ رہے گا۔ اگر وہ بھی وہ جو موصوف سمجھ رہے ہیں تو ان کا جواب یہ ہوتا کہ یہودیوں کے ماہ تشری کو دیکھو اور اسی کی نو تاریخ کو روزہ رکھو۔ سائل کے اس سوال کے جواب میں بھی کہ کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم یونہی روزہ رکھتے تھے وہ اثبات میں جواب دیتے ہیں۔ سائل اس جواب سے دو باتیں بالکل صاف ہو جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خالص قمری حساب سے عاشورا کا روزہ رکھتے تھے اور دوسری یہ کہ یہود بھی اسی حساب سے روزہ رکھتے تھے ورنہ مطابقت ناممکن تھی۔ یہ حدیث موصوف کے نظریے کے بالکل خلاف تھی اس کو اپنی موافقت میں پیش کرنے کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اس پر غور نہیں کیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ موصوف کا سب سے بڑا ثبوت بھی کوئی ثبوت نہیں ہے۔ (باقی)

رویت ہلال

جناب حسن احمد مینائی

رویت ہلال کے بارے میں ان دنوں جو الجھنیں ہیں اور خصوصاً بعض اسلامی ممالک میں جس طرح بعض
ینوں کے آغاز کا اعلان کیا جا رہا ہے اس ضمن میں بعض امور انتہائی سنجیدگی کے ساتھ غور طلب ہیں جو بنیادی
بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ ۱۳۸۵ھ کو عید الفطر کے موقع پر پاکستان میں جو انتشار رہا اس کے پیش نظر یہ مسئلہ
ر زیادہ قابل غور ہو گیا ہے۔ اس سلسلے میں یہ استدلال درست نہیں ہے کہ بعض اسلامی ملکوں میں قمری
مہینے پاکستان کے مقابلے میں عموماً دو دن پہلے شروع ہو رہے ہیں اور شوال ۱۳۸۵ھ کی تاریخوں میں
دن کا تفاوت ہو گیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ کسی غلط عمل کو خواہ وہ کسی کی جانب سے ہو استدلال
بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔ گزشتہ کچھ عرصے سے بعض ملکوں میں قمری مہینوں کے آغاز کا اعلان ایسے دن
ر دیا جاتا ہے جبکہ نئے چاند کا نظر آنا ممکن ہی نہیں۔ بالفاظ دیگر چاند اس منزل اور اس درجے پر پہنچا
ہیں جب وہ ہلال کی شکل میں دکھائی دے سکے۔ اس کا ایک ناقابل تردید ثبوت چودھویں رات کے
سے پیش کیا جا سکتا ہے جس رات ماہ کامل ہو وہ ظاہر ہے کہ ہلال کی رویت کے بعد سے چودھویں
ب ہوگی لیکن اگر اس حساب کو درست فرض کیا جائے جو بعض جگہ چلایا جا رہا ہے تو سب ہی دیکھ سکتے ہیں
ماہ کامل کی شب عموماً سولھویں شب قرار پاتی ہے جو بدیہی طور پر ناقابل قبول ہے۔ اسی چیز کو یوں بھی کہا
سکتا ہے کہ ان ملکوں میں جہاں قمری مہینے رویت ہلال سے قبل شروع کیے جا رہے ہیں وہاں مقامی
ساب کے مطابق چودھویں رات کو ماہ کامل نہیں ہوگا جسے سب ہی دیکھ سکتے ہیں۔ یہ کسی طرح بھی باور نہیں
جا سکتا کہ ہمارے ہاں عموماً بارہویں رات کا جو غیر کامل چاند ہوگا وہ اسی رات کو وقت کے تھوڑے سے
کی وجہ سے ان علاقوں میں ماہ کامل نظر آ رہا ہوگا جہاں وہی رات چودھویں شب قرار پاتی ہو کیونکہ قمر

ایک ہی ہے جو مشرق وسطیٰ کے ملکوں میں کچھ دیر بعد لازماً ویسا ہی دکھائی دے گا جیسا مغربی پاکستان میں تقریباً تین گھنٹے قبل دکھائی دیتا رہا ہو۔ اس صورت میں یہ کیسے ممکن ہے کہ وہی چاند ایک ہی رات میں ماہ کامل بھی ہوا اور گیارھویں بارھویں رات کا ناکمل چاند بھی۔ بالفاظ دیگر وہ محض تین گھنٹوں کے فرق میں بارھویں رات کے ناکمل چاند سے ماہ کامل بن جائے اور اگلی رات ہمارے لیے پھر ناکمل چاند ہو جائے۔ یہاں یہ وضاحت نامناسب نہ ہوگی کہ انگلستان سے شائع ہونے والی ایک مسلمہ فلکی تقویم میں جو رائل کی تقویم فلکی کہلاتی ہے، ماہ شوال ۱۳۸۵ھ میں ماہ کامل ہونے کا جو وقت لکھا ہے وہ پاکستان کے لیے ۵ اور ۶ رفروری ۱۹۶۶ء یعنی روز شنبہ و یکشنبہ کی درمیانی رات کی ابتدا میں پڑتا ہے جس کی رو سے پاکستان میں یکم شوال ۱۳۸۵ھ مطابق ۲۴ر جنوری ۱۹۶۶ء کو بروز دوشنبہ قرار پاتی ہے۔

چونکہ مغربی قومیں آج متعدد علوم و فنون میں دوسری اقوام اور مسلمانوں کی بہ نسبت بہت آگے ہیں اس لیے ان علوم میں بیشتر معیاری معلومات مغرب ہی سے شائع ہوتی ہیں۔ انہی میں فلکیاتی تقویمیں بھی ہیں جن میں رفتار سیارگان صحت کے ساتھ درج ہوتی ہے جس کی تصدیق مسلمان ماہرین فلکیات بھی کر سکتے ہیں۔ ان کی مدد سے یہ باسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ کس مہینے چاند کن کن علاقوں میں غروب آفتاب کے وقت ایسے درجات پر پہنچ جائے گا کہ ہلالی شکل میں دکھائی دے سکے۔ لہٰذا یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ آیا کسی جگہ نئے چاند کے دیکھے جانے کا دعویٰ درست ہے بھی یا نہیں۔ اس سلسلے میں سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ خدا کے ہاں ان عبادات کی حیثیت کیا ہوگی جو شرعاً تو حقیقی رویت ہلال پر موقوف ہیں لیکن عملاً ان کے بارے میں رویت کی پابندی نہیں کی جا رہی ہے۔ ان حالات میں حسب ذیل امور فیصلہ طلب ہیں۔

۱۔ علمائے دین کی ایک جماعت جس میں تمام بڑے اسلامی ملکوں کے مسلم اور سربرآوردہ علماء کی نمائندگی ہو، اس بات کو طے کرے کہ کیا قمری مہینوں کے آغاز کے لیے اب نئے چاند کا دیکھا جانا ضروری نہیں ہے؟

۲۔ اگر اب یہ ضروری نہیں ہے تو پھر یہ طے کیا جائے کہ نئے چاند کے تعین کی بنیاد کیا ہوگی۔ کیا یہ بنیاد فلکیاتی اصطلاح کے مطابق ہوگی۔ اس اصطلاح کے تحت نئے چاند کا اطلاق کرۂ قمر پر اس وقت ہوتا ہے جب وہ منطقۃ البروج میں اسی درجے پر پہنچ جائے جس درجے پر آفتاب ہو۔ اس کے معاً بعد ہی وہ نیا چاند ہو جاتا ہے لیکن ہلال کی شکل میں نظر آنے کی نوبت بعض اوقات ایک دن بعد پہنچتی ہے اور بعض صورتوں میں دو دن بعد بھی۔ اس مسئلے کی تفصیلات طویل اور پیچیدہ ہیں جن پر بحث کی یہاں گنجائش نہیں۔

اگر نئے چاند کا دیکھا جانا بہر حال ضروری ہے تو اس کے مطابق عمل بھی لازمی ہے ۔ نئے چاند کے نظر آنے کی بنیادی شرط صدیوں کے تجربے کے مطابق یہ ہے کہ یہ اس وقت دکھائی دیتا ہے جب کرۂ قمر کرۂ آفتاب سے کم و بیش بارہ درجے پیچھے ہٹ جائے (یا صحیح فلکیاتی اصطلاح کے مطابق کم و بیش آگے رہ جائے) اگر آفتاب اور چاند کے درمیان فاصلہ گیارہ درجے سے کم ہو تو نئے چاند کے دکھائی دینے کا امکان تقریباً معدوم ہوتا ہے ۔ ۲۲ رجنوری ۱۹۶۶ء روز شنبہ مطابق ۲۹ رمضان ۱۳۸۵ھ کو مغربی پاکستان میں غروب آفتاب کے وقت چاند کا سورج سے فاصلہ رافائیل کی تقویم کے مطابق پونے دس درجے تھا ۔

آفتاب اور چاند کے درمیان فصل وقت کے گزرنے کے ساتھ بڑھتا ہے اور اسی میں زمین بھی اپنے محور پر گردش کرتی ہوتی ہے جس کا رخ مغرب سے مشرق کی طرف ہے ۔ لہذا رویت ہلال کی حد تک اختلاف مطالع بنیادی طور پر شرقاً غرباً ہوتا ہے ۔ گو نئے چاند کے دکھائی دینے پر کچھ اور عوامل بھی اثر انداز ہوتے ہیں جن کی تفصیل یہاں ناممکن ہے ۔ غرض یہ تصور درست نہیں ہے کہ مثلاً مغربی پاکستان کے شمالی علاقوں میں رویت ہلال کراچی سے ایک دن پہلے ہونا ممکن ہے اور پھر وہاں سے مشرق وسطیٰ کے درمیان مزید ایک دن کا فرق ہو سکتا ہے لہذا کراچی اور مشرق وسطیٰ کے درمیان رویت ہلال میں دو دن کا فرق ممکن ہے ۔ ۱۳۸۵ھ کی عید الفطر کا تو یہ حال ہوا کہ سعودی عرب میں یہ عید اخباری اطلاعات کے مطابق جمعہ ۲۱ رجنوری ۱۹۶۶ء کو مصر میں بروز شنبہ ۲۲ رجنوری کو کچھ اور مقامات پر یکشنبہ ۲۳ رجنوری کو اور پاکستان میں بیشتر بروز دو شنبہ ۲۴ رجنوری کو منائی گئی کیا ایک لمحے کے لیے بھی یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ یہ سب عیدیں رویت ہلال پر مبنی تھیں ۔ اگر کوئی یہ فرض کرے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ شوال ۱۳۸۵ھ میں ماہ کامل بھی چار متواتر راتوں میں ہونا چاہیے جن میں سے ایک سعودی عرب کے لیے ایک مصر کے لیے ایک کچھ اور علاقوں کے لیے اور ایک پاکستان کے لیے ہو کیا یہ ممکن ہے ؟ البتہ یہ صورت علمی طور پر قابل قبول ہے کہ دنیا کے مختلف علاقوں کے لیے دو متواتر راتوں میں سے کسی ایک رات کو چاند کی وہ شکل ہو جسے عرف عام میں ماہ کامل کہا جاتا ہے جیسا کہ رویت بھی مختلف علاقوں میں صرف دو متواتر شاموں میں سے کسی ایک شام کو ہو سکتی ہے ۔

آسمان پر سیر قمر کا حساب صدیوں سے صحت کے ساتھ کیا جا رہا ہے ۔ علم فلکیات کی مزید ترقی اور جدید آلات کی مدد سے یہ حسابات زیادہ قابل اعتماد درجہ میں ہو گئے ہیں ۔ چنانچہ اب یہ بات وثوق

کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ کرۂ قمر کسی جگہ ہلال کی شکل میں نمودار ہوسکنے کی نوبت پر کس دن اور کس وقت پہنچ رہا ہے۔ بالفاظ دیگر کیا کسی مقام پر غروب آفتاب کے وقت تک چاند، آفتاب سے کم و بیش بارہ درجے دور رہا ہے یا نہیں تاکہ مطلع صاف ہونے کی صورت میں رویت ہلال ممکن ہو۔ اس ضمن میں ہمیں اپنے عوام کی صحیح رہبری کرنے کی بھی شدید ضرورت ہے۔ مناسب افہام و تفہیم کے ذریعے ان پر یہ بات واضح کی جانی چاہیے کہ وہ شک کا روزہ نہ رکھیں جس کی حدیث میں ممانعت کی گئی ہے۔ یعنی وہ رمضان کے روزے ایک دن پہلے شروع نہ کریں ورنہ اس ماہ کے ۳۰ روزے ہونے کی صورت میں انہیں یا تو ۳۱ روزے رکھنے ہوں گے، یا پھر رویت سے ایک دن پہلے عید الفطر کرنی ہوگی اور یہ دونوں صورتیں درست نہیں ہیں۔ تبلیغ کا ایک نہایت اہم پہلو ہمارے لیے یہ بھی ہے کہ خود مسلمانوں کو دین کے مبادی سے واقف کرائیں۔

نئے چاند کا نظر آنا مظاہر قدرت میں سے ایک مظہر ہے اور تمام مظاہر فطرت جن میں سیاروں کی گردش بھی شامل ہے۔ مقررہ طبیعی قوانین کے مطابق وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ سنت الٰہی یہ ہے کہ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ ان حقائق کے باوجود یہ تصور کہ شاید چاند ایسی صورت میں بھی نظر آجاتا ہو جبکہ اس مظہر کے وقوع پذیر ہونے کے قدرتی لوازم پورے نہ ہوئے ہوں، محض لاعلمی اور فہم کی کوتاہی ہے۔ علم مسلمان کی میراث تھا جس کے حصول کی تاکید قرآن حکیم اور احادیث میں موجود ہے۔ قدرت کی نشانیوں، آسمان و زمین اور اس کے موجودات میں غور و فکر کرنے کی قرآنی دعوت درحقیقت تمام سائنسوں کی بنیاد ہے لیکن آج مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ بجائے اس کے کہ علم کو اپنی میراث گم گشتہ تصور کریں اور اسے جہاں بھی ملے حاصل کریں۔ اس سے نابلد رہنے پر قانع ہیں اور ان امور سے جن پر انہیں اپنے علم کی مدد سے حاوی اور مطلع رہنا چاہیے تھا بے خبر ہیں۔ اس طرح ہم نے اپنے اہم ترین مذہبی اعمال کو محض ایسے روایاتی معتقدات کا درجہ دے دیا ہے جن کا حقائق کائنات سے گویا کوئی تعلق نہیں ہے۔

رویت ہلال ممکن ہونے سے قبل بعض جگہ قمری ماہ کے آغاز کے اعلان کی صرف ایک توجیہ سمجھ میں آتی ہے۔ وہ یہ کہ قمری تاریخیں اس دن سے شروع کی جا رہی ہیں جس دن مغربی فلکیاتی تقویموں میں New moon) یا "نیا چاند" لکھا ہوتا ہے اور اس پر بھی غور نہیں کیا جا رہا ہے کہ فلکیاتی اصطلاح کے تحت بھی یہ نئے چاند کا اطلاق خود اس ملک پر اس دن ہوتا ہے یا نہیں۔ شوال ۱۴۰۲ھ کے آغاز کا اعلان سعودی عرب میں ایسے دن کیا گیا کہ کرۂ قمر فلکیاتی اصطلاح میں بھی "نئے چاند" کی منزل پر تھا۔

حساب کے مطابق یکم شوال کا پورا دن گزرنے کے بعد مغرب کے قریب پہنچا اور ہلال کے درجے پر پہنچنے کے لیے اسے بعض علاقوں کی نسبت سے کم از کم مزید ایک دن اور بعض ملکوں کے لیے مزید دو دن درکار رہتے جیسا کہ اوپر بھی بتایا گیا۔ فلکیاتی اصطلاح کا نیا چاند ہلال نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے اور ہلال کے درمیان کم از کم ایک دن کا اور بعض صورتوں میں دو دن کا فرق بھی ہو سکتا ہے۔ غرض فلکیاتی اصطلاح کے "نئے چاند" اور شرعی رویتِ ہلال میں فرق خواہ ایک دن کا ہو یا دو دن کا۔ اس کے مطابق رویت کا اعلان اور اس پر عمل درآمد نہ تو سائنسی نقطۂ نظر سے قابلِ قبول ہے اور نہ شرعی طور پر قابلِ برداشت۔ اب اس گتھی کو سلجھانا علمائے کرام کا کام ہے کہ یہ صورت کیوں واقع ہو رہی ہے۔

اس مرحلے پر چند امور قابلِ توجہ ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ کہ عالمِ اسلام یا مسلم مملکتوں کا کرۂ ارض پر موجودہ پھیلاؤ ایسا ہے کہ سب جگہ رویتِ ہلال ایک ہی دن ہونا ضروری بھی نہیں ہے۔ بعض مہینوں میں ایک دن کا فرق ناگزیر ہوگا۔ جو سائنسی طور پر لازم ہے لیکن ایک دن سے زیادہ کا فرق بھی ناممکن ہے ایک دن کا فرق مثلاً اس طرح ہوگا کہ نیا چاند قابلِ رویت ہونے کی نوبت پر ایران میں کسی جگہ غروب آفتاب کے وقت پہنچے۔ اس صورت میں پاکستان یا انڈونیشیا میں جو ایران کے مشرق میں ہیں رویت نہیں ہو سکے گی اور اس بنا پر نئے ماہ کا آغاز شرعاً نہیں ہوگا۔ بخلاف اس کے ایران کے مغرب میں جو اسلامی ملک مثلاً عراق، سعودی عرب، شام، اردن اور ترکی ہیں وہاں نیا چاند یقیناً دکھائی دے گا۔ اسی طرح ہم جتنا مغرب کی طرف بڑھتے جائیں گے۔ یعنی مصر، پھر لیبیا، پھر الجزائر اور پھر مراکش وغیرہ تو ان ملکوں میں نیا چاند علی الترتیب زیادہ واضح دکھائی دیتا جائے گا۔ لیکن یہ محض ناممکن ہے کہ نیا چاند مثلاً مصر میں کسی دن دکھائی دے اور اس کے تیسرے دن سے پہلے پاکستان میں دکھائی نہ دے سکے۔

موجودہ مسلم مملکتوں کا پھیلاؤ انڈونیشیا سے لے کر مغربی افریقہ تک ہے اور انڈونیشیا کی مشرقی سرحد سے افریقہ کے مغربی ساحل تک کا فصل کم و بیش ½۱۵۷ درجے طول البلد بنتا ہے۔ وقت کے حساب سے یہ فرق کوئی ½۱۰ گھنٹے کا ہوتا ہے۔ کیونکہ زمین ۲۴ گھنٹوں میں اپنے محور پر ۳۶۰ درجے گھوم جاتی ہے ½۱۰ گھنٹے میں کرۂ قمر جب وہ سست رفتار ہو تو کوئی ½۵ درجے اور جب تیز رفتار ہو تو کوئی ½۶ درجے قوس تک کا فاصلہ طے کر لیتا ہے۔ واضح ہو کہ زمین کے گرد چاند کی گردش کی رفتار میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے چنانچہ ۲۴ گھنٹوں میں چاند منطقۃ البروج کے پس منظر میں کبھی تقریباً ¾۱۱ درجے اور کبھی تقریباً ¾۱۵ درجے تک

کا فاصلہ طے کرتا ہے۔ یہ کیفیت ان تمام اجرام فلکی کی ہے جو کسی دوسرے جرم فلکی کے گرد گھومتے ہیں یعنی ایک مکمل گردش کے دوران ان کی رفتار گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ نیز یہ کہ ان کی گردش ایک مکمل دائرے کی شکل میں نہیں ہوتی بلکہ ان کا مدار بیضوی شکل کا ہوتا ہے۔ چناں چہ گردش کرنے والے توابع کا فاصلہ اپنے مرکزی جرم فلکی سے گھٹتا بڑھتا رہتا ہے اور یہ قانون فطرت ہے کہ توابع کی رفتار اپنے مدار پر اس وقت سب سے زیادہ دھیمی ہوتی ہے جب وہ اپنے مرکزی جرم فلکی سے بعید ترین فاصلے پر ہوں اور اس وقت سب سے زیادہ تیز ہوتی ہے جب وہ مرکزی جرم فلکی سے قریب ترین ہوں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ قدرت کسی مرکزی جرم فلکی کی قوت کشش اور اس کے گرد گھومنے والے توابع کی اپنے مدار پر گردش سے پیدا ہونے والی مرکز گریز طاقت (CENTIFOGALFORCE) کے درمیان توازن قائم رکھتی ہے جب توابع اپنے مرکزی ستارے یا سیارے سے قریب تر ہوں۔ تو ان پر قوت کشش زیادہ اثر انداز ہوتی ہے جس کی تعدیل زیادہ تیز رفتار کی وجہ سے پیدا ہونے والی زیادہ قوی مرکز گریز قوت کر دیتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو توابع اپنے مدار پر قائم نہیں رہ سکیں گے اور اپنے مرکزی جرم فلکی کی طرف کھنچ کر اس سے جا ٹکرائیں گے۔ قدرت کے اسی اصول کے تحت جسے ایک سائنسی ضابطے کی شکل دے لی گئی ہے۔ زمین کے گرد چاند کی گردش کی رفتار بھی گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ جس کا حساب لگایا جاتا ہے اور جو تمام معیاری تقاویم فلکی میں شائع بھی ہوتا ہے۔

چونکہ تمام دنیا یا تمام اسلامی ملکوں میں بھی نیا چاند ایک ہی دن ہونا ضروری نہیں ہے۔ خواہ وہ شرعی اصطلاح میں ہو یا فلکیاتی اصطلاح میں لہٰذا نیا چاند ایک ہی دن قرار دینے کی غیر شرعی اور غیر علمی کوشش بھی ہمیں نہیں کرنی چاہیے۔ اگر مثلاً عالم اسلام کے مغربی نصف حصے میں آج عید ہے اور پاکستان میں کل (کیونکہ ہمارا ملک جغرافیائی طور پر موجودہ عالم اسلام کے مشرقی نصف حصے میں پڑتا ہے) تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ علاوہ ازیں بعض عیدیں ایسی بھی ہوں گی جو تمام عالم اسلام میں ایک ہی دن ہوں۔ اس مجموعی صورت حال کو نہ تو مذہبی یکسانیت کی کمی پر محمول کرنا درست ہے اور نہ قمری تقویم کی ناکامی پر۔ مذہبی یک جہتی درحقیقت تصورات اور نصب العین کی یک جہتی ہے جس کا اظہار صرف فکر و عمل کی یکسانیت سے ہوتا ہے نہ کہ دن اور تاریخ کی یکسانیت سے رہا دو مختلف تاریخوں کا سوال تو یہ صورت شمسی تقویم کے تحت بھی اس علاقے میں پیش آتی ہے جہاں بین الاقوامی طور پر تسلیم کردہ خط تاریخ (DATELINE) قائم ہے۔ یہ خط جو ایک حد تک ۱۸۰ درجے طول البلد

کے ساتھ ساتھ بحرالکاہل کے مغربی نصف حصے میں قائم کیا گیا ہے۔ اس کے عین مشرق میں جو کچھ تاریخ ہوتی ہے خط کے عین مغرب میں اس سے اگلی تاریخ ہوتی ہے۔ زمین کی گولائی کی بنا پر یہ ایک ایسی ناگزیر ضرورت ہے جس سے مفر نہیں۔

کسی مہینے تمام عالم اسلام کے لیے ایک ہی دن نیا چاند ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ انڈونیشیا کے مشرقی علاقے میں دکھائی دے۔ اس صورت میں وہ تمام اسلامی ملکوں میں دکھائی دے گا۔ البتہ ان مہینوں کے لیے جن میں نیا چاند تمام اسلامی ملکوں میں ایک ہی دن نہ ہو رہا ہو۔ علماء کی کسی مرکزی کمیٹی کی جانب سے یہ اعلان کیا جاسکتا ہے کہ رویت کے دو ممکن دنوں میں سے کن کن ملکوں میں چاند کس دن دکھائی دے گا اس صورت میں کوئی علاقہ ایسا بھی ہوگا جہاں کسی دن چاند کے ہونے یا نہ ہونے کی حدِ فاصل واقع ہوگی ایسے علاقے میں رویت کی شرعی شہادت کے مطابق عمل ہونا چاہیے۔ ایسا اعلان ہر ماہ کے لیے بھی کیا جاسکتا ہے کیونکہ مسلمان دنیا کے تمام براعظموں میں موجود ہیں اور اس سے سب کو سہولت ہوگی۔

غور کرنے کا مقام ہے کہ ہم اپنی لاعلمی کے سبب دوسروں کی نظر میں اپنے مذہب کو قابل حرف گیری قرار دیے جانے کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ مثال کے طور پر کسی ایک علاقے میں دو عیدوں ہی کو لیجیے۔ غیر مسلم اسے مذہب اسلام اور اس کے احکام کی ایک بڑی خامی کے طور پر پیش کرتے ہیں جو درحقیقت مذہب کی کوئی خامی نہیں بلکہ اس کے موجودہ پیروؤں کی لاعلمی اور بے حسی ہے۔ کیا تعجب ہے کہ ہم اس بنا پر عند اللہ قابل مؤاخذہ ہوں اور یہ بھی ہماری محرومیوں کے اسباب میں سے ایک سبب ہو۔ (ماخوذ)

دعوتِ دین کے مراحل

(مولانا سید جلال الدین عمری)

خدا کے دین کی دعوت اور انسانوں کی اصلاح و تربیت بہت وسیع کام ہے۔ بیوی بچوں کی اصلاح، خاندان اور قبیلے کی اصلاح، بستی اور شہر کی اصلاح، ملک و وطن کی اصلاح اور پھر تمام عالم اور ساری نوعِ انسانی کی اصلاح، اس وسیع کام کے مختلف مراحل ہیں۔ ہم یہاں اصلاح و دعوت کے ان ہی مختلف مراحل پر کسی قدر تفصیل سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

بیوی اور بچوں کی اصلاح

دعوت و تبلیغ اور اصلاح و تربیت کا آغاز آپ کو اپنے گھر سے کرنا چاہیے۔ خدا کے دین کو اگر آپ دوسرے بے شمار انسانوں کی طرح فرسودہ اور مہمل چیز نہیں سمجھتے بلکہ اس کو وہی اہمیت دیتے ہیں جو فی الواقع اسے حاصل تو آپ کی بیوی اور آپ کے بچے سب سے زیادہ اس کے مستحق ہیں کہ آپ ان کو دین کی حقیقت سمجھائیے اور دین سے انحراف اور بغاوت کے خوفناک انجام سے باخبر کریں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جو شخص اپنے لیے خدا کے دین کی اتباع کو ضروری سمجھے گا وہ لازماً اپنی بیوی اور بچوں کو بھی دین کی راہ چلائے گا۔ وہ کبھی اس بات کو پسند نہیں کر سکتا۔ کہ خود تو آخرت کے عذاب سے بچ جائے اور اس کے بیوی بچے اس میں گرفتار ہو جائیں۔

بیوی اور بچوں کی اصلاح اور ان کو دین کی راہ پر چلانا آپ کے لیے نفل یا مستحب نہیں ہے۔ خدا کا حکم ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا	اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو (دوزخ کی) آگ سے بچاؤ

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

الرجل راع علیٰ اھل بیتہ	مرد نگراں ہے اپنے گھر والوں پر اور
وھو مسئول عن رعیتہ	سے اس کی رعیت کے بارے میں (قیامت کے
(بخاری، مسلم)	دن) پوچھا جائے گا

دعوت دین ہو یا اصلاح و تربیت اس کے نتیجہ خیز ہونے کے لیے پہلی شرط ہے خلوص اور محبت۔ اگر خلوص اور محبت ہے تو مخاطب اس سے اثر لے گا ورنہ اس پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ اس پہلو سے آپ دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ ہر شخص اپنے بیوی بچوں کی اصلاح کے لیے دوسروں سے زیادہ موزوں ہے۔ اسے اپنی بیوی اور بچوں سے بے حد محبت ہوتی ہے۔ وہ ان کا سچا خیر خواہ ہوتا ہے۔ ان کی خدمت کو اپنے لیے فرض سمجھتا ہے۔ ان کی نگہداشت اور پرورش کرتا ہے، ان کا دکھ درد اٹھاتا ہے اور ان کے لیے قربانیاں دیتا ہے۔ اس لیے وہ اس کے خلوص اور محبت کے بارے میں کبھی شک نہیں کر سکتے۔ وہ اس کو اپنا خیر خواہ اور محسن ماننے پر مجبور ہیں۔ اس وجہ سے وہ اگر ان کو دین کی دعوت دے یا ان کی اصلاح کرنا چاہے تو توقع یہی ہے کہ وہ اسے اپنی فلاح کا ذریعہ سمجھیں گے اور کسی بھی دوسرے شخص کی دعوت دین اور سعی اصلاح کے مقابلے میں زیادہ اثر لیں گے۔

بیوی بچوں کی اصلاح کے لیے ایک خاص حد میں خدا نے آپ کو اقتدار بھی دیا ہے۔ اس خاص حد کے اندر آپ ان پر سختی بھی کر سکتے ہیں۔ اس لیے اگر وہ حدودِ شریعت سے باہر ہوں تو پہلے آپ نرمی اور افہام و تفہیم کے ذریعہ ان کی اصلاح کی کوشش کریں لیکن اگر اس سے ان کی اصلاح نہ ہو سکے تو آپ کو چاہیے کہ ان پر سختی کریں اور بزور ان کو دین کا تابع بنائے رکھیں۔

خدا نے آپ کو اپنی بیوی اور بچوں پر جو اقتدار عطا کیا ہے اس کی وجہ سے آپ بہت بڑی آزمائش میں پڑ گئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ کے بیوی بچے خدا کے دین سے منحرف ہیں تو آپ خاموش رہ سکتے ہیں اور نہ محض نصیحت کر کے مطمئن ہو سکتے ہیں کہ آپ کی ذمہ داری ادا ہو گئی۔ بلکہ اس کو روکنے کے لیے آپ کو اس حد تک طاقت بھی استعمال کرنی ہوگی۔ جس حد تک طاقت کے استعمال کی خدا نے آپ کو اجازت دی ہے۔ اگر آپ ان کی غلط روی کو برداشت کرتے رہے اور حدود شریعت کے اندر ان کی اصلاح کی کوشش نہیں کی تو آپ خدا کے نزدیک بہت بڑے مجرم ہوں گے۔

آپ اس عزم کے ساتھ اٹھے ہیں کہ اگر آپ کو خدا کی زمین میں اقتدار ملے تو یہاں اس کی حکومت قائم کریں گے۔ آپ کو اپنے گھر پر خدا نے جو اقتدار دیا ہے اس میں آپ کے اس عزم کا امتحان ہے۔ ایک چھوٹے سے دائرے میں آپ کو چند انسانوں پر جو محدود اقتدار ملا ہے اس کے ذریعے آپ ان کو خدا کا مطیع و فرماں بردار بنانے میں کامیاب ہوں تو یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ اس سے وسیع اقتدار حاصل ہو تو آپ خدا کی زمین پر خدا کی حکومت قائم کریں گے۔ لیکن اگر آپ اپنے گھر میں بھی خدا کا قانون نافذ نہیں کر سکے تو پھر کیسے توقع کی جائے کہ آپ کے ذریعہ ساری دنیا میں اس کا قانون نافذ ہوگا۔ آپ اس دنیا میں جو کار عظیم انجام دینا چاہتے ہیں اس کی پہلی منزل گھر کی اصلاح ہے۔

اگر پہلی منزل بھی آپ نے مکمل نہیں کی تو کون کہہ سکتا ہے کہ اس کی تمام منازل آپ کے ہاتھوں مکمل ہوں گی۔ حقیقت یہ ہے کہ جب آپ کو اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ آپ کی بیوی اور بچے خدا کی اطاعت کر رہے ہیں، یا اس کی نافرمانی، تو پھر آپ کو دنیا کی ہدایت و ضلالت سے بھی کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی۔

دعوت دین کا کام کرنے والے جب اس وسیع انقلاب کے بارے میں سوچتے ہیں جو وہ دنیا میں لانا چاہتے ہیں تو بعض لوگ بیوی اور بچوں کی اصلاح کو اہمیت نہیں دیتے۔ حالانکہ گھر سے باہر انقلاب کے لیے گھر کے اندر انقلاب بہت ضروری ہے۔ اگر آپ کی بیوی اور بچوں کو دین سے محبت ہو اور وہ دین کی راہ میں آنے والی مشکلات میں نہ صرف ثابت قدم رہیں بلکہ آپ کو بھی استقامت کی ترغیب دیں تو یقیناً آپ کا جذبۂ دعوت طاقتور ہوگا اور آپ یکسوئی اور انہماک کے ساتھ دین کی خدمت کر سکیں گے لیکن اگر خدانخواستہ آپ کا گھر دین دار نہیں ہے تو گھر سے باہر دین کی خدمت آپ کے لیے آسان نہیں ہوگی۔ آپ جانتے ہیں کہ بہت سے لوگ دین کی خدمت محض اس وجہ سے نہیں کر پاتے کہ ان کی بیوی اور ان کے بچے اس راہ میں رکاوٹ ہیں اور ان کو آگے بڑھنے نہیں دیتے کیا اس حقیقت کو جاننے کے بعد بھی آپ گھر کی اصلاح کی اہمیت نہیں محسوس کریں گے اور اس سے غافل ہی رہیں گے؟

خاندان کی اصلاح

بیوی اور بچوں کی اصلاح کے ساتھ آپ کو اپنے ماں باپ بھائی بہن اور قریب ترین رشتہ داروں کی بھی اصلاح کرنی چاہیے کیونکہ عام

انسانوں کے مقابلے میں رشتہ داروں کا حق زیادہ ہے خدا کا حکم ہے :

وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ — اور اپنے قریب کے رشتہ داروں کو ڈراؤ

خاندان ہماری معاشرتی زندگی کا اہم ادارہ ہے۔ ہم اس سے اس طرح بندھے ہوئے ہیں کہ آسانی سے الگ نہیں ہو سکتے۔ خاندان ہمارا محتاج ہے اور ہم اس کے محتاج ہیں۔ اس کو ہماری ضرورت ہے اور ہمیں اس کی ضرورت ہے۔ وہ ہمارا تعاون چاہتا ہے اور ہم اس کا تعاون چاہتے ہیں۔ اس پر ہمارے حقوق ہیں اور ہم پر اس کے حقوق ہیں۔ اس لیے اگر آپ کا خاندان دین دار اور خدا پرست ہو تو آپ اس سے اپنے تمام تعلقات دین کی بنیاد پر قائم کر سکتے ہیں۔ ورنہ حدودِ دین کے اندر رہتے ہوئے آپ کو اپنے خاندان سے تعلقات استوار کرنے میں بلکہ نباہنے میں بھی زحمت ہوگی۔ اس کا بھی خدشہ ہے کہ کسی مرحلے میں آپ کے سامنے یہ سوال پیدا ہو کہ خاندان والوں کو راضی کیا جائے یا خدا کو خوش کیا جائے اور آپ خدا کی رضا کے لیے خاندان والوں سے تعلقات توڑنے پر مجبور ہو جائیں

خاندان کی اصلاح ایک اور پہلو سے بھی آپ کے لیے مفید ہے۔ وہ یہ کہ خاندان کے افراد میں تعاون اور ہمدردی کا جذبہ ہوتا ہے بعض اوقات یہ جذبہ تعصب کی حد تک پہنچ جاتا ہے اور آدمی خاندان کی ہر جائز و ناجائز بات کی حمایت کرنے لگتا ہے۔ بلاشبہ یہ تعصب ہمارے نزدیک غلط ہے لیکن اس سے قطع نظر یہ واقعہ ہے کہ خاندان کے افراد میں تعاون اور ہمدردی کا جتنا زبردست جذبہ ہوتا ہے خاندان سے باہر اتنا زبردست جذبہ آپ کم ہی دیکھیں گے۔ اس لیے اگر آپ کے خاندان کو دین سے محبت ہو تو وہ دین کی راہ میں آپ کا بہترین معاون ہو سکتا ہے۔ دعوت دین کی کوشش میں وہ آپ کا شریک ہو تو وہ آپ کا تعاون محض اس لیے نہیں کرے گا کہ آپ اس کے ایک فرد ہیں بلکہ اس وجہ سے بھی وہ آپ کی حمایت کرے گا کہ یہ اس کے دین و ایمان کا تقاضا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خاندان کی اصلاح سے آپ کے تعلقات بھی صحیح ہوں گے اور آپ کو دین کے بہترین حامی بھی مل سکیں گے

خاندان کی اصلاح سے اگر آپ صرف نظر کر لیں تو اس عظیم کام کو نقصان پہنچائیں گے جو آپ کے پیش نظر ہے۔ دنیا بغور دیکھ رہی ہے کہ جو دعوت آپ دوسروں کو دے رہے ہیں کیا وہ اپنے گھر اور

خاندان والوں کو بھی دیتے ہیں یا نہیں؟ کیونکہ دنیا یہ سوچ نہیں سکتی کہ خدا کا دین نجات کا ذریعہ ہے تو آپ دوسروں کو تو اس سے باخبر کریں اور اپنے گھر اور خاندان والوں کو اس سے غافل رہنے دیں۔ پھر دنیا یہ بھی دیکھ رہی ہے کہ جس دین کی آپ دعوت دے رہے ہیں اس کی اتباع آپ خود اور آپ کے گھر اور خاندان والے کہاں تک کر رہے ہیں۔ اگر آپ کا گھر اور خاندان دین سے منحرف ہے اور آپ اس انحراف کو برداشت کر رہے ہیں تو دعوت دین کی راہ میں آپ خود سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ جب آپ کے بیوی بچے اور خاندان کے لوگ دین کا مذاق اڑا رہے ہوں، شرک و بدعت میں مبتلا ہوں، محرمات کا ارتکاب کر رہے ہوں، اپنے کاروبار اور معاملات میں حرام و حلال کی تمیز سے بے نیاز ہوں، خوشی اور غم کے مواقع پر خدا اور اس کے رسول کے بتائے ہوئے آداب کو چھوڑ کر رسوم جاہلیت کی پیروی کر رہے ہوں اور آپ ان کی اس حالت کو بدلنے کی بجائے دنیا کو نصیحت کرتے پھریں تو دنیا پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ ہاں اگر آپ خاندان کے اس رویے سے بیزار ہوں اور اپنی حد تک اتمام حجت کر دیں تو خدا کے نزدیک بھی بری الذمہ ہوں گے اور خدا کی مخلوق بھی آپ کو معذور سمجھے گی۔

گھر اور خاندان کی اصلاح بہت نازک کام ہے۔ رشتہ داری اور تعلقات خاندانی تعلق جس کی وجہ سے اصلاح کا کام آسان ہونا چاہیے، اس راہ میں ایک حجاب بن جاتا ہے۔ آدمی اپنے کسی عزیز کو غلطی پر دیکھتا ہے تو محض اس وجہ سے کہ وہ اس کا عزیز ہے اسے نہیں ٹوکتا۔ وہ غیروں کو تو آسانی سے ان کی خامیاں بتا سکتا ہے لیکن اپنے عزیزوں کی خامیوں کی نشان دہی کرنے سے بچنا چاہتا ہے۔ خاص طور پر ان رشتہ داروں کی اصلاح اس کے لیے بہت مشکل ہوتی ہے جو عمر میں اس سے بڑے ہوں اور جن کا ادب و لحاظ شرعاً اس کے لیے ضروری ہو۔ داعی دین ایک خاص پوزیشن کا مالک ہوتا ہے کیونکہ وہ انسانوں کا مصلح اور مربی ہے۔ وہ اس مقصد کے لیے اٹھتا ہے کہ بگڑے ہوئے لوگوں کو راہ راست دکھائے لیکن اس کی یہی حیثیت بعض اوقات اس کو اپنے بزرگوں کے سامنے آنے سے روکتی ہے۔ سامنے حجاب محسوس ہوتا ہے کہ جن لوگوں کی تعظیم و تکریم کو وہ واجب سمجھتا ہے انہیں ان کی خامیوں سے آگاہ کرے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہماری معاشرت میں بزرگوں کی کسی لغزش کو لغزش کہنا جرم ہے۔ حالانکہ ان کے ساتھ خیر خواہی اور اپنی سعادت مندی کا تقاضا یہ ہے کہ انہیں غلط روی سے روکنے

میں کوئی تامل نہ کیا جائے اور صحیح راہ دکھائی جائے۔ یہ کتنی بڑی بدخواہی ہے کہ ان کو تباہی کے راستے پر چلنے دیا جائے اور اس کے انجام سے واقف ہونے کے باوجود انہیں آگاہ نہ کیا جائے۔ خوشی اور غم کا کوئی بھی موقع ہو آپ سب سے پہلے اپنے خاندان والوں کو یاد کرتے ہیں۔ اگر آخرت کی ناکامی اور کامیابی کا آپ کو یقین ہے تو فطری طور پر آپ کو اپنے خاندان والوں کو اس سے باخبر کرنا چاہیے جب آپ کا کوئی عزیز جہنم کی طرف بڑھ رہا ہو اور آپ کے اندر اس کو بچانے کے لیے اتنی بے چینی بھی نہ ہو جتنی اس کو ڈوبتے ہوئے دیکھ کر آپ کے اندر پیدا ہو سکتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یا تو آپ خود جہنم کی ہولناکی سے بے خبر ہیں یا آپ کو اپنے عزیز سے محبت نہیں ہے۔ آپ کے سامنے حضرت ابراہیمؑ کی مثال ہے۔ ان کا باپ کسی معمولی جرم کا ارتکاب نہیں کر رہا تھا بلکہ شرک اور بت پرستی میں مبتلا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے یہ نہیں سوچا کہ میں اپنے باپ سے یہ کیسے کہوں کہ تم نے کفر و شرک کی جو روش اختیار کی ہے وہ سیدھے تمہیں جہنم میں پہنچائے گی بلکہ انھوں نے صاف الفاظ میں اس کے نتائج سے باپ کو باخبر کر دیا۔

إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ يَا أَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِي عَنكَ شَيْئًا ۝ يَا أَبَتِ إِنِّي قَدْ جَاءَنِي مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ فَاتَّبِعْنِي أَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ۝ يَا أَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطَانَ إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلرَّحْمَٰنِ عَصِيًّا ۝ يَا أَبَتِ إِنِّي أَخَافُ أَن يَمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمَٰنِ فَتَكُونَ لِلشَّيْطَانِ وَلِيًّا ۝	جب کہ اس نے اپنے باپ سے کہا اے ابا جان! آپ ان چیزوں کی کیوں پرستش کرتے ہیں جو نہ سنتی ہیں اور نہ دیکھتی ہیں اور نہ آپ کے کچھ کام آسکتی ہیں۔ ابا جان! میرے پاس وہ علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا ہے لہٰذا آپ میرے پیچھے چلیں، میں آپ کو سیدھا راستہ دکھاؤں گا۔ ابا جان! آپ شیطان کی عبادت نہ کریں کیونکہ شیطان خدا ئے رحمٰن کا نافرمان ہے۔ ابا جان! مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ رحمٰن کے عذاب میں نہ آجائیں اور شیطان کے ساتھ ہو کر رہیں۔

ٹھیک اسی طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے خاندان والوں کے درمیان ارتداد

کا فرض انجام دیا تھا اور آنے والے ہولناک دن سے انہیں باخبر کیا تھا۔ حدیثوں میں آتا ہے کہ جب خدا کا یہ حکم نازل ہوا کہ تم اپنے قریب کے رشتہ داروں کو ڈراؤ، تو آپ نے اپنے قبیلے کے تمام لوگوں کو جمع کیا اور اس کی ہر شاخ کا نام لے کر فرمایا۔ خدا کا عذاب آنے والا ہے اور میں اس کے آنے سے پہلے تمہیں اس کی اطلاع دے رہا ہوں۔ میرا حال ٹھیک اس شخص کا ہے جس کو یہ معلوم ہے کہ دشمن اس کے خاندان پر حملہ کرنے والا ہے اور وہ اس امید میں چیخ رہا ہو کہ شاید لوگ اس کی بات سنیں اور اس حملے سے بچیں۔ اے بنی عبدالمطلب، اے بنی فہر اور اے بنی لوئی! اپنے آپ کو خدا کے عذاب سے بچاؤ۔ تمہارا نفع یا نقصان بالکل میرے ہاتھ میں نہیں ہے۔ ہاں رشتہ داری کی وجہ سے تمہارے جو حقوق ہیں وہ میں ضرور ادا کروں گا۔ اے میری بیٹی فاطمہ! اور اے میری پھوپھی صفیہ! تم بھی اپنے آپ کو خدا کے عذاب سے بچاؤ۔ میرے پاس جو کچھ مال و دولت ہے وہ حاضر ہے اس میں سے جو چاہو لے لو لیکن یاد رکھو کل قیامت کے دن میں کچھ بھی تمہارے کام نہیں آسکتا ـــ

اگر آپ کا خاندان دین کی راہ میں آپ کے ساتھ ہے تو اسے ثابت قدم رکھنے کی کوشش کیجیے اور خدا کا شکر ادا کیجیے کہ اس نے آپ کا ایک بوجھ ہلکا کر دیا لیکن اگر خدانخواستہ آپ کے عزیز و اقارب دنیا میں کھوئے ہوئے اور خدا کے دین سے منحرف اور باغی ہیں تو آپ کا فرض ہے کہ انہیں صاف صاف الفاظ میں اور بوقت ضرورت دلائل کے ساتھ بتا دیں کہ تمہاری روش خدا کے غضب کو دعوت دینے والی اور تمہیں خدا کی رحمت سے دور کرنے والی ہے۔ قیامت آئے گی اور یقیناً آئے گی لیکن افسوس کہ تمہیں اس کا احساس نہیں ہے اور تم نے خدا کے عذاب سے بچنے کی کوئی تدبیر نہیں کی ہے۔ اسی کا آپ کو حکم ہے اور یہی خدا کے پیغمبروں کا اسوہ ہے۔

بستی اور شہر کی اصلاح

گھر اور خاندان کی اصلاح کے بعد اس بستی اور شہر کی اصلاح آپ کا فرض ہے جس میں آپ رہتے ہیں۔ کیوں کہ جس ماحول میں آپ پیدا ہوئے، پرورش پائی اور جوان ہوئے۔ آپ پر اس کا بہت احسان ہے۔ اس احسان کا تقاضا یہ ہے کہ آپ اس میں خدا کا دین پھیلائیں اور وہاں کے باشندوں کو آنے والے ہولناک دن کے عذاب سے ڈرائیں۔ ظاہر ہے اس کام کے لیے

آپ جس قدر موزوں ہو سکتے ہیں آپ کے ماحول سے باہر کا کوئی شخص اتنا موزوں نہیں ہو سکتا ۔ آپ کو فطری طور پر اس بات کے مواقع حاصل ہیں کہ اپنے ماحول کی نفسیات، اس کے حالات اور اس کی فکری و عملی خوبیوں اور خامیوں سے واقف ہوں۔ اس لیے آپ ان کے درمیان خدا کے دین کے بہترین داعی بن سکتے ہیں ۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آپ اپنی بستی اور شہر کے لیے جانے پہچانے ہوں گے اور آپ سے وہاں کے لوگوں کو وہ اجنبیت نہیں ہوگی جو کسی غیر شخص سے ہوتی ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ وہ آپ کی بات کو اپنے ہی میں کے ایک فرد کی بات سمجھیں گے اور اگر آپ خلوص اور ہمدردی سے اور ان کے حالات و مسائل کی رعایت کے ساتھ ان تک خدا کا دین پہنچائیں تو یہ توقع غلط نہیں ہوگی کہ وہ نسبتاً آسانی سے اس کی طرف توجہ کریں گے ۔

شہر کے قرب و جوار کی اصلاح

اپنے شہر میں خدا کا دین پہنچانے کے بعد یہ نہ سمجھیے کہ آپ کا کام ختم ہو گیا کیونکہ آپ کو اس کے اطراف و اکناف میں بھی یہی کام کرنا ہے ۔ چناں چہ آپ قرآن میں دیکھیں گے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ اور اطراف مکہ دونوں جگہ انذار کا حکم دیا گیا ہے ۔ ارشاد ہے :۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا	اسی طرح ہم نے تم پر قرآن عربی کی وحی کی ہے تاکہ تم مکہ والوں کو اور ان لوگوں کو جو مکے کے آس پاس رہتے ہیں خدا کے عذاب سے ڈراؤ ۔

سارے عالم کی اصلاح

خدا کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مکے اور اس کے آس پاس کی بستیوں میں دین کا پیغام پہنچانے کے بعد اپنا دعوتی کام ختم نہیں کیا بلکہ دنیا میں اسے پھیلانے کی کوشش کی۔ کیونکہ جس دین کے مرحل داعی تھے وہ کسی خاص قوم یا کسی مخصوص خطۂ زمین کے لیے نہیں ہے بلکہ تمام عالم کے لیے ہے ۔ اسی وجہ سے آپ کے بارے میں قرآن نے اعلان کیا:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۝	ہم نے تم کو تمام انسانوں کے لیے (جنت کی) خوش خبری دینے والا اور (جہنم سے) ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے

یاد رکھیے کہ جو دین ساری دنیا کے لیے ہے آپ اس کے داعی ہیں اور جس پیغمبر کی بعثت تمام انسانوں کے لیے ہوئی تھی آپ اس کے جانشین ہیں۔ اس لیے آپ کا فرض ہے کہ اس دین کو سارے عالم میں پھیلانے اور اس کے انکار کے نتائج سے اس کو باخبر کرنے کی کوشش کریں۔ ورنہ خدا نے آپ پر جو فرض عائد کیا ہے آپ اس سے کبھی سبک دوش نہیں ہوں گے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لینے کے باوجود ان کے صحیح جانشین نہیں کہے جائیں گے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ ہم نے دعوت دین کے جو مختلف مراحل بیان کیے ہیں ضروری نہیں کہ وہ ایک خاص ترتیب ہی کے ساتھ پیش آئیں۔ یہ تمام مراحل ایک ساتھ بھی آپ کے سامنے آسکتے ہیں اور ان کی ترتیب بھی بدل سکتی ہے۔ ایسا عین ممکن ہے کہ آپ کو اپنے گھر اور خاندان میں دعوت دین کے جو مواقع اور سہولتیں حاصل ہیں ٹھیک یہی مواقع اور یہی سہولتیں آپ کو بڑی بڑی قوموں سے خطاب کرنے کے لیے بھی حاصل ہوں۔ بلکہ اس کا بھی امکان ہے کہ کسی وقت دعوت دین کے لیے آپ کے اپنے گھر کی فضا سازگار نہ ہو اور باہر کے حالات سازگار ہوں۔ اس وقت ان حاصل ہونے والے مواقع اور سہولتوں کو یہ سوچ کر کھو دینا کہ ابھی خاندان اور قبیلے میں ہمارا دعوتی کام نہیں ہوا ہے، بہت بڑی نادانی ہوگی۔ بلکہ اس سے آگے میں یہ کہوں گا کہ آپ کو دعوت و اصلاح کا بہت وسیع کام کرنا ہے اس لیے آپ خواہ اپنے گھر میں اصلاح کی کوشش کر رہے ہوں یا خاندان اور قبیلے میں یہ وسیع کام آپ کو بہرحال اپنے سامنے رکھنا ہوگا اور اپنی حد تک اسے انجام دینا ہوگا۔ دعوت دین کے جو مراحل اوپر بیان ہوئے ہیں ان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جب دعوت کا ایک مرحلہ ختم ہو تو آپ دوسرے مرحلے کا آغاز کریں یا جب تک اپنے گھر کی پوری طرح اصلاح نہ ہو خاندان کی اصلاح کی کوشش نہ کریں یا آپ کے شہر میں دعوت کا کام نہ ہو تو اہل وطن کو دین کی دعوت نہ دیں بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان اس فکر میں کہ اسے سارے عالم میں حق کا دین پہنچانا ہے، اپنے گھر، خاندان اور شہری ماحول کو نہ بھول جائے۔ اس سے دعوت کے کام میں حسن و خوبی پیدا ہوتی ہے اور اس کے اچھے نتائج نکلتے ہیں۔ ایک اور پہلو سے سوچیے تو معلوم ہوگا کہ یہ انتہائی نامعقول اور بہت بڑی غلطی ہے کہ کوئی شخص دوسروں کی اصلاح کی تو کوشش کرے اور بیوی بچوں کی اصلاح سے غافل ہو جائے۔ لیکن اس کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس غلطی کی وجہ سے اس کی سعی اصلاح جو وہ دوسروں میں کر رہا ہے خدا کے نزدیک مذموم نہیں ہوگی۔ وہ فی نفسہ قابل تعریف ہے اور اسے فی الواقع قابل تعریف ہونا ہی چاہیے

تناسخ کا تحقیقی جائزہ

(۳)

جناب سلطان مبین صاحب، ایم اے سنسکرت

تناسخ کا ایک دوسرا پہلو ہے جس کو ہم "تناسخ تعزیری" کہتے ہیں۔ اس پہلو کی تشریحات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بدکار و گنہگار دوسرے جنم میں پہلے جنم کی سزا بھگتتا ہے۔ انسان پہلے جنم کے گناہوں کے سبب سے دوسرے جنم میں اندھا، مریض، تنگ دست، بدشکل، بدرنگ اور بدذات ہوتا ہے۔ یقیناً روح رجحان و میلان کے سبب سے برضا و رغبت اندھا، مریض و مسکین و بدشکل ہونا پسند نہ کریگی یہ بات تو روح کو جبراً و کرہاً ہی گوارا ہوگی۔ یہاں ہر سمجھدار متکلم کے منہ سے یہ بات نکلے گی کہ تناسخ کا یہ تعزیری کردار "میلان طبیعت کا نتیجہ نہیں ہے۔ کوئی انسان کبھی بھی اندھا، لولا اور دائم المریض بننے کا خواب میں بھی ارادہ نہیں کرتا۔ نہ کوئی سنسکار و ملکہ ایسا ہے کہ وہ روح کو بدشکلی، مرض، ذلت و مسکنت کی طرف بہالے جائے۔ یہاں تو ایسا معلوم پڑتا ہے کہ کوئی قوت قاہرہ ہے جو روح انسانی کو اندھا، لولا، ذلیل و مسکین بنا کر سزا دینا چاہتی ہے۔ بھارت کے سبھی متکلم اس بات پر زور دیتے ہیں کہ تناسخ کا عمل میلان طبیعت کا مرہون ہے۔ تبادلہ، تنزل یا ترقی سنسکار، ملکہ و مزاج کے مطابق ہوتی رہتی ہے اس تشریح کی تائید کچھ حلقوں نے تو جان بوجھ کر کی اور کچھ بے چاروں نے غیر شعوری طور پر ہاں میں ہاں ملایا۔ یہ بات بڑی خطرناک اور اذیت ناک ہے کہ بھارتی اذہان و ادیان میں الحاد کا زہر پوری طرح گھل مل گیا ہے۔ بودھ متکلمین نے تو ڈنکے کی چوٹ پر ابطال باری پر دلائل پیش کیے ہیں۔ اسلام کے ہندوستان میں وارد ہونے سے پہلے تک "اثبات باری اور ابطال باری" علم کلام کا ایک دلچسپ عنوان اب رہ چکا ہے۔ فلسفے کے چار اسکول مستقلاً وجود باری کے منکر و مبطل رہے ہیں۔ اس نظام فلسفے نے

یقیناً عالم کی ایسی تشریح کی ہوگی جو کم از کم ان کے "مکتب فکر" کا بھرم تو قائم ہی رکھے ہوگا۔ چنانچہ آج ہم سانکھیہ اور بودھ درشن (فلسفہ) میں اس تشریح کو منضبط طور پر پاتے ہیں۔ جب ہوا کا رخ ایسا ہو تو یقیناً تناسخ کے عمل کو خدا آزاد عمل ہونا ہی چاہیے۔ چنانچہ بودھوں کے سانکھیہ فلاسفروں نے جان بوجھ کر۔ تناسخ کے میلان طبعی ہونے کی تائید کی۔ جب جنم و مرن کا عمل بہم میلان طبعی ہو کر رہ جائے تو "وجود باری" کی کیا ضرورت ہے؟ رہ گئے آستک اسکول تو انھوں نے بھی مرعوب ہو کر تناسخ کے عقیدے کو دھر لیا۔ اور غیر شعوری طور پر میلان طبع کی وکالت کرتے رہے۔ جب آستکتا اور ناستکتا کی کنونسنگ کے دروازے پاٹ چوپٹ کھلے ہوں۔ وحی و رسالت کی مشعل ہدایت موجود نہ ہو تو ہر ذہین آدمی سرگرانی کے بعد کچھ لینے دینے کے لیے مجبور ہے۔ پس عقائد و دلائل میں خلط ملط اور گڈمڈ ہونا زیادہ تعجب کی بات نہیں۔ چنانچہ ملفوظات بدھ سے ہم کو اس بات کا اندازہ لگتا ہے کہ آنجناب تناسخ کو "عمل تعزیر" کے طور پر مانتے تھے۔ مگر بالعموم بدھ متکلم تناسخ کو عمل رجحانی مانتے ہیں اور ہندو متکلمین تناسخ کو "عمل تعزیر" مانتے ہوئے بھی اس کے میلان طبیعت کی وکالت کرنے لگتے ہیں۔ بہرحال تناسخ کے دو پہلو ہیں۔ ایک ہے میلانی، دوسرا تعزیری۔ پہلے میلانی کے شواہد پہلے آ چکے ہیں۔ اب ذیل میں پہلوئے تعزیری کے شواہد دیے جا رہے ہیں۔

جس زمانے میں تناسخ کی یہ تشریح کی جا رہی تھی اس زمانے میں تعزیر کا یہی طریقہ تھا کہ چوری کرنے والے کے ہاتھ کاٹ لیے جاتے تھے۔ زبان سے گناہ کیے جانے پر زبان کھنچوا لی جاتی تھی اور کان سے ارتکاب معاصی ہونے پر کان میں پگھلی ہوئی دھات ڈال دی جاتی تھی۔ ۔۔ ، ایکزادہ (شودر) اگر دوزادوں (برہمن، کشتری، ویش) کو درشت لہجے سے ڈانٹتا ہے تو اس کی زبان تراش لی جائے، کیونکہ وہ بدزاد (پاؤں سے پیدا) ہے۔ (۲، ۱) اگر شودر ان (شریف زادوں) کا نام اور ان کی جات کا نام لے لیتا ہے تو اس کے منہ میں لوہے کی جلتی ہوئی دس انگل کی سلاخ ڈال دی جائے۔ (۲، ۲) اگر شودر گھمنڈ کی وجہ برہمنوں کو دھرم کا اپدیش دیتا ہے تو راجہ اس شودر کے گوش و دہن میں کھولتا ہوا تیل ڈلوا دے۔ منوسمرتی (۸: ۲۷۰ - ۲۷۲) آپ جلدی میں یہ فیصلہ نہ کریں کہ شودروں کے ساتھ بڑا سخت سلوک کیا جاتا تھا۔ شریف زادوں کے ساتھ بھی اس طرح کا معاملہ پیش آتا تھا۔ اگر دوزاد (برہمن، کشتری، ویش) چوک سے شراب پی لے تو اس کو (کفارت میں) کھولتی ہوئی شراب پینی چاہیے

اس طرح جل کر مر جانے سے اس گناہ سے نجات مل جائے گی۔ منوسمرتی: ۱۱: ۱۰۱
(۱۰۴) استاد کی حرم سے مباشرت کرنے والا اپنے گناہ کو بیان کر کے لوہے کی تپتی ہوئی گرم چارپائی پر سو جائے۔ یا عورت کے جلتے ہوئے آہنی مجسمہ سے گلے لگ جائے۔ اس طرح مر کر گناہ سے پاک ہوتا ہے۔ (۱۰۵) یا اپنے خصیتین اور آلت کو کاٹ کر ہتھیلی میں لے کر جنوب مغرب سمت میں سیدھا چلا جائے حتیٰ کہ زمین پر گر پڑے۔ منوسمرتی: ۱۱: ۱۰۴: ۱۰۵

اس طرح کے کفارات و تعزیرات گردو پیش میں نافذ تھیں پس جب کبھی کسی مجرم کو لوگ سزا سے بچا ہوا دیکھتے تو فوراً ذہن اس طرف منتقل ہو جاتا کہ اب اس کو دوسرے جنم میں "اسی طرح" کی سزا دی جائے گی اسی لیے ہم جہاں "تناسخ تعزیری" کے حوالہ جات پاتے ہیں وہاں ہم "تعزیر مثلی" ہی کو پاتے ہیں جرم و سزا میں ایک گونہ مشابہت ضرور ہو گی۔ چنانچہ:۔

(۵۰) پرائی عورتوں کو جو لوگ بری نظر سے دیکھتے ہیں وے بری طبیعت کی وجہ سے پیدائشی اندھے ہوتے ہیں۔ (۵۱) جو لوگ برے ارادے سے ننگی عورت کو دیکھتے ہیں۔ وے بدکار لوگ مریض ہو کر تکلیف اٹھاتے ہیں۔ (۵۲) جو جاہل نابکار مردوں سے اغلام کرتے ہیں وے مخنث ہوتے ہیں۔ (۵۳) جو لوگ مویشیوں کا قتل کرتے ہیں اور جو لوگ استاد کی بیوی سے مجامعت کرتے ہیں اور شہوت پرستی میں زندگی گزارتے ہیں وے "نامرد" کا جنم پاتے ہیں۔ مہابھارت: انوشاسن: ۱۴۵: ۵۰-۵۳ دیگر

(۴۸) یہاں سے بدکار انسان پہلے جنم کی ہوئی بداعمالیوں کی وجہ سے۔ بدصورتی۔ کو پہنچتے ہیں۔ (۴۹) سونا چرانے والا۔ بد ناخن، شراب پینے والا۔ کالے دانت۔ برہمن کا قاتل۔ دق۔ استاد کی بیوی سے زنا کرنے والا۔ امراض چرمی کو پہنچتا ہے۔ (۵۰) چغل خور ناک کی سڑاہن کو، جاسوسی کرنے والا منہ کی سڑاہن کو، اناج چرانے والا عضو کی کمی کو، اور آمیزش کرنے والا عضو کی کمی بیشی کو پہنچتا ہے۔ (۵۱) اناج چرانے والا بدہضمی کو، علم چرانے والا گونگے پن کو، کپڑا چرانے والا برص (سفید داغ) کو گھوڑا چرانے والا لولے پن کو پہنچتا ہے۔ (۵۲) چراغ چرانے والا اندھا ہو جاتا ہے۔ چراغ بجھانے والا کانا ہو جاتا ہے قتل کرنے سے دائم المریض اور رحمدلی سے صحتمند ہوتا ہے۔ (۵۳) اس طرح انسان خاص خاص اعمال سے شریفوں میں حقیر و ذلیل، بیوقوف، گونگے، اندھے، بہرے اور بدصورت و بدشکل پیدا ہوتے ہیں۔ (۵۴) اسی لیے پاکیزگی کے لیے سدا کفارے ادا کرنا چاہیے۔ کفارہ نہ کرنے والے [illegible] بری

شانیوں کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں۔ منوسمرتی: ۱۱: ۴۸ – ۵۴ دیگر

پاروتی نے پوچھا کچھ انسان سدا منہ کے مرض میں مبتلا رہتے ہیں۔ کچھ دانت، حلق اور رخسار کے امراض سے تکلیف اٹھاتے ہیں۔ کیا انسان شروع میں ہی ایسے ہی ہو گئے ہیں یا کسی سبب سے؟ کس عمل کی پاداش میں ایسا ہوتا ہے؟ آپ اس کو بتلانے کے اہل ہیں۔ شری مہادیو نے فرمایا۔ اے دیوی! تمہیں بتاتا ہوں توجہ سے سنو۔ دیوی! جو بدزبان زبان سے تلخ و تند، جھوٹ، بڑوں اور دوسروں کے لیے درشت و سخت کہتا ہے یا جو غصہ میں بھر کر دوسروں سے سخت کلامی سے پیش آتا ہے یا جو بالعموم یا خود غرضی سے جھوٹ بولتا ہے۔ ان لوگوں کو زبان کی بیماری ہوتی ہے۔ جو دوسروں کی باتوں کو بدنیتی سے سنتے ہیں یا دوسرے کی قوت شنوائی کو نقصان پہنچاتے ہیں وے دوسرے جنم میں مختلف قسم کے امراض گوش میں مبتلا ہوتے ہیں۔ غرضیکہ اسی طرح دانت کی بیماری، امراض سر اور تکالیف گوش اور دوسری منہ کی خرابیاں سب کی سب اپنی کرتوت کا نتیجہ ہیں۔

پاروتی نے پوچھا۔ خداوند! انسان جریان وغیرہ امراض میں مبتلا دیکھے جاتے ہیں۔ پتھری اور شکر کے مرض سے آدمی تکلیف اٹھاتے ہیں۔ یہ کس عمل کی پاداش ہیں؟ آپ اس کو بھی بتائیں۔

شری مہادیو نے فرمایا۔ دیوی جو انسان پہلے جنم میں دوسرے کی بیویوں سے زنا کرتے ہیں اور جو دغاباز جانوروں سے بدفعلی کرتے ہیں۔ اپنے حسن پر نازاں جو بدمعاش مغلوب الشہوت ہو کر لڑکی اور بیوہ سے بالجبر زنا کرتے ہیں وے مر کر دوسرے جنم میں — اگر آدمی کا جنم پاتے ہیں تو ایسے لوگ جریان وغیرہ دوسرے تکلیف دہ امراض میں مبتلا رہتے ہیں۔ اے پیاری حسینہ!

پاروتی نے پوچھا۔ کچھ انسان سوکھے ہوئے دبلے پتلے دکھائی پڑتے ہیں۔ یہ کس عمل کی پاداش ہے آپ مجھے یہ بتلائیں۔ شری مہیشور نے فرمایا۔ دیوی! پہلے جنم میں جو انسان حریص اور گوشت کے شوقین ہوتے ہیں۔ اپنے مزہ و لذت کے لیے دوسروں کے آرام چین کو ختم کر دیتے ہیں۔ جو انسان دوسروں کے سکھ کو دیکھ کر جلتے ہیں حسینہ! اس طرح کے کردار کے انسان دوسرے جنم میں۔ پاپ کرم کے بھوگنے کے لیے لاغری کے مرض میں مبتلا ہوتے ہیں۔ پاروتی نے پوچھا۔ بہت لوگ کوڑھی ہوتے ہیں۔ یہ کس عمل کی سزا ہے؟ مجھ کو بتلائیں۔ شری مہیشور نے فرمایا۔ دیوی! جن انسانوں نے پہلے جنم میں — سزائے ناحق میں کشت و خون سے دوسروں کا [illegible] ہے۔ جن انسانوں نے آنکھ وغیرہ پھوڑا ہے اور زہریلا کھانا دیا ہے۔ حسد میں

کرنے والے بڑے ڈاکو، ہنسا کرنے والے سنگ دل لوگ، نجاست پھیلانے والے بے ہوش کرنے والے آدمی اور اسی طرح کے کردار رکھنے والے انسان دوسرے جنم میں اگر انسانی جسم پاتے ہیں تو تکلیف جھیلتے ہیں اور یہاں سیکڑوں قسم کے کوڑھ سے آلودہ ہوکر مصیبت اٹھاتے ہیں۔ کچھ "بدجلدی" میں مبتلا ہوتے ہیں۔ کچھ زخم والے کوڑھ میں پھنسے رہتے ہیں یا پھر سفید کوڑھ سے ملوث ہوتے ہیں یا طرح طرح کے کوڑھ سے حسب عمل۔ بھرے ہوتے ہیں دیوی!

پاروتی نے پوچھا: بھگوان! بہت سارے انسان ناقص الاعضاء اور لولے ہوتے ہیں۔ یہ کس عمل کی پاداش سے ہے؟ آپ کو مجھے بتانا مناسب ہے۔ شری مہیشور نے فرمایا۔ دیوی! حرص وطمع میں پڑکر جو آدمی پہلے جنم میں۔ جانوروں کو مارنے کے لیے ان کا آنگ بھنگ "نقص عضو" کرتے ہیں یا دیوی! جو لوگ ہتھیار کے حملے سے جانوروں کو بے حرکت کر دیتے ہیں حسینہ! ایسے کردار کے لوگ مر کر دوسرے جنم میں بلاشبہ ناقص الاعضاء ہوتے ہیں اور ما درزاد لولے پیدا ہوتے ہیں

پاروتی نے پوچھا۔ بھگوان! کچھ لوگ گھٹیا ورمشکا "اشک چشم سے دکھ جھیلتے ہوئے دکھائی پڑتے ہیں یہ مجھ کو بتلایئے۔ شری مہیشور نے فرمایا۔ دیوی! جو لوگ پہلے جنم میں۔ آدمیوں کے جوڑوں کو توڑتے ہیں جو سنگ دل گنہگار گھونسے سے حملہ کرتے ہیں۔ جو ٹونا کرنے والے اور بھالا مارہیں حسینہ! اس طرح کے لوگ دوسرے جنم میں گٹھیا اور مشک کے سبب سے بہت تکلیف اٹھاتے ہیں۔

پاروتی نے پوچھا۔ بھگوان! کچھ لوگ سدا پاؤں کے مرض میں مبتلا دیکھے جاتے ہیں۔ یہ مجھے بتلائیں کیوں؟ شری مہیشور نے فرمایا: دیوی! غصہ ولالچ کی وجہ سے جن انسانوں نے پہلے جنم میں دیوتا استھان کو پانوؤں سے روندا ہے اور ایڑی اور زانو سے جانداروں کو مارا ہے حسینہ! اس طرح کی کرتوت والے لوگ دوسرے جنم میں طرح طرح کے امراض پا سے تکلیف اٹھاتے ہیں اور ان کو درندے مارتے ہیں:۔

پاروتی نے پوچھا۔ خداوند خداوندان! بھگوان بھوت پال آپ کو سنکار ہو چھوٹے ہاتھ پاؤں والے ناقص الاعضاء، ٹیڑھے عضو والے، کبڑے اور بونے اور سوکھے ہاتھ والے بہت سے انسان دکھائی پڑتے ہیں۔ یہ کس عمل کی پاداش سے ہے؟ آپ کو مجھے بتانا مناسب ہے۔ شری مہیشور نے فرمایا۔ دیوی! حرص طمع کے سبب سے جن انسانوں نے پہلے جنم میں خرید وفروخت میں غلے کے باٹوں کو کم [illegible]

تیسلے میں ڈنڈی مارتے ہیں اور سب لوگوں سے خرید فروخت میں حصہ لیتے ہیں اور جو لوگ غصہ میں آکر "ہنگا مہ" کرتے ہیں اور جو جاہل ہمیشہ بے قاعدہ گوشت کھاتے ہیں حسینہ! ایسے کام کرنے والے لوگ دوسرے جنم میں ناقص الاعضا، بونے اور کبڑے ہوتے ہیں۔

پاروتی نے پوچھا۔ خداوندا! انسانوں میں بہت سے انسان ادھر ادھر پھرنے والے پاگل اور مجنون زدہ دکھائی پڑتے ہیں۔ یہ کس عمل کی پاداش ہے وہ آپ کو مجھے بتانا مناسب ہے۔

شری مہیشور نے فرمایا۔ "دیوی! جن انسانوں نے پہلے جنم میں از روئے غرور و پندار دوسروں سے بات کیا ہے یا ان کی ہنسی اڑائی ہے اور لالچ میں پڑ کر دوسروں کو روپیہ پیسہ یا لشا آور چیزوں سے فریب دیا ہے اور جو نادان لوگ بڑے بوڑھوں پر فضول ہنستے ہیں اور جو بدست لوگ شاستروں میں شبہہ کرتے ہیں اور جھوٹ بکتے ہیں حسینہ! ایسے کردار والے لوگ دوسرے جنم میں بلا شبہہ پاگل اور مجنون ہوتے ہیں۔

پاروتی نے پوچھا۔ بھگوان! کچھ لوگ بے اولاد کے سبب سے بہت رنجیدہ ہوتے ہیں اور ادھر ادھر کوشش کرتے ہوئے بھی اولاد نہیں پاتے ہیں۔ یہ کس عمل کی پاداش سے ہے۔ آپ کو مجھے بتانا بہت مناسب ہے۔ شری مہیشور نے فرمایا۔ دیوی! جن انسانوں نے پہلے جنم میں جانداروں پر بے رحمی کرتے ہوئے چرندوں اور پرندوں کے بچوں کو مارتے ہیں اور کھاتے ہیں۔ جو بزرگوں سے حسد کرتے ہیں اور دوسروں کے لڑکوں سے حسد کرتے ہیں اور حسب روایت آٹھویں تاریخ کو مردوں (پتروں) کی پوجا نہیں کرتے ہیں حسینہ! ایسے کردار والے لوگ دوسرے جنم میں مدت دراز کے بعد انسانیت کو پا کر "بے اولاد" ہوتے ہیں اور اولاد کے غم میں گھلتے ہیں۔ اس میں کوئی کلام نہیں۔

پاروتی نے پوچھا۔ "بھگوان! خداوند خداوندان! آدمیوں میں کچھ لوگ "غلام" دکھائی پڑتے ہیں جن کو بادل ناخواستہ ہر کام کرنا پڑتا ہے۔ وے کوڑے اور ملامت برداشت کرتے ہیں اور ہر اعتبار سے تکلیف اٹھاتے ہیں یہ کس عمل کی پاداش سے ہے۔ آپ کو مجھے بتا دینا چاہیے۔ شری مہیشور نے فرمایا۔ اس سبب کو میں بتاتا ہوں سنو پہلے جنم میں دوسروں کی دولت غصب کرنے والے بلے رقمی سے قرض کو بڑھانے والے دی ہوئی امانت کو ہڑپنے والے اور قیمتیں پانے پر دوسرے کے دیے ہوئے دھن کو غصب کرنے والے غلطی سے چھوٹے ہوئے دھن کو اپنانے والے اور جو لوگ دوسروں کو۔ مار پیٹ سے قید و بند سے اور

اور سنتاپاکر غلام بنائے جاتے ہیں مے مر جانے پر یم کے حکم سے سزا پاتے ہیں۔ دیوتا اپھر وہی لوگ کسی طرح
انسان کا جنم پاکر۔ تادم حیات غلام رہتے ہیں اور ان کا کام کرتے ہیں جن کا دھن چرلتے ہیں۔ اپنے بد
کے اختتام تک وہ (غلامی) کرتے ہیں۔ یہ بات یقینی اور قطعی ہے اور بعید اسی طرح دوسرے بہت سے لوگ بھ
ہوجاتے ہیں اور اسی طرح خدمت کرتے کرتے ان کی بدعملی ختم ہوجاتی ہے۔ مہابھارت: انوشاسن:
۲۲۲-۲۱۹ طبع اول سنسکرت ایڈیشن گیتا پریس

۵) یم لوک (عالم یم راج) میں متعدد قسم کی سزاؤں کو جھیل چکنے کے بعد سزاؤں سے نجات پالینے
بعد مختلف "جنم" میں پیدائش ہوتی ہے۔ ۶) انسانیت کے پالینے پر گناہ کی علامتیں ہوتی ہیں۔ خیر الطی
وگرڈ!) ان علامتوں کو میں تمہیں بتاؤں گا۔ ۷) سب سزاؤں کو جھیل چکنے پر بار بار سزاؤں کو پا پاکر ا
میں سزا جھیل چکنے پر دنیا میں" با علامت آتا ہے۔ ۸) جھوٹ بولنے والا گدھا ہوتا ہے۔ گائے کا جھوٹا گو
ہوتا ہے۔ برہمن کا قاتل کوڑھی ہوتا ہے اور شراب پینے والا سیاہ دانت والا ہوتا ہے۔ ۹) سونا چرانے
بد ناخن ہوتا ہے اور استاد کی اہلیہ کی بے حرمتی کرنے والا بد جلد ہوتا ہے۔ بری صحبت سے پست قوم کا
ہے اور خیرات نہ کرنے والا انسان مسکین ہوتا ہے۔ ۱۰) رذیلوں سے مانگنے والا برہمن سور ہوتا ہے۔ ک
سوال سے گدھا ہوتا ہے اور بغیر بلائے ہوئے دعوت کھانے والا کوا ہوتا ہے۔ ۱۱) بغیر جانچے پرکھے
والا انسان سنسان جنگل میں بندر ہوتا ہے۔ اناج چرانے والا بلی ہوتا ہے اور کھلیان جلانے والا جگنو ہو
۱۲) بدچلن عورت کے پاس جانے والا انسان بیل ہوتا ہے۔ برہمن کو باسی کھانے دینے والا کتا ہوتا ہے۔ ۱۳)
سے پیدائشی اندھا ہوتا ہے اور کتاب چرانے والا مادرزاد اندھا ہوتا ہے۔ پھل چرانے والے انسان
اولاد زندہ نہیں رہتی۔ اس میں شبہ نہیں۔ ۱۴) نیا زنہ کر کے کھانے والا انسان لاولد ہوتا ہے۔ کپڑا چ
والا "گوہ" (سوسمار) اور زہر کھلانے والا سانپ ہوتا ہے۔ ۱۵) بغیر گرو سیا دھونے والا انسان چ
گھڑیاں ہوتا ہے۔ پانی چرانے والا پپیہا ہوتا ہے اور اناج چرانے والا چوہا ہوتا ہے۔ ۱۶) بچی
مجامعت کرنے والا سانپ ہوتا ہے۔ ایسا مروی ہے استاد کی اہلیہ سے معاشقہ کرنے والا یقی
گرگٹ ہوجاتا ہے۔ ۱۷) دوسروں کی غیبت کرنے والا انسان مچھلی ہوتا ہے۔ ممنوع اشیا چیزو
فروخت کرنے والا انسان بچھو ہوتا ہے۔ ۱۸) اغلام کرنے والا نامرد ہوتا ہے اور بیٹے کو فریب دینے
انسان الو ہوتا ہے۔ میت کی گیارہویں میں کھا کر کتا ہوتا ہے۔ ۱۹) برہمن کو وعدہ کی ہوئی چیز کو نہ

ہوتا ہے۔ رانی سے مجامعت کرنے والا پاخانہ خور کیڑا ہوتا ہے۔ ۲۰) برہمن کی شکایت کرنے والا کچھوے کا جنم پاتا ہے۔ پھل فروش بدقسمت ہوتا ہے۔ زانیہ سے شادی کرنے والا بھیڑیا ہوتا ہے۔ ۲۱) آگ کو پاؤں سے چھونے والا انسان بلی ہوتا ہے۔ خوشبو چرانے والا لنگڑے والا ہوتا ہے۔ لڑکی کا قاتل چنڈال ہوتا ہے جو سدا شہوت پرستی کرتا ہے۔ وہ مینڈھے کا جنم پاتا ہے۔ ۲۲) دوسروں سے جلنے والا اور کپڑا چرانے والا یقینی طور پر دھوبی ہوتا ہے۔ مالک کی نمک حرامی کرنے والا گنہگار پتھر کا کیڑا ہوتا ہے۔ ۲۳) مرتد انسان مرگھٹ کا گدھ ہوتا ہے۔ گھی چرانے والا دوسرے جنم میں کوڑھی کا جنم پاتا ہے۔

گروڈ پریت کلپ : ۴۴ : ۵-۲۳

باقی

(صفحہ ۱۵ کا بقیہ) راہ کی دشواریوں کو دور کرنے کا حوصلہ اس لائق نہیں ہے کہ اسے نظرانداز کر دیا جائے اور اس کی قدر کی جائے۔ ایک زمانہ تھا جب مسلمانوں نے یورپ کو علمی ارتقا کی طرف متوجہ کیا تھا اور اب وقت یہ ہے کہ یورپ و امریکہ ہمیں علمی ارتقا کی طرف متوجہ کر رہے ہیں۔ اسی نقطۂ نظر سے ہم نے اس مختصر مضمون کا ترجمہ یہاں شائع کیا ہے۔ (ادارہ)

زندگی

کے فروری، مارچ اور اپریل ۱۹۶۶ء کے شماروں کی ضرورت ہے۔ جن صاحبان کے پاس ہوں، براہِ کرم ارسال فرمائیں۔

خریدار اگر بھیجیں گے تو ان کی مدت خریداری میں اضافہ کر دیا جائے گا۔ ایجنٹوں کے بھیجنے کی صورت میں ان کے بل میں کمی کر دی جائے گی۔

منیجر ماہنامہ "زندگی" رامپور

تصحیح: گزشتہ شمارے میں دو صفحات پر ۱۹ کا عدد چھپ گیا ہے۔ ۱۵ کے بعد ۱۹ ہے اس کو ۱۶ پڑھیے۔ اس کے بعد صفحات لا کر صحیح پڑھیے۔ (ادارہ)

تراجم و اقتباسات

چاند تک انسان کی اڑان

چاند کے ممکن استعمالات اور اس سے فائدے حاصل کرنے کی تحقیق اب محض علمی و نظری نہیں رہ گئی ہے، بلکہ عنقریب یہ تحقیق عمل کے میدان میں اترنے والی ہے۔ امریکا اور روس دونوں ہی کسی ایسے معاہدے کے لیے فکرمند نظر آتے ہیں جو انسان کی حرکت و عمل اور اس کی کارروائیوں کو کنٹرول کرسکے خواہ زمین کر یہ کارروائیاں چاند پر ہوں یا چاند کے اوپر سے زمین تک انجام دی جانے والی ہوں۔ ان دونوں حکومتوں کی اس فکرمندی ہی سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ چاند کا استعمال اب زیادہ دور نہیں ہے۔

چاند کو زمین کی دیکھ بھال یا اس پر بم باری کرنے کے لیے فوجی مرکز بنانے کا خیال اس کی عملی قدر و قیمت سے کچھ متجاوز معلوم ہوتا ہے البتہ چاند سے نیچے زمین کے گرد گھومنے والے مصنوعی سیارے، جاسوسی کے لیے زیادہ مفید نظر آتے ہیں کیونکہ وہ زمین سے قریب ہوتے ہیں، چاند سے زمین پر راکٹ داغنے کا خیال بھی بعید نظر آتا ہے۔ اولاً اس لیے کہ دور مار راکٹ کے تمام ساز و سامان اور اس کی معاون اشیاء کو چاند تک پہنچانا آسان نہیں ہے۔ ثانیاً اس لیے بھی کہ چاند سے زمین تک راکٹ پہنچنے کا وقت نسبتہً زیادہ ہوگا اور اتنے وقت میں آسانی کے ساتھ اسے راستے میں روکا جاسکے گا اور اس کی راہ میں مزاحمت کھڑی کی جاسکے گی۔

تاہم چاند سے متعدد و مختلف غیر فوجی فائدے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ اس کا سب سے نمایاں اور بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کو دوسرے سیاروں کی تحقیق کے لیے ایک مرکز بنایا جاسکتا ہے۔ مسٹر آرتھر کلارک نے فلکیات سے متعلق اپنے تازہ مجموعہ مضامین میں بتایا ہے کہ چاند دوسرے سیاروں تک پہنچنے کے لیے ایک مخصوص قدرتی زینے کی حیثیت اختیار کرے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زمین کے مقابلے میں چاند

کے اندر کشش ثقل ہے۔ سادہ حقیقت یہ ہے کہ زمین کی کشش سے باہر نکلنے کے لیے چاند کے مقابلے میں بیس گنا زیادہ طاقت خرچ کرنی پڑتی ہے۔ چاند کی کشش سے نکلنے کے لیے بیس گنا کم طاقت خرچ کرنی پڑے گی۔ اس کے علاوہ چاند ہوا کے دباؤ سے بھی خالی ہے اور اس سے ہم ایک دوسرا فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔ وہاں یہ ممکن ہو گا کہ مختصر وقت میں ضرورت کے مطابق رفتار متعین کی جا سکے کیونکہ رگڑ سے خلائی جہاز کے جل اٹھنے کا کوئی اندیشہ نہ ہو گا۔

ایک دوسرا اہم فائدہ جو چاند سے یقینی طور پر حاصل کیا جا سکے گا۔ یہ ہے کہ چاند کی رصدگاہوں سے فلکیات کا مطالعہ کیا جائے گا۔ کرۂ ہوا کا مانع موجود نہ ہونے کی وجہ سے یہ مشاہدات بڑی آسانی سے کیے جا سکتے ہیں۔ مسٹر کلارک نے یہ خیال بھی پیش کیا ہے کہ چاند میں سیارتی اطلاعات کا ایک ایسا مرکز بن سکے گا جہاں ان اطلاعات کو صاف اور واضح کیا جا سکے۔ اس قسم کے فوائد، چاند پر فنی سرگرمیوں کو بلاشبہ بہت بڑھا دیں گے۔ مسٹر کلارک کے خیال میں چاند فنی ارتقا کے لیے موزوں ترین جگہ ہو گی اور اس کی صنعتی و فنی ترقیوں سے زمین پر بھی فائدہ اٹھایا جا سکے گا۔

اس وقت بہت سے اہم کارخانے 'خلا کی ٹیکنک' پر مبنی ہیں یعنی کیمیاوی اور خام دھات کو صاف کرنے کا طریق عمل اس بات پر موقوف ہے کہ مکمل طور پر خلا پیدا کر دیا گیا ہو یعنی ہوا کو کھینچ کر بالکل خالی کر دیا گیا ہو۔ چونکہ زمین پر خلا پیدا کرنا مشکل بھی ہے اور مصارف بھی بہت آتے ہیں اور چاند پر یہ خلا آپ سے آپ قدرتی طور پر موجود ہے اس لیے وہاں ایسی صنعتوں کی ترقی بڑی تیزی سے ہو سکتی ہے۔

چاند کے خلا میں بہت سے نئے طریق عمل دریافت کیے جا سکتے ہیں۔ جو صنعتیں آج خواب و خیال ہیں وہ وہاں بافراط موجود ہوں گی اور وہاں کی پیداوار چاند سے زمین پر پہنچائی جا سکے گی۔ باقی رہا خام مواد کی بات تو اس کی پوری توقع ہے کہ بہت سی صنعتوں کا خام مواد خود چاند مہیا کرے گا۔

نوٹ:۔ اوپر کا مختصر مضمون اسٹیٹسمین کے سائنسی نامہ نگار کا لکھا ہوا ہے جو ۲۰ جون ۶۲ء کے اخبار میں "انسان چاند پر کیا کچھ کر سکتا ہے" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔

یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ آج جو لوگ چاند کو فتح کرنے کی سعی کر رہے ہیں انھوں نے اس زمین کا کیا حال بنا رکھا ہے جس پر وہ آباد ہیں اور وہ جب وہاں جا پہنچیں گے تو اس کا کیا حال بنائیں گے لیکن یہ کہ با وجود ان کی علمی تحقیق، عملی جد و جہد اپنی قوتوں کا استعمال اور اس (باقی صفحہ ۴۹ پر)

رسائل و مسائل

حولانِ حول کی شرط اور چاندی کا نصاب

سوال :- ایک مسئلے میں کچھ شبہہ ہو رہا ہے جس کے ازالے کے لیے یہ خط لکھ رہا ہوں۔ آپ کے جواب کا شکرگزار رہوں گا۔

(۱) سوال یہ ہے کہ تجارتی مال پر حولان حول کا اطلاق ہوتا ہے یا نہیں؟ اگر ہوتا ہے تو کس طرح؟ اس لیے کہ یکساں حال پر اس کی مالیت نہیں رہتی۔ نفع یا نقصان سے مسلسل بڑھتی یا گھٹتی رہتی ہے۔ مجھی طور پر میں خود جاننے کی ضرورت رکھتا ہوں۔ میں نے ایک دکان کپڑے کی شروع کی تھی میں تین سو روپیہ سے۔ سال کے ہر ماہِ رمضان میں حساب سے زکوٰۃ نکالتا ہوں۔ یہ تجارتی مال تین سو سے رفتہ رفتہ آج اصل اور نفع ملا کر سات سو روپیہ (مع مال اور نقد کے) ہوا ہے جس کے مطابق رمضان میں ایک سال ہی مان کر اس پر بھی زکوٰۃ نکالوں تو حساب کرکے بتا دیجیے کہ زکوٰۃ کی رقم کتنی ہوگی۔ وہ حولانِ حول والی بات مجھے الجھن میں ڈالے ہوئے ہے کہ کوئی رقم ... نہیں کی جا سکتی جس پر ایک سال گزرے۔

(۲) اسی طرح اگر کوئی تنخواہ سے بیس روپیہ ہر ماہ جمع کرے اور نصاب قائم ہونے پر زکوٰۃ نکالنے کے دن پوری جمع شدہ رقم جو اس دن ہے اس پر زکوٰۃ نکالی جائے گی یا اس رقم پر جو ایک سال پہلے تھی۔ یہ رقم بھی رفتہ رفتہ ہر ماہ بڑھتی ہے۔

جواب

راقم الحروف مقدارِ زکوٰۃ اور حولانِ حول کے مسئلے پر زندگی ستمبر ۱۹۶۳ء کے رسائل و مسائل میں ...

رکھا ہے اگر آپ تو وہ شمارہ نہیں مل جائے تو پڑھ لیجیے گا۔ مختصراً آپ کے سوالات کا جواب یہ ہے:-

(۱) تجارتی مال کی زکوٰۃ نکالنے کے لیے بھی حولان حول کی شرط ہے یعنی ایک سال گزر جانے کے بعد زکوٰۃ کی ادائیگی واجب ہوتی ہے۔ حولان حول کے سلسلے میں قاعدہ یہ ہے کہ درمیان سال کی کمی بیشی کا اعتبار نہیں کیا جاتا، بلکہ سال ختم ہونے کے بعد جو مال موجود ہو اس کی زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔ مثال کے طور پر یوں سمجھیے کہ کوئی شخص محرم میں سو روپیہ کا مالک ہوا اور پھر درمیان سال میں یہ رقم گھٹتی بڑھتی رہی لیکن جب سال پورا ہوا تو پچھتر روپیے اس کے پاس موجود تھے تو وہ زکوٰۃ اتنے ہی روپے کی ادا کرے گا۔ اور اگر سو موجود تھے تو سو کی اور اگر ایک سو چالیس موجود تھے تو ایک سو چالیس کی۔ غرض یہ کہ سال تمام ہونے پر جتنی رقم موجود ہوگی اسی کی زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔ الّا یہ کہ نصاب ہی باقی نہ رہے تو پھر زکوٰۃ بھی ساقط ہو جائے گی۔ مثلاً اگر ختم سال پر اس کے پاس صرف پچیس روپیے بچے ہیں تو زکوٰۃ نہیں دینی پڑے گی۔

اس سلسلے میں ایک اور مسئلہ ذہن نشین کر لینا چاہیے وہ یہ کہ اگر درمیان سال میں کل رقم ختم ہو گئی ہو اور اس کے بعد وہ پھر صاحب نصاب ہوا ہو تو سال کا شمار اس ماہ سے ہوگا جب وہ دوبارہ صاحب نصاب ہوا ہے۔ اوپر ہی کی مثال لے لیجیے اگر کوئی مسلمان محرم میں سو روپیے کا مالک ہوا تھا لیکن صفر میں سب روپیے خرچ ہو گئے اس کے بعد ربیع الاول میں وہ پھر سو روپیے کا مالک ہو تو اب سال کا حساب محرم سے نہیں بلکہ ربیع الاول سے کیا جائے گا۔

آپ نے اپنی جو صورت پیش کی ہے اس میں اگر آپ سال ختم ہونے سے پہلے رمضان میں زکوٰۃ ادا کرنا چاہتے ہیں تو کر سکتے ہیں۔ سات سو کی مقدار زکوٰۃ ڈھائی روپیے سیکڑے کے حساب سے ساڑھے سترہ روپیے ہوتی ہے۔ یہ بات بھی یاد رکھیے کہ حولان حول یعنی سال پورے ہونے کا حساب قمری مہینوں سے ضروری ہے۔ شمسی مہینوں سے حساب کر کے زکوٰۃ ادا کرنا صحیح نہیں ہے۔

(۲) پہلے جب چاندی کے روپیے چلتے تھے تو چالیس روپیے کو ایک نصاب تسلیم کر لیا گیا تھا لیکن اب چاندی کے روپیے غائب ہو چکے ہیں اور کاغذ کے نوٹ چل رہے ہیں۔ اس صورت میں جب تک کسی کے پاس اتنے روپیے نہ ہوں جن سے چاندی کی وہ مقدار خریدی جا سکے جو ایک نصاب کے برابر ہے اس وقت تک وہ صاحب نصاب نہ ہوگا۔ ہمارے نزدیک چاندی کا نصاب چھتیس تولہ ساڑھے پانچ ماشے ہے۔ اب فرض کیجیے کہ چاندی دو روپیہ تولہ فروخت ہو رہی ہے تو جب تک کسی کے پاس ۷۲ روپیے ۷۲ پیسے

فرمایا) نہ ہوں وہ صاحب نصاب نہ ہوگا۔ آپ کے سوال کا جواب یہ ہوا کہ تنخواہ سے جس شخص کے پاس روپیہ جمع کرنے والا شخص جب صاحب نصاب ہو جائے گا تو سال تمام ہونے کے بعد جس قدر رقم جمع ہو چکی ہوگی ان سب کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔ اس پر کہ نصاب مکمل ہو جانے کے بعد جتنی رقم بڑھتی جائے گی اس کے لیے الگ سال کا حساب نہیں ہوگا۔ بلکہ کل روپیوں کے سال کا حساب اسی ماہ سے ہوگا جس ماہ میں وہ صاحب نصاب ہوا تھا۔

دنیا میں حضرت عیسیٰ کا نزول

سوال :۔

تعلیم حاصل کرنے کے لیے جو طلبہ یورپ جاتے ہیں تو وہاں کے عیسائی طلبہ ان کے سامنے طرح طرح کے مذہبی سوالات بھی رکھتے ہیں۔ اسی طرح کے دو سوالات وہاں کے ایک مسلمان طالب العلم نے لکھ بھیجے ہیں کہ ان کا جواب دیا جائے۔ ان سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ عام طور سے ہمارے مسلمان طلبہ اپنے مذہب سے کس قدر ناواقف ہوتے ہیں کہ وہ معمولی سوالات کے جواب بھی خود نہیں دے سکتے اور ذہنی الجھن میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ وہ دو سوال یہ ہیں :۔

(۱) حضرت عیسیٰ علیہ السلام دنیا میں نبی ہو کر آئیں گے یا امام ہو کر۔ نبی ہو کر آئے تو ثابت ہوا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آخری نبی نہیں ہیں۔ اور اگر امام ہو کر آئے تو ان کی نبوت کس سزا میں چھینی گئی

(۲) جب حضرت عیسیٰ آسمان پر ہیں تو ثابت ہوا کہ وہ حضرت محمد سے افضل ہیں۔

جواب :۔

(۱) یہ سوال ایک دھوکا ہے جو پادری صاحبان مسلمانوں کو دیتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نئے نبی ہو کر نہیں آئیں گے وہ تو نبی ہیں ہی جیسا کہ سوال کے دوسرے جزء سے خود معلوم ہوتا ہے۔ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری نبی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اب کوئی نیا نبی قیامت تک نہیں آئے گا۔ اب اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کے کوئی نبی اللہ کی قدرت سے دنیا میں پھر آ جائیں تو اس سے حضور کے آخری نبی ہونے میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ایک حدیث میں ہے کہ حضور نے فرمایا کہ اگر

کبھی موسیٰ زندہ ہوتے تو ان کو میری ہی پیروی کرنی پڑتی۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ آپ کی شریعت آخری شریعت ہے جس نے پہلی تمام شریعتوں کو منسوخ کر دیا ہے۔ اس لیے بالفرض اگر پہلے زمانے کے کوئی نبی دنیا میں تشریف لائیں تو نبی ہوتے ہوئے بھی ان کو شریعت محمدی کی پیروی کرنی پڑے۔ خود عیسیٰ علیہ السلام جب اس دنیا میں موجود تھے تو نبی ہوتے ہوئے انھوں نے شریعت موسوی کی پیروی کی تھی۔ اب چونکہ شریعت محمدی نے شریعت موسوی کو منسوخ کر دیا ہے اس لیے قیامت کے قریب جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ دنیا میں تشریف لائیں گے تو شریعت محمدی ہی پر عمل کریں گے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دوبارہ تشریف لانے کا ایک مقصد یہ بھی ہوگا کہ وہ موجودہ دین مسیحی کی حقیقت پادری صاحبان پر واضح کر دیں جس میں ان کے بعد ان حضرات نے تحریف کر دی ہے اور ان پر یہ بھی واضح کر دیں کہ انھوں نے نبوت محمدی کا انکار کر کے خود حضرت عیسیٰ اور انجیل کا انکار کیا ہے جن پر ایمان کا وہ دعوے رکھتے ہیں۔

(۲) یہ بھی ایک دھوکا ہے جو عیسائی حضرات مسلمانوں کو دیتے ہیں۔ کیونکہ افضلیت صرف آسمان پر ہونے سے ثابت نہیں ہوتی ہے۔ دیکھیے فرشتے بھی تو آسمان پر ہیں لیکن وہ انبیاء کرام سے افضل نہیں ہیں۔ قرآن کی بعض آیتوں کے اشارے سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمان پر جانور بھی موجود ہیں تو کیا جانور زمین والوں سے افضل مان لیے جائیں گے؟ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کے آخری نبی ہیں، ان کی شریعت آخری اور کامل ترین شریعت ہے اور ان کی شریعت نے پہلی تمام شریعتوں کو منسوخ کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود انہیں اتنی خوبیاں عطا فرمائی ہیں جو مجموعی طور پر کسی دوسرے نبی میں موجود نہ تھیں۔ اب ہر شخص فیصلہ کر سکتا ہے کہ افضلیت آپ کو حاصل ہوگی یا کسی اور کو۔ اس کے علاوہ جب قرآن و حدیث کو مان کر ہم مسلمان یہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ آسمان پر ہیں اور وہ دوبارہ دنیا میں آئیں گے اسی قرآن و حدیث میں یہ بھی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء سے افضل ہیں۔ ہم مسلمان اس کو بھی مانتے ہیں اور اس کو بھی۔

حضرت ادریس علیہ السلام کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بھی آسمان پر اٹھا لیے گئے تھے تو اب پادری صاحبان بتائیں کہ حضرت عیسیٰ اور حضرت ادریس میں کون افضل ہیں؟

سید احمد قادری

مسجد سے میخانے تک

ملا ابن العرب مکی۔ صفحات ۴۴۸ کاغذ، کتابت، طباعت بہتر مجلد گرد پوش کے ساتھ۔ قیمت: پانچ روپیے۔ ناشر: مکتبۂ تجلی، دیوبند۔ یوپی۔

ماہنامہ تجلی دیوبند ہندوستان اور پاکستان دونوں ہی ملکوں میں دل چسپی کے ساتھ پڑھا جاتا ہے اور عوام و خواص دونوں طبقوں میں مقبول ہے۔ اس کی عام مقبولیت میں ملا ابن العرب مکی کے طنز و مزاح کا بڑا حصہ ہے۔ کتنے ہی لوگ ہیں جو تجلی کھولتے ہی سب سے پہلے ملا کی نگارشات سے محظوظ ہوتے ہیں۔ طنز و مزاح اگر با مقصد ہو تو اصلاح کے لیے ایک موثر ہتھیار بن جاتا ہے اور بن سکتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ وہ اپنی حدود کے اندر ہو، پھکڑ اور یاوہ گوئی نہ بن جائے۔ اللہ تعالیٰ نے ملا ابن العرب مکی کو لکھنے کا سلیقہ اور ایک موجد و مخترع ذہن عطا کیا ہے اور یہ اس کا کرم ہے کہ وہ اس کو تعمیر و اصلاح کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ اگر وہ محض حصول مال کے لیے سنسنی پیدا کرنے والے افسانے اور ناول لکھنے پر اتر آتے تو ان کی جیبیں سیم و زر سے بھر جاتیں۔

زیر تبصرہ کتاب ان کے طنزیہ و مزاحیہ صفحات کا ایک منتخب مجموعہ ہے اور اس میں شاید ہی کوئی ایسی چیز ہو جسے راقم الحروف پہلے نہ پڑھ چکا ہو۔ ان کے طنز و مزاح کا سب سے بڑا ہدف غلط قسم کا تصوف اور مزارات پر ہونے والی خرافات و بدعات ہیں۔ دوسرے موضوعات پر بھی انھوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ان کا قلمی پوسٹ مارٹم، ڈاکٹروں کی تشریح الاعضاء سے کم نہیں ہوتا۔ ہر ادیب کی طرح ملا مکی کی نگارشات بھی اپنے حسن، سلیقے اور معنویت کے لحاظ سے یکساں نہیں ہیں، بلکہ کہیں کہیں تو ان کا قلم بہک بھی گیا ہے اور طنز و مزاح نے پھکڑ کا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ مثال کے طور پر تقصیر ایک میلاد کا

م الحروف کے نزدیک طنز و مزاح کے حدود سے تجاوز کر گیا ہے۔ میں نے تجلی میں اسے پڑھا تھا
س وقت بھی طبیعت منغض ہوئی تھی اور اس مجموعے میں بھی اس کو اسی طرح براجمان دیکھ کر کوفت
ئی۔ ہر شخص میں "انا" ہوتی ہے۔ "مسجد سے میخانے تک" کے صفحات پڑھتے ہوئے کتنی ہی جگہ
حساس ہوا ہے کہ یہ مدیر تجلی کی "انا" کے لیے "ملاس" کی خدمت بھی انجام دیتے ہیں —— زیر تبصرہ
یہ کا بقلم خود پیش لفظ بھی بہت دلچسپ اور بامعنی ہے۔

توقع ہے کہ یہ کتاب جلد سے جلد نکل جائے گی اور ہم ملا بھائی کی نگارشات کا دوسرا مجموعہ
ی جلد ہی پڑھ سکیں گے۔

لندن دیارِ غیر میں

مولانا عبداللہ عباس ندوی۔ صفحات ۹۶۔ کاغذ کتابت و طباعت بہتر۔ قیمت: ایک روپیہ ۵۲ پیسے۔ ناشر: دارالاشاعت رحمانی مونگیر۔ بہار۔

مولانا عبداللہ عباس ندوی پھلواری کا ایک مختصر سفرنامہ المجیب پھلواری شریف ضلع پٹنہ میں
ساط شائع ہوا تھا۔ اسی کو اب کتابی شکل میں دارالاشاعت رحمانی مونگیر نے شائع کیا ہے ——
م الحروف نے یہ سفرنامہ المجیب میں پڑھا تھا۔ اصل سفرنامہ میں عنوانات نہ تھے۔ اب ناشر نے مضامین
سرخیات کے عنوانات متعین کر دیے ہیں اور اس سے افادیت بڑھ گئی ہے۔ مصنف کا تعارف مولانا
ؒالدین ندوی استاذ جامعہ رحمانیہ مونگیر نے لکھا ہے۔ یہ تعارف شاید بہت جلدی میں لکھا گیا ہے۔
ی لیے واقعات کے سنین غلط ہو گئے ہیں۔ صفحہ ۱۲ پر درج ہے کہ مولانا عبداللہ ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۴ء
ے دارالعلوم ندوہ میں ادیب اول کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور اسی صفحہ میں یہ بھی درج ہے
لہ وہ ۱۹۶۴ء میں دوبارہ حجاز گئے اور وہیں کے ہو رہے اور صفحہ ۱۰ پر درج ہے کہ چھ برسوں کے
د ۱۹۶۲ء میں رابطہ عالم اسلامی سے متعلق ہو گئے۔ آخر یہ ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۲ء تک صرف چھ برس کس حساب
ے ہوئے؟ صفحہ ۱۵ کی آخری سطر میں سال کا عدد غائب ہے۔ صرف "سال ہوئے" رہ گیا ہے ——
۱۔ پر حضرت شیخ العالمین کا نام اور سن وفات بھی غائب ہے۔

مولانا عبداللہ عباس ندوی کا یہ سفرنامہ پڑھنے کے لائق ہے۔ یورپ کو ایک مسلمان کی نظر سے

دیکھ کر انھوں نے یہ سفرنامہ مرتب کیا ہے اور اس میں بہت سی قیمتی اور مفید معلومات سمٹ آئی ہیں۔

تذکرہ زنداں جناب خورشید احمد ایم اے ایل ایل بی۔ قیمت سستا اڈیشن چھ روپیہ۔ اعلیٰ اڈیشن پلاسٹک کور کے ساتھ دس روپیہ۔ ناشر:۔ مکتبہ:۔ چراغ راہ۔ ۹ لوٹیا بلڈنگ۔ آرام باغ روڈ۔ کراچی۔

مرتب کتاب ۶ جنوری ۶۴ء سے ۹ ار اکتوبر ۶۴ء تک جیل میں رہے۔ ۱۹۶۴ء جماعت اسلامی پاکستان کے لیے ایک سخت آزمائشی سال تھا اور اللہ کے فضل و کرم سے وہ اس آزمائشی بھٹی سے کندن بنکر باہر نکلی۔ وہاں کے سپریم کورٹ نے انصاف کی لاج رکھ لی اور جماعت اپنی جدوجہد کے لیے آزاد ہو گئی۔ حکومت پاکستان نے جماعت پر پابندی عائد کر کے اس کی مجلس شوریٰ کے تمام ارکان کو گرفتار کر لیا تھا۔ خورشید احمد صاحب بھی مجلس شوریٰ کے رکن تھے۔ اس لیے انہیں بھی جیل کی زندگی کا تجربہ کرنا پڑا۔ یہ بڑے سائز کی تین سو اڑسٹھ صفحات کی کتاب انہیں ایام اسیری کے واردات و تاثرات پر مشتمل ہے۔ خورشید صاحب اردو انگریزی دونوں ہی زبانوں کے صاحب قلم ہیں۔ اور یہ کتاب ان کے اردو زبان میں صاحب قلم ہونے کی ایک سند ہے۔ فرصت کی کمی کے سبب میں نے یہ کتاب راتوں کو جاگ کر پڑھی ہے اور اس سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ اللہ انہیں جزائے خیر دے کہ انھوں نے اپنے واردات و تاثرات میں دوسروں کو بھی شریک کر لیا ہے۔

دنیا کے تمام اقتدار پرست حکمرانوں کا یہ مشترک شیوہ ہے کہ جب وہ کسی فرد یا کسی جماعت کو اپنے اقتدار کی راہ کا روڑا سمجھتے ہیں تو پھر اس کو اپنی راہ سے ہٹانے کے لیے وہ سب کچھ کر گزرتے ہیں جو ان کے بس میں ہو۔ وہ جب ان قوانین کے ماتحت بھی کسی پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے جو خود ان کے اپنے بنائے ہوتے ہیں تو ان بے چاروں کو بالکل جھوٹے اور انتہائی نامعقول الزامات تراشنے پڑتے ہیں۔ اس کا تجربہ یہاں وہاں ہر جگہ ہو رہا ہے۔ خورشید صاحب نے اپنی جو فرد جرم اس کتاب میں نقل کی ہے (صـ ۲۲۵) اس کو پڑھ کر ہمیں تعجب نہیں ہوا۔ البتہ حکومت پاکستان بعض باتوں میں دوسری حکومتوں سے بازی لے گئی ہے مثال کے طور پر یہ بات کہ کسی بیمار قیدی سے کسی ڈاکٹر کی ملاقات کرائی جائے، قیدی کو خبر بھی نہ ہو کہ یہ ڈاکٹر ہیں یا کون ہیں۔ ڈاکٹر صاحب قیدی سے مصافحہ کر کے واپس آ جائیں اور حکومت اعلان کرے کہ فلاں قیدی کو بہترین طبی سہولت بہم پہنچائی جا رہی ہے یا یہ کہ فلاں قیدی ڈاکٹری رپورٹ کی بنا پر بالکل صحت مند ہیں۔ اسی طرح کسی

[ق]یدی سے کسی وکیل کی ملاقات کرائی جائے، قیدی کو خبر بھی نہ ہو، صاحب سلامت ہو، ادھر ادھر کی بات چیت [ہ]و اور پھر حکومت کا پریس نوٹ شائع ہو جائے کہ فلاں قیدی نے قانونی مشیر سے مشورہ لے کر اپنا جواب تیار [ک]یا ہے ۔

جیل کی زندگی کسی فرد یا کسی جماعت کے اخلاق و کردار یا اس کے مقصد حیات کو جانچنے کی ایک بڑی اچھی کسوٹی ہے۔ خورشید صاحب اور ان کے رفقاء نے جیل میں جس طرح کی زندگی بسر کی اس کی حکایت بھی جب ہمیں متاثر کرتی ہے تو پھر اسی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ خود ان اصحاب کہف پر اس کا کتنا اچھا اثر مرتب ہوا ہوگا :

خورشید صاحب تذکرۂ زنداں کی ترتیب پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ کھلے دل سے جو شخص بھی اس کا مطالعہ کرے گا اس سے متاثر ہوگا اور بالخصوص ان لوگوں کے لیے جو اعلاء کلمۃ اللہ کی جد و جہد کر رہے ہیں اس کتاب کا مطالعہ بہت مفید ثابت ہوگا ۔

جہاں ہم ہیں

جناب غلام سرور۔ صفحات ۹۶۔ قیمت: ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ: سلمہ بانو، معرفت صغری النساء غلام سرور۔ صدر بازار دانا پور کینٹ ضلع پٹنہ۔ بہار

روزنامہ سنگم پٹنہ کے ایڈیٹر جناب غلام سرور نے اس کتاب میں اپنی دوسری جیل یاترا کے تاثرات معلومات پیش کیے ہیں۔ اسی کتاب سے معلوم ہوا کہ وہ اپنی پہلی گرفتاری کی روداد "گوشے میں قفس کے" پہلے شائع کر چکے ہیں۔ (ہمارے پاس وہ کتاب تبصرے کے لیے نہیں آئی ۔

زیر تبصرہ کتاب میں انھوں نے جیلوں کے جو حالات بیان کیے ہیں وہ ایک شریف انسان کو لرزا دینے والے ہیں۔ یہ جیل خانے ایسی قتل گاہیں بن گئے ہیں جہاں انسانیت شرافت اور پاک بازی کو کند چھری سے ذبح کیا جا رہا ہے۔ جب قید خانے خود جرائم خانوں میں بدل جائیں تو پھر جرائم کی کمی اور مجرموں کی اصلاح کا خیال بھی فضول ہے ۔

آزادی کے بعد توقع تھی کہ عام قیدیوں کے ساتھ انسانوں جیسا برتاؤ کیا جائے گا لیکن افسوس کہ آج بھی ان کے ساتھ جانوروں جیسا برتاؤ کیا جا رہا ہے ۔ ان جیل خانوں میں ظلم و زیادتی اور حق تلفی کی وہ فضا چھائی ہوئی ہے کہ ان میں ملازمت کرنے والا کوئی شخص ایماندارانہ زندگی بسر کرنے کا تصور بھی

نہیں کر سکتا۔ جو ملازم ذرہ برابر بھی اخلاقی حس رکھتے ہیں وہ اپنی اس ملازمت سے بیزار ہیں۔ فاضل مرتب نے جیل خانوں کی اصلاح پر بھی اظہار خیال کیا ہے بحیثیت مجموعی یہ چھوٹی سی کتاب پڑھنے کے لائق ہے۔ افسوس یہ ہے کہ کتاب کی طباعت اچھی نہیں ہے۔ دوسرے اڈیشن میں اس کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہیے۔

مذہبیت و لامذہبیت کی کشمکش

(پانچ مقالے)

از صوفی نذیر احمد کاشمیری۔ صفحات ۱۸۲۔ کاغذ، کتابت و طباعت بہتر۔ قیمت دو روپے ملنے کا پتہ کتب خانہ انجمن ترقی اردو۔ جامع مسجد۔ دہلی۔

محترم جناب صوفی نذیر احمد صاحب کشمیری کی کتاب "جہاد اعظم کی تیاری" پر کچھ عرصہ گزرا زندگی میں تبصرہ شائع ہوا تھا۔ اب موصوف کی یہ دوسری کتاب تبصرے کے لیے آئی ہے۔ اس کا تعارف خود جناب صوفی صاحب کی تحریر میں پڑھیے۔ اس سے کتاب کی نوعیت اور اس کی زبان دونوں کا اندازہ ہوگا لکھتے ہیں:

> ساری کائنات کے انواع مخلوقات میں ایک نوع بھی ایسا نہیں ہے جو اپنا ایک معین آئین بقا و فلاح نہ رکھتا ہو۔ جمادات، نباتات و حیوانات کے تمام انواع میں سے ایک نوع بھی اس قاعدۂ کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہے حقیقت میں کائنات کا سارا نظام صرف اس آئین بندی و آئین پسندی کے سہارے چل رہا ہے۔ اب انسان جیسی ذی شعور مخلوق کے لیے یہ خیال کرنا کہ اس کی فلاح و بقا و امن و سلامتی کا کوئی معین آئین نہیں ہے بلکہ انسان جس چیز کو چاہے اپنا آئین بنا ڈالے۔ جہاں اس ساری کائنات کے لیے ایک کھلا چیلنج ہے وہاں یہی گمراہی تمام فساد انسانی کی بنیاد ہے۔ یہی اس کا جہنم کا دروازہ ہے۔ یہی اس کی بدنظمی و تضاد مقاصد کا سرچشمہ ہے۔ بلا شبہ فطرت انسانی کا بھی اپنا آئین فلاح و بقا ہے اور وہ اس کا وہ اخلاقی شعور و احساس و کردار ہے جو باقی انواع مخلوقات سے ایک واضح امتیاز دیتا ہوا اسے ایک اشرف و اعلیٰ مخلوق بنا دیتا ہے۔ اسی حقیقت کی شرح یہ مختصر کتاب ہے

اس عبارت کو پڑھ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر انسان ایک پابند آئین مخلوق ہے تو پھر وہ آئین کون ہے جس کی پابندی اس کو کرنی چاہیے۔ اس کا جواب صوفی صاحب یہ دیتے ہیں:۔

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝

"یہ میرا (معین کردہ) راستہ سیدھا راستہ ہے۔ اس کا اتباع کرو مختلف پگڈنڈیوں پر نہ چل کھڑے ہو اس لیے کہ وہ تمہیں اس کے راستے سے منتشر کردیں گی۔ اس کا تمہیں وہ (اللہ تعالیٰ) حکم دیتا ہے تاکہ تم بچ نکلو۔"

اس سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ صوفی صاحب کی یہ کتاب قرآن کی دکھائی ہوئی صراط مستقیم کی طرف دعوت دیتی ہے۔ یہ کتاب کسی عنوان پر مرتب کتاب نہیں ہے بلکہ صوفی صاحب کے پانچ مقالوں کا مجموعہ ہے۔ (۱) مارکس ازم اور انسانی بقا (۲) دین فطرت کیا ہے۔ (۳) انسانی فطرت کے تین مرکزی عناصر اور ان کی ترتیب و تکمیل۔ (۴) دین کا عمرانی نظام۔ (۵) تنظیم و تجدید کی مخصوص و ممتاز راہ عمل ——— جو لوگ غور و فکر کے عادی ہوں ان کے لیے اس کتاب کا مطالعہ مفید ہوگا۔ یہ کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جسے سرسری طور پر پڑھ کر اس سے کچھ حاصل کیا جا سکے۔ اس کتاب کے پہلے مقالے میں اشتراکیت کی عظیم ضلالت کی تشریح و تردید کی گئی ہے اور دوسرے مقالات میں بھی یہ گمراہی مقالہ نگار کے سامنے رہی ہے۔ صوفی صاحب کی خدمت میں دو باتیں عرض کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے ایک یہ کہ اپنے مخالفین کے بارے میں سب و شتم کی زبان استعمال کرنا خود اپنے ہی مقصد کو نقصان پہنچانا ہے۔ جب کوئی کمیونسٹ کارل مارکس کے بارے میں "دجال اکبر" کا لقب پڑھے گا تو اسی وقت کتاب بند کر دے گا۔ دوسری بات یہ کہ صوفی صاحب جو کچھ چاہتے ہیں اس کے حصول کی عملی شکل ان کی کسی کتاب سے واضح نہیں ہوتی اور جب تک وہ اپنے مقصد کے لیے خود عملی اقدام نہ کریں شاید اس کا سمجھنا دشوار ہی رہے گا۔ اہل علم کے لیے اس کتاب کا مطالعہ بہرحال مفید ہوگا۔

ایصالِ ثواب

مرتبہ محمد حسن منظری۔ صفحات ۸۰ گرد پوش کے ساتھ قیمت: ایک روپیہ ———
ملنے کا پتہ: مکتبہ اسلامی ادب للّہ پورہ۔ فاطمان۔ وارانسی۔ یوپی

جناب محمد حسن منظری کی یہ کتاب دلچسپ، مفید اور مؤثر ہے۔ تبصرہ نگار نے ایصال ثواب پر اب تک جتنی کتابیں پڑھی ہیں یہ ان سب میں بہتر ہے۔ فاضل مؤلف نے آسان زبان اور دلچسپ انداز میں یہ کتاب مرتب کی ہے اور جس موضوع پر لکھی ہے اس کے لیے یہی مناسب بھی ہے۔ معمولی پڑھا لکھا مسلمان بھی اس سے پورا استفادہ کر سکتا ہے۔ ایک اچھی ترتیب کے ساتھ مؤلف نے کارآمد معلومات جمع کر دی ہیں۔ انھوں نے ایصال ثواب کے موجودہ عوامی تصور اور طریقے پر ایسے انداز میں گفتگو کی ہے جس میں کوئی تلخی نہیں پائی جاتی اور عوام کی اصلاح

یہ یہی انداز ضروری ہے۔ قرآن کی آیات اور احادیث کی صحت طباعت کا بھی اہتمام کیا گیا ہے
لیے طباعت کی غلطیاں بہت کم ہیں سطا پر سَمِعْتَ کے بجائے سَمِنْتَ اور دعائیں الجنۃ کے
ے دعائیں چھپ گیا ہے۔ دعائیں کے ترجمے پر بھی مولف کو نظر ثانی کرنی چاہیے۔ اس کا ترجمہ
ت کے کیڑے" مناسب نہیں ہے۔ فاتحہ زندوں کے لیے ـــ فاتحہ زندہ ماں باپ کے لیے ـــ فاتحہ
اولاد کے لیے۔ فاتحہ خود اپنے لیے ـــ یہ عنوانات دل چسپ ہیں اور "فاتحہ" کے موجودہ تصور پر ایک
ب لگاتے ہیں۔

امید ہے کہ یہ کتاب عوام کے حلقے میں خاص طور سے پسند کی جائے گی اور اس سے فائدہ اٹھایا
ئے گا۔ (ع۔ق)

(بقیہ اشارات)

مسلم دشمنی کو چھپا کر نہیں رکھا ہے بلکہ علانیہ اس کا اظہار کرتی ہیں ورنہ جس تنظیم کے ہاتھ میں اس ملک
باگ ڈور ہے اس میں بھی ہزاروں ایسے افراد موجود ہیں جو مسلمانوں کے بارے میں ٹھیک یہی خیالات
بات رکھتے ہیں جن کی نمایندگی اوپر کے الفاظ کر رہے ہیں لیکن سیاسی مصالح کی بنا پر وہ برملا اس کا اظہار
یں کرتے ـــ وہ تو خیریت یہ ہے کہ ابھی اس ملک میں لاکھوں عوام اور بہت سے ذی اثر اور معتاد
راسیے موجود ہیں جو مسلم دشمنی کی اس چوٹی تک نہیں پہنچے ہیں اور انہیں کی وجہ سے اس ملک کی کم سے
خارجہ پالیسی مسلم دشمنی پر مبنی نہیں ہو سکی ہے ورنہ اس ملک کی حالت اس سے بھی زیادہ بری ہوتی جتنی
ہے۔ ہزار گئی گزری حالت میں بھی مسلم ممالک اس پوزیشن میں ہیں کہ ان کی دشمنی ہندوستان کو
ہ پہنچانے کے بجائے نقصان پہنچائے گی۔

اسرائیل کی بنیاد ظلم پر قائم کی گئی ہے اور برطانیہ فرانس اور امریکہ کی حمایت اس کو سہارا دیے
ئے ہے۔ ظلم کی بنیاد خود اپنے اندر ڈائنامیٹ چھپائے رکھتی ہے جو کسی وقت بھی پھٹ کر اس کو تباہ
ر سکتی ہے۔ مغربی حکومتوں نے بھی صرف اپنے مفاد کے لیے اس کو پال رکھا ہے اور مفاد سے وابستہ سہارا
بوط نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ عرب ممالک کا باہمی اختلاف و انتشار بھی اسرائیل کے وجود کو باقی رکھے ہوئے
ہے اگر وہ خلوص کے ساتھ متحد ہو کر اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں تو مغربی ممالک کی حمایت بھی زیادہ دن ل

ملک اسے تباہی سے بچا نہیں سکے گی۔ اس صورت حال میں اسرائیل کی دوستی پر عرب ممالک کی دوستی کو قربان کرنا نفع کا سودا نہیں ہے۔

ہندو مہاسبھا کی یہ ذہنیت بھارت کے لیے ایک بڑی لعنت اور مزمن مرض بنی ہوئی ہے اور افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ مرض گھٹنے کے بجائے بڑھ رہا ہے کیونکہ حکمراں جماعت اس ذہنیت کا علاج کرنے کے بجائے اپنے طرز عمل سے اس کو بڑھاوا دے رہی ہے۔ اس ذہنیت نے ہندوستان کے مسلمانوں کو بے حد جانی ومالی نقصان پہنچایا ہے اور پہنچا رہی ہے لیکن اس سے بھارت کو فائدہ نہیں بلکہ اس کی بین الاقوامی ساکھ اور نیک نامی کو نقصان پہنچ رہا ہے۔

ہندو مہاسبھا کے اس خطبۂ صدارت میں اتحاد عالم اسلامی پر بھی اندیشے کا اظہار کیا گیا ہے اور اس کے جواب میں ایک ایسا بین الاقوامی محاذ بنانے کی سفارش کی گئی ہے جو اس کا توڑ کر سکے۔ حالانکہ اتحاد اسلامی کی تحریک میں ہندوؤں کی مخالفت کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا اس لیے ہندو مہاسبھا کے اجلاس میں اس کی مخالفت آ بیل مجھے مار کی مصداق ہے۔ افسوس ہے کہ حکومت ہند کے وزیر خارجہ نے بھی اتحاد اسلامی کی کھل کر مخالفت کی ہے۔ ممکن ہے کہ اپنے دوست صدر ناصر کی تائید مقصود ہو۔ صدر ناصر، صدر ٹیٹو اور وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کی جو کانفرنس دہلی میں ہونے والی ہے شاید اس میں بھی اس پر گفتگو ہو اور باضابطہ اس کی مخالفت کا اعلان کیا جائے۔ حکومت اپنی پالیسی کو خود بہتر سمجھتی ہے لیکن ہم جیسے لوگوں کے نزدیک یہ روش ملک کے لیے مفید نہیں معلوم ہوتی۔

بھارت کے مسلمانوں کے پاس اس زہریلی ذہنیت کا تریاق موجود ہے۔ اگر وہ دنیوی مفاد کو مطمح نظر بنانے کے بجائے متحد ہو کر اللہ کی ڈوری کو مضبوطی سے تھام لیں تو وہ اپنے آپ کو بھی محفوظ کر لیں گے اور اپنے اس ملک کو بھی ترقی کی راہ پر ڈال دیں گے۔ "اتحاد" اسلام کی بنیاد ہے اور اسی کے لیے۔ یہ ہے وہ اصل تدبیر جو اس ملک میں انہیں عزت کا مقام عطا کر سکتی اور ہندو مہاسبھا کے جوش تعصب پر ٹھنڈا پانی ڈال سکتی ہے۔

جلد :- ۳۷
شمارہ :- ۲

مدیر : سید احمد قادری

- خط و کتابت و ارسال زر کا پتہ :- منیجر رسالہ "زندگی" رام پور - یوپی
- زر سالانہ :- چھ روپیہ - ششماہی :- تین روپیہ - فی پرچہ :- ۶۰ پیسے
- ——— ممالک غیر سے دس شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر

مالک :- جماعت اسلامی ہند - اڈیٹر سید احمد عروج قادری - پرنٹر پبلشر :- احمد حسن مطبع :- دہلی پرنٹنگ ورکس
مقام اشاعت :- دفتر زندگی رام پور

اشارات

(سید احمد قادری)

مرکزی وزارت داخلہ نے جماعت اسلامی ہند کے خلاف جو خفیہ سرکلر جاری کیا ہے اس پر کئی پہلوؤں اور کئی نقطہ ہائے نظر سے گفتگو کی جاسکتی ہے ۔ خود جماعت اسلامی ہند کے نقطۂ نظر سے حکومت ہند کی اس کارروائی میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے ۔ جماعت نے جس راہ کو اپنے لیے پسند کیا ہے اور جس کی طرف وہ تمام لوگوں کو دعوت دے رہی ہے اس میں اس طرح کی دہشت انگیزی نہیں متوقع اور بہت معمولی چیز ہے ۔ جماعت کے سربراہوں اور ممتاز افراد کو جیل میں ڈال کر آزمایا جاچکا ہے اور گزشتہ ہند پاک جنگ کے موقع پر تو ایک صوبے میں تمام ارکان گرفتار کیے جاچکے ہیں ۔ اب جماعت کی دعوت سے لوگوں کو ڈرانے کے لیے یہ نئی کارروائی کی گئی ہے ۔ گزشتہ زمانے کی جابر حکومتیں ہوں یا موجودہ دور کی ۔ وہ اپنی آواز سے مختلف آواز کو دبانے کے لیے سب کچھ کرتی رہی ہیں اور کر رہی ہیں اور آئندہ بھی کرتی رہیں گی ۔ جماعت اسلامی ہند تو اپنے اللہ کے حضور سراپا شکر و سپاس ہے کہ اس کے فضل و کرم نے اس کو ان آزمائشوں سے بچا رکھا ہے جن میں اسی طرح کی دعوت دینے والی دوسری جماعتیں غیر مسلم حکومتوں کے تحت نہیں بلکہ مسلم حکومتوں کے تحت مبتلا کی جاچکی ہیں ۔ مصر میں، انڈونیشیا میں، پاکستان میں اور ترکی میں اسلام اور اسلامی نظام کی طرف دعوت دینے والی جماعتوں کے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا گیا ہے ۔ مصر میں تو دار و رسن نے بھی ان کا استقبال کیا ہے اور وہاں کی حکومت نے حق پرست جماعت کے ساتھ جس سنگ دلی کا ثبوت دیا ہے اس پر جنگل کے بھیڑیے بھی شرمندہ ہوں گے ۔ پھر ہمارے لیے وجہ شکایت کیا ہے جبکہ یہ بات بھی بعید نہیں کہ اس خفیہ کے اجراء میں کچھ اعلیٰ درجے کے مشتبہ مسلمانوں کی تحریک اور ان کی خفیہ جد و جہد شریک رہی ہو ۔

ممکن ہے کہ یہ لوگ اس خفیہ سرکلر پر بھی مطمئن نہ ہوں اور اُن کی خواہش اس سے بھی آگے ہو۔ دہلی کا ایک اردو ہفتہ وار — جس کے ایڈیٹر، پرنٹر اور پبلشر خیر سے ایک مسلمان ہی ہیں اپنے ۱۹ جون کے شمارہ میں کانگرس اور جمعیۃ العلماء کی تعریف اور جماعت اسلامی و مجلس مشاورت کی مذمت کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

"اس اتوار میں ہندوستانی سیاست میں یہ ایک اہم تاریخی واقعہ رونما ہوگیا کہ نیشنلسٹ اور قوم پرور مسلمان پھر خم ٹھونک کر میدان میں آگیا۔ ہندوستان کی قدیم قوم پرست جماعت 'جمعیۃ علماء' جو حالیہ فرقہ پرستی کے چکر میں آگئی تھی۔ اب پھر اپنے تمام بدترین عناصر کو چھانٹ دینے کے بعد دوبارہ خم ٹھونک کر میدان میں آگئی ہے۔ گیا میں اس کا شاندار اجلاس ہوا جس میں پچاس ہزار مسلمانوں کا اجتماع ہوا اور جمعیۃ العلماء نیشنلسٹ مسلمان اور پرانی قوم پرور مومن کانفرنس کا متحدہ محاذ بنا .... ہندوستانی سیاست کی اس حقیقت کو بھی جس نے اب تک نہ سمجھا ہو وہ سمجھ لے کہ ہندوستانی مسلمان کا بیڑا صرف کانگریس ہی پار لگا سکتی ہے — اور قوم پرور مسلمانوں یعنی جمعیۃ العلماء وغیرہ ہی کے ذریعے بیڑا پار لگ سکتا ہے ورنہ وہ لوگ جو دراصل ہندوستان کے دشمن ہیں اور پاکستان کے ایجنٹ ہیں وہ بیڑا پار کیا لگائیں گے وہ مسلمانوں کا بلا دیچھ کریں گے۔ پہلے اپنی تو خیر منائیں ان بھیڑیوں کی فہرست تیار ہے اور ایک دن ان بھیڑیوں کی گردن ناپی جانے والی ہے۔ ان بھیڑیوں کی الگ الگ ناپ کی قبریں تیار ہیں۔

وہ دن بڑا بھیانک ہوگا۔ ڈرو اس دن سے جب ہندوستان کو جلال آئے گا اور وہ اپنے غداروں کو نیست و نابود کر دینے پر تل جائے گا۔

ان سطروں کا تجزیہ اور ان پر تبصرہ مقصود نہیں ہے دیکھنے کی اصل چیز یہ ہے کہ ان جدید خان بہادروں کے دلوں میں کیا کیا تمنائیں پرورش پا رہی ہیں اور یہ کس قسم کی سرگرمیوں میں مشغول ہیں۔

جن لوگوں کی اپنی گردنیں محفوظ نہیں ہیں وہ دوسروں کی گردنیں ناپ رہے ہیں اور جن کے لیے آگ کے گڑھے کھدے ہوئے تیار ہیں وہ دوسروں کے لیے قبریں بنا رہے ہیں جن کے اپنے نام سیاہ فہرست میں درج ہیں وہ دوسروں کے نام فہرست میں لکھوا رہے ہیں۔ وہ دوسروں کو ہندوستان کے جلال سے ڈراتے ہیں مگر اس ذات کے جلال سے غافل ہیں جو ہندوستان، پاکستان، افغانستان اور تمام دنیا کا

مالک و مختار رہے اور یہ ہندوستان کے جلال سے ڈرانے والے وہ لوگ ہیں جن کی بد اعمالیوں اور بدکرداریوں نے اس کو امریکہ اور روس کے جلال کے سامنے سرنگوں کر رکھا ہے ۔ ہندوستان کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنے والے اس سے محبت رکھنے والوں کو دھمکا رہے ہیں ۔ یہ الٹی گنگا پہلے بھی بہائی گئی ہے اور اب بھی بہائی جا رہی ہے ۔

جن لوگوں کے سامنے اپنے حلوے مانڈے کے سوا کوئی دوسرا مقصد نہیں وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ اپنے سامنے زندگی کے بلند مقاصد رکھنے والی جماعتیں اور افراد جب ان کے آقاؤں کی غراہٹ سے خوف زدہ نہیں ہوتے تو وہ ان کی میاؤں سے کیا خوف زدہ ہوں گے ۔

خفیہ سرکلر اضلاع کے ججوں کے پاس بھی بھیجا گیا ہے ۔ ہمارا خیال ہے کہ جس جج نے بھی اس کو پڑھا ہوگا اس کے لبوں پر تبسم ضرور نمودار ہوا ہوگا ۔ سب سے پہلے اس نے یہ سوچا ہوگا کہ اگر جماعت اسلامی ہند کی سرگرمیاں ملک و قوم کے لیے نقصان دہ ہیں تو پھر خفیہ سرکلر کی کیا ضرورت ۔ علانیہ طور پر عدالت میں اس کو مجرم کیوں ثابت نہیں کیا جاتا ۔۔۔ اس سرکلر میں کہا گیا ہے کہ جماعت اسلامی چند متعصب مسلمانوں پر مشتمل ایک فرقہ پرست تنظیم ہے ۔ یہ الزام پڑھ کر ہر جج کے ذہن میں کم سے کم دو سوالات پیدا ہوں گے پہلا یہ کہ چند مسلمانوں پر مشتمل ایک تنظیم کے لیے آل انڈیا خفیہ سرکلر کا مطلب کیا ہے ؟ جب یہ ایک غیر اہم تنظیم ہے تو کیا حکومت ہند خود اسے اہمیت دے کر آگے بڑھانا چاہتی ہے ؟ دوسرا سوال یہ کہ فرقہ پرست کس کو کہتے ہیں ؟ اگر حکومت نے فرقہ پرست کی کوئی تعریف متعین کر لی ہے تو اس سرکلر میں اس کا ذکر ضرور آنا چاہیے تھا تاکہ اس کو پڑھ کر اطمینان کے ساتھ جماعت اسلامی کو فرقہ پرست سمجھا جا سکتا ورنہ ہر سوچنے والا گورنمنٹ سرونٹ یہ سوچے گا کہ ملک میں مذہب کی بنیاد پر بھی، تہذیب و ثقافت کے نام پر بھی اور مختلف مقاصد کے لیے الگ الگ فرقوں کی مخصوص تنظیمیں قائم ہیں تو کیا وہ سب کی سب فرقہ پرست اور مندرجۂ فہرست ہیں ؟ اور کیا ان سب کے لیے اس طرح کے خفیہ سرکلر جاری کیے گئے ہیں اگر نہیں تو پھر جماعت اسلامی کے ساتھ یہ امتیاز کیوں برتا گیا ہے ؟

سرکلر میں کہا گیا ہے کہ جماعت اسلامی دستور ہند اور سیکولرزم کی مخالف ہے سوال پیدا ہوتا ہے کہ دستور ہند کی مخالفت کے کیا معنی ؟ کیا جماعت نے اس کی کوئی خلاف ورزی کی ہے ؟

کیا اس نے دستور ہند کی پامالی کا پیان سرِ بازار جلائی ہیں؟ کیا اس کی کسی دفعہ کو اس نے عملاً توڑ ڈالا ہے؟ اگر ان میں سے کوئی بات اس نے نہیں کی ہے اور یقیناً نہیں کی ہے ورنہ حکومت کو خفیہ سرکلر جاری کرنے کی ضرورت نہ پڑتی تو پھر اس کو دستور ہند کا مخالف کہنا زیادتی ہے یا نہیں؟ پھر وہ یہ سوچے گا کہ ہندوستان میں ایسی تنظیمیں موجود ہیں جنھوں نے سرِ بازار دستور ہند کی کاپیاں جلائی ہیں لیکن آج تک ان کے خلاف نہ اس طرح کا کوئی خفیہ سرکلر جاری ہوا نہ علانیہ۔ تو پھر وہ حکومت کے عدل و انصاف کے بارے میں کیا تصور قائم کرے گا۔ یہی حال سیکولرزم کی مخالفت کے بارے میں بھی پیدا ہوتا ہے۔

ہندوستان کے تمام رہنما جن میں مرکزی وزیر داخلہ بھی داخل ہیں یہ کہتے رہتے ہیں کہ سیکولرزم کے معنی مذہب کی مخالفت کے نہیں ہیں بلکہ ہندوستان صرف اس معنی میں سیکولر اسٹیٹ ہے کہ وہ غیر فرقہ وارانہ ہے اور ملک کے تمام شہری اس کی نظر میں مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ موجودہ صدر جمہوریہ نے کہا ہے کہ ہندوستان کے لیے سیکولر اسٹیٹ کے بجائے غیر فرقہ وارانہ اسٹیٹ کی اصطلاح استعمال کرنی چاہیے وہ سیکولرزم کی اصطلاح کا استعمال بھی پسند نہیں کرتے۔

مرکزی وزیر داخلہ اپنے سناتن دھرمی ہونے پر فخر کا اظہار بھی کر چکے ہیں۔ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ حکومت ہند جماعت اسلامی ہند کو سیکولرزم کا مخالف کس معنی میں قرار دیتی ہے۔ کیا جماعت نے یہ کہا ہے کہ حکومت کو اپنے شہریوں کے درمیان امتیاز برتنا چاہیے اور ان کو مساوی حیثیت نہیں دینی چاہیے۔ حکومت خود سیکولرزم کا جو مطلب بیان کرتی ہے جماعت جب اس کے خلاف نہیں ہے تو پھر اس کو مخالف قرار دینا زیادتی ہے یا نہیں؟ پھر وہ سوچے گا کہ اس ملک میں ایسی تنظیمیں بھی موجود ہیں جو ہندوستانی سیکولرزم کی علی الاعلان مخالفت کرتی ہیں اور یہ کہتی ہیں کہ ہندوستان ہندوؤں کا ملک ہے اور یہاں ہندو اور غیر ہندو برابر نہیں ہو سکتے لیکن آج تک ان تنظیموں کے خلاف اس طرح کا سرکلر جاری نہیں ہوا۔ اس صورت حال میں حکومت کے انصاف پر کس کا اعتماد باقی رہ جائے گا؟

اور اگر جماعت کو سیکولرزم کا مخالف اس معنی میں کہا گیا ہے کہ مثال کے طور پر وہ معنی سیکولرزم کی مخالف ہے جو مذہب کو مٹا دینا چاہتا ہے تو پھر یہ سوال پیدا ہوگا کہ اس کو الزام اور جرم کس طرح قرار دیا گیا ہے اور اگر اس معنی میں سیکولرزم کی مخالفت واقعی جرم ہے تو سب سے پہلے اس کا مجرم [illegible] کا گروہ ہے جو سیکولرزم کے مخالف مذہب [illegible] سب سے پہلے اس کو مذہب

فہرست تنظیم قرار دے کر اس کے خلاف سرکار جاری کرنا چاہیے۔ اس تجزیے سے معلوم ہوا کہ جماعت کے خلاف یہ خفیہ سرکلر خود ہندوستانی سیکولرزم کے منہ پر ایک طمانچے کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ حکومت ہند کو اتنی معقول باتیں سوچنے کی فرصت ہی نہیں ہے۔

ان بوسیدہ اور رٹے پٹائے الزامات کے بعد ــ جن کے جوابات بیسیوں مرتبہ دیے جا چکے ہیں۔ جماعت اسلامی ہند کو جو سزائیں دی گئی ہیں وہ یہ ہیں:۔

اس کے لیڈروں سے سرکاری افسران ملاقاتیں نہ کریں گے۔ اس کے ممبروں کو حکومت کی کسی سرگرمی اور پروگرام میں حصہ لینے کی اجازت نہ ہوگی۔ سرکاری ملازمین کو جماعت سے کسی طرح کا بھی تعلق رکھنے کی ممانعت کر دی گئی ہے۔ جماعت کے ممبران جو مراسلت کریں اس کو نظر انداز کر دیا جائے۔

بائی کاٹ اور ترک موالات کی یہ سزائیں اس جماعت کو دی گئی ہیں جس کا کوئی ادنیٰ ترین جرم بھی حکومت ثابت نہیں کر سکی ہے اور خفیہ سرکلر کا اجرا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ثابت کر بھی نہیں سکتی۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا۔ ہمارے اپنے نقطۂ نظر سے جرم حق پرستی کی یہ سزائیں حیرت انگیز نہیں ہیں۔ جن لوگوں کو شعب ابی طالب کی تاریخ یاد ہو وہ ان خفیہ سزاؤں پر تعجب کا اظہار کیوں کریں۔ لیکن جو شخص بھی خود دستور ہند اور ہندوستانی سیکولرزم کے نقطۂ نظر سے اس خفیہ سرکلر اور اس میں دی ہوئی سزاؤں پر غور کرے گا وہ اظہار تعجب کیے بغیر نہیں رہ سکتا کیونکہ یہ سرکلر ہندوستان کے دستور اور ہندوستانی سیکولرزم کی عین ضد ہے۔ لطیفہ یہ ہے کہ اس میں جماعت پر دستور ہند کی مخالفت کا الزام لگایا گیا ہے حالانکہ خود یہ سرکلر اس دستور کی ناقابل انکار خلاف ورزی ہے۔ اس میں جماعت پر سیکولرزم کے مخالف ہونے کا الزام عائد کیا گیا ہے۔ حالانکہ خود یہ سرکلر ہندوستانی سیکولرزم کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ ہے۔

یہ ہے وہ جمہوریت جس پر ہمارے ملکی رہنما فخر کرتے ہیں اور جس کی قصیدہ خوانی سے ان کی زبانیں کبھی نہیں تھکتیں۔ ہمارے لیے یقین کرنا سخت مشکل ہے کہ یہ سرکلر کسی ایسے شخص نے مرتب کیا ہوگا جو گاندھی جی کو اپنا لیڈر تسلیم کرتا ہو۔ یہ تو کسی ایسے شخص کا مرتب کیا ہوا معلوم ہوتا ہے جو گوڈسے کو

بتاتا ہم اتنا ہوں اس سرکلر میں عقل، انصاف، اور انسانیت کا کوئی شائبہ بھی تو موجود نہیں کس طرح
مان لیا جائے کہ یہ وزیر داخلہ کی منظوری سے جاری ہوا ہوگا جو اپنے آپ کو گاندھی جی کا سچا
پیرو سمجھتے اور دستور ہند کے وفادار ہیں۔

اس سرکلر سے واقف ہو کر ہمیں اس ملک پر ترس آنے لگتا ہے جس کے ہم باشندے ہیں جس ملک میں
خدا پرستی، نیکی اور اخلاق کا پرچار بھی جرم بن جائے اس ملک کا حال کیا ہوگا۔

تم جماعت اسلامی کی آواز کو دبا سکو تو دبا دو لیکن خدا کے بندو! کبھی یہ بھی تو سوچو کہ تم کس آواز
کو دبانا اور کن زبانوں پر قفل ڈالنا چاہتے ہو۔ تمہارا پنجۂ جبر کن گردنوں کی طرف بڑھ رہا ہے —
کیا واقعی تم اب تک یہ نہیں جان سکے کہ جماعت اسلامی ہند کیا کہتی اور کیا کرتی ہے۔ یہ جماعت اس
وقت سے کام کر رہی ہے جب ہم اور تم انگریزوں کی غلامی سے آزاد بھی نہ ہوئے تھے اور جب اللہ
نے تمہیں یہ تختِ حکومت دیا بھی نہ تھا۔ کیا اس وقت سے لے کر آج تک اس کا پیغام تم پر مخفی ہی رہا۔
کیا واقعی تم وحدت اللہ اور وحدت آدم کے پیغام کو اس درجہ ناپسند کرتے ہو کہ اس کو دبانے کے
لیے تم نے کمر کس لی ہے؟ اچھی طرح سوچ لو کہ اس کو دبا کر تم اس ملک کی دوستی کا حق ادا کرو گے یا اس سے
دشمنی کا ثبوت دو گے جس نے اپنی باگ ڈور تمہارے ہاتھوں میں دے رکھی ہے۔

اب میں چند لفظ اپنے آپ سے اور جماعت اسلامی ہند کے تمام ارکان سے کہنا چاہتا ہوں۔
— یہ بات محتاج تشریح نہیں ہے کہ ہمارا ملک انتشار اور طوائف الملوکی کے جس دور سے گزر رہا
ہے اس میں کوئی حادثہ مستبعد نہیں۔ آج یہ سرکلر خفیہ ہے۔ کل علانیہ ہو سکتا ہے۔ بلکہ اس سے بھی آگے
کی کوئی بات رونما ہو سکتی ہے۔ اس لیے اس سرکلر کو نظر انداز کرنے کے بجائے ہمیں اس کو اپنی سرگرمیوں کے
لیے مہمیز سمجھنا چاہیے۔ ہمیں اس عہد کی تجدید کرنی چاہیے جو ہم نے اللہ رب العٰلمین سے کیا ہے اور ہمیں ہر
وقت اپنے آقا و مولیٰ سے حق پر استقامت کی دعا مانگتے رہنا چاہیے۔ ہم نے عہد کیا ہے کہ نازک سے
نازک حالات میں بھی اللہ کا بھیجا ہوا پیغام دوسروں تک پہنچاتے رہیں گے اور زندگی کے آخری لمحے
تک اس کے دین کو سربلند کرنے کی جدوجہد میں لگے رہیں گے۔ یہ ایک ڈیوٹی ہے جس پر اس نے ہمیں اور
تمام مسلمانوں کو مقرر کیا ہے۔ یہ ایک فریضہ ہے جو اس نے ہم پر عائد کیا ہے۔ اس سے منہ موڑنے کا

کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ مصیبتیں ہر راہ میں آتی ہیں اور موت اپنے وقت پر ہر جگہ استقبال کرتا ہے
خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں مصیبتیں اٹھاتے اور اسی کی راہ میں اپنی جان دیتے ہیں۔
ہمیں اپنے عہد کی پابندی کا، اپنے عزم کی استواری کا اور اپنے اخلاق و کردار کی بلندی کا ثبوت
دیتے رہنا ہے کیونکہ مجرد دعوے خدا کے نزدیک قابل قبول نہیں۔

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ یُّتۡرَکُوۡۤا	کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس
اَنۡ یَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا وَ هُمۡ لَا یُفۡتَنُوۡنَ	اتنا کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ "ہم ایمان
وَ لَقَدۡ فَتَنَّا الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ	لائے" اور ان کو آزمایا نہ جائے گا؟ حالانکہ
فَلَیَعۡلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِیۡنَ صَدَقُوۡا	ہم ان سب لوگوں کو آزما چکے ہیں جو ان
وَ لَیَعۡلَمَنَّ الۡکٰذِبِیۡنَ ۝	سے پہلے گزرے ہیں۔ اللہ کو تو ضرور یہ دیکھنا
	ہے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون

۸ رجولائی ۱۹۶۶ء

باطل کی اطاعت کا نتیجہ

اے ایمان لانے والو! اگر تم ان لوگوں کے اشاروں پر چلو گے جنھوں نے کفر کی راہ اختیار
کی ہے تو وہ تم کو الٹا پھیرلے جائیں گے اور تم نامراد ہو جاؤ گے۔ (آل عمران آیت ۱۴۹)

اہل کفر پر یہ بات کھل رہی ہے کہ تم دین اسلام پر کیوں ایمان لائے ہو اور اس کی طرف دنیا کو
دعوت کیوں دیتے ہو۔ پس جب تک وہ اپنے کفر پر اڑے ہوئے ہیں اور تم اس دین پر قائم ہو تمہارے
اور ان کے درمیان صفائی کسی طرح نہ ہو سکے گی اور ایسے دشمنوں کو تم معمولی دشمن بھی نہ سمجھو جو تم سے
مال و زر یا زمین چھیننا چاہتا ہے وہ کمتر درجے کا دشمن ہے مگر جو تمہیں دین حق سے پھیرنا چاہتا ہو وہ
تمہارا بدترین دشمن ہے۔ کیونکہ پہلا صرف تمہاری دنیا ہی خراب کرتا ہے لیکن دوسرا تمہیں آخرت کے ابدی
عذاب میں دھکیل دینے پر تلا ہوا ہے۔

شرکت اور مضاربت کے شرعی اصول

جناب محمد نجات اللہ صدیقی

شعبہ معاشیات مسلم یونیورسٹی۔ علی گڈھ

دور جدید میں اسلامی معاشیات کے موضوع پر لکھنے والے اس بات پر متفق ہیں کہ اسلام میں سود کی حرمت کے پیش نظر بنک کاری کے نظام کی نئی تنظیم شرکت اور مضاربت کی بنیادوں پر کرنی ہوگی۔ جدید معیشت میں بنک جو اہم مقام رکھتے ہیں وہ کسی دلیل کا محتاج نہیں۔ بڑے پیمانے پر سرمایے کو بچت کرنے والوں سے جمع کر کے کاروبار کرنے والوں کو فراہم کرنا، امانتیں رکھنا، اہل ضرورت کو قرضے دینا، نیز عام افراد اور کاروباری طبقے کی بہت سی خدمات معمولی معاوضہ پر انجام دینا، بنکوں کے عام وظائف ہیں۔ اس کے علاوہ بنکوں کے ذریعہ زر کی تخلیق اور کریڈٹ کی فراہمی کا اہم معاشی کام بھی انجام پاتا ہے۔ کسی معیشت میں زر کی مجموعی رسد کے گھٹنے یا بڑھنے میں بنکوں کے طرز عمل کو بڑا دخل حاصل ہے اور اس کا اثر اشیاء کے نرخ، صنعت و تجارت اور عام معاشی سرگرمیوں نیز روزگار اور آمدنیوں کی سطح پر بھی پڑتا ہے۔ اس اہمیت کے پیش نظر ضروری ہے کہ تفصیل کے ساتھ یہ واضح کیا جائے کہ شرکت اور مضاربت کی بنیادوں پر نظام بنک کاری کو اس طرح منظم کیا جا سکتا ہے کہ وہ مذکورہ بالا وظائف کو بسہولت انجام دے سکے اور اس کا مجموعی عمل ان خرابیوں سے پاک ہو جو سودی نظام بنک کاری سے وابستہ ہو گئے ہیں۔ ہمارا ارادہ ہے کہ آئندہ اوراق میں غیر سودی نظام بنک کاری کا ایک خاکہ پیش کریں لیکن ایسا کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شرکت اور مضاربت کے شرعی احکام بیان کر دیے جائیں۔ پیش نظر مقالہ اسی ضرورت کی تکمیل کے لیے لکھا گیا ہے۔

اس مقالے میں شرکت اور مضاربت کے تمام فقہی احکام کا احاطہ نہیں کیا گیا ہے بلکہ صرف ان ضروری

تفصیلات پر بحث کی گئی ہے جن کا بنکوں کی تنظیم نو سے گہرا تعلق ہے۔ جو لوگ مزید تفصیلات کا مطالعہ کرنا چاہیں انہیں ان فقہی مآخذ کی طرف رجوع کرنا چاہیے جن کے حوالے اس مقالے میں دیے گئے ہیں۔ یہ مقالہ اور اس کے بعد غیر سودی نظام بنک کاری کا جو خاکہ پیش کیا جائے گا، اہل علم کے غور و فکر کے لیے پیش کیا جا رہا ہے تاکہ ان کے بحث و مشورے سے مسئلے کا کوئی قابل اطمینان حل نکل سکے۔ ہر قاری کو اس سلسلۂ مضامین کی اس نوعیت کو سامنے رکھنا چاہیے۔ ہمیں امید ہے کہ ہر قاری اصل مسئلے پر سوچنے اور اجتماعی غور و فکر کے ذریعے غیر سودی نظام بنک کاری کا ایک قابل اطمینان نقشہ طے کرنے کی اس کوشش میں حصہ لے گا جس کی تحریک اس مقالے کے ذریعے کی جا رہی ہے۔

شرکت اور مضاربت کے شرعی اصولوں کی وضاحت میں ہم نے اسلامی فقہ کے چاروں مشہور مکاتب حنفی، مالکی، شافعی، اور حنبلی کی مستند کتابوں کو سامنے رکھا ہے۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ نظام بنک کاری کی تنظیم نو کے لیے شرکت اور مضاربت کے سلسلے میں ایسی رایوں کو بنیاد بنائیں جو ان مکاتب فقہ کے درمیان متفق علیہ ہوں یا جن پر زیادہ سے زیادہ اتفاق رائے میسر آسکے۔ البتہ جن امور کے سلسلے میں خود قرآن و سنت نے کوئی متعین ضابطہ نہیں دیا ہے۔ ان میں زمانے کی تبدیلی اور نت نئی ضرورتیں پیدا ہونے کی وجہ سے بسا اوقات دوسری یا تیسری صدی ہجری کے مرتب کردہ فقہی احکامات کو من و عن قبول کرنے کی بجائے ان میں مناسب ترمیم و تبدیلی منشاء شریعت کے زیادہ مطابق ہو سکتی ہے۔ اسی حقیقت کے پیش نظر چند مسائل میں ہم نے ایسی رائیں بھی اختیار کی ہیں جو ان فقہاء نے نہیں اختیار کی تھیں۔ ایسے مواقع پر جو بہت ہی کم ہیں، ان شرعی اصولوں اور شرعاً معتبر مصالح کا حوالہ دیا گیا ہے جو اس نئی رائے کی بنیاد بنے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ اہل علم ان رایوں پر تنقیدی نگاہ ڈالیں گے اور ان کے بارے میں مشورہ دے کر منشاء شریعت کی تلاش میں ہماری مدد کریں گے۔

شرکت اور مضاربت کا جواز

جب نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو انسانوں کے درمیان تجارت و زراعت اور صنعت و حرفت کے مختلف طریقے رائج تھے۔ نبیؐ کے لیے نہ اس کی ضرورت تھی، نہ یہ آپ کا منصب تھا کہ انسانوں کو دنیوی کاروبار کے طریقے از سر نو سکھائے۔ بلکہ ان طریقوں میں جو باتیں اخلاقی معیاروں سے گری ہوئی یا عدل و انصاف کے

بیع حاضر باد، ملامسہ و [illegible] وغیرہ اور دھوکہ فریب سے ممانعت اور
کاروباری معاہدوں میں فریقین کی رضامندی کی شرط تو قرآن میں موجود ہے۔ غرر کی مختلف صورتوں
کی روک تھام، معاہدے میں ایسے عدم تعین اور لاعلمی (جہل) کو جو جھگڑے کی بنیاد بن سکتی ہو ممنوع قرار
دینا، ایسی چیز کو فروخت کرنے کی ممانعت جس کا فروخت کنندہ مالک نہ ہو اور کسی معاہدے کو ایسی شرائط
کا پابند کرنے سے روکنا جن سے کسی فریق کے حق میں اس معاہدے کا فائدہ ختم ہو جاتا ہو، احادیث
سے ثابت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کاروبار کی جن شکلوں سے منع کر دیا یا ان شکلوں میں
جو ترمیمیں لازمی قرار دیں ان کے تجزیے سے فقہاء نے ان مصالح کا پتہ لگایا جن کا تحفظ شریعت
کی نگاہ میں ضروری ہے اور ان مفاسد کو متعین کیا جن کا سدباب شریعت کو مطلوب ہے۔ انھوں نے
دوسرے تمام معاملات میں بھی ان مصالح کا لحاظ اور انھیں ان مفاسد سے پاک رکھنا ضروری قرار دیا
کاروبار کے جو طریقے ان مصالح سے ہم آہنگ اور ان مفاسد سے پاک نظر آئے ان کو انھوں نے جائز
قرار دیا۔ اگر کاروبار کے کسی طریقے کو خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمایا، یا وہ طریقہ آپ
کے زمانے میں رائج تھا مگر آپ نے نہ اس سے روکا نہ اس میں کوئی ترمیم کی، یا کسی مروجہ طریقے پر اگر
آپ نے پسندیدگی کا اظہار فرمایا تو یہ ان طریقوں کے جواز یا پسندیدگی کی سند قرار پایا۔ کاروباری
امور کے بارے میں فقہ اسلامی کی تفصیلات اسی طور پر مرتب کی گئی ہیں۔

کاروباری معاملات کی یہ نوعیت عبادات سے بالکل مختلف ہے جن کے طور طریقے ہدایت الٰہی
کے تحت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانوں کو از سر نو سکھلائے۔ یہ طریقے اپنی اسلامی تفصیلات کے
ساتھ پہلے سے نہیں رائج تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اکثر تفصیلات اللہ کی کتاب میں درج ہیں یا نبی کریم
صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور عملی نمونے کے ریکارڈ میں محفوظ ہیں۔ نوعیت کے اس فرق کا ایک
عملی نتیجہ یہ ہے کہ عبادات سے متعلق جس قدر تفصیلی احکام ملتے ہیں فقہ اسلامی کے اولین مآخذ میں معاملات
سے متعلق اتنے تفصیلی احکام نہیں ملتے۔ مزید برآں عبادات کا تعلق ایسے انسانی اعمال سے ہے جن
پر زمانہ اور حالات کی تبدیلی کا زیادہ اثر نہیں پڑتا۔ مگر کاروبار کے طور طریقوں کا تمدنی ترقی اور
آلات و وسائل کے بدلنے کے ساتھ تبدیل ہونا ناگزیر ہے۔ کاروباری معاملات اور ان کے بارے
میں شرعی احکام کے اس پس منظر کو ہمیشہ نظر کے سامنے رکھنا چاہیے۔

شرکت اور مضاربت کاروباری معاہدوں کی وہ شکلیں ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت رائج تھیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانوں کی ہدایت فرمائی، ان کو مکارم اخلاق کی تعلیم دی، حدود الٰہی سے آگاہ کیا اور ایک ایسی سوسائٹی برپا کی جس میں عدل و قسط قائم کیا گیا آپ نے ایک ایسی سٹیٹ کا پورا نظم عرصہ تک چلایا جس میں انسانی زندگی کے اجتماعی شعبوں کو اللہ کی مرضی کے مطابق منظم کیا گیا۔ اس پورے عرصے میں شرکت اور مضاربت کے طریقے رائج رہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظروں کے سامنے آپ کے تربیت یافتہ رفقا نے یہ طریقے اختیار بھی کیے۔ آپ نے ان طریقوں سے روکا نہیں بلکہ ان پر اظہار پسندیدگی فرمایا ان میں سے بعض طریقے آپ نے خود بھی اختیار کیے تھے۔ یہی بات ان طریقوں کے جواز کی سب سے بڑی دلیل ہے۔[1] ذیل میں اس اجمال کی تفصیل کے لیے چند احادیث و آثار پیش کیے جا رہے ہیں

سائب بن شریک کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکے میں تجارت میں شرکت کی تھی۔ مدینے میں ان سے ملاقات ہوئی تو آپ نے اس کا ذکر فرمایا اور اس شرکت کو پسندیدگی کے ساتھ یاد فرمایا۔[2]

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب تک دو شرکا میں سے کوئی ایک دوسرے کے ساتھ خیانت نہ کرے میں ان دونوں کا تیسرا ساتھی بن جاتا ہوں۔[3]

روایت ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے کہا کہ میں بازاری کاروبار کرتا ہوں اور میرا ایک شریک مسجد میں نماز پڑھتا رہتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شاید تیرے کاروبار کی برکت اسی کے سبب ہے۔[4]

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جس نے تین لڑکیوں کی پرورش کی وہ مثل قیدی کے ہے۔ لہٰذا اے اللہ کے بندو! اس کے ساتھ مضاربت کرو اسے قرض دو۔[5]

---

[1] شمس الدین السرخسی :۔ المبسوط، جلد ۱۱ ص ۱۵۱ اور جلد ۲۲ ص ۱۹

[2] ایضاً جلد ۱۱ ص ۱۵۱ مطبعہ سعادہ ۔ مصر۔ طبع اول

[3] ابوداؤد : سنن ۔ کتاب البیوع۔ باب الشرکۃ ۔ اس حدیث کو حاکم اور بیہقی نے بھی روایت کیا ہے۔ بحوالہ محمد المدنی۔ کتاب الاتحافات السنیہ فی الاحادیث القدسیہ ۔ حیدر آباد ۱۳۲۳ھ

[4] سرخسی : المبسوط جلد ۲۲ ص ۱۵۱

[5] ایضاً ص ۱۹

حضرت عباس بن عبدالمطلب چند مخصوص شرائط کے ساتھ مضاربت کرتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم ہوا تو آپ نے اظہار پسندیدگی فرمایا[1]

حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ بھی انہی شرائط کے ساتھ مضاربت کرتے تھے[2]

ابو نعیم راوی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت سے پہلے حضرت خدیجہ رض کے مال کو مضاربت کے طور پر حاصل کر کے شام میں تجارت کی۔[3]

ابن ماجہ کی روایت ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ مضاربت میں برکت ہے[4] حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مضاربت کا طریقہ اختیار کیا تھا[5]۔ اور قاسم بن محمد روایت کرتے ہیں کہ ہمارا کچھ سرمایہ حضرت عائشہ رض کے پاس جمع تھا جو اسے مضاربت کے طور پر کاروبار کے لیے دیا کرتی تھیں[6] حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی زید بن خلیدہ کے ساتھ مضاربت کی تھی[7] اور آپ نے بیت المال کی جانب سے بھی مضاربت کا طریقہ اختیار کیا تھا[8] نیز آپ سے یہ بھی مروی ہے کہ آپ یتیموں کا مال مضاربت کے اصول پر کاروبار کے لیے دیتے تھے تاکہ اس میں اضافہ ہو[9]

ان احادیث و آثار سے شرکت اور مضاربت کا جواز تو واضح ہو گیا لیکن ان معاہدوں سے متعلق تفصیلی احکامات نہیں سامنے آئے۔ یہ تفصیلات فقہائے اسلام نے مرتب کی ہیں۔ یہ کام انہوں نے ابتدائی دور میں اسلامی سوسائٹی میں شرکت اور مضاربت کے مروجہ طریقوں کو سامنے رکھ کر ان اصولوں کے مطابق کیا ہے جو کاروباری معاملات کے سلسلے میں قرآن و سنت سے مستنبط کیے گئے ہیں جیسا کہ

---

1 سرخسی : المبسوط جلد ۲۲ ص ۱۸

2 ایضاً ص ۱۹

3 علی الخفیف : الشرکات فی الفقہ الاسلامی ۔ ص ۲۲ طبع دار النشر للجامعات المصریہ، قاہرہ ۱۹۶۲

4 ایضاً

5 سرخسی : المبسوط جلد ۲۲ ص ۱۸

6 ایضاً ص ۱۸

7 ایضاً ص ۱۸

8 امام مالک : موطا ۔ کتاب القراض

9 سرخسی : المبسوط جلد ۲۲ ص ۱۸

ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں ۔

شرکت اور مضاربت کے جواز کی دلیل کے طور پر ہمارے فقہاء نے اس بات پر زور دیا ہے کہ اہم انسانی مصالح کے تحفظ کے لیے ان طریقوں کا جواز ضروری ہے ۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی کے پاس سرمایہ ہو مگر وہ کاروبار نہ کر سکتا ہو ۔ اسی طرح بہت سے افراد ایسے ہوتے ہیں جو کاروبار کرنا چاہتے ہیں مگر ان کے پاس سرمایہ نہیں ہوتا ۔ مضاربت کے ذریعے یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ دونوں افراد باہمی تعاون سے ایک مشترکہ مقصد حاصل کر سکیں [1] اسی طرح یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دو اصحاب سرمایہ الگ الگ کاروبار کرنے کی بجائے مل کر کام کرنے کو نفع کمانے کا زیادہ موثر طریقہ سمجھتے ہوں ۔ شرکت ان کے درمیان تعاون ممکن بنا دیتی ہے ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک صاحب سرمایہ نہ صرف یہ کہ خود کاروبار نہ کر سکتا ہو بلکہ اچھے کاروباری فریق کے انتخاب کے لیے بھی کسی دوسرے فریق کو زیادہ موزوں خیال کرتا ہو ۔ یہ دوسرا فریق اپنے علم و تجربے اور کاروباری امور میں مہارت کے سبب کسی کاروباری فریق سے مضاربت کا معاہدہ کرنے کے لیے زیادہ موزوں ہو ۔ ایسی صورت میں اگر صاحب سرمایہ اس فریق کو مضاربت کے اصول پر سرمایہ دے اور یہ فریق اس سرمایے کو کسی کاروباری فریق کو مضاربت کے طور پر دے تو ان تینوں افراد کے درمیان تعاون کی راہ کھل جاتی ہے ۔ مضاربت اور مضاربت کی یہ صورت سب کے لیے مفید ہے اور اس میں کوئی خلاف شرع بات نہیں پائی جاتی ۔ اس صورت کے جواز پر فقہی سند آئندہ پیش کی جائے گی ۔ یہاں اس کا ذکر صرف مذکورہ بالا دلیل کی مناسبت سے کیا گیا ہے اور اس وجہ سے بھی کہ یہ غیر سودی نظام بنک کاری کے اس خاکے میں کلیدی اہمیت کی حامل ہے جو ہم آئندہ تجویز کریں گے ۔

شرکت اور مضاربت کی تعریف

اسلامی قانون کے چار مشہور اسکولوں میں سے مالکی اور حنبلی اسکول کے نزدیک مضاربت بھی شرکت ہی کی ایک شکل ہے ۔ حنفی فقہاء بھی مضاربت کی بعض ایسی صورتوں کو جائز سمجھتے ہیں جو عملاً شرکت سے جا ملتی ہیں ۔ چونکہ ہمارے اصل موضوع کے لیے شرکت اور مضاربت کے علیحدہ تجزیے کی ضرورت نہیں اس لیے ذیل میں دونوں کا مطالعہ ساتھ ہی کیا جائے گا اور جہاں ضرورت ہوگی دونوں کا فرق

---

[1] السرخسی : المبسوط جلد ۲۲ ص ۱۹

ختم کر دیا جائے گا۔ اس مطالعے کی ابتدا کے طور پر شرکت اور مضاربت کی مندرجہ ذیل تعریفوں کو سامنے رکھنا مفید ہوگا۔ اس تعریف میں اور اس پورے مقالے میں شرکت کا لفظ ان معنے میں استعمال کیا گیا ہے جسے حنفی فقہاء شرکت عنان[1] سے تعبیر کرتے ہیں۔ حنبلی اور شافعی فقہاء بھی اس اصطلاح سے یہی معنی مراد لیتے ہیں۔ البتہ مالکی فقہاء اس معنی کی تعبیر شرکت مفاوضہ کی اصطلاح سے کرتے ہیں۔ اس مقالے میں شرکت سے وہ معاہدہ مراد ہے جسے حنفی فقہاء شرکت عنان اور مالکی فقہاء شرکت مفاوضہ کہتے ہیں۔

شرکت یہ ہے کہ دو یا دو سے زائد افراد کسی کاروبار میں متعین سرمایوں کے ساتھ اس معاہدے کے تحت شریک ہوں کہ سب مل کر کاروبار کریں گے اور کاروبار کے نفع و نقصان میں متعین نسبتوں کے ساتھ شریک ہوں گے۔

مضاربت یہ ہے کہ ایک فریق سرمایہ فراہم کرے اور دوسرا اس سرمایے سے کاروبار کرے اس معاہدے کے تحت کہ اسے کاروبار کے نفع میں ایک متعین نسبت سے حصہ ملے گا۔

مضاربت کی صورت میں بھی مال فراہم کرنے والے اور کاروبار کرنے والے متعدد افراد ہو سکتے ہیں۔ یعنی سرمایہ چند افراد مل کر فراہم کریں اور اس سے چند آدمی مل کر کاروبار کریں، یا سرمایہ ایک فرد کا ہو اور اس سے چند افراد مل کر کاروبار کریں یا چند افراد مل کر سرمایہ فراہم کریں اور اس سرمایے سے ایک فرد کاروبار کرے۔ یہ سب صورتیں جائز ہیں[2]۔

---

[1] فقہی تعریف اور وجہ تسمیہ کے لیے ملاحظہ ہو۔

علاء الدین ابوبکر بن مسعود کاسانی : بدائع الصنائع جلد ۶ ص ۵۸ ۔ مطبعہ جمالیہ مصر ۱۳۲۸ھ

[2] علی الخفیف : الشرکات فی الفقہ الاسلامی ص ۹۷ دار النشر للجامعات المصریۃ قاہرہ ۱۹۶۲ء۔ اس بیان کی سند کے حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی فقہ کے مندرجہ ذیل مآخذ کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔

شمس الدین السرخسی : المبسوط جلد ۲۲ ص ۱۲۳-۱۲۷ مطبعہ سعادہ۔ مصر۔ طبع اول

احمد الدردیر : الشرح الصغیر جلد ۲ ص ۲۵۲ (علی ہامش بلغۃ السالک لاقرب المسالک للشیخ احمد الصاوی) مصطفیٰ البابی مصر ۱۳۷۲ھ

محمد الشربینی الخطیب : مغنی المحتاج جلد ۲ ص ۳۱۰ ۔ دار احیاء الکتب العربیہ مصر ۱۳۵۲ھ

شرکت کی صورت میں یہ لازمی نہیں کہ ہر شریک عملاً بھی کاروبار کرنے میں حصہ لے۔ البتہ کسی شریک کو کاروبار میں عملی حصہ لینے سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ اصولاً اسے یہ حق حاصل رہے گا خواہ وہ عملاً حصہ لے یا نہ لے[1]

باہمی رضامندی سے یہ بھی ممکن ہے کہ سرمایہ چند افراد مل کر فراہم کریں اور کاروبار ان میں سے ایک یا چند افراد کریں یا سرمایہ ایک آدمی کا ہو لیکن کاروبار کئی افراد مل کر کریں جن میں سرمایہ فراہم کرنے والا فرد بھی شامل ہو۔

اب ہم شرکت اور مضاربت سے متعلق بعض اصولی احکام بیان کریں گے۔ سارے احکام کا احاطہ نہیں کیا جائے گا بلکہ صرف ان احکام کا ذکر کیا جائے گا جو ہمارے اصل موضوع میں غیر سودی نظام بنک کاری سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ ان احکام کی ترتیب میں بھی موضوع کے تقاضوں کو رہنما بنایا گیا ہے۔ سارے ضروری احکام کو بیان کرنے کے بعد ہر حکم کی فقہی سند الگ الگ بیان کی جائے گی۔

شرکت اور مضاربت کے احکام

(الف) نفع کی تقسیم اور نقصان کی ذمہ داری

۱۔ نقصان نام ہے اصل سرمایہ کے ڈوب جانے والے حصے کا۔ لہٰذا نقصان ہمیشہ کاروبار میں لگے ہوئے سرمایوں پر ان کی مقداروں کی نسبت سے تقسیم کیا جائے گا اور اسے ان سرمایوں کے مالک برداشت کریں گے۔

اس سے لازم آتا ہے کہ کوئی سرمایہ لگانے والا فریق کاروبار میں نقصان ہونے کی صورت میں نقصان برداشت کرنے کی اس ذمہ داری سے نہیں بچ سکتا جو اس کے لگائے ہوئے سرمایے کی نسبت سے اس کے سر آتی ہو۔ نیز یہ کہ جس فریق نے کاروبار میں سرمایہ نہ لگایا ہو اس کو کاروبار کا نقصان نہ برداشت کرنا ہو گا۔

۲۔ نفع کی تقسیم شرکاء کاروبار کے درمیان باہم طے کردہ نسبتوں سے ہو گی۔ نفع میں ہر فریق کا حصہ لازماً نسبت یا فی صدی کی صورت میں طے کیا جانا چاہیے۔ کسی فریق کے لیے کوئی متعین رقم نہیں طے کی جا سکتی۔

---

[1] علی الخفیف: الشرکات فی الفقہ الاسلامی ص۲۲ تا ص۲۴

۳۔ مسلسل جاری کاروبار میں نقصانات کی تلافی نفع سے کی جاتی رہے گی۔ تاہم اگر کاروبار ختم کرکے حسابات صاف کرلیے جائیں۔ حساب فہمی کے وقت پہلے اصل سرمایہ علیحدہ کیا جائے گا۔ تب جو رقم فاضل ہو وہ نفع قرار پائے گی اور کمی واقع ہونے کی صورت میں کمی کی مقدار نقصان قرار پائے گی۔

۴۔ کاروبار کے نفع کے حق دار نفع کے مالک اس وقت قرار پائیں گے جب اصل سرمائے اصحاب سرمایہ کو واپس مل جائیں۔ خواہ اپنے سرمایوں پر ان کا قبضہ عملاً ہو یا صرف قانوناً۔

(ب) شرکاء کار کے کاروباری تصرفات

(۵) ایک شریک دوسرے شرکاء کی اجازت سے کاروبار کے لیے دوسرے افراد سے شرکت یا مضاربت کے معاہدے کے تحت مزید سرمایہ حاصل کرسکتا ہے اور شرکت کے مال کے ایک حصے کو کسی دوسرے فریق کو مضاربت یا شرکت کے معاہدے کے تحت کاروبار کرنے کے لیے دے سکتا ہے۔

۶۔ مضاربت کے معاہدے کے تحت سرمایہ حاصل کرکے کاروبار کرنے والا فریق سرمایے کے مالک کی اجازت عام کے تحت، یا مخصوص طور پر اس امر کی اجازت حاصل کرکے، کاروبار مضاربت میں اپنا ذاتی سرمایہ بھی شامل کرسکتا ہے۔ اور دوسرے افراد سے مضاربت یا شرکت کے معاہدے کے تحت مزید سرمایہ حاصل کرکے بھی کام میں لاسکتا ہے۔ اسے یہ حق بھی حاصل ہے کہ مالک کی اجازت سے مضاربت کے مال کو کسی دوسرے فریق کو مضاربت کے معاہدے کے تحت کاروبار کے لیے دے یا اس مال کے ذریعہ کسی دوسرے کے ساتھ شرکت کا معاہدہ کرے۔

۷۔ کوئی شریک یا مضاربت پر مال لے کر کاروبار کرنے والا فریق، دوسرے شرکاء یا صاحب سرمایہ کی صریح اجازت کے بغیر شرکت یا مضاربت کے سرمایے میں سے دوسرے افراد کو قرض نہیں دے سکتا نہ دوسرے افراد سے قرض سرمایہ حاصل کرکے اس کاروبار میں لگا سکتا ہے۔

۸۔ شرکت میں ہر شریک اور مضاربت میں کاروباری فریق کاروبار کے سلسلے میں ادھار فروخت کا اختیار رکھتا ہے۔ الا یہ کہ اسے دوسرے شرکاء یا صاحب سرمایہ ایسا کرنے سے منع کردیں۔ مشترکہ کاروبار کی جانب سے ادھار خریدی جانے والی اشیاء اور خدمات کی قیمت کاروبار کی مالیت سے زیادہ نہ ہونی چاہیے۔ اس سے زیادہ ادھار مال خریدنے کا اختیار دوسرے شرکاء یا صاحب سرمایہ کی اجازت سے ہی حاصل ہوسکتا ہے۔ اجازت کے بعد اگر کسی فریق نے کاروبار کی جانب سے ادھار

مال خریدا ہوا اور کاروبار کا سرمایہ اس مال کی قیمت ادا کرنے کے لیے کافی نہ ہو۔

تو وہ اس کی قیمت ادا کرنے میں دوسرے فریقوں کے ساتھ برابر کا ذمہ دار

(ج) شرکا کار کی مالی ذمہ داری

۹۔ شرکت میں کوئی شریک دوسرے شرکا رکی اٹھائی ہوئی مالی ذمہ داریوں کا کفیل (ضامن) نہیں ہوتا الا یہ کہ یہ ذمہ داری تمام شرکا رکی اجازت سے مشترکہ کاروبار کی جانب سے اٹھائی گئی ہو۔ مضاربت میں سرمایہ فراہم کرنے والے فریق کی مالی ذمہ داری اس کے فراہم کردہ سرمایے کی حد تک محدود ہوگی الا یہ کہ اس نے اپنی جانب سے قرض لینے یا ادھار خریدنے کی اجازت دے کر اس ذمہ داری کو مزید وسعت دی ہو۔

(د) مدت کاروبار

۱۰۔ شرکت یا مضاربت کے معاہدے کو کوئی فریق کسی وقت بھی فسخ کر سکتا ہے۔ اگر فریقوں کی تعداد دو سے زائد ہو تو باقی فریقوں کے حق میں معاہدہ قائم رکھا جا سکتا ہے۔

۱۱۔ شرکت یا مضاربت کا معاہدہ متعین مدت کے لیے بھی کیا جا سکتا ہے۔

۱۲۔ شرکت یا مضاربت کا معاہدہ کسی ایک فریق کی موت سے ختم ہو جاتا ہے۔ اگر فریقوں کی تعداد دو سے زائد ہو تو باقی فریقوں کے حق میں معاہدہ قائم رکھا جا سکتا ہے۔

مذکورہ بالا احکام میں سے اکثر چاروں فقہی مکاتب کے درمیان متفق علیہ ہیں۔ البتہ بعض احکام کے بارے میں مختلف مکاتب فقہ کے درمیان جزئی یا بنیادی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ اب ہم ہر حکم کے سلسلے میں فقہاء کی تصریحات پیش کریں گے۔ جہاں اختلاف پایا جاتا ہے اسے بیان کریں گے اور واضح طور پر بتائیں گے کہ آئندہ مباحث میں ہم نے کس رائے کو کن وجوہ سے ترجیح دی ہے۔

مشترکہ کاروبار میں نفع کی تقسیم اور نقصان کی ذمہ داری

نقصان کی ذمہ داری

(۱) نقصان نام ہے اصل سرمایہ کے ڈوب جانے والے حصے کا۔ لہذا نقصان ہمیشہ کاروبار میں لگے ہوئے سرمایوں پر ان کی مقداروں کی نسبت سے تقسیم کیا جائے گا اور اسے ان سرمایوں کے

مالک برداشت کریں گے۔

یہ اصول کہ مشترکہ کاروبار میں خواہ یہ اشتراک مضاربت کے اصول پر مبنی ہو یا شرکت کے اصول پر، نقصان ہونے کی صورت میں یہ نقصان اصحاب سرمایہ کو اپنے لگائے ہوئے سرمایوں کی نسبت سے برداشت کرنا ہوگا۔ فقہ اسلامی کے تمام مکاتب کے درمیان متفق علیہ ہے۔ سنی فقہ کے چار مشہور اسکولوں کے علاوہ شیعہ فقہ کے تمام اسکول بھی اس پر متفق ہیں۔ استاذ علی الخفیف لکھتے ہیں:۔

"کمی یا نقصان کو ہمیشہ اصل سرمایہ کے مطابق تقسیم کیا جائے گا۔ تمام ائمہ اختلاف مسلک کے باوجود اس اصول پر متفق ہیں۔ اس اصول کے خلاف طے کی ہوئی شرط فاسد قرار پائے گی اور نافذ نہ کی جاسکے گی۔"[1]

"اگر (کاروبار میں) نقصان ہو تو اسے اصل سرمایے میں کمی واقع ہونا قرار دیا جائے گا اور صرف صاحب سرمایہ کو برداشت کرنا ہوگا۔"[2]

"جہاں تک نقصان یا بعض فقہاء کی تعبیر کے مطابق کمی کا تعلق ہے وہ صاحب سرمایہ کی ملکیت اصل سرمایہ میں کمی واقع ہوجانے کا نام ہے۔ اس بنا پر وہ مالک ہی کی ذمہ داری ہوگی کیونکہ کسی مال کا ضیاع یا اس میں کمی اس کے مالک ہی کے سر آتی ہے الا یہ کہ کسی دوسرے کی کی ہوئی زیادتی کے سبب اس کی ذمہ داری بھی شامل ہوجائے۔ اس بنیاد پر کوئی ایسی شرط طے کرنا جائز نہیں جس کے مطابق نقصان میں صاحب سرمایہ اور کاروباری فریق دونوں کی شرکت ضروری ہوئی۔"[3]

اسی اصول کی صراحت ابن رشد نے بھی کی ہے:۔

"مسلمانوں کے درمیان مضاربت کے جواز کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ...... اور وہ سب اس پر متفق ہیں کہ ...... کاروباری فریق پر اصل سرمایہ کے ضائع ہوجانے والے حصہ کے سلسلے میں کوئی ذمہ داری نہیں۔ بشرطیکہ اس میں اس کی زیادتی کو دخل نہ ہو۔"[4]

---

[1] علی الخفیف: الشرکات فی الفقہ الاسلامی ص ۲۵ (شرکت سے متعلق بحث)
[2] ایضاً ص ۷۶ (مضاربت سے متعلق بحث)
[3] ایضاً ص ۸۳
[4] ابن رشد: بدایۃ المجتہد جلد ۲ ص ۲۳۶ طبع دار المعرفۃ [illegible]

نقصان کی تعریف کرتے ہوئے مشہور حنفی محقق شمس الدین سرخسی لکھتے ہیں :-

"نقصان سرمایہ کے ہلاک ہو جانے والے حصے کا نام ہے" [1]

اور یہ کہ

"اس امر میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا کہ نقصان کی کوئی ایسی نسبت طے کرنا جو سرمایہ کی مقدار کے مطابق نہ ہو ایک باطل شرط ہے" [2]

"مضاربت میں مضاربت پر مال لے کر کام کرنے والے کے ذمے کچھ بھی نقصان طے کرنا جائز نہیں ہوگا"

مالکی فقیہ احمد الدردیر لکھتے ہیں :-

"(شرکت میں) نفع اور نقصان دونوں شریکوں کے درمیان ان کے سرمایوں کے مطابق تقسیم پائے گا" [4]

یہ بات کہ مضاربت میں کاروباری فریق جو اپنا سرمایہ کاروبار میں نہ لگائے، نقصان کا ذمہ دار نہ ہوگا۔ موطا امام مالک کی کتاب القراض سے بھی واضح ہے [5]

شافعی مکتب فقہ کا اصول بھی یہی ہے :-

"نفع اور نقصان دونوں سرمایوں کی مقدار کے مطابق تقسیم پائے گا۔ خواہ شرکاء کے کاروباری اعمال برابر ہوں یا ان میں فرق ہو۔ اگر وہ اس کے خلاف تقسیم کا کوئی اور اصول طے کرتے ہیں تو معاہدہ فاسد ہو جائے گا" [6]

---

[1] شمس الدین السرخسی : المبسوط جلد ۱۱ ص ۱۵۷

[2] ایضاً ص ۱۵۶

[3] ایضاً ص ۱۵۶ حنفی فقہاء کی مزید تصریحات کے لیے ملاحظہ ہو۔

مرغینانی : ہدایہ جلد ۳ ابواب المضاربۃ اور

کاسانی : بدائع الصنائع ۔ جلد ۶ ص ۶۲ اور ص ۸۶

[4] احمد الدردیر : الشرح الصغیر جلد ۲ ص ۱۵۷

[5] امام مالک : موطا ۔ کتاب القراض ۔ باب ما لا یجوز من الشرط فی القراض

[6] یحیی بن شرف النووی ۔ منہاج الطالبین ص ۵۶ (کتاب الشرکۃ)

اسی فقہی ماخذ اور شافعی فقہ کی دوسری مستند کتابوں میں مضاربت کی بحث میں یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ یہ ایک معاہدہ ہے جو کاروبار کرنے والے فریق کے ساتھ سرمایے کا مالک کاروبار کے نفع میں ایک متعین نسبت کے ساتھ شرکت کے عوض کرتا ہے۔ نقصان سے کاروباری فریق کا کوئی تعلق نہیں۔

حنبلی محقق ابن قدامۃ المقدسی لکھتے ہیں:۔

"نقصان یعنی خسارہ شرکت میں ہر شریک کا اس کے سرمایے کے مطابق ہوگا ...... اور مضاربت میں نقصان مخصوص طور پر سرمایے پر ہوگا۔ کاروباری فریق پر نہیں ہوگا۔ کیونکہ خسارہ اصل سرمایہ میں کمی کا نام ہے جو صاحبِ سرمایہ کی ملکیت ہے، جس میں کاروباری فریق کا کوئی حصہ نہیں لہذا نقصان مالک کے سرمایہ میں ہی ہوگا۔ دوسرے فریق کا نہیں ہوگا۔"[1]

فقہائے اسلام کی مذکورہ بالا تصریحات سے واضح ہے کہ ہم نے جو اصول بیان کیا ہے وہ تمام مکاتب فقہ کے درمیان متفق علیہ ہے۔ فقہاء نے اس امر کی بھی صراحت کر دی ہے کہ جس فریق نے کاروبار میں سرمایہ نہ لگایا ہوا اس کو کاروبار کا نقصان نہ برداشت کرنا ہوگا۔ فقہاء کی صراحتوں سے یہ بات بھی واضح ہے کہ کاروبار میں سرمایہ لگا کر اس کاروبار میں ہونے والے نقصان سے بچنے کی کوئی صورت نہیں ممکن ہے یہ اسلام میں سود کی حرمت کا براہ راست نتیجہ ہے جو ہمارے موضوع کے لیے بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ ہمارے فقہاء نے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ نقصان نام ہے۔ سرمایے کے ایک حصے کے ڈوب جانے کا۔ اس لیے جب بھی نقصان واقع ہوگا وہ لازماً سرمایہ لگانے والے کے سر آئے گا۔

جب محنت یعنی کاروباری جدوجہد اور سرمایہ دونوں لگا کر کوئی مشترکہ کاروبار کیا جائے اور اس کاروبار میں کوئی نفع نہ ہو، نہ کوئی نقصان ہو تو کاروباری جدوجہد کا کوئی صلہ نہیں ملتا اور سرمایے کو کوئی نفع نہیں ملتا۔ جب اس کاروباری کو گھاٹا ہو تو یہ کمی سرمایے کے سر آتی ہے۔ غور کیجیے تو کاروباری جدوجہد کا صلہ نہ ملنا اس فریق کے لیے جو کاروباری جدوجہد انجام دے رہا ہے ایک بڑا نقصان ہے اس پر مزید نقصان کا بار نہیں ڈالا گیا ہے۔ اس اصول کے پیچھے عدل وانصاف پر مبنی یہ تصور کام کر رہا

---

[1] ابن قدامۃ المقدسی، الشرح الکبیر مع المغنی جلد ۵ ص ۱۱۱ مطبعۃ المنار، مصر ۱۳۴۷ھ
(یہ کتاب [illegible] ہے۔)

کہ محنت اور کاروباری جد وجہد کو سرمایہ پر لگانے کا منشا اس سرمایہ میں اضافہ تھا۔ اگر یہ اضافہ عملاً نہ ہو سکا تو اس کا تاوان کاروباری فریق کے سر نہیں ڈالا جا سکتا۔ اس کی ناکامی یہی ہے کہ اضافہ نہ کر سکنے کی وجہ سے وہ اپنے صلے سے محروم رہا۔

نفع کی تقسیم

۲۔ نفع کی تقسیم شرکاء کاروبار کے درمیان باہم طے کردہ نسبتوں سے ہوگی۔ نفع میں ہر فریق کا حصہ لازماً نسبت یا فی صد کی صورت میں طے کیا جانا چاہیے۔ کسی فریق کے لیے کوئی متعین رقم نہیں طے کی جا سکتی۔

جہاں تک مضاربت کا تعلق ہے نفع کی تقسیم کا مذکورہ بالا اصول چاروں مکاتب فقہ کے درمیان متفق علیہ ہے۔ یہ بات بھی متفق علیہ ہے کہ شرکت یا مضاربت میں کسی فریق کے لیے نفع میں سے کوئی متعین رقم نہیں طے کی جا سکتی۔ یہ بات کہ نفع کی تقسیم کے لیے شرکاء کاروبار باہمی رضامندی سے جو نسبتیں بھی چاہیں طے کر سکتے ہیں مضاربت کی صورت میں تو متفق علیہ ہے لیکن شرکت کی صورت میں یہ رائے صرف حنبلی اور حنفی فقہاء کی ہے۔ مالکی اور شافعی فقہاء کے نزدیک شرکت میں نفع کی تقسیم لازماً شرکاء کے فراہم کردہ سرمایوں کی نسبت سے عمل میں آئے گی۔

پہلے ہم متفق علیہ امور پر فقہی ماخذ سے سندیں فراہم کریں گے۔ کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ کے مصنف نے صراحت کی ہے کہ اس بات پر کہ مضاربت اور شرکت میں کسی فریق کا حصہ نفع متعین رقم کی صورت میں نہیں طے کیا جا سکتا، چاروں مکاتب فقہ متفق ہیں۔ نیز اس بات پر بھی کہ مضاربت میں فریقین باہمی رضامندی سے نفع کی تقسیم کی جو نسبت بھی چاہیں طے کر سکتے ہیں[1]۔

کسی فریق کے لیے نفع کی کوئی متعین رقم نہیں طے کی جا سکتی

فقہاء احناف کے نزدیک یہ ضروری ہے کہ شرکت میں کسی شریک کے لیے طے کردہ حصۂ نفع کل نفع

---

[1] عبدالرحمٰن الجزیری: کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ جلد ۳ ۔ مباحث الشرکۃ صفحہ ۱۱ (حنفی مسلک) با صفحہ ۱۱۱ (مالکی مسلک) با صفحہ ۱۱۲ (شافعی مسلک) با صفحہ ۱۱۳ (حنبلی مسلک) ۔ مباحث المضاربۃ صفحہ ۴۹ (حنفی مسلک) با صفحہ ۵۳ (مالکی مسلک) با صفحہ ۵۵ (شافعی مسلک) اور صفحہ ۵۹ (حنبلی مسلک)۔ طبع ثانی۔ قاہرہ [illegible] ۱۹۵۰ء۔ استاذ علی الخفیف نے بھی یہی لکھا ہے۔ الشرکات فی الفقہ الاسلامی صفحہ ۲۹

کا ایک عام حصہ باعتبار نسبت ہو، متعین رقم نہ ہو۔[1] اور ضروری ہے کہ مضاربت پر مال لینے والے اور مال کے مالک دونوں کے لیے طے کیا جانے والا حصۂ نفع ایک عام نسبت ہو۔ مثلاً آدھا، تہائی یا چوتھائی۔ اگر ایک متعین حد طے کر لیا گیا مثلاً یہ کہ ان میں سے ایک کے لیے نفع میں سے سو درہم یا اس سے کم یا زیادہ درہم ہوں گے اور باقی دوسرے کے لیے ہوگا تو یہ جائز نہیں اور مضاربت فاسد ہو جائے گی۔"[2]

مضاربت کے سلسلے میں مالکی اور شافعی فقہاء کا مسلک بھی یہی ہے۔

"مالک نے کہا ہے کہ اگر ایک آدمی دوسرے کو سرمایہ بطور مضاربت دے اور اس سے یہ طے کرے کہ نفع میں سے کچھ اسی کے لیے مخصوص ہوگا، اس کے کاروبار کرنے والے ساتھی کا اس میں کوئی حق نہ ہوگا تو یہ صورت درست نہ ہوگی۔ خواہ مخصوص کی ہوئی یہ رقم ایک درہم ہی کیوں نہ ہو۔ صحیح صورت صرف یہ ہے کہ وہ آدھا نفع اپنے لیے طے کرے اور آدھا کاروباری فریق کے لیے یا تہائی، چوتھائی یا اس سے کم یا زیادہ طے کرلے۔۔۔۔"[3]

مالکی فقہاء کے نزدیک ضروری ہے کہ مضاربت میں کاروباری فریق کے لیے طے کیا جانے والا حصۂ نفع کل نفع کا

"ایک عام اور متعین جزء ہو۔ مثلاً چوتھائی یا آدھا، غیر متعین نہ ہو۔ اسی مال کے نفع کا حصہ ہو جو صاحب سرمایہ نے دیا ہے، کسی اور مال کا نفع نہ ہو اور کوئی متعین رقم نہ طے کی جائے۔ مثلاً یہ کہ خواہ نفع کم ہو یا زیادہ۔ اس میں سے دس دینار کاروباری فریق کو ملیں گے۔۔۔۔"[4]

جہاں تک شرکت کا تعلق ہے مالکی اور شافعی فقہاء کی یہ رائے کہ نفع لازماً سرمایوں کی مقدار کے مطابق تقسیم پائے گا۔ اس بات کو مستلزم ہے کہ کسی شریک کے لیے نفع کی کوئی متعین رقم نہیں طے کی جاسکتی۔

---

[1] کاسانی: بدائع الصنائع جلد ۶ ص۸۵

[2] ایضاً ص۸۶

[3] امام مالک: موطا۔ کتاب القراض۔ باب مایجوز من الشرط فی القراض

[4] احمد الدردیر: الشرح الصغیر جلد ۲ ص۲۴۷

حنبلی فقہاء کا مسلک وہی ہے جو حنفی فقہاء کا ہے۔ یعنی جب دو افراد شرکت کریں تو "نفع ان کے مابین ان کی طے کردہ نسبت سے تقسیم پائے گا" شرکت کی تمام صورتوں میں جہاں تک مضاربت کی سادہ شکل کا سوال ہے اس بارے میں کوئی اختلاف بھی نہیں پایا جاتا۔

"اور کسی شریک کے لیے مخصوص طور پر چند متعین دراہم زائد دینا نہیں طے کیا جا سکتا۔"[2]

"شرکت یا مضاربت میں دونوں فریقوں میں سے کوئی اگر اپنے لیے درہموں کی کوئی تعداد طے کرے ...... تو ایسا کرنا درست نہ ہوگا۔"[3]

---

[1] ابن قدامۃ المقدسی : الشرح الکبیر علی المقنع جلد ۵ صـ۱۱۶

[2] احمد الدردیر : الشرح الصغیر جلد ۲ صـ۱۵۷

[3] ابو حامد الغزالی : کتاب الوجیز فی مذہب الامام الشافعی جلد ۱ صـ۱۸۱

دعوتِ دین اور اتباعِ دین

(مولانا سید جلال الدین عمری)

اتباعِ دین اور دعوتِ دین بظاہر دو مختلف کام ہیں۔ ایک کا تعلق انسان کی اپنی ذات سے ہے اور دوسرے کا اپنی ذات سے باہر خارج کی دنیا سے لیکن اس کے باوجود واقعہ یہ ہے کہ ان میں بہت گہرا ربط ہے۔ اس ربط کی وجہ سے آپ ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کر کے نہیں سوچ سکتے۔ ایک طرف یہ حقیقت ہے کہ دین پر عمل اسی وقت مکمل ہوگا جب کہ دنیا کو اس کی دعوت دی جائے اور دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ جب تک دین پر آپ کا عمل نہیں ہوگا آپ صحیح معنے میں داعی دین نہیں بن سکتے۔ اگر آپ انسانوں تک خدا کا دین پہنچانا چاہتے ہیں تو اس کے لیے ضروری ہے کہ دین کی حقیقت پہلے آپ کے دل و دماغ میں اتر جائے اور آپ کی زندگی سے اس کا اظہار ہونے لگے۔ دین کی حقیقت سے اگر آپ خود بے خبر ہیں اور آپ کے عمل سے اس کا اظہار نہیں ہو رہا ہے تو دوسروں کو دین سے باخبر کرنا آپ کے بس کا کام نہیں ہے جس دین کی آپ دنیا کو دعوت دے رہے ہیں اس کے سب سے پہلے مخاطب آپ خود ہیں۔ اس لیے جو کام آپ دوسروں کے درمیان کرنا چاہتے ہیں اس کا آغاز آپ کو اپنی ذات سے کرنا ہوگا اور دوسروں کو خدا پرست بنانے سے پہلے اپنے آپ کو خدا پرست بنانا ہوگا۔ دین کی اتباع کے بغیر اس کی دعوت ایک مذاق ہے اور جب کوئی دعوت مذاق بن جائے تو لوگوں کو اپنی طرف کھینچ نہیں سکتی۔ وہی دعوت دنیا کو اپنا گرویدہ بناتی ہے جس کے علم بردار اپنی شخصیت کو اس میں گم کر دیں اور اس کی زندہ تصویر بن جائیں۔

دعوتِ دین کا مطلب محض یہیں ہے کہ آپ انسانوں کے درمیان اس کے حق و صداقت کا اعلان

کردیں اور بس خاموش بیٹھ جائیں' بلکہ یہ اپنے مزاج کے لحاظ سے ایک زبردست انقلابی کوشش ہے ۔
خدا کا دین چاہتا ہے کہ وہ انسانوں کے تمام خود ساختہ دینوں پر غالب آجائے اور سب اس کے تابع اور
محکوم بنکر رہیں ۔ اگر آپ فی الواقع خدا کے دین کے اس مطلوبہ انقلاب کو دنیا میں لانا چاہتے ہیں تو پہلے
اپنے اندر کی دنیا میں انقلاب لائیے ورنہ باہر کی دنیا میں آپ کی انقلابی کوشش کامیاب نہ ہوگی
دوسروں پر خدا کی حکومت قائم کرنے کے لیے پہلے آپ کو اپنی ذات پر خدا کی حکومت قائم کرنی ہوگی ۔
کیونکہ اگر آپ کی شخصیت پر خدا کی حکومت نہیں ہے تو آپ قیامت تک دوسروں پر اس کی حکومت
قائم نہیں کرسکتے ۔ سب سے بڑی بات جسے آپ کو کبھی بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے ، وہ یہ ہے کہ آپ اس
دعوت کے ذریعے خدا کو خوش کرنا چاہتے ہیں اور خدا کے نزدیک یہ بات سخت ناپسندیدہ ہے کہ
آدمی دوسروں کے درمیان تو اس کے دین کی تبلیغ کرے اور خود اس کی زندگی دین کے اثرات سے خالی ہو

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ	اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو تم وہ
مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ كَبُرَ مَقْتًا	باتیں کیوں کہتے ہو جن پر (خود) عمل نہیں کرتے
عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا	اللہ کے نزدیک سخت ناپسندیدہ ہے کہ تم
تَفْعَلُوْنَ (۱) ۝	ایسی باتیں کرتے ہو جن پر عمل نہیں کرتے ۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا و آخرت میں انجام خیر صرف اس شخص کے لیے ہے جو خدا کے دین کو قبول
کرے اور اس کے سامنے سر جھکا دے ۔ جو شخص خدا کے دین کو رد کردے اور اس کی نافرمانی اختیار کرے
اسے انجام بد سے کوئی چیز نہیں بچا سکتی ۔ اسی حقیقت سے آپ دنیا کو باخبر کرنا چاہتے ہیں ۔ اگر اس حقیقت
پر آپ کو خود ہی یقین نہیں ہے تو آپ اپنی دعوت کے ذریعے دنیا کو دھوکا دے رہے ہیں لیکن اگر اس حقیقت
پر آپ کا ایمان ہے اور آپ کا دل اس کے حق ہونے کی گواہی دے رہا ہے تو آپ کو سب سے زیادہ
خدا کے دین کا متبع ہونا چاہیے ۔ کیونکہ نجات کا محتاج جس طرح وہ شخص ہے جسے آپ خدا کا دین پہنچاتے
ہیں ٹھیک اسی طرح آپ بھی نجات کے محتاج ہیں ۔ جس شخص کو آنے والے عذاب کی خبر نہیں ہے وہ تو
اس سے بے فکر ہوسکتا ہے لیکن عقل کہتی ہے کہ آپ کو اس سے قطعاً بے فکر نہیں ہونا چاہیے جب آپ
کی زبان علی الاعلان اس یقین کا اظہار کرتی ہے کہ زندگی کا بہترین قانون وہ ہے جو خدا نے اپنے
رسولوں کے ذریعے نازل کیا ہے اور پھر آپ اپنے عمل سے اس قانون کی خلاف ورزی کرتے ہیں تو خدا

اور اس کی مخلوق کے سامنے اپنے یقین کو رسوا کرتے ہیں۔ خدا نے آپ کو صرف اس بات کا حکم نہیں دیا ہے کہ لوگوں کو آخرت کے عذاب سے بچائیں، بلکہ یہ بھی ہدایت کی ہے کہ آپ خود بھی اس سے بچنے کی کوشش کریں۔ میں یہاں قرآن کی صرف دو آیتیں نقل کروں گا۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمْ
وَاخْشَوْا يَوْمًا لَا يَجْزِي وَالِدٌ
عَنْ وَلَدِهِ وَلَا مَوْلُودٌ هُوَ جَازٍ
عَنْ وَالِدِهِ شَيْئًا إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ
حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا
وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللَّهِ الْغَرُورُ
(لقمٰن)

اے لوگو! اپنے رب کا تقویٰ اختیار
کرو اور اس دن سے ڈرو جب کہ کوئی باپ
اپنے بیٹے کے کام نہیں آئے گا اور نہ کوئی بیٹا
اپنے باپ کے کچھ کام آ سکے گا۔ بے شک اللہ
کا وعدہ برحق ہے، پس نہ فریب دے تم کو
دنیا کی زندگی اور نہ فریب دے تم کو خدا کے بارے
میں یہ دھوکا باز (شیطان)۔

دوسری آیت میں فرمایا:۔

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَا
عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُحْضَرًا وَمَا عَمِلَتْ
مِنْ سُوءٍ تَوَدُّ لَوْ أَنَّ بَيْنَهَا وَ
بَيْنَهُ أَمَدًا بَعِيدًا ۚ وَيُحَذِّرُكُمُ
اللَّهُ نَفْسَهُ وَاللَّهُ رَءُوفٌ
بِالْعِبَادِ ۝
(آل عمران)

اس دن ہر شخص جو کچھ بھی اس نے (یہاں)
بھلائی اور برائی کی ہے اسے (اپنے سامنے)
حاضر پائے گا اور یہ تمنا کرے گا کہ کاش!
(ابھی یہ دن نہ آتا اور) اس کے اور اس دن
کے درمیان ایک لمبی مدت حائل ہوتی۔ اللہ
تم کو اپنے آپ سے ڈراتا ہے اور اللہ اپنے
بندوں پر مہربان (بھی) ہے۔

جس شخص کے سامنے یہ خوفناک دن ہوگا وہ کبھی بھی اپنے انجام سے غافل نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے ممکن نہیں ہو کہ دوسروں کو تو خدا کے عذاب سے ڈراتا رہے اور اپنے آپ کو اس کے سامنے بھول کر دے۔ آپ خدا کی پکڑ سے محض اس لیے محفوظ نہیں ہوں گے کہ اس کے دین کے داعی ہیں بلکہ اس کے یہاں آپ سے لازماً یہ سوال ہوگا کہ جس دین کی تم دنیا کو دعوت دے رہے تھے اس کا کتنا حصہ تمہاری زندگی میں موجود تھا اور کتنا حصہ غائب تھا؟ سوچیے اس سوال کا جواب آپ کے پاس کیا ہوگا جبکہ

فرشتے آپ کے خلاف یہ فردِ جرم عائد کریں گے کہ آپ دوسروں کو تو دین کی دعوت دیتے تھے لیکن خود اس پر عمل نہیں کرتے تھے۔ آپ کی کامیابی خدا کے دین کی اتباع میں چھپی ہوئی ہے۔ اگر آپ نے دین سے بغاوت کی روش اختیار کی تو نہ دنیا میں کامیاب ہوں گے اور نہ آخرت میں۔ خدا کی رحمت اس کے فرماں برداروں کو ملتی ہے۔ اگر آپ نے اپنی فرماں برداری کا ثبوت نہ دیا تو پھر کیسے اس کی رحمت کے مستحق ہوں گے؟

آپ جس دین کی دعوت دے رہے ہیں اسے اگر آپ کے ہم وطن رد کر دیں، آپ کے محلے والے رد کر دیں، آپ کے خویش و اقارب رد کر دیں، حتیٰ کہ آپ کے ماں باپ، بھائی بہن اور بیوی بچے رد کر دیں اور دنیا کا ایک شخص بھی اسے قبول نہ کرے تو خدا کے ہاں آپ سے کوئی بازپرس نہیں ہوگی۔ کیونکہ آپ کو دین کی راہ میں جدوجہد کی طاقت دی گئی تھی۔ یہ طاقت آپ نے لوگوں کو راہِ راست پر لانے میں صرف کر دی اور اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو گئے۔ اس سے آگے آپ کے پاس دلوں کو بدلنے کی قدرت نہیں تھی۔ اس لیے ان کے دل نہیں بدل سکے۔ لیکن اگر آپ خود دین سے پھر جائیں تو خدا کے ہاں آپ کا کوئی عذر نہیں سنا جائے گا۔ کیونکہ اگر آپ اپنی شخصیت کو خدا کی بندگی کی طرف موڑنا چاہیں تو یقیناً موڑ سکتے ہیں۔ اس راہ میں کوئی ایسی رکاوٹ نہیں ہے جس کا دور کرنا آپ کے لیے ممکن نہ ہو۔ خدائے تعالیٰ نے آپ کو اپنی ذات کا مالک بنایا ہے اور اس پر اقتدار آپ کو عطا کیا ہے۔ انسان جب کبھی یہ اقتدار پانے کے بعد اسے خدا کی مرضی کے خلاف استعمال کرتا ہے تو خود سے معذرت کے تمام دروازے بند کر دیتا ہے۔ وہ کسی دوسرے پر اس کی ذمہ داری ڈال کر اس کے نتائج سے بچ نہیں سکتا۔ اسے خود ہی اپنا انجام بھگتنا ہوگا۔ خواہ وہ کتنا ہی خوفناک اور دل ہلا دینے والا انجام کیوں نہ ہو۔

اگر آپ خدا کے دین کی خدمت کرنا چاہتے ہیں اور واقعی اپنے اس ارادے میں سنجیدہ اور مخلص ہیں تو آپ کو خدا سے وہ تعلق بھی پیدا کرنا ہوگا جو اس کام کے لیے مطلوب ہے۔ خدا سے یہ تعلق اس کے دین کی اتباع سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے۔ خدا کے پیغمبر جن قوموں میں مبعوث ہوتے ہیں وہ ان میں خدا کے دین کے سب سے پہلے اور سب سے بڑے داعی ہوتے ہیں۔ خدا سے ان کے تعلق کا یہ عالم ہوتا ہے کہ ان کا دل ہر وقت خدا سے جڑا رہتا ہے۔ ان کی زندگی خدا کی عبادت اور بندگی میں پوری طرح ڈھل جاتی ہے اور وہ سراپا عبدیت اور مجسم تسلیم و رضا ہوتے ہیں۔ وہ جب دین کی اپنی قوم کو دعوت

دیتے ہیں اس کی اتباع اس کامل یکسوئی کے ساتھ کرتے ہیں کہ ان کے کسی مخالف کو بھی یہ کہنے کی ہمت نہیں ہوتی کہ ان کا عمل ان کی دعوت کے خلاف ہے۔ وہ خدا کے ہر حکم پر اس طرح عمل کرتے ہیں کہ زندگی کے سخت ترین مرحلوں میں بھی اس سے نہیں ہٹتے۔ قرآن نے ان کو خشوع وخضوع، زہد وعبادت، تقویٰ واسلام اور انابت ورجوع الی اللہ سے متصف بتایا ہے۔ یہ صفات محض ان کے شخصی کردار کو نہیں ظاہر کرتی ہیں بلکہ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس قسم کے افراد ہیں جو دعوت دین کا کام کر سکتے ہیں۔

خدا کے دین کی دعوت کسی بھی دوسرے نظریے کی دعوت سے زیادہ مشکل ہے۔ دنیا میں جتنی تحریکیں اور نظریات اٹھتے ہیں وہ انسان کے ظاہر کو بدلنا اور اس کے چند مسائل کو حل کرنا چاہتے ہیں لیکن خدا کا دین انسان کے ظاہر وباطن دونوں میں انقلاب لاتا ہے اور اس کی پوری زندگی کے لیے ہر نظریہ اور ہر تحریک سے مختلف ایک نیا فکر اور ایک نیا انداز عطا کرتا ہے۔ اس دین کی خدمت کے لیے دنیا کے کسی بھی لیڈر اور کسی بھی راہنما کے مقابلے میں بڑی ہمت، بڑے صبر واستقلال، قربانی کے بے پناہ جذبے اور بہت زیادہ فہم وبصیرت کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر خدمت دین کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ خدا سے آپ کا تعلق جتنا قوی ہوگا یہ صفات بھی آپ کے اندر اتنی ہی قوت کے ساتھ ابھریں گی اور آپ خدا کے دین کے بہترین خادم بن سکیں گے۔ جب خدا سے آپ کا تعلق اتنا مضبوط ہو کہ اس کے دین کی خاطر کسی بھی تعلق کے ٹوٹنے کی آپ پروا نہ کریں۔ جب خدا کی یاد آپ کے لیے اس قدر پرکشش ہو کہ دنیا کی کوئی بھی چیز آپ کو خدا سے غافل نہ ہونے دے اور جب خدا کا خوف اور اس کی محبت آپ کے دل ودماغ پر اس طرح چھا جائے کہ کوئی دوسرا خوف اور کوئی دوسری محبت آپ پر غالب نہ آسکے تو دنیا کی کوئی بھی طاقت آپ کو دعوت دین کی راہ سے نہیں ہٹا سکتی اور آپ خدا کے دین کی اس سے زیادہ اور اس سے اچھی خدمت کر سکیں گے جتنی کہ آپ کی سطح کا کوئی بھی فرد اپنے نظریے اور تحریک کی کر سکتا ہے۔

خدا کے پیغمبر اس طرح اپنی دعوت پیش کرتے ہیں کہ ان کی مخالفت کے لیے کسی کے پاس کوئی حجت باقی نہیں رہتی۔ آج آپ اسی کام کے لیے کھڑے ہیں اس لیے آپ کے اندر دین کی اتباع کا وہی جذبہ ہونا چاہیے جو خدا کے پیغمبروں میں ہوتا ہے۔ آپ کو یہ حقیقت نہیں بھولنی چاہیے کہ کوئی بے عمل شخص خدا کی طرف سے انسانوں پر حجت قائم نہیں کر سکتا۔ کیونکہ عمل کا کھوکھلا پن بات کو بے وزن بنا دیتا ہے۔ دنیا آپ کی نصیحت سے زیادہ آپ کے کردار کو دیکھتی ہے۔ اگر آپ کا عمل آپ کے قول کے خلاف ہے تو آپ خود دین کی قبولیت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ آپ کی بات کو رد کرنے کے لیے لوگوں کے نزدیک

یہ دلیل کافی ہوگی کہ آپ کی روش اس سے ٹکرا رہی ہے۔ جب آپ نے دعوت دین کا کام شروع کیا ہے تو دنیا آپ کی کسی چھوٹی سے چھوٹی غلطی کو بھی معاف نہیں کرے گی۔ وہ آپ کی معمولی سی لغزش کو بھی دعوت ہی کے بگاڑ کا نتیجہ قرار دے گی اور اسے بدنام کرے گی۔ کوئی بھی دعوت اسی وقت لوگوں کے لیے قابل قبول ہوتی ہے جبکہ داعی کی زندگی اس کی شرح و تفسیر بن جائے۔ اور جو چیز وہ اس کی زبان سے سن رہے ہیں اسے وہ اس کے عمل میں دیکھ لیں۔

خدا کے دین کو جب آپ نے حق سمجھ کر قبول کیا ہے تو اس کا فطری تقاضا ہے کہ آپ اپنے پورے وجود کے ساتھ اس کے شاہد بن جائیں اگر آپ کی زندگی سے اس کی صداقت کی آواز بلند نہ ہو تو محض آپ کی تبلیغ سے کسی دوسرے شخص کی زندگی اس کی گواہی نہیں دے سکتی۔ دین کی قدر و قیمت جس چیز نے گھٹائی ہے وہ یہی بے عمل دعوت ہے۔ لیکن سوچیے ہم میں سے کتنے ہیں جن کے لیے دین شب و روز کا موضوع سخن بنا ہوا ہے اور کتنے ہیں جن کی زندگیوں میں وہ فی الواقع اترا ہوا ہے۔ دین کا نام لینے والے دین کو بہت رسوا کر چکے اب ہمیں اس سے بچنا ہے۔

شرائطِ ایجنسی

۱۔ ایجنسی کم سے کم ۵ پرچوں پر دی جائے گی

۲۔ ۔/۵ ایڈوانس جمع کرنے ہوں گے۔

۳۔ ۵ سے ۵۰ پرچوں تک 25% کمیشن دیا جائے گا۔ البتہ ۵۰ سے زائد رسالوں پر کمیشن 30% دیا جائے گا

۴۔ رسائل کی روانگی کا خرچ دفتر برداشت کرے گا۔ رجسٹری اور وی پی کا خرچ ایجنٹ صاحبان کے ذمے

۵۔ ہر مہینے کا بل باقاعدگی سے ادا کرنا چاہیے۔

منیجر:۔ رسالہ زندگی رام پور یوپی

حل التضاد کا مختصر تنقیدی جائزہ

(۲)

(سید احمد قادری)

گزشتہ شمارے میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خالص قمری حساب سے ماہ ربیع الاول میں مدینہ تشریف لائے تھے اور یہ کہ صوم عاشوراء آپ قمری حساب سے ۱۰ محرم کو رکھتے تھے اور یہود مدینہ بھی اسی حساب سے ۱۰ محرم کو صوم عاشوراء رکھتے تھے۔ ہمارے فاضل دوست نے صوم عاشوراء کی احادیث کو اپنے نظریے کے لیے سب سے بڑا ثبوت قرار دیا ہے۔ جب یہ ثبوت بھی ثبوت نہ رہا تو مزید واقعات کی چھان بین چنداں ضروری نہ تھی لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے۔
کہ موصوف کے غور و فکر کے لیے چند اور واقعات کی چھان بین کر لی جائے۔

پہلا غزوہ تمام مورخین و محدثین اس پر متفق ہیں کہ سب سے پہلا غزوہ جس میں سرور عالم بنفس نفیس شریک ہوئے غزوہ ابواء و ودان ہے۔ یہ صفر ۲ھ کا واقعہ ہے لیکن امام بخاریؒ امام مسلم نے حضرت زید بن ارقمؓ کی جو حدیث روایت کی ہے اس سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلا غزوہ العشیرہ تھا۔ حدیث میں یہ مذکور نہیں ہے کہ غزوہ ذو العشیرہ کب واقع ہوا۔ مورخین سیرت کی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ غزوہ جمادی الاولیٰ یا جمادی الاخریٰ ۲ھ کا واقعہ ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ محدثین نے اس صحیح حدیث کی بنا پر مورخین سیرت سے اختلاف کیوں نہیں کیا۔ یہاں تک کہ امام بخاریؒ کے نزدیک بھی پہلا غزوہ العشیرہ نہیں بلکہ غزوۂ ابواء ہے۔ حضرت زید بن ارقم کی حدیث پر جو ترجمۂ باب انھوں نے لکھا ہے اس میں ابن اسحٰق کے قول کا حوالہ دے کر اشارہ کر دیا ہے کہ صحیح بات یہ ہے کہ العشیرہ پہلا غزوہ نہیں بلکہ تیسرا غزوہ ہے وہ لکھتے ہیں:-

"اور ابن اسحٰق نے کہا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا غزوہ ابواء ہے اس کے بعد بواط اس کے بعد عشیرہ"

شارح باب کے اس اشارے کو انھوں نے اپنی تاریخ صغیر میں کھول دیا ہے اور وہاں حضرت عمرو بن عوف مزنی رضؓ کی یہ روایت درج کی ہے کہ :۔

"سب سے پہلا غزوہ جس میں ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک ہوئے ابواء ہے"

حضرت عمرو بن عوف کی یہ حدیث امام طبرانی نے بھی روایت کی ہے۔ (فتح الباری ج، ص۱۵۱)

یہ ایک ایسے صحابی کی روایت ہے جو خود اس غزوے میں شریک تھے۔ سیرت النبی میں علامہ شبلی نے غزوۂ ابواء کے ذکر میں لکھا ہے :۔

"تمام محدثین مغازی کی ابتدا اسی واقعہ سے کرتے ہیں۔ صحیح بخاری میں بھی اسی کو اول الغزوات قرار دیا ہے"

حافظ ابن حجر نے بھی حضرت زید کی حدیث کی بنا پر مورخین سیرت کے قول کو رد نہیں کیا ہے حالانکہ متعدد واقعات میں انھوں نے صحیح حدیث کے مقابلے میں مورخین سیرت کے قول کو رد کر دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسری احادیث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت زید بن ارقم نے محض اپنے علم کی حد تک بات کہی ہے۔ اسی حدیث میں وہ حضور کے غزوات کی تعداد ۱۹ بتلاتے ہیں۔ حالانکہ حضرت جابر بن عبداللہ رضؓ سے مسلم شریف اور حدیث کی دوسری کتابوں میں بسند صحیح مروی ہے کہ غزوات کی تعداد ۲۱ ہے۔ (فتح الباری جلد، ص۱۹۹ و زرقانی ج ۱) ابن حجر اور زرقانی نے لکھا ہے کہ صغر سنی کی وجہ سے حضرت زید سے جن دو غزووں کا ذکر چھوٹ گیا ہے وہ ابواء اور بواط ہیں۔ مختلف احادیث کے درمیان یا حدیث اور مدونین سیرت کی روایات کے درمیان تطبیق پیدا ہو جائے تو اختلاف دور ہو جاتا ہے چنانچہ اس واقعے میں ابواء کا پہلا غزوہ ہونا تمام مورخین و محدثین کا متفقہ قول بن گیا ہے۔

ہمارے فاضل دوست نے اس متفقہ قول کو مختلف فیہ قرار دیا اور اختلاف کو بھی اس رنگ میں پیش کیا ہے جیسے مورخین و محدثین کے درمیان اس کے بارے میں بڑی کشمکش رہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :۔

"محدثین اور سیرت نگاروں کے اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہے کہ دونوں روایتیں بظاہر مشکوک ہو جاتی ہیں اور شارحین روایات کبھی بخاری اور زید بن ارقم پر جرح کرنے لگتے ہیں اور کبھی سیرت نگاروں پر لیکن ...

طور پر جانچ کیجیے تو یہ صرف ایک تقویمی فریب ثابت ہوتا ہے جس میں سیرت نگار اور محدثین و مورخین مدتوں سے مبتلا ہیں ۔

(برہان اکتوبر [illegible])

معلوم نہیں وہ شارحین روایات کون لوگ ہیں جو کبھی ان پر اور کبھی ان پر جرح کرنے لگتے ہیں۔ ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ شارحین روایات نے حضرت زید کی حدیث کی صحیح نوعیت بتا کر اختلاف دور کر دیا ہے۔ یہ تو ہمارے فاضل دوست کا وہ تقویمی نظریہ ہے جو محدثین و مورخین کے درمیان اختلاف کی نمائش کر رہا ہے ورنہ کسی محدث نے بھی العشیرہ کو پہلا غزوہ قرار نہیں دیا ہے۔ موصوف نے اس متفقہ قول کو مختلف فیہ بنا کر اختلاف دور کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا ہے اس کو بھی دیکھ لیجیے ۔

پہلے غزوہ ابوار، بواط اور عشیرہ کے بارے میں سیرت ابن ہشام کے تاریخی بیان واقعہ کا خلاصہ سن لیجیے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے بارہویں مہینے صفر میں غزوے کے لیے نکلے اور مدینے میں سعد بن عبادہ کو اپنا نائب بنایا۔ یہاں تک کہ ودان پہنچے اور یہی غزوۂ ابواء ہے۔ وہاں بنو ضمرہ سے مصالحت کا معاہدہ ہوا۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینے لوٹ آئے اور صفر کے باقی ایام اور ربیع الاول کے ابتدائی ایام مدینے میں مقیم رہے۔ پھر آپ ربیع الاول میں غزوے کے لیے نکلے اور مدینے میں سائب بن عثمان بن مظعون کو نائب بنایا۔ یہاں تک کہ بواط پہنچے۔ پھر آپ مدینے لوٹ آئے اور ماہ ربیع الآخر کے بقیہ ایام اور جمادی الاولی کے کچھ دن مدینے میں مقیم رہے۔ اس کے بعد پھر آپ غزوے کے لیے نکلے اور مدینے میں ابو سلمہ بن عبد الاسد کو نائب بنایا۔ یہاں تک کہ آپ عشیرہ پہنچے اور وہاں جمادی الاولی اور جمادی الآخرہ کے کچھ دن ٹھہرے اور بنو مدلج اور ان کے حلفاء بنو ضمرہ سے مصالحت کی اور مدینے پلٹ آئے۔

مواہب لدنیہ اور زرقانی میں کچھ مزید تفصیل ہے۔ مثلاً یہ کہ غزوۂ ابواء میں آپ کے ساتھ مہاجرین کے ساٹھ افراد تھے اور علم بردار حمزہ بن عبد المطلب۔ اس سفر سے ۱۵ دنوں کے بعد آپ مدینہ واپس آ گئے ۔ غزوۂ بواط میں آپ کے ساتھ دو سو صحابہ اور علم بردار سعد بن وقاص تھے۔ آپ اس غزوے کے لیے ہجرت کے تیرہویں مہینے کی ابتدا میں نکلے تھے ۔ غزوۂ عشیرہ میں آپ کے ساتھ ڈیڑھ سو یا دو سو سپاہی تھے اور علم بردار حمزہ بن عبد المطلب تھے۔ اس غزوے میں آپ کے ساتھ صرف ۳۰ اونٹ تھے جن پر سب لوگ باری باری سے سوار ہوتے ۔

ابن اسحاق کے نزدیک یہ غزوہ جمادی الاولیٰ کا واقعہ ہے اور ابن سعد کے نزدیک جمادی الآخری کا۔ قسطلانی اور ابن قیم نے جمادی الاخری کی روایت اختیار کی ہے۔ قسطلانی نے اس کو ہجرت سے سولھویں مہینے کا واقعہ لکھا ہے اور ابن قیم نے زاد المعاد جلد ا میں صراحۃً اس کو جمادی الاخریٰ کا واقعہ لکھا ہے۔ علامہ شبلی نے بھی یہی لکھا ہے۔

ان واقعاتی بیانات سے بوضاحت معلوم ہوا کہ ان تین غزوات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مستقل الگ الگ سفر کیے تھے اور ان تین سفروں میں مدینے کی نیابت تین الگ الگ صحابیوں کو عطا فرمائی تھی۔ تینوں غزووں میں سپاہیوں کی تعداد بھی مختلف تھی اور آغاز سفر کے مہینے بھی مختلف تھے۔ یہ واقعاتی صراحت بھی موجود ہے کہ پہلے غزوے میں آپ ہجرت سے بارھویں مہینے سفر میں نکلے تھے۔ اس کے بعد اب موصوف کا حل ملاحظہ کیجیے۔ لکھتے ہیں:-

> ۲ھ کی دو تقویمی جدولوں پر نظر ڈالیے تو مکی صفر کے مقابلے میں مدنی جمادی الاولیٰ نظر آئے گا جس کے معنی یہ ہیں کہ ۲ھ میں یہ دونوں مہینے ایک ساتھ چل رہے تھے۔ مکی تقویم کے بموجب اس مہینے کا نام صفر تھا جو عام قمری اعتبار سے جمادی الاولیٰ کہلاتا تھا۔ اس طرح دونوں واقعے ایک ہی ماہ سے تعلق رکھتے ہیں۔
>
> سیرت نگاروں نے "غزوہ ابواء" کو محض اس لیے مقدم قرار دیا کہ روایات کے بموجب یہ واقعہ صفر نام کے مہینے کا تھا جو "جمادیٰ" کے پہلے آتا ہے۔ اس کے مقابلے میں ذات العشیرہ کو تیسرا غزوہ صرف اس لیے تسلیم کیا گیا کہ از روئے روایات یہ "جمادی الاولیٰ" کا واقعہ تھا۔"
>
> (برہان' اکتوبر ص ۲۱۴-۲۱۳)

موصوف نے اوپر جو تاریخی بیان واقعات گزرا اس کی طرف اپنے مقالے میں اشارہ تک نہیں کیا اور سب کو بیک قلم حذف کرکے کس آسانی سے اختلاف کو دور کر دیا۔ جی ہاں اس اختلاف کو جو مورخین و محدثین کے درمیان موجود بھی نہیں ہے۔ موصوف کے نزدیک مورخین کو جو رشتہ اتنی پہنچی تھی وہ صرف ماہ صفر اور ماہ جمادی الاولیٰ کی تھیں۔ باقی رہیں وہ تمام تفصیلات یعنی حضور کا تین الگ الگ مستقل سفر کرنا۔ مدینے میں ہر سفر میں الگ الگ تین صحابیوں کو نائب بنانا۔ سپاہیوں کی تعداد کا مختلف ہونا پہلے سفر میں صرف ۱۵ دن مدینے سے باہر رہنا اور پہلے غزوے میں قدوم مدینہ سے بارھویں مہینہ کا ہونا۔ یہ

تمام واقعات انھوں نے اپنے جی سے گھڑ کر کتابوں میں لکھ دیے ساتھ ہی ان میں سے کوئی بات روایۃً ان تک نہ پہنچی تھی۔ پتہ نہیں ان کو "صفر ا، جمادی الاولیٰ" کے نام بھی روایۃً پہنچے تھے یا یہ نام بھی انھوں نے خود ہی گھڑ لیے تھے۔ جس ذخیرے کا یہ حال ہو وہ قابل فخر نہیں، من گھڑت کہانیوں کا انبار ہے۔ حالانکہ موصوف نے اپنے پہلے مقالے میں اسی ذخیرۂ سیرت کو اس کی واقعاتی تفصیلات کے اعتبار سے بھی قابل فخر قرار دیا ہے۔ موصوف اپنا نظریہ ثابت کرنے کے لیے تاریخی بیان واقعہ کو رد کر دیں لیکن دوسرے لوگ رد نہیں کریں گے۔ مورخین کے متفقہ بیان واقعہ سے یہ بات حتماً ثابت ہے کہ ابوا، اور عشیرہ کے واقعات ایک ماہ کے ہرگز نہیں ہیں اور یہ بات ممکن نہیں ہے کہ تین چار مہینے ایک دوسرے میں داخل ہو کر ایک مہینہ بن جائیں۔ ہجرت سے بارہویں مہینے کی تاریخی و توقیتی صراحت نے یہ بات بھی ناممکن بنا دی ہے کہ صفر کو ہی صفر قرار دیا جائے۔ خود موصوف کے مرتب کردہ لمی کیلنڈر سے صفر بارہواں مہینہ نہیں ہوتا۔ صرف قمری حساب سے بارہواں مہینہ بنتا ہے۔ باقی رہی مجرد دعوے کی بات تو مجرد دعوے سے ہر چیز ثابت کی جا سکتی ہے۔

جملہ اہل سیر لکھتے ہیں کہ پہلا معاہدہ ابواء میں بنو ضمرہ سے ہوا تھا۔ اس کے بعد بنو مدلج سے عشیرہ میں۔ بنو ضمرہ اور بنو مدلج قبیلہ کنانہ کی دو شاخیں تھیں اور ایک دوسرے کی حلیف بھی۔ اس لیے عشیرہ میں ابوا والے معاہدے کی مزید توثیق بھی ہوئی اور چونکہ بنو ضمرہ سے پہلے معاہدہ ہو چکا تھا اس لیے بنو مدلج کے ساتھ بآسانی معاہدہ طے پا گیا۔ علامہ شبلی سیرت النبی جلد ا صـ۱۱۳ پر لکھتے ہیں :-

> جمادی الثانی یعنی اس واقعہ کے تیسرے مہینے آپ دو سو مہاجرین کے ساتھ مدینے سے نکلے اور مقام ذوالعشیرہ پہنچ کر بنو مدلج سے معاہدہ کیا۔ یہ مقام مدینے سے ۹ منزل پر ینبوع کے نواحی میں ہے بنو مدلج بنو ضمرہ کے حلیف تھے اور چونکہ بنو ضمرہ پہلے اسلام کے معاہدے میں داخل ہو چکے تھے اس لیے انھوں نے آسانی سے یہ شرطیں منظور کر لیں۔

موصوف نے اہل سیر کی یہ روایت تسلیم نہیں کی ہے اور محض اپنے قیاس سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ معاہدہ پہلے بنو مدلج سے ہوا تھا جہاں بنو ضمرہ سے بھی باتیں طے پا گئی تھیں لیکن وہ ابواء کے باشندے تھے اس لیے [illegible] کی توثیق ہوئی اور دلیل یہ دی ہے کہ بنو ضمرہ سے ابواء میں جو معاہدہ ہوا [illegible] میں بنو مدلج کا ذکر نہیں ملتا ہے۔ یہ ایک مغالطہ ہے۔ مورخین کا بیان یہ ہے کہ

پہلے سفر میں معاہدہ صرف بنو ضمرہ سے ہوا تھا۔ بنو مدلج سے نہیں' اس سے معاہدہ دوسرے سفر میں ہوا اور وہاں بنو ضمرہ کے معاہدے کی توثیق بھی ہوئی اس لیے ابواء کے معاہدے میں بنو مدلج کا ذکر آتا تو تعجب آتا۔ موصوف مورخین کے اس بیان کا تو کوئی حوالہ نہیں دیتے اور حوالہ صرف اتنی بات کا دیتے ہیں کہ ابوار کے معاہدے میں بنو مدلج کا ذکر نہیں ہے۔ یعنی جب ذکر نہیں ہے تو معلوم ہوا کہ بنو مدلج سے معاہدہ پہلے ہو چکا تھا۔ موصوف کی اس دلیل سے صرف وہی شخص مطمئن ہو گا جس نے خود کتابیں نہیں پڑھی ہیں۔

غزوہ ابوار و عشیرہ کو ایک ماہ کا واقعہ قرار دینے کے لیے موصوف نے ایک دلیل یہ دی ہے۔

"یہ بات بھی خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ جملہ اہل سیر کے نزدیک ان دونوں مہموں میں فوج کے علم بردار حمزہ بن عبدالمطلب تھے جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک ہی فوج ان دونوں مقامات پر پہنچی تھی جس کا پہلا ہدف عشیرہ تھا۔ اور دوسرا ابوار۔"

(برہان' اکتوبر)

اوپر مورخین کے تاریخی بیانات پڑھے اور پھر موصوف کی عبارت۔ جملہ اہل سیر یہ بیان کر رہے ہیں کہ ابوار اور عشیرہ کا سفر مستقلاً الگ الگ ہوا تھا۔ غزوۂ ابوار میں حضور کے ساتھ صرف ساٹھ مہاجرین تھے اور مدینے کے نائب سعد بن عبادہؓ بنائے گئے تھے۔ غزوۂ عشیرہ میں حضور کے ساتھ دو سو سپاہیوں کی فوج تھی اور مدینے کے نائب ابو سلمہ بنائے گئے تھے۔ موصوف کے نزدیک جملہ اہل سیر کا یہ بیان قابل ذکر بھی نہیں ہے لیکن دونوں میں حضرت حمزہ کا علمبردار ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ سفر ایک ہی تھا۔ فوج بھی ایک ہی تھی اور واقعہ بھی ایک ہی مہینے کا تھا۔ گویا حضرت حمزہ کا دو بار دو الگ الگ فوجوں کا علمبردار بنایا جانا تو کسی طرح صحیح ہو ہی نہیں سکتا۔ پتہ نہیں' موصوف نے استدلال کا یہ طریقہ کن لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے اختیار کیا ہے۔

میں نے تھوڑی تفصیل سے پہلے غزوے پر گفتگو اس لیے کی ہے کہ موصوف کا طریقہ استدلال واضح ہو جائے۔ میں ان سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنے اس طریقۂ استدلال پر نظر ثانی کریں۔

اب میں اختصار کے ساتھ چند مزید واقعات کی طرف اشارہ کروں گا۔

تحویل قبلہ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی صحیح ترین حدیث میں — جس پر بخاری و مسلم دونوں

متفق ہیں —— یہ صراحت ہے کہ تحویل قبلہ کا واقعہ ہجرت کے سولہ یا سترہ مہینے کے بعد ہوا تھا۔ ابن قیم نے زاد المعاد میں واقعہ بدر سے دو مہینے پہلے لکھا ہے یعنی رجب میں۔ ابن اسحق کے نزدیک ایک روایت میں رجب کا اور دوسری روایت میں شعبان کا واقعہ ہے۔ علامہ ابن حجر نے پوری تحقیق و تفصیل کے بعد ۱۵ رجب کو ترجیح دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

وذالک ان القدوم کان فی شہر ربیع الاول بلا خلاف وکان التحویل فی نصف شہر رجب من السنۃ الثانیۃ علی الصحیح وبہ جزم الجمہور ورواہ الحاکم بسند صحیح عن ابن عباس (فتح الباری ج ۱ ص ۲۲)

اور یہ اس لیے کہ آمد بلا اختلاف ماہ ربیع الاول میں ہوئی اور صحیح قول کی بنا پر تحویل قبلہ کا واقعہ دوسرے سال نصف ماہ رجب میں ہوا۔ یہی جمہور کا قول ہے اور حاکم نے بسند صحیح ابن عباس رض سے بھی اسی کی روایت کی ہے

موصوف نے لکھا ہے کہ تحویل قبلہ کی تاریخ عام روایات میں شعبان ملتی ہے اور امام زہری نے جمادی الاولیٰ بیان کی ہے۔ انھوں نے حضرت براء کی حدیث کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا بلکہ اس کو نظر انداز کر کے امام زہری کا ایک قول نقل کر دیا ہے۔ (اس قول کا حوالہ بھی ان کے مقالے میں چھپنے سے رہ گیا ہے) زرقانی نے مواہب کی شرح میں تمام اقوال جمع کیے ہیں لیکن جمادی الاولیٰ کا کوئی قول نقل نہیں کیا ہے البتہ ابن عقبہ کا ایک شاذ قول جمادی الاخریٰ کا اس میں موجود ہے —— موصوف نے زہری کا قول نقل کر کے مکی و مدنی کیلنڈر کی طرف اشارہ کر دیا کہ مکی جمادی الاولیٰ اور مدنی شعبان ایک ساتھ چل رہے ہیں لہذا اختلاف دور ہو گیا۔ حالانکہ اگر تحویل قبلہ کو مکی جمادی الاولیٰ کا واقعہ مانا جائے تو حضرت براء کی حدیث صحیح باقی نہیں رہے گی کیونکہ اس صورت میں نہ سولہ مہینے کی صراحت درست رہتی ہے اور نہ سترہ مہینے کی۔ اس طرح موصوف کے مکی کیلنڈر نے اس صحیح حدیث کو خارج از بحث قرار دے دیا اس متفق علیہ حدیث کی بنا پر تمام محققین کے نزدیک تحویل قبلہ کا واقعہ قمری رجب یا قمری شعبان کا ہے اور دوسرے تمام اقوال شاذ اور ناقابل اعتنا ہیں۔ موصوف نے صحیح حدیث کو نظر انداز کر کے صرف ایک اختلاف کو دور کر دیا لیکن اقوال تو بہت سے موجود ہیں کیا ان سب اختلافات کو دور کرنے کے لیے چار تقویمیں مرتب کی جائیں۔

حضرت براء کی یہ حدیث پوری طرح یہ بات بھی ثابت کر رہی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت

۔ لیکن قمری حساب سے ربیع الاول میں ہوئی تھی کیونکہ صرف اسی حساب سے سولہ یا سترہ مہینے کی توقیت صحیح ہوتی ہے۔ حضرت براء کی اس حدیث میں کسی مہینے کا نام سرے سے موجود نہیں ہے۔ اس لیے یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ ان کو مہینے کا نام کسی پرچے پر لکھا ہوا مل گیا تھا اور انھوں نے اپنے قیاس سے سولہ یا سترہ مہینے بیان کر دیا۔

سریۂ عبداللہ بن جحش موصوف نے اس کے بارے میں لکھا ہے:-

" یہ واقعہ مکی رجب کا معلوم ہوتا ہے کیونکہ روایات سے ثابت ہے کہ قریش کے نزدیک یہ حرام مہینہ تھا جس کی خلاف ورزی پر انھوں نے سخت احتجاج کیا تھا (دیکھیے قرآن) (برہان اکتوبر ۱۹۶۱ء ص ۲۰۹)

مکی رجب، ہجری کیلنڈر کے شوال سے مطابق ہے۔ یعنی موصوف کے نزدیک یہ واقعہ مکی رجب اور مدنی شوال کا ہے۔ روایات میں کوئی ضعیف روایت بھی ایسی موجود نہیں جو اس واقعے کو مدنی شوال کا واقعہ قرار دیتی ہو بلکہ تمام روایتیں متفق ہیں کہ یہ واقعہ رجب کا تھا لیکن میں اس سے قطع نظر کر کے چند باتیں عرض کرتا ہوں۔

جس رجب میں سریۂ ابن جحش واقع ہوا وہ صرف مکی رجب نہیں بلکہ مدنی رجب بھی تھا۔ موصوف نے قرآن کی جس آیت کی طرف اشارہ کیا ہے وہ اس بات کی پختہ دلیل ہے کہ کم سے کم اس واقعے کے وقت مکی اور مدنی رجب ایک تھا۔ رجب میں قتال کے واقعے پر صرف مشرکین مکہ ہی اعتراضات کی بوچھار نہیں کر رہے تھے بلکہ صحیح روایات سے ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اصحاب سریہ کو اس پر سرزنش کی تھی اور فرمایا تھا کہ میں نے تم لوگوں کو شہر حرام میں قتال کی اجازت نہیں دی تھی چنانچہ آپ نے مال غنیمت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ دوسرے مسلمان بھی صحابہؓ پر اعتراضات کر رہے تھے سخت اضطراب کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی اور اس سریے میں شریک صحابہ سخت افسردہ اور پریشان تھے۔ مدینے میں کوئی ایک آواز بھی بلند نہیں ہوئی جو ان اصحاب کو تسلی دیتی اور یہ کہتی کہ واقعہ دراصل شہر رجب کا نہیں بلکہ شہر شوال کا ہے۔ ایسے نازک وقت میں قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی۔

يَسْئَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيلِ اللهِ

لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ ماہ حرام میں لڑنا کیسا ہے۔ کہو اس میں لڑنا برا ہے مگر

وَكُفْرٌ بِهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَإِخْرَاجُ أَهْلِهِ مِنْهُ أَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ۔ البقرہ ر ۲۷

اللہ کے راستے سے روکنا اور اس کا انکار کرنا اور مسجد حرام سے روکنا اور حرم کے باشندوں کو اس سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ برا ہے اور فتنہ قتل سے شدید تر ہے

اس آیت میں اللہ تعالےٰ نے مشرکین کے سخت اعتراض کو تسلیم کرکے جواب دیا ہے یعنی مشرکین کا یہ قول صحیح ہے کہ واقعہ رجب میں ہوا۔ اب قابل غور بات یہ ہے کہ اگر قمری حساب کے لحاظ سے یہ واقعہ رجب کا نہیں بلکہ شوال کا ہوتا تو رجب میں اس قتال کے وقوع کو ہرگز تسلیم نہ کیا جاتا بلکہ کہا جاتا کہ دراصل یہ شہر حرام کا واقعہ نہیں بلکہ ایک ایسے مہینے کا واقعہ ہے جس میں قتال خود تمہارے نزدیک بھی جائز ہے۔ مشرکین کے اعتراض والزام کو قبول کرلینا اس بات کی دلیل ہے کہ کم سے کم اس واقعے کے وقت مکی اور مدنی مہینے ایک ساتھ چل رہے تھے جو مہینہ مکے میں رجب تھا وہ مدینے میں بھی رجب ہی تھا کوئی دوسرا مہینہ نہ تھا۔

ہمارے پاس مورخین سیرت کی جو صراحتیں موجود ہیں ان سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ خالص قمری حساب سے وہ رجب کا مہینہ تھا "پہلا غزوہ" کے عنوان سے اوپر جو تاریخی بیان نقل کیا گیا ہے اس سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے اس کے علاوہ قسطلانی نے صراحت کی ہے کہ یہ واقعہ ہجرت سے سترہویں مہینے رجب میں ہوا۔ رجب سترھواں مہینہ قمری ہی حساب سے ہوگا۔

قرآن کی یہ آیت اور کتب تاریخ وسیرت ہمیں یہ سوچنے پر بھی مجبور کرتی ہیں کہ آیا مکے میں بھی کبیسہ والی تقویم رائج تھی یا نہیں؟ مدینے میں اس کے رائج ہونے کا دعوے تو بالکل ایسا ہے جیسے کوئی دعوے کرے کہ عہد رسالت میں خالص شمسی تقویم رائج تھی۔

صلح حدیبیہ اس واقعے کے بارے میں تمام مورخین ومحدثین متفق ہیں کہ یہ ذی قعدہ ۶ھ کا واقعہ ہے اس سے اختلاف کرنے والی کوئی شاذ روایت بھی موجود نہیں ہے۔ ہمارے محترم دوست نے بھی یہی لکھا ہے لیکن قتل خسرو سے متعلق تاریخ طبری کی ایک روایت نے موصوف کو الجھن میں مبتلا کیا دیکھتے ہیں:۔

طبری نے ایران قدیم کے ذیل میں عکرمہ کے حوالے سے لکھا ہے:۔

"سو اللہ نے کسریٰ کو ہلاک کیا اور اس کی خبر رسول اللہ کے پاس حدیبیہ کے زمانے میں پہنچی تو خوش

آں حضرتؐ اور آپ کے جملہ ساتھی سرفراز ہوئے۔ (برہان نومبر ۱۹۷۰ء صفحہ)

اس کے بعد انھوں نے ابن خلدون کی ایک روایت نقل کی ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ کسریٰ ۱۰ رجمادی الاولیٰ ۷ھ کو قتل کیا گیا اور اس کی خبر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی دی گئی۔ پھر انھوں نے واقدی کی روایت نقل کی ہے جس میں یہ ہے کہ کسریٰ ۱۰ رجمادی الاولیٰ ۷ھ کو قتل کیا گیا۔

ان دونوں روایتوں میں ۷ھ کی صراحت طبری کی اس روایت کے خلاف پڑ رہی تھی جس کا حوالہ موصوف نے دیا ہے کیونکہ صلح حدیبیہ متفقہ طور پر ۶ھ کا واقعہ ہے اور اس موقع پر قتل کرنے کی خبر پہنچ چکی تھی لہٰذا ۷ھ کی صراحت صحیح نہیں ہو سکتی۔ اس لیے موصوف نے ۷ھ کو کتابت کی غلطی قرار دے دیا اور مورخین اسلام کے نزدیک قتل کسریٰ کی تاریخ ۱۰ رجمادی الاولیٰ ۶ھ بطور خود متعین کر دی۔ اس کے بعد انھوں نے تحریر فرمایا ہے کہ صلح حدیبیہ کی تاریخ ذیقعدہ ۶ھ میں مدنی تقویم سے ریکارڈ کی گئی تھی اور قتل کسریٰ کی تاریخ جمادی الاولیٰ ۶ھ کی تقویم سے ریکارڈ کی گئی تھی اور ذی قعدہ ۶ھ مدنی کی کیلنڈر میں جمادی الآخریٰ ۷ھ سے مطابق ہے۔ اس طرح ثابت ہو گیا کہ دونوں واقعات تقریباً ایک ہی زمانے کے ہیں۔ اگرچہ اب بھی دونوں واقعات میں ایک ماہ کا فرق ہے مگر یہ ناقابل لحاظ ہے کیونکہ ایران سے مکہ تک خبر پہنچنے میں ایک ماہ لگا ہو گا۔ موصوف کے خیال میں اس تحقیق سے طبری کی روایت، واقدی کی روایت اور صلح حدیبیہ کی تاریخ سب اپنی اپنی جگہ ٹھیک فٹ ہو جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ یورپین مورخین نے خسرو پرویز کے قتل کی جو تاریخ متعین کی ہے اس سے بھی مورخین اسلام کی تاریخ مطابق ہو جاتی ہے ــــ موصوف کی اس تحقیق پر چند باتیں ان کے مزید غور و فکر کے لیے عرض ہیں:

(۱) مورخین اسلام کے نزدیک خسرو پرویز کا قتل اور صلح حدیبیہ تقریباً ایک زمانے کے واقعات نہیں ہیں بلکہ خسرو پرویز کا قتل چھ ماہ بعد کا واقعہ ہے۔

(۲) واقدی اور ابن خلدون کی روایت میں ۷ھ کتابت کی غلطی نہیں ہے۔

(۳) طبری نے عکرمہ کے واسطے سے جو روایت درج کی ہے وہ احادیث و سیر کی متفقہ روایتوں کے خلاف ہے۔

ان تینوں باتوں کی دلیل یہ ہے کہ محدثین اور سیرت نگار دونوں اس پر متفق ہیں کہ صلح حدیبیہ کے بعد حضورؐ نے متعدد بادشاہوں کو دعوت الی الاسلام کے جو فرامین بھیجے تھے ان میں ایک فرمان آپ نے خسرو پرویز کو

بھیجا تھا اور وہ خسرو پرویز ہی تھا جس نے حضور کے نامۂ مبارک کو چاک کر دیا تھا اور جب آپ کو
اس کی خبر ملی تھی تو آپ نے فرمایا تھا کہ اس کی سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ وہ خسرو پرویز ہی تھا جس
کے قتل کی خبر آپ نے ان دو اشخاص کو دی تھی جو یمن کے کسریٰ گورنر باذان کا خط آپ کے پاس لائے
تھے اور باذان اس خبر کی صداقت ثابت ہو جانے کے بعد مسلمان ہو گئے تھے۔ دیار بکری نے شیرویہ کا
وہ خط بھی نقل کیا ہے جو باپ کو قتل کرنے کے بعد اس نے باذان کو لکھا تھا۔ (ج ۲ ص ۳۷)

خسرو پرویز کے قتل کی تاریخ ۱۰ جمادی الاولیٰ ۷ھ خود حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمی رضی اللہ
عنہ کی ایک حدیث میں موجود ہے جو حضور کا خط کسریٰ کے پاس لے گئے تھے۔ فتح الباری جلد ۸ باب
کتابۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم الیٰ کسریٰ وقیصر میں یہ حدیث نقل کی گئی ہے۔ اس کے آخری الفاظ یہ ہیں

قال وکان ذالک لیلۃ الثلثاء	انھوں نے کہا یہ واقعہ بروز سہ شنبہ
لعشر سنین من جمادی الاولیٰ فی	۱۰ جمادی الاولیٰ ۷ھ کو ہوا اور اللہ نے
سنۃ سبع وان اللہ سلط علیہ ابنہ	اس پر اس کے بیٹے شیرویہ کو مسلط کیا تو
شیرویہ فقتلہ	اس نے اس کو قتل کر دیا۔

یہ حدیث زرقانی نے بھی نقل کی ہے (جلد ۳ ص ۳۴۲) علامہ شبلی نے تاریخ طبری جلد ۳ کے
حوالے سے لکھا ہے کہ حضور نے یمن کے گورنر باذان کو خسرو پرویز ہی کے قتل کی خبر بھجوائی تھی۔ اس
طرح خود طبری کی یہ روایت ان کی اس روایت کے خلاف ہے جس کا حوالہ موصوف نے دیا ہے —
سیرت کی کتابوں میں سب سے قدیم کتاب سیرت ابن ہشام ہے اس میں بھی یہی ہے کہ جس کسریٰ نے اپنے
گورنر باذان کو حکم دیا تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دے اور جس کی ہلاکت کی خبر حضور نے باذان کو
بھیجی وہ اپنے بیٹے شیرویہ کے ہاتھوں مارا گیا (ج ۱ ص ۴۳) اس سے معلوم ہوا کہ ابن خلدون اور
واقدی کی روایت میں ۶ھ کی صراحت کتابت کی غلطی نہیں ہے۔ بلکہ متفقہ روایات کے عین مطابق ہے
راقم الحروف کا خیال یہ ہے کہ محض یورپین مورخین کی روایت کی بنا پر محدثین و مورخین سیرت
کے متفقہ قول کو رد کرنا صحیح نہ ہوگا۔ قتل خسرو پرویز کی تاریخ کے تعین کے لیے مزید تحقیق کی ضرورت ہے

عمرۃ القضاء یہ عمرہ متفقہ طور پر ذی قعدہ ۷ھ کا واقعہ ہے لیکن حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی
ایک حدیث آتی ہے جس میں انھوں نے کہا ہے کہ ایک عمرہ حضور نے ماہ رجب

میں کیا تھا لیکن جب حضرت عائشہ کو معلوم ہوا تو انھوں نے اس کی تردید کی اور فرمایا کہ حضورؐ نے کوئی عمرہ رجب میں نہیں کیا۔

موصوف نے حضرت ابن عمر کی حدیث کو اپنا دو تقویمی نظریہ ثابت کرنے کے لیے ایک ثبوت بنا لیا۔ انھوں نے لکھا ہے کہ عمرۃ القضاء مکی تقویم کے لحاظ سے ٹھیک رجب میں کیا گیا تھا۔ باقی رہی یہ بات کہ حضرت عائشہؓ نے حضرت ابن عمرؓ کی تردید و تغلیط کیوں کی تو اس کا جواب موصوف نے یہ دیا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے دو تقویمی کیلنڈر کے فرق کو نظر انداز فرما دیا۔ موصوف کو اپنے اس جواب سے خود تسلی ہو گئی ہو گی لیکن دوسروں کو اس جواب سے اطمینان نہ ہو گا۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت عروہ بن زبیر نے حضرت ابن عمر کی موجودگی میں حضرت عائشہ سے یہ پوچھا تھا کہ ابو عبدالرحمٰن یعنی حضرت عبداللہ بن عمر کہتے ہیں کہ حضورؐ نے ایک عمرہ رجب میں کیا تھا۔ یہ سنتے ہی حضرت عائشہ نے پرزور تردید کی وہ ان کی تردید کو سن رہے تھے لیکن انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یہاں دیکھنے کی بات یہ بھی ہے کہ یہ تینوں مہاجر ہیں ان میں سے کوئی انصاری نہیں ہے۔ اگر مہاجرین اپنے ساتھ مکی تقویم لے گئے ہوتے اور ۶ھ تک مسلمانوں کی دینی تقویم کی تقویم ہوتی تو کیا یہ قابل فہم بات ہے کہ حضرت عائشہ ایک صحابی کی ان کے منہ پر تغلیط کریں اور پھر وہ اس تغلیط کو سنکر خاموش رہ جائیں اور یہ نہ کہیں کہ اے ام المومنین میں نے رجب میں عمرے کی بات مکی تقویم کے لحاظ سے کہی ہے۔ اس کے معنی تو یہ ہوں گے کہ خود مہاجرین بھی مکی تقویم کو اس طرح بھول چکے تھے کہ وہ ان کے ذہن سے بالکل محو ہو گئی تھی۔ راقم الحروف کے نزدیک یہ بات عادۃً محال ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مدینے میں مکی تقویم کبھی نافذ ہی نہیں ہوئی۔ اس لیے اس کے یاد رہنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ خود موصوف کے مرتب کردہ مکی کیلنڈر میں ذی قعدہ ۶ھ مدنی جمادی الاخریٰ ۶ھ مکی سے مطابق ہے۔ اس حساب سے بھی رجب میں عمرے کا قول صحیح نہیں ہے۔

غزوۂ خیبر قدیم اور صحیح تاریخی روایات سے یہ ثابت ہے کہ غزوۂ خیبر اوائل ۷ھ کا واقعہ ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ذوالحجہ میں حدیبیہ سے واپس تشریف لائے اور محرم ۷ھ میں خیبر کی طرف روانہ ہوئے اور صفر ۷ھ میں خیبر فتح کر لیا گیا۔ واقدی نے ایک شاذ قول جمادی الاولیٰ کا تحریر کیا ہے۔ اس روایت کو شاید کسی سیرت نگار اور مورخ نے قابل اعتنا نہیں سمجھا ہے البتہ ہمارے فاضل

دوست نے اس کو لے لیا اور تحریر فرمایا کہ تاریخی اعتبار سے بھی صحیح معلوم ہوتا ہے کہ خیبر کا واقعہ صلح حدیبیہ سے چھ ماہ کے بعد ہوا تھا اور محرم ۷ھ اور جمادی ۷ھ کا اختلاف اس طرح دور ہو جاتا ہے کہ جمادی مدنی محرم ۷ھ مکی سے مطابق ہے یعنی محرم کی روایت مکی تقویم سے ریکارڈ کی گئی تھی اور جمادی کی روایت مدنی تقویم سے لکھی گئی تھی لہٰذا اختلاف دور ہو گیا۔ اس ناقابل اعتنا اختلاف کو دور کرنے کے لیے موصوف نے ٹھیک وہی طریقہ استعمال کیا ہے جس کی تفصیل غزوۂ عشیرہ میں گزر چکی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیبیہ سے واپسی اور خیبر کی طرف روانگی کے تمام توقیتی و تاریخی بیانات کو انھوں نے قابل ذکر بھی نہیں سمجھا ہے۔ گویا ابن اسحٰق کو کسی پرزے پر صرف غزوۂ خیبر اور محرم لکھا ہوا مل گیا تھا۔ انھوں نے غلط فہمی سے اس کو مدنی محرم سمجھ لیا اور اس کے بعد ان کے ذہن نے تمام دوسری باتیں خود گھڑ لیں اور انھوں نے اپنی تاریخ میں انھیں درج کر دیا ـــــ موصوف کا خیال جو کچھ بھی ہو قارئین زندگی کو مختصراً ائمہ سیرت کے بیانات پڑھ لینے چاہییں۔

ابن ہشام نے اپنی سند سے ابن اسحٰق کا جو بیان نقل کیا ہے وہ یہ ہے :۔

ابن اسحٰق نے کہا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ سے واپس آئے تو مدینے میں ذی الحجہ اور محرم کے بعض ایام مقیم رہے۔ پھر محرم کے بقیہ حصے میں خیبر کی طرف روانہ ہوئے۔

(سیرت ابن ہشام جلد ۳ ص [illegible])

یہ دیکھ لیجیے کہ ابن اسحٰق نے یہ بات یوں ہی لکھ دی یا ان تک اس کی روایت پہنچی تھی۔ زاد المعاد میں ہے :۔

"اور ابن اسحٰق نے کہا کہ مجھ سے زہری نے حدیث بیان کی عروہ سے، عروہ نے مروان بن الحکم اور مسور بن مخرمہ سے۔ ان دونوں نے عروہ سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلح حدیبیہ سے واپس ہوئے تو مکہ اور مدینے کے درمیان سورۂ فتح نازل ہوئی جس میں اللہ نے فتح خیبر کا وعدہ کیا تھا پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم ذوالحجہ میں مدینے پہنچے اور وہاں مقیم رہے یہاں تک کہ محرم میں خیبر کی طرف روانہ ہوئے۔"

(زاد المعاد ج ۱ ص [illegible] - فتح الباری جلد ۷ ص [illegible])

اب ہمیں دیکھنا چاہیے کہ اس بیان واقعہ میں ابن اسحٰق تنہا ہیں یا دوسرے ائمہ سیرت بھی ان کے

شریک ہیں۔

موسیٰ بن عقبہ نے کہا: "جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ سے مدینہ تشریف لائے تو مدینہ میں بیس دن یا اس کے قریب مقیم رہے۔ پھر غزوے کے لیے خیبر کی طرف روانہ ہوئے۔"

(زاد المعاد جلد ا، فتح الباری جلد ٧، زرقانی جلد ٢)

ابن عائذ نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے کہ حضورؐ حدیبیہ سے واپسی کے بعد دس دن مدینے میں مقیم رہے اور مغازی سلیمان التیمی میں ہے کہ آپ نے ١۵ دن قیام فرمایا۔"

(فتح الباری جلد ٧، زرقانی جلد ٢)

ائمۂ سیرت کی یہ مستند ترین صراحتیں بتا رہی ہیں کہ صلح حدیبیہ سے واپسی کے بعد آپ زیادہ سے زیادہ بیس دن مدینے میں مقیم رہے۔ اس کے بعد غزوۂ خیبر کے لیے روانہ ہوئے لیکن ہمارے فاضل دوست نے واقدی کے ایک شاذ اور ناقابل اعتنا قول کو صحیح ثابت کرنے کے لیے عملاً ان مستند روایتوں کی تغلیط کر دی اور غزوۂ خیبر کو صلح حدیبیہ سے چھ ماہ بعد کا واقعہ قرار دے دیا تا کہ ان کا دوقدیمی کیلنڈر صحیح ہو جائے۔ اگر کوئی موصوف کے اس حل سے مطمئن ہوتا ہے تو ہو۔ راقم الحروف کے نزدیک یہ طریقہ کار مستند ترین ذخیرۂ روایات کو بے وزن کر دینے کے مترادف ہے۔ اسی واقعے میں ابن حجر اور زرقانی نے ابو حامد کا ایک قول ٧ھ کا بھی لکھا ہے تو کیا ہمیں اس غلط قول کی تصحیح میں لگ جانا چاہیے۔

ایک اور بات کی طرف اشارہ کر دوں کہ ابن حجر نے واقدی کے ایک نسخے میں پڑھا تھا کہ یہ واقعہ صفر ٧ھ کا ہے۔ (فتح الباری جلد ٧) اس کے معنی یہ ہیں کہ واقدی کے مختلف نسخوں میں مختلف مہینے درج تھے۔ اگر صفر ٧ھ کو اختیار کر لیا جائے تو پھر کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا۔ اس لیے کہ خیبر صفر ٧ھ ہی میں فتح ہوا تھا۔

امام مالک اور ابن حزم کا جو قول آخر ٦ھ کا ہے اس کی بنیاد یہ ہے کہ انھوں نے ربیع الاول ١ھ سے سال شمار کیا ہے اس کے لحاظ سے محرم اور صفر ٧ھ کے آخری مہینے قرار پاتے ہیں۔ اس کے برخلاف جمہور مورخین نے محرم ١ھ سے سال شمار کیے ہیں جس کی بنا پر محرم سے ٧ھ شروع ہو گیا تھا اس طرح امام مالک اور ابن اسحٰق وغیرہما میں اختلاف باقی نہیں رہتا۔

موصوف نے غزوۂ خیبر کو صلح حدیبیہ سے چھ ماہ بعد کا واقعہ قرار دینے کی ایک دلیل یہ دی ہے

"تقریباً تمام سیرت کی کتابوں میں یہ روایتیں موجود ہیں کہ فتح خیبر کے بعد مسلمانوں کے ہاتھ ہزارہا من خشک کھجوروں کے ذخائر لگے تھے" (برہان دسمبر ۶۲ء ص ۳۴۵)

چونکہ کھجوروں کی فصل ستمبر، اکتوبر میں تیار ہوتی ہے۔ اس لیے یہ واقعہ ستمبر اکتوبر ہی کا ہو سکتا ہے۔ یہ ہے موصوف کا استدلال۔ پہلے تو عرض یہ ہے کہ معلوم نہیں سیرت کی کن کتابوں میں ہزارہا من خشک کھجوروں کے ذخائر ملنے کی روایت لکھی ہوئی ہے۔ موصوف نے ابن ہشام اور طبری کا حوالہ دیا ہے۔ طبری میرے سامنے نہیں ہے لیکن سیرت ابن ہشام میں یہ روایت تلاش کے باوجود نہیں ملی۔ قسطلانی اور زرقانی نے تمام روایتوں کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے ان میں بھی یہ روایت موجود نہیں ہے بلکہ زرقانی نے امام مالک اور بخاری و مسلم کے حوالے سے حضرت ابوہریرہ کی یہ حدیث نقل کی ہے کہ ہم نے خیبر فتح کیا تو ہمیں غنیمت میں سونا اور چاندی نہیں ملی بلکہ گائیں، اونٹ، متاع (سامان) اور باغات ملے (جلد ۲ ص ۲۴۵) میرا خیال ہے کہ سیرت ابن ہشام میں خیبر اور اس کے ملحقات کی زمین اور باغات کی تقسیم کا ذکر وسق (ایک پیمانہ) کی تعیین کے ساتھ کیا گیا ہے۔ شاید اس سے موصوف کو دھوکا ہوا ہے۔ اور بالفرض اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ہزارہا من خشک کھجوروں کے ذخائر ہاتھ لگے تھے تو اس سے یہ کیسے ثابت ہو جائے گا کہ غزوہ ستمبر میں ہوا۔ کیا گزشتہ سال کی فصل کے ذخائر ہاتھ نہیں لگ سکتے اور یہ کیا کوئی نادر بات ہے۔ سال کے ہر موسم میں دنیا بھر کے حجاج مدینہ منورہ جاتے ہیں اور ہزارہا من خشک کھجوریں اپنے ساتھ لے جاتے ہیں تو یہ کھجوریں ہر موسم میں کہاں سے آتی ہیں۔ ذخائر کو بلا دلیل اسی سال کی فصل کے ذخائر سمجھنا عجیب بات ہے۔ حضرت صفیہ کے ولیمے میں خشک کھجور، پنیر اور گھی کا ذکر بھی موصوف کے لیے اس بات کی دلیل بن گیا ہے کہ غزوہ خیبر ستمبر میں ہوا۔ میں تو اس طرح کے دلائل پڑھ کر حیران رہ جاتا ہوں۔

فتح مکہ فتح مکہ رمضان ۸ھ کا واقعہ ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ کوئی روایت ایسی موجود نہیں ہے جو اس کو کسی دوسرے مہینے کا واقعہ بتاتی ہو۔ البتہ دو تقویمی کیلنڈر اس میں اختلاف پیدا کر دیتا ہے۔ موصوف نے اس کو بھی رمضان کا واقعہ قرار دیا ہے اس لیے مدنی کیلنڈر کے اعتبار سے لازماً وہ صفر ۹ھ کا واقعہ قرار پاتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ تمام احادیث اور تاریخی روایات کے خلاف صرف مہینہ ہی نہیں بدلا بلکہ سال تک بدل گیا۔ موصوف نے اپنے دلائل کی بنیاد

سورۂ توبہ کی ابتدائی آیات یعنی لم سے کم آیت ۱ سے آیت ۲۸ تک پر رکھی ہے۔ اٹھائیسویں آیت میں مسلمانوں کو مخاطب کرکے کہا گیا ہے کہ مشرک ناپاک ہیں اس لیے اس سال کے بعد وہ مسجد حرام کے قریب نہ پھٹکنے پائیں ۔۔۔ موصوف نے حاشیے میں اپنے اس گمان کا اظہار کیا ہے کہ سورۂ توبہ کی ابتدائی آیات فتح مکہ سے پہلے نازل ہو چکی تھیں جن میں معاہدۂ حدیبیہ کی شکست کا اعلان تھا۔ کیونکہ اس معاہدے کو توڑے بغیر مکے کے خلاف کسی بھی قسم کی فوجی کارروائی ممکن نہ تھی۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ معاہدۂ حدیبیہ کو انہیں آیات نے توڑا تھا اس لیے کھلی بات ہے کہ انہیں فتح مکہ سے پہلے نازل ہو چکنا چاہیے۔

سب سے پہلے میں یہ عرض کرتا ہوں کہ آخر یہ کیا اصول ہے کہ کہیں تو موصوف کسی محض تاریخی روایت کو اپنی دلیل بنا کر دوسروں کے خیالات کی پرزور تردید کرتے ہیں اور کہیں صرف اپنے گمان پر صحیح روایات کو بھی قربان کر دیتے ہیں۔ یہ بات صحیح روایات سے ثابت ہے کہ سورۂ توبہ کی ابتدائی چالیس آیتیں ۹ھ میں نازل ہوئی تھیں اور اسی سال کے موسم حج میں حضرت علی نے ان کا اعلان کیا بلکہ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حج کے لیے حضرت صدیق کے روانہ ہو جانے کے بعد یہ آیتیں نازل ہوئی تھیں۔ اس کے بعد حضور نے حضرت علی کو ان آیات کے اعلان کے لیے روانہ کیا تھا۔ اگر یہ آیتیں فتح مکہ سے پہلے یا فتح مکہ کے وقت نازل ہو چکی ہوتیں تو کیا یہ ممکن تھا کہ حضور مکے میں ان کا اعلان نہ فرماتے۔ فتح مکہ کے حالات و واقعات تفصیل سے احادیث و سیر میں موجود ہیں اور اس موقع کے خطبات نبوی بھی محفوظ ہیں ان میں کہیں بھی ان آیات کا کوئی نشان ملتا ہے؟ سیرت النبی کے حاشیے میں سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ علامہ شبلی نے اپنے ایک خط میں اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ سورۂ توبہ کی ابتدائی آیتیں فتح مکہ کے وقت نازل ہوئی ہوں گی۔ (ج ۱ ص ۵۰۲) ممکن ہے موصوف کو علامہ شبلی کا خیال پسند آگیا ہو لیکن انہیں یہ تو دیکھ لینا چاہیے تھا کہ اس خیال کی بنیاد کیا ہے اور اس کے اثرات خود موصوف کے دیگر خیالات پر کیا پڑتے ہیں ۔۔۔ میں ذیل میں چند باتیں عرض کرتا ہوں تاکہ وہ ان پر غور فرمائیں۔

(۱) انھوں نے خود لکھا ہے کہ قریش نے معاہدے کے خلاف بنو بکر کی حمایت کی یہاں تک کہ بہت سے قریشی نوجوانوں نے رضاکارانہ جنگ میں حصہ لیا۔ اس کے بعد ان کی اپنی عبارت یہ ہے:۔

"خزاعہ چونکہ اسلام کے اتحادی تھے اور ان کی حفاظت مسلمانوں کے ذمہ تھی اس لیے حدیبیہ کا معاہدہ خود بخود ٹوٹ گیا اور مدینے سے اعلان کر دیا گیا کہ اب اس معاہدے کی کوئی قیمت نہیں قریش

تو یہ معلوم ہوتا کہ انھوں نے ابوسفیان کو تجدید معاہدے کے لیے مدینے بھیجا مگر یہ کامیاب نہ ہو سکا"

(برہان، دسمبر ص۳۴۴)

اس سے معلوم ہوا کہ معاہدہ قریش نے توڑا تھا مسلمانوں نے نہیں۔ مدینے سے اعلان بھی کر دیا گیا کہ اب معاہدے کی کوئی قیمت نہیں رہی۔ تجدید معاہدہ سے بھی انکار کر دیا گیا تو پھر یہ کہنا کس طرح صحیح ہوگا کہ سورۂ توبہ کی ابتدائی آیات میں معاہدۂ حدیبیہ کی شکست کا اعلان تھا اور اس معاہدے کو توڑے بغیر مکے کے خلاف فوجی کارروائی ممکن نہ تھی اس سے تو یہ نکلتا ہے کہ معاہدہ قریش نے نہیں بلکہ مسلمانوں نے توڑا تھا تاکہ وہ قریش کے خلاف فوجی کارروائی کر سکیں۔ موصوف کی ان دونوں باتوں میں مطابقت کیا ہے؟ پھر قابل غور بات یہ ہے کہ جب اعلان کو مشرکین مکہ تک پہنچانا ضروری تھا۔ اس کا ۸ھ سے پہلے تاریخ میں کہیں ذکر تک نہیں تو کیا شکست معاہدہ کا اعلان ان تک پہنچائے بغیر ہی مکے پر چڑھائی کر دی گئی تھی۔

(۲) موصوف نے بگمان غالب یہ لکھا ہے کہ ابتدائی آیتوں میں جن چار مہینوں کی رخصت کا ذکر ہے اس سے رمضان ۹ھ سے ذوالحجہ ۹ھ تک کا زمانہ مراد ہے۔ سوال یہ ہے کہ چار ماہ کی رخصت جب ۹ھ میں ہی ختم ہو چکی تھی تو پھر ۱۰ھ کے موسم حج میں کس چار مہینے کی رخصت کا اعلان کیا گیا تھا۔

(۳) موصوف نے لکھا ہے کہ ۹ھ کا حج مشرکین کا آخری حج تھا اس لیے کہ سورہ توبہ کی آیت نے ذوالحجہ ۹ھ کے بعد مشرکین کا داخلہ حرم میں حرام قرار دے دیا تھا تو یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ۱۰ھ میں اعلان کس کے لیے کیا گیا تھا۔ اس طرح ۱۰ھ کے حج میں اس آیت کا اعلان تو بالکل بے معنی ہو جاتا ہے کیونکہ "بعد عامہم ہذا" تو ۹ھ میں ختم ہو چکا تھا حالانکہ روایتوں میں آتا ہے کہ ۱۰ھ کے موسم حج میں ان آیتوں کا اعلان بار بار اور اس قدر زور و شور سے کیا گیا تھا کہ بعض صحابہ کا چیختے چیختے گلا پڑ گیا تھا (۴) موصوف نے لکھا ہے کہ

"معلوم ہوتا ہے کہ یہ آخری موسم حج تھا جس میں بنو تمیم کے سردار نے مقام حجر پر کھڑے ہو کر اعلان نسی کیا۔" برہان، دسمبر ص۳۵۱

عرض یہ ہے کہ جب ذوالحجہ ۹ھ کے بعد مشرکین کا مکے میں داخلہ حرام قرار دیا جا چکا تھا تو پھر اعلان نسی کے کیا معنی ہوں گے خصوصاً اس حال میں کہ موصوف نے ۹ھ کا حج قمری حساب سے قرار دیا ہے۔ کیا

ایک بے کار اور احمقانہ اعلان نسی تھا۔

(۵) موصوف کے نزدیک ۸ھ کا حج کی حساب سے ذوالحجہ میں کیا گیا تھا جو مدنی جمادی الاولیٰ کے مطابق تھا اور ان کے نزدیک ۹ھ کا حج قمری حساب سے ذوالحجہ میں کیا گیا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ دوسرا حج صرف سات مہینے کے بعد ادا کیا گیا۔ یہ ایک ایسا واقعہ تھا جس کا ذکر احادیث اور تاریخ میں ضرور ہونا چاہیے تھا لیکن کیا کوئی ضعیف روایت بھی موجود ہے جو یہ بتائے کہ ۸ھ اور ۹ھ کے حج میں صرف سات ماہ کا فرق تھا۔

(۶) موصوف نے لکھا ہے کہ کی تقویم کی تنسیخ[1] کا اعلان ۹ھ کے موسم حج میں کیا گیا تھا۔ موصوف کے

[1] اصول شرع میں کسی حکم شرعی کو کسی دوسرے حکم شرعی سے ختم کر دینے کا نام نسخ ہے۔ وہ حکم جس کو دوسرے حکم سے منسوخ کیا گیا ہو کبھی مامور بہ ہوتا ہے اور کبھی منہی عنہ۔ اگر مامور بہ ہو تو منسوخ ہونے کے بعد اس پر عمل صحیح نہیں رہتا اور اگر منہی عنہ ہو تو اس پر عمل جائز ہو جاتا ہے۔ ہر دو صورت میں دو حکم شرعی ضروری ہے۔ ایک نسخ سے پہلے والا حکم اور دوسرا اس کو ختم کرنے والا حکم۔ یہ بات بھی ذہن میں رکھنے کی ہے کہ کسی مامور بہ کو منسوخ کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا اور نہیں ہو سکتا کہ منسوخ ہونے سے پہلے اس پر عمل غلط، لغو اور باطل تھا بلکہ اس کے برعکس جب وقت تک وہ منسوخ نہیں کیا گیا تھا وہی قابل عمل، ضروری عند اللہ مقبول اور لائق اجر تھا۔ مثال کے طور پر جب حضور مدینے تشریف لائے تو امر الٰہی کے ماتحت آپ نے سولہ یا سترہ مہینے بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی۔ اس کے بعد قرآن نے اس کو منسوخ کر کے کعبہ کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا۔ اب بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرنا صحیح نہیں رہا لیکن جن لوگوں نے نسخ سے پہلے ادھر رخ کر کے نماز پڑھی اس کے بعد قرآن نے اس کو مقبول اور لائق اجر تھا اور اللہ نے اس عمل کو لغو اور باطل قرار نہیں دیا ۔ اس سے معلوم ہوا کہ انما النسیٔ زیادۃ فی الکفر کی آیت کو قاعدہ نسی کی تنسیخ کا اعلان کہنا بالکل غلط ہے۔ اس پر نسخ کی تعریف صادق نہیں آتی۔ کبھی ایک دن کے لیے بھی شریعت نے کسی کو نسی پر عمل کرنے کا حکم نہیں دیا ہے۔ دیگر دلائل کے علاوہ خود یہی ٹکڑا اس کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ اگر نسی پر کسی حکم شرعی کے ماتحت عمل ہو رہا ہوتا تو منسوخ کرتے وقت اس کو کفر کبھی نہ کہا جاتا۔ آخر جو چیز امر الٰہی کے تحت ہوتی تھی وہ کفر کس طرح ہو سکتی تھی ۔ اس کے علاوہ اس آیت کے مخاطب مکے کے مشرکین ہیں جو نسی پر عمل کرتے رہے تھے مدینے کے مسلمانوں کا اس سے ذرہ برابر تعلق نہیں ہے ۔ تنسیخ، تخصیص اور تحریم اصول شرع کی الگ الگ اصطلاحات ہیں ان کو ایک دوسرے کے ساتھ گڈمڈ کرنا صحیح نہیں ہے۔ بعض ناواقف لوگ تحریم خمر کو تنسیخ کہہ دیتے ہیں حالانکہ تحریم اور چیز ہے۔ تنسیخ اور چیز۔

کے خیال کے مطابق سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب مسلمانوں کی دینی تقویم بھی مکی ہی تقویم تھی تو پھر نسخ کے اعلان سے پہلے ۹ھ کا حج قمری حساب سے کس طرح ادا کیا گیا؟ کیا ۹ھ کی ابتدا میں اس اعلان کا کوئی ثبوت ہے؟

غزوۂ تبوک غزوۂ تبوک کو مکی رجب کا واقعہ قرار دینے کے لیے ہمارے فاضل دوست کو حج ابوبکر کی متفقہ روایات کو رد کرنا پڑا ہے۔ تمام مورخین و محدثین متفق ہیں کہ حج ابوبکر غزوۂ تبوک کے بعد کا واقعہ ہے — اپنی دلیل میں انھوں نے عکرمہ کا ایک قول نقل کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا عکرمہ کے منفرد قول پر تمام روایات کو قربان کر دیا جائے۔

موصوف نے لکھا ہے کہ حج ابوبکر میں حاجیان مدینہ کی تعداد کا کم ہونا اور حضرت ابوبکر و علی کے علاوہ کسی بڑی شخصیت کا شریک نہ ہونا بھی اس کی دلیل ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور اور دوسرے صحابہ غزوۂ تبوک کی تیاری کی وجہ سے حج میں شریک نہ ہوئے۔ اس دلیل کے بارے میں عرض ہے کہ حضرت صدیق کے ساتھ تین سو اشخاص مدینے سے گئے تھے۔ خود حضور نے اپنی طرف سے قربانی کے لیے بیس اونٹ بھیجے تھے۔ حضرت صدیق کی شخصیت حضور کے سوا سب سے بڑی تھی۔ شیعہ حضرات کے نزدیک حضور کے سوا حضرت علی کی شخصیت سب سے بڑی تھی۔ ان دونوں کے علاوہ حضرت سعد بن وقاص اس میں شریک تھے۔ جو عشرۂ مبشرہ میں ہیں۔ حضرت ابوہریرہ شریک تھے جو ایک جلیل القدر صحابی ہیں —

تو کیا موصوف کا مطلب یہ ہے کہ حضور کا خود اس حج میں شریک نہ ہونا اس کی دلیل ہے کہ وہ حج غزوۂ تبوک سے پہلے ہوا؟ حالانکہ اصل واقعہ یہ ہے کہ حج ابوبکر غزوۂ تبوک کے بعد ہوا تھا اور اس کے باوجود حضور اس میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ حضور کی عدم شرکت کا سبب غزوۂ تبوک کی تیاری نہ تھا۔

اس کے علاوہ حج ابوبکر کو مدنی ذوالحجہ اور غزوۂ تبوک کو مکی رجب کا واقعہ قرار دینے میں مہینے کے حساب کی جو شکل موصوف نے تجویز کی ہے وہ بہت ہی عجیب ہے۔ شکل یہ ہے کہ حضرت ابوبکر مدنی مہینے کے حساب سے آخر ذی قعدہ میں حج کو روانہ ہوئے۔ مدنی مہینے کے حساب سے ذوالحجہ میں انھوں نے حج ادا کیا اور وہاں مکی تقویم کی تنسیخ کا اعلان بھی کیا لیکن جب وہ حج کر کے واپس آئے تو مدینے میں مکی تقویم اب بھی رائج تھی اور مکی رجب موجود تھا۔ چنانچہ غزوۂ تبوک مکی ہی رجب میں واقع ہوا — تاریخی ثبوت کے بغیر مجرد دعوے کرنا کس قدر آسان کام ہے۔ آدمی کا جو جی چاہے لکھتا اور کہتا چلا جائے۔

تناسخ کا تنقیدی جائزہ

جناب سلطان مبین صاحب ایم اے

(آخری قسط)

تناسخ منفرد

اوپر کی مثالوں سے بالعموم یہی مترشح ہوتا ہے کہ تناسخ ایک مستقل عقیدہ ہے اور زندگیوں کے درمیان اسی کا سکہ چلتا ہے۔ اس کے اقتدار اعلیٰ میں کسی شرکت و مشارکت کی گنجائش نہیں ہے۔ مگر بھارتی دھرموں میں خلط و اختلاط کی وجہ سے ہم کو ایسے ابواب و حوالجات ملتے ہیں جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تناسخ و آخرت کم و بیش متبادل طور پر کام کرتے رہتے ہیں اور باہم دونوں میں داخل خارج ہوتے رہتے ہیں۔ تناسخ و آخرت باہم سہیم و تشارک ہیں اور مل جل کر زندگی کی گاڑی کھینچتے چلے جاتے ہیں۔

تناسخ متشارک کے حوالہ جات

دیوی پران: ۹ : ۳۳ : ۲ — ۱۲۶

(۲) جو شخص طاقت کے غرور سے سخت کلامی کے ذریعے بھائیوں کو جلاتا ہے وہ قومی شخص آگ کے حوض میں جاتا ہے۔ (۳) وہ بالوں کی تعداد کے برابر سال تک آگ میں رہ کر تین جنم تک بجلی سے جلے ہوئے مویشی کا جنم پاتا ہے۔ (۴) گھر پر آئے ہوئے جلے بھنے، بھوکے پیاسے برہمن کو جب وقوف شخص نہیں کھلاتا پلاتا ہے وہ تپتے ہوئے حوض میں جاتا ہے۔ (۵) وہاں وہ برہمن کے بالوں کی تعداد کے برابر سال تکلیف دہ تپتی ہوئی جگہ اور تپتے ہوئے بستر پر رہنے کے بعد سات جنم تک چڑیا رہتا ہے۔ (۶) اتوار، سنکرانتی اور اماوس کے دن جو شخص کپڑے کو ریہ دھوتا ہے۔ (۷) وہ تاگوں کی گنتی کے برابر سال تک ریہ کے حوض میں رہتا ہے اور پھر بھارت میں سات جنم تک گدھے کا جنم پاتا ہے (۸) جو انسان دیوی، وید و شاستر یا پرانوں کی شکایت کرتا ہے۔ (۹) برہما، بشنو اور شنکر کی شکایت

کرنے والا انسان، پاروتی، سرسوتی وغیرہ دیویوں کی شکایت کرنے والا انسان (۱۰) یہ سب دوزخ میں
اس خطرناک کھتے میں جاتے ہیں جس سے بڑھ کر تکلیف دہ کھتہ اور ہو ہی نہیں سکتا۔ (۱۱) اور وہاں چودہ
کلپ تک رہ کر پھر سانپ کی "یونی" کو جاتا ہے۔ دیوی کی بدگوئی کے گناہ کا کوئی کفارہ نہیں ہے
(۲۳) اگر برہمن کو چیز دے کر اسے دوسرے کو دے دے تو وہ چربی کے کھتے میں رہتا ہے اور سو
سال تک اس کو کھاتا رہتا ہے۔ (۲۴) اور پھر بھارت میں سات جنم تک گرگٹ ہوتا ہے۔ بعدہٗ بڑا
بدشکل، مفلس، کم عمر ہوتا ہے۔ (۲۷) جو شخص ستا کر برہمن کو مارتا ہے اور خون بہاتا ہے وہ خون کے
کنڈ میں رہتا ہے اور سو سال تک خون کھاتا رہتا ہے۔ (۲۸) اور پھر بھارت میں سات جنم تک شیر
ہوتا ہے۔ اس طرح انسان بتدریج پاکیزہ ہوتا ہے۔ (۲۹) جو شخص گاتے ہوئے بھگت کو دیکھ کر
رونگٹا کھڑا کر کے روتا ہے یا شری کرشن کے اوصاف کے گیت پڑھتا ہے۔ (۳۰) آنسو کے کنڈ میں رہتا
ہے اور سو سال تک آنسو کھاتا رہتا ہے۔ پھر تین جنم تک چنڈال ہوتا ہے بعدہٗ پاکیزہ ہوتا ہے۔ (۳۲)
جو شخص بہرے پر ہنستا ہے یا غرور سے اس کی شکایت کرتا ہے وہ کان کی میل کے کنڈ میں پڑا رہتا ہے اور
سو سال تک کھونٹ کھاتا رہتا ہے۔ (۳۴) اس کے بعد سات جنم تک بہرا اور مفلس رہتا ہے اور سات
جنم تک ناقص الاعضا رہتا ہے۔ پھر قطعی طور پر پاک ہو جاتا ہے۔ (۳۷) اپنی لڑکی کی پرورش کر کے
جو شخص اسے فروخت کرتا ہے۔ (۳۸) روپیہ کی لالچ کے سبب سے وہ بڑا جاہل گوشت کے کنڈ میں
جاتا ہے۔ لڑکی کے بال برابر سالوں تک وہ کچا گوشت کھاتا ہوا وہاں پڑا رہتا ہے۔ (۳۹) یم راج کے سپاہی
اس کو ڈنڈے سے پیٹتے ہیں۔ اس کے سر پر گوشت کی گٹھری لاد دیتے ہیں وہ بھوک سے خون چاٹتا رہتا
ہے۔ (۴۰) پھر بھارت میں ساٹھ ہزار سال تک لڑکی کے پاخانے کا کیڑا ہوتا ہے اور سات جنم تک بہلیا
ہوتا ہے۔ (۴۱) وہ تین جنم تک سور اور سات جنم تک مرغ رہتا ہے۔ پھر سات جنم تک بھارت میں
مینڈک اور جونک رہتا ہے۔ (۴۲) اور پھر سات جنم تک کوا رہتا ہے بعدہٗ حتمی پاکیزگی پاتا ہے۔
(۴۴) جو شخص بھارت میں مٹی کے لنگ کو "بال سمیت" بھینٹ چڑھاتا ہے۔ (۴۵) مٹی کے ذرہ برابر
سال تک بال کے کنڈ میں رہتا ہے اور پھر شنکر جی کی ناراضگی سے یونانی نسل میں پیدا ہوتا ہے۔ (۴۶)
اور سو سال تک پاک ہو کر قطعی طور پر "کرشش" ہوتا ہے۔ (۴۹) نالیہ اور حافظہ کے اناج کو جو شخص کھاتا
ہے۔ (۵۰) وہ سو سال تک دہکتے ہوئے لوہے کے حوض میں پڑتا ہے وہ سات جنم تک کووں کے مٹھے

کو پاتا ہے۔(۵۱) غریب اور ناسوری ہو کر پھر پاکیزہ ہوتا ہے۔(۵۲) شودر کے ذریعے دھو
کیے جانے پر جو شخص شودر کا اناج کھاتا ہے۔(۵۳) وہ برہمن کھولتے ہوئے شراب کے حوض میں سو سال
پڑتا ہے اور پھر سات جنم تک شودر کی نذر گزارنے والا برہمن ہوتا ہے۔(۵۴) اور وہ شودروں
کی نذر پر زندگی گزارتا ہے۔ پھر قطعی طور پر پاک ہوتا ہے۔(۶۴) شودر کی نذر گزارنے والا شودر کا
پیاز خور برہمن۔(۶۵) شودروں کے مردے کو جلانے والا برہمن یقینی طور پر پیپ کے کنڈ میں پڑتا ہے۔
اور بالوں کی گنتی برابر سال تک یم راج کی سزا کو جھیلتا ہے۔ اے وفا شعار (۶۶) یم راج کے سپاہی
اس کو مارتے ہیں وہ پیپ کھاتا ہوا پڑا رہتا ہے۔ بعدہٗ بھارت میں آکر سات جنم تک شودر ہوتا ہے
(۶۷) اور وہ بدبخت مریض، غریب، بہرا اور گونگا ہوتا ہے۔(۷۹) جو نا سمجھ راجہ روپے کے لالچ سے
رعایا پر جرمانہ عائد کرتا ہے وہ یقینی طور پر بالوں کی تعداد کے برابر سالوں تک مچھروں کے کنڈ میں رہتا ہے
(۸۰) بعدہٗ وہ بھارت میں سات جنم تک مچھر رہتا ہے۔ پھر وہ ناقص الاعضاء انسان ہوتا ہے اور
(گناہ کے) مرض سے یقینی طور پر پاک ہو جاتا ہے۔(۹۰) بھارت میں جو انسان دیوتا اور برہمن کے
سونا کو چراتا ہے وہ یقینی طور پر اپنے بالوں کی تعداد کے برابر سالوں تک "منقص کنڈ" میں رہتا ہے۔(۹۱) یم
راج کے سپاہی اس کو پیٹتے ہیں جس سے اس کی آنکھ پھوٹ جاتی ہے وہ وہاں پاخانہ کھاتا ہوا پڑا
رہتا ہے۔ بعدہٗ تین جنم تک اندھا ہوتا ہے۔(۹۲) سات جنم تک بھارت میں بے رحم، بڑا گنہگار، مفلس
سنار ہوتا ہے اور پھر سونے کا سوداگر ہوتا ہے۔(۹۷) جو شخص دیوتاؤں اور برہمنوں کے دھن، دودھ، دہی
گھی اور کپڑوں کو چراتا ہے وہ دہکتے ہوئے پتھر کے کنڈ میں اپنے بالوں کی تعداد کے برابر سالوں تک حتمی طور
پر رہتا ہے۔(۹۸) وہ تین جنم تک کانسہ گر ہوتا ہے۔ پھر تین جنم تک "سفید جلد والا" ہوتا ہے۔ پھر ایک جنم
برص سفیدا: پھر دوسرے جنم میں سفید پرندہ ہوتا ہے۔(۹۹) پھر خون کی خرابی کا مریض اور خارشتی انسان
ہوتا ہے اور پھر سات جنم تک کم عمری میں مر مر کر پاکیزہ ہوتا ہے۔(۱۰۰) جو انسان دیوتا اور برہمن کے
تیل یا کانسہ کے برتن چراتا ہے وہ تیز پتھروں کے کنڈ میں اپنے بال برابر سال تک رہتا ہے۔(۱۰۱)
پھر وہ سات جنم تک بھارت میں گھوڑے کا جنم پاتا ہے۔ پھر وہ "فضیل الاعضاء" (زیادہ عضو والا) ہوتا
ہے۔ پھر پاؤں کا مریض ہو کر پاک ہوتا ہے۔(۱۰۴) بھارت میں جو برہمن "غیر ہندو" کی خدمت کرتا ہے یا
سیاہی سازی کرتا ہے وہ سزا کا مستحق بال برابر سال تک سیاہی کے حوض میں رہتا ہے۔(۱۰۵) وہاں وہ

یم راج کے سپاہیوں سے مار کھاتا ہوا سیاہی کھاتا ہوا پڑا رہتا ہے۔ پھر وہ تین جنم تک کالا جانور رہتا ہے۔ (۱۰۶) اور تین جنم تک بکرا اور تین جنم تک سیاہ رنگ رہتا ہے۔ پھر وہ انسان تاڑ کا درخت ہو کر پاک وصاف ہو جاتا ہے۔ (۱۰۷) جو شخص دیوتا یا برہمن کا غلہ فصل، پان چوکی اور پلنگ چراتا ہے وہ چمڑے کے کنڈ میں جاتا ہے۔ (۱۰۸) یم راج کے سپاہیوں سے پیٹا جاتا ہوا وہ سو سال تک رہتا ہے۔ پھر وہ مینڈھے کا جنم پاتا ہے۔ پھر تین جنم تک مرغ ہو جاتا ہے۔ (۱۰۹) پھر وہ بندر ہوتا ہے اور زمین پر کھانسی کا مریض، لاولد، مفلس، اور کم عمر ہو کر پاک ہوتا ہے۔ (۱۱۰) جو انسان روپیہ چرا کر برہمنوں کو دھوکا دیتا ہے وہ سزا پاتا ہوا سو سال تک کولھو کے کنڈ میں پڑتا ہے۔ (۱۱۱) پھر وہ تین جنم تک تیلی ہوتا ہے مریض بیمار اور لاولد ہو کر پاک ہوتا ہے۔ (۱۱۲) جو انسان برہمنوں اور گایوں کو فریب دیتا ہے وہ بھول بھلیاں کنڈ میں دو سو سال تک رہتا ہے وہ سات جنم تک کم عضو اور کم عضو ہوتا ہے۔ مفلس، لاولد اور لازدیج ہو کر پاک ہوتا ہے۔ (۱۲۲) جو قوی انسان طاقت، فریب یا قتل سے بھارت میں دوسرے کی آبائی زمین کو غصب کرتا ہے۔ (۱۲۳) وہ "سوزن تپیدہ" میں گرتا ہے اور شب و روز تکلیف اٹھاتا ہے۔ کھولتے ہوئے تیل میں جس طرح ہمیشہ جاندار مر مر جاتے ہیں۔ (۱۲۴) اس طرح وہ عذاب میں خاکستر ہو کر فنا نہیں ہوتا۔ گنہگار سات "منونتر" تک جلتا ہوا پڑا رہتا ہے۔ (۱۲۵) یم راج کے سپاہیوں سے سزا پاتا ہوا بھوکا پیاسا چلاتا رہتا ہے۔ بعدہ ساٹھ ہزار سال تک پاخانے کا کیڑا ہوتا ہے۔ (۱۲۶) پھر وہ بے زمین مسکین ہو کر پاک ہو جاتا ہے۔ بعد ازاں پنا (انسانی) جسم پا کر نیک کام کرتا ہے۔ دیوی بھاگوت: ۹: ۳۳: ۱۰۲

دیوی پران کا یہ باب تناسخ تشارک کی روشن مثال ہے۔ بادی النظر میں تناسخ انسان وغیرہ کے درمیان تبادلہ ہے۔ مگر حقیقتاً تناسخ کا ذیل چارہ سیاہ اور نباتات کی دنیا میں بھی ہے۔ گنہگار روح کو کانسہ و پتھر، گھاس و درخت ہونا پڑتا ہے۔ متعدد رشیوں اور بھگتوں کو درخت تارک کی صورت فرمایا گیا ہے۔

تناسخ کے متکلمین نے کبھی کبھی تطابق الفعل بالفعل کے طور پر تناسخ کو معاکسہ

تناسخ یا معاکسہ

کے درجے تک پہنچا دیا ہے۔ یعنی گناہ جس جسم و جہت کے ساتھ واقع ہوتا ہے سزا بھی اسی جسم و جہت کے ساتھ واقع ہو گی۔

(۳) جو جس جس جسم جو جو عمل کرتا ہے اسی اسی جسم سے اس پھل کو پاتا ہے۔ (۴) انسان جن جن صورتوں میں جو بھلا برا کرتا ہے انہیں انہیں صورتوں میں جنم بعد جنم پاداش پاتا ہے۔ مہابھارت: انوشاسن

(۲۶) قاتل یقیناً قتل کیا جاتا ہے۔ کھانے والا (گوشت خور) بھی قتل کیا جائے گا۔ راجہ غصہ کرنے والا بھی معتوب ہوتا ہے اس سے ناراض ہوا جائے گا۔ (۲۷) جو جس جس جسم سے جو جو عمل کرتا ہے اسی اسی جسم سے اس اس پھل کو پاتا ہے۔ مہا بھارت انوشاسن: ۱۱۶: ۲۶، ۲۷

یعنی شکاری اگر ہرن کو نیزے سے شکار کرتا ہے تو دوسرے جنم میں شکاری کو ہرن بنایا جائے گا اور ہرن کو شکاری بنا دیا جائے گا۔ پھر اس قتل و خون کا عمل بھی نیزے کے وسیلے سے انجام دیا جائے گا۔ یقیناً جزائے کامل کی یہی صورت فوری طور پر سمجھ میں آتی ہے اور شاید اس سے عمدہ بدلہ دینے کا طریقہ سوچا نہیں جا سکتا۔ مگر یہ حسین ترین پر تکلف اصول بڑی جلدی اپنی نااہلیت کا ثبوت دے دیتا ہے مقروض نے بالقصد مہاجن کے قرض کو ادا نہیں کیا۔ چور نے چوری کیا۔ کیا دوسرے جنم میں مقروض کو مہاجن بنا کر سزا دی جا سکتی ہے۔ چوری کی سزا کا معاملہ و مکافات (کفو بہ کفو) کیا ہوگا۔ چور کو مسروق منہ اور مسروق منہ کو چور بنا کر کیا بدلہ دلا دیا جائے۔

ختم شد

(صفحہ ۴۹ کا بقیہ)

حرفِ آخر میرے نزدیک بہت سے دینی اور تاریخی مسلمات کو توڑ کر غزوات کے شرف موسم کو موجودہ عیسوی کیلنڈر کے مطابق ٹھیک کر لینا کوئی مناسب حل نہیں ہے۔ موصوف کی کوشش تاریخی اختلافات کو دور کرنے میں نہیں بلکہ دو تقویمی کیلنڈر کو زبردستی صحیح ثابت کرنے میں صرف ہوئی ہے اور یہ بحیثیت مجموعی واقعات سیرت کے لیے نفع کا سودا نہیں ہے۔ البتہ اس کے ذریعے ایک ماڈرن تاریخ بنائی جا سکتی ہے۔

اسقاطِ حمل کا قانونی جواز

ہندوستان اور پاکستان دونوں ہی ملکوں میں خاندانی منصوبہ بندی اور صحیح تعبیر کے لحاظ سے قطع نسل پر بہت زور دیا جا رہا ہے اور دونوں جگہ کی حکومتیں اس پر بے دریغ روپیہ صرف کر رہی ہیں لیکن لوپ کے استعمال، دواؤں کے استعمال اور دیگر تدبیروں سے بھی افزائش نسل میں خاطر خواہ کمی واقع نہیں ہو رہی ہے۔ اس لیے ہمارے ملک میں اب یہ سوچا جا رہا ہے کہ عورتوں کو اسقاط حمل کا قانونی جواز عطا کر دیا جائے۔ رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لیے بیانات و مقالات شائع کیے جا رہے ہیں۔ ہمارے مسلمان وزیر تعلیم اس کو جائز قرار دینے کے بڑے حامیوں میں ہیں ان کے متعدد بیانات چھپ چکے ہیں۔ اور ان پر اخبارات و رسائل میں تبصرے اور تنقیدیں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ ۱۰ رجون ۱۹۶۶ء کے اخبار اسٹیٹسمین میں ڈاکٹر اس چندر سیکھر ایم۔ پی Dr. S. Chandra sekher کا ایک مقالہ شائع ہوا تھا۔ اس مقالے میں بھی اس کو جائز قرار دینے کی حمایت کی گئی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے بھی ہمیں واقف رہنا چاہیے۔ مقالہ نگار نے اپنا نقطۂ نظر مرتب انداز میں پیش کیا ہے اور مذہبی دلیل کو چھوڑ کر شاید تمام دلائل جمع کر دیے ہیں۔ ہم ذیل میں ان کے مقالے کی تلخیص دے رہے ہیں۔ اس کے بعد بہت اختصار کے ساتھ اس پر تبصرہ بھی کریں گے۔

(ادارہ)

دنیا کے ابتدائی غیر تعلیم یافتہ عہد سے لے کر موجودہ ترقی یافتہ عہد تک انسانی معاشروں میں مختلف وجوہ واسباب کے پیش نظر اسقاطِ حمل پر برابر عمل کیا جا رہا ہے۔ ان وجوہ واسباب میں چند نمایاں اسباب یہ ہیں:-

زنا کاری۔ قانونی سن بلوغ سے کم عمر کی ناکتخدا لڑکی کا حمل۔ ہونے والی ماں کی صحت اور ا

ندگی کا استحقاق ، ایک کے بعد دوسرے حمل کے درمیان مدت کی کمی ، ایام رضاعت کا حمل سے تحفظ کرنے کا خیال ۔ عام طور سے ان چھ اسباب کی بنا پر اسقاط حمل کرایا جاتا ہے ۔

اگرچہ پہلے بھی اور اب بھی اسقاط حمل پر بڑی وسعت کے ساتھ عمل ہوتا رہا ہے اور ہو رہا ہے لیکن کے باوجود ہر معاشرے نے اس پر پابندی عائد کرنے کی مختلف تدبیریں اختیار کی ہیں ۔ عام ازیں کہ وہ جی دباؤ ہو یا پنچایتی سزائیں ہوں یا حکومتوں کی قانونی پابندیاں ۔ ہر سماج نے اس پر کنٹرول حاصل نا چاہا ہے ۔

اس زمانے میں اسقاط صرف سماجی اور انسانی مسئلہ نہیں ہے بلکہ طبی (میڈیکل) اور قانونی (لیگل) مسئلہ ہے ۔ آج کسی حکومت کے ترقی یافتہ اور ہمدرد انسانیت ہونے کو اس بات سے جانچا جاسکتا ہے سقاط کے بارے میں اس کا رویہ کیا ہے ـــــ مہذب ممالک جیسے اسکنڈی نیویا (سوئیڈن ناروے رک) اور مشرقی یورپ کے تقریباً تمام سوشلسٹ ممالک میں مختلف وجوہ سے اسقاط کی اجازت حاصل جاسکتی ہے لیکن غیر مہذب ممالک جیسے امریکہ میں کوئی وجہ بھی اسقاطِ حمل کے قانونی جواز کے لیے کافی ہا سمجھی جاتی ۔ یہاں تک کہ محرمات کے ساتھ بدکاری یا کوئی بھی سماجی وجہ اسقاط کو جائز قرار نہیں دیتی ۔

ہمارے اپنے ملک کے نقطہ نظر سے اسقاط کے قانونی جواز پر آزادانہ بھی غور کرنا چاہیے اور کثرت دی کے مسئلے کو سامنے رکھ کر بھی غور کرنا چاہیے ۔ اس لیے سب سے پہلے ہم اس کو عزت و وقار اور ضرورت نقطہ نظر سے جانچیں گے ۔ اس کے بعد اس نقطہ نظر سے کہ یہ ہمارے ملک کی تیز رفتار کثرتِ آبادی کے کا ایک جواب ہے ۔

...طلاح کا مفہوم

ابورشن (اسقاطِ حمل) کیا ہے ؟ (میں خود بخود گر جانے والے حمل کے بارے میں گفتگو نہیں کر رہا ہوں اس لیے کہ یہ ہمارے کنٹرول سے باہر ہے بلکہ میں اس قاطِ حمل کے بارے میں گفتگو کروں گا جس کی ہم ترغیب دے رہے ہیں) مطلوب اسقاطِ حمل کا مفہوم یہ کہ حمل کی ایک خاص مدت تک نا مطلوب حمل کو بالقصد ختم کرا دیا جائے ۔ یہ گویا قدرتی عمل میں ایک سانی دخل اندازی کا نام ہے ـــــ دوسرا سوال یہ ہے کہ اسقاطِ حمل کی تدبیر کون اختیار کرتا ہے م لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ زیادہ تر بن بیاہی لڑکیاں سماج کے سخت رویے سے ڈر کر اپنے ناجائز حمل کو رانے کی تدبیر اختیار کرتی ہیں لیکن یہ خیال غلط ہے ۔ اس بات کا قابل اعتماد ثبوت موجود ہے کہ بن بیاہی

لڑکیوں کے مقابلے میں بہت زیادہ شادی شدہ عورتیں اسقاط کی تدبیر اختیار کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر ڈنمارک میں ۷۰٪، چلی میں ۵۵٪، جاپان میں ۶۰٪ اور امریکہ میں تقریباً ۵۵٪ اسقاط حمل شادی شدہ عورتیں کراتی ہیں۔

ہمارے ملک میں اسقاط کے سرکاری اعداد و شمار مہیا نہیں ہیں لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے ملک میں بھی وہی تناسب ہوگا جو دنیا کے دوسرے ممالک میں ہے بلکہ اس لحاظ سے کہ ہمارے ملک میں شادی شدہ عورتیں زیادہ ہیں اور شادی بھی نسبتاً کم عمر میں ہو جاتی ہے ان کے اسقاط حمل کی تدبیر اختیار کرنے کا تناسب دوسرے ممالک سے زیادہ ہی ہوگا۔

معمولاً ایسی عورتیں جن کے چند بچے ہوتے ہیں اور وہ مزید پیدائش کو روکنے میں ناکام رہتی ہیں صحت، اقتصادیات اور سماجی وجوہ سے اسقاط کی تدبیر اختیار کرتی ہیں اور اس طرح کے بہت سے مواقع میں انفرادی، خاندانی، طبقاتی اور قومی نقطۂ نظر سے اسقاطِ حمل کی تدبیر دوسری تدبیروں کے مقابلے میں قابل ترجیح ہوتی ہے۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ غیر قانونی اسقاط کا عمل کس قسم کے ڈاکٹروں کے ذریعے کرایا جاتا ہے اور کیا یہ عمل خطرناک ہوتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قابل حصول بین الاقوامی اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ اسقاطوں کی بڑی تعداد لائق اور تربیت یافتہ ڈاکٹروں اور سرجنوں کے ذریعے عمل میں لائی جاتی ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ کچھ عورتیں غیر صحت بخش دواؤں کی خوراکیں استعمال کرتی ہیں اور میلی کچیلی دائیوں اور اناڑی طبیبوں کے ذریعے اسقاط کراتی ہیں جن کا طریقہ پرانی کہاوتوں پر مبنی اور خطرناک ہوتا ہے۔ مغربی ممالک میں ایسے واقعات کم ہوتے ہیں لیکن ہمارے ملک میں زیادہ تعداد دائیوں اور عطائیوں ہی کے ذریعے یہ کام کراتی ہے۔ امریکہ کے ایک محتاط اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں ۹۰٪ اسقاط سند یافتہ ڈاکٹروں کے ذریعے کرایا جاتا ہے۔ یہ بات حیرت انگیز ہے کہ جب امریکہ میں اسقاط غیر قانونی ہے تو پابند اصول ڈاکٹروں کی بہت بڑی تعداد یہ غیر قانونی کام کس طرح انجام دیتی ہے۔ یہ بات قرین عقل نہیں ہے کہ تمام ڈاکٹروں کا محرک صرف حصول زر ہوگا بلکہ غالب قرینہ یہ ہے کہ جذبۂ رحم اور انسانیت دوستی بھی انہیں اس کام پر آمادہ کرتی ہوگی۔

اسقاط کے خطرناک ہونے کا جو سوال ہے اس کا سادہ جواب یہ ہے کہ عمل اسقاط خطرناک نہیں

ہے۔ اگر یہ عمل اپنے صحیح وقت پر اور سند یافتہ ڈاکٹروں کے ذریعے کرایا جائے تو خطرناک نہیں ہوتا۔
روما میں تقریباً ڈھائی لاکھ اسقاط کے واقعات کا تازہ مطالعہ بتاتا ہے کہ ایک لاکھ واقعات میں موت کا تناسب چھ سے بھی کم تھا۔ ہنگری میں اسقاطِ حمل بالکل ایک قانونی عمل ہے اور سرکاری سپتالوں میں یہ کام کیا جاتا ہے۔ ہندستان سمیت چند دوسرے ممالک کے اندر عام امراض میں موت کا تناسب اس سے زیادہ ہے۔ حیاتیات (بائولاجی) کے ایک ممتاز ماہر کا قول ہے کہ عام حالات میں بچوں کی ولادت محتاط عمل اسقاط کے مقابلے میں چار گنا زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔

حمل کی دوسری سہ ماہی میں اسقاط یقیناً خطرناک ہوتا ہے۔ ہنگری کی رپورٹ اور گزٹ کہ پہلی سہ ماہی میں اسقاط کرانے سے فی لاکھ چھ سے بھی کم موتیں واقع ہوتی ہیں اور روس کی رپورٹ یہ بھی ہے کہ دوسری سہ ماہی میں موت کا تناسب فی لاکھ تین سو تک پہنچ جاتا ہے۔ پہلی سہ ماہی کے مقابلہ میں پچاس گنا زیادہ۔

یہاں ایک سوال اور ہے۔ کیا اسقاط عورتوں کو زبردست نقصان پہنچانے کا سبب نہیں ہے؟ امریکہ کی ایک رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسقاط کی وجہ سے نو فی صدی عورتیں نفسیاتی خلل میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ لیکن اس کا سبب اسقاط نہیں ہے بلکہ اس عمل کے بارے میں سوسائٹی کی بدعقیدگی اس کا سبب ہے۔ سوسائٹی چونکہ اس عمل کو ناجائز اور برا سمجھتی ہے۔ اس لیے عورتیں اس سے متاثر ہو جاتی ہیں۔ اگر سوسائٹی اپنا خیال بدل دے اور حکومت کا قانون بھی اس کو جائز قرار دے دے تو یہ نفسیاتی خلل یا جسمانی نقصانات ختم ہو جائیں گے۔

آپریشن مشکل نہیں ہے

آخری دو سوال اور ہیں۔ کیا عمل اسقاط ایک مشکل آپریشن ہے؟ اور کیا چند دفعہ کے اسقاط سے بانجھ پن ہو جاتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اسقاط مشکل آپریشن نہیں ہے۔ آپریشن کے متعدد طریقے ہیں لیکن آج کل عام طور سے D اور C کے طریقے پسند کیے جاتے ہیں۔ ہر ڈاکٹر جو وہی اپنی ڈگری کا مستحق ہے اپنے کلینک (مطب) میں یہ آپریشن کر سکتا ہے۔ یہ بات بہت مشہور ہے کہ اس طرح کے کئی آپریشن کرنے سے عورت بانجھ ہو جاتی ہے لیکن یہ شہرت غلط ہے ـــــ بیس سال کے اندر جاپان میں لاکھوں آپریشن کیے گئے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ متعدد بار آپریشن کرنے سے بھی بانجھ پن پیدا نہیں ہوتا۔

اب استقاط کا دوسرا پہلو لیجیے۔ یہ کثرت آبادی کے مسئلے کا ایک جواب ہے۔ ہمارے ملک میں اس مسئلے کی سنگینی اتنی واضح ہے کہ اسے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر بھی چند بنیادی حقائق کی یاد دہانی کرنی چاہیے۔ ہمارا ملک دنیا بھر میں آبادی کے لحاظ سے دوسرے نمبر پر ہے۔ اور زمین کے اعتبار سے ساتویں نمبر پر۔ دنیا کے زمینی علاقوں میں اس کا تناسب ۲.۴٪ ہے اور انسانی آبادی کا تناسب ۱۴٪ ہے۔ آج کل ہماری آبادی تقریباً چار سو اسی ملین ہے اور ہر سال اس آبادی میں تقریباً بارہ ملین کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اگر اسی تناسب سے اضافہ ہوتا رہا تو ۲۰۰۰ء میں ہماری آبادی ایک ارب ہو جائے گی۔ یہ واقعہ صرف ۴۴ سال بعد پیش آنے والا ہے۔

ہم اپنی آبادی کے لیے غذا مہیا کرنے کے لائق بھی نہیں ہیں۔ دوسری ضرورتوں اور عیش و آرام کے بارے میں تو گفتگو بھی بےکار ہے۔ اس لیے خاندانی منصوبہ بندی کو قومی سطح پر اختیار کرنا ہمارے لیے ضروری ہے۔ جن لوگوں نے ۱۹۵۵ء کے بعد شادی کی ہے بالخصوص وہ لوگ جنھوں نے ۱۹۶۰ء کے بعد شادی کی ہے۔ ان سے ہمیں اپیل کرنی چاہیے کہ وہ دو یا تین بچوں پر اکتفا کریں۔ اس سے زیادہ بچے نہ پیدا ہونے دیں۔

فیملی پلاننگ کے لیے ہمیں کن طریقوں کی سفارش کرنی چاہیے؟ ہمیں کسی ایک طریقے پر اکتفا نہ کرنا چاہیے؛ ہر سائنٹیفک اور منظور شدہ تدبیر و علاج کو مہیا کرنا چاہیے۔ اس طرح شادی شدہ جوڑا جس طریقے کو چاہے پسند کرے گا۔ ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم استقاط کو خاندانی منصوبہ بندی کے لیے طبعی اور معمولی طریقے کی حیثیت نہ دیں بلکہ اس کے برعکس ہمیں امکانی کوشش کرنی چاہیے کہ دوسرے طریقے کامیاب نظر آنے لگیں اور استقاط کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ البتہ اگر اس کی ضرورت پڑ ہی جائے تو اس کے لیے بہترین انتظام کرنا چاہیے۔

میرا خیال یہ ہے کہ اس ملک کی ہر عورت کو یہ حق ملنا چاہیے کہ وہ استقاط کے لیے بغیر کوئی وجہ بتائے ہوئے قانونی اجازت حاصل کر سکے۔ عورتیں اپنی مالک آپ ہیں۔ ان کو نامطلوب حمل اٹھانے پھرنے کی دنیاوی غلامی سے نجات ملنی چاہیے۔ عورتوں کی آزادی اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک انھیں استقاط حمل کا قانونی حق نہ مل جائے۔ کیا یہ اخلاقی طور پر قابل دفاع اور منصفانہ بات ہے کہ کسی عورت کو نامطلوب بچے کی پیدائش پر مجبور کیا جائے۔

تبصرہ

یہ مقالہ خالص مادی نقطۂ نظر سے لکھا گیا ہے اور کم سے کم اس مقالے کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مقالہ نگار نے اپنے ذہن میں کسی مذہب کی کوئی رمق بھی باقی نہیں رہنے دی ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہمارے ملک میں ایسے "معیاری مہذب" افراد بھی موجود ہیں جو امریکہ جیسے ملک کو بھی صرف اس لیے "غیر مہذب" سمجھتے ہیں کہ اس نے اب تک عورتوں کو اسقاط حمل کی قانونی اجازت عطا نہیں کی ہے اور ان کے نزدیک کسی ملک کے مہذب ہونے اور نہ ہونے کا معیار ہی یہ ہے کہ اس نے اسقاط کو جائز قرار دیا ہے یا نہیں ——— اس مقالے میں ضمنی طور پر جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے ہم ان پر تبصرہ نہیں کریں گے۔

خالص مادی نقطۂ نظر سے بھی خاندانی منصوبہ بندی اور اسقاط کو جائز قرار دینے کی ضرورت پر مقالہ نگار نے جو کچھ لکھا ہے وہ بالکل یک طرفہ اور ناقص ہے اس سے پڑھنے والے کو اطمینان نہیں ہوتا۔ انھوں نے ہندوستان کی موجودہ آبادی، زمینی حلاقے اور آئندہ بڑھ جانے والی آبادی کے اعداد و شمار پیش کرکے یہ لکھا ہے کہ ہم اتنی بڑی آبادی کو غذا مہیا نہیں کر سکتے۔ اس لیے آبادی پر کنٹرول ضروری ہے۔ یہ پڑھ کر متعدد باتیں جاننے کی خواہش ہوتی ہے۔ مثلاً ان کو یہ بتانا چاہیے تھا کہ اس وقت غلے کی پیداوار کے لحاظ سے کتنی زمین آباد اور کتنی غیر آباد ہے اور ان کے درمیان تناسب کیا ہے۔ دوسری بات یہ بتانی چاہیے تھی کہ اس وقت جو کھیت آباد ہیں ان کی پیداوار کا تناسب دنیا کے دوسرے ممالک کی پیداوار کے مقابلے میں کیا ہے۔ اسقاطِ حمل کے سلسلے میں انھوں نے ہنگری اور جاپان کی مثال بھی دی ہے کم سے کم انہیں دونوں ملکوں کی پیداوار کے مقابلے میں اپنے ملک کی پیداوار کا تناسب بتانا چاہیے تھا۔ انہیں یہ بات بھی بتانا چاہیے تھی کہ اس وقت ملک میں جو غلے کی پریشانی ہے اس میں بے رحم تاجروں اور کسانوں کی ذخیرہ اندوزی کا دخل کتنا ہے؟ پھر انہیں یہ بھی بتانا چاہیے تھا کہ اس وقت حکومت خاندانی منصوبہ بندی (اور فی الحقیقت قطع نسل) پر جو رقم، ذرائع و وسائل اور انرجی صرف کر رہی ہے اور آئندہ کرنے والی ہے وہ سب غیر آباد زمینوں کو آباد کرنے، آباد زمینوں کی صلاحیت پیداوار بڑھانے اور ملک میں ہمدردی و ایثار کی فضا پیدا کرنے میں لگا دے تو ملک کے لیے یہ زیادہ مفید ہوگا یا پیدا ہونے والے بچوں کو زبردستی روکنے پر قوت صرف کرنا زیادہ مفید ہوگا۔ ان دونوں تدبیروں کے درمیان مادی و غیر مادی نفع و نقصان کا موازنہ کیا جائے تو [illegible]

کہ مقالۂ زیر تبصرہ میں بحث کے اس پہلو کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا گیا ہے ———

آخر میں مقالہ نگار نے ایک سوال کیا ہے ۔

"کیا یہ اخلاقی طور پر قابل دفاع اور منصفانہ بات ہے کہ کسی عورت کو نامطلوب بچے کی پیدائش پر مجبور کیا جائے ؟"

اس سوال کے جواب میں خود مقالہ نگار سے یہ سوال کیا جا سکتا ہے ۔

"کیا یہ اخلاقی طور پر قابل قبول اور منصفانہ بات ہے کہ خاندانی آبرو کو جان سے زیادہ عزیز رکھنے والے مردوں کو اس پر مجبور کیا جائے کہ وہ اپنی عورتوں کو بدکاری کی کھلی چھوٹ دے دیں ؟"

(بقیہ رسائل مسائل)

اس مسئلے پر جناب مفتی محمد شفیع صاحب نے بھی مقالہ لکھا ہے جو "بینات" کراچی میں شائع ہوا تھا۔ ان مقالوں کی تفصیلات کو یہاں نقل کرنا دشوار ہے ۔ اس حقیر کی رائے بھی یہی ہے کہ یورپ اور امریکہ میں جو حلال جانور تسمیہ کے بغیر مشین سے کاٹ دیے جاتے ہیں ان کا گوشت حرام ہو جاتا ہے

آپ کے عرب دوست سورۂ انعام کی ذبیحے سے متعلق آیات کی جو تفسیر بیان کرتے ہیں وہ صرف انہیں لوگوں کو مطمئن کر سکتی ہے جو بہر حال اہل کتاب کے ذبیحے کو حلال کرنے کے خواہشمند ہوں۔

یہودیوں کی دکان سے آپ گوشت خرید کر کھا سکتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کے بارے میں یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ اب بھی اللہ کا نام لے کر جانور ذبح کرتے ہیں۔

مقالاتِ سیرت

ڈاکٹر محمد آصف قدوائی ایم اے پی ایچ ڈی نے مقالات سیرت کے نام سے یہ کتاب تعلیم یافتہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے لیے لکھی ہے جس میں سیرت محمدی کا خلاصہ اور عطر پیش کیا گیا ہے۔ طرز بیان سادہ اور خوشگوار کتابت طباعت دیدہ زیب سائز ۱۸×۲۲ صفحات ۰۰ قیمت مجلد مع گرد پوش چار روپے پچاس پیسے ۔ ملنے کا پتہ ۔ مکتبہ زندگی کاغذی رامپور یوپی

رسائل و مسائل

اہل کتاب کا ذبیحہ

خط

یہاں شکاگو میں کافی مسلمان ہیں اور "اسلامک سنٹر" تقریباً پچھلے پچیس تیس سال سے کام کر رہا ہے۔ جمعہ کی نماز میں وقت نہ ملنے کی وجہ سے بہت کم لوگ رہتے ہیں لیکن اتوار کو "اسلامک سنٹر" میں کافی لوگ جمع ہو جاتے ہیں اور وہ منظر بڑا روح افزا ہوتا ہے۔ جب مختلف ممالک کے لوگ صرف خدا کے نام پر ایک دوسرے بھائیوں کی طرح ملتے ہیں اور دوسری کوئی چیز ہم لوگوں میں مشترک نہیں ہوتی۔ بہرحال مسلم سوسائٹی کے لیے بہت اچھی فضا تیار ہو رہی ہے۔ نومسلموں کا جو گروہ یہاں پر پیدا ہو رہا ہے ان پر اب تک احمدیہ فرقے کا زیادہ اثر ہے کیونکہ سب سے پہلے احمدیہ فرقے کے لوگوں نے یہاں تبلیغ کا کام شروع کیا تھا لیکن اب آہستہ آہستہ قرآن کو سمجھنے کی وجہ سے ان کے خیالات درست ہو رہے ہیں ـــــ یہاں پر اکثر لوگوں کے پاس لائبریری میں مولانا مودودی کی تمام کتابیں موجود ہیں۔ میں چھٹی کے دن کوئی نہ کوئی کتاب لے آتا ہوں۔

یہاں پر ہم لوگوں میں جو مسئلہ اکثر زیر بحث آتا ہے وہ ذبیحے کا مسئلہ ہے۔ یہاں کے تمام عرب دوست سورۂ الانعام کا جو ترجمہ کرتے ہیں اور جو تفسیر بیان کرتے ہیں اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اللہ کے نام کے بغیر ذبح کیا ہوا گوشت حرام ہے۔ کئی لوگوں نے الازہر سے فتویٰ منگوایا تھا وہ لوگ (علمائے الازہر) بھی یہی لکھتے ہیں کہ اگر جانور کو غیر اللہ کے نام پر ذبح نہ کیا گیا ہو تو وہ جائز ہے اور چونکہ یہاں گوشت کی انڈسٹری صرف منافع کی بنیاد پر چلتی ہے اس لیے غیر اللہ کے نام پر ذبح کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ گوشت کھاتے وقت اگر بسم اللہ کہہ لیا جائے تو کافی ہے ـــ یہودیا

کے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا گوشت کو بالکل جائز سمجھتے ہیں اور یہ گوشت یہودیوں کی دکانوں میں آسانی سے مل جاتا ہے۔

صرف ہم ہندستان اور پاکستان کے معدودے چند لوگ ہیں جو اب تک مارکیٹ کے گوشت سے پرہیز کرتے ہیں لیکن کبھی کبھی مجھے یہ خیال آنے لگتا ہے کہ کہیں میں اسلام کو دوسروں کے لیے مشکل بنا کر تو نہیں پیش کر رہا ہوں جس کے لیے کل خدا کے حضور مجھے شرمندہ ہونا پڑے ورنہ مجھے اپنی مشکلات کی کوئی پروا نہیں ہے ۔ ہاسٹل وارڈ میں چھ ماہ سبزی کھا کر رہا ہوں ۔ اس کے بعد اپنے ہاتھ سے ایک دنبہ ذبح کرکے فریزر میں رکھوا دیا تھا جو تین ماہ تک کام آتا رہا ۔ آپ اس تعلق سے ضرور چند احادیث کا حوالہ بھیجوا دیجئے تاکہ مجھے اطمینان ہو اور میں دوسروں کو بھی قائل کر سکوں ۔

جواب

اپنے خط میں آپ نے ایک شرعی حکم کے لیے مشکلات برداشت کرنے کے جس عزم کا اظہار کیا ہے ، در حلال نا جائز ذبیحے سے پرہیز کی جو کیفیت لکھی ہے وہ بڑی قابل قدر ہے ۔ اللہ تعالےٰ آپ کو اس عزم اور اس عمل پر قائم رکھے ۔

آپ نے جس مسئلے پر اطمینان حاصل کرنے کے لیے چند حدیثوں کا حوالہ طلب کیا ہے ۔ اس مسئلے پر مولانا مودودی نے ترجمان القرآن اپریل ۱۹۵۹ء میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہے اور اب ان کا وہ مقالہ تفہیمات حصہ سوم میں شائع ہو گیا ہے ۔ آپ نے لکھا ہے کہ وہاں لائبریریوں میں مولانا مودودی کی تمام کتابیں موجود ہیں ۔ اگر تفہیمات حصہ سوم بھی وہاں پہنچ چکی ہو تو اس کا ضرور مطالعہ کیجیے ۔ امید ہے کہ انشاء اللہ آپ کو اطمینان حاصل ہو جائے گا ۔ آپ نے جن حالات میں یہ خط لکھا ہے انھیں حالات میں مولانا مودودی کو ایک پاکستانی طالب العلم نے لندن سے خط لکھا تھا اور علماء عراق کے دو فتوے بھی بھیجے تھے جن میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اہل کتاب کے ذبیحے ہر حال میں حلال ہیں وہ ان پر بسم اللہ پڑھیں یا نہ پڑھیں اور جانور ہاتھ سے ذبح کیے گئے ہوں یا مشین سے کاٹ دیے گئے ہوں ۔ علمائے عراق نے جن دلائل سے حلت ثابت کی ہے علمائے ازہر نے بھی غالباً وہی دلائل دیے ہوں گے ۔ مولانا مودودی نے ان دلائل کا تسلی بخش جواب دیا ہے اور اس سلسلے کی تمام آیات و احادیث کو جمع کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ شافعی علماء کا فتوے اور ان کی رائے اس مسئلے میں صحیح نہیں ہے ۔ (باقی ملاحظہ ہو)

تنقید و تبصرہ

وہ گھر خدا — غلام سرور صفحات ۱۱۲ قیمت ایک روپیہ ملنے کا پتہ :- ملکہ بانو معرفت اصغرالنساء غلام سرور۔ صدر بازار۔ داناپور کینٹ ضلع پٹنہ۔ بہار۔

جناب غلام سرور ایڈیٹر سنگم پٹنہ کو راقم الحروف اس وقت سے جانتا ہے جب وہ نوجوان تھے یہ تبصرہ کتاب ان کے حج کا مختصر سفرنامہ ہے اور اس کتاب میں وہ اتنے مختلف نظر آئے کہ اس شخص کو پہچاننا مشکل ہو گیا جسے میں غلام سرور کے نام سے جانتا تھا۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور ہیں اور تمام مسلمانوں کو دین حق پر ثابت قدم رکھے۔ انھوں نے حج اور متعلقات حج کے بارے میں بھی جو کچھ لکھا ہے اس میں کم مقامات ایسے ملے جہاں قلم لگانے کی ضرورت ہو۔ ایسا محسوس ہوا کہ بعض باتیں انھوں نے کسی سے سن لی ہیں یا کسی گھٹیا درجے کی کتاب میں پڑھی ہیں اور اسی کو دہرا دیا ہے۔ مثال کے طور پر ۳۲ انھوں نے لکھا ہے "وہاں (یعنی عرفات میں) حقوق اللہ بخشوا رہے تھے۔ یہاں (یعنی مزدلفہ میں) حقوق العباد معاف کرا رہے ہیں"۔ یہی بات انھوں نے حضور کی طرف منسوب کر کے ۸۵ پر لکھی ہیں۔ "رسول اللہ صلعم نے عرفات اور مزدلفہ میں ہی حقوق اللہ اور حقوق العباد بخشوائے تھے"۔ معلوم نہیں اس عبارت کا مطلب کیا ہے اور کہاں سے انھوں نے لکھا ہے۔ "مسجد نبوی کے قریب ہی ایک انصاری کے گھر میں سہم النبی (نبی صلعم کی کمان) ہے۔ یہ بات بھی شاید بلاتحقیق انھوں نے لکھ دی ہے۔ علاوہ ازیں سہم تیر کو کہتے ہیں کمان کو نہیں ۸۳ پر آیت اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا کا مقام نزول صحیح نہیں لکھا ہے۔

راقم الحروف کے نزدیک اس کتاب کا سب سے اہم باب وہ ہے جو ۹۵ سے ۱۰۸ تک پھیلا ہوا ہوا ہے۔ اس باب میں المؤتمر الاسلامی کے اجتماعات کی روداد ہے اور بہت معلومات افزا ہے۔ صرف اس باب کے لیے بھی اگر یہ کتاب خریدی جائے تو مہنگی نہیں ہے۔ ارزاں ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ سفرنامہ قابل قدر اور پڑھنے کے لائق ہے۔

ماہنامہ

زندگی

رامپور

جلد :- ۳۷
شمارہ :- ۳

جمادی الاولیٰ ۱۳۸۶ھ
ستمبر ۱۹۶۶ء

مدیر : سید احمد قادری

• خط و کتابت و ارسال زر کا پتہ — منیجر زندگی رامپور یوپی

• زر سالانہ : چھ روپیہ ، شش ماہی تین روپیہ ، فی پرچہ : ۶۰ پیسے

• ممالک غیر سے : دس شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر

مالک : جماعت اسلامی ہند ۔ اڈیٹر سید احمد عروج قادری ۔ پرنٹر پبلشر محمد شفیق ۔ مطبع : دہلی پرنٹنگ ورکس محلہ بنگلہ آزاد خاں ۔ دہلی

مقام اشاعت : دفتر زندگی ۔ رامپور ، یوپی

اشارات

سید احمد قادری

توحید کا اثبات اور شرک کی نفی، دین اسلام کے تمام قطعیات و واضحات میں سب سے زیادہ قطعی
رسب سے زیادہ واضح حقیقت ہے اور کتاب و سنت کے سیکڑوں نصوص میں یہ نفی و اثبات ملتا ہے
سلیے توحید کا اثبات اور شرک کی نفی واضح ترین منصوصات میں داخل ہے۔ اب اگر کسی چیز کے بارے
، کوئی پڑھا لکھا شخص یہ کہے کہ "فلاں چیز شرک تو ہے لیکن غیر منصوص اور اجتہادی شرک ہے" تو یہ ایک
یی بات ہوگی جس کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ کہنے والے نے عالم استغراق میں کہہ دی ہوگی یا یہ
لہ وہ منصوص و غیر منصوص اور اجتہادی و غیر اجتہادی مسائل و احکام کے درمیان فرق کرنے سے ناصر
ہا ہوگا۔ سبھی جاننے والے جانتے ہیں کہ اجتہاد کا تعلق ظنیات سے ہے، قطعیات سے نہیں۔ اسی طرح جو
م منصوص ہو اس میں اجتہاد کی گنجائش نہیں، اس کی ضرورت تو وہیں پیش آتی ہے جہاں نص موجود نہ ہو
—— ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ اصلاً شرک کا تعلق انسان کے عقیدہ و خیال سے ہوتا ہے، اس کا حقیقی محل
لب و دماغ ہے۔ خارج میں شرک کے صرف مظاہر پائے جاتے ہیں کیونکہ شرک کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ
، ذات، اس کی خصوصی صفات اور مخصوص حقوق میں کسی دوسرے کو اس کا شریک مان لیا جائے۔ یہی
بہ ہے کہ کوئی شخص یا گروہ اگر کسی کو اللہ کی ذات، اس کی خصوصی صفات و حقوق میں شریک مانتا ہے تو
مشرک ہوگا۔ چاہے اپنی زندگی میں اس نے کبھی اس کے سامنے سجدہ نہ کیا ہو اور مراسم عبودیت میں
وئی رسم ادا نہ کی ہو اور وہ شخص یا گروہ مشرکوں کا امام تسلیم کیا جائے گا جو اپنے آپ کو مستحق عبادت
بھے، خود کسی کی عبادت نہ کرے اور دوسروں سے اپنی عبادت کرائے، خود کسی کے سامنے نہ جھکے اور دوسرو

کو اپنے سامنے جھکائے۔ اس سے بھی آگے کی صورت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی خواہش نفس کو اپنا معبود بنالے، اپنے سوا کسی کو مستحق اطاعت نہ سمجھے اور نفس امارہ کے احکام پر بے چون و چرا عمل کرتا رہے تو وہ مشرک ہوگا حالانکہ اپنے سامنے نہ کوئی رکوع کرتا ہے اور نہ سجدہ۔

غیر اللہ کے لیے رکوع اور سجدہ اور اس طرح کے دیگر مظاہر شرک کو شریعت اسلامیہ نے دو وجوہ سے شرک قرار دیا ہے۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ عموماً عملی شرک کے پیچھے عقیدے کا شرک موجود ہوتا ہے اس طرح شرک کی جڑ، اس سے چھوٹی موٹی شاخیں، پتیاں، پھول اور پھل مل کر ایک پورا شجر خبیث تیار ہو جاتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ یہ چاہتا ہے کہ اس کے موحد و مومن بندے، صورۃً اور عملاً بھی ان مظاہر کے قریب نہ پھٹکیں ورنہ اس بات کا سخت اندیشہ ہے کہ عملی شرک انہیں عقیدے کے شرک میں مبتلا کر دے۔ شرک چونکہ ایک ایسا ظلم عظیم اور ایک ایسی معصیت کبریٰ ہے جسے اللہ کبھی معاف نہ کریگا اس لیے شریعت اسلامیہ نے اس کے تمام رخنوں کو بند کر دیا ہے۔

جس شرک کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے وہ کسی خاص بت، کسی خاص شے، کسی خاص شخص یا انسانوں کے کسی خاص مجموعے کے ساتھ محدود و مخصوص نہیں ہے، ایسا نہیں ہے کہ لات، ہبل، عزیٰ، ود، سواع، نسر اور اسی طرح کے چند خاص بتوں کو جن کا ذکر قرآن میں ہے، خدا کے مخصوص حقوق میں شریک ماننا تو منصوص شرک ہو اور دنیا کے ان ہزاروں بتوں کو جن کا ذکر قرآن میں نہیں ہے شریک ماننا غیر منصوص و اجتہادی شرک بن جائے، ایسا نہیں ہے کہ مشرکین عرب نے اپنے جن سرداروں کو حق تشریع دے دیا تھا یا یہودیوں نے اپنے جن احبار و رہبان کو قانون الٰہی کے علی الرغم قانون ساز مان لیا تھا ان کا ارباب من دون اللہ ہونا تو منصوص ہو اور یہی حق آج انسانوں کے کسی گروہ کو دے دیا جائے تو اس کا ارباب من دون اللہ ہونا غیر منصوص اور اجتہادی بن جائے۔ پہلے تو یہ تھا کہ کسی ملک یا کسی قوم کا ایک خاندان یا چند افراد معبود ہوتے تھے اور پورا ملک اور پوری قوم ان کی عبادت گزار اور آج اس دور ارتقاء میں شرک نے بھی مدارج ارتقاء طے کر لیے ہیں اور جمہور کی خدائی کا دور آگیا ہے۔ اب ہر ملک کا ہر فرد ایک چھوٹا خدا بن گیا ہے یا بنا دیا گیا ہے تو کیا اس ارتقائی شرک کو غیر منصوص اور اجتہادی سمجھنا صحیح ہوگا؟

جو حال شرک کا ہے وہی اعمال شرک اور مظاہر شرک کا بھی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ قرآن اور احادیث

میں تمام مظاہر شرک کا ذکر عبارۃ النص میں موجود ہو۔ یہ عملاً ممکن نہ تھا بلکہ اشارۃ النص، دلالۃ النص اور اقتضاء النص سے جن مظاہر شرک کی حرمت ثابت ہو وہ سب منصوص ہیں۔ ایک مثال سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔ مظاہر شرک میں سب سے بڑا مظہر کسی غیر حق کے سامنے سجدہ کرنا ہے۔ اس کی ممانعت کے لیے جو آیت آئی ہے وہ یہ ہے:۔

وَمِنْ اٰیٰتِہِ الَّیْلُ وَالنَّھَارُ وَ	اور اس کی نشانیوں میں رات، دن سورج
الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ لَا تَسْجُدُوْا	اور چاند ہیں، نہ سورج کو سجدہ کرو اور نہ چاند کو
لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰہِ	اور اللہ کو سجدہ کرو جس نے ان سب کو پیدا کیا
الَّذِیْ خَلَقَھُنَّ اِنْ کُنْتُمْ اِیَّاہُ تَعْبُدُوْنَ (حم سجدہ)	اگر تم صرف اسی کی عبادت کرتے ہو

شاید پورے قرآن میں غیر اللہ کو سجدہ کرنے کی ممانعت، صریح الفاظ میں اسی جگہ موجود ہے۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ صرف سورج اور چاند کو سجدہ کرنے کی ممانعت منصوص ہے اور باقی اشیاء کو سجدہ کرنے کی ممانعت منصوص نہیں ہے تو کیا اس کا یہ قول صحیح ہو گا؟ کھلی بات ہے کہ بالکل غلط ہو گا۔ دوسرے نصوص کے لحاظ سے ہی نہیں بلکہ صرف اس آیت کے لحاظ سے بھی اصولاً ہر غیر اللہ کے لیے سجدہ کی ممانعت منصوص ہے۔ شجر و حجر سے لے کر انبیاء و اولیاء تک کو سجدہ کرنے کی ممانعت کے لیے یہ آیت نص قطعی ہے:۔

حاکمیت جمہور کے عقیدہ و نظریہ کی بنیاد پر دنیا میں جو اسمبلیاں اور پارلیمنٹیں کام کر رہی ہیں ان کی حیثیت و نوعیت اس کے سوا اور کیا ہے کہ لوگوں نے اپنے اس عقیدے پر عمل کرنے کے لیے انتخابات کا ایک نظام وضع کر لیا ہے، چند عمارتیں بنائی ہیں اور وہاں بیٹھ کر پورے ملک کے لیے وہ جو قانون چاہتے ہیں بناتے ہیں اور یہ پارلیمنٹیں اپنے بنائے ہوئے قوانین کے لیے خود آخری سند کا درجہ رکھتی ہیں۔ اگر یہ شرک کا منصوص مظہر نہیں ہیں تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ منصوص شرک اور اس کے مظاہر ہیں کیا؟ غیر تسلی بخش تاویلیں کر کے تو لات و منات اور فرعون و نمرود کے شرک کی بھی نفی کی جا سکتی ہے لیکن عقل و نقل نے کبھی ان تاویلوں کو قبول نہیں کیا ہے۔ لات و منات کی جگہ جو بت بھی بنا لیے جائیں اور ان بتوں کے جو لوگ بھی پاسبان مقرر کر لیے جائیں نص قطعی ان کو شرک ہی قرار دیتی ہے۔ آج لات و منات کی جگہ پر قوم و وطن کو رکھ دیا گیا ہے اور ان کے استھانوں کی نمائندگی اسمبلیاں اور پارلیمنٹیں کرتی ہیں تو کیا اس کی وجہ سے شرک کی حقیقت بدل جائے گی؟

حاکمیت اللہ کے عقیدے کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ حاکمیت جمہور[1] کا انکار کیا جائے۔ کفر بالطاغوت کے بغیر ایمان باللہ کا دعوے ایک بے معنی دعوے ہے

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ	دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں، بے شک
تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ	ہدایت گمراہی سے جدا ہو چکی ہے۔ اب جو کوئی
يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ	طاغوت کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لائے تو
فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى	اس نے مضبوط حلقہ تھام لیا جو ٹوٹنے والا نہیں
لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ	ہے اور اللہ سب کچھ سنتا جانتا ہے۔ اللہ ایمان
اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ	لانے والوں کا مددگار ہے۔ انہیں تاریکیوں سے
مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَالَّذِيْنَ	روشنی کی طرف نکال لاتا ہے اور کافروں کے
كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰۗـــُٔــهُمُ الطَّاغُوْتُ	رفیق طاغوت ہیں جو انہیں روشنی سے تاریکیوں کی
يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ وَ	طرف لے جاتے ہیں۔ یہی لوگ دوزخی ہیں وہ
اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ	اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔

[1] حاکمیت جمہور کے نتائج ان ملکوں میں دیکھیے جہاں سے یہ گندہ چشمہ پھوٹا ہے۔ جرمنی میں دو مردوں کے درمیان جنسی تعلق کو جائز قرار دیا گیا تھا یہاں تک کہ ایک مرد دوسرے مرد سے شادی بھی کرسکتا تھا۔ "نازی دور سے پہلے جرمنی کے ایک صاحب ڈاکٹر ماگنوس ہرشفیلڈ تھے جو دنیا کی مجلس اصلاح صنفی کے صدر بھی رہ چکے ہیں۔ انھوں نے عمل قوم لوط کے حق میں چھ سال تک بڑے زبردست پروپیگنڈا کیا آخر کار جمہوریت کا آلہ اس حرام کو حلال کر دینے پر راضی ہو گیا اور جرمن پارلیمنٹ نے کثرت رائے سے طے کر دیا کہ اب یہ فعل حرام نہیں ہے بشرطیکہ طرفین کی رضامندی سے اس کا ارتکاب کیا جائے اور معمول کے نابالغ ہونے کی صورت میں اس کا ولی ایجاب قبول کی رسم ادا کرے۔"

اور اب ۶۶ء میں انگلینڈ کے ہاؤس آف لارڈس نے دو بالغ مردوں کے درمیان درپردہ جنسی تعلقات کو جائز قرار دے دیا ہے۔ اس ہاؤس کے ایک لاٹ صاحب نے اس کی حمایت میں تقریر کرتے ہوئے کہا ہے کہ میں اپنے ملک کے دس لاکھ افراد کی نمائندگی کر رہا ہوں۔ یہ اس ملک کا حال ہے جس کے بادشاہ حامی دین مسیح کے لقب سے ملقب ہیں اور چرچ میں باقاعدہ ان کی حاضری ہوتی رہتی ہے۔ سب سے زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ انگلینڈ کے لاٹ پادری صاحب نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ جمہوریت کے ان بدمست اداروں کے ملعون ہونے میں کس مومن کو شک ہو سکتا ہے۔

مشرکین مکہ اللہ کے وجود کے قائل تھے اور اس کی بہت سی صفات کو بھی تسلیم کرتے تھے۔ اس کے باوجود وہ مشرک تھے۔ اس کی وجہ یہی تو تھی کہ انھوں نے اللہ کی ذات اور اس کے صفات و حقوق میں دوسروں کو شریک قرار دے لیا تھا۔ ان کا دارالندوہ بھی قانون سازی میں بالکل آزاد تھا۔ قبائل کے سردار اور ان کے شیوخ ہر فیصلے کی آخری سند تھے وہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول مان کر اپنی پوری زندگی اللہ کو سپرد کرنے پر تیار نہ تھے۔ آزاد قانون سازی کے اعتبار سے مکے کے دارالندوہ اور آج کی پارلیمنٹوں میں کوئی جوہری و بنیادی فرق نہیں ہے۔ پھر یہ کتنی عجیب بات ہے کہ وہی جرم مکے کے لوگ کریں تو مشرک ہیں اور وہی جرم آج دنیا کے اکثر ممالک کریں تو مشرک نہیں ہیں اور اگر مسلمان کریں تو ان کی توحید پر آنچ بھی نہ آئے۔ مکے کی پارلیمنٹ (دارالندوہ) کا شرک ان کی سمجھ میں آتا ہے لیکن ہندوستان کی پارلیمنٹ کا شرک ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔ اپنے آپ کو فریب دینے سے کیا فائدہ؟ اس کا انجام بخیر نہیں ہوتا۔

موجودہ نظام حکومت کو صحیح سمجھتے ہوئے اسمبلیوں اور پارلیمنٹ کے الکشن میں حصہ لینے کو ناجائز کہنا جماعت اسلامی ہند کی کوئی ایسی بات نہیں ہے جو عقل و نقل اور کتاب و سنت سے الگ ہو اور یہ بات بھی واضح ہو کہ ہمارا مقصد کسی کی مخالفت نہیں ہے بلکہ اپنا دین و ایمان محفوظ رکھنے اور عذاب آخرت سے بچنے کے لیے ہم یہ بات کہتے اور اسی کو صحیح سمجھتے ہیں۔ شرک کی معافی کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے۔ اس کے مقابلے میں نرم رویہ اختیار کرنے سے مسلمانوں کے وجود اور ان کے دنیوی مفادات کا تحفظ تو مشکوک و موہوم ہے لیکن اخروی مفاد کی تباہی یقینی ہے۔ اللہ ہم سب کو آخرت کی تباہی سے بچائے آمین!

شرک اور اہل شرک، ظلم اور اہل ظلم کی طرف میلان کو قرآن میں اتنی سختی کے ساتھ منع کیا گیا ہے کہ اس آیت کو پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں:۔

فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَمَنْ	پس تم اور تمہارے ساتھی جو (کفر و بغاوت)
تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ۚ إِنَّهُ بِمَا	سے تائب ہو چکے ہیں، ٹھیک ٹھیک راہ راست
تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝ وَلَا تَرْكَنُوا	پر ثابت قدم رہو جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے اور
إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ	(اور بندگی کی) حد سے تجاوز نہ کرو۔ بے شک
النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ	تمہارے عمل کو وہ دیکھ رہا ہے اور ظالموں کی

مِنْ أَوْلِيَاءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُونَ ۝	کی طرف نہ جھکو ورنہ آگ تمہیں پکڑ لے گی اور اللہ کے سوا تمہارا کوئی مددگار نہیں پھر تم کہیں مدد نہ پاؤ گے
(ہود - آیت ۱۱۲-۱۱۳)	

"راہ راست پر جمے رہو" یہ امر ہے جس کی تعمیل ضروری ہے۔ "حد سے آگے نہ بڑھو اور ظالموں کی طرف
جھکو" یہ دو چیزیں ہیں جن سے روکا گیا ہے، ان سے اجتناب واجب ہے۔ ظالموں کی طرف میلان کی جو
...زا بیان کی گئی ہے وہ ہر مومن اور ہر داعیِ حق کو لرزا دینے والی ہے۔ ایک طرف تو یہ کہا گیا ہے کہ اگر تم
...لموں کی طرف مائل ہوئے تو جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ کے مستحق بن جاؤ گے اور دوسری طرف یہ تنبیہ کی گئی
...ے کہ اگر تم نے ایسا کیا تو اللہ کی نصرت و حمایت سے محروم ہو جاؤ گے۔ دوسری جگہ کہا گیا ہے :-

وَإِنْ كَادُوا لَيَفْتِنُونَكَ عَنِ الَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهُ وَإِذًا لَاتَّخَذُوكَ خَلِيلًا ۝ وَلَوْلَا أَنْ ثَبَّتْنَاكَ لَقَدْ كِدْتَ تَرْكَنُ إِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيلًا ۝ إِذًا لَأَذَقْنَاكَ ضِعْفَ الْحَيَاةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيرًا ۝	وہ لوگ تو چاہتے تھے کہ تمہیں اس چیز سے پھیر دیں جو وحی ہم نے تمہاری طرف کی ہے تاکہ تم ہمارے نام پر اس کے سوا کوئی جھوٹ گھڑ لاؤ اور تب وہ تمہیں اپنا دوست بنا لیتے اور اگر ہم تمہیں سنبھالے نہ رکھتے تو تم ان کی طرف کچھ نہ کچھ جھک جاتے لیکن اگر تم ایسا کرتے تو ہم تمہیں دنیا میں بھی دہرے عذاب کا مزہ چکھاتے اور آخرت میں بھی دہرے عذاب کا۔ پھر ہمارے مقابلے میں تم کوئی مددگار نہ پاتے۔
(بنی اسرائیل ۷۳ تا ۷۵)	

...مکہ کے ان حالات کا تصور کیجیے جن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے مسلمان گھرے ہوئے
...ے اور پھر ان آیات کو پڑھیے، غور کیجیے کہ یہ باتیں حضورؐ کو مخاطب کر کے کہی گئی ہیں۔ آپ کے بارے میں یہ تصور
...ں نہیں کیا جا سکتا تھا کہ مشرکوں اور ظالموں کی طرف آپ کا میلان کسی ذاتی مفاد کے لیے ہو سکتا تھا اگر میلان
...ن تھا تو یقیناً اس دین ہی کے مفاد کی خاطر ممکن تھا جس کے آپ داعی تھے اور یہ میلان بھی اس سے آگے نہیں
...ہو سکتا تھا کہ کفر و شرک کے مقابلے میں اپنا رویہ کچھ نرم کر لیا جائے لیکن بے حد نازک اور اذیت رساں حالات
...، باوجود جن شدید ترین الفاظ و اسلوب میں تنبیہ کی گئی ہے وہ ہم سب کے سامنے ہے۔ اس سے اندازہ کیجیے

ہ ظالمانہ و مشرکانہ اداروں کی برضا و رغبت کفیت اس کیلیے دوڑ دھوپ اور ان اداروں کو کامیابی کے
ساتھ چلانے کی خواہش و کوشش کس نوعیت کا جرم ہوگا اور اس کی سزا کیسا ہو گی۔ افسوس یہ ہے کہ مسلمانوں
کے دل و دماغ میں عقیدۂ توحید اتنا ضعیف ہو چکا ہے کہ اب یہ باتیں ان کے لیے سراسر اجنبی بن کر رہ گئی ہیں

حق کی دعوت بلند ہو کر جب پھیلنے لگتی ہے اور باطل پرست قوتیں اسے روکنے کی تدابیر اختیار کر کے
یہ دیکھ لیتی ہیں کہ اس کا روکنا آسان نہیں تو وہ اس دعوت میں بگاڑ پیدا کرنے اور داعیانِ حق سے مصالحت پر
آمادہ ہو جاتی ہیں۔ یہی موقع ہوتا ہے جب داعیانِ حق کی طرف سے مداہنت کے ارتکاب کا اندیشہ ہو سکتا ہے
اس لیے قرآن حکیم نے ان کو دین کے معاملے میں مداہنت و مصالحت سے بھی روک دیا۔

فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ ○ وَدُّوْا — پس تم تکذیب کرنے والوں کی اطاعت
لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ○ — نہ کرو۔ وہ چاہتے ہیں کہ اگر تم ڈھیلے پڑو تو وہ
(القلم ۱ر) — بھی ڈھیلے ہو جائیں۔

مشرکین مکہ کش کش سے بچنے کے لیے اس بات پر آمادہ ہو گئے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اگر ان کے شرک
اور ان کے معبودوں کی تردید ترک کر دیں تو وہ بھی اپنے شہر میں اسلام کے وجود کو گوارا کر لیں گے۔ کچھ ہم بڑھیں
کچھ تم بڑھو" کی فضا پیدا ہو جائے تو کش مکش ختم ہو سکتی ہے بلکہ وہ تو یہاں تک تیار ہو گئے تھے کہ اگر شرک
کی مذمت اور تردید ترک کر دی جائے تو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا سردار تسلیم کر لیں گے اگر حضور اسے
کو منظور فرما لیتے تو اسی وقت مکے میں مسجدیں تعمیر ہو جاتیں، مسلمان وہاں جا کر خدا کی عبادت کر لیتے اور مشرک
مندروں میں اپنے معبودوں کو پوج لیتے۔ پھر مشرک اور مومن دونوں ایک دوسرے کے ساتھ " رواداری "
کی ٹھنڈی فضا میں رہتے بستے لیکن قرآن نے یہ راہ بند کر دی تھی اس لیے حضور نے ان کے مطالبے کو
بالکلیہ رد فرما دیا۔ مشرکین کی خواہشات کی پیروی سے اجتناب کا حکم ایک جگہ ان الفاظ میں دیا گیا ہے۔

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ — اور اسی طرح ہم نے عربی زبان میں یہ
حُكْمًا عَرَبِيًّا ○ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ — واضح فرمان نازل کیا اور اب اس کے بعد
بَعْدَ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ — کہ تمہارے پاس علم آچکا ہے۔ اگر تم نے ان
مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا — کی خواہشات و آذر کی پیروی کی تو اللہ کے
مقابلہ میں

شرکت و مضاربت کے شرعی اصول

(۲)

جناب نجات اللہ صدیقی، شعبۂ معاشیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

نفع کی تقسیم کے لیے نسبتوں کی تعیین میں آزادی

چند افراد یا دو افراد شرکت کے اصول پر کاروبار میں سرمایہ لگائیں تو مالکی اور شافعی فقہ کے مطابق یہ ضروری ہوگا کہ نفع ان کے لگائے ہوئے سرمایوں کی نسبت سے تقسیم پائے۔ ان کو یہ اختیار نہیں کہ نفع کی تقسیم کے لیے کوئی ایسی نسبت طے کرسکیں جو ان کے لگائے ہوئے سرمایوں کی نسبت سے مختلف ہو اسی اصول تقسیم کی مناسبت سے مالکی فقہا یہ بھی کہتے ہیں کہ دونوں شرکا کی کاروباری اعمال انجام دینے کی ذمہ داری ان کے سرمایوں کی نسبت سے ہوگی۔

> شرکت کے مال کے سلسلے میں ان کے کاروباری اعمال ان کے سرمایوں کی مقدار کی نسبت سے ہونے چاہیں اور کاروبار کا نفع ونقصان بھی ان کے درمیان ان کے سرمایوں کی نسبت سے تقسیم پائے گا۔ آدھا آدھا یا کسی اور نسبت سے۔ اگر وہ یہی اصول طے کرکے شرکت کا معاہدہ کریں تو یہ شرکت درست ہوگی۔ اگر کوئی اصول تقسیم نہ طے کریں تو بھی شرکت درست ہوگی اور ان کے درمیان اسی اصول کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا اور اگر سرمایوں کی نسبت کے علاوہ کوئی اور نسبت طے کریں تو معاہدہ فاسد ہو جائے گا۔[۱]

شافعی فقہا میں سے امام غزالی اس بات کا امکان تسلیم کرتے ہیں کہ شرکا کے کاروباری اعمال میں نسبت سے نہ ہوں جو ان کے لگائے ہوئے سرمایوں کے درمیان پائی جاتی ہے۔ اس لیے یہ سوال پیدا

---

[۱] احمد الدردیر: الشرح الصغیر جلد ۲ ص ۱۵۷

ہے کہ کیا دو مساوی سرمایہ فراہم کرنے والے شرکاء میں سے اس شریک کے لیے نفع کا زیادہ حصہ کیا جا سکتا ہے جو زیادہ کاروباری اعمال انجام دیتا ہو لیکن ان کے بیان کے مطابق اس جواز میں اختلاف ہے وہ لکھتے ہیں :-

نفع اور نقصان سرمایوں کی نسبت سے تقسیم پائے گا۔ اگر وہ اس سے مختلف نسبتیں طے کریں تو یہ شرط باطل ہوگی اور معاہدہ فاسدہ ہو جائے گا........ اگر وہ اس شریک کے لیے زیادہ نفع طے کریں جس کے ذمے زیادہ کاروباری اعمال ہیں تو اس شرط کے درست ہونے میں اختلاف ہے [1]

لیکن شافعی فقہ میں جو رائے اختیار کی گئی ہے وہ یہی ہے کہ کاروباری اعمال میں تفاوت کے باوجود نفع ہمیشہ سرمایوں کی نسبت سے تقسیم پائے گا [2]

اس رائے کی دلیل ایک شافعی فقیہ نے ان الفاظ میں بیان کی ہے :-

نفع اور نقصان دونوں سرمایوں کی نسبت سے تقسیم پائے گا۔ کیوں کہ نفع ان کے سرمایوں کے نمو کا نام ہے اور خسارہ ان کے سرمایوں میں کمی واقع ہو جانے کا نام ہے۔ لہذا یہ دونوں ان دونوں سرمایوں کی مقداروں کی نسبت سے ہوں گے۔ اگر دونوں سرمایے برابر ہوں اور فریقین نفع اور نقصان میں ایک شریک کے لیے دوسرے سے زیادہ حصہ طے کریں یا سرمایے برابر نہ ہوں مگر وہ نفع اور نقصان میں مساوی حصے طے کریں تو معاہدہ درست نہ ہوگا۔ چونکہ یہ ایک ایسی شرط ہے جو شرکت کے تقاضا کے منافی ہے لہذا درست نہ ہوگی اسی طرح جس طرح کہ وہ یہ طے کرلیں کہ سارا نفع ان میں سے صرف ایک ہی شریک کو ملے گا [3]

مالکی اور شافعی فقہاء کا اختیار کردہ مسلک یہی ہے کہ شرکاء کے کاروباری اعمال میں اگر تفاوت ہو تو اسے نظر انداز کر دیا جائے گا اور نفع کی تقسیم سرمایوں کی نسبت سے عمل میں آئے گی

---

[1] ابو حامد الغزالی : کتاب الوجیز فی مذہب الامام الشافعی جلد ۱ ص ۱۸۲ مطبعۃ الآداب المؤید۔ قاہرہ ۱۳۱۷ھ

[2] عبد الرحمٰن الجزیری : کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ جلد ۳ ص ۷۰

[3] ابو اسحٰق ابراہیم بن علی بن یوسف الفیروز آبادی الشیرازی۔ کتاب المہذب فی فقہ مذہب الامام الشافعی جلد ۱ ص ۳۴۶ دار الکتب العربی۔ مصر

ان فقہاء کی دلیل یہ ہے کہ نفع سرمایہ کی بڑھوتری یا نمو کا نام ہے اس لیے وہ سرمایہ کا تابع ہے۔[1] ان کی رائے کی دوسری بنیاد یہ بتائی گئی ہے کہ شرکت کا معاہدہ کاروبار میں لگائے جانے والے سرمایہ کے بارے میں ہوتا ہے۔ کاروباری اعمال کے بارے میں نہیں ہوتا۔ لہذا کاروبار کے منافع کے ذریعہ سرمایہ میں جو اضافہ ہو اسے اصل سرمایہ کے تابع رہنا چاہیے اور اسی نسبت سے تقسیم پانا چاہیے۔[2] ان فقہاء نے اپنی رائے کی سند میں یہ بات بھی پیش کی ہے کہ نقصان کے بارے میں یہ اصول تمام مکاتب فقہ تسلیم کرتے ہیں کہ وہ ہمیشہ سرمایہ کی نسبت سے تقسیم پائے گا۔ جس طرح نقصان سرمایہ میں واقع ہونے والی کمی کا نام ہے اسی طرح سرمایہ میں واقع ہونے والے اضافے کا نام نفع ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ نفع کی تقسیم کا اصول نقصان کی تقسیم سے مختلف ہو۔

ان رایوں کا تجزیہ کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان فقہاء نے کاروباری جد وجہد کو مشترکہ کاروبار میں نفع کے استحقاق کی ایک مستقل اور علیحدہ بنیاد نہیں تسلیم کیا ہے۔ انھوں نے یہ فرض کرلیا ہے کہ کاروباری جد وجہد سرمایہ کے تابع اور اسی نسبت سے ہوتی ہے۔ یہ مفروضہ صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ بات عام تجربے سے ظاہر ہے کہ بعض شرکاء دوسروں کی بہ نسبت زیادہ لائق اور تجربہ کار ہوتے ہیں یا زیادہ محنتی ہوتے ہیں۔ عملاً ایسی صورتیں پیش آتی رہتی ہیں کہ مشترکہ سرمایہ سے کیے جانے والے کاروبار میں چند شرکاء بہت زیادہ کاروباری جد وجہد کرتے ہوں اور بعض شرکاء بہت کم جد وجہد کرتے ہوں۔ کاروباری اعمال کی قدر وقیمت وقت دینے اور مشغول رہنے کے پیمانے سے بھی نہیں ناپی جاسکتی کیونکہ ایک صاحب بصیرت اور ماہر کاروباری فرد کے چند کاروباری فیصلے دوسرے فرد کی دوڑ دھوپ سے زیادہ اہمیت کے حامل ہوسکتے ہیں۔ عدل وانصاف کا تقاضا یہی ہے کہ مشترکہ کاروبار میں نفع کے استحقاق کے لیے سرمایہ کے پہلو بہ پہلو کاروباری جد وجہد کو علیحدہ اور مستقل بنیاد کے طور پر تسلیم کرتے ہوئے فریقین کو اس بات کا حق دیا جائے کہ وہ باہمی رضامندی سے نفع کی تقسیم کے لیے جو اصول چاہیں طے کرلیں۔

شریعت نے کاروباری جد وجہد کو نفع کے استحقاق کی ایک مستقل بالذات بنیاد تسلیم کیا ہے۔ اس کی دلیل مضاربت میں کاروباری فریق کو ملنے والا حصۂ نفع ہے۔

مزید برآں تمام فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ اگر کاروباری فریق صاحب سرمایہ کی اجازت سے مضاربت

---

[1] یہ دلیل فیروزآبادی کے مذکورہ بالا اقتباس میں صراحت کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ نیز ملاحظہ ہو ابن رشد، بدایۃ المجتہد ج ۲ ص ۲۵۱

[2] علی الخفیف: الشرکات فی الفقہ الاسلامی ص ۵۵

کے کاروبار میں اپنا ذاتی سرمایہ بھی لگائے تو اس سرمایہ کا پورا نفع اسی کو ملے گا۔ اس کے علاوہ اسے صاحب سرمایہ سے لیے ہوئے سرمایہ کے نفع میں سے طے شدہ نسبت کے مطابق حصہ بھی ملے گا۔ یہ صورت عملاً شرکت کی اس صورت کی طرح ہے جس میں سارے کاروباری اعمال صرف ایک شریک انجام دیتا ہو۔ کوئی وجہ نہیں کہ کاروباری جدوجہد کو جو وزن مضاربت میں دیا گیا ہے وہ شرکت میں نہ دیا جائے۔ ایک دوسری دلیل یہ ہے کہ مضاربت پر سرمایہ حاصل کرکے کاروبار کرنے والا اگر صاحب سرمایہ سے کاروباری اعمال کی انجام دہی میں تعاون چاہے اور وہ برضا و رغبت اس پر آمادہ ہو جائے تو بھی نفع کی تقسیم اسی شرط کے مطابق ہوگی جو مضاربت کا معاہدہ کرتے وقت طے کی گئی تھی۔ اس صورت میں عملاً ایک فریق کے لگائے ہوئے سرمایہ سے دو افراد کاروبار کرتے ہیں اور نفع دونوں کے درمیان تقسیم پاتا ہے۔ پورا نفع صاحب سرمایہ کو نہیں ملتا۔ معلوم ہوا کہ مشترکہ کاروبار میں نفع کو نقصان کی طرح سرمایہ کا تابع کر دینا اور کاروباری جدوجہد کو یکسر نظر انداز کر دینا خود مالکی اور شافعی فقہاء کے تسلیم کیے ہوئے دوسرے جائز کاروباری معاملات سے ہم آہنگ نہیں ہے۔

نفع اور نقصان کے درمیان فرق

نفع کی تقسیم کو نقصان کی ذمہ داری پر قیاس کرنا درست نہیں ہے۔ نفع سرمایہ لگاکر کاروباری جدوجہد کرنے کا مشترکہ ثمرہ ہے۔ نقصان کسی جدوجہد کا ثمرہ نہیں۔ نفع کامیاب کاروباری جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ نقصان کو ان معنی میں کاروباری جدوجہد کا نتیجہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔ نقصان اس بات کی علامت ہے کہ کاروباری جدوجہد کے باوجود سرمایہ میں اضافہ نہیں ہو سکا۔

نفع اور نقصان کی نوعیت میں اس اصولی فرق کا شریعت نے لحاظ رکھا ہے۔ یہ بات مضاربت کے شرعی اصول سے واضح ہے۔ اگر کاروبار مضاربت میں نقصان ہو تو کاروباری فریق کو اس نقصان کا کوئی حصہ نہیں برداشت کرنا ہوگا۔ اس نے سرمایہ کے ذریعے کاروباری جدوجہد کی تاکہ سرمایہ میں اضافہ ہو اور اس نفع میں سے اسے بھی حصہ مل سکے۔ باوجود کوشش کے اضافہ نہ ہو سکا اس کی کاروباری جدوجہد ناکام رہی اسے کوئی نفع نہیں ملے گا۔ یہی اس کا نقصان ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر اس پر سرمایہ میں واقع ہونے والی کمی یعنی کاروبار کے خسارہ، کا بار نہیں ڈالا گیا ہے۔ اس سے

رہے کہ شریعت نقصان کو کاروباری جدوجہد کا نتیجہ یا "ثمرہ" یا حاصل نہیں قرار دیتی۔ وہ نقصان کو
رمایہ میں نقصان قرار دیتی ہے۔ اس کے برعکس اگر مضاربت پر سرمایہ حاصل کرکے کاروباری جدوجہد
کرنے والے کی کوششیں کامیاب ہوئیں اور کاروبار میں نفع ہوا تو اسے اس نفع میں سے ایک حصہ ملتا ہے
معلوم ہوا کہ شریعت نفع کو سرمایہ کے ساتھ کاروباری جدوجہد کا نتیجہ اور ثمرہ قرار دیتی ہے۔ شریعت نے
نفع اور نقصان کو ایک درجہ نہیں دیا ہے، نہ ان کی تقسیم کا اصول ایک رکھا ہے۔

حنفی فقہا کے نزدیک شرکت میں نفع کی تقسیم کے لیے سرمایوں کی نسبت کی پابندی ضروری نہیں بلکہ
فریقین باہمی رضامندی سے نفع کی تقسیم کے لیے جو نسبتیں بھی چاہیں طے کرسکتے ہیں۔

"جائز ہے کہ دو شرکا کے سرمایے برابر ہوں اور نفع میں ایک کا حصہ دوسرے سے زیادہ ہو[1]

"نفع کا استحقاق شرط پر مبنی ہے، چنانچہ دونوں شریکوں میں سے ہر ایک اس حصہ کا مستحق ہوگا
جو از روئے شرط اس کے لیے طے پایا ہو۔"[2]

ایک حنفی محقق نے اپنے مسلک کی دلیل ان الفاظ میں بیان کی ہے[3]:۔

"بنیادی بات یہ ہے کہ ہمارے نزدیک نفع کا استحقاق یا تو سرمایہ کی بنیاد پر ہوتا ہے یا عمل کی
بنیاد پر یا ضمان (ذمہ داری) کی بنیاد پر............ پس معلوم ہوا کہ ان میں سے ہر ایک سبب
اس بات کی صلاحیت رکھتا ہے کہ نفع کا حق دار بنا سکے............

ہمارے نزدیک نفع کا استحقاق کبھی سرمایہ کی وجہ سے ہوتا ہے کبھی کاروباری عمل کی وجہ سے
اور کبھی مالی ذمہ داری کی وجہ سے، جیسا کہ ہم نے اوپر واضح کیا ہے۔ خواہ دونوں فریق کاروباری
اعمال بجا لائیں یا صرف ایک فریق، نفع ان دونوں کے درمیان طے شدہ شرط کے مطابق تقسیم پائے گا
کیونکہ شرکت میں کاروباری عمل کی بنیاد پر نفع کے استحقاق کے لیے عمل کا شرط ہونا کافی ہے، بالفعل محنت
کرنا ضروری نہیں۔"

یہی رائے حنبلی فقہا کی بھی ہے:۔

---

[1] مرغینانی: ہدایہ جلد ۲ (کتاب الشرکۃ شرکت عنان)

[2] سرخسی: المبسوط جلد ۱۱ ص ۱۵۱

[3] کاسانی:۔ بدائع الصنائع جلد ۶ ص ۶۲-۶۳

شرکت عنان یعنی دو یا افراد کے اپنے سرمایوں کے ساتھ کاروبار میں شریک ہونے کی صورت
میں یہ جائز ہے کہ دونوں نفع کے حقوق کو سرمایوں کے مطابق رکھیں اور یہ بھی جائز ہے کہ سرمایوں
میں تفاوت کے باوجود نفع کے حصوں کو برابر رکھیں یہی امام ابوحنیفہ رح کا مسلک ہے۔ ہماری
دلیل یہ ہے کہ نفع کا استحقاق کاروباری اعمال کی بنیاد پر ہے ہوتا ہے۔ اس لیے جب دونوں
فریق کاروباری اعمال انجام دے رہے ہوں تو جائز ہوگا کہ نفع کی تقسیم میں ایک کا حصہ دوسرے
سے زیادہ ہو۔[1]

ہمارے نزدیک حنفی اور حنبلی فقہاء کی یہ رائے دلائل کے اعتبار سے بھی زیادہ وزنی ہے اور مشترکہ
کاروبار میں سہولت اور وسعت پیدا کرنے میں بھی معاون ثابت ہوگی۔ مشترکہ کاروبار میں منافع کی منصفانہ
تقسیم کے لیے شرکاء کو یہ اختیار دینا ضروری ہے کہ وہ اپنے لگائے ہوئے سرمایوں اور اپنی صلاحیتوں
کا لحاظ کرتے ہوئے باہمی رضامندی سے نفع کی تقسیم کا کوئی اصول طے کرسکتے ہیں۔ اگر اس کی اجازت
نہیں دی جائے گی اور نفع کی تقسیم کو لازماً سرمایوں کا تابع رکھا جائے گا تو مختلف صلاحیتوں کے حامل افراد
کے لیے کاروبار میں اشتراک کرنا مشکل ہوجائے گا اور اشتراک کی صورت میں زیادہ صلاحیت اور تجربہ
رکھنے والے افراد کے ساتھ بے انصافی لازم آئے گی۔ آئندہ مباحث میں ہم اسی رائے کو ترجیح دیں گے۔

حساب فہمی کا طریقہ

۳۔ مسلسل جاری کاروبار میں نقصانات کی تلافی نفع سے کی جاتی رہے گی۔ تا آنکہ کاروبار ختم
کرکے حسابات صاف کرلیے جائیں۔ حساب فہمی کے وقت پہلے اصل سرمایہ علیحدہ کیا جائے گا۔ تب جو رقم
فاضل ہو وہ نفع قرار پائے گی اور کمی واقع ہونے کی صورت میں کمی کی مقدار نقصان قرار پائے گی
یہ اصول بھی تمام مکاتب فقہ کے درمیان متفق علیہ ہے اور اس کا اطلاق شرکت اور مضاربت دونوں
پر ہوتا ہے۔ شرکت کی صورت میں چونکہ کاروبار کے سرمایہ میں ہر شریک کا حصہ ہوتا ہے۔ اس لیے اگر ختم
معاہدہ سے پہلے شرکاء کے درمیان کچھ نفع تقسیم کردیا جائے تو اس سے حساب فہمی کے موقع پر نزاعی صورت
پیدا ہونے کا امکان نہیں۔ کیونکہ اگر حساب سے یہ معلوم ہو کہ کسی شریک کو اس کو ملنے والے کل نفع سے
زیادہ نفع دیا جاچکا ہے تو یہ رقم اس کے اصل سرمایہ کی واپسی کے وقت وضع کی جاسکتی ہے۔ مضاربت

[1] ابن قدامہ، المغنی جلد ۵ صفحہ ۱۴۰

مہ سرمایہ ایک ہی فریق کا ہوتا ہے مگر نفع میں دونوں فریق شریک ہوتے ہیں اسلئے بحساب تقسیم نفع سے نزاعی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ اگر کاروباری فریق کو اس کے حصے سے زیادہ نفع جا چکا ہو، یا اسے نفع کا ایک حصہ دینے کے بعد کاروبار میں اتنا نقصان ہو جائے کہ حساب کتاب کے وقت سی نفع کا مستحق نہ قرار پائے تو اس کو دیے ہوئے نفع کی واپسی میں دشواری پیش آسکتی ہے یہی وجہ کہ فقہاء کے یہاں اس مسئلے پر بحث مضاربت کے باب میں ملتی ہے۔ ذیل میں فقہی آخذ سے جو اقتباسات کیے جا رہے ہیں وہ مضاربت کے ابواب سے لیے گئے ہیں۔

ع یا نقصان کی تعیین اختتام کاروبار پر ہو گی۔

ابن رشد نے لکھا ہے کہ :-

ان (فقہاء اسلام) کے درمیان اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ مضاربت پر مال لیکر کاروبار کرنے والا نفع میں سے اپنا حصہ اس وقت لے گا جب پورا سرمایہ کاروبار پھر نقد کی شکل اختیار کرلے۔ اور یہ کہ اگر اسے کاروبار میں نقصان ہوا اور اس کے بعد وہ پھر کاروبار کرے اور اس میں نفع ہو تو اس نفع سے پچھلے نقصان کی تلافی کی جائے گی [۱]

تمام فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ فریقین کے نفع یا نقصان کی مقداروں کی تعیین کاروبار ختم ہونے پر کی جائے گی، اور آخری طور پر حساب کتاب اس وقت ممکن ہو گا۔ البتہ اس بارے میں اختلاف ہے کہ اگر روبار ختم ہونے سے پہلے اس میں نفع ظاہر ہوا اور کچھ نفع تقسیم کرلیا جائے تو ایسا کرنا درست ہو گا یا نہیں ؟ اس تقسیم سے کسی فریق کو جو رقم ملے گی اس پر اس کی ملکیت مکمل اور مستقل ہو گی یا عارضی اور نامکمل۔ اسی ضمن یہ بحث بھی پیدا ہوتی ہے کہ نفع کا مستحق اس نفع کا مالک کب ہوتا ہے۔ نفع واقع ہوتے ہی یا اس کی یم عمل میں آنے پر حنفی، مالکی اور شافعی فقہاء کے نزدیک نفع کا ظہور اور اس کی ملکیت کا ثبوت اس وقت ما ہے جب حساب فہمی کے بعد اصل سرمایہ صاحب سرمایہ کو واپس مل جائے [۲] حنبلی فقہاء اور شیعہ مکاتب کے نزدیک نفع واقع ہوتے ہی مضاربت میں کاروباری فریق اپنے حصۂ نفع کا مالک ہو جاتا ہے گر کیت پوری طرح قائم اسی وقت ہوتی ہے جب حساب کتاب کے بعد نفع کی تقسیم عمل میں آجائے [۳] اس

---

[۱] ابن رشد : بدایۃ المجتہد جلد ۲ صفحہ ...

[۲] علی الخفیف : الشرکات فی الفقہ الاسلامی صفحہ ...

پورے مسئلے کے بارے میں چاروں فقہی اسکولوں کے مسلک درج ذیل بیان سے واضح ہیں ۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ نفع کی تقسیم اس وقت تک درست نہیں جب تک صاحب سرمایہ اپنے اصل سرمائے پر قبضہ نہ کرلے ۔ اگر نفع اس سے پہلے تقسیم کرلیا گیا ہے تو یہ تقسیم عارضی (موقوف) ہوگی ۔ پھر اگر مالک نے اصل سرمایہ پر قبضہ کرلیا تو (یہی تقسیم) صحیح ہو جائے گی ورنہ کالعدم قرار پائے گی ...... [1]

" البتہ اگر نفع تقسیم کرلیا جائے اور اصل سرمایہ مضاربت پر مال لے کر کاروبار کرنے والے ہی کے پاس ہو ، پھر مضاربت کا یہ معاہدہ ختم کرکے ایک نئے معاہدے کے تحت ازسرنو مضاربت شروع کی جائے تو جو نفع تقسیم کیا جا چکا اس کی تقسیم نافذ ہو جائے گی اور یہ نفع پھر واپس نہ لیا جا سکے گا ۔" [2]

" شافعیہ کہتے ہیں کہ مالک کے سرمایہ پر قبضہ کرنے سے پہلے نفع کی تقسیم درست ہے مگر جب بھی تمام اشیاء تجارت کے فروخت ہو جانے اور اصل سرمایہ کے نقد کی صورت اختیار کرلینے سے پہلے نفع کی تقسیم عمل میں لائی جائے گی تو اس نفع پر ملکیت نہیں قائم ہوگی ۔ اگر اس تقسیم کے بعد سرمایہ میں کوئی نقصان ہوا تو اس نفع پر ملکیت نہیں قائم ہوگی ۔ اگر اس تقسیم کے بعد سرمایہ میں کوئی نقصان ہوا تو اس کی تلافی نفع میں سے کی جائے گی جو حصہ نفع کاروباری فریق کو دیا گیا ہو اسے واپس لیا جائے گا اور جو حصہ صاحب سرمایہ نے لیا ہو اسے اصل سرمایہ میں سے وضع کیا جائے گا ۔" [3]

" مالکیہ کہتے ہیں کہ اس کے بارے میں قاعدہ یہ ہے کہ اصل سرمایہ میں اگر کاروبار کرنے کے سبب کوئی نقصان ہو یا کسی آفت سماوی کے سبب یا چوری کے چوری کرنے کی وجہ سے اس کا کوئی حصہ ضائع جائے تو اس کمی کی تلافی نفع میں سے کی جائے گی ۔ یعنی ضیاع یا خسارے کے بعد اصل سرمایہ کا جو حصہ بچا ہے اس میں پچھلا نفع ملا کر اصل سرمایہ کو پورا کیا جائے گا ۔ اس کے بعد بھی اگر کچھ فاضل بچے تو وہ کاروباری فریق اور صاحب سرمایہ کے درمیان اسی شرط کے مطابق تقسیم پائے گا جو انھوں نے شروع میں طے کی تھی ۔ اگر صاحب سرمایہ کے اصل سرمایہ پر قبضہ پانے سے پہلے نفع تقسیم کرلیا گیا ہو تو اسی قاعدے کے مطابق عمل کیا جائے گا اور نفع میں سے جو کچھ لیا گیا ہو اسے واپس

---

[1] عبدالرحمٰن الجزیری : کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ جلد ۳ ص ۴۶ (مباحث المضاربۃ)

[2] ایضاً ص ۴۸

[3] ایضاً ص ۴۸

کر کے نقصان کی صورت میں اصل سرمایہ کو پورا کیا جائے گا۔"[1]

"حنابلہ کہتے ہیں کہ جب تک مضاربت پر سرمایہ حاصل کر کے کاروبار کرنے والا اصل سرمایہ کو اس کے مالک کو واپس نہ کر دے وہ نفع میں سے کسی حصہ کا حق دار نہ ہوگا، اور نقصان کی تلافی نفع میں سے کی جائے گی .... یہ بات قبضہ کے قائم مقام سمجھی جائے گی کہ تمام اشیاء فروخت کر دی جائیں اور اصل سرمایہ نقد کی صورت اختیار کرے .... اس کے بعد اگر دونوں فریق حساب فہمی کریں اور نفع تقسیم کر لیں مگر صاحب سرمایہ اپنے سرمایہ پر قبضہ نہ کرے بلکہ کاروباری فریق سے یہ طے کرے کہ وہ اس سرمایہ کے ذریعے مضاربت کے اصول پر کاروبار کرے گا۔ پھر اس کاروبار میں نفع ہو تو اس نفع سے سابق کاروبار کے نقصان کی تلافی نہیں کی جائے گی۔"[2]

اوپر احناف کا جو مسلک بیان کیا گیا ہے اس کی صراحت خود حنفی فقہاء نے دلائل کے ساتھ کی ہے صاحب ہدایہ لکھتے ہیں کہ :۔

"اگر مضاربت علیٰ حالہا قائم ہے مگر فریقین نے نفع تقسیم کر لیا ہے۔ اور اس کے بعد سرمایہ کا ایک حصہ ضائع ہو جائے تو دونوں نفع واپس کر دیں گے تا کہ صاحب سرمایہ اصل سرمایہ کو پورا واپس لے سکے کیونکہ نفع کی تقسیم اصل سرمایہ کو پورا کر لینے سے پہلے درست نہیں ہوتی۔ وہ (سرمایہ) بنیاد ہے اور یہ (نفع) اسی پر مبنی اور اس کے تابع ہے۔"[3]

احناف کے نزدیک نفع کاروبار میں نفع واقع ہونے پر نہیں بلکہ نفع کی تقسیم عمل میں آنے پر متحقق ہوتا ہے

"نفع تقسیم سے نمودار ہوتا ہے اور تقسیم کے جائز ہونے کی شرط یہ ہے کہ اصل سرمایہ پر قبضہ کر لیا جائے چنانچہ (مالک کے) اصل سرمایہ پر قبضہ لینے سے پہلے نفع کی تقسیم درست نہیں۔"[4]

ہمارا کہنا یہ ہے کہ جب تک اصل سرمایہ پورے کا پورا صاحب سرمایہ کو نہ دے دیا جائے نفع نمودار ہی نہیں ہوتا۔ کیونکہ نفع اضافہ کا نام ہے جب تک خود اصل سرمایہ صاحب سرمایہ کو نہ مل جائے

---

[1] عبد الرحمٰن الجزیری : کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ جلد ۳ ص۴۱

[2] ایضاً ص۴۲

[3] مرغینانی : ہدایۃ جلد ۳ کتاب المضاربۃ

[4] کاسانی : بدائع الصنائع - جلد ۶ ص۱۰۷

اس میں اضافہ نہیں ظاہر ہو سکتا۔" [1]

یہی موقف شافعی فقہاء نے بھی اختیار کیا ہے۔ امام نووی لکھتے ہیں:۔

"راجح رائے یہی ہے کہ مضاربت پر کاروبار کرنے والا اپنے حصۂ نفع کا مالک نفع کی تقسیم ہونے پر ہوتا ہے نہ کہ نفع کے واقع ہونے پر .... نرخ گر جانے سے جو خسارہ ہوتا ہے اس کی تلافی، جہاں تک ممکن ہو، نفع میں سے کی جائے گی۔ اسی طرح اگر کچھ مال کسی آفت سماوی یا غصب یا چوری کی وجہ سے کاروباری فریق کے کاروبار شروع کر دینے کے بعد ضائع ہو جائے تو اس کی تلافی بھی نفع میں سے کی جائے گی، زیادہ صحیح رائے یہی ہے اور اگر یہ ضیاع کاروباری فریق کے تصرف سے پہلے واقع ہو تو زیادہ صحیح رائے کے مطابق، وہ اصل سرمایہ میں محسوب ہوگا ......

اگر مالک سرمایہ کا کچھ حصہ نفع یا نقصان واقع ہونے سے پہلے واپس لے لے تو باقی سرمایہ ہی اصل قرار پائے گا۔" [2]

جیسا کہ ذیل کے اقتباسات سے واضح ہے مالکی اور حنبلی محققین کا موقف بھی یہی ہے کہ نفع کی اصل تقسیم جس کا اعتبار کیا جائے گا وہی ہے جو اختتام معاہدہ پر اصل سرمایہ کو علیحدہ کرنے کے بعد عمل میں لائی جائے

"جب مال میں گھاٹا ہو ...... تو اس کمی کو نفع میں سے پورا کیا جائے گا اور اس کمی کی تلافی کے بعد جو نفع باقی بچے وہ فریقین کے درمیان ان کی طے کردہ شرط کے مطابق تقسیم پائے گا ...... یہ اسی وقت تک جب تک اصل سرمایہ کاروباری فریق سے واپس نہ لے لیا جائے۔ اگر صاحب سرمایہ نے اصل سرمایہ کو گھاٹے کے ساتھ واپس لے لیا پھر اسے کاروباری فریق کو دوبارہ دیا تو اب اس میں جو کمی (پہلے ہو چکی) ہے اس کی تلافی (آئندہ) نفع سے نہیں کی جائے گی کیونکہ اب یہ مضاربت کا ایک نیا معاہدہ قرار پائے گا۔" [3]

مضاربت پر سرمایہ حاصل کر کے کاروبار کرنے والے کو اس وقت تک کوئی نفع نہیں ملے گا جب تک اصل سرمایہ پورا واپس نہ لے لیا جائے یعنی اصل سرمایہ مالک کو لوٹا دینے سے پہلے اسے

---

[1] سرخسی: المبسوط۔ جلد ۲۲، ص ۳۰

[2] نووی:۔ منہاج۔ ص ۶۵

[3] احمد الدردیر: الشرح الصغیر جلد ۲ ص ۲۳۳

نفع میں سے کچھ لینے کا حق نہیں۔ جب مال میں گھاٹا اور نفع دونوں ہوں تو نقصان کی تلافی نفع سے کی جائے گی۔ خواہ نقصان اور نفع ایک ہی بار کے کاروبار میں ہوا ہو، یا ایک تجارت میں گھاٹا ہوا اور دوسری تجارت میں نفع ہو۔[1]

اختتام کاروبار سے پہلے نفع کی تقسیم

حنابلہ کا اختلاف جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، صرف اس جزئی مسئلے میں ہے کہ کیا کاروباری فریق کا اپنے حصۂ نفع پر حق ملکیت نفع کے واقع ہوتے ہی قائم ہو جاتا ہے۔ ابن قدامہ لکھتے ہیں:-

"تقسیم سے پہلے نفع کے واقع ہوتے ہی کاروباری فریق کے اس کے مالک ہو جانے کے سلسلے میں ہمارا غالب مسلک یہی ہے کہ اس کا یہ حق قائم ہو جاتا ہے۔ قاضی نے یہی مسلک بیان کیا ہے اور یہی ابوحنیفہؒ کی رائے ہے۔ ابوالخطاب نے ایک دوسری روایت بھی نقل کی ہے کہ جب تک تقسیم نہ عمل میں آ جائے کاروباری فریق نفع کا مالک نہیں ہوتا۔ یہی امام مالک کا مسلک ہے اور شافعی کی طرف مذکورہ بالا دو روایتوں کی طرح دو اقوال منسوب ہیں۔"[2]

حنبلی فقہاء اس جزئی اختلاف کے علاوہ اس اصول سے پوری طرح متفق ہیں جو ہم نے اوپر بیان کیا ہے۔ ان کے نزدیک بھی مناسب یہی ہے کہ فریقین کے درمیان نفع کی تقسیم اختتام کاروبار پر ہو۔ البتہ وہ اس بات میں کوئی حرج نہیں سمجھتے کہ اگر صاحب سرمایہ راضی ہو تو کاروباری فریق کو نفع کی کچھ قسطیں علی الحساب دے دی جائیں۔ اس صورت میں بھی دوسرے فقہاء کی طرح وہ یہی رائے رکھتے ہیں کہ یہ تقسیم نفع عارضی ہوگی اور اصل تقسیم اختتام کاروبار پر اصل سرمایہ کو علیحدہ کر لینے کے بعد ہوگی۔ آخری طور پر حساب کرنے سے اگر کسی فریق کو علی الحساب دیے ہوئے نفع میں سے کسی قسم کی واپسی ضروری نظر آئی تو ایسا ہی کیا جائے گا۔ ذیل کی عبارت اس بارے میں بالکل واضح ہے۔

"جب کاروباری فریق پر یہ واضح ہو جائے کہ اس کے ہاتھ میں اصل سرمایہ سے زیادہ مال ہے تو وہ صاحب سرمایہ کی اجازت کے بغیر اس میں سے کچھ لینے کا اختیار نہیں رکھتا۔ خلاصۂ کلام یہ کہ جب مضاربت میں نفع ظاہر ہو تو کاروباری فریق کو صاحب سرمایہ کی اجازت کے بغیر

[1] ابن قدامہ: المغنی جلد ۵ ص۱۶۹

[2] ایضاً ایضاً

اس میں سے کچھ لینے کا اختیار نہیں۔ ہمارے علم کی حد تک اس سلسلے میں اہل علم کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔ کاروباری فریق کو یہ اختیار نہ حاصل ہونے کے تین اسباب ہیں...... تیسرا سبب یہ ہے کہ اس نفع پر اس کی ملکیت غیر مستقل ہے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ آئندہ نقصان ہو اور اس کی تلافی میں یہ نفع اس کے ہاتھ سے نکل جائے۔ اگر صاحب سرمایہ نے اسے کچھ لینے کی اجازت دی ہو تو ایسا کرنا جائز ہوگا کیونکہ اس (مال) سے متعلق سارے حقوق انہی دو افراد کے درمیان محدود ہیں، ان کے علاوہ اس میں کسی کا حق نہیں۔[1]

چاروں مکاتب فقہ کی تصریحات کے مطالعے سے یہ بات واضح ہے کہ اگر فریقین کی رضامندی سے اختتام کاروبار سے پہلے نفع کی قسطوں کے طور پر کچھ رقمیں علی الحساب لے لی جائیں —— اس صورت میں جب کہ اس وقت تک کے کاروبار میں نفع واقع ہو چکا ہو —— تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ اگر اس تقسیم نفع کو عارضی اور اختتام کاروبار پر ہونے والے حساب کتاب کے تابع سمجھا جائے تو اس میں کسی مکتب فقہ کو اعتراض نہ ہوگا۔ آئندہ مباحث میں ہم یہی رائے اختیار کریں گے کسی مشترکہ کاروبار کے ایک طویل مدت تک مسلسل جاری رکھنے کی صورت میں سہولت اور شرکاء کے مفادات و مصالح کا تقاضا یہی ہے کہ اختتام کاروبار سے پہلے نفع کی تقسیم ممکن ہو۔ مضاربت کی صورت میں اس کی ضرورت زیادہ ہے کیونکہ کاروباری فریق نے جس کاروبار کو ذریعہ معاش بنایا ہے اس سے اگر عرصہ دراز تک اسے کوئی آمدنی نہ ہو تو وہ اسے جاری نہ رکھ سکے گا۔

سرمایہ کی واپسی اور نفع کی تقسیم

۴۔ کاروبار میں نفع کے حق دار نفع کے مالک اس وقت قرار پائیں گے جب اصل سرمایے اصحاب سرمایہ کو واپس مل جائیں، خواہ اپنے سرمایوں پر ان کا قبضہ عملاً ہو یا صرف قانوناً۔

اوپر تیسرے اصول کی سند میں جو فقہی عبارتیں نقل کی ہیں وہی اس اصول کی سند بھی فراہم کرتی ہیں۔ تمام فقہاء متفق ہیں کہ مشترکہ کاروبار میں نفع کی مستقل تقسیم اور شرکاء کی اپنے اپنے حصۂ نفع پر مکمل ملکیت اسی وقت قائم ہوگی جب اصل سرمایے اصحاب سرمایہ کو واپس مل جائیں۔

اس ضمن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قبضہ یا واپس ملنے سے کیا مراد ہے۔ اس کی ایک صورت یہ

[1] ابن قدامہ: المغنی جلد ۵ ص ۱۷۸

ہے کہ اصل سرمایہ مالک کے ہاتھ میں دے دیا جائے۔ عملاً قبضہ کی یہ صورت جہاں بہ سہولت ممکن ہو اس کا اہتمام
بہتر ہوگا۔ قبضہ یا واپسی کی دوسری صورت یہ ہے کہ سرمایہ نقد کی صورت میں موجود ہو لیکن وہ عملاً کاروبار
یا شرکائے کاروبار کے ہاتھ میں ہو، مالک کے ہاتھ میں نہ آیا ہو۔ البتہ مالک کے لیے یہ پوری طرح ممکن
کہ وہ چاہے تو اسے اپنے ہاتھ میں لے لے اور خرچ کر دے یا محفوظ رکھے اور چاہے تو اسی کاروباری
یا انہی شرکاء کے ساتھ اس سرمایے کے ذریعے ایک نیا کاروباری معاہدہ کر لے۔ یہ قانونی قبضہ ہے
میں رقم ہاتھ میں تو نہیں آتی مگر پوری طرح زیر تصرف آ جاتی ہے۔ چونکہ ملکیت اور قبضہ کا اصل جوہر
تصرف ہے، اس لیے اکثر فقہاء نے اسے قبضہ اور واپس ملنے کے ہم معنی قرار دیا ہے۔ اصل سرمایے کے
نوناً مالک کو واپس مل جانے کے بعد سابق کاروبار کے نفع و نقصان کی تقسیم آخری اور قطعی ہو جاتی ہے
اب اس سرمایے سے ایک نیا کاروبار شروع کیا جا سکتا ہے۔

حنفی اور حنبلی فقہ کی جو صراحتیں اوپر نقل کی گئی ہیں ان میں یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ اگر ایک
کاروبار کے حسابات صاف کر کے نفع و نقصان کی تعیین و تقسیم عمل میں آ جائے اور پھر سرمایے کا مالک
روباری فریق سے کہے کہ وہ اسی سرمایے سے کاروبار کرے تو یہ ایک نیا معاہدہ قرار پائے گا اور
یسا کاروبار کرنا جائز ہوگا۔

شافعی فقہاء تقسیم نفع کے لیے جس بات پر زیادہ زور دیتے ہیں وہ کاروبار کے سرمایے کا اشیاء
جاس کی فروخت کے ذریعے نقد کی صورت میں منتقل ہو جانا ہے۔ اگر یہ شرط پوری ہو چکی ہے تو نفع کی
نسیم عمل میں لائی جا سکتی ہے۔ اس کے بعد اس بات کی اصولاً پوری گنجائش ہے کہ اسی سرمایے کے ذریعے
فریق کے ساتھ نیا کاروباری معاہدہ کیا جا سکے۔ مالکی فقہاء کے حوالے سے جو قاعدہ اوپر نقل کیا
یا ہے وہ بھی اس امر میں مانع نہیں کہ قانونی قبضہ کو عملی قبضے کے ہم معنی سمجھا جائے۔ لیکن مالکی اور شافعی
کے جن مآخذ کی طرف ہم رجوع کر سکے ہیں ان میں اس بات کی اس طرح صراحت نہیں ملتی جس طرح حنفی
ور حنبلی مآخذ فقہ میں ملتی ہے۔

آئندہ مباحث میں ہم جس رائے کو اختیار کریں گے وہ وہی ہے جو حنبلی اور حنفی فقہاء نے اختیار کی
ہے اور جس کی ہمیں مالکی اور شافعی فقہ کی روشنی میں پوری گنجائش نظر آتی ہے۔ نفع کی آخری تقسیم اور اس
رمایے کے ذریعے نئے کاروباری معاہدے کے لیے سرمایے پر مالک کا قانوناً قبضہ کافی ہے جو اسے اس کے

ہر طرح کے تصرف کا اختیار دے دیتا ہے۔ یہی رائے کاروباری کارکردگی اور سہولت کے لیے زیادہ مناسب ہے۔ اس رائے کو اختیار کرنے میں نزاعی صورت حال پیدا ہونے کا امکان نہیں کیونکہ ہم نے حساب فہمی اور نئے کاروباری معاہدے سے پہلے سرمایہ کے نقد کی صورت اختیار کرلینے اور مالک کے زیر تصرف آجانے کو ضروری قرار دیا ہے۔

دورِ جدید میں اکثر کاروباری لین دین بنکوں میں جمع رقوم کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ کسی فرد کے کھاتے میں جو رقم جمع ہے اس پر وہ اسی طرح قابض ہے جس طرح اس رقم پر جو اس کے ہاتھ میں ہے۔ اگرچہ یہ قبضہ عملاً نہیں قانوناً ہے۔ ہماری اختیار کی ہوئی رائے کے مطابق اگر ایک فرد کسی بنک کے ساتھ مضاربت کا معاہدہ کرے تو اس معاہدے کے اختتام اور نفع کی تقسیم کے لیے یہ کافی ہوگا کہ اصل سرمایہ اس فرد کے کھاتے میں جمع کردیا جائے۔ اس رقم کو اپنے کھاتے سے نکال کر اپنے ہاتھ میں لیے بغیر مالک اسی بنک کے ساتھ اسی رقم کے ذریعے ایک نیا معاہدۂ مضاربت کرسکے گا۔ اس کے لیے یہ بھی ممکن ہوگا کہ اس رقم کے ذریعے ایک دوسرے کاروباری فریق کے ساتھ مضاربت یا شرکت کا معاہدہ کرے اور بنک کو ایک چیک کے ذریعے ہدایت کردے کہ وہ رقم اس نئے کاروباری فریق کی طرف منتقل کردے۔

مشترکہ کاروبار میں کسی فریق کے کاروباری تصرفات کے حدود

اوپر ہم نے جن احکام کا مطالعہ کیا ہے ان کا تعلق مشترکہ کاروبار میں نفع اور نقصان کی تقسیم سے تھا۔ مشترکہ کاروبار کی صورت میں ایک اہم سوال یہ ہے کہ شرکاء کاروبار کے کاروباری تصرفات کے حدود کیا ہیں۔ وہ عام اور بنیادی کاروباری تصرفات جن کے بغیر کسی کاروبار کا تصور نہیں کیا جاسکتا، کسی بحث کے محتاج نہیں۔ نقد قیمت کے عوض خرید و فروخت کا اختیار اس کی سب سے نمایاں مثال ہے۔ باربرداری کے لیے سواری حاصل کرنا، کرایہ پر دکان یا کوئی اور عمارت حاصل کرنا، اجرت پر کام کرنے والے مزدوروں اور دیگر کارکنوں کی خدمات حاصل کرنا اور دوسری کاروباری ضروریات کی تکمیل بھی انہی عام اور بنیادی تصرفات میں داخل ہے جس کا اختیار ہر کارندے کو ہے۔ خواہ وہ شریک ہو یا مضاربت پر مال لے کر کاروبار کررہا ہو۔

شرکت میں شریک اور مضاربت میں کاروباری فریق کو ادھار مال خریدنے یا فروخت کرنے کا اختیار

چند شرائط کے تحت ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ شریک یا کاروباری فریق اگر اس کاروبار میں کسی دوسرے فریق سے شرکت یا مضاربت کے اصول پر مزید سرمایہ حاصل کر کے لگاتا ہے، یا خود اپنا ذاتی سرمایہ بھی شریک کاروبار کرتا ہے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسے ایسا کرنے کا اختیار کن شرائط کے تحت حاصل ہے دوسرے شرکاء یا مضاربت میں صاحب سرمایہ کی اجازت ضروری ہے یا اس کے بغیر بھی وہ ایسا کرسکتا ہے۔ یہی سوال اس صورت میں پیدا ہوتا ہے جب کوئی فریق شرکت یا مضاربت کا معاہدہ کرنا چاہے۔ ایک علیحدہ مسئلہ شرکت یا مضاربت کے سرمایے میں سے قرض دینے یا قرض کے طور پر سرمایہ حاصل کر کے اسے کاروبار میں لگانے کا ہے۔ آئندہ جن چار اصولوں پر گفتگو کی جائے گی ان کا تعلق ان ہی تصرفات سے ہے۔

شریک کے کاروباری تصرفات

۵۔ ایک شریک دوسرے شرکاء کی اجازت سے کاروبار کے لیے دوسرے افراد سے شرکت یا مضاربت کے معاہدے کے تحت مزید سرمایہ حاصل کرسکتا ہے اور شرکت کے مال کے ایک حصے کو کسی دوسرے فریق کو مضاربت یا شرکت کے معاہدے کے تحت کاروبار کرنے کے لیے دے سکتا ہے۔

اس اصول کا تعلق صرف شرکت سے ہے۔ مضاربت کی صورت میں متعلقہ احکام کا مطالعہ چھٹے اصول کے تحت کیا گیا ہے۔ شرکت کا معاہدہ ہر شریک کو دوسرے شرکاء کا ایجنٹ (وکیل) بنا دیتا ہے اسے مشترکہ سرمایہ پر ایسے تصرفات کا حق حاصل ہو جاتا ہے جن کا منشا تمام شرکاء کا فائدہ ہو۔ ہر شریک کو ایسے کاروباری تصرفات کا اختیار حاصل ہو جاتا ہے جو مشترکہ کاروبار کے لیے مفید ہوں جن سے کسی شریک کے مفادات نہ مجروح ہوتے ہوں اور جو کاروباری افراد کے درمیان معروف ہوں۔

مشترکہ کاروبار کی جانب سے شرکت یا مضاربت کا اختیار

جہاں تک کسی شریک کے شرکت کے اصول پر کسی نئے فریق سے مزید سرمایہ حاصل کرنے کا سوال ہے اگر یہ سرمایہ مشترکہ کاروبار میں لگانے کے لیے حاصل کیا گیا ہے تو اس کے معنی شرکت میں ایک شریک کے اضافے کے ہیں۔ یہ اقدام تمام شرکاء کی رضامندی ہی سے کیا جا سکتا ہے کسی کاروبار میں شریک افراد کو ہر وقت اس بات کا اختیار حاصل ہے کہ وہ شرکت کے دوسرے شرعی احکام کی پابندی کرتے ہوئے اس کاروبار میں مزید افراد کو شریک کرلیں۔ دوسرے شرکاء کی اجازت کے بغیر کسی ایک

شریک کو ایسا کرنے کا اختیار نہیں۔

اگر کسی شریک نے کسی دوسرے فریق کے ساتھ مشترکہ کاروبار کے علاوہ اپنے ذاتی سرمایہ سے ایک نئے کاروبار کے آغاز کے لیے شرکت کی ہے تو اس کی نوعیت مختلف ہے۔ یہ اس شریک کا ایک ذاتی فعل ہے جس کا مشترکہ کاروبار سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ مسئلہ دراصل زیر بحث مسئلہ سے براہ راست متعلق بھی نہیں ہے۔ البتہ اگر یہ نیا کاروبار اس شریک کے سابق مشترکہ کاروبار کے سلسلے میں کاروباری جدوجہد پر اثر انداز ہو سکتا ہو تو مسئلے کی نوعیت بدل جائے گی۔ ایسی صورت میں بعض فقہاء نے یہ ضروری قرار دیا ہے کہ ایسا کرنے سے پہلے دوسرے شرکاء سے اجازت حاصل کر لی جائے۔

یہی نوعیت کسی شریک کے مضاربت کے اصول پر کسی نئے فریق سے سرمایہ حاصل کر کے کاروبار کرنے کی ہے۔ اگر یہ سرمایہ مشترکہ کاروبار کی طرف سے اس میں لگانے کے لیے حاصل کیا گیا ہے تو اس میں تمام شرکاء کی رضامندی ضروری ہے۔ کیونکہ اس معاہدے کی اصل نوعیت یہ ہوگی کہ یہ تمام شرکاء کی جانب سے کیا جائے گا۔ مضاربت کے معاہدے کے تحت حاصل کیے ہوئے سرمایہ پر شرکت کے حصے میں جو کچھ آئے گا وہ تمام شرکاء کا مشترکہ نفع ہوگا اور ان شرائط کے مطابق تقسیم پائے گا جو ان کے درمیان طے پائی ہوں۔

اگر یہ سرمایہ اس شریک نے اپنی ذاتی حیثیت میں حاصل کیا ہو تو یہ نیا کاروبار اس کا ذاتی کاروبار ہوگا اور اس معاہدۂ مضاربت کے تحت اسے جو نفع ملے گا وہ اس کی ذاتی ملکیت ہوگا' دوسرے شرکاء کا اس میں کوئی حصہ نہ ہوگا۔ البتہ اگر یہ نیا کاروبار مشترکہ کاروبار کے سلسلے میں اس کی کاروباری جدوجہد کو متاثر کر سکتا ہو تو مسئلہ کی نوعیت بدل جائے گی۔ بعض فقہاء نے ایسی صورت میں یہ ضروری قرار دیا ہے کہ یہ اقدام دوسرے شرکاء سے اجازت حاصل کر کے کیا جائے۔

(باقی)

تصحیح

اگست ۱۹۶۱ء کے شمارے میں مقالہ "شرکت اور مضاربت کے شرعی اصول" کا ایک پیراگراف چھوٹ گیا ہے قارئین صفحہ ۲۲ سطر ۱۶ کے بعد درج ذیل پیراگراف بڑھا لیں۔

شافعی فقہاء کے نزدیک جب ایک فریق سرمایہ فراہم کرے اور دوسرا اس سے کاروبار کرے تو

"ضروری ہے کہ نفع انہیں دونوں کے لیے مخصوص ہو اور دونوں اس میں شریک ہوں .... ہر ایک کا حصہ کل نفع کے ایک جزء کے طور پر متعین و معلوم ہو .... اگر کسی فریق کے لیے دس (درہم) طے کیے گئے یا کسی خاص قسم کے مال تجارت کا نفع طے کیا گیا تو معاہدہ فاسد ہو جائے گا۔

نووی: منہاج الطالبین ۲۹۶-۲۹۵

انکارِ دین کے اسباب

(سید جلال الدین عمری)

خدا نے اپنا دین واضح کر دیا ہے جو شخص بھی سنجیدگی سے اس پر غور کرے گا اس کو حق پالے گا۔ لیکن اس کے باوجود یہ واقعہ ہے کہ کبھی تمام انسانوں نے اسے قبول نہیں کیا۔ ہر دور میں بے شمار انسان اس کا انکار کرنے والے پائے گئے اور آج بھی اس کے منکرین اکثریت میں ہیں۔ قرآن نے اس کے اسباب کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ یہاں ہم چند نمایاں اسباب کا ذکر کریں گے۔

غلط افکار کا غلبہ

صحیح فکر انسان کو خدا کے دین سے ملتا ہے۔ اس کے علاوہ جتنے بھی افکار و نظریات ہیں وہ سب غلط اور باطل ہیں۔ جو شخص خدا کے دین کو چھوڑ دے وہ کسی نہ کسی غلط فکر کو اختیار کرنے پر مجبور ہے۔ اگر جلد ہی اسے اپنی غلطی کا احساس نہ ہو تو وہ اس کو غلط ماننے سے بھی انکار کر دیتا ہے اور اس کے حق میں دلائل فراہم کرنے لگتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی فکر پر مدت تک قائم رہنے سے انسان کو اس سے محبت ہو جاتی ہے اور اس کے بارے میں اس کے اندر تعصب پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ تعصب کسی صحیح فکر سے ہے تو یقیناً قابل تعریف ہے۔ اس لیے کہ اس سے اس کی ذات کو اور دوسروں کو فائدہ پہنچتا ہے۔ لیکن اگر یہی تعصب کسی غلط فکر سے پیدا ہو جائے تو اس کی قطعاً تعریف نہیں کی جاسکتی۔ کیونکہ یہ سخت تباہ کن ہے۔ کسی غلط فکر کو اختیار کرنے کے بعد صحیح فکر کی طرف وہی شخص پلٹ سکتا ہے جو مضبوط قوت ارادی کا مالک ہو اور جس میں اتنی ہمت ہو کہ ہر وقت اپنے رویے کا تنقیدی جائزہ لے سکے لیکن ایسے لوگ کم ہوتے ہیں۔ عام انسانوں کی ذہنی کیفیت یہ ہے کہ جب کسی شخص پر کوئی غلط فکر چھا جاتی ہے تو خدا کے دین کے حق میں اس کی نفسیات بدل جاتی ہے۔ وہ دین کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ اس کی پوری قوت دین پر اعتراض اور تنقید میں صرف ہوتی ہے۔ خدا کے دین کو رد کرنے کے لیے اسے

کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ کمزور سا بہانہ بھی کافی ہوتا ہے۔ قرآن کے الفاظ میں اس پر شیطان کی گرفت مضبوط ہو جاتی ہے۔ شیطان اس کو بڑی تیزی سے غلط راستے پر لے چلتا ہے اور ساتھ ہی اس دھوکے میں رکھتا ہے کہ وہ راہ راست پر ہے اور بہترین دلائل کی بنا پر اس نے خدا کے دین کو رد کیا ہے۔

وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ۝ وَاِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝ (الزخرف: ۳۷-۳۶)

جو شخص خدائے رحمٰن کی یاد سے اعراض کرے ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں اور وہ اس کا ساتھی بن جاتا ہے۔ یہ شیاطین ان کو راہ راست سے روکتے ہیں لیکن وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ سیدھے راستے پر قائم ہیں۔

خدا نے اپنا دین نازل کرنے سے پہلے تمام مخالف نظریات کو مٹا نہیں دیا بلکہ ان کو باقی رکھا اور اس بات کے مواقع دیے کہ اس کے دین کے ساتھ ساتھ وہ بھی اپنا کام کرتے رہیں۔ کیونکہ اسی میں انسان کا امتحان ہے اور اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ کس شخص کو خدا کا دین عزیز ہے اور کون ان نظریات کو اختیار کرتا ہے جو اس سے متصادم ہیں۔ چنانچہ جب بھی خدا کا دین انسانوں کے سامنے پیش ہوا باطل نظریات نے پوری قوت سے اس کی مخالفت کی اور اس کو مٹانے اور اس پر غالب آنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ یہی بات قرآن کی اس آیت میں کہی گئی ہے:۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ۭ وَلَوْ شَاۗءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ۝ وَلِتَصْغٰٓى اِلَيْهِ اَفْـــِٕدَةُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَلِيَرْضَوْهُ وَلِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ

اسی طرح ہم نے انسانوں اور جنوں میں سے شیاطین کو ہر نبی کا دشمن بنا دیا ہے۔ وہ دھوکا دینے کے لیے ایک دوسرے کے دل میں خوش آیند باتیں ڈالتے رہتے ہیں۔ اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کر پاتے۔ تو تم ان کو اور ان کی افترا پردازیوں کو (اللہ پر) چھوڑ دو۔ (یہ سب کچھ ہم انہیں اس لیے کرنے دے رہے ہیں) تاکہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل اس کی طرف

مُقْتَرِفُوْنَ ۝ مائل ہوں اور وہ اس سے راضی ہو جائیں اور
جن برائیوں کا وہ اکتساب کرنا چاہتے ہیں ان
(الانعام: ۱۱۳-۱۱۲) کا اکتساب کرلیں ۔

خدا کا دین ہمیشہ ایک رہا ہے لیکن اس کا مقابلہ مختلف ادوار میں مختلف نظریات کرتے رہے ہیں جو شخص بھی سنجیدگی سے ان نظریات کا خدا کے دین سے موازنہ کرے گا اسے معلوم ہوگا کہ ان میں سے ہر نظریہ انسانی فکر کی خامیوں کا اعتراف ہے اور نجات خدا کے دین میں ہے ۔ خدا نے انسان کو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت دی ہے ۔ وہ حق و باطل میں تمیز کرسکتا ہے، لیکن غلط نظریات اس کے دل و دماغ پر اس طرح چھا جاتے ہیں کہ وہ ان سے ہٹ کر سوچنے کے لیے تیار نہیں ہوتا ۔

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝

ان کے پاس دل ہیں مگر وہ ان سے نہیں سوچتے اور ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ ان سے نہیں دیکھتے اور ان کے پاس کان ہیں مگر ان سے نہیں سنتے یہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے یہی لوگ ہیں جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں

(الاعراف: ۱۷۹)

جو شخص باطل نظریات کا گرویدہ ہو جائے ۔ اس کے سامنے خدا کے دین کو اگر اس کا رسول بھی پیش کرے تو وہ اس کو صاف رد کردے گا ۔ ہو سکتا ہو کہ ان دلائل کی وجہ سے اس کی زبان بند ہو جائے جو خدا کا رسول اس کے دین کے حق میں پیش کرتا ہے لیکن اس کے دل کے دروازے اس کے لیے کھل نہیں سکتے ۔

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ وَفِيْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّمِنْۢ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ ۝

وہ کہتے ہیں کہ جس بات کی طرف تم ہم کو بلاتے ہو ہمارے دل اس سے پردے میں ہیں اور ہمارے کانوں میں گرانی ہے اور ہمارے اور تمہارے درمیان ایک طرح کا حجاب حائل ہے پس تم اپنی جگہ کام کرو اور ہم بھی اپنی جگہ کام کر رہے ہیں ۔

(حٰمٓ السجدہ: ۵)

دین کو قبول کرنے کی راہ میں ایک رکاوٹ انسان کا غلط عمل بھی ہے۔

غلط عمل سے محبت انسان اگر کسی غلط نظریۂ حیات کو اختیار کر لے تو وہ صحیح رخ سے پھر جاتا ہے اور غلط رخ میں کام کرنے لگتا ہے اور جب صحیح فکر کو اپناتا ہے تو اس کی زندگی کا سارا نظام درست ہو جاتا ہے۔ کسی فکر کی خوبی یا خامی کو خالص علمی و عقلی بنیاد پر معلوم کرنا یقیناً دشوار ہے لیکن اس کے نتائج کو دیکھ کر اس کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کرنا نسبتاً آسان ہے جس شخص کو کسی غلط فکر کے نتائج بے چین کر دیں اس پر دین کی حقیقت آسانی سے کھل جاتی ہے لیکن جو شخص ان نتائج سے مطمئن ہو دین کی طرف اس کا متوجہ ہونا بہت مشکل ہے۔ دنیا کے بیشتر انسان اسی وجہ سے خدا کے دین کو چھوڑے ہوئے ہیں کہ انہیں اس کا احساس نہیں ہے کہ غلط افکار و نظریات نے ان کی زندگی کو کس قدر فتنہ و فساد سے بھر دیا ہے۔ صحیح فکر کے نہ ہونے سے ان کے اخلاق تباہ ہو گئے ہیں، ان کی معاشرت بگڑ گئی ہے، ان کی معیشت و سیاست میں خلل آگیا ہے لیکن اس کے باوجود ان میں اپنی اصلاح کے لیے کوئی بے چینی اور اضطراب نہیں ہے۔ قرآن کے الفاظ میں گو وہ عقل و فہم رکھتے ہیں اور صحیح و غلط میں تمیز کر سکتے ہیں لیکن شیطان نے ان کی غلط روش کو انتہائی حسین بنا دیا ہے اور وہ اس فریب میں مبتلا ہیں کہ وہ بہت اچھے کام کر رہے ہیں

وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَكَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ ۝ (العنکبوت: ۳۸)

شیطان نے ان کے اعمال کو ان کے لیے آراستہ کر دیا اور انہیں سیدھے راستے سے روک دیا حالانکہ وہ سوجھ بوجھ والے تھے۔

انسان کے لیے نجات کا راستہ یہ ہے کہ خدا کا دین اخلاق کا جو تصور پیش کرتا ہے، تہذیب و معاشرت کے جو آداب سکھاتا ہے، معیشت و سیاست کے جو اصول دیتا ہے، عدل و انصاف کے جو قوانین فراہم کرتا ہے، ان کو اخلاص کے ساتھ قبول کرے اور اپنی زندگی کو ان کا تابع بنا دے لیکن جو شخص اپنی ناکام زندگی ہی کو کامیاب زندگی سمجھ بیٹھے وہ خود ہی تباہ ہونا چاہتا ہے، اسے تباہی سے کون بچا سکتا ہے۔

اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا فَاِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ

کیا وہ شخص جس کے لیے اس کا برا عمل خوشنما بنا دیا گیا ہے اور وہ اس کو اچھا خیال کرتا ہے۔ (اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو نیک عمل کرتا ہے؟) حقیقت یہ ہے کہ اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ

حَسَرَاتٍ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِمَا يَصْنَعُونَ ○ (فاطر: ۸)

کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھاتا ہے تو ان پر حسرت اور افسوس میں تمہاری جان نہ جاتی رہے۔ وہ جو کچھ کر رہے ہیں یقیناً اللہ اسے جانتا ہے۔

کثریت کی اتباع خدا کے دین کو قبول کرنا ان لوگوں کے لیے بھی آسان نہیں ہے جو حق و باطل کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھتے بلکہ دنیا کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں جن کے ہر اقدام کو دنیا کی روش متعین کرتی ہے اور دنیا کی روش اگر بدل جائے تو ان کا رویہ بھی بدل جاتا ہے۔ یہ لوگ کسی نظریے کو اس کے دلائل کی وجہ سے نہ قبول کرتے ہیں اور نہ رد کرتے ہیں بلکہ ان کی موافقت اور مخالفت دنیا کے رجحان کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک دنیا جس چیز کو قبول کر لے وہ حق ہے اور جسے قبول نہ کرے وہ باطل ہے۔ جب خدا کا دین وقت کے نظریات کو ہر محاذ پر چیلنج کرتا ہے اور اپنی حقانیت اس طرح ثابت کر دیتا ہے کہ علم و عقل کے میدان میں اس کی مخالفت ناممکن ہو جاتی ہے تو وہ حیرت کے ساتھ اپنے چاروں طرف دیکھتے ہیں کہ دنیا اس کو کیوں نہیں قبول کرتی مگر خود ان میں اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ دنیا کے رویے کے برخلاف اپنے بگڑے ہوئے عقائد کو چھوڑ کر خدا کے دین کو اختیار کر لیں اور اس کے مطیع و تابع بن جائیں۔ وہ یہ سوچ کر اپنے نفس کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ گو خدا کا دین بظاہر حق ہے لیکن دنیا جب اس کو قبول نہیں کر رہی ہے تو یقیناً اس میں کوئی خرابی ہوگی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ساری انسانی آبادی غلط راستے پر چل رہی ہو اور راہ حق صرف چند اشخاص پر منکشف ہو جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب انسان کا ذہن پستی کی اس حد کو پہنچ جائے کہ وہ پاکیزہ چیز کے مقابلے میں گندگی کو اس لیے ترجیح دے کہ وہ بڑی مقدار میں ہے تو اس سے کسی فکری بلندی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ خدا کا دین ان لوگوں کو ملتا ہے جن کا ذوق صحیح اور فکر اونچی ہو اور جو دنیا کے رویے کی بنا پر نہیں بلکہ اس کی خوبیوں کی وجہ سے اسے قبول کرنے کے لیے آمادہ ہوں۔ قرآن کہتا ہے کہ دنیا کے بیشتر انسان اپنے خیالات کے لیے کوئی علمی بنیاد نہیں رکھتے بلکہ محض وہم و قیاس کی اتباع کرتے ہیں۔ اس لیے یہ بات صحیح نہ ہوگی کہ دنیا کی اکثریت کو دیکھ کر باطل کو اختیار کر لیا جائے بلکہ معقولیت کی راہ یہ ہے کہ اکثر کے طریقے کو چھوڑ کر حق کی اتباع کی جائے ورنہ جس طرح انسانوں کی اکثریت گمراہ ہے اسی طرح

بھی بھٹکتے پھروگے اور منزل تم سے دور ہوتی چلی جائے گی۔

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِى	اگر تم ان لوگوں کی اکثریت کی اتباع
الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ	کروگے جو زمین میں ہیں تو وہ تم کو خدا کے
اللّٰهِ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ	راستے سے بھٹکا دیں گے۔ وہ تو گمان کی
هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۝ (الانعام:۱۱۶)	پیروی کرتے ہیں اور محض اٹکل پچو سے کام لیتے ہیں۔

گمراہ لیڈروں کی غلامی

حق اور باطل کے درمیان فیصلہ کرنا ہر شخص کا اپنا کام ہے لیکن دنیا کے بیشتر انسان یہ کام خود نہیں کرتے بلکہ اسے اپنے راہنماؤں اور لیڈروں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ وہ اپنے راہنماؤں کو گو خدا نہ کہیں لیکن ان کا کوئی بھی حکم ان کے لیے حکم خدا سے کم نہیں ہوتا۔ ان کے نزدیک حق وہ ہے جسے ان کے لیڈر کی زبان حق کہہ دے اور جس خیال کے باطل ہونے کا فیصلہ ان کا راہنما کر دے وہ یقیناً باطل ہے جس راستے پر ان کے راہنما چلیں وہی ان کی راہ ہوتی ہے۔ کسی مخالف سمت میں قدم اٹھانا ان کے لیے ناممکن ہے۔ وہ ہر معاملہ میں اپنے راہ نماؤں کی عقل سے سوچتے ہیں اور ان کی اتباع کو اپنے لیے باعث سعادت سمجھتے ہیں۔ وہ بظاہر صاحب تمیز مخلوق ہیں لیکن ان کے راہنما ان کو جانوروں کی طرح جدھر چاہتے ہیں ہانکتے پھرتے ہیں۔

خدا نے نجات کا راستہ اپنے پیغمبروں کے ذریعے بتا دیا ہے۔ اب انسان کے سامنے دو ہی صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ براہ راست پیغمبروں کے علوم سے واقفیت حاصل کرے اور اس کی روشنی میں خود بھی زندگی گزارے اور دوسروں کی بھی راہنمائی کرے۔ دوسری صورت یہ کہ ان لوگوں کی اتباع کرے جو اسے پیغمبروں کی راہ دکھا سکتے ہیں۔ بلاشبہ ایسے افراد کم ہوتے ہیں جو زندگی کے مختلف مسائل میں علوم نبوت سے براہ راست استفادہ کریں اور دنیا کو صحیح راہ دکھائیں۔ لیکن خدا نے ہر انسان کو اتنی صلاحیت ضرور دی ہے کہ وہ پیغمبروں کے راستے پر چلنے والوں اور ان لوگوں کے درمیان فرق کر سکے جو اس راہ سے اس کو پھیرنا چاہتے ہیں لیکن اس کے باوجود انسان اگر اپنی زمام کار ان ہی اشخاص کے ہاتھ میں دے دے جو پیغمبروں کے راستے سے خود بھی برگشتہ ہیں اور دوسروں کو بھی برگشتہ کر رہے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے خود ہی اپنے لیے نجات کی راہ بند کر لی ہے۔ اس کے سامنے وہ ہولناک نتائج آکر رہیں گے جن کا مشاہدہ پیغمبروں کی مخالفت کے بعد تاریخ ہمیشہ کرتی رہی ہے۔ اگر کسی کے دل پر اپنے راہنما کا اس طرح قبضہ ہو گیا ہے کہ وہ اس کے

پیچھے جہنم میں بھی جانے کے لیے تیار ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے جہنم سے نکال کر جنت میں نہیں پہنچا سکتی ۔ انسان صرف خدا کے قانون کا پابند ہے لیکن اس کی کتنی بڑی بدقسمتی ہے کہ وہ اپنے ہی جیسے انسانوں کے احکام کی اس طرح پیروی کرتا ہے جیسے خدا کے قانون کی اسے پیروی کرنی چاہیے ۔

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ	انھوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے عالموں کو
رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ	اپنے درویشوں کو اور عیسیٰ بن مریم کو رب بنالیا
وَالْمَسِیْحَ ابْنَ مَرْیَمَ وَمَآ اُمِرُوْٓا	حالانکہ ان کو یہی حکم دیا گیا تھا کہ وہ صرف ایک
اِلَّا لِیَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰهَ	خدا کی عبادت کریں ۔ اس کے سوا کوئی معبود
اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ۝	نہیں ہے ۔ پاک ہے وہ اس شرک سے جو وہ
(التوبۃ: ۳۱)	کرتے ہیں ۔

ماضی کی پرستش

بہت سے لوگ ماضی کے پرستار ہوتے ہیں ۔ وہ کسی ایسے نظریے کو قبول نہیں کرتے جو ان کے ماضی کو غلط قرار دے اور ان کے اسلاف پر تنقید کرے ۔ خدا کی طرف سے آنے والے حق کو چھوڑنا ان کے لیے آسان ہے لیکن ماضی کی غلط روایات کو اپنی زندگی سے خارج کرنا آسان نہیں ہے ۔ ان کو ماضی کی خوبیوں ہی سے نہیں خامیوں سے بھی محبت ہوتی ہے ۔ وہ ماضی سے سبق نہیں لیتے بلکہ اس کی خوبیوں اور خرابیوں دونوں ہی کو فخر کے ساتھ دہراتے ہیں ۔ ان کو اپنے بزرگوں میں عقل، بصیرت، دیانت، احتیاط غرض ہر خوبی نظر آتی ہے اور ان سے کسی بھی غلطی کو وہ خارج از امکان سمجھتے ہیں ۔ ان کے نزدیک ماضی میں جو کچھ ہوا وہ حق ہے اور جس چیز کو ماضی کی سند حاصل نہیں ہے وہ باطل ہے ۔ غلط سے غلط فلسفہ بھی ان کے لیے قابلِ قبول ہوتا ہے، اگر ماضی نے اس کو شرفِ قبولیت بخشا ہے اور زندگی کے بہترین نظریے کو بھی وہ قبول نہیں کرسکتے، اگر ان کے غلط رو اسلاف نے اس کو رد کر دیا ہے ۔ قرآن ماضی کی اس پرستش پر سخت تنقید کرتا ہے ۔ اس کے نزدیک ماضی یقیناً سینے سے لگانے کے قابل ہے جب کہ حق کی روشنی اس میں موجود ہو لیکن ماضی اگر حق سے خالی ہے تو باعث فخر نہیں، بلکہ باعثِ ننگ ہے ۔ اگر کوئی شخص اس وجہ سے حق کو رد کرتا ہے کہ اس کے آباء و اجداد نے اسے رد کیا تھا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان کے انجام سے عبرت حاصل کرنا نہیں چاہتا بلکہ ان ہی کی طرح تباہ ہونا چاہتا ہے ۔ خدا کا دین بڑی قربانیوں کے بعد ملتا ہے جو شخص اس کے لیے ماضی کی فرسودہ روایات کو بھی نہ چھوڑ سکے وہ اس

کا حامل نہیں بن سکتا۔ انسان کو اپنے ماضی سے محبت کی بجائے خدا کے دین سے محبت ہونی چاہیے لیکن افسوس کہ وہ ماضی کی محبت میں خدا کے دین کو بھول جاتا ہے۔

وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا	اور اسی طرح (اے پیغمبر) ہم نے تم سے
مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ	پہلے جس بستی میں بھی کسی ڈرانے والے کو بھیجا تو اس
اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا وَجَدْنَا	کے آسودہ حال لوگوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے
اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى	باپ دادا کو ایک طریقے پر پایا ہے اور ہم ان
اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ۝ قٰلَ	ہی کے نقوش قدم کی پیروی کر رہے ہیں۔ پیغمبر
اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا	نے ان سے کہا کہ اگر میں اس سے زیادہ سیدھا
وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ	طریقہ تمہیں بتاؤں جس پر تم نے اپنے باپ دادا کو
قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ	پایا ہے (تو کیا اس وقت بھی تم اپنے پرانے
فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَانْظُرْ	طریقے ہی پر قائم رہوگے؟) انھوں نے جواب دیا
كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ	کہ جس دین کے ساتھ تمہیں بھیجا گیا ہے ہم اس کے
الْمُكَذِّبِيْنَ ۝	منکر ہیں۔ تو ہم نے ان سے بدلہ لیا پس دیکھو کہ جھٹلانے
(الزخرف: ۲۵-۲۳)	والوں کا انجام کیسے ہوا؟

دنیا کی محبت انسان دنیا کی زندگی میں کھویا ہوا ہے لیکن خدا کا دین چاہتا ہے کہ آخرت کی فکر اس پر چھا جائے اور وہ دنیا کی کامیابی اور ناکامی سے بے نیاز ہو کر صرف آخرت کے لیے کام کرے۔ کیونکہ دنیا اس قابل نہیں ہے کہ انسان کا مطمح نظر بن سکے۔

اِنَّمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا	یہ دنیا کی زندگی تو محض (چند روزہ)
مَتَاعٌ وَّاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ هِيَ	ساز و سامان ہے اور آخرت تو وہی ہمیشہ رہنے کا
دَارُ الْقَرَارِ ۝	گھر ہے۔

دنیا کی زندگی ایک فریب ہے لیکن انسان یہ سمجھتا ہے کہ یہی سب سے بڑی اور آخری حقیقت ہے۔ اس سے اونچی کسی حقیقت کا وجود نہیں ہے کہ اسے وہ تلاش کرے۔ دنیا اس کے شب و روز پر چھا گئی ہے اور اس کی ساری جدوجہد اسی کے لیے ہے۔ قرآن کے الفاظ میں:

يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غَافِلُونَ	یہ لوگ دنیا کی زندگی کے ظاہر کو جانتے ہیں اور آخرت سے بالکل بے خبر ہیں ۔

دین کی بہت سی حقیقتوں کا تعلق عالم آخرت سے ہے ۔ ان حقیقتوں کو انسان اسی وقت سمجھ سکتا ہے جب کہ وہ اس مادی دنیا سے ہٹ کر سوچنے کے لیے تیار ہو لیکن کم ہی انسان اس کے لیے تیار ہوتے ہیں ۔ بہت سے لوگ آخرت کے امکان ہی کو تسلیم نہیں کرتے اور بہت سے اس کے بارے میں شک میں پڑے ہوئے ہیں ۔ ان کو یقین نہیں ہے کہ فی الواقع وہ آئے گی ۔ حالانکہ آخرت گو آج ہماری نگاہوں سے چھپی ہوئی ہے لیکن وہ وقت جلد آنے والا ہے جب کہ وہ بالکل بے نقاب ہوگی اور انسان انکار آخرت کے نتائج کو دیکھ کر کانپ اٹھے گا لیکن اس وقت اس کی حسرت اور ندامت اس کے کچھ بھی کام نہ آئے گی کیونکہ مہلت عمل ختم ہو چکی ہوگی اور اپنے اعمال کا نتیجہ سامنے ہوگا ۔

فَيَوْمَئِذٍ لَّا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَعْذِرَتُهُمْ وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ	پس اس دن ظلم کرنے والوں کو نہ تو ان کی عذر خواہی کچھ کام دے گی اور نہ ان کو خدا کو خوش کرنے کا موقع دیا جائے گا ۔
(الروم: ۵۷)	

اسباب دنیا کی کثرت

اسباب دنیا کی کثرت اور آسائش و راحت سے بھرپور زندگی بھی بعض اوقات قبول حق کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے ۔ آسودہ زندگی انسان کے اندر سے اطاعت کا جذبہ چھین لیتی اور اسے خدا کا باغی بنا دیتی ہے ۔ عیش و عشرت میں انسان خدا کی ہدایت کو اس طرح رد کر دیتا ہے جیسے خدا اس کا حاکم اور وہ اس کا محکوم نہیں ہے ۔ خدائے تعالےٰ اس سرکشی پر بار بار اس کو تنبیہ کرتا ہے لیکن وہ اپنی نافرمانی سے باز نہیں آتا ۔ یہاں تک کہ خدا کا قانون مکافات اس کو پیس کر رکھ دیتا ہے ۔

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۝ وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا	ہم اس وقت تک لوگوں کو عذاب نہیں دیا کرتے جب تک کہ ان کے درمیان ایک رسول نہ بھیج دیں ۔ جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو اس کے خوش حال لوگوں کو (اپنی اطاعت کا) حکم دیتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ اس میں

تَدۡمِیۡرًا ○   —— نافرمانی کرتے ہیں تب اس بستی پر عذاب کا فیصلہ

(بنی اسرائیل: ۱۶-۱۷)   ہو جاتا ہے اور ہم اسے تباہ کر کے رکھ دیتے ہیں

آسودہ حال انسان کبھی اس دھوکے میں ہوتا ہے کہ حق اس کے ساتھ ہے۔ اس سے آگے بعض اوقات وہ اس فریب میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے کہ وہ حق کا ترجمان ہے۔ اس کا حکم خدا کا حکم اور اس کی مخالفت خدا کی مخالفت ہے۔ وہ کسی خستہ حال شخص کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ اس کی غلطیوں پر تنقید کرے اور اسے راہ راست دکھائے۔ وہ جب کسی کم حیثیت انسان کی زبان سے حق کا پیغام سنتا ہے تو حقارت کے ساتھ جھٹکرا دیتا ہے —— وہ اس منطق سے اپنے آپ کو اور دوسروں کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ جب مجھے دنیا کا عیش حاصل ہے تو یہ میرے برحق ہونے کی دلیل ہے۔ میری راہ اگر غلط ہوتی تو مجھ پر خدا کا اس طرح التفات نہ ہوتا اور میں اس کے انعام و اکرام سے یوں نوازا نہ جاتا۔ اس کے برعکس جو شخص میری روش کو غلط قرار دے رہا ہے اس کو سکون اور چین کی زندگی تک نصیب نہیں ہے۔ اگر اس کی راہ خدا کی راہ ہوتی اور اس کا طرز عمل خدا کے نزدیک پسندیدہ ہوتا تو وہ اسباب دنیا سے محروم نہ ہوتا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنے اس دعوے میں جھوٹا ہے اور خدا اس کے ساتھ نہیں ہے۔ لہذا ایسے شخص کی اتباع کرنا اپنے آپ کو تباہ و برباد کرنا ہے۔

وَقَالَ الۡمَلَاُ مِنۡ قَوۡمِهِ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَكَذَّبُوۡا بِلِقَآءِ الۡاٰخِرَةِ وَاَتۡرَفۡنٰهُمۡ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ۙ مَا هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ ۙ يَاۡكُلُ مِمَّا تَاۡكُلُوۡنَ مِنۡهُ وَيَشۡرَبُ مِمَّا تَشۡرَبُوۡنَ ○ وَلَئِنۡ اَطَعۡتُمۡ بَشَرًا مِّثۡلَكُمۡ اِنَّكُمۡ اِذًا لَّخٰسِرُوۡنَ ○

(المؤمنون: ۳۳-۳۴)

اس کی قوم کے سرداروں نے جنھوں نے کفر کیا اور آخرت کی پیشی کا انکار کیا اور جن کو ہم نے دنیا کی زندگی میں آسودہ کر رکھا تھا۔ کہنے لگے کہ یہ تو تم ہی جیسا آدمی ہے۔ تم جو کچھ کھاتے ہو وہی وہ بھی کھاتا ہے اور تم جو کچھ پیتے ہو وہی وہ بھی پیتا ہے۔ اگر تم نے اپنے ہی جیسے کسی انسان کی پیروی اختیار کی، تو تم یقیناً خسارے میں رہوگے۔

یہی بات محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں آپ کے مخالفین کہتے تھے:۔

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ (الزخرف : ۳۱)

یہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن دونوں شہروں (مکہ اور طائف) کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں نازل کیا گیا؟

دنیا میں ایسے انسانوں کی کمی نہیں ہے جو اس طرح کی غیر عقلی باتوں پر آسانی سے ایمان لے آتے ہیں۔ وہ حق کا بحیثیت حق کے مطالعہ نہیں کرتے، بلکہ یہ دیکھتے ہیں کہ اسے کس حیثیت اور کس سطح کے انسان نے پیش کیا ہے اور پھر اسی لحاظ سے اس کے ساتھ ان کا رویہ متعین ہوتا ہے۔ وہ حق کو آسانی سے رد کر سکتے ہیں، اگر کوئی بے حیثیت آدمی اسے پیش کر دے لیکن کھلے ہوئے باطل کو بھی رد نہیں کر سکتے، بلکہ اس کی طرف لپک پڑیں گے، اگر سرداران قوم اس کی دعوت دے رہے ہوں۔ ان کی عقل میں یہ بات نہیں آتی کہ جو شخص آسائش سے محروم اور ساز و سامانِ دنیا سے خالی ہے وہ تو حق کا امین ہو اور اصحاب تخت و تاج اور بڑے بڑے امراء و رؤسا اس سے ناواقف ہوں لیکن ظاہر ہے اس نادانی اور غلط اندازِ فکر کی بنا پر وہ انکارِ حق کے انجام سے محفوظ نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ وہ کبھی محفوظ نہیں رہے۔

وَنَادٰى فِرْعَوْنُ فِيْ قَوْمِهٖ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ مَهِيْنٌ وَّلَا يَكَادُ يُبِيْنُ ۝ فَلَوْلَا اُلْقِيَ عَلَيْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ ۝ فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ۝ فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ فَجَعَلْنٰهُمْ

فرعون نے اپنی قوم میں پکار کر کہا کہ اے میری قوم کیا ملک مصر میرا نہیں ہے اور یہ نہریں (جو) میرے نیچے بہہ رہی ہیں کیا تم (ان سب چیزوں کو) نہیں دیکھتے ہو بلکہ میں (تو یقیناً) بہتر ہوں اس شخص سے جو کہ ذلیل ہے اور صاف صاف اپنی بات بھی نہیں کر سکتا۔ پس کیوں نہیں ڈالے گئے اس کے لیے سونے کے کنگن یا آئے اس کے ساتھ فرشتے پرے باندھ کر۔ اس طرح اس نے اپنی قوم کو حقیر سمجھا اور وہ اس کی بات مان گئے یقیناً وہ فاسق لوگ تھے ہی۔ جب انھوں نے ہمیں غصہ دلایا تو ہم نے ان سے بدلہ لیا اور

فَسَلَقْنَاهُمْ سَلَفًا وَّمَثَلًا لِّلْاٰخِرِیْنَ ٥ ان سب کو ڈبو دیا اور بعد والوں کے لیے پیش رو اور مثال بنا کر رکھ دیا

اقتدار اور حکومت تاریخ کا تجربہ ہے کہ خدا کے دین کو ارباب اقتدار نے ہمیشہ رد کیا ہے۔ جب بھی خدا کا دین ان کے سامنے آیا اسے انھوں نے اپنے اقتدار کے لیے خطرہ سمجھا اور اس کی مخالفت کی۔ وہ شخص ان کو سب سے بڑا سیاسی حریف بن جاتا ہے جو ان کو خدا کے عذاب سے بچانے کی کوشش کرے۔ خدا کے دین کے حق ہونے پر وہ مضبوط دلائل پیش کرتا ہے لیکن وہ یہ کہہ کر ان کو رد کر دیتے ہیں کہ یہ اقتدار پر قبضہ کرنے کی چال ہے۔ اگر دنیا کا سب سے بڑا بے غرض اور مخلص انسان انھیں دین کی دعوت دے تو اس کی بے نفسی میں بھی انھیں ہوس اقتدار نظر آتی ہے اور وہ چیخنے لگتے ہیں۔

إِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ يُّرَادُ (ص:) یقیناً یہ بات کسی غرض ہی سے کی جا رہی ہے

فرعون کے نزدیک حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون جیسی شخصیتوں کے اندر بھی اقتدار کی بھوک تھی اور ان کی دعوت کا مقصد حکومت پر قبضہ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى (طٰہٰ: ۶۳)

انھوں نے کہا یہ تو دو جادوگر ہیں جو چاہتے ہیں کہ جادو کے زور سے تم کو تمہاری زمین سے نکال دیں اور تمہارے مثالی طریقے کو ختم کر دیں۔

یہی بات ایک دوسری جگہ ان الفاظ میں کہی گئی ہے:۔

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ ٥ (یونس: ۷۸)

انھوں نے کہا کہ کیا تم اس لیے آئے ہو کہ جس طریقے پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے اس سے پھیر دو اور زمین میں بڑائی تم دونوں کے لیے ہو جائے۔ ہم تمہاری بات ماننے والے نہیں ہیں۔

نفس پرستی خدا کے دین کو اختیار کرنے کی راہ میں ایک رکاوٹ نفس پرستی بھی ہے۔ نفس پرست انسان کسی بھی چیز پر غور کرنے سے پہلے اپنے نفس کی راحت کا خیال کرتا ہے۔ خدا کی

پیدا کم ہوتی اس دنیا میں اس کو صرف تسکین نفس کی تلاش ہوتی ہے۔ وہ اس فیصلے کے ساتھ زندگی گزارتا ہے کہ اسے کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہیے جس سے اس کے نفس کو تکلیف پہنچے۔ وہ کسی ایسے خارزار میں الجھنا نہیں چاہتا جو اس سے سکونِ نفس چھین لے اور بے چین کر دے۔ اسی وجہ سے خدا کے دین کو حق سمجھنے کے باوجود وہ اسے قبول نہیں کرتا۔ کیونکہ اس سے اس کے نفس کے آرام میں خلل پڑتا ہے لیکن خدا کا دین بہت غیور ہے۔ جو شخص اس کو جاننے اور سمجھنے کے بعد بے نیازی سے ٹھکرا دے وہ اس سے کوسوں دور ہو جاتا ہے۔ جب انسان اپنے نفس کے سامنے سر ٹیک دے تو خدا اس کو اپنے در سے اٹھا دیتا ہے۔ وہ نفس کی غلامی کرتے ہوئے مر جائے گا لیکن اس کو خدا کے سامنے سر جھکانے کی توفیق نہ ہوگی۔

اَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهُ	کیا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہش
هَوَاهُ وَأَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ	نفس کو اپنا خدا بنا لیا ہے اور باوجودیکہ وہ علم
وَخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهِ وَقَلْبِهِ	رکھتا ہے، خدا نے اسے گم راہ کر دیا اور اس کے
وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهِ غِشَاوَةً	کانوں اور اس کے دل پر مہر لگا دی اور اس
فَمَنْ يَهْدِيهِ مِنْ بَعْدِ اللّٰهِ	کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔ پس جب خدا ہی
أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ٥	نے اس کو گم راہ کر دیا ہے تو کون اسے راہ دکھا سکتا
(الجاثیۃ : ۲۳)	ہے۔ تو کیا تم نصیحت نہیں حاصل کرتے۔

استکبار خدا سے بغاوت کا ایک سبب استکبار رہے۔ خدا نے شیطان کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرے لیکن اس نے خدا کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ قرآن نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ اس کے اندر استکبار تھا۔ استکبار کے معنی ہیں اپنے آپ کو بڑا سمجھنا۔ یہ جذبہ دو شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس کی ایک شکل ہے انکارِ حق اور دوسری شکل ہے لوگوں کی تحقیر۔ یہ دونوں باتیں شیطان کے استکبار میں موجود تھیں ایک طرف تو اس نے حضرت آدم کو اپنے سے فروتر سمجھا اور دوسری طرف خدا کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔

استکبار کی وجہ سے انسان میں خدا سے بغاوت اور سرکشی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ یہ جذبات جس درجہ اور جس نوعیت کے ہوں گے خدا سے بغاوت بھی اسی درجہ اور اسی نوعیت کی ہوگی۔ جب استکبار اپنے شباب پر ہو تو خدا سے بغاوت بھی اپنی آخری حد کو پہنچ جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنی بڑائی کا احساس انسان کو خدا کے سامنے سر جھکانے سے روکتا ہے اور وہ اپنے لیے ایسی حیثیت کا مطالبہ کرتا ہے جو فی الواقع

خدا نے اسے کچھ نہیں دی ہے جس شخص میں استکبار ہو اس کی نفسیات خدا کے مطیع و فرماں بردار بندے کی نفسیات سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ خدا کی اطاعت وہ شخص کرتا ہے جو اس کو اپنا معبود اور حاکم سمجھے لیکن متکبر انسان کسی کو اپنے سے برتر ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ خدا کی اطاعت اسے شاق گزرتی ہے اور وہ اپنے آپ کو ہر قید و بند سے آزاد سمجھتا ہے۔

اسی طرح متکبر شخص چاہتا ہے کہ سوسائٹی میں اس کو سب سے اونچی حیثیت حاصل ہو اور کوئی شخص اس کی ہمسری کا دعویٰ نہ کرے۔ گم کردہ راہ ہونے کے باوجود اس کو اپنی عقل و بصیرت اور دانائی پر ناز ہوتا ہے وہ اندھوں کی طرح ٹھوکریں کھاتا رہتا ہے لیکن اس کا غرور اس کو اپنی غلط روی پر سوچنے کا موقع نہیں دیتا وہ سمجھتا ہے کہ یہ ناممکن ہے کہ حق و صداقت ہماری نگاہوں سے پوشیدہ رہے اور کوئی دوسرا شخص اس سے واقف ہو جائے۔ اگر کہیں خیر و خوبی ہوگی تو سب سے پہلے ہمارے علم میں آئے گی اور کسی کے اس تک پہنچنے سے قبل ہم پہنچیں گے۔ وہ کسی دوسرے انسان میں کسی اخلاقی خوبی کو بھی ماننے کے لیے تیار نہیں وہ شریف اور مہذب اپنے آپ کو سمجھتا ہے یا ان لوگوں کو جو اس کے ہم مسلک ہوں۔ جو لوگ اسے خدا کے دین کی طرف دعوت دیں اور اس کے فسق و فجور پر تنقید کریں وہ اس کے نزدیک اراذل اور اشرار ہیں۔ وہ اس بات کو برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی شخص بڑا بن کر اس کو نصیحت کرے اور اس کی غلطی کی اصلاح کرے۔ وہ اپنی غلطی پر مر جانا پسند کرتا ہے لیکن کسی کی نصیحت قبول کر کے اپنی اصلاح کرنا نہیں چاہتا جس شخص کے تکبر کا یہ عالم ہو کہ وہ اپنے سوا کسی اور چیز کو دیکھنے ہی کے لیے آمادہ نہ ہو، وہ خدا کے دین کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا، البتہ دین اس کے لیے ایک سربمہر حقیقت ہوگا جس تک پہنچنے کی تمام راہیں بند ہوں گی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ۙ اِنْ فِيْ صُدُوْرِهِمْ اِلَّا كِبْرٌ مَّا هُمْ بِبَالِغِيْهِ ۚ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ (المومن: ۵۶)	وہ لوگ جو خدا کی آیتوں میں جھگڑا کرتے ہیں بغیر کسی دلیل کے جو ان کے پاس آئی ہو؟ ان کے دلوں میں تو بس غرور بھرا ہوا ہے (کہ ہم اس کو ختم کر کے رہیں گے مگر) وہ اس تک پہنچ نہیں سکتے۔ تو تم اللہ سے پناہ مانگو کیونکہ وہی سننے اور دیکھنے والا ہے۔

دین میں ترمیم کا مطالبہ جب کوئی نظریہ دلیل سے ثابت ہو جائے تو انسان کے لیے معقول رویہ یہ ہے کہ آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگالے اور ان تمام نظریات کو رد کر دے جو اس سے ٹکراتے ہیں لیکن بہت سے لوگ خدا کے دین کے بارے میں یہ معقول رویہ اختیار نہیں کرتے۔ وہ غلط سے غلط اور برے سے برے طریقے سے اس کی مخالفت کرتے رہتے ہیں اور جب مخالفت ناممکن ہو جاتی ہے تو صاف صاف نہ تو اسے رد کرتے ہیں اور نہ اسے اپنی صحیح شکل میں قبول کرتے ہیں' بلکہ اس میں ایسی ترمیم چاہتے ہیں جو اسے ان کے غلط افکار و نظریات سے قریب کر دے۔ ان کی پوری کوشش یہ ہوتی ہے کہ خدا کے دین میں ان کی خواہشات کی بھی گنجائش نکل آئے تاکہ خدا کی اطاعت کے ساتھ ساتھ جذبات نفس کی بھی تسکین ہوتی رہے۔ حالانکہ خدا کا دین اپنی خالص اتباع چاہتا ہے کسی بڑے سے بڑے شخص کی' حتیٰ کہ خدا کے رسول کی بھی یہ حیثیت نہیں ہے کہ اس میں ایک لفظ کی کمی بیشی کرے اور من مانے طور پر اس کی پیروی کرے۔

وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا	جب ان کو ہماری صاف صاف آتیں
بَيِّنَاتٍ قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا	سنائی جاتی ہیں تو جو لوگ ہم سے ملنے کی توقع
ائْتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَٰذَا أَوْ بَدِّلْهُ	نہیں رکھتے' یہ کہتے ہیں کہ اس کی جگہ کوئی دوسرا
قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ	قرآن لاؤ یا اس میں ترمیم کر دو۔ اے پیغمبر! ان
تِلْقَاءِ نَفْسِي إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ	سے کہہ دو کہ مجھے یہ حق نہیں ہے کہ اس میں اپنی
إِلَيَّ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ	طرف سے ترمیم کر دوں۔ میں تو بس اس وحی
رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ	کی اتباع کرتا ہوں جو میرے پاس آتی ہے
عَظِيمٍ ○	اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے
(یونس : ۱۵)	ایک بڑے دن کے عذاب کا ڈر ہے۔

جو لوگ باطل کو چھوڑے بغیر خدا کے دین کی طرف آئیں حقیقت میں انہیں خدا کے دین سے محبت نہیں ہوتی بلکہ نفس اور اپنی خواہشات سے محبت ہوتی ہے اور ان غلط افکار و نظریات سے محبت ہوتی ہے جنہیں خدا کا دین مٹانا چاہتا ہے۔ خدا کا دین اس لیے نہیں آتا کہ باطل کے ساتھ صلح صفائی کرے بلکہ اس لیے آتا ہے کہ باطل کا سر کچل دے اور اس پر غالب آجائے۔ جب تک انسان باطل سے بالکل دست بردار نہ ہو حق کا ساتھی نہیں بن سکتا۔

تراجم و اقتباسات:

افغانستان کے ساتھ روس کے تازہ تعلقات

روس کے ہم سرحد ممالک میں افغانستان کی سرحد اس کے جنوبی علاقے سے ملتی ہے۔ ادھر چند برسوں میں افغانستان نے روس سے اپنے تعلقات بہت بڑھالیے ہیں۔ اس مقالے میں ہم ان تعلقات کے پس منظر سے بحث کرکے ان کے اقتصادی، سیاسی اور فوجی پہلوؤں کا ایک خاکہ پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔

انیسویں صدی میں جب زار روس نے اپنے جنوبی علاقے میں اضافے کا منصوبہ بنایا تو اس کا ایک ہدف افغانستان بھی تھا۔ روسیوں نے جب سنٹرل ایشیا میں پیش قدمی شروع کی تو انھوں نے اپنی فوجیں افغانستان کے شمالی علاقے کے قریب تک پہنچا دیں۔ ۱۸۸۵ اور ۱۸۹۵ میں دونوں ملکوں کے درمیان سرحد کی تعیین کا معاہدہ طے پایا۔ سرحد کی تعیین کے باوجود یہ معاہدہ فوجی اور نسلی اعتبار سے حقائق کے مطابق نہ تھا اس لیے کہ اب بھی افغانستان کے حدود میں غیر افغانی قبائل موجود رہے جن کا نسلی تعلق ان قبائل سے تھا جو روسی سرحد کے اندر آباد تھے۔ بہرحال اس معاہدے کے کچھ دنوں بعد افغانی حکمراں کی منظوری سے برطانیہ نے افغانستان کے خارجی تعلقات پر کنٹرول حاصل کرلیا اور ۱۹۰۷ کے برطانوی، روسی معاہدے میں روس نے افغانستان کو برطانیہ کا زیر اثر ملک تسلیم کرلیا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ایک افغانی مشن ماسکو گیا اور ایک روسی مشن کابل آیا۔ ۲۷ فروری ۱۹۱۹ کو امیر امان اللہ افغانستان کے تخت پر بیٹھے اور اس کے ساتھ ہی برطانیہ سے ان کی کش مکش شروع ہوگئی۔ معاملہ یہ تھا کہ ہندوستان کے قوم پرست، افغانستان کے حدود کے اندر آکر برطانیہ کے خلاف کارروائیاں کر رہے تھے۔ برطانیہ یہ مطالبہ کر رہا تھا کہ ان قوم پرستوں کو وہاں سے نکال دیا جائے۔ امان اللہ خاں نے یہ مطالبہ ماننے سے انکار کردیا اور برطانیہ سے تجدید معاہدہ کی کوشش شروع کی یہاں تک کہ ۸ راگست ۱۹۱۹ء کو راولپنڈی میں ان دونوں کے

درمیان ایک نیا معاہدہ ہوا جس میں برطانیہ نے افغانستان کو ایک مکمل آزاد ملک تسلیم کیا۔ اس معاہدے نے امان اللہ کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ اب روس سے گفتگو کر سکیں۔ ۱۹۱۹ میں دونوں ملکوں کے وفود آئے گئے اور اس کے نتیجے میں باضابطہ سیاسی تعلقات قائم ہوئے اور بڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ ۲۸ فروری ۱۹۲۱ء کو ان دونوں ملکوں کے درمیان معاہدۂ دوستی پر دستخط ہوئے۔

اسی اثنا میں لینن نے امان اللہ کو ایک خط لکھا تھا جس میں اس نے پان اسلامزم تحریک کی حمایت کی تھی۔ اس نے لکھا تھا:-

"موجودہ دور میں صرف ترقی پذیر افغانستان ہی دنیا میں ایک آزاد مسلم مملکت ہے۔ افغانستانی عوام کے سامنے اس وقت دو عظیم الشان تاریخی کام ہیں ایک یہ کہ وہ خود متحد ہو جائیں اور دوسرا یہ کہ دوسرے مسلمانوں کو غلامی سے نجات دلائیں اور آزادی و استقلال کی شاہراہ کی طرف ان کی رہنمائی کریں۔" (۱)

مارچ ۱۹۲۱ء میں لینن سے افغانستان کا ایک معاہدہ طے پایا جس میں سونا اور سامان جنگ کی مدد دی گئی تھی اس کے علاوہ یہ بھی طے پایا تھا کہ روس اپنے آخری سرحدی ریلوے اسٹیشن کشکا سے کابل تک ایک ٹیلی گراف لائن تعمیر کرے گا۔ اس طرح روس نے طاقت کے اس خلا کو پُر ناشروع کیا جو افغانستان پر برطانیہ کا اثر ختم ہو جانے کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا۔ اس وقت کابل میں برطانیہ کا کوئی سفارتخانہ نہ تھا۔

اس کے بعد ۱۹۲۱ء کے آخری حصے میں جب امان اللہ خاں پر یہ بات واضح ہوئی کہ سنٹرل ایشیا میں روس مسلمانوں کے ساتھ بہت برا برتاؤ کر رہا ہے تو وہ چوکنا ہو گیا اور اس نے پسند نہیں کیا کہ اس کے ملک میں روسی اثرات مزید بڑھیں۔ اب اس نے پھر برطانیہ کی طرف اپنی توجہ مبذول کی۔ ۲۲ نومبر ۱۹۲۱ء کو برطانیہ اور افغانستان میں ایک معاہدہ ہوا اور دونوں کے درمیان سیاسی مشن کا تبادلہ طے پایا اور برطانیہ نے اسکو ہندوستان میں گزرگاہ اور کسٹم کی مراعات دیں تاہم روسی مدد اور روسی اثرات کا بالکل خاتمہ نہیں ہوا۔ امان اللہ نے اپنے ملک میں روس کو بیرونی تجارت کی ایک شاخ قائم کرنے کی اجازت دی اور روس کی یہ پیشکش قبول کر لی کہ وہ افغانستان کے پبلک ورکس کے لیے انجینیر اور ہوائی فوج کے لیے اساتذہ مہیا کرے۔ ۱۹۲۶ء میں دونوں کے درمیان غیر جانبداری اور ایک دوسرے پر حملہ نہ کرنے کا معاہدہ طے پایا۔ اس وقت روس نے اپنے دوسرے ہم سرحد ممالک سے بھی اس طرح کے معاہدے کیے تھے

۱؎ فریزر ٹسٹلر، دی سوویٹس ان ورلڈ افیئرز، لندن ۱۹۳۰، جلد ۱ صفحہ ۲۸۶

مشرق وسطیٰ کے معاملات کا ایک مشہور ماہر لکھتا ہے :۔

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اپنی حق پرستی کے تمام مظاہروں کے باوجود روس نے افغانستان کے اندر گھسنے کی ایک تدریجی پالیسی اختیار کی تھی۔ ایک طرف وہ امان اللہ کے ان خیالات سے پورا فائدہ اٹھا رہا تھا جو وہ برطانیہ کے خلاف رکھتا تھا اس نے بہت سے معاملات میں اپنی ہمدردی کا مظاہرہ کیا اور امان اللہ نے جو اپنے آپ کو بہت ہوشیار سمجھتا تھا برطانیہ کی طاقت کا توڑ کرنے کے لیے روسی ہمدردیوں کو قبول کیا۔ دوسری طرف روس اس حقیقت سے بھی ناجائز فائدہ اٹھا رہا تھا کہ افغانستان کے شمالی علاقے میں ترکی زبان بولنے والی اقلیتیں آباد تھیں جن کا ایک حصہ روسی علاقے میں آباد تھا اور ان دونوں حصوں کو ایک غیر محفوظ بلکہ مصنوعی سرحد جدا کرتی تھی۔(۱)

روس کے ساتھ افغانستان کے علاقائی ربط و تعلق نے افغان پالیسی پر روس کو اثر انداز ہونے کا موقع فراہم کیا۔ اس نے ریلوے، سڑکیں اور ٹیلی گراف لائن کی تعمیر کے ذریعے دوستانہ تعلقات بڑھائے چونکہ افغانستان کی شمالی سرحد جغرافیائی نقشے کے مطابق متعین نہیں ہوئی تھی اس لیے روس کو اس کا غیر معمولی موقع مل گیا کہ وہ اس علاقے سے اپنا سماجی اقتصادی رشتہ استوار کرے۔

۱۴ جنوری ۱۹۲۹ء کو باغی سرداروں کے دباؤ کی وجہ سے امان اللہ تخت حکومت سے دست بردار ہو گئے۔ اس سے کچھ پہلے روس نے آمادگی ظاہر کی تھی کہ امان اللہ کی مدد کے لیے اپنی فوج افغانستان میں داخل کر دے لیکن اس کی یہ آمادگی لاحاصل تھی۔ ہنگامے اور انتشار کے ایک مختصر دور کے بعد ۱۶ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو نادر خان تخت حکومت پر بیٹھے۔ انھوں نے ملکی اقتصادیات کو روسی اور برطانوی خدمات حاصل کیے بغیر مضبوط و مستحکم کرنے میں کامیابی حاصل کی اور دونوں حکومتوں کے مقابلے میں وہ غیر جانب دار رہے۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں شمالی سرحد کے معاملے میں روس اور افغانستان کے باہمی تعلقات ایک بحران کا شکار ہوئے۔ سوویت فوجیں حدود افغانستان میں داخل ہو گئیں لیکن جب نادر شاہ نے بخارا کے پناہ گزینوں کو جنوب میں منتقل کر دیا تو معاملات طے ہو گئے۔

نومبر ۱۹۳۳ء میں نادر خان قاتلانہ حملے کا شکار ہو گئے۔ ان کے بعد ان کے لڑکے محمد ظاہر شاہ ان کے جانشین ہوئے۔ انھوں نے اپنے والد کی خارجہ پالیسی برقرار رکھی۔ سنہ ۱۹۳۶ء میں انھوں نے روس سے ایک تجارتی

(۱) جارج لنزوفسکی۔ "دی مڈل ایسٹ" ص ۳۳۵

معاہدہ کیا لیکن اپنے ملک میں روس کے تجارتی کمیشن کے قیام کی درخواست رد کر دی۔ جنگ عظیم ثانی کے درمیان دونوں حکومتوں میں معمولی کھنچاؤ پیدا ہوا اس کا سبب جرمنی اور دوسرے اتحادی ملکوں کے وہ باشندے تھے جو افغانستان میں ملازمت کر رہے تھے۔ افغان حکومت نے ان ملازموں کو چھوڑ کر جنہیں سیاسی رتبہ حاصل تھا باقی دوسرے ملازمین کو اپنے ملک سے نکال دیا۔ جنگ کے زمانے میں دونوں ملکوں کے درمیان تجارت ختم ہو گئی لیکن جب جنگ ختم ہو گئی تو تجارتی تعلقات پھر قائم ہو گئے۔ روس سے پٹرول، روئی اور شکر آتی اور افغانستان اون بھیجتا۔

اقتصادی تعلقات

روس نے افغانستان کے ساتھ مفید مطلب تعلق قائم کرنے میں اقتصادی امداد کو سب سے بڑا ذریعہ بنایا ہے۔ ۱۹۵۰ء میں دونوں ملکوں کے درمیان ایک نئے تجارتی معاہدے پر دستخط ہوئے۔ روس نے پڑوسی ملک ازبکستان کی اقتصادی ترقی کو پیش کر کے افغانستان پر اثر انداز ہونے کی کوشش جاری رکھی اس نے بتایا کہ روسی ٹکنالوجی کی وجہ سے کس طرح یہ علاقہ جدید اقتصادی دور میں داخل ہو گیا ہے اس نے افغانستان کے ذہین اور تعلیم یافتہ افراد کو دعوت دے کر تاشقند بخارا، سمرقند اور دوسرے شہروں کی سیر کرائی۔ ازبکستان کے اقتصادی تغیرات نے آخر کار افغانستان کو اس پر آمادہ کر دیا کہ وہ اپنے اس شمالی علاقے کی ترقی پر زیادہ توجہ دے جو سوویٹ یونین سے ملا ہوا ہے۔ یہ علاقہ روسی سنٹرل ایشیا سے تہذیبی مذہبی تعلقات رکھتا ہے۔

جولائی ۱۹۵۰ء میں روس اور افغانستان کے درمیان چار سالہ تجارتی معاہدہ ہوا۔ روس نے افغانستان کے معدنیات کے بدلے میں مشینری اور ٹرانسپورٹ کے سامان بھیجنا منظور کیا۔ مدت معاہدہ کے درمیان روس نے افغانستان میں اپنے ماہرین حشریات، جانوروں کے ڈاکٹر اور پٹرول کے ماہرین بھیجے۔

اپریل ۱۹۵۳ء میں اس نے ایک ٹیکنیکل مشن بھی بھیجا تاکہ وہ گیہوں کو ذخیرہ کرنے کی عمارتیں بنائے۔ اسی سال جنوری میں روس نے ۲ فیصدی سود پر افغانستان کو ۳۵ لاکھ ڈالر قرض دیا تاکہ وہ آٹا پیسنے کی ملیں اور گیہوں کو بالائی منزل تک پہنچانے کی مشینیں قائم کرے (سود کی یہ شرح اس شرح سے کچھ کم تھی جو امریکہ نے افغانستان کے سامنے پیش کی تھی) اس کے بعد روس نے ایک دوسری امداد بھی دی۔ مئی ۱۹۵۴ء میں اس نے افغانستان کے سب سے بڑے اسپتال کو ضروری سامان مہیا کیے۔ اسی سال کے موسم گرما میں روس نے گیسولین (GASOLINE) کو منتقل

لے جانے کے لیے ایک پائپ لائن کی تعمیر شروع کی جو روسی سرحد پر شہر ترمذ سے مزار شریف تک لمبی ہے جو
شمال میں جنوب میں افغانستان کا دوسرا اہم شہر ہے۔ ایک بہت ہی ڈرامائی پروجیکٹ کے لیے روس نے
دس لاکھ ڈالر کی امداد دی وہ یہ کہ کابل کی اہم سڑکیں پختہ بنائی جائیں۔ افغانستان نے اس کام کے لیے
پہلے امریکہ سے قرض مانگا تھا لیکن اس نے انکار کر دیا۔ اس چیز نے افغانستان میں امریکہ کے اثر کو کم کیا اور
روس کے اثر کو بڑھا دیا

۱۹۵۵ء میں روسی امداد کی مجموعی تعداد اسی لاکھ ڈالر تھی۔ بڑی مقدار کی روسی امداد کے اس ابتدائی
دور میں دونوں ملکوں کے درمیان مختلف وفود کی آمد و رفت بڑھ گئی۔ افغان ڈاکٹروں، صحافیوں اور
پہلوانوں کے وفود روس گئے اور روسی اہل علم کے وفود افغانستان آئے۔ ۱۹۵۵ء میں جیسا کہ رپورٹ سے
معلوم ہوتا ہے۔ افغانستان میں روس کے تقریباً پانچ سو ماہرین تھے۔ دونوں ملکوں کے باہمی تعلقات نقطۂ
عروج پر اس وقت پہنچے جب دسمبر ۱۹۵۵ء میں ہندوستان اور برما کے سفر پر جاتے ہوئے مسٹر خرشچیف
اور مسٹر بلگانن نے افغانستان میں قیام کیا۔ اس موقع پر روس کی طرف سے افغانستان کو سو بستروں کا تمام
سامان سے لیس ایک مکمل ہسپتال تحفۃً پیش کیا گیا۔ اس کے علاوہ کابل کے لیے روسی ساخت کی ۱۵ بسیں
فاضل پرزوں کے ، ۷ بھیلوں کے ساتھ پیش کی گئیں۔ ۱۸ دسمبر کو ان دونوں حکومتوں کا جو مشترکہ کمیونک
شائع ہوا۔ اس میں اس ضرورت کا اظہار کیا گیا کہ ان دونوں ملکوں کے درمیان اقتصادی اور ٹیکنیکل تعلقات
میں اضافہ ہونا چاہیے۔ خصوصیت کے ساتھ حسب ذیل چیزوں کی صراحت تھی

زراعی ترقی، ایک ہائیڈرو الیکٹرک اسٹیشن کی تعمیر، کھیتوں کی سیرابی کے لیے آلات کی تنصیب، آٹوموبائل
کی مرمت کے لیے دکانیں، کابل کے ہوائی اڈے کی تعمیر جدید

اس کمیونک میں یہ بھی بیان کیا گیا تھا کہ سوویٹ روس، افغانستان کو ایک کروڑ ڈالر کا طویل المیعاد
قرض دے گا۔ (۱) اس قرض کے معاہدے پر ۲۸ جنوری ۱۹۵۶ء کو دستخط ہوئے۔ افغانستان نے تسلیم کیا
کہ وہ اپنے برآمدی سامان کے ذریعے یہ رقم ۲۲ سال میں ادا کرے گا۔ دو فی صدی سود ہوگا اور اس رقم
کو استعمال کرنے کے آٹھ سال بعد قرض کی ادائیگی شروع ہوگی۔ افغانستان نے یہ قرض اپنے پنج سالہ
منصوبے کی تکمیل کے لیے لیا تھا۔ اس معاہدے کی بنیاد پر روس نے تسلیم کیا تھا کہ دو عدد ہائیڈرو الیکٹرک

(۱) ازویستا۔ دسمبر ۱۹۵۵ء

پلانٹ نصب کرے گا، آٹو موبائل مرمت کی تین دکانیں قائم کرے گا اور کھیتوں کی زرخیزی کے لیے ایک کیمیاوی لیبورٹری کھولے گا۔ کابل سے مزار شریف تک پہاڑوں کے درمیان سے ایک سڑک بنائے گا۔ کابل سے مزار شریف تک پہاڑوں کے درمیان سے ایک سڑک بنائے گا۔ کابل میں ایک فوجی ہوائی اڈہ تعمیر کرے گا۔ خودکار ٹیلیفون کا انتظام کرے گا۔ اس کے علاوہ اس نے پٹرول دریافت کرنے کا معاہدہ بھی کیا۔ یکم مارچ ۱۹۵۶ء کو ماہرین اور دیگر سامان کے سلسلے میں معاہدہ ہوا۔ ۲۴ مارچ کو کابل اور ماسکو کے درمیان مستقل ہوائی سروس کے معاہدے پر دستخط ہوئے۔ ایک ہفتے کے بعد لندن سے خبر دی گئی کہ ماسکو سے ایک میڈیکل ٹیم کابل یونیورسٹی میں لکچر دینے گئی ہے۔ ۱۹۵۵ء میں افغانستان کی عالمی تجارت میں روس کا حصہ ۴ فی صدی تھا جو ۱۹۵۶ء میں ۳۰ فی صدی ہو گیا۔ کمیونسٹ بلاک سے افغانستان کے تجارتی تعلقات بڑھ گئے اور امریکہ سے کم ہو گئے۔ سوویٹ بلاک نے افغانستان کو تقریباً ۲۵ ملین ڈالر کے جنگی سامان بھی دیے اور ۱۹۵۶ء میں پہلی بار روس نے مگ ۱۷ اور ٹی ۳۴ ٹینک دیے۔ سوویٹ یونین سے اس قدر امداد حاصل کر لینے کی وجہ افغانستان کی جغرافیائی پوزیشن ہے۔ افغانستان کی ۸۰۰ میل لمبی سرحدیں روس اور چین سے ملتی ہیں اور یہ ملک ایران اور پاکستان کے درمیان ایک گاؤدم مثلث نما کی شکل میں قائم ہے۔

ہر سال یا ہر دو سال کے بعد دونوں ملکوں میں تجارتی معاہدوں پر گفتگو اور دستخط ہوتے رہے ہیں۔ ایک اقتصادی وفد جب ۱۴ مارچ ۱۹۵۹ء کو افغانستان سے ماسکو پہنچا تو خود خروشچیف نے اس کا استقبال کیا۔ ۲۸ مئی ۱۹۵۹ء کو بھی ایک معاہدہ ہوا۔ اس معاہدے کی رو سے روس کو پانچ سو پچیس میل لمبی سڑک تعمیر کرنی تھی جو اس کے سرحدی شہر کشکا سے شروع ہو کر ہرات ہوتی ہوئی قندھار جائے۔ یہ سڑک افغانستان اور ایران کی سرحدوں کے بالکل قریب سے گزرتی ہے اور جنوبی افغانستان کو روس کے روڈ سسٹم سے ملا دیتی ہے جو کشکا میں ہے۔ یہ سڑک زار روس کے ایک منصوبہ کی یاد دلاتی ہے۔ زار روس چاہتا تھا کہ افغانستان سے گزرتی ہوئی ایک ریلوے تعمیر کرے جو بلوچستان ہوتی ہوئی بحر عرب تک جا پہنچے۔ جنگ عظیم اول میں برطانیہ کی مدد سے یہ ریلوے ہرات تک بنائی گئی تھی۔ ۱۹۵۹ء روسی افغانی تعلقات کے لحاظ سے ایک اہم سال رہا ہے۔ ازبکستان میں چونکہ مسلمان آباد ہیں اس لیے روس نے ازبک انجینیروں اور دوسرے ماہرین کو افغانستان پر اثر انداز ہونے کے لیے خوب استعمال کیا۔ مختلف قسم کے معاہدے مسلسل ہوتے رہے۔

اکتوبر ۱۹۶۱ء میں ایک معاہدہ ہوا جس میں روس نے افغانستان کے دوسرے پنج سالہ منصوبے میں امداد دینا قبول کیا۔ ۱۹۶۲ء میں ایک تجارتی معاہدہ ۱۹۶۲ء – ۱۹۶۶ء تک کے لیے طے پایا۔ دونوں ملکوں کے سربراہوں اور ممتاز افراد کی آمد و رفت بھی جاری رہی اور جاری ہے۔ یہ معاہدے تقریباً اسی قسم کے ہیں جس قسم کے معاہدے سوویت روس نے ہندوستان سے کیے ہیں۔ روس نے پوری کوشش کی ہے اور کر رہا ہے کہ افغانستان کی خارجہ پالیسی مغربی ممالک کی طرف نہ جھکنے پائے۔

سیاسی اور فوجی تعلقات

افغانستان کے روس کی طرف جھکاؤ کی ایک وجہ پختونستان کا مسئلہ بھی ہے۔ بعض ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ افغانستان، پاکستان کے پٹھان علاقے کو آزاد کرا کے مشرقی افغانستان اور پاکستان کے درمیان ایک بفر اسٹیٹ قائم کرانا چاہتا ہے۔ ۱۹۵۵ء میں اس مسئلے پر پاکستان کو افغانستان کی معاندانہ دھمکیوں کا مقابلہ کرنا پڑا اور اس نے افغانستان کے ساتھ اپنی سرحد بند کر دی[1]۔ اسی سال مئی کے مہینے میں روس نے افغانستان کو اپنے علاقے میں "گزرگاہ" کے حقوق عطا کیے۔ اسی سال جولائی میں محمد ظاہر شاہ نے روس کا تیرہ روزہ دورہ کیا۔ اس دورے کے دوران میں روس نے نہ صرف یہ کہ ٹیکنیکل اور دوسرے قسم کے امداد و اعانت کی تجدید کی بلکہ شاہ افغانستان کو یقین دلایا کہ وہ پختونستان کے مسئلے میں ان کی حمایت کرے گا۔ مغربی ممالک نے اس مسئلے میں اس کی حمایت سے انکار کر دیا تھا۔ اس لیے افغانستان نے روس کی طرف اپنی توجہ مبذول کی۔ کہا جاتا ہے کہ اس زمانے میں امریکہ کے ایک ماہر اقتصادیات سے جو افغانستان کا دورہ کر رہا تھا۔ وہاں کے محکمۂ خارجہ کے ایک ترجمان نے کہا تھا: "جب امریکہ نے اس جھگڑے کو دور کرنے میں دلچسپی نہیں لی تو حکومت افغانستان مجبور ہوگئی کہ روس کا اثر استعمال کرے"[2]

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ افغانستان روسی بلاک میں داخل ہو گیا ہے۔ اگرچہ اس نے روس سے وسیع امداد حاصل کی ہے مگر وہ کمیونسٹ نہیں ہوا ہے البتہ وہاں کے کچھ تعلیم یافتہ افراد مارکسٹ ہو گئے

---

[1] اب حالات بدل گئے ہیں۔ افغانستان اور پاکستان اسی طرح روس اور پاکستان کے باہمی تعلقات پہلے سے بہت اچھے ہو گئے ہیں۔ (مترجم)

[2] پیٹرجی۔ فرینک "افغانستان مشرق اور مغرب کے درمیان" واشنگٹن ۱۹۶۰ء ص ۱۱

ہیں۔ وہاں افغان کمیونسٹ پارٹی نہیں ہے اور کمیونزم کے پروپیگنڈے پر پابندی لگی ہوئی ہے۔ افغانستان کے تازہ جرمن سیاحوں کی رپورٹ یہ ہے کہ: "افغانستان میں نہ کمیونزم کا پروپیگنڈہ کرنے والے پمفلٹ پائے جاتے ہیں اور نہ وہاں کوئی کمیونسٹ اخبار ہے" بظاہر افغانستان میں مقیم روسی مشیر اور ماہرین بھی وہاں سوویٹ نظریات کا پروپیگنڈہ کرنے سے اجتناب کرتے ہیں۔ وہاں کا طاقتور مسلم مذہب کمیونزم کو پھیلنے سے روک رہا ہے۔ وہاں کے سابق وزیر اعظم سردار محمد داؤد خاں بھی جو ادھر چند برسوں میں افغانستان کی سیاست پر بہت اثر انداز رہے ہیں کمیونسٹ نہیں ہیں۔ مزید یہ کہ افغان وزیر خارجہ پرنس سردار محمد نعیم نے جب فروری ۱۹۵۹ء میں ماسکو کا دورہ کیا تو کہا جاتا ہے کہ انھوں نے کسی نئے سیاسی اور فوجی معاہدے سے انکار کیا[1]

۱۹۵۹ء میں افغان اور پاکستان کے تعلقات میں ایک بحران پیدا ہوا۔ اسی زمانے میں امریکہ نے پاکستان اور ایران سے فوجی معاہدہ مکمل کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس معاہدے کی وجہ سے روس نے اپنی فوجیں افغانستان میں داخل کر دیں اور ہرات کی سڑک پر قبضہ کر لیا جو افغانستان اور ایران کے درمیان تعلق پیدا کرتی ہے۔ لندن کے افغان سفیر نے اس کا انکار کیا اور روس کی نیوز ایجنسی تاس نے بھی اس کا انکار کیا۔ بہرحال روس نے افغانستان کو اپنی فوجی امداد کی پیش کش کی تھی۔[2]

جنوری ۱۹۶۰ء میں ایک پاکستانی اخبار نے لکھا کہ روس نے افغانستان کو سو مِگ فائٹر تحفۃً دیے ہیں۔[3] فروری ۱۹۶۴ء میں ایک معاہدہ ہوا جس میں افغانستان نے روس کو اپنے ہوائی اڈے استعمال کرنے کی اجازت دی۔[4] ۱۲ دسمبر ۱۹۶۲ء کو سپریم سوویٹ میں خروشچیف نے کہا:-

"سوویٹ گورنمنٹ افغان گورنمنٹ کی دوستانہ پالیسی کو بہت وزن دیتی ہے جس کے وزیر اعظم اس وقت مسٹر داؤد ہیں۔ اس سال ہم نے وہاں کے بادشاہ محمد ظاہر شاہ سے بہت مفید ملاقات کی ہے جس نے پڑوسی ملکوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات کو مزید تقویت پہنچائی ہے۔[5]

۱؎ نیویارک ہیرلڈ ٹریبون، ۸ فروری ۵۹ء

۲؎ ڈیلی ٹیلی گراف ۱۱ مئی ۵۹ء

۳؎ ڈان ۲۰ جنوری ۱۹۶۰ء

(۴) "دی ایشین ریکارڈ" نئی دہلی ۱۹۶۴ صفحہ ۵۹۹۹

(۵) پراودا - ۱۳ دسمبر ۶۲ء

تازہ ترقیاں

۱۰ مارچ ۱۹۶۳ء کو سردار محمد داؤد کی حکومت ختم ہو گئی اور ان کی جگہ پر ڈاکٹر محمد یوسف وزیر اعظم ہوئے۔ طبقۂ عوام میں سے یہ سب سے پہلے شخص ہیں جو افغانستان میں وزیر اعظم مقرر کیے گیے۔ ان کے وزیر اعظم ہونے کے کچھ ہی مہینے بعد برزنیف نے افغانستان کا دورہ کیا۔ شاید یہ دورہ حکومت کی تبدیلی کا نتیجہ تھا تاکہ موجودہ حکومت افغانستان کی پالیسی معلوم کی جائے۔ اس دورے میں روس نے وہاں پالی ٹیکنک ادارہ قائم کرنے کا معاہدہ کیا۔ ۴ دسمبر ۶۴ کو مسٹر کوسی گن نے افغانستان کا دورہ کیا وہ اس وقت سوویٹ یونین کی کونسل آف منسٹرز کے فرسٹ ڈپٹی چیرمین تھے۔ مسٹر کوسی گن اور محمد ظاہر شاہ نے مل کر اس شارع عام کا افتتاح کیا جو روس نے کوہ ہندوکش میں درۂ سالانگ سے گزار کر بنائی تھی۔ دونوں ملکوں کے درمیان ثقافتی تعلقات بھی بڑھتے جا رہے ہیں۔ روس کی اقتصادی امداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ جولائی ۱۹۶۵ء میں پراودا نے یہ خبر شائع کی۔

> ہمارا جنوبی پڑوسی افغانستان ننگلو (NAGHLU) میں ایک پاور پلانٹ کی تعمیر میں مصروف ہے جس سے ۶۶,۰۰۰ کلوواٹ بجلی پیدا ہوگی .... افغانستان میں تیس ہزار سے زیادہ افراد کو مختلف شعبوں میں تربیت دی گئی ہے۔ صرف جلال آباد آبپاشی نہر نکالنے میں ہمارے ماہروں نے مختلف پیشوں میں افغانستان کے ۴,۶۰۰ افراد کو تعلیم دی ہے۔

بحیثیت مجموعی افغانستان کے ساتھ روس کی مخصوص پالیسی رہی ہے جو اس کے دوسرے پڑوسی ملکوں کے ساتھ ہے اور کوئی قرینہ نہیں کہ اس میں کوئی خاص تبدیلی واقع ہوگی۔ اقتصادی اور فوجی امداد کے ذریعے وہ اپنا اثر بڑھاتا رہے گا۔ پختونستان کے مسئلے میں بھی وہ افغانستان کی حمایت کر کے اپنے اثر کو ترقی دیگا

ابھی اگست ۱۹۶۵ء میں محمد ظاہر شاہ اور ملکہ حمیرا نے روس کا دورہ کیا۔ ہوائی اڈے پر موجودہ وزیر اعظم مسٹر کوسی گن اور پدگورنی نے ان دونوں کا استقبال کیا۔ محمد ظاہر شاہ گیارہ دن ماسکو میں مقیم رہے اس کے بعد کریمیا گئے۔ کوئی کمیونک شائع نہیں کیا گیا لیکن یہ ظاہر ہے کہ اس کا مقصد دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات کا اضافہ ہے — ان سب باتوں کے باوجود جیسا کہ اوپر کہا گیا افغانستان کمیونسٹ بلاک میں داخل نہیں ہوا ہے۔ بلکہ وہ روس اور امریکہ یا مشرق اور مغرب کی لڑائی میں غیر جانب دار ہے۔ ظاہر شاہ نے جرمنی

اور ممالک متحدہ امریکہ کا بھی دورہ کیا ہے اور شاہدین نے اپنا یہ تاثر ظاہر کیا ہے کہ افغانستان کی پالیسی غیر جانبدارانہ ہے۔ محمد یوسف خاں بھی مستعفی ہو چکے ہیں اور اب ان کی جگہ پر محمد ہاشم وزیراعظم ہیں۔ ان کا تعلق بھی طبقہ عوام سے ہے یعنی یہ شاہی خاندان کے فرد نہیں ہیں۔ ان کی پالیسی بھی وہی ہے جو سابق وزرائے اعظم کی تھی۔

یہ اندیشہ موجود ہے کہ روس پر اس کا اقتصادی انحصار کہیں سیاسی طور پر بھی اس کو روس کے زیر اثر نہ کر دے۔ ابھی تک ایسا ہوا نہیں ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ امریکہ بھی غیر متعلق نہیں ہے بلکہ وہ بھی اس کو دوسرے مسلمان ملکوں کی طرح اقتصادی امداد دے رہا ہے۔

بلوٹین میونخ جرمنی جون ۱۹۶۶ء سے ترجمہ کیا گیا

صدر ناصر اور شاہ فیصل کا اختلاف

صدر ناصر اور شاہ فیصل کا اختلاف روز بروز بڑھتا ہی جا رہا ہے اور نوبت یہاں تک آپہنچی ہے کہ صدر ناصر کسی کانفرنس میں ان کے ساتھ بیٹھنا بھی نہیں چاہتے۔ شاہ فیصل پر "رجعت پسندی" کا الزام تو صرف دکھاوے کی بات ہے ورنہ ظاہر ہے کہ ان کی رجعت پسندی نئی نہیں ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ انھوں نے سوشلزم کا نعرہ کبھی نہیں لگایا اور آج سے پہلے بھی وہ اسلام ہی کو دنیوی و اخروی فلاح کا ضامن سمجھتے رہے ہیں۔ اس کے باوجود صدر ناصر ہمیشہ ان کے ساتھ کانفرنسوں میں بیٹھے ہیں بلکہ ان سے معانقہ بھی کیا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ شاہ فیصل نے اسلام کی بنیاد پر اتحاد عالم اسلامی کی جو آواز بلند کی ہے اس میں انہیں اپنے شیشۂ اقتدار کے ٹوٹنے کی صدا سنائی دے رہی ہے۔ وہ اس تحریک کو اپنے اقتدار پر ضرب شدید سمجھ رہے ہیں۔ ان کے اس رویے نے عرب لیگ کو بھی خطرے میں ڈال دیا ہے وہ اب تک اس کو اپنے آلۂ کار کے طور پر استعمال کرتے رہے ہیں لیکن مجبور ہو کر شاہ فیصل نے ارادہ کر لیا ہے کہ اب وہ اس کو ان کا آلۂ کار نہیں بننے دیں گے۔

صدر ناصر کے رویے نے اگر عرب لیگ کو ختم کر دیا تو کیا اس کی کوئی قوی امید ہے کہ وہ "ترقی پسند" عرب ممالک کی کوئی علیحدہ لیگ بنا سکیں گے؟ اثبات میں اس سوال کا جواب دینا آسان نہیں ہے اس لیے کہ جو ممالک ترقی پسند کہے جاتے ہیں ان کے درمیان خود جوتیوں میں دال بٹ رہی ہے اور ان کے باہمی اختلافات ان اختلافات سے کہیں زیادہ ہیں جو اسلام پسند ممالک کے درمیان ہو سکتے ہیں۔ ترقی پسندوں میں سب سے زیادہ ترقی پسند ملک مصر اور شام سمجھے جاتے ہیں اور یہی دو ملک ہیں جن میں سب سے زیادہ اختلافات بھی ہیں۔ مسٹر کوسی گن کے حکم سے یہ دونوں مل تو گئے ہیں لیکن یہ ملاپ عارضی ہے — یہ تو ان دونوں حکومتوں

کی بات تھی اور جہاں تک ان ملکوں کے عوام کا تعلق ہے وہ یقیناً ترقی پسند نہیں ہیں بلکہ ترقی پسند فوجوں کے نرغے میں پھنسے ہوئے ہیں جیسے ہی یہ نرغہ ڈھیلا ہوگا ان ملکوں کی اکثریت اپنا وزن دینِ فطرت اسلام کے پلڑے میں ڈال دے گی۔ عرب نیشنلزم کی ہوا اکھڑ چکی ہے اور خود صدر ناصر بھی اب اس سے مایوس ہوتے جا رہے ہیں۔

یقیناً شاہ فیصل کی راہ میں بھی مشکلات ہیں لیکن اس وقت جو بہترین موقع مل گیا ہے اس میں انھوں نے خلوص اور قوت کے ساتھ اتحاد عالمِ اسلامی کی کوشش جاری رکھی تو ان کی کامیابی کے امکانات صدر ناصر کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں۔ پہلی فوقیت انھیں یہ حاصل ہے کہ اسلام اتحاد کی وہ بنیاد ہے جو دنیا کے تمام مسلم ممالک کے درمیان مشترک ہے۔ ایران، ترکی، پاکستان، نائجیریا، انڈونیشیا، ملیشیا اور دوسرے عجمی ممالک کو عرب نیشنلزم سے دلچسپی نہیں ہوسکتی لیکن اسلام ان سب کو متاثر کرسکتا اور ان کے باہمی اتحاد کی پائیدار بنیاد بن سکتا ہے اور اس وقت ان تمام ممالک میں احیائے اسلام کی تڑپ بھی پیدا ہو چکی ہے۔

دوسری سب سے بڑی چیز جو انہیں مل سکتی ہے وہ اللہ رب العٰلمین کی نصرت و حمایت ہے۔ اگر خلوص کے ساتھ انھوں نے کوشش کی تو امید یہی ہے کہ اللہ کی مدد حاصل ہوگی۔

مسلم یونیورسٹی نمبر کی ضبطی

ندائے ملت" لکھنؤ کے مسلم یونیورسٹی نمبر کی ضبطی درحقیقت حوادث و مصائب کی اس لمبی زنجیر کی ایک کڑی ہے جس میں اٹھارہ انیس برسوں سے ہندوستان کے مسلمانوں کو کسنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

۳۱ جولائی ۱۹۶۵ء کو ندائے ملت کے دفتر پر اس طرح چھاپہ مارا گیا جیسے وہاں خطرناک قسم کے بم بنائے جاتے ہوں۔ مسلم یونیورسٹی نمبر کی تمام کاپیاں ضبط کرلی گئیں اور حفیظ نعمانی صاحب مدیر معاون ندائے ملت اور دوسرے دو کارکنوں کو گرفتار کرکے جیل میں بند کردیا گیا۔ ان لوگوں کے ساتھ وہاں جو برتاؤ کیا گیا وہ اس روداد سے ظاہر ہے جو حفیظ صاحب ندائے ملت میں شائع کر رہے ہیں۔ ان لوگوں کی رہائی کے بعد توقع تھی کہ اس نمبر کی کاپیاں دفتر کو واپس کردی جائیں گی لیکن یہ توقع یوں پوری ہوئی کہ ۲۹ اپریل ۱۹۶۶ء کو یوپی کی حکومت نے اس نمبر کی تمام کاپیوں کو جو پولیس ہی کی تحویل میں تھیں، قانون دفاعِ ہند کے تحت "ضبط" قرار دے دیا۔

ندلائے ملت وقف کے متولیوں کی طرف سے الہ آباد ہائی کورٹ میں رٹ داخل کیا گیا ہے اور ہائی کورٹ
نے حکومت یوپی کو عارضی حکم نامہ بھیج دیا ہے کہ وہ ان کاپیوں کو ضائع نہ کرے جنہیں اس نے ڈی آئی آر
کے تحت ضبط کیا ہے۔ کچھ دنوں کے بعد اس رٹ کا فیصلہ سامنے آجائے گا۔

ہمارے سوچنے کی بات یہ ہے کہ آخر اس قسم کی دھاندلیاں صرف مسلمانوں کے ساتھ کیوں کی جارہی
ہیں۔ کیا اس کا سبب جرم ضعیفی کے سوا کچھ اور ہے؟ ضعیفوں کے ساتھ انصاف صرف وہی لوگ
کرسکتے ہیں جو حقیقی معنی میں خداپرست اور آخرت کی جزا و سزا پر یقین رکھتے ہوں۔ دوسری قسم کے لوگوں
سے انصاف حاصل کرنے کے لیے جرم ضعیفی سے توبہ ضروری ہے ورنہ نالہ و شیون کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

انڈونیشیا اور ملیشیا کی مُصالحت

مشرق بعید کے دو مسلمان ملکوں کے درمیان مصالحت، انڈونیشیا کے فوجی انقلاب کا ثمر شیریں ہے
ملیشیا کے خلاف انڈونیشیا کی صف بندی، صدر سوکارنو اور چین نواز کمیونسٹوں کی ملی بھگت کا نتیجہ تھا۔ بہا
تخریبی قوت کی شکست کے بعد اس صف بندی کو ختم ہونا ہی چاہیے تھا۔ ملیشیا کے نائب صدر معاہدے
پر دستخط کرنے کے لیے جب جکارتہ پہنچے تو وہاں کے عوام نے خوشی کا اظہار کیا اور جب اس کے جواب
میں انڈونیشیا کے وزیر خارجہ ملیشیا کے صدر مقام پہنچے تو وہاں کے عوام نے ایسی خوشی منائی جیسی عید میں
منائی جاتی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمان ملکوں کے عوام ایک دوسرے سے اتحاد و اتفاق
کے کتنے خواہشمند ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ ان ملکوں کے اختلافات صرف وہاں کے سربراہوں اور لیڈروں کی
باہمی رسہ کشی کا نتیجہ ہیں۔

ہر ڈکٹیٹر کی طرح صدر سوکارنو بھی اپنے آپ کو اپنے ملک کا مائی باپ سمجھتے تھے اور اب بھی اس کے
جراثیم ان کے دماغ سے نکلے نہیں ہیں۔ پہلے تو انھوں نے بنکاک کانفرنس کے معاہدے پر دستخط میں رکاوٹ
ڈالی جس کی وجہ سے کچھ دیر تو لگی لیکن دستخط ہوگئے اور اب پھر انھوں نے یہ کہہ کر نیا شگوفہ کھلایا ہے کہ
دونوں ملکوں میں سفارتی تعلقات صباح اور سراواک میں انتخاب کے بعد قائم ہوں گے۔ ملک میں ان کو
جو مقبولیت حاصل رہی ہے وہ اب بھی اس سے فائدہ اٹھانے سے باز نہیں آرہے ہیں۔ کیونکہ وہ طبقہ جو

…سے فائدے حاصل کر رہا تھا ان کی حمایت کر رہا ہے اور شاید اسی وجہ سے وہاں کی پارلیمنٹ اور
…ہارتو ان کی صدارت کو برداشت کر رہے ہیں۔

صدر سوکارنو کی پالیسی نے انڈونیشیا کی صرف دینی اور سیاسی حیثیت ہی پر ضرب نہیں لگائی تھی بلکہ اقتصادی
…ور پر بھی اس کو تباہی کے قریب پہنچا دیا تھا اب وہاں کے دینی، سیاسی اور فوجی لیڈروں پر ہمہ جہتی جد وجہد
…ی ذمہ داری عائد ہوگئی ہے۔ خدا کرے یہ تمام لیڈر اپنی ذمہ داری محسوس کریں اور انڈونیشیا ہر اعتبار سے
…ترقی کی راہ پر گامزن ہو۔

مدیر

۱۵ اگست ۱۹۶۶ء

مرکز جماعت اسلامی عمارت فنڈ

رفقاء سے تعاون کی اپیل

مرکز جماعت اسلامی کی موجودہ عمارت جس میں چند مرکزی شعبوں کے دفاتر رکھے گئے ہیں جماعت کی موجودہ ضرورت
…کے لیے ناکافی ہے یہی وجہ ہے کہ جماعت کے بعض مرکزی شعبے ماہنامہ زندگی، رسالہ کانتی (ہندی) اور شعبہ تصنیف وغیرہ
…ابھی تک رامپور سے دہلی منتقل نہیں کیے جا سکے ہیں اور جن شعبوں کی منتقلی ہو چکی ہے ان کی ضرورتیں بھی پوری نہیں ہوئی
…ہیں۔ جگہ کی کمی کی وجہ سے مکتبہ اور دعوت کو خاص طور سے بڑی دشواریاں درپیش ہیں۔ ان سب ضرورتوں کا
…تقاضا تھا کہ ایک وسیع تر مکان کا انتظام ہو۔ چنانچہ جماعت کی مجلس شوریٰ نے ایک مکان کی جو بازار چتلی قبر (جامع مسجد)
…میں واقع ہے خرید لینے کا فیصلہ کیا ہے اور سوا لاکھ (۱٫۲۵٫۰۰۰) روپیہ میں معاملہ طے کر کے بیعانہ دیدیا گیا ہے۔

معاہدے کی رو سے ۱۰ اکتوبر ۱۹۶۶ء تک تمام رقم داخل کر کے مکان کی رجسٹری کرا لینی ضروری ہے۔ اس لیے اس مدت سے
پہلے ہی رقم فراہم ہو جانی چاہیے جس کے لیے رفقاء جماعت سے اعانت کی اپیل کی جاتی ہے۔ توقع ہے کہ آپ حسب استطاعت
…اس اہم ضرورت میں ضرور ہاتھ بٹائیں گے اور اپنی رقمیں جلد سے جلد مرکز کے پتے پر بھیجیں گے۔

اعانت کے علاوہ قرض کے طور پر بھی رقمیں درکار ہوں گی جو حضرات اس سلسلے میں حصہ لینے کے موقف میں ہوں اور قرض
…دینا پسند فرمائیں وہ اپنی رقم کی مقدار اور واپسی کی شرطوں سے مطلع فرمائیں۔ رقوم شرائط طے ہونے کے بعد منگوائی جائیں گی۔
قرض دینے والوں کے اطمینان کے لیے یہ عرض ہے کہ مجلس شوریٰ میں یہ بات طے ہو چکی ہے کہ بوقت ضرورت مرکز کی موجودہ
…عمارت یا جماعت کی کوئی اور ملک فروخت بھی کی جا سکتی ہے۔ اس لیے قرض رقموں کی ادائیگی وعدے کے مطابق کی جا سکے گی۔

قیم جماعت اسلامی ہند ۔ سوئی والان دہلی ۶

روداد اجلاس شوریٰ

منعقدہ ۱۵ جولائی ۱۹۶۶ء

مجلس شوریٰ جماعت اسلامی ہند کا اجلاس حسب اعلان ۱۵ جولائی بعد نماز جمعہ ۳ بجے سہ پہر سے شروع ہوا اور ۲۲ جولائی کو ایک مختصر نشست کے بعد دعا پر ختم ہوگیا۔ اجلاس کی صدارت محترم امیر جماعت مولانا ابو اللیث صاحب اصلاحی ندوی نے فرمائی۔ ارکان شوریٰ میں سے مولانا صدر الدین صاحب، مولانا سید احمد عروج قادری صاحب، مولانا سید حامد علی صاحب، جناب انیس الدین احمد صاحب، جناب کے سی عبد اللہ صاحب، جناب عبد الرزاق لطیفی صاحب، جناب شمس پیرزادہ صاحب، مولانا نظام الدین صاحب، جناب محمد شفیع مونس صاحب، جناب نجات اللہ صدیقی صاحب، جناب محمد عبد الحی صاحب، سید حامد حسین صاحب اور افضل حسین صاحب معاون قیم جماعت نے شرکت کی۔

جناب محمد یوسف صدیقی صاحب اور جناب انعام الرحمٰن خاں صاحب خصوصی دعوت پر شریک اجلاس رہے۔ جناب محمد یوسف صاحب قیم جماعت اپنی علالت اور جناب محمد مسلم صاحب مدیر دعوت اپنے چچا جان کی شدید علالت کے باعث شرکت نہ کرسکے۔ مولانا سید احمد صاحب قادری کی تلاوت قرآن پاک سے کارروائی کا آغاز ہوا۔ محترم امیر جماعت نے اپنی افتتاحی تقریر میں اس اجلاس کے انعقاد کی ضرورت و اہمیت پر روشنی ڈالی اور دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ ہماری صحیح رہنمائی فرمائے۔

امیر جماعت کی افتتاحی تقریر کے بعد اوقات کی تعیین اور ایجنڈے کی ترتیب کا کام مکمل کیا گیا اور ایجنڈے کے مطابق کارروائی شروع ہوئی۔

گذشتہ روداد شوریٰ کی خواندگی

گذشتہ روداد شوریٰ منعقدہ مارچ ۱۹۶۶ء کی خواندگی ہوئی۔ روداد کو سننے کے بعد بعض ارکان شوریٰ

نے کچھ وضاحتی سوالات کیے جن کے جوابات امیر محترم نے دیے۔ اس کے بعد ارکان شوریٰ نے روداد کے رجسٹر پر دستخط ثبت کیے۔

کل ہند اجتماع

میقات رواں کے لیے جماعت نے جو پالیسی اور پروگرام نافذ کیا ہے اس میں میقات میں ایک مرتبہ کل ہند اجتماع کا انعقاد بھی طے کیا گیا ہے۔ اس مجلس میں کل ہند اجتماع کے انعقاد پر مزید غور و خوض ہوا اور طے کیا گیا کہ:۔

۱۔ کل ہند اجتماع اواخر مارچ یا اپریل ۱۹۶۳ء میں بمقام حیدر آباد منعقد کیا جائے۔

۲۔ حلقہ ہائے حیدر آباد، اورنگ آباد، بمبئی، میسور، مدراس اور آندھرا کے تمام ارکان کے لیے اجتماع میں شرکت لازمی ہوگی الّا یہ کہ عذر شرعی لاحق ہو۔

۳۔ حلقہ ہائے کیرلا، بھوپال اور بقیہ حلقہ ہائے شمالی ہند کے تمام ارکان کی شرکت لازمی نہیں ہوگی۔ البتہ امرائے حلقہ جات اور امرائے مقامی کے علاوہ جہاں دس یا زیادہ ارکان ہوں ان میں سے ایک نمائندے کی شرکت بھی لازمی ہوگی۔ الّا یہ کہ عذر شرعی لاحق ہو۔

۴۔ جن ارکان کی شرکت لازمی نہیں ہے ان کو بھی حتی الوسع شرکت کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

۵۔ ارکان شوریٰ کی شرکت بھی ضروری ہے امید ہے اس موقع پر ان شاء اللہ مجلس شوریٰ کا اجلاس بھی منعقد ہوگا۔

اجتماع کے مصارف کا سرسری تخمینہ بیس ہزار روپیہ کیا گیا ہے اور طے کیا گیا کہ امرائے حلقہ جات اپنے اپنے حلقوں سے حسب حیثیت و تناسب اپنا حصہ جلد از جلد مرکز روانہ کر دیں۔

مرکز جماعت اسلامی ہند کے لیے نئی عمارت کی خریداری

مرکز جماعت اسلامی ہند کی موجودہ عمارت جس میں چند مرکزی شعبوں کے دفاتر رکھے گئے ہیں جماعت کی موجودہ ضروریات کے لیے بہت ناکافی ہے۔ چنانچہ جماعت کی مجلس شوریٰ نے ایک مکان جو مرکز کی موجودہ عمارت سے زیادہ وسیع ہے سوا لاکھ روپیے (۲۵،۰۰۰) میں خرید لینے کا فیصلہ کیا ہے۔

مجلس نے یہ بھی طے کیا ہے کہ رفقائے جماعت سے امانت اور قرض کی اپیل کی جائے اور ضرورت محسوس ہو تو مرکز کی موجودہ عمارت فروخت بھی کی جا سکتی ہے۔

اس عمارت کا باقاعدہ بیعانہ ہو چکا ہے اور ۱۵ اکتوبر ۱۹۶۶ء رقم ادا کرنے کی آخری تاریخ ہے۔

اعلیٰ تعلیم کی درس گاہ

اعلیٰ تعلیم کی درس گاہ کے قیام کا جو فیصلہ مجلس شوریٰ منعقدہ مارچ ۱۹۶۶ء میں کیا گیا تھا اس کے نفاذ کے سلسلے کی عملی دشواریوں کے پیش نظر یہ طے کیا گیا کہ سر دست اس کا نفاذ ملتوی کر دیا جائے اور آئندہ اجلاس شوریٰ میں جو چند ماہ بعد منعقد ہونے والا ہے اس پر تفصیل سے غور ہو۔ اس مدت میں ابتدائی تعلیم کا پورا انتظام حسب سابق برقرار رہے گا۔

قرار دادیں

مجلس نے اپنے اجلاس میں ملک کی موجودہ صورت حال کا جائزہ لیا۔ نیز پریس میں شائع شدہ اطلاعات کے مطابق مرکزی وزارت داخلہ کی طرف سے جماعت اسلامی کے متعلق جو سرکلر جاری کیا گیا ہے اور جس کی اب تک حکومت کی طرف سے کوئی تردید بھی شائع نہیں ہوئی ہے اس پر غور و فکر کر کے درج ذیل دو قرار دادیں منظور کیں۔

ملک کی صورت حال پر تشویش

۱۔ مجلس شوریٰ نے اپنے اجلاس میں ملک کی موجودہ صورت حال پر غور و فکر کیا۔ مجلس کو اس صورت حال پر سخت تشویش ہے کہ ایک طرف عوام میں یہ رجحان بڑھتا جا رہا ہے کہ وہ اپنے مطالبات کے حصول کے لیے لاقانونیت کا سہارا لیں جس کا نتیجہ امن و امان کی بربادی اور نظم و نسق کی ابتری و تعطل کی شکل میں بھی نمایاں ہونے لگا ہے۔ اور دوسری طرف حکومت کے طرز عمل سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ عوام کے جائز مطالبات پر بھی ہمدردانہ غور کرنے اور اپنی کسی غلطی کی تلافی کرنے کے بجائے اس کے نزدیک صحیح تدبیر یہ ہے کہ وہ اپنے حاصل شدہ قانونی اختیارات کو جا و بے جا استعمال کرے اور ہنگامی حالات کو عذر بنا کر مزید ہنگامی اختیارات بھی حاصل کرے۔

مجلس کے نزدیک عوام کا یہ رجحان بہر صورت قابل اصلاح ہے لیکن حکومت کا یہ طرز عمل اس اصلاح میں ہرگز معاون نہیں بن سکتا۔ اس صورت حال کی اصلاح کی اصل تدبیر یہ ہے کہ عوام اور ارباب حکومت دونوں میں اخلاقی اقدار کا صحیح شعور پیدا ہو اور اپنی ذمہ داریوں کا صحیح احساس بیدار ہو۔

جماعت اسلامی کے خلاف خفیہ سرکلر کی مذمت

۲۔ پریس میں شائع شدہ اطلاعات کے مطابق مرکزی وزارت داخلہ کی طرف سے جماعت اسلامی کے متعلق جو سرکلر جاری کیا گیا ہے اور جس کی اب تک حکومت کی طرف سے کوئی تردید بھی شائع نہیں ہوئی ہے جماعت کی مجلس شوریٰ اسے قابل مذمت سمجھتی ہے اور اس پر رنج و افسوس کا اظہار کرتی ہے

تعجب ہے کہ اس سرکلر میں جماعت پر وہ الزامات لگائے گئے ہیں جن کی تردید ذمہ داران جماعت کے اعلانات اور جماعت کا عملی رویہ کر رہا ہے۔ اگر حکومت کی نظر میں حق و انصاف کی قدر و قیمت ہے تو اس کی اولیں ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے اس سرکلر کو واپس لے یا پھر وہ جماعت کے خلاف اپنے سرکلر میں لگائے ہوئے سنگین الزامات کو ثابت کرے اور بتائے کہ جماعت نے دستور ہند کو کب ماننے سے انکار کیا ہے؟ اور یہ ثابت کرے کہ جماعت نے کب اس اصول سے اختلاف کیا ہے کہ ملک کے مختلف اہل مذاہب کے ساتھ حکومت کا رویہ یکساں اور غیر جانبدارانہ ہو؟ اور جماعت نے کب ملک کے مختلف فرقوں کے مابین تلخی پیدا کرنے یا فرقہ وارانہ جذبات کو ابھارنے کی کوشش کی ہے؟

اگر حکومت مذکورہ بالا دونوں باتوں کو روبہ کار لانے میں ناکام رہی تو اس کے صاف و صریح معنی یہ ہوں گے کہ حکومت اپنے طرز عمل سے دستور کے تسلیم شدہ جمہوری اقدار اور باشندگان ملک کے مختلف طبقوں کے مابین مساوات کے اصول کو مجروح کر رہی ہے جو خود دستور ہند کی صریح خلاف ورزی ہے۔

مجلس کو حکومت کے عائد کردہ الزامات پر اس بنا پر اور زیادہ رنج و افسوس ہے کہ جماعت کے ذمہ داروں نے مرکزی وزیر داخلہ اور ہوم منسٹری کے ذمہ دار افسروں سے یہ معلوم کرنے کے لیے متعدد ملاقاتیں کیں کہ حکومت کو جماعت سے کیا شکایات ہیں اور ان کی کیا بنیاد ہے؟ لیکن نہ ان ملاقاتوں میں ان الزامات کا کوئی ذکر کیا گیا اور نہ وعدوں کے باوجود اپنے شکوک و اعتراضات متعین شکل میں اب تک دیے گئے اور پھر بھی اسی مدت میں اس طرح کا سرکلر جاری کر دیا گیا۔

الیکشن کا مسئلہ

مجلس شوریٰ میں ۱۹۶۷ء کے الیکشن کے سلسلے میں جماعت کے موقف اور رویے کا مسئلہ بھی تفصیل کے ساتھ زیر بحث آیا۔ اس ضمن میں جو باتیں طے ہوئیں ان کے خاص نکات حسب ذیل ہیں:

۱۔ جماعت اسلامی اپنے اس موقف پر قائم ہے کہ موجودہ نظام حکومت کو غیر اسلامی اور خلاف

سمجھتے ہوئے اس کو اسلامی نظام میں تبدیل کرنے کے لیے الیکشن میں حصہ لینا جائز ہے۔

۲۔ موجودہ نظام حکومت کو غیر اسلامی اور خلاف حق سمجھتے ہوئے اسلام اور مسلمانوں کے اہم مفادات کے لیے الیکشن میں حصہ لینا جائز ہے۔

۳۔ لیکن چونکہ عـ۱ اور عـ۲ کے تحت الیکشن میں عملاً حصہ لینے کے لیے

(۱) ابھی تک مطلوبہ رائے عامہ ہموار نہیں کی جاسکی ہے۔

(۲) جماعت اور اس کی دعوت سے ملک کا بہت محدود طبقہ ہی متعارف ہوسکا ہے اور بہت بڑی تعداد یا تو متعارف نہیں ہے یا غلط فہمیوں کا شکار رہی ہے جس کی بنا پر اس کا اندیشہ ہے کہ الیکشن میں حصہ لینے سے جماعت کی دعوت اور مقصد کے بارے میں مزید غلط فہمیاں پیدا ہوجائیں گی اور ان سے ہمارے اصل مقصد کو غیر معمولی نقصان پہنچے گا۔ اور

(۳) بحالات موجودہ ہمارے وسائل و ذرائع اور افرادی قوت (Man power) بھی اس کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ اس لیے اس الیکشن میں ان دونوں مقصدوں میں سے کسی کے لیے جماعت اپنا امیدوار کھڑا نہیں کرے گی۔

(۴) اگر کوئی دوسرا فرد یا جماعت ۱ کے تحت ۶۲ء کے الیکشن میں بہ حیثیت امیدوار اپنے طور سے حصہ لینے کا فیصلہ کرتی ہے تو اصولاً اس کی تائید صحیح ہوسکتی ہے لیکن چونکہ نمبر ۱ کے تحت کسی فرد یا جماعت کا ۶۲ء کے الیکشن میں حصہ لینا مذکورہ بالا وجوہ کی بنا پر تحریک اسلامی کے مصالح کے لیے مضر ہوسکتا ہے۔ اس لیے ہم اس کی تائید نہیں کریں گے۔

(۵) عام انتخابات ۶۲ء کے انعقاد سے پہلے جبکہ مختلف حلقہ ہائے انتخاب سے کھڑے ہونے والے امیدواروں کے نام سامنے آچکے ہوں مجلس شوریٰ کا اجلاس بلایا جائے گا جو یہ فیصلہ کرے گا کہ کسی حلقہ انتخاب میں ارکان جماعت سے وہ پابندی ہٹائی جائے یا نہ ہٹائی جائے جو ووٹ دینے کے سلسلے میں ان پر اب بھی عائد ہے۔

(۶) الیکشن میں جماعت کے عملاً حصہ نہ لینے کے وجوہ مذکورہ بالا کو کس طرح دور کیا جاسکتا ہے اس پر آئندہ غور کیا جائے گا۔

(۷) اگرچہ جماعت اسلامی کا اصولی موقف اب بھی یہی ہے کہ موجودہ نظام حکومت کو صحیح سمجھتے ہوئے اس کو

چلانے کے لیے الیکشن میں حصہ لینا ناجائز ہے۔ لیکن جماعت کسی فرد یا پارٹی کے خلاف مخالفت کی کوئی مہم نہیں چلائے گی۔ البتہ بوقت ضرورت سوال و جواب کے موقع پر یا تحریر و تقریر میں جماعتی موقف کی وضاحت کے لیے جماعتی نقطۂ نظر کا اظہار کیا جا سکتا ہے۔

نوٹ:۔ اس ضمن میں رفقاء کو یہ یاد دلانا بھی مناسب اور ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۷۱ء کے الیکشن کے موقع پر مجلس شوریٰ میں یہ مسئلہ بھی زیر گفتگو آیا تھا کہ الیکشن میں حصہ لینے والی پارٹیاں اور رائے دہندگان بالعموم کچھ ایسے طریقے بھی اختیار کرتے ہیں جو اخلاقی نقطۂ نظر سے سخت معیوب اور ملک و معاشرے کے وسیع مفاد کے لیے سخت مضر ہیں۔ مثلاً:۔

- فرقہ وارانہ اور طبقاتی، صوبائی اور لسانی عصبیتوں کو برانگیختہ کرنا۔
- ووٹ حاصل کرنے کے لیے تفہیم و استدلال سے کام لینے کی بجائے دھن دھونس دھاندلی سے کام لینا
- جھوٹ، افترا پردازی، تہمت، دشنام طرازی اور فریب دہی وغیرہ۔

اس لیے ضرورت سمجھی گئی تھی کہ رفقاء کو اس طرف توجہ دلائی جائے کہ وہ اپنے اپنے دائرے میں جس حد تک بھی لوگوں کو ان باتوں سے روک سکتے ہیں روکنے کی کوشش کریں۔

آئندہ الیکشن کے ذیل میں بھی رفقائے جماعت اس ہدایت کو پیش نظر رکھیں۔

۸۔ الیکشن کے سلسلے میں مسلمانوں کا رویہ کیا ہونا چاہیے۔ اس مسئلے پر بھی شوریٰ میں غور ہوا۔ اس ضمن میں مجلس کے بنیادی مشورے درج ذیل ہیں:۔

(۱) بہ حیثیت مسلمان جب ان کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ ہی ان کا معبود اور حاکم علی الاطلاق ہے اور اس کا بھیجا ہوا دین ہی صحیح نظام زندگی ہے تو انہیں اس کے مطابق اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی گزارنے اور تمام بندگان خدا کو اس کی طرف دعوت دینے کی کوشش کرنی چاہیے اور الیکشن کو بھی حتی الوسع اسی مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ بنانا چاہیے۔

(۲) اس ملک میں دین کا قیام اس بات پر موقوف ہے کہ باشندگان ملک کی معتدبہ تعداد کے دلوں میں ایمان اور اپنے رب سے وابستگی پیدا ہو اور ان کو اپنی فلاح اس ملک میں دین کے قیام پر موقوف نظر آنے لگے اور اس مقصد کا حصول اس بات پر موقوف ہے کہ ان کے سامنے اسلام کی دعوت قولی و عملی شہادت کے ساتھ مؤثر طور پر پیش کی جائے جو امت مسلمہ کا اصل فریضہ بھی ہے۔ اس لیے انہیں الیکشن کے موقع پر کوئی

طرزِ عمل اختیار نہیں کرنا چاہیے جس سے ان کی بااصل حیثیت مجروح ہو یا اس کے بارے میں خواہ مخواہ کی غلط فہمیاں پیدا ہوں۔

(۳) مسلمانوں کے لیے ایک اہم اور مقدم کام یہ ہے کہ وہ اپنے دیگر مسائل کی طرح الیکشن کے مسئلے میں بھی قرآن وسنت کی روشنی میں اپنا بنیادی موقف طے کرنے کے لیے کسی اجتماعی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کریں اور اسلام اور مسلمانوں کے اہم مفادات کے تحفظ کی خاطر بھی اپنا رویہ زیادہ سے زیادہ اصولی اور غیر فرقہ وارانہ بنانے کی کوشش کریں۔

مجلس نے جماعت کے نصب العین اور اس کے فطری اصول ومقتضیات پر بھی گفتگو کی اور اس ذیل میں طے پایا کہ ملک میں دین کے قیام کے لیے مسلمانوں کو ایک داعی گروہ کے موقف میں لانے کی جو اہمیت ہے اس کے پیش نظر ایمان کی تجدید عمل کی اصلاح اور معاشرے کی تطہیر کے ساتھ ان ملی مسائل سے بھی تعرض کرنا ہے جن سے تعرض اس مقصد کے لیے ضروری نظر آئے۔

نیز یہ بھی طے کیا گیا کہ وہ کوششیں جو امت مسلمہ کی بقاء وتحفظ اور اس کی ملی خصوصیات کو قائم برقرار رکھنے نیز مستحکم کرنے کے لیے انجام دی جائیں وہ اقامت دین کے مفہوم میں شامل ہیں۔ البتہ ان کاموں کی اہمیت دعوتی کاموں کے مقابلے میں ثانوی ہوگی بجز استثنائی حالات کے۔

آئندہ شوریٰ

اس اجلاس کے لیے جو ایجنڈا ترتیب دیا گیا تھا اس کا ایک خاص جزء پچھلے ملتوی شدہ مسائل تھے جن پر غور کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا لیکن وقت کی کمی کی بنا پر ان مسائل میں سے کچھ اب بھی باقی رہ گئے ہیں جن کو آئندہ اجلاس شوریٰ کے لیے جو غالباً قبل رمضان منعقد ہو سکے گا ملتوی کر دیا گیا۔

بدید عمارت کے لیے حلقوں سے اعانت

اجلاس شوریٰ میں متعدد امرائے حلقہ جات بھی شریک تھے۔ ان کے مشوروں سے طے پایا کہ حسب ذیل حلقے آئندہ دو ماہ کے اندر اپنے حلقوں سے مرکز کے عمارتی فنڈ میں حسب تصریح ذیل اعانت کی رقوم فراہم کریں گے۔

(۱) حلقہ جنوبی بہار..... بارہ ہزار (۲) حلقہ بمبئی..... دس ہزار (۳) حلقہ بھوپال..... پانچ ہزار
(۴) حلقہ حیدرآباد.... پانچ ہزار (۵) حلقہ مغربی یوپی..... پانچ ہزار (۶) حلقہ کیرلہ..... تین ہزار
طے کیا گیا کہ بقیہ حلقے بھی اس فنڈ میں حسب حیثیت پورا حصہ لیں۔
اس کے بعد ۲۲ جولائی کی صبح کو دعا پر اجلاس برخاست ہوا۔

افضل حسین
من جانب قیم جماعت اسلامی ہند

تنقید و تبصرہ

م جدید کا چیلنج

وحید الدین خاں۔ صفحات ۳۰۰۔ قیمت پانچ روپیہ۔
ناشر: مجلس تحقیقات و نشریات اسلام۔ ندوۃ العلماء، لکھنؤ

جو نوجوان اپنے مذہب سے واقفیت حاصل کیے بغیر جدید علوم کی تحصیل میں لگ جاتے ہیں۔ اکثر و بیشتر ان کے دل و
میں انکار رسالت و آخرت یہاں تک کہ انکار خدا کا زہر بھی سرایت کرنے لگتا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب اس زہر
کا تریاق مہیا کرتی ہے۔ فاضل مصنف نے جدید انداز میں بڑی اچھی ترتیب کے ساتھ سادہ اور آسان زبان میں مذہب کے
بنیادی عقائد کو انہیں دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جن دلائل سے ان کا انکار کیا جاتا ہے اور وہ اپنی اس
کوشش میں کامیاب ہیں۔ یہ کتاب ان عنوانات میں تقسیم ہے۔ تمہید۔ مخالفین مذہب کا مقدمہ۔ تبصرہ۔ استدلال کا طریقہ
کائنات خدا کی گواہی دیتی ہے۔ دلیل آخرت۔ اثبات رسالت۔ قرآن، خدا کی آواز۔ مذہب اور تمدنی مسائل۔ جس زندگی
میں تلاش ہے۔ آخری بات۔

اس کتاب میں موجودہ دور کے فلاسفہ، سائنس داں اور عیسائی مذہب کے علماء کی کتابوں سے بکثرت اقتباسات نقل
کیے گئے ہیں اور یہ کتاب ان قیمتی اقتباسات کا ایک اچھا مجموعہ بن گئی ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب مقبول ہوگی اور جدید تعلیم یافتہ
طبقہ ان کے لیے بہت مفید ثابت ہوگی۔ ہم تمام ایسے لوگوں سے اس کتاب کے مطالعے کی سفارش کرتے ہیں جو دینی عقائد
میں شک و ریب کا شکار ہو گئے ہوں۔

ہم یہاں چند باتیں فاضل مصنف کی توجہ کے لیے عرض کرنا چاہتے ہیں ــــ جس موضوع پر انہوں نے یہ کتاب
لکھی ہے اس پر دوسرے لوگوں نے بھی لکھا ہے اور لکھ رہے ہیں۔ ان کے کام میں فاضل مصنف کے خیال میں کچھ
نقائص ہیں۔ ایک نقص پر اظہار خیال کرتے ہوئے انہوں نے تمہید میں لکھا ہے:۔

مثال کے طور پر اثبات رسالت کے عنوان پر ہمارے یہاں جو کام ہوا ہے اس میں اکثر یہ فرض

کر لیا جاتا ہے کہ دورِ جدید کا یہ دعویٰ ہے کہ "محمد صلی اللہ علیہ وسلم جھوٹے رسول تھے" اور اس کے بعد آپ کو "سچا" ثابت کرنے پر مواد اکٹھا کرنا شروع کر دیا جاتا ہے۔ حالانکہ جھوٹا نبی کہنے کا مطلب یہ ہے کہ سچا نبی بھی ہوتا ہے۔ جبکہ جدید انسان اپنے معلوماتی دائرے کے مطابق ایسی کسی چیز کے ماننے ہی میں شبہ ہے۔ فاضل مصنف کا یہ بیان واقعے کے مطابق نہیں ہے۔ دوسرے لوگوں نے بھی اثباتِ رسالت پر کام کیا ہے کام اثباتِ رسالت پر بھی ہوا ہے اور حضورؐ کو سچا نبی ثابت کرنے پر بھی اور زیرِ تبصرہ کتاب میں بھی یہ دونوں کام ساتھ ساتھ کیے گئے ہیں۔ خود مصنف نے دوسری جگہ لکھا ہے :-

"کتاب میں جس پہلو سے مذہب کی مدافعت ہے یا جس ذہن کے پیش نظر اس کو مدلل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے دو الگ الگ انداز ہو سکتے ہیں۔ ایک تصوراتی اور دوسرے تجرباتی۔ یا دوسرے لفظوں میں ایک فلسفیانہ اور دوسرے سائنٹیفک۔ (اگر اس کو سائنٹیفک کہا جا سکتا ہو) زیرِ نظر کتاب میں زیادہ تر دوسرے پہلو کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس کی خاص وجہ مصنف کا یہ احساس ہے کہ پہلے طرز پر ہمارے ہاں کافی کام ہو چکا ہے جب کہ دوسرے پہلو پر نسبتہً بہت کم کام ہوا ہے۔"

یہاں مصنف نے خود اعتراف کیا ہے کہ اثباتِ رسالت پر فلسفیانہ انداز کا کافی کام ہو چکا ہے۔ سیرۃ النبی حصہ سوم میں معجزات اور وحی کے اثبات پر جو حصہ لکھا گیا ہے وہ فلسفیانہ اور سائنٹیفک دونوں طریقوں کا جامع ہے اور واقعہ یہ ہے کہ فلسفیانہ انداز سے اثباتِ رسالت پر جو گفتگو کی جاتی ہے وہ بھی تجربات ہی پر مبنی ہوتی ہے۔ مصنف نے تمہید میں لکھا ہے کہ جس انداز کے تحت اس کتاب میں دین کی حمایت و مدافعت کی گئی ہے۔ اگر اہلِ دین میں سے کسی کو وہ اجنبی اور نامناسب معلوم ہو تو انہیں یہ خیال کرنا چاہیے کہ یہ کتاب متکلمانہ ضرورت سے لکھی گئی ہے تشریحِ دین کے طور پر نہیں لکھی گئی ہے عرض یہ ہے کہ متکلمانہ ضرورت اور تشریحِ دین کے درمیان فرق کرنا جب ہمارے لیے بھی آسان نہیں ہے تو وہ لوگ ان دونوں کے درمیان کس طرح فرق پہچان لیں گے جن کو سامنے رکھ کر یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ میں یہاں مثال کے طور پر ایک بات مصنف کی توجہ کے لیے پیش کرتا ہوں۔ اثباتِ رسالت کے باب میں انھوں نے لکھا ہے :-

اشراقی پیغام رسانی جو بندوں کے درمیان ایک معلوم اور ثابت شدہ واقعہ ہے ایک ایسا قرینہ ہے جس سے ہم اس اشراق کو سمجھ سکتے ہیں جو بندے اور خدا کے درمیان ہوتا ہے اور جس کی کامل اور متعین صورت کو مذہب کی اصطلاح میں "وحی" کہا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وحی اپنی نوعیت کے اعتبار سے اسی قسم کا ایک کائناتی اشراق ہے جس کا تجربہ محدود پیمانے پر ہم انسانی زندگی میں بار بار کر چکے ہیں اور کرتے رہتے ہیں۔

یہ عبارت بہت مبہم ہے اور اس سے قرآن کے بارے میں غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔ قرآن بھی وحی ہے اب اگر کوئی شخص اس کو بھی خدا اور بندے کے درمیان "اشراق" سمجھے تو کیا اس کا یہ سمجھنا صحیح ہوگا؟ قرآن کی وحی اور اشراق میں کوئی مشابہت نہیں ہے۔ پہلا فرق تو یہ ہے کہ اشراق میں الفاظ نہیں بلکہ صرف معنی منتقل کیے جاتے ہیں اور قرآن

خدا کا کلام ہے۔ ٹھیک یہی الفاظ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچائے گئے ہیں۔ اس میں ایک لفظ بھی آپ کا اپنا نہیں ہے
دوسرا فرق یہ ہے کہ اشراقات میں کوئی واسطہ نہیں ہوتا اور قرآن حضرت جبریل کے واسطے حضور تک پہنچا ہے ——
آئندہ اڈیشن میں فاضل مصنف اس عبارت کو واضح کر دیں تو مناسب ہے —— مصنف ص ۱۷۶ پر لکھتے ہیں :۔

"جب آپ نے پیغمبری کا اعلان کیا تو مکے کے لوگ جو آپ کو اچھی طرح جانتے تھے ان کے لیے یہ سوال خارج از بحث تھا کہ آپ کو نعوذ باللہ جھوٹا یا جعل ساز سمجھیں۔ کیونکہ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اب تک پوری زندگی کے بالکل خلاف تھا اس لیے انھوں نے کبھی آپ پر اس قسم کا الزام نہیں لگایا بلکہ کہا تو یہ کہا کہ اس شخص کی عقل کھو گئی ہے۔ وہ شاعرانہ مبالغہ کر رہے ہیں اور ان پر کسی کا جادو چل گیا ہے۔ ان پر جنات سوار ہے مخالفین نے یہ سب کچھ کہا مگر کسی کی جرأت یہ نہ ہوئی کہ وہ آپ کی صداقت اور دیانتداری پر شبہ ظاہر کرے"

عرض یہ ہے کہ قریش نے آپ کو ساحر، شاعر، اور کاہن کس لحاظ سے کہا تھا؟ ظاہر ہے کہ آپ کے اعلان نبوت و رسالت اور تلاوت قرآن ہی کے لحاظ سے کہا تھا اور قرآن کہتا ہے کہ اس لحاظ سے انھوں نے آپ کو جھوٹا اور جعل ساز بھی کہا جس طرح گزشتہ امتوں نے اپنے وقت کے رسولوں کی تکذیب کی تھی۔ اسی طرح آپ کے مخالفین نے بھی آپ کی تکذیب کی اور الزام لگایا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ قرآن خود گھڑ کر پیش کر رہے ہیں۔ سورہ ص کے شروع ہی میں ہے :۔

وَقَالَ الْكَافِرُونَ هَٰذَا سَاحِرٌ كَذَّابٌ (ص ۱) 　　اور کافروں نے کہا کہ یہ جادوگر اور بڑا جھوٹا ہے

قرآن نے جب قریش کو مقابلے کا چیلنج دیا تو یوں کہا :۔

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۖ قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهِ مُفْتَرَيَاتٍ (ہود ۲) 　　کیا وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر قرآن گھڑ لایا ہے۔ کہو تم بھی اس جیسی دس سورتیں گھڑ کے لے آؤ۔

آپ کے مخالفین کی ایک بڑی دھاندلی یہ بھی تو تھی کہ وہ دنیوی معاملات میں چالیس سال تک آپ کی صداقت و امانت کا تجربہ رکھنے کے باوجود دین کے معاملے میں آپ کو جھوٹا قرار دیتے تھے۔ وہ محمد عربی کو صادق اور امین اور محمد رسول اللہ کو نعوذ باللہ کاذب اور مفتری کہتے تھے۔ گزارش یہ ہے کہ فاضل مصنف کو اپنی یہ عبارت بھی درست کر لینی چاہیے۔

ص ۱۸۱ پر دو جگہ عقبہ چھپ گیا ہے صحیح نام عتبہ ہے —— فاضل مصنف نے اس کتاب کی تمہید ختم کرتے ہوئے لکھا ہے :

"یہ بالواسطہ طور پر مولانا مودودی ہی کا فیض ہے کہ پندرہ سال پہلے اپنی زندگی کے ایک نازک ترین مرحلے میں میرے دل میں اس احساس نے غلبہ پایا کہ میں اپنی زندگی کو خدمت دین کے لیے وقف کر دوں جس کا ایک باقاعدہ مظہر یہ کتاب ہے"

یہ عبارت پڑھ کر مجھے یہ شعر یاد آ گیا 　　باقی ص ۶۴ پر

(بقیہ اشارات)

وَّلَا وَاقٍ ۝ مقابلے میں نہ تمہارا کوئی حمایتی ہوگا اور نہ اس
کی سزا سے بچانے والا۔ (الرعد: آیت ۳۷)

نزول قرآن کے وقت مشرکین مکہ کی رائے ان کی خواہش اور ان کا مطالبہ یہ تھا کہ شرک کی تردید اور مظاہر شرک کی مذمت ترک کر دی جائے اور آج کے برسراقتدار لوگوں کی رائے، ان کی خواہش اور ان کا مطالبہ یہ ہے کہ قومی دھارے میں غوطے لگاؤ، قومی ادغام و انضمام کے مبلغ بنو۔ رہن سہن اور کلچر میں اپنے آپ کو ایسا بناؤ۔ تاکس نہ گوید بعد ازیں، من دیگرم تو دیگری۔ مذہب کو سیاست سے بالکلیہ نکال باہر کرو، حاکمیت جمہور کو برحق مانو اور سیکولرزم کو ہر مرض کی دوا جانو۔ تمہارے پاس جو قرآن و حدیث ہے اس کو ان باتوں کے تابع ہونا چاہیے اور اگر ان کے احکام ان باتوں کے خلاف ہوں تو ان کی تاویلیں کرو، نئی تعبیریں پیش کرو اور نہیں وقت کے سانچے میں کسی نہ کسی طرح فٹ کرو۔ اب دنیا میں تمہارے اسلام کا یہ ماڈرن ایڈیشن ہی چل سکتا ہے۔ قدیم اسلام کو تھامے رہوگے تو نقصان اٹھاؤگے۔ ہم یہ مطالبہ تمہارے اپنے فائدے کے لیے کر رہے ہیں۔ اگر نہیں مانتے تو تم جانو اور تمہارا کام۔

ان خواہشوں، رایوں اور مطالبوں کے پتھر ہر طرف سے اس طرح برس رہے ہیں کہ عام مسلمان تو الگ رہے ان کے خواص اور علماء بھی بدحواس ہو رہے ہیں اور ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ کھائیں کدھر کی چوٹ، بچائیں کدھر کی چوٹ۔

ان حالات میں ہمیں مداہنت فی الدین سے یہ یقین ہی بچا سکتا ہے کہ اگر ہم نے ایسا کیا تو ہماری آخرت برباد ہو جائے گی اور آخرت کی ابدی بربادی پر دنیا کی عارضی آبادی کو ترجیح دینا بدترین قسم کی حماقت ہے۔

بقیہ ص ۶۳

کس نیاموخت علم تیر از من ۔۔۔ کہ مرا عاقبت نشانہ نکرد

آخر میں ایک اور بات یہ عرض کرنی ہے کہ اس کتاب کے مواد کا قابل لحاظ حصہ اس وقت لکھا ہے جب فاضل مصنف جماعت اسلامی ہند کے شعبۂ تصنیف میں کام کر رہے تھے۔ اگر وہ اس کا ذکر بھی تمہید میں کر دیتے تو اچھا تھا۔

(ع ق)

زندگی رامپور

جلد: ۳۷ جمادی الاخری ۱۳۸۶ھ
شمارہ: ۴ اکتوبر ۱۹۶۶ء

مدیر: سید احمد قادری

• خط و کتابت و ارسال زر کا پتہ: منیجر "زندگی" رام پور۔ یوپی

• زر سالانہ: چھ روپیہ۔ ششماہی: تین روپیہ۔ فی پرچہ: ۶۰ پیسے

ممالک غیر سے: بارہ شلنگ بذریعہ پوسٹل آرڈر

مالک جماعت اسلامی ہند۔ ایڈیٹر: سید احمد صاحب قادری۔ پرنٹر پبلشر: احمد حسن۔ مطبع: دہلی پرنٹنگ پریس چاؤڑی بازار دہلی

مقام اشاعت: دفتر زندگی رام پور یوپی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

(سید احمد قادری)

آج ۳۰ اگست ۶۶ء کے اخبارات میں یہ خبر پڑھی کہ سید قطب ابراہیم اور ان کے دو ساتھیوں کو قاہرہ کے جیل میں رات کے وقت پھانسی دے دی گئی۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ حادثہ بے حد افسوسناک ہے لیکن حیرت انگیز بالکل نہیں۔ اللہ تعالیٰ ان شہیدوں کی پاک روحوں کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کی قبروں پر اپنی رحمت کے پھول برسائے۔ آمین۔

الاخوان المسلمون کی جماعت نے ایک بار پھر یہ ثابت کر دیا کہ اللہ کی رضا کے لیے اعلائے کلمۃ اللہ کی راہ میں اپنا سب کچھ لٹا دینے والوں کی تاریخ کا تابناک باب بند نہیں ہوا ہے وہ مسلسل لکھا جا رہا ہے اور قیامت تک لکھا جاتا رہے گا۔ اخوان کے ارکان نے ایک دفعہ پھر اپنے سرخ اور گرم خون سے جریدۂ عالم پر اپنا نقش دوام ثبت کر دیا۔ رحمہم اللہ اجمعین۔ دنیا عبدالقادر عودہ شہید اور ان کے پانچ ساتھیوں کو بھولی نہیں ہے اور وہ ان تین شہیدوں کو بھی بھول نہیں سکے گی۔ ان اللہ کے بندوں نے حق پر استقامت کا جو ثبوت دیا ہے اس پر فرشتے بھی خوشی سے جھوم اٹھے ہوں گے۔ مصر کی حکومت نے ان پر نت نئی اذیت رسانیوں کی مشق کا ریکارڈ توڑ دیا لیکن یہ کس مٹی کے بنے ہوئے لوگ ہیں جو اپنے موقف سے ایک انچ نہیں ہٹے۔ دو چار دنوں، دو چار مہینوں اور دو چار سالوں کی بات نہیں مسلسل بارہ برسوں سے یہ جماعت ناصری حکومت کا ہدف ستم بنی ہوئی ہے لیکن اس نے اپنے اللہ سے جو عہد وفا باندھ رکھا ہے اس کو توڑنا تو بڑی بات ہے ڈھیلا کرنے پر بھی آمادہ نہیں ہے۔ مظالم کی جو داستانیں بیان کی جاتی ہیں انہیں سنکر دل دہل جاتا اور رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تاریخ کے چکر نے پھر وہ منظر سامنے کر دیا ہے۔ جب ظالم حکومتوں نے حق پرستوں

کی کھالیں لوہے کی کنگھیوں سے ادھیڑ دی تھیں اور جن کے جسموں کو آروں سے چیر ڈالا تھا۔

اے اللہ کی محبت میں سرشار مومنو! اپنے اس ضعیف الایمان بھائی کا سلام قبول کرو۔ میں تمہارے پاسنگ کے برابر بھی نہیں لیکن :

احب الصالحین ولست منہم لعل اللہ یرزقنی الصلاحا

اے سید قطب! ہم اپنے لحاظ سے تمہاری قربانیوں کو حیرت انگیز سمجھتے ہیں لیکن تم سے پوچھا جائے تو شاید یہ کہو :۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔

تم اگر شہید نہ کیے جاتے جب بھی علم و فضل اور قلمی جہاد کی دنیا میں زندۂ جاوید ہوتے۔ تم نے اپنے پیچھے وہ کتابیں چھوڑی ہیں جنہیں کوئی ناصر پھانسی نہیں دے سکتا۔ یہ کتابیں سیکڑوں اور ہزاروں دلوں میں وہ چراغ روشن کریں گی جسے روشن رکھنے کے لیے تم نے اپنے خون کا تیل بھی انڈیل دیا ہے۔

اللھم ارحمھم وبرد مضاجعھم ونور قبورھم۔

سید قطب اور ان کے ساتھیوں کی گرفتاری اور ان پر مقدمہ چلانے کی جو خبر اخبارات میں شائع ہوئی تھی اور صدر ناصر نے ماسکو میں اخوان کے خلاف جو تقریر کی تھی اسی سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس دفعہ پھر اخوان کے دو چار ارکان کو شہادت نصیب ہوگی۔ مارچ ۶۶ء کے ماہنامہ زندگی میں راقم الحروف نے ضمناً یہ لکھا تھا :۔

"اخوان کے شہیدوں کا خون پہلے بھی رائگاں نہیں گیا ہے اور اب یہ تازہ خون بھی ان شاء اللہ رائگاں نہیں جائے گا۔" ص۴۶

اس وقت "اب یہ تازہ خون" کا جملہ صدر ناصر کے بیان کی روشنی میں محض قیاساً لکھا گیا تھا۔ سخت افسوس ہے کہ یہ قیاس صحیح نکلا اور سید قطب جیسا مفکر و مجاہد صدر ناصر کے جوش انتقام کی بھینٹ چڑھ گیا۔ مصطفےٰ کمال نے بھی ترکی میں دین داروں اور اپنے مخالفوں کو ستایا تھا اور ان میں چند کو قتل بھی کر دیا تھا لیکن صدر ناصر اخوان کے ساتھ جس بہیمیت، درندگی اور سنگ دلی کا برتاؤ کر رہے ہیں۔ اتاترک نے شاید اس کا تصور بھی نہ کیا ہو۔ اخوان کے خلاف صدر ناصر کے اندھے جوش انتقام کی تو کوئی نہایت ہی معلوم نہیں ہوتی [illegible]

نے بھی حضرت یوسفؑ پر ایمان لانے والوں کے ساتھ اسی سنگ دلی کا ثبوت نہیں دیا تھا؟ عبدالقادر عودہ کے بعد سید قطب، ناصری حکومت کا سب سے بڑا نشانہ تھے۔ عبدالقادر عودہ کی زبان و قلم کو اللہ نے بڑی تاثیر بخشی تھی اور یہی قوت سید قطب کے قلم و زبان کو بھی عطا ہوئی تھی۔ صدر ناصر اس قوتِ تاثیر سے لرزہ براندام تھے اور اب خدا کے ذکر سے تر زبان کو خاموش کر کے وہ مطمئن ہوں گے کہ انھوں نے پالا مار لیا۔ ہر ڈکٹیٹر اسی طرح سوچتا ہے اور ہمیشہ یہ "سوچ" غلط ثابت ہوتی ہے۔ ہم ہوں یا نہ ہوں، دنیا دیکھ لے گی کہ صدر ناصر کی یہ سوچ بھی غلط ثابت ہو گئی ہے۔ صرف اقتدار کے اسٹیج یا دنیوی زندگی کے پردے سے ہٹ جانے کی دیر ہے۔ اس وقت معلوم ہوگا کہ پالا کس نے مارا تھا، صدر ناصر نے یا سید قطب نے؟

(۲)

مسلمانوں نے مجلس مشاورت کے نو نکاتی منشور کا جس طرح استقبال کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں بیداری کی ایک لہر دوڑ گئی ہے۔ یہ ایک خوش آیند علامت ہے لیکن یہی وقت ہے کہ اس بیداری کا صحیح رخ متعین کرنے کی طرف پوری توجہ دی جائے۔ مولانا ابو اللیث امیر جماعت اسلامی ہند نے اخبار دعوت دہلی کے کئی سہ روزہ شماروں میں اپنے خیالات تفصیل کے ساتھ پیش کیے ہیں۔ ان کا مقصد یہی معلوم ہوتا ہے کہ حالات کا جائزہ لے کر اس بیداری کی کمیت و کیفیت کا ٹھیک اندازہ لگایا جائے اور اس کو صحیح رخ کی طرف موڑنے کی سعی کی جائے۔ مسلمانوں کی بیداری کا غلط اندازہ لگانا یا مسلم مجلس مشاورت سے غلط توقعات وابستہ کرنا مفید نہ ہوگا۔ اسی طرح کانگرس دشمنی کے منفی جذبے پر اپنی سعی و جہد کی عمارت کھڑی کرنا یا اپوزیشن پارٹیوں میں سے کسی ایک یا ان کے کسی متحدہ محاذ پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کرنا بھی مضر ہوگا۔

مولانا نے ۹ اگست کے سہ روزہ دعوت میں کانگرس اور اپوزیشن پارٹیوں کو سامنے رکھ کر حالات کا جائزہ لیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ بلاشبہ آنے والے الکشن میں کانگرس کی مخالف پارٹیاں بھی اتحاد کے لیے پہلے انتخابات کے مقابلے میں زیادہ بے قرار نظر آ رہی ہیں اس لیے کہ متعدد پارٹیوں میں ووٹوں کی تقسیم کانگرس کو کامیاب کر دیتی ہے لیکن بے قراری کے باوجود اس کی امید نہیں ہے کہ مخالف پارٹیوں کے درمیان کوئی ایسا پائدار اتحاد وجود میں آسکے گا جو کانگرس کو شکست فاش دے سکے۔ اس یاس کی تین بنیادیں ہیں:۔

(۱) مخالف پارٹیوں کی تمام تگ و دو کانگرس دشمنی کے منفی جذبے پر مبنی ہے۔ حدیہ ہے کہ راجہ جی

جیسے ٹھنڈے مزاج اور فہم و فراست رکھنے والے لیڈر یہ کہتے ہیں کہ اس وقت مقدم کام کانگریس کو اقتدار
سے محروم کرنا ہے اور ہر پارٹی کو یہ مقصد ہر چیز پر مقدم رکھنا چاہیے۔ نفرت کے منفی جذبے پر جو
اتحاد مبنی ہو وہ مضبوط نہیں ہوتا۔ پھر دیکھنے کی چیز یہ بھی ہے کہ یہ نفرت کیا کسی مثبت اصول کی بنا پر ہے
کہیں کہیں اس کا سبب محض اقتدار کی ہوس یا ذاتی و طبقاتی مفادات کے حصول کا جذبہ ہے۔ اس
سبب کے وجود سے انکار کرنا آسان نہیں ہے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ ایسی پارٹیوں کا اتحاد کچے دھاگے
سے بندھا ہوگا۔

(۲) ایسی چھوٹی چھوٹی پارٹیاں بھی موجود ہیں جو اپنا اپنا ایک مخصوص حلقۂ اثر رکھتی ہیں اور اسی کے بل پر
ان کے کچھ نمائندے اسمبلیوں اور پارلیمنٹ میں پہنچ جاتے ہیں۔ اس طرح کی پارٹیوں کو یہ خطرہ لاحق ہوسکتا
ہے کہ کسی متحدہ محاذ میں داخل ہوکر وہ تحلیل نہ ہوجائیں اور ان کی انفرادیت ختم نہ ہوجائے۔ اس لیے اوّلاً
تو یہ چھوٹی پارٹیاں بڑی پارٹیوں کے محاذ میں داخل ہونے سے گریز کریں گی اور اگر گریز نہ کریں تو الکشن کے
آخر وقت تک ان پر اعتماد کرنا آسان نہ ہوگا۔

(۳) مخالف پارٹیوں میں بے حد نظریاتی اختلافات ہیں اس لیے آئندہ آنے والی حکومت کی پالیسی اور
اس میں حصہ رسدی پر اتفاق بہت مشکل ہے۔

یہ ہیں وہ کم سے کم بنیادیں جن کی بنا پر یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ کوئی ایسا متحدہ محاذ وجود میں آسکے گا
جو کانگریس کو حکومت سے باہر کردے۔ زیادہ سے زیادہ یہی توقع کی جاسکتی ہے کہ ریاستی اسمبلیوں اور لوک سبھا
میں کانگریس پارٹی کا موجودہ تناسب کچھ اور کم ہوجائے۔ البتہ چند صوبوں میں وہاں کے حالات کے پیش
نظر کانگریس کی شکست بہت متوقع معلوم ہورہی ہے۔ اگر یہ توقع پوری بھی ہوجائے تو پورے ملک کے لحاظ سے
اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ یہ سوال بھی قابل غور ہے۔

حالات کا یہ جائزہ مسلمانوں کو متنبہ کرتا ہے کہ:

(۱) وہ کانگریس سے سخت ترین شکایتوں کے باوجود اپنی سعی و جہد کی بنیاد اس کی دشمنی کے منفی جذبے
پر نہ رکھیں۔

(۲) اپوزیشن پارٹیوں یا ان کے کسی متحدہ محاذ پر ضرورت سے زیادہ اعتماد نہ کریں۔

مسلمانوں میں بیداری کے جو آثار نظر آرہے ہیں ان پر محترم امیر جماعت نے خوشی کا اظہار کیا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ انھوں نے چند اہم باتوں کی طرف بھی متوجہ کیا ہے۔ وہ احتیاط کی ضرورت پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"ہم ان لوگوں میں نہیں ہیں جو احتیاط کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ اس کے ساتھ کوئی نیا قدم اٹھانا ہی سرے سے مشکل ہو جاتا ہے۔ ہم افراد کی طرح قوموں ملتوں اور گروہوں کے بارے میں بھی یہ تصور رکھتے ہیں کہ انھیں کبھی کبھی خطرات بھی مول لینے پڑتے ہیں اور اسی سے ان میں جان پیدا ہوتی ہے اور ہم اس کے بھی قائل ہیں کہ زندگی کی کامیابیوں کی طرح اس کی ناکامیاں بھی افراد اور اقوام وملل کی ترقی کا زینہ بنتی ہیں لیکن ہندوستان کے موجودہ حالات بہرحال اس کے متقاضی ہیں کہ عام حالات میں عشق کو عقل کی پاسبانی سے بالکل آزاد نہ چھوڑ دیا جائے کیونکہ اس سے جو نتائج برآمد ہو سکتے ہیں وہ اپنی ذات یا کسی مخصوص گروہ تک محدود ہو کر نہیں رہ سکتے بلکہ پوری ملت اور اس کے ساتھ ملک کے مفادات بھی ان کی زد میں آسکتے ہیں۔

سہ روزہ دعوت ۲۸ اگست ۶۶ء

اس کے بعد انھوں نے ایک اور پہلو کی طرف ان الفاظ میں متوجہ کیا ہے:۔

"میں یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے بارے میں خدانخواستہ ہم کسی سوء ظن میں مبتلا نہیں ہیں بلکہ اس کے برعکس ہم نے بارہا اس پہلو سے انھیں سراہا ہے کہ انھوں نے اپنی مجموعی حیثیت میں حالات اور ان کے تقاضوں کے سمجھنے میں کافی سوجھ بوجھ کا ثبوت پیش کیا ہے لیکن پھر بھی اگر ہم ان کی اس نئی بیداری کے آئندہ رخوں کو قابل توجہ قرار دے رہے ہیں تو اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے اپنے خیال کے مطابق یہ بیداری اپنے صحیح رخ سے پیدا نہیں ہوئی ہے اس کے اسباب ومحرکات میں وہ محرک مفقود رہا ہے یا ہے تو اس کا اثر بس برائے نام ہی ہے جو امت مسلمہ کی بیداری کا حقیقی محرک کہلانے کا مستحق ہے یعنی اپنے اصل منصب ومقام کا شعور اور اس مقام سے گر جانے کا احساس اور اس پر جذبۂ افسوس وندامت ـــ اس نئی بیداری کا اصل محرک درحقیقت وہ اضطراب و بے چینی ہی ہے جو یہاں کے حالات نے ان کے اندر پیدا کر دی ہے اور ان میں بھی وہ حالات خاص طور سے اس کے موجب بن رہے ہیں جو ان کی عزت وخودداری کو مجروح یا ان کے وجود وبقا کو اور ان کی معاشی حالت

کو متاثر کرنے والے ہیں"

یہ ایک اہم ترین پہلو ہے جس کی طرف مولانا نے بروقت توجہ کیا ہے۔ ہم مسلمان عرصہ دراز سے اپنے مقصد وجود اور اس دنیا میں اپنی صحیح پوزیشن کو بھولے ہوئے ہیں۔ ہمیں یہ بات یاد نہیں رہی کہ اسلام نے ہم پر کچھ اجتماعی فرائض بھی عائد کیے ہیں یا نہیں؟ اسلامی اجتماعیت کیا ہے اور اسلامی تنظیم کن بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔ اللہ و رسول ہم سے کس اخلاق و کردار کا مطالبہ کرتے ہیں اور اسلام کو سربلند کرنے یا رکھنے کے لیے وہ ہمیں کس بات کا مکلف گردانتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم میں جب کبھی اپنے کچھ حقوق و مسائل کے تعلق سے بیداری و حرکت پیدا ہوتی ہے تو اس کا رنگ ڈھنگ دوسری قوموں کے رنگ ڈھنگ سے مختلف نہیں ہوتا۔ ہم میں نہ خدا کی طرف رجوع کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، نہ گناہوں سے توبہ کی توفیق ملتی ہے۔ نہ اسلامی فرائض و واجبات کی انجام دہی میں چستی پیدا ہوتی ہے، نہ ہمارے اخلاق سنورتے ہیں اور نہ ہم میں اسلامی اتحاد کا استحکام پیدا ہوتا ہے۔ جس چیز کے لیے ہم اٹھتے ہیں وہ حاصل ہو یا نہ ہو ہر دو حال میں ہمارا عارضی جوش و خروش جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا ہے اور اسلامی نقطہ نظر سے ہم پہلے سے بھی زیادہ پست حال ہو جاتے ہیں۔ ہر کھلی آنکھ ایک عرصے سے یہ منظر دیکھتی چلی آ رہی ہے۔ ہندوستان کے موجودہ حالات میں اگر ہم مزید تباہی سے بچنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی اس روش کو بدلنا ہوگا۔ نئی بیداری مبارک لیکن اس کو فی الواقع اسلامی بیداری بنائیے۔ یہی ہمارے مسائل کا صحیح اور پائدار حل ہے۔

مسلم مجلس مشاورت کی صحیح پوزیشن بتاتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:۔

بہت سے لوگوں نے یہ خیال قائم کرلیا ہے کہ مسلم مجلس مشاورت، سیاست میں کوئی سرگرم حصہ لینے کا فیصلہ کر چکی ہے اور اس سلسلے میں جو عملی دشواریاں ہیں ان کو وہ اپنے طور سے کسی نہ کسی طرح حل کر چکی ہے اور اسی کے مطابق وہ الکشن میں مسلمانوں کو رہنمائی دینا چاہتی ہے۔ خاص طور سے اس بارے میں کہ وہ آئندہ الکشن میں کس پارٹی کا ساتھ دیں۔ مسلم مجلس مشاورت کے ساتھ مسلمانوں کے حسن ظن کا تو میں دل سے خیر مقدم کروں گا۔ لیکن میرے اپنے خیال کے مطابق اس کے بارے میں کوئی ایسی رائے قائم کر لینا جو واقعہ کے خلاف ہو نہ مجلس کے لیے مفید ہو سکتا ہے اور نہ رائے قائم کرنے والوں کے لیے ....

میں اس خواہش میں کسی سے پیچھے نہیں ہوں کہ مسلم مجلس مشاورت کا ایک مستحکم وفاق بنے جو خود الکشن

کے بارے میں مسلمانوں کی پوری رہنمائی کر سکے کہ انہیں ملک و ملت کے مفاد کے لیے کیا کرنا ہے
[illegible] بارے میں کسی کو غلط فہمی میں نہ رہنا چاہیے کہ ابھی اس طرح کا کوئی وفاق وجود میں نہیں
آ سکا ہے اور مجلس مشاورت کے نام سے جو تنظیم وجود میں آئی ہے وہ مسلمانوں کی بہترین خواہشات
اور تمناؤں کے باوجود ابھی اپنے استحکام کی نہایت ابتدائی منزلیں طے کر رہی ہے ۔

(سہ روزہ دعوت ۲۰ اگست ۶۶ء)

مولانا کی یہ تنبیہ بھی بروقت ہے۔ اگر مسلمانوں نے مسلم مجلس مشاورت سے غلط توقعات قائم کر لیں
اور وہ پوری نہ ہوئیں تو اس کا رد عمل بہت مضر ہوگا۔ ابھی مجلس نے صرف نو نکاتی منشور پر اتفاق کیا
ہے۔ آگے کی کوئی بات اس نے طے نہیں کی ہے۔ اس لیے بطور خود کسی بات کو طے شدہ سمجھ لینا صحیح نہ ہوگا

اپنے حقوق و مسائل کو حل کرنے کے لیے جزوی طور پر الکشن کو مفید بنایا جا سکتا ہے۔ اس سے ہمیں انکار
نہیں ہے لیکن الکشن نہ کوئی واحد حل ہے اور نہ کلی طور پر قابل اعتماد حل ہے اس لیے مسلمانوں کو سوچنا چاہیے
کہ خیر امت ہونے کی جہت سے ان کے مسائل کیا ہیں اور انہیں حل کرنے کی کیا تدابیر ہو سکتی ہیں اور جس
ذات نے خیر امت کا لقب دیا ہے اس نے امت مسلمہ کی عزت و قوت اور سربلندی و سرافرازی کا کوئی
طریقہ بتایا ہے یا نہیں؟ اگر بتایا ہے اور یقیناً بتایا ہے تو وہ طریقہ کیا ہے؟ محترم مولانا ابو اللیث
صاحب نے اس سوال پر بھی اپنے ایک مضمون میں روشنی ڈالی ہے۔ اس کو بھی توجہ سے پڑھنے کی ضرورت
ہے۔ ہم یہاں دو تین اقتباسات پر اکتفا کرتے ہیں:

مایوسی یوں بھی کفر ہے اور ہندوستان کے موجودہ حالات میں بھی اسلام اور مسلمانوں کے
مستقبل کی طرف سے مایوس ہو جانے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی ہے بلکہ اس کے برعکس ان دونوں کا
مستقبل نہایت شاندار ہو سکتا ہے بشرطیکہ وہ اپنی موجودہ مشکلات و مسائل کا کوئی فوری اور
وقتی حل تلاش کر کے صرف ان پر تکیہ نہ کر لیں بلکہ ان کا مستقل حل جس کی رہنمائی خود ان کا دین کرتا ہے
معلوم کریں اور پھر اسے پورے عزم اور مستقل مزاجی کے ساتھ اختیار کریں اور ہو سکے تو اپنے دین ہی
کی روشنی میں اپنی موجودہ حالت تک پہنچنے کے اسباب کی بھی تحقیق کریں اس سے آئندہ کے لیے
انہیں بہت کچھ سبق حاصل ہو سکتا ہے۔ (سہ روزہ دعوت یکم ستمبر ۶۶ء)

شرکت اور مضاربت کے شرعی اصول

(۳)

جناب نجات اللہ صدیقی، شعبۂ معاشیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

ذاتی حیثیت میں کسی نئے فریق کے ساتھ شرکت کا اختیار

تمام شرکار کی جانب سے کسی نئے فریق کے ساتھ شرکت یا مضاربت کا معاہدہ کرنے کے اختیار کی دلیل میں کسی فقہی سند کی ضرورت نہیں۔ اوپر یہ بتایا جا چکا ہے کہ شرکت یا مضاربت کا معاہدہ ایک فرد کی جانب سے بھی کیا جا سکتا ہے اور چند افراد مل کر بھی ایسا کر سکتے ہیں۔

ذیل میں جو فقہی عبارتیں نقل کی جائیں گی ان کا تعلق اس صورت سے ہے جب ایک شریک مشترکہ کاروبار سے علیحدہ ایک نئے کاروبار کے لیے شرکت یا مضاربت کے اصول پر سرمایہ حاصل کرتا ہے۔ حنفی محقق کاسانی لکھتے ہیں کہ شرکتِ عنان میں ایک شریک کو:

> یہ اختیار نہیں حاصل ہے کہ وہ کسی دوسرے فریق کے ساتھ شرکت کا معاہدہ کرے الا یہ کہ اسے (دوسرے شرکار کی جانب سے) اس کی اجازت ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی معاہدہ کے تحت اسی پایہ کا معاہدہ کرنے کا اختیار خود بخود نہیں حاصل ہو جاتا[1]۔

> یہ اس صورت کا حکم ہے جب ہر شریک نے دوسرے سے یہ نہ کہا ہو کہ تم اپنی صوابدید کے مطابق کاروبار کر سکتے ہو۔ اگر وہ ایک دوسرے سے ایسا کہہ دیں تو دونوں شرکار میں سے ہر ایک کے لیے کاروبار کے اموال کو لے کر سفر کرنا، مضاربت اور شرکت کے معاہدے دوسروں کے ساتھ کرنا اور شرکت کے مال کو اپنے نجی مال میں ملانا اور رہن رکھنا یا رہن کے طور پر کسی چیز کو حاصل کرنا

[1] کاسانی، بدائع الصنائع جلد ۶ ص ۷۱

جائز ہو جائے گا۔[1]

شریک کے کاروباری اختیارات بیان کرتے ہوئے ایک مالکی فقیہ لکھتے ہیں :۔

"اسے یہ اختیار ہے کہ کسی غیر شریک کے ساتھ کسی متعین کام میں شرکت کا معاہدہ کرے اس طور پر کہ اس فریق کو شرکت کے سرمایے پر کوئی تصرف نہ حاصل ہو......"[2]

شافعی اور حنبلی فقہ کے جن مآخذ سے ہم نے استفادہ کیا ہے ان میں اس مسئلے کے ضمن میں کوئی صراحت نہ مل سکی۔ جیسا کہ اگلی بحث میں واضح کیا جائے گا۔ بعض حنبلی فقہاء کے نزدیک مضاربت میں کاروباری فریق کو صاحب سرمایہ کی اجازت کے بغیر نیا معاہدۂ مضاربت کرنے کا اختیار صرف اسی صورت میں ہے جب اس نئے کاروبار میں اس کی مصروفیت پہلے کاروبار کے لیے نقصان دہ نہ ہو۔[3] چونکہ حنبلی کتب فقہ میں مضاربت اور شرکت عنان میں کاروباری تصرفات سے متعلق احکام میں کوئی فرق نہیں اس لیے یہ رائے قائم کرنا درست ہوگا کہ شرکت کی صورت میں بھی ان کی رائے یہی ہے۔ اکثر حنبلی فقہاء کے نزدیک ہر شریک کو اپنی ذاتی حیثیت میں کسی نئے کاروبار میں شرکت کا اختیار حاصل ہے۔ البتہ بعض حنبلی فقہاء کے نزدیک اگر نئے کاروبار میں اس کی مصروفیت پہلے مشترکہ کاروبار کے لیے نقصان دہ ہو سکتی ہو تو دوسرے شرکاء کی اجازت کے بغیر اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ شافعی مکتب فقہ کا عام مزاج بھی اسی موقف کے حق میں ہے۔ کسی مکتب فقہ کو اس سے اختلاف نہ ہوگا کہ اگر دوسرے شرکاء اجازت دیں تو ایک شریک کو اپنی ذاتی حیثیت میں کسی دوسرے مشترکہ کاروبار میں شرکت کا اختیار رہے گا۔

ہمارے نزدیک صحیح موقف یہ ہے کہ جب تک دوسرے شرکاء کسی شریک کو منع نہ کریں اسے دوسرے افراد کے ساتھ اپنی ذاتی حیثیت میں شرکت کے نئے معاہدے کرنے کا پورا اختیار حاصل ہے۔ حنفی اور مالکی فقہاء کا جو مسلک اوپر نقل کیا جا چکا ہے وہ اس کی تائید کرتا ہے اور اس میں اس مصلحت کا بھی لحاظ کیا گیا ہے جس کے تحفظ کے لیے بعض حنبلی فقہاء بعض حالات میں اجازت ضروری قرار دیتے ہیں۔ یہی موقف اس اصول کے مطابق بھی اختیار کیا جانا چاہیے کہ کوئی معاہدہ معاہدہ کرنے والوں کو ان کی اس آزادیٔ کاروبار سے نہیں محروم کر سکتا جو اس معاہدے کے دائرے کے باہر انھیں حاصل ہیں۔ اگر مشترکہ کاروبار میں شرکاء کی

---

[1] کاسانی: بدائع الصنائع جلد ۶ ص۷۲

[2] احمد الدردیر: الشرح الصغیر جلد ۲ ص۱۵۶

[3] ابن قدامہ: المغنی۔ جلد ۵ ص۱۶۳

کاروباری ذمہ داریاں معلوم اور متعین ہوں تو یہ شبہ بھی کمزور پڑ جاتا ہے کہ ایک شریک کی کسی نئے کاروبار میں شرکت پہلے مشترکہ کاروبار میں اس کی جدوجہد کو متاثر کرے گی۔

اگر دوسرے شرکار کو اس بات پر اصرار ہے کہ ان کے ایک شریک کی کسی نئے کاروبار میں شرکت ان کے مشترکہ کاروبار کے لیے مضر ہوگی تو اس شریک کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا کہ وہ یا تو اس شرکت سے علیحدگی اختیار کرلے یا نئے کاروبار میں شرکت کا ارادہ ترک کردے۔

مضاربت کے طور پر سرمایہ حاصل کرکے ذاتی کاروبار

احناف کے نزدیک ہر شریک کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ دوسرے افراد سے مضاربت کے اصول پر سرمایہ حاصل کرکے اس سے ذاتی کاروبار کرے۔ ایسا کرنے کے لیے وہ دوسرے شرکار کی اجازت کا محتاج نہیں

"اسے یہ حق حاصل ہے کہ مضاربت پر مال حاصل کرے۔ اس مال کا نفع اسی کے لیے مخصوص ہوگا۔ کیونکہ مضاربت پر مال حاصل کرنے والے کو نفع اس کے کاروباری عمل کی بنا پر ملتا ہے لہذا یہ نفع اسی کا ہوگا۔ جیسے اس صورت میں جب یہ شخص کسی دوسرے کا کام اجرت کے عوض کرے (یہ اجرت اسی کو ملے گی اس میں شرکار کا حصہ نہ ہوگا"[1]

اس بات کی توجیہ کہ مضاربت پر مال حاصل کرکے کاروبار کرنے کا اختیار دوسرے شرکار کی اجازت کا محتاج نہیں اگرچہ شرکت کرنے کے لیے اجازت درکار ہے، سرخسی نے کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

شرکت اور مضاربت کے درمیان اس تفریق کا سبب یہ ہے کہ کسی معاہدے سے خود بخود یہ اختیار حاصل ہو جاتا ہے کہ اس سے کم درجے کے معاہدے کیے جاسکیں۔ کسی چیز کے تحت وہی چیز داخل ہوسکتی ہے جو اس سے کم درجے کی ہو، نہ کہ وہ جو اس سے اونچے درجے کی ہو۔ مضاربت کا درجہ شرکت سے کم ہے۔"[2]

مالکی فقہاء کے نزدیک بھی مضاربت کرنے کے لیے شرکار کی اجازت حاصل کرنا صرف بعض مخصوص حالات میں ضروری ہے۔

"دونوں شرکار میں سے جو بھی مضاربت پر سرمایہ حاصل کرے یعنی کسی سے اس شرط پر

---

[1] کاسانی: بدائع الصنائع۔ جلد ۶۔ ص ۹۹

[2] سرخسی: المبسوط، جلد ۱۱ ص ۱۷۹

سرمایہ حاصل کرے کہ اس کے ذریعے مضاربت کے طور پر کاروبار کرے گا۔ یعنی کسی سے اس شرط پر سرمایہ حاصل کرے کہ اس کے ذریعے مضاربت کے طور پر کاروبار کرے گا۔ اس نفع کے عوض جو صاحب سرمایہ نے اسے دینا طے کیا ہو، وہ شریک اس سرمایہ کا خود ہی ذمہ دار رہو گا خواہ یہ اقدام اس نے اپنے شریک کی اجازت سے کیا ہو۔ کیونکہ مضاربت کا یہ سرمایہ شرکت سے باہر ہے۔ ایسا کرنا ہر شریک کے لیے جائز ہو گا۔ اگر دوسرا شریک ایسا کرنے کی اجازت دے دے یا کاروبار مضاربت میں اس کی مشغولیت کاروبار شرکت میں مخل نہ ہو۔[1]

جیسا کہ دردیر کے شارح شیخ احمد الصاوی نے واضح کر دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کاروبار مضاربت میں مشغولیت کاروبار شرکت میں مخل نہ ہو تو ایک شریک دوسرے شریک کی اجازت کے بغیر بھی مضاربت پر سرمایہ حاصل کر کے نیا کاروبار شروع کر سکتا ہے۔[2]

اگرچہ حنبلی مآخذ میں اس ذیل میں بھی کوئی صراحت نہیں مل سکی ہے لیکن یہ کہنا درست ہو گا کہ اس مسئلے میں بھی ان کی رائے وہی ہے جو اوپر شرکت کے سلسلے میں بیان کی گئی ہے۔ شافعی مکتب فقہ کے جن مآخذ سے ہم نے استفادہ کیا ہے ان میں بھی کوئی صراحت نہ مل سکی۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر دوسرے شرکاء اجازت دیں تو، ہر مکتب فقہ کے نزدیک ایک شریک کو کسی نئے شریک سے مضاربت کے اصول پہ سرمایہ حاصل کر کے کاروبار کرنے کا اختیار رہو گا۔ البتہ اگر شرکاء کو یہ اصرار ہو کہ یہ نیا کاروبار اس شریک کی اس کاروباری جدوجہد پر برا اثر ڈالے گا جو اسے مشترکہ کاروبار کے لیے انجام دینی چاہیے اور اس بنیاد پر وہ اسے ایسا کرنے سے منع کریں تو اسے یا تو اس اقدام سے باز آنا ہو گا، یا مشترکہ کاروبار سے علیحدگی اختیار کرنی ہو گی۔

اگر ایک شریک اس سرمایے کے علاوہ جو معاہدہ شرکت کے وقت اس نے مشترکہ کاروبار میں لگایا تھا۔ اس کاروبار میں مزید ذاتی سرمایہ لگانا چاہے تو ظاہر ہے کہ اس کی نوعیت مشترکہ سرمایے میں اس شریک کے حصے میں اضافے کی ہو گی۔ ایسا تمام شرکاء کی اجازت سے ہی کیا جا سکے گا۔ یہ کوئی قابل بحث مسئلہ نہیں کیونکہ اس کا حکم بالکل واضح ہے۔ اگر دوسرے شرکاء اس بات پر راضی ہوں کہ ایک شریک مزید سرمایہ

---

[1] احمد الدردیر: الشرح الصغیر، جلد ۲ ص۴۵۱

[2] شیخ احمد الصاوی: بلغۃ السالک لاقرب المسالک، جلد ۲ ص۴۵۱

لگانے اور سرمایہ میں اس اضافے کی روشنی میں نفع کی تقسیم کے طے شدہ اصول یا کسی نئے اصول پر سب کا اتفاق ہو تو ایسا کیا جا سکے گا۔

مشترکہ سرمایہ کو شرکت کے اصول پر دینے کا اختیار

کیا ایک شریک شرکت کے سرمایے کے ایک حصے کو کسی نئے فریق کے ساتھ اس کے کاروبار میں شرکت کے لیے استعمال کر سکتا ہے؟ یہ مسئلہ ان مسائل سے مختلف ہے جن پر اوپر گفتگو کی جا چکی ہے۔ اکثر فقہاء کے نزدیک کوئی شریک دوسرے شرکاء کی اجازت کے بغیر یہ اقدام نہیں کر سکتا۔ البتہ مالکی فقہاء کے نزدیک چند شرائط کے ساتھ ہر شریک یہ اقدام کر سکتا ہے۔ دوسرے شرکاء کی اجازت ضروری نہیں ان کا مسلک ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

"اسے یہ اختیار حاصل ہے کہ سرمایہ کے کسی حصے کی حد تک شرکت مفاوضت یا شرکت عنان کے اصول پر کسی دوسرے فریق کے ساتھ معاہدہ کرے۔ اس طور پر کہ اس نئے شریک کو صرف اس کام کا حق حاصل ہو جو اس نے متعین کر دیا ہو۔ اگر یہ نیا فریق پہلے شریک کی اجازت کے بغیر کاروبار کے جملہ اموال میں تصرف کرنے لگے تو یہ درست نہ ہوگا۔" [1]

"اسے یہ اختیار ہے کہ کسی متعین کام میں کسی اجنبی کے ساتھ شرکت کا معاہدہ کرے۔ اس طور پر کہ اس اجنبی کو پہلے مشترکہ کاروبار میں دخل نہ حاصل ہو۔" [2]

حنبلی فقہاء کے نزدیک دوسرے شرکاء کی اجازت کے بغیر ایسا نہیں کیا جا سکتا۔

"اسے یہ اختیار نہیں کہ شرکت کے سرمایہ کے ذریعے کسی دوسرے کے ساتھ شرکت کا معاہدہ کرے نہ یہ اختیار ہے کہ اس سرمایہ کو مضاربت کے طور پر کسی دوسرے کو دے۔ کیونکہ ایسا کرنے سے اس سرمایہ میں نئے حقوق واجب ہوتے ہیں اور اس کے نفع میں دوسروں کا حق ہو جاتا ہے۔ ایک شریک کو اس طرح کے حقوق لازم کرنے کا اختیار نہیں ......" [3]

اور اگر دوسرا شریک اس سے یہ کہہ دے کہ اپنی رائے کے مطابق کاروبار کرو تو اس کے لیے

---

[1] عبدالرحمٰن الجزیری، کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ جلد ۳ ص ۷۱

[2] احمد الدردیر: الشرح الصغیر۔ جلد ۲ ص ۱۶۹

[3] ابن قدامہ: المغنی جلد ۵ ص ۱۳

جملہ کاروباری تصرفات جائز ہو جائیں گے یعنی کسی سے بلامعاوضہ کاروبار کرانا اس سرمایہ کو مضاربت کے طور پر دینا، اس کے ذریعے شرکت کرنا، اس کو اپنے سرمایہ میں ملا کر کاروبار کرنا اس کو لے کر سفر کرنا، اس کو امانت کے طور پر رکھنا اور ادھار فروخت کرنا ......" [1]

حنفی فقہار کے نزدیک بھی کوئی شریک دوسرے شرکار کی اجازت کے بغیر شرکت کے سرمایہ سے کسی نئے فریق کے ساتھ شرکت کا معاہدہ نہیں کر سکتا کیونکہ ان کے نزدیک شرکت کا معاہدہ ہر شریک کو دوسرے افراد سے صرف ایسے معاہدے کرنے کا حق دیتا ہے جو شرکت سے کم پایہ کے ہوں۔ شرکت کرنے کا حق نہیں دیتا۔ [2]

شافعی فقہ کے جن ماخذ کا ہم نے مطالعہ کیا ہے ان میں اس مسئلے کے بارے میں کوئی صریح بیان نہ مل سکا۔

جن فقہائے نے دوسرے شرکار کی اجازت کے بغیر یہ اختیار نہیں دیا ہے کہ ایک شریک مشترکہ سرمایہ کے ایک حصے سے کسی نئے فریق کے ساتھ شرکت کا معاہدہ کرے ان کی رائے اسی دلیل پر مبنی ہے جو ابن قدامہ نے دی ہے۔ مالکی فقہار نے چند شرائط کے ساتھ یہ اختیار اس لیے دیا ہے کہ شرکت میں ہر شریک کو ایسے کاروبار کا حق حاصل ہے جو نفع آور ہو، اور کسی نئے فریق کے ساتھ شرکت کا معاہدہ بھی نفع کمانے کے لیے ہی کیا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ دلیل بھی وزنی ہے لیکن ہم آئندہ مباحث میں وہی موقف اختیار کریں گے جو ابن قدامہ نے اختیار کیا ہے شرکار کے درمیان نزاع کا سدباب کرنے اور مشترکہ کاروبار کے مفادات و مصالح کے تحفظ کے لیے یہ طریقہ زیادہ موزوں ہوگا کہ مشترکہ سرمایہ کے ذریعے کسی نئے فریق کے ساتھ شرکت کرنے سے پہلے ایک شریک کے لیے دوسرے شرکار کی اجازت حاصل کرنا ضروری قرار دیا جائے۔ خواہ یہ اجازت عام ہو یا خصوصی طور پر ہر ایسے اقدام کے لئے علیحدہ سے حاصل کی جائے۔

جہاں تک اس نئی شرکت کے ذریعے حاصل ہونے والے نفع یا اس میں ہونے والے خسارے کا سوال ہے تمام فقہار اس امر پر متفق ہیں وہ اصل شرکت کے حساب میں داخل سمجھا جائے گا جس کے سرمایہ کو اس نئی شرکت میں لگایا گیا ہے۔

مشترکہ سرمایے کو مضاربت کے طور پر دینے کا اختیار

احناف کے نزدیک ہر شریک کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ شرکت کے سرمایے کا ایک حصہ کسی دوسرے فریق کو مضاربت کے اصول پر کاروبار کے لیے دے۔ کاروباری فریق سے جو نفع حاصل ہوگا وہ مشترکہ

---

[1] ابن قدامہ: المغنی جلد ۵ صفحہ ۱۳۲

[2] سرخسی: المبسوط جلد ۱۱ صفحہ ۱۷۶

کا نفع متصور ہوگا اور اگر نقصان ہوا تو وہ بھی مشترکہ کاروبار کے سرمایے میں ہوگا۔ یہ اختیار دوسرے شرکاء کی اجازت کا پابند نہیں، البتہ وہ کسی شریک کو ایسا کرنے سے روک سکتے ہیں۔ کیونکہ ہر شریک دوسرے شرکاء کا وکیل ہے اور وکیل کو متعین تصرفات سے روکا جا سکتا ہے۔

"ہر شریک کو یہ حق حاصل ہے کہ ..... سرمایہ کو مضاربت کے اصول پر دوسروں کو دے کیونکہ مضاربت شرکت سے نچلے درجے کا معاہدہ ہے لہذا معاہدۂ شرکت میں خود بخود ایسا کرنے کی اجازت مضمر ہے۔"[1]

"ابو حنیفہ نے کہا ہے کہ شرکت عنان میں ہر شریک کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ .... شرکت کے سرمایے کو مضاربت کے اصول پر دوسروں کو دے۔ اگرچہ اس کے شریک نے اسے ایسا کرنے کی اجازت نہ دی ہو۔"[2]

مالکی فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ

"اسے یہ حق حاصل ہے کہ (شرکت کے) سرمایے کا ایک حصہ کسی فریق کو مضاربت کے اصول پر دے، بشرطیکہ سرمایہ اتنا زیادہ ہو کہ ایسا کرنے کی گنجائش ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو اسے اپنے شریک کی اجازت کے بغیر ایسا کرنے کا حق نہ ہوگا۔"[3]

"وہ مضاربت کر سکتا ہے اس طور پر کہ سرمایہ کو دوسرے فریق کو بطور مضاربت دے، بشرطیکہ سرمایہ میں اتنی گنجائش ہو، ورنہ وہ ایسا نہیں کرے گا ......"[4]

جیسا کہ ابن قدامہ کی مذکورہ بالا عبارت سے واضح ہے حنبلی مکتب فقہ کے نزدیک کسی شریک کو دوسرے شرکاء کی اجازت کے بغیر یہ اختیار نہیں کہ وہ شرکت کے سرمایہ میں سے ایک حصہ مضاربت کے طور پر دے سکے۔ البتہ ایسے اقدام کی مخصوص طور پر اجازت حاصل کرنا ضروری نہیں بلکہ کاروباری تصرفات کی عام اجازت

---

[1] مرغینانی: ہدایہ۔ جلد ۲ کتاب الشرکۃ

[2] سرخسی:۔ المبسوط جلد ۱۱ ص۱۷۵۔ نیز ملاحظہ ہو۔
کاسانی: بدائع الصنائع جلد ۶ ص۶۹

[3] عبدالرحمٰن الجزیری۔ الفقہ علی المذاہب الاربعہ جلد ۳ ص۱۱۷

[4] احمد الدردیر: الشرح الصغیر جلد ۳ ص۱۵۶

کافی ہے۔ [1]

شافعی مسلک کی وضاحت میں ہمیں اس سے زیادہ صراحت نہ مل سکی کہ ہر شریک کو ایسے تصرفات کا حق حاصل ہے جو مشترکہ کاروبار کی مصلحت کے مطابق ہوں۔

اس مسئلے کے ضمن میں بھی ہمارا موقف وہی ہے جو ہم نے شرکت کے سلسلے میں اختیار کیا ہے یعنی ایک شریک شرکت کے سرمایہ کو مضاربت کے طور پر کسی دوسرے فریق کو اسی وقت دے سکتا ہے جب اسے اپنے شرکا سے ایسا کرنے کی عام یا مخصوص اجازت مل چکی ہو۔ اگر وہ اسے ایسا کرنے سے روکنا چاہیں تو روک سکتے ہیں۔ اس موقف کو اختیار کرنے کا سبب وہی ہے جس کا ذکر ہم نے اوپر شریک کے شرکت کرنے کے حق کے سلسلے میں کیا ہے۔ یعنی شرکا کے درمیان باہمی نزاعات کا سدباب اور مشترکہ کاروبار کے مفادات کا تحفظ۔

مذکورہ بالا مسائل کے ضمن میں ہمارے مختار مسلک کے مطابق اگر شرکت کا معاہدہ کرتے وقت شرکا نے ایک دوسرے کو جملہ کاروباری تصرفات کی اجازت دی ہو تو ہر شریک کو دوسرے افراد سے شرکت یا مضاربت کے معاہدے کرنے کا اختیار حاصل ہو جائے گا۔ الگ سے ان اقدامات کی اجازت حاصل کرنا ضروری نہ ہوگا۔ اگر معاہدہ میں یہ اجازت عام نہ شامل ہو تو ہر ایسے اقدام سے پہلے تمام شرکا کی اجازت ضروری ہوگی۔

شرکت کا معاہدہ کرتے وقت شرکا ایک دوسرے کی کاروباری صلاحیتوں پر نظر ڈالتے ہیں اور ان کے بارے میں ان کا اعتماد اس بات کا محرک بنتا ہے کہ وہ مشترکہ کاروبار کریں۔ مضاربت یا شرکت کے ذریعے مشترکہ سرمایہ کے ایک حصے کو کسی دوسرے کاروباری فریق کے تصرف میں دینا ایک ایسا فیصلہ ہے جو اس کاروباری فریق کی صلاحیتوں پر اعتماد کی بنیاد پر ہی کیا جا سکتا ہے۔ اگر معاہدۂ شرکت عام اجازت کے ساتھ کیا گیا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر شریک کو دوسرے کی کاروباری صلاحیتوں پر بھروسے کے ساتھ اس بات پر بھی اعتماد ہے کہ وہ مضاربت اور شرکت کے لیے نئے کاروباری فریقوں کا اچھا انتخاب بھی کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اگر معاہدہ اس اجازت عام کے ساتھ نہیں کیا گیا ہے تو اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شرکا ایک دوسرے پر اس درجہ اعتماد کے لیے تیار نہیں۔ ایسی صورت میں ضروری ہے کہ

---

[1] ابن قدامہ: المغنی - جلد ۵ صفحہ ۱۳۲

مشترکہ سرمایہ کو کسی نئے کاروباری فریق کے زیر تصرف دینے سے پہلے تمام شرکاء اس کی کاروباری صلاحیتوں کے بارے میں اطمینان کرلیں کیونکہ اس کی کامیابی دنا کامی ہر شریک کے مفادات پر اثر انداز ہوگی۔

مشترکہ سرمایہ کو ذاتی سرمایہ کے ساتھ ملا کر کاروبار کرنا

اگر ایک شریک مشترکہ کاروبار کے علاوہ کچھ ذاتی کاروبار بھی کر رہا ہے تو یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا اسے دونوں کاروباری سرمایوں کو ملانے اور بسا اوقات دونوں کاروباروں کو ملا جلا کر کرنے کا اختیار ہوگا۔ فقہاء کی تصریحات کی روشنی میں اس سوال کا جواب بھی یہی ہے کہ دوسرے شرکاء کی عام اجازت، یا مخصوص طور پر ایسا کرنے کی اجازت کے بغیر کسی شریک کو یہ اختیار نہیں کہ وہ مشترکہ کاروبار کو اپنے ذاتی کاروبار میں ملائے۔ باہمی نزاع سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ عام طور پر بھی کاروبار اور مشترکہ کاروبار کو علیحدہ رکھا جائے۔ لیکن چونکہ بعض اوقات عملاً ایسا کرنا دشوار ہو سکتا ہے، یا ملا جلا کر کاروبار کرنے میں مشترکہ کاروبار اور ذاتی کاروبار دونوں کو بعض اخراجات کاروبار میں کفایت ہو سکتی ہے لہٰذا اجازت کے ساتھ ایسا کرنے کی گنجائش بھی رہنی چاہیے۔

اسی بحث میں کاسانی[1] اور ابن قدامہ[2] کے حوالے سے جو عبارتیں نقل کی جا چکی ہیں وہ مذکورہ بالا بیان کی تائید کرتی ہیں۔ مالکی فقہاء نے مضاربت کی بحث میں یہ صراحت کی ہے کہ کاروباری فریق کو مضاربت سرمایہ اپنے ذاتی سرمایہ میں ملانے اور دونوں کاروباروں کو ملا جلا کر کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ اس کے لیے مالک کی اجازت ضروری نہیں۔[3]

شرکت کی بحث میں اس ضمن میں ہمیں کوئی صراحت نہ مل سکی۔ قیاس یہی ہے کہ اس صورت میں بھی ان کی رائے یہی ہوگی۔ شافعی فقہ کے جن مآخذ کا ہم نے مطالعہ کیا ہے ان میں بھی اس مسئلے کے ضمن میں کوئی صراحت نہ مل سکی۔

اس پوری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر شرکت کا معاہدہ کرتے وقت تمام شرکاء ایک دوسرے کو جملہ کاروباری تصرفات کی اجازت دے دیں تو ہر شریک کے لیے یہ ممکن ہوگا کہ وہ دوسرے افراد کے ساتھ

---

[1] بدائع الصنائع جلد ۶ ص ۷۔ اسی صفحے پر کاسانی نے اس امر کی صراحت بھی کر دی ہے کہ دوسرے شرکاء کی اجازت کے بغیر کسی شریک کو مال اپنے نجی مال میں ملانے کا حق نہیں حاصل ہے۔

[2] المغنی جلد ۵ ص ۱۳۱

[3] احمد الدردیر: الشرح الصغیر جلد ۲ ص ۲۴۹

ور مضاربت کے اصول پر مزید سرمایہ حاصل کرکے مشترکہ کاروبار میں لگائے اور مشترکہ سرمایہ کے ذریعے دیگر افراد کے ساتھ شرکت اور مضاربت کے معاہدے کرے۔ اس اجازت کے باوجود شرکا کسی ایک شریک کو کسی ایسے اقدام سے روک سکتے ہیں جو ان کے نزدیک مشترکہ کاروبار کے لیے مضر ہو۔ عام اجازت کی عدم موجودگی میں ہر شریک کو مذکورہ بالا اقدامات سے پہلے دوسرے شرکا کی اجازت حاصل کرنی ہوگی۔

کاروباری فریق کے تصرفات

۶۔ مضاربت کے معاہدے کے تحت سرمایہ حاصل کرکے کاروبار کرنے والا فریق سرمایہ کے مالک کی اجازت عام کے تحت، یا مخصوص طور پر اس امر کی اجازت حاصل کرکے، کاروبار مضاربت میں اپنا ذاتی سرمایہ بھی شامل کرسکتا ہے، اور دوسرے افراد سے مضاربت یا شرکت کے معاہدے کے تحت مزید سرمایہ حاصل کرکے بھی کام میں لاسکتا ہے۔ اسے یہ حق بھی حاصل ہے کہ مالک کی اجازت سے مضاربت کے مال کو کسی دوسرے فریق کو مضاربت کے معاہدے کے تحت کاروبار کے لیے دے یا اس مال کے ذریعے کسی دوسرے کے ساتھ شرکت کا معاہدہ کرے۔

مذکورہ بالا احکام پر چاروں مکاتب فقہ کا اتفاق ہے۔ البتہ ایک روایت کے مطابق شافعی مسلک یہ ہے کہ مالک کی اجازت کے بعد بھی کاروباری فریق دوسرے افراد کے ساتھ شرکت نہیں کرسکتا نہ مضاربت کے سرمایہ کو مضاربت کے اصول پر کسی دوسرے فریق کو دے سکتا ہے۔ مختلف مکاتب فقہ کے مسلک کے مستند بیانات درج ذیل ہیں۔

حنفی مسلک یہ ہے کہ کاروباری فریق کو مضاربت کا سرمایہ اپنے سرمایے میں ملاکر کاروبار کرنے یا مضاربت کے طور پر دینے یا شرکت کے لیے استعمال کرنے کا اختیار سرمایہ کے مالک کی اجازت کے بغیر نہیں مل سکتا۔

"تصرفات کی اس قسم میں جس کا اختیار مضاربت پر سرمایہ حاصل کرکے کاروبار کرنے والے کو اس سے حاصل ہوجاتا ہے کہ اس سے یہ کہہ دیا جائے کہ تم اپنی صوابدید کے مطابق کام کرو، خواہ صراحت کے ساتھ ان تصرفات کا ذکر نہ آئے۔ مضاربت، شرکت، اور (مضاربت کے سرمایہ کو) اپنے مال میں ملانا شامل ہے۔ اگر صاحب سرمایہ اس سے یہ کہہ دے کہ تم اپنی صوابدید کے مطابق کام کرو .... تو اسے یہ حق حاصل ہوجائے گا کہ مضاربت کا سرمایہ بطور مضاربت

کسی دوسرے کو دے یا مضاربت کے سرمایہ سے کیے جانے والے کاروبار میں کسی دوسرے فریق کو شرکت عنان کی بنیاد پر شریک بنائے، یا مضاربت کے سرمایہ کو اپنے ذاتی سرمایہ میں ملا کر کاروبار کرے ۔"[1]

اس ضمن میں کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ میں یہ صراحت بھی ملتی ہے کہ احناف کے نزدیک :

"اگر کسی ملک میں عام رواج ہو کہ مضاربت پر سرمایہ حاصل کر کے کاروبار کرنے والے اپنا ذاتی مال مضاربت کے مال میں ملا کر کاروبار کرتے ہوں، اور اصحاب سرمایہ ان کے ایسا کرنے پر راضی ہوں تو اسے صاحب سرمایہ کے یہ کہے بغیر بھی اپنا مال ملا کر کاروبار کرنے کا حق ہوگا کہ تم اپنی رائے کے مطابق کاروبار کر سکتے ہو۔ جب صاحب سرمایہ صراحت سے اجازت دے دے تب تو اسے مذکورہ بالا تمام کاموں کا حق حاصل ہو ہی جائے گا ۔"[2]

مالکی فقہاء کے نزدیک بھی کاروباری فریق کو مضاربت کا سرمایہ کسی دوسرے فریق کو مضاربت کے طور پر دینے کا اختیار سرمایہ کے مالک کی اجازت سے ہی مل سکتا ہے ۔

(امام) مالک نے کہا ہے کہ جو شخص کسی سے مضاربت کے طور پر سرمایہ حاصل کرے۔ پھر صاحب سرمایہ کی اجازت کے بغیر اسے کسی دوسرے آدمی کو دے دے تاکہ وہ مضاربت کے طور پر اس کے ذریعے کاروبار کرے تو وہ اس مال کا ضامن (ذمہ دار) ہوگا۔ اگر اس کے کاروبار کے سبب سرمایہ میں گھاٹا ہو گیا تو وہ اس کمی کا ذمہ دار ہوگا ۔ اگر نفع ہوا تو سرمایہ کے مالک کو اس کی طے کردہ شرط کے مطابق نفع میں سے حصہ ملے گا، پھر جس نے عملاً کاروبار کیا ہے اس کو طے شدہ شرط کے مطابق باقی مال میں سے حصہ ملے گا ۔"[3]

البتہ اسے سرمایہ کے مالک کی اجازت کے بغیر یہ اختیار حاصل ہے کہ مضاربت کے سرمایہ کو اپنے ذاتی سرمایہ میں ملا کر کاروبار کرے ۔

---

[1] کاسانی :۔ بدائع الصنائع جلد ۶ ص ۹۵ نیز ملاحظہ ہو۔ ہدایۃ جلد ۳۔ کتاب المضاربت اور المبسوط جلد ۲۲ ص ۱۰۲

[2] عبدالرحمٰن الجزیری : کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ جلد ۳ ص ۴۹

[3] امام مالک : موطا کتاب القراض ۔ باب التعدی فی القراض

"اور اسے یعنی مضاربت کے مال کو (دوسرے مال میں) ملانا جائز ہے۔ کاروباری فریق اسے اپنے ذاتی مال میں ملا کر کاروبار کرے تو بھی جائز ہوگا بشرطیکہ صاحب سرمایہ نے از روئے شرط اس پر ایسا کرنا لازم نہ کر دیا ہو ...... [1]

یہی مصنف ان باتوں کا ذکر کرتے ہوئے، جن کے مالک کی اجازت کے بغیر کرنے سے کاروباری فریق سرمایہ مضاربت کے نقصان کا ذمہ دار قرار پا جائے گا۔ لکھتے ہیں:-

"یا یہ کہ مضاربت کے سرمایے میں کاروباری فریق صاحب سرمایہ کی اجازت کے بغیر کسی دوسرے فریق کو شریک بنالے۔ خواہ یہ دوسرا فرد اس کی مالک کے لیے مضاربت پر کاروبار کر رہا ہو۔ ایسی صورت میں کاروباری فریق ضامن (نقصان کا ذمہ دار) ہوگا۔ کیونکہ سرمایہ کے مالک نے اس سرمایہ کے سلسلے میں کسی دوسرے پر اعتماد نہیں کیا تھا۔

...... یا یہ کہ دوسرے کے ساتھ مضاربت کا معاہدہ کرے۔ یعنی مضاربت پر حاصل کیے ہوئے سرمایہ یا اس کے ایک حصے کو مالک کی اجازت کے بغیر مضاربت کے اصول پر کسی دوسرے فریق کو دے دے تو وہ ضامن قرار پائے گا۔ [2]

کاروباری فریق کو کاروبار مضاربت میں اپنا ذاتی سرمایہ شامل کرنے کے لیے مالک کی اجازت کا پابند نہ کرنے میں مالکی فقہاء نے غالباً اس بات کا لحاظ کیا ہے کہ یہ ایک موزوں تجارتی اقدام ہے اور اس سلسلے میں کاروباری فریق کو صاحب سرمایہ کی اجازت کا پابند بنانا اس کے لیے تنگی پیدا کرنے کے مرادف ہوگا۔ حنفی فقہاء بھی اس کے لیے اس عام اجازت کو کافی سمجھتے ہیں جو کاروباری تصرفات کے سلسلے میں صاحب سرمایہ کاروباری فریق کو عطا کرے گا۔

شافعی مسلک کی وضاحت میں امام غزالی کا بیان یہ ہے کہ

"مضاربت میں کاروباری فریق کو صاحب سرمایہ کی اجازت کے بغیر کسی دوسرے فریق کے ساتھ مضاربت کا معاہدہ کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ صاحب سرمایہ کی اجازت سے ایسا

---

[1] احمد الدردیر: الشرح الصغیر، جلد ۴، ص ۲۳۲

[2] ایضاً ایضاً ص ۲۳۳-۲۳۴

کرنے کے جواز کے بارے میں اختلاف ہے۔[1]

امام نووی نے صراحت کی ہے کہ۔

"اگر کاروباری فریق مالک کی اجازت سے کسی دوسرے فریق کے ساتھ مضاربت کا معاہدہ کرے تاکہ اسے کاروبار میں شریک کرکے نفع میں حصہ دار بنائے تو زیادہ صحیح رائے یہ ہے کہ ایسا کرنا جائز نہ ہوگا۔ اگر مالک کی اجازت کے بغیر ایسا کیا گیا تو (بالاتفاق) معاہدہ فاسد ہو جائے گا"[2]

کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ کا بیان بھی یہی ہے کہ شافعی کتب فقہ میں جس رائے کو ترجیح دی گئی ہے وہ عدم جواز کی رائے ہے۔ صاحب سرمایہ کی اجازت سے بھی کاروباری فریق کو یہ اختیار نہیں حاصل ہوسکتا کہ وہ اس کا دیا ہوا سرمایہ کسی دوسرے فریق کو مضاربت کے معاہدے کے تحت دے۔[3]

لیکن بعض شافعی محققین کے نزدیک کاروباری فریق کو صاحب سرمایہ کی اجازت سے یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ اس سرمایہ کو کسی دوسرے فریق کے ساتھ مضاربت کرنے کے لیے استعمال کرے۔ ابواسحٰق ابراہیم بن علی بن یوسف الفیروزآبادی الشیرازی لکھتے ہیں:۔

"کاروباری فریق کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ صاحب سرمایہ کی اجازت کے بغیر کسی دوسرے فریق کے ساتھ مضاربت کا معاہدہ کرے۔ کیونکہ (سرمایۂ مضاربت میں) اس کا تصرف اجازت پر موقوف ہے اور صاحب سرمایہ نے اسے مضاربت کرنے کی اجازت نہیں دی ہے لہذا اسے اس کا اختیار نہیں۔ اب اگر صاحب سرمایہ نے اس کے ساتھ نصف نفع خود لینے کی شرط پر مضاربت کی ہے اور کاروباری فریق نے کسی دوسرے کے ساتھ مضاربت کرلی اور اس دوسرے فریق نے اپنی ذمہ داری پر اشیاء و اجناس خریدیں اور ان کی قیمت سرمایۂ مضاربت میں سے ادا کی اور نفع کمایا۔ تو (اس نفع کے استحقاق کے بارے میں) ہم ان دو رایوں کی بنیاد پر رائے دیں گے جو اس شخص کے سلسلے میں ظاہر کی گئی ہے جو کوئی رقم غصب کرے۔ پھر اپنی ذمہ داری پر مال خریدے اور اس کے دام غصب کیے ہوئے سرمایہ میں سے ادا کرے اور نفع کمائے۔ اب اگر ہم ان (امام شافعی) کے

---

[1] غزالی: کتاب الوجیز جلد ۱ ص۲۲۴

[2] نووی: منہاج ص۶۵

[3] عبدالرحمٰن الجزیری: کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ جلد ۳ ص۴۸

قدیم قول کے مطابق رائے دیں تو سارا نفع سرمایے کے اصل مالک کا ہوگا۔ اسی مسئلے میں مزنی نے یہ رائے دی ہے کہ صاحب سرمایہ کو آدھا نفع ملے گا اور باقی آدھا دونوں کاروباری فریقوں کے درمیان آدھا آدھا تقسیم پائے گا۔ ہمارے فقہاء اس بارے میں مختلف رائیں رکھتے ہیں۔ ابو اسحٰق کی رائے یہ ہے کہ (مزنی کی) یہ رائے صحیح ہے۔ کیونکہ سرمایہ کا مالک اس پر راضی ہو چکا ہے کہ وہ آدھا نفع لے گا۔ لہٰذا اسے اس سے زیادہ پانے کا حق نہیں۔ باقی آدھا دونوں کاروباری فریقوں کو ملے گا۔ کیونکہ انھوں نے یہ طے کیا تھا کہ جو اللہ دے گا وہ ان دونوں کے درمیان تقسیم پائے گا اور اللہ نے آدھا نفع دیا ہے ...." [1]

آگے چل کر مصنف نے دوسرے شافعی فقہاء کی اختلافی رائیں نقل کی ہیں جن کا مطالعہ ہمارے لیے غیر ضروری ہے۔ اگر ہم مصنف کی رائے کو اختیار کریں تو شافعی مکتب فقہ کا یہ مسلک بعینہٖ وہی ہے جو دوسرے مکاتب فقہ نے اختیار کیا ہے۔

جہاں تک شرکت کرنے کے حق کا سوال ہے اس کے بارے میں بھی شافعی فقہاء کا مسلک وہی ہو سکتا ہے جو انھوں نے مضاربت کرنے کے حق کے سلسلے میں اختیار کی ہے لیکن ہمیں اس کی کوئی صراحت نہ مل سکی۔ اسی طرح اس مسئلے کے ضمن میں بھی صریح بیان نہ مل سکا کہ کاروباری فریق مضاربت کے سرمایہ کو اپنے ذاتی سرمایے میں ملا کر کاروبار کر سکتا ہے یا نہیں۔ شافعی فقہاء نے کاروباری فریق کی عام ذمہ داری یہ بتلائی ہے کہ وہ احتیاط کے ساتھ کاروبار کے مفاد کے مطابق تصرفات کرے [2] اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اگر صاحب سرمایہ چاہے تو اسے مضاربت کا سرمایہ نجی سرمایے میں ملا کر کاروبار کرنے سے روک سکتا ہے، ورنہ اس پر کوئی حرج نہیں۔

حنبلی فقہاء کا مسلک بھی وہی ہے جو احناف کا ہے۔ یہ بتلانے کے بعد کہ صاحب سرمایہ کی اجازت کے بغیر کاروباری فریق کو یہ حق نہیں حاصل ہے۔ ابن قدامہ لکھتے ہیں :۔

" اگر صاحب سرمایہ اس بات کی اجازت دے کہ کاروباری فریق اس سرمایہ کو کسی دوسرے

---

[1] ابو اسحٰق ابراہیم : کتاب المہذب جلد ۱ صفحہ ۳۹۱

[2] ایضاً صفحہ ۳۹۱

فریق کو مضاربت کے طور پر دے سکتا ہے تو ایسا کرنا جائز ہوگا۔ احمد بن حنبلؒ نے اس کی صراحت کردی ہے اور ہمارے علم کی حد تک اس میں کسی کو اختلاف نہیں۔ اگر مالک نے اس سے یہ کہا ہو کہ تم اپنی رائے کے مطابق کام کرو یا جیسی اللہ توفیق دے ویسا کرو تو اس کے لیے اس سرمایہ کو مضاربت کے طور پر دینا جائز ہو جائے گا۔"[1]

اور اسے یہ اختیار نہیں کہ مضاربت کا مال اپنے ذاتی مال میں ملائے۔ اگر وہ ایسا کرے گا اور دونوں اموال کو علیحدہ کرنا ممکن نہ رہ جائے گا تو وہ ضامن (نقصان کا ذمہ دار) ہوگا۔ کیونکہ وہ (سرمایہ مضاربت) امانت ہے اور اس کی حیثیت امانۃً رکھے ہوئے مال کی ہے۔ البتہ اگر مالک نے اس سے یہ کہہ دیا ہو کہ تم اپنی صواب دید کے مطابق کاروبار کرنا تو اس کے لیے ایسا کرنا جائز ہو جائے گا۔"[2]

اور جب ایک آدمی ایک فریق سے مضاربت (پر سرمایہ حاصل کرکے کاروبار کرنے) کا معاہدہ کرلے تو اس کے لیے یہ جائز نہ ہوگا کہ کسی دوسرے فریق کے ساتھ بھی مضاربت پر کاروبار کرنے کا معاہدہ کرے۔ اگر ایسا کرنے میں پہلے فریق (کے سرمایہ سے کیے جانے والے کاروبار) کا نقصان لازم آتا ہو۔ اگر وہ اس کے باوجود ایسا کرے گا اور (دوسرے کاروبار کے ذریعے) نفع کمائے گا تو یہ نفع پہلے مشترکہ کاروبار کے حساب میں داخل کیا جائے گا۔ خلاصہ یہ کہ جب اس نے ایک آدمی سے مضاربت پر سرمایہ لیا۔ پھر یہ ارادہ کیا کہ دوسرے آدمی سے بھی مضاربت پر سرمایہ حاصل کرے۔ اور پہلے صاحب سرمایہ نے ایسا کرنے کی اجازت دے دی تو اس کے لیے ایسا کرنا جائز ہوگا۔ اگر اس نے اجازت نہیں دی مگر اس اقدام سے اس کے مفاد کو کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ ہو تو بھی ایسا کرنا جائز ہوگا۔ اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں۔ البتہ اگر ایسا کرنے میں پہلے صاحب سرمایہ کا نقصان لازم آتا ہو اور وہ اجازت نہ دے تو ایسا کرنا جائز نہ ہوگا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ یہ دوسرا سرمایہ بہت زیادہ ہو جس سے کاروبار کے لیے اس کا خاصا وقت درکار ہے جس کے سبب اس کے پہلے کاروبار کے سلسلے میں کچھ کرنے سے قاصر رہ جانے کا اندیشہ ہو، اور پہلا سرمایہ بھی اتنا

---

[1] ابن قدامہ: المغنی جلد ۵ ص ۱۴۰

[2] ایضاً ایضاً ص ۱۴۲

زیادہ ہو کہ اگر اس کے کاروبار سے کنارہ کر کے دوسرے کاروبار میں مصروف ہو گیا تو بعض ضروری کام رہ جائیں گے۔ مگر اکثر فقہاء کی رائے یہ ہے کہ کاروباری فریق کے لیے نیا معاہدۂ مضاربت جائز ہوگا کیونکہ مضاربت ایک ایسا معاہدہ ہے جو اس کو اس کاروبار کے جملہ منافع کا مستحق نہیں بناتا۔ اس بنا پر وہ اسے نئی مضاربت سے نہیں روک سکتا جب اس سے نقصان کا اندیشہ نہ ہو، یا جس طرح اجیر مشترک کو (یہ بات اجرت پر مزید کام کرنے سے نہیں روک سکتی کہ وہ کسی ایک سے اجرت پر کام کرنا طے کر چکا ہے۔)[1]

(باقی)

[1] ابن قدامہ: المغنی جلد ۵ ص۱۶۳

خاندانی منصوبہ بندی

جناب صدیق الحسن گیلانی - ایم اے

فاضل مقالہ نگار نے خاندانی منصوبہ بندی پر بحث کرتے ہوئے ضمنی طور پر پاکستان میں عیسائیت کے فروغ کی جو روداد بیان کی ہے وہ بڑی عبرت ناک ہے۔

(ادارۂ زندگی)

آبادی کے اضافے پر جن حضرات کو تشویش ہے۔ ان میں دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک گروہ تو ملکی سطح پر متفکر رہتا ہے کہ دنیا کی آبادی بڑھ رہی ہے اور رقبے کی کمی کی وجہ سے ذرائع و وسائل میں کمی واقع ہو جانے کی وجہ سے صورتِ حال کیا پیدا ہوگی اور بے چارہ انسان کیا کرے گا۔ ان حضرات کے لیے مختلف براعظموں میں فی مربع میل آبادی کا نقشہ دیا جا رہا ہے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ آج دنیا کا نصف سے زیادہ رقبہ مزید آبادی کے انتظار میں ہے تاکہ اسے آباد کیا جائے اور اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔

براعظم	آبادی فی مربع میل	براعظم	آبادی فی مربع میل
ایشیا (روس کے علاوہ)	۱۵۳٫۲	آسٹریلیا	۳٫۵
روس	۲۴٫۳	اوسٹیانہ	۱۴٫۶
شمالی امریکہ	۲۷٫۹	انٹارکٹیکا	رقبہ چھ ہزار مربع میل بالکل غیر آباد
جنوبی امریکہ	۱۹٫۹	افریقہ	۲٫۵
یورپ	۲۲۱٫۲		

نیشنل برتھ ایکٹ کمیشن نے جو دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی پر غور کرنے کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ اپنی رپورٹ میں کہا کہ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ دنیا کی موجودہ آبادی کی ضرورت کے لیے اس کے قدرتی وسائل کافی نہیں بلکہ ان ذرائع سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کے لیے دنیا کی موجودہ آبادی سے کہیں زیادہ آبادی

ضرورت ہے جس کا معیار زندگی بھی اونچا رہ سکتا ہے۔ (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا)

دنیا کے خوش حال ملک وہی ہیں جن کی آبادی زیادہ ہے۔ کیونکہ انسان ہی قدرت کی وہ مشین ہے جو ذرائع و وسائل سے فائدہ اٹھانا جانتا ہے اور اسی کی محنت زمین میں سے معدنیات اور غذا پیدا کرتی ہے۔ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے مطابق مختلف ممالک کی فی مربع میل آبادی یہ تھی۔

برطانیہ	۶۶۵	جاپان	۴۴۳
بلجیم	۶۵۴	جرمنی	۳۵۲

جبکہ مغربی پاکستان میں فی مربع میل آبادی ۱۹۵۱ء میں ۱۳۳ اور ۱۹۶۱ء میں ۱۳۶ ہے۔ کل پاکستان میں ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق فی مربع میل آبادی ۲۵۷ نفوس پر مشتمل ہے۔ پھر پاکستان میں ایسے علاقے بھی ہیں جہاں فی مربع میل آبادی بہت کم ہے۔ مثلاً ڈیرہ اسمٰعیل خاں ڈویژن میں ۱۱۰۔ بہاولپور ڈویژن میں ۱۴۷۔ خیرپور ڈویژن میں ۱۵۶۔ حیدرآباد ڈویژن میں ۸۹۔ کوئٹہ ڈویژن میں ۱۴ اور قلات ڈویژن میں ۷ افراد ایک مربع میل میں آباد ہیں۔

اس سے صاف طور سے ظاہر ہے کہ مغربی پاکستان میں مسئلہ آبادی کی زیادتی کا نہیں بلکہ کمی کا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ کروڑوں میل رقبے ابھی تک ایسے ہیں جن سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جا سکا۔

مشرقی پاکستان کی حد تک آبادی کا مسئلہ ضرور موجود ہے۔ وہاں ۹۲۲ افراد ایک مربع میل میں آباد ہیں لیکن اس کا آسان حل مغربی پاکستان میں قدرتی اکانومی زرعی معیشت کو ترقی دینے اور مشرقی پاکستان میں غیر قدرتی اکانومی یعنی صنعتی ترقی میں بہت آگے بڑھانے سے ہو سکتا ہے۔ مشرقی پاکستان کا رقبہ کم ہونے کے باوجود وہاں زمین سونا اگلتی ہے۔ اور اگر مناسب طریقے سے منصوبہ بندی (معاشی خاندانی نہیں) کی جائے تو ملک بے شمار دولت پیدا کر سکتا ہے۔ اور دونوں حصے ایک دوسرے پر انحصار کر سکتے ہیں۔

افرادی قوت

افرادی قوت کے مسئلے پر غور کرتے ہوئے اس بات کو نہیں بھولنا چاہیے کہ پاکستان میں اوسط عمر صرف ۵۰ سال ہے جبکہ امریکہ اور یورپ میں ۶۰ اور ۷۰ کے درمیان ہے۔ اس ۵۰ کی اوسط عمر میں سے اگر ابتدائی ۲۰ سال نکال دیے جائیں جن میں ایک بچہ پل کر جوان ہوتا ہے اور تعلیم حاصل کر

یا فنون سیکھتا ہے۔ تو قوم کو ایک فرد کی زندگی کے صرف ۵۰ سال ملتے ہیں جن میں وہ کوئی مفید خدمت انجام دے سکتا ہے۔ اس لحاظ سے جن ممالک کی اوسط عمر کم ہے انہیں اسی نسبت سے افرادی قوت کی زیادہ ضرورت ہے۔

مغربی پاکستان میں اوسطاً آبادی فی مربع میل ۱۳۶ ہے۔ جو دوسرے ممالک کے مقابلے میں نصف ہے۔ اس طرح اگر آبادی میں ۸ گنا اضافہ کیا جائے تو قدرتی ذرائع و مسائل کے قومی لحاظ سے ہم دوسرے ممالک کی سطح پر آسکتے ہیں۔ چہ جائیکہ اس معمولی آبادی کو بھی برتھ کنٹرول کی دیمک لگا دی جائے۔

عیسائیوں کی بڑھتی ہوئی آبادی کا مسئلہ

عیسائیوں کی آبادی میں حیرت انگیز اضافہ ہو رہا ہے اور قبل اس کے کہ اس اضافے پر کوئی تبصرہ کیا جائے۔ مندرجہ ذیل اعداد و شمار کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔

مغربی پاکستان۔ عیسائی آبادی

ضلع	سنہ ۱۸۸۱ء	سنہ ۱۹۳۱ء	سنہ ۱۹۶۱ء
لاہور	۷۶۰	۶۷۶۸۶	۱۲۵۲۴۰
شیخوپورہ	۔	۵۹۹۸۵	۶۳۶۸۸
منٹگمری	۲۰	۲۴۱۰۱	۳۶۴۳۱
لائل پور	۔	۵۱۶۹۶	۸۱۸۸۲
جھنگ	۔	۷۴۴	۱۴۸۲
ملتان	۲۴	۱۳۲۷۰	۲۱۳۷۸
مظفر گڑھ	۵	۲۱۸	۲۹۴۹
گجرات	۱۹	۳۹۱	۳۹۷۶
سرگودھا	۳	۱۲۹۶۰	۲۲۳۹۳
جہلم	۸۴	۷۳۰	۱۶۷۰
راولپنڈی	۱۱۰	۴۲۱	۱۱۶۵۳
میانوالی		۳۲۴	۲۲۲۷
مشرقی پاکستان			
چاٹگام		۳۰	۳۰۳۶

ضلع	۱۸۸۱ء	۱۹۴۱ء	۱۹۶۱ء
چٹاگانگ ہلز	۰	۶۰	۱۰۱۶۰
میمن سنگھ	۰	۲۳۲۲	۱۶۶۷۴
دیناج پور	۰	۱۴۴۳	۸۸۶۰
کھلنا	۰	۳۵۸۸	۸۰۲۸
راج شاہی	۰	۱۱۶۶	۸۳۰۳
رنگ پور	۰	۳۸۹	۲۸۴۲

۱۸۸۱ء اور ۱۹۴۱ء کے اعداد و شمار سے اندازہ ہوگا کہ عیسائیوں کی آبادی ان علاقوں میں خاص طور پر بڑھ گئی جن میں نہریں نکالی گئیں آب پاشی کا انتظام کیا گیا اور آراضی کے قطعات (مربعہ جات) تقسیم کیے گئے حصول آراضی کے مواقع سے بھی زیادہ تر پس ماندہ اقوام نے ہی فائدہ اٹھایا یا کچھ ہندو عیسائی ہوئے۔ مسلمانوں نے ایمان کا سودا بہت ہی کم کیا۔ ۱۹۴۱ء میں چونکہ جنگ کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس لیے عیسائی مشنوں کی سرگرمیاں بالکل سرد رہیں۔ در اصل ۱۹۴۱ء اور ۱۹۶۱ء کے درمیان اضافہ ۱۹۴۷ء اور ۱۹۶۱ء کے درمیان ہوا ہے۔

رفتار ترقی

مشرقی پاکستان میں ۱۹۵۱ء سے ۱۹۶۱ء تک عام آبادی میں اضافے کا تناسب ۴٫۲ فی صد رہا جبکہ عیسائی آبادی میں اسی عرصے میں ۵۹٫۲ فی صد کے حساب سے اضافہ ہوا

مغربی پاکستان میں ۶۱-۱۹۴۱ء کے عرصے میں ۵۰ فی صد کے حساب سے اضافہ ہوا لیکن یہ اضافہ پورے مشرقی پنجاب اور ہندوستان کے بیشتر علاقوں سے کروڑوں لوگوں کی ہجرت کی وجہ سے ہوا۔ جبکہ عیسائیوں کی آبادی میں ۴۴ فی صد کے حساب سے اضافہ ہوا۔ درآں حالیکہ عیسائیوں کی ایک بڑی تعداد نقل مکانی کر کے ہندوستان بھی چلی گئی۔

۱۹۶۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ میں یہ بتایا گیا ہے کہ ۱۹۰۱ء میں یہاں عیسائی آبادی کا تناسب ۰٫۰۷ تھا۔ لیکن حالیہ سالوں میں حیرت انگیز اضافہ ہوا ہے۔ پاکستان میں عیسائیت نے تمام مذاہب کے مقابلے میں سب سے زیادہ ترقی کی ہے۔ سب سے زیادہ اضافہ راولپنڈی (جسے اب دارالحکومت کے لیے منتخب

یا گیا ہے) میں ہوا۔ یہ اضافہ ۶۰ر۲۲۷ فی صد ہے۔ چٹاگانگ میں ۷۱ فی صد۔ رنگ پور میں ۶۰ فی صد
یناج پور میں ۱۳۴ فی صد اور ضلع پنبہ میں ۰ء۷ فی صد اضافہ ہوا ہے۔

یسا کی فتوحات

کینیڈا کے رومن کیتھولک جریدہ پر اسپکٹر نے اکتوبر ۱۹۵۸ میں مشرق بعید (پاکستان سمیت) میں اپنی
حات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: "مشنریوں کی کارکردگی مشرق بعید میں پچھلے سال میں ہمیشہ سے زیادہ
ہے۔ آخری اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ پچھلے سال ۱۲ لاکھ ۱۲ ہزار ۱۹۷ افراد کو بپتسمہ دیا گیا جس
ے کیتھولک عیسائیوں کی تعداد ۳ کروڑ ۶۲ لاکھ ۴۴ ہزار ۹۹ ہو گئی۔ جبکہ اس حصے کی کل آبادی ۳۰ کروڑ
لاکھ ۶۳ ہزار ہے۔

آگے چل کر یہی اخبار لکھتا ہے: "پاکستان میں چرچ کو اپنے تبلیغی مشن میں عظیم ترین کامیابی حاصل ہوئی ہے اور
ف گزشتہ سال میں آٹھ ہزار مسلمانوں کو بپتسمہ دے کر عیسائی بنایا گیا ہے۔ پاکستان کی مجموعی آبادی سات
روڑ اسی لاکھ ہے جس میں کیتھولک افراد کی تعداد اسی ہزار سے بڑھ کر اب دو لاکھ اٹھاسی ہزار دو سو تریسٹھ
پہنچ چکی ہے۔ اب ۲۳۸ پادری ہیں۔ جن میں ۴۶ پاکستانی ہیں۔ چرچ نے ایک اور سنگ میل نصب کیا
۔ اور وہ یہ کہ ایک پاکستانی جوزف کارڈینل کو کراچی کا آرچ بشپ مقرر کیا گیا ہے۔

یہ صرف ایک مشن کا حال ہے اور ایسے ۴۰ مشنری ادارے پاکستان کے دونوں حصوں میں کام کر رہے
جنہیں امریکہ، برطانیہ، فرانس، اٹلی، سویڈن اور دوسرے یورپین ممالک کروڑوں نہیں اربوں روپے کی
امداد دے رہے ہیں۔ مشنری اداروں کو جو خصوصی ہدایات جاری کی گئی ہیں وہ بہت زیادہ قابل غور ہیں

شنریوں کو ہدایات

اگر مسلمان نصرانیت قبول نہ کریں تو کوئی پرواہ نہیں۔ تم اپنا کام جاری رکھو اور ان کے ذہنوں میں
سلام کے متعلق مختلف قسم کے شکوک و شبہات پیدا کرتے رہو۔ اگر تم اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو گئے تو
ہاری عظیم فتح ہو گی۔ تم ان لوگوں کو عیسائی بنائے بغیر ان سے عیسائیت کی ایسی خدمت لے سکتے ہو
عیسائی بھی اپنے مذہب کے لیے نہ کر سکیں اور اس غرض کے لیے اگر تمہیں مسیحی اصولوں کے اندر کچھ لچک بھی پیدا
نی پڑے تو بلا تکلف پیدا کر دو۔

اس مقصد کی تکمیل کے لیے مشنری اسکول بڑا اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ کیونکہ آئندہ نسل جن کے

انھوں میں مستقبل قریب میں پاکستان کی باگ ڈور ہوگی۔ اس کا تقریباً اسی فی صد حصہ جس کی اکثریت پاکستان کے با اختیار اور سرمایہ دار طبقے سے تعلق رکھتی ہے ان ہی مشن اسکولوں میں تعلیم پا رہا ہے۔

سرکاری تعاون

مشہور عیسائی جریدہ مسلم ورلڈ نے اپنے جنوری ۱۹۵۸ء کی اشاعت میں لکھا تھا کہ ایک حقیقت بالکل واضح اور نمایاں ہے کہ مسلمانوں کا امن و سکون اس طرح غارت ہو چکا ہے کہ جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ آج عیسائیوں کی طرف سے دوستی کا اظہار مسلم افراد پہلے کی نسبت زیادہ خوشی سے قبول کر رہے ہیں۔ ان کی آنکھوں کے سامنے سے پردے ہٹ چکے ہیں۔ وہ افراتفری کا شکار ہیں اور اپنی ضرورت و احتیاج کو پہچاننے لگے ہیں۔ مسیحی امانت، مواسات اور ہدایات کے لیے اس سے عظیم تر موقع پہلے کبھی میسر نہیں آیا۔ لاہور میں مغربی پاکستان کے لیے کرسچین ریلیف کمیٹی قائم ہو چکی ہے۔ حکومت پاکستان امدادی مہم کے دوران چرچ ورلڈ سروس کا برابر ہاتھ بٹا رہی ہے۔ ہمارے نمائندے پاکستان سے برابر یہ اطلاعات پہنچا رہے ہیں کہ سرکاری حکام کی طرف سے انہیں دل کھول کر تعاون اور سہولتیں حاصل ہو رہی ہیں۔

مشنری ادارے

سردار غیاث الرحمن صاحب نے مغربی پاکستان اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ مشنری اسکول درحقیقت گھاس میں چھپے ہوئے سانپ ہیں۔ اور ہمارے نوجوانوں کا کردار تباہ کرنے کی پوری پوری کوشش کر رہے ہیں اگر مشنریوں کی سرگرمیوں پر فوراً پابندی نہ لگائی گئی تو دس سال کے اندر اندر اس ملک میں ایک بھی "مسلمان" نہ رہے گا۔ (روزنامہ جنگ ۲۵ رجون ۱۹۶۴ء)

مسٹر انیتھونی ڈی سوزا کا بیان

مسٹر انیتھونی ڈی سوزا پاکستانی عیسائیوں کے نمائندے اور ایک ذمہ دار سرکاری افسر ہیں۔ انھوں نے اپنے بیان میں فرمایا تھا۔ عیسائی اقلیت آج صرف بڑے شہروں اور قصبوں میں ہی سرگرم کار نہیں ہے بلکہ پورے ملک کے دیہات میں اور جھونپڑیوں تک میں عیسائی ٹیچر، ڈاکٹر، نرسیں اور قانون داں موجود ہیں۔ اور مغربی پاکستان میں عیسائیوں کے پورے پورے گاؤں وجود میں آچکے ہیں۔

یہ حقائق اور اعداد و شمار ہر شخص کے سامنے موجود ہیں۔ اب میرے لیے اس سوال کا جواب دینے کی ضرورت نہیں ہے کہ اگر عیسائی چرچ نے مسلمانوں کو عیسائی بنانے میں نمایاں ترین کامیابی حاصل کی ہے اور پاکستان

مشنریوں کے لیے تر نوالہ بن رہا ہے ۔ تو یہ امر پاکستانی مسلمانوں کے لیے اور ان لوگوں کے لیے جنہوں نے گزشتہ واہرس تک اس ملک میں حکمرانی کی ہے ۔ کس قدر باعث فخر ہے ۔ ہماری گزشتہ تاریخ تو ہمیں یہ بتاتی ہے کہ اگر ملت اسلامیہ کا ایک فرد بھی دائرہ اسلام سے خارج ہوا ہے یا اس کے نکلنے کے امکانات پیدا ہوئے ہیں ۔ تو پوری ملت کرب و اذیت سے تلملا اٹھی ۔ ہماری یہ کیفیت اس دور میں بھی قائم رہی جب ہم انگریزوں کے تسلط میں جکڑے ہوئے تھے ۔ ہمارے اٹھارہ ۱۹ سالہ دور آزادی میں اسلام چھوڑ کر عیسائیت قبول کرنے والوں کی تعداد ہمارے دو صد سالہ دور غلامی میں عیسائی ہونے والوں کی تعداد سے کہیں زیادہ ہے ۔ درآں حالیکہ انگریزی دور میں نہری علاقوں کو جب آباد کیا گیا تو عیسائیوں کو بہت مراعات دی گئیں ۔ ان عیسائیت قبول کرنے والوں کو زمینوں کے بڑے بڑے قطعات عطا کیے گئے لیکن اس پورے دور میں صرف اچھوت اقوام نے عیسائیت قبول کی اور مسلمانوں نے بڑے سے بڑے لالچ کو ٹھکرا دیا ۔

خطرناک نتائج

اس حقیقت سے تو ہر شخص واقف ہے کہ عیسائی آبادی میں اضافہ کرنے کے لیے مشن کروڑوں روپے صرف کر رہے ہیں عیسائیوں کے ہاں ہر بچہ پیدا ہونے پر وظیفہ دیا جاتا ہے اور ہر طرح کے لالچ اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکا اور برطانیہ بھیجنے کی ترغیب اور ہر ہتھکنڈے سے لوگوں کا ایمان خریدا جاتا ہے ۔ اس طرح آبادی میں اضافہ کرنے کے مختلف طریقے استعمال کر کے اب آبادی بارہ لاکھ تک پہنچ گئی ہے اور حکومت سے ایک وزارت کا مطالبہ بھی کیا جا رہا ہے ۔

سیاسی خطرات

سیاسی خطرے کی نشان دہی روزنامہ انجام کراچی نے ۱۲ اگست ۱۹۶۶ء کے اداریے میں کی ہے ۔ جو درج ذیل ہے ۔

ویت نام سے سبق لو

اس وقت جنوبی ویت نام میں عیسائیوں کی تعداد صرف ۱۰ لاکھ ہے اور بدھ دھرم کے پرستاروں کی تعداد سوا کروڑ سے زیادہ ہے لیکن اقلیت کے اثر و اقتدار کا یہ عالم ہے کہ اس بدھ ملک کے صدر ڈائم کیتھولک عیسائی ہیں ۔ ان کی خواہر نسبتی میڈیم نہو عیسائی مذہب کی اس قدر پرجوش تبلیغ کرنے والی ہیں ۔ بادلہ بدھ مذہب کے خلاف اس قدر سخت تعصب کرتی ہیں کہ تازہ اطلاعات کے مطابق بدھ لیڈروں نے میڈیم

کی ناقابلِ برداشت اشتعال انگیزیوں کی جانب ان کے بہنوئی صدر کی توجہ مبذول کرائی ہے۔

صدر مملکت اور اس کی محل سرا کا رنگ تو آپ نے دیکھ لیا اب ذرا باہر نظر ڈالیے۔ جنوبی ویت نام وزیراعظم عیسائی ہے۔ کمانڈر انچیف عیسائی ہے۔ ڈاکٹروں انجینیروں اور پروفیسروں کی بھاری اکثریت عیسائی ہے۔ کاروبار پر عیسائی چھائے ہوئے ہیں اور بدھوں کی یہ پرانی عظیم الشان مملکت عملی طور پر عیسائی مذہب ماننے والوں کے ہاتھ میں ہے۔ یہی لوگ جن کے آبار واجداد بدھ مذہب کے پرستار تھے اور جنہیں پرتگیزی فرانسیسی مشنریوں نے ان کے قومی مذہب سے منحرف کر دیا۔ جنوبی ویت نام کے اس واقعہ میں پاکستان کے لیے بہت بڑا سبق پوشیدہ ہے۔ غیر ممالک کے مشنری اداروں نے اپنی جارحانہ تبلیغ کے ذریعے پاکستان میں ارتداد کی آگ پوری شدت سے بھڑکا رکھی ہے۔ جارحانہ تبلیغ کے ذریعے پرانے کپڑوں کے ذریعے امریکی گھی اور دودھ کے ڈبوں کے ذریعے۔ غرضیکہ ہر ممکن فریب اور ہر ممکن دھمکی کے ذریعے مسلمانوں کے مذہب پر ڈاکہ ڈالا جا رہا ہے اور عیسائیوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ غیر ممالک کے مسیحی اخبارات علی الاعلان لکھ رہے ہیں کہ دنیا کے تمام ملکوں میں پاکستان کی سرزمین ان کے لیے زیادہ زرخیز ثابت ہو رہی ہے۔ جسے دنیا کے نقشے پر نمودار کرنے کے لیے کم و بیش ڈیڑھ کروڑ مسلمانوں نے جام شہادت نوش کیا اور مکمل تباہی و جلاوطنی کو لبیک کہا۔ مشنری اداروں کی سرکشی کا یہ حال ہے کہ وہ حکومت کے احکام و ہدایات کو خاطر میں نہیں لاتے اور حکومت کے خرچ پر بھی اپنے سکولوں میں مسلم طلبہ کی مذہبی تعلیم کا انتظام کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ یہ غیر ملکی مشنری ادارے مذہب کے علاوہ ہماری تہذیب، ہماری معاشرت اور ہماری تاریخ پر بھی ڈاکہ ڈال رہے ہیں۔ مشنری اسکولوں میں اردو بولنے کو جرم قرار دیا جاتا ہے اور سلطان ٹیپو شہید ایسے مجاہد کو ڈاکو کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ ہماری حکومت کی افسوسناک رواداری اور چشم پوشی سے عیسائیوں کے حوصلے بھی بڑھتے جا رہے ہیں۔ اپنی سرکشی اور اشتعال انگیزی پر شرمندگی محسوس کرنا تو درکنار، وہ اب یہاں تک مطالبہ کر رہے ہیں کہ مرکزی اور صوبائی کابینہ میں عیسائی وزراء شامل کیے جائیں۔ وقت ہے کہ پاکستان میں غیر ملکی مشنریوں کی دراز دستیوں، جارحانہ تبلیغ اور ان کی بھڑکائی ہوئی آتش ارتداد کا مقابلہ سختی کے ساتھ کیا جائے ان کے اشتعال انگیز لٹریچر پر پابندیاں عائد کی جائیں۔ ان کے ہسپتالوں اور درس گاہوں کو قومی تحویل میں لیا جائے۔

ہمیں یہ خطرہ اور تلخ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہیے کہ اگر جنوبی ویت نام میں نو دس لاکھ عیسائی سوا کروڑ

سے زیادہ بدھ باشندوں کو غلام بنا سکتے ہیں تو پاکستان میں غیر ملکی چیرہ دستیاں ایک نہ ایک دن کیوں رنگ نہیں لا سکتیں اور عیسائی اقلیت کی تعداد بڑھ جانے پر پاکستان کی عظیم الشان اکثریت کو نگنی کا ناچ کیوں نہیں نچا سکتی۔

نائیجیریا کی مثال

روزنامہ انجام نے بڑی وضاحت کے ساتھ قلندرانہ بات کہہ دی ہے۔ اس پر مزید کچھ کہنے کی تو فرصت نہیں، البتہ نائیجیریا کا حشر ہمارے سامنے ہے۔ جہاں عیسائی اقلیت نے مسلمان وزیر اعظم سر ابوبکر اور احمد کو شہید کر کے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ مسلمانوں کے اندر اس سے بے چینی پیدا ہوئی تو قتل و غارت کا بازار گرم ہوا اور مسلمانوں کا جینا حرام کر دیا گیا۔

کیا اس معاملے کی سنگینی اور نزاکت اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ خاندانی منصوبہ بندی کے ذریعے مسلمانوں کے اخلاقی سرمایہ کو تباہ کر دیا جائے۔ ان کی آبادی کو کم کیا جائے۔ اور عیسائی اقلیت کو مزید گل کھلانے کا موقع دیا جائے۔ ("ایشیا" لاہور)

قرآن مجید کے ہندی تراجم

جناب سید قادر علی صاحب استاذ درسگاہ جماعت اسلامی رام پور

قرآن مجید کے ہندی ترجموں کی تعداد دو درجن سے زیادہ ہے۔ جن میں کچھ ترجمے تو مکمل ہیں اور ...نامکمل ہیں۔ پھر ان میں سے بعض تراجم عربی متن کے ساتھ ہیں اور بعض غیر متن کے شائع ہوئے ہیں ...کچھ ترجمے ایسے بھی ہیں جو عربی متن کے علاوہ تشریحی نوٹ تفسیری حواشی اور دیگر مفید معلومات سے ...ہیں۔ ان تراجم کا مختصر تعارف درج ذیل ہے

(الف) قرآن مجید کے غیر مکمل ہندی تراجم:

(۱) نویں صدی عیسوی کے مشہور سیاح بزرگ ابن شہریار نے اپنے سفرنامے (عجائب الہند) میں صفحہ ۳ پر قرآن مجید کے ایک ترجمے کا ذکر کیا ہے۔

یہ ترجمہ اب سے تقریباً گیارہ سو سال پہلے ہندوستان میں ہندی زبان میں ہوا ہے۔ قرآن شریف ...یہ سب سے پہلا ترجمہ ہے جسے ایک ہندوستانی راجہ نے ۲۷۰ھ مطابق ۸۸۳ء میں کرایا تھا۔ اس ...جہ کا نام مہروک بن رائک (یا رائق) تھا۔ جو الرا (الور) کشمیر اور پنجاب کا حکمراں تھا۔

...ترجمہ ایک ایسے عالم نے کیا تھا جس کی پرورش ہندوستان میں ہوئی تھی اور وہ ہندوستان کی مختلف ...بانیں جانتا تھا۔ اس نے یہاں تین سال گزارے۔ اس عالم کو راجہ مہروک بن رائک کی فرمائش پر منصورہ (سندھ) ...حاکم عبداللہ بن عمر نے بھیجا تھا تاکہ راجہ صاحب موصوف کو اسلام سے پورے طور پر واقف کرا دے ... افسوس ہے کہ یہ ہندی ترجمہ صرف سورۂ یسین (تئیسویں پارے رکوع ۴) تک مکمل ہو کر نامکمل رہ گیا ...ن ترجمے کو سن کر راجہ صاحب نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ (ماخوذ از پیام امین ص ۷۹، ماہنامہ البلاغ بمبئی ...بت ماہ مئی ۱۹۶۶ء ص ۲۳، ۲۶ فاران تحریک نمبر کراچی) اور روزنامہ دعوت دہلی ۹ ... ۱۹۶۶ء کا کالم

(۲) مولانا سید محمد علی صاحب مونگیری رحمۃ اللہ اپنی تصنیف "ارشاد رحمانی" میں صفحہ ۴۶ پر لکھتے ہیں کہ ایک روز عصر کے وقت (مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادیؒ نے اس کمترین کو پاس بلا کر ارشاد فرمایا کہ "مولوی عبدالقادر صاحبؒ کے ترجمے (موضح القرآن مطبوعہ ۱۷۹۰ء سے دو سو برس پیشتر" بھاکھا میں نہایت عمدہ ترجمہ قرآن شریف کا ہوا ہے۔ ہم نے دیکھا ہے"۔

یعنی یہ ترجمہ تقریباً ۱۵۹۰ء میں کیا گیا ہوگا۔ مولانا فضل الرحمٰن صاحب کی اس عینی شہادت کو مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی نے اپنی تالیف (تذکرۂ فضل رحمٰن) میں صفحہ ۴۲ اور صفحہ ۱۳۹ پر تحریر فرمایا ہے۔

(۳) مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادیؒ نے اپنے زمانے کی بے تکلف ہندی بھاشا میں قرآن مجید کی کچھ سورتوں اور حصوں کا ترجمہ فرمایا ہے۔ جو ایک بار گلشن ابراہیمی پریس لکھنؤ سے شائع ہوا تھا اور اب نایاب ہے۔ یہ ترجمہ مولانا کی قرآن فہمی ادبی ذوق اور لطافت طبع کا نمونہ ہے"۔

(اقتباس از تذکرہ فضل رحمٰن صفحہ ۸۳ مرتبہ مولانا ابوالحسن علی ندوی)

(۴) مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی (ضلع اناؤ۔ یوپی) المتوفی ۱۳۱۳ھ۔ آپ اپنے مریدوں کو وقتاً فوقتاً قرآن مجید کا درس دیا کرتے تھے۔ مولوی تجمل حسین صاحب بہاری نے ان درسوں کا ترجمہ کیا جسے مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی نے ۱۳۲۱ھ میں ناگری رسم الخط میں طبع کرا کر لکھنؤ سے شائع کیا اس ترجمے کا ایک نسخہ راقم الحروف کے پاس بھی موجود ہے۔

ترجمے کا نام قرآن شریف کا ترجمہ ہے۔ لمبائی ۸ انچ اور چوڑائی پانچ انچ ہے۔ صفحات کی تعداد ۴۴ ہے اور ہدیہ صرف دو آنے ہے۔ پہلا ایڈیشن ایک ہزار کی تعداد (گورنمنٹ امپلائز پریس ۴۴ لاٹوش روڈ لکھنؤ) میں طبع ہوا ہے۔

(۵) خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی متوفی ۱۹۵۵ء۔ موصوف نے شدھی اور سنگھٹن کے پرآشوب زمانے (۱۹۲۳ء لغایۃ ۱۹۲۶ء) میں قرآن مجید کا ایک مکمل ہندی ترجمہ مع تفسیر دو ضخیم جلدوں میں شائع کیا ہے جس کی زبان عام فہم اور سلیس ہے۔ انہیں دنوں مولانا نے پارۂ عم (تیسویں پارے) کا ہندی ترجمہ علیحدہ بھی شائع کیا تھا تاکہ ہندی جاننے والے لڑکے اور لڑکیاں پڑھ سکیں۔ ان کا ہدیہ تین آنہ ہے۔

(اردو دیباچہ تفسیر مذکور صفحہ ۳)

(۶) سورۂ بقرہ کی غیر مطبوعہ ہندی تفسیر: خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی اپنی تفسیر کے ...

دیباچے میں صفحہ ۴ پر تحریر فرماتے ہیں۔

ابتدا میں ایک بڑے لائق مسلم عالم کو دو سو روپیہ ماہوار پر مقرر کیا تھا جو علاوہ عربی علوم کے انگریزی علوم کے بھی مستند فاضل تھے اور جن کو فن تفسیر میں سالہا سال کا تجربہ تھا اور تفسیر نویسی کے وہ خاص ماہر تھے۔ چنانچہ انھوں نے دو سال میں سورۂ بقرہ کی تفسیر تیار کی اور مولانا غلام محمد صاحب نے اپنے مترجم رفقار کی مدد سے اس تفسیر کا ہندی ترجمہ بھی تیار کر دیا۔

لیکن میں نے دیکھا کہ یہ تفسیر اس قدر طویل ہے کہ صرف سورۂ بقر کی تفسیر پورے قرآن مجید کی تفسیر کے برابر ہے تو مجھے چھپائی کے خرچ کا اندیشہ ہوا اور مجبوراً مذکورہ تفسیر کو سورۂ بقر تک ملتوی کرا دیا۔ اس تفسیر میں مخالفین اسلام کے تمام اعتراضات کا نہایت عمدگی کے ساتھ رد کیا گیا ہے۔ کثیر مصارف کے باعث یہ تفسیر شائع نہیں کی جا سکی۔

(۷) مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی (ضلع بارہ بنکی) اپنے اخبار "صدق جدید" لکھنؤ میں ۲۶ جون ۱۹۶۴ء کی اشاعت کے صفحہ ۸ پر تحریر فرماتے ہیں کہ :-

"بعض پاروں کا ہندی ترجمہ مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب نگرامی کا کیا ہوا ہے۔ یہ ترجمہ ابھی تک مجھے دستیاب نہیں ہو سکا ہے لیکن میرے محترم دوست مولانا محمد ایوب صاحب اصلاحی جو بحیثیت معلم کے تقریباً دو تین سال قصبہ نگرام (ضلع لکھنؤ) میں قیام فرما چکے ہیں۔ اپنے چشم دید حالات اس طرح بیان فرماتے ہیں۔

مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب نگرامی ضعیف العمر تھے صحت بھی خراب رہتی تھی۔ جسم اور ہاتھوں میں آبلے پڑے رہتے تھے جس کی وجہ سے لکھ نہیں سکتے تھے مگر مولانا کو قرآن مجید کا ہندی ترجمہ کرنے کی بڑی دھن تھی۔ ضعیفی اور علالت کے باوجود انتھک محنت کرتے تھے۔ خصوصاً ہندی الفاظ کے انتخاب میں بڑی تحقیق اور چھان بین سے کام لیتے تھے۔ ترجمے کا املا کراتے اور ایک غیر مسلم جو قوم کے کایستھ تھے، کاتب کی خدمت انجام دیتے تھے تقریباً ۴۳-۱۹۴۲ء میں مولانا رحلت فرما گئے جس کی وجہ سے یہ ترجمہ نامکمل رہ گیا۔

(۸) قاضی عابد علی صاحب بھوری ضلع کانپور المتوفی ۱۹۶۱ء آپ نے ہندی زبان میں قرآن شریف کے پندرہ پاروں کا ترجمہ کیا تھا۔ جو ماہنامہ "اسلام" کانپور میں بالاقساط نکلتا رہا

(کتابی دنیا کراچی بابت ماہ جنوری ۱۹۶۳ء صفحہ ۵) اس ترجمے کا بیشتر حصہ راقم الحروف نے مطالعہ کیا ہے۔ زبان بہت آسان اور با محاورہ ہے۔ ترجمے کے ساتھ ساتھ حسب ضرورت تفسیری اشارات بھی ہیں

میں (۹) فروری ۱۹۵۵ء میں مکتبہ جماعت اسلامی ہند سے "پوتر قرآن" کے نام سے قرآن مجید کے پہلے پارے (الٓمّ) کا ہندی ترجمہ تقطیع کلاں پر شائع ہوا ہے۔ صفحات کی تعداد ۱۲۶ اور ہدیہ دو روپیہ آٹھ آنے ہے پہلا ایڈیشن دو ہزار کی تعداد "ہندوستانی پرنٹنگ ورکس رام پور میں طبع ہوا ہے۔

ترجمہ اور تفسیر لکھنے کے فرائض مولانا صدرالدین صاحب اصلاحی نے انجام دیے ہیں۔ موصوف نے تفسیر لکھتے وقت اس دور کے غیر مسلم ذہن میں پیدا ہونے والی الجھنوں کو خاص طور سے سامنے رکھا ہے۔

ترجمے کو ہندی جامہ پہنانے کی خدمت پنڈت کیلاش ناتھ صاحب برہسپت رام پوری، حافظ ابو محمد امام الدین صاحب رام نگری اور افضل حسین صاحب بستوی نے انجام دی ہے۔ زبان عمدہ اور معیاری ہے۔ ترجمے کے ساتھ عربی متن بھی شامل ہے جو ٹائپ میں ہے۔

(۱۰) فروری ۱۹۵۵ء میں حافظ ابو محمد امام الدین رام نگری صاحب نے تیسویں پارے (پارۂ عمّ) اور پارۂ اول (الٓمّ) کا ترجمہ مع تشریح کے شائع کیا ہے جن کا ہدیہ بالترتیب ڈیڑھ روپیہ اور ایک روپیہ ہے پارۂ عمّ دو قسم کا طبع ہوا ہے۔ ایک عربی متن کے ساتھ ہے اور دوسرا بلا متن کا ہے۔

ان پاروں کا سائز کتابی (۲۰×۳۰/۱۶) ہے۔ طابع ستیسی پرنٹنگ پریس ورکس نیچی باغ وارانسی اور پبلشر ساہتیہ سدن رام نگر بنارس اسٹیٹ ہے۔

(۱۱) آچاریہ ونوبا بھاوے جی دو جدید تحریکوں (بھودان تحریک اور سروداے تحریک) کے بانی اور مشہور سماجی رہنما ہیں۔ چناں چہ بھودان تحریک میں اب تک آپ کو بائیس ہزار پانچ سو اڑسٹھ (۲۲۵۶۸) گاؤں بطور عطیہ مل چکے ہیں۔

آپ نے قرآن مجید کا ایک انتخاب تیار کیا ہے۔ قرآن میں کل چھ ہزار چھ سو چھیاسٹھ (۶۶۶۶) آیات ہیں ان میں سے ایک ہزار پینسٹھ (۱۰۶۵) آیتوں کو منتخب کر کے آچاریہ جی نے چار سو مختلف عنوانات کے تحت یہ انتخاب مرتب کیا ہے۔ ان میں بعض آیات جزوی طور پر لی گئی ہیں۔

اس انتخاب کا ترجمہ آچاریہ جی نے اپنی مادری زبان میں مرہٹی میں کیا ہے جسے آپ ہندوستان کی ساری زبانوں میں شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

چناں چہ اب تک اردو ایڈیشن "روح القرآن" کے نام سے ہندی ایڈیشن "قرآن سار" کے نام سے انگریزی ایڈیشن "دی ایسنس آف قرآن" کے نام سے اور عربی ایڈیشن جس کا ہدیہ بارہ روپیہ ہے۔ روح القرآن کے

نام سے مکمل سرد سیوا سنگھ پرکاشن، راج گھاٹ، کاشی سے شائع ہو چکا ہے۔

جون ۱۹۶۳ء میں اردو ایڈیشن روح القرآن کے نام سے تین ہزار کی تعداد میں شائع ہوا ہے۔ یہ ترجمہ شری اچیت دلیش پانڈے صاحب نے کیا ہے جو بلا متن کے ہے۔ اس مجلد ترجمے کا ہدیہ صرف چار روپے اس اردو ترجمے (روح القرآن) کو ناگری رسم الخط میں روح القرآن ہی کے نام سے بھی شائع کیا ہے جس کا ہدیہ دو روپے ہے۔

(۱۲) سنہ ۱۹۶۵-۶۶ء میں ہندی ایڈیشن "قرآن سار" کے نام سے دو قسم کا شائع ہوا ہے۔ ایک بغیر متن کے ہے اور دوسرا مع عربی متن کے ہے جن کا ہدیہ بالترتیب دو روپے پچاس نئے پیسے اور چھ روپیہ فی جلد ہے۔ (از فہرست کتب بابت ماہ جولائی سنہ ۱۹۶۶ء، سروودے ساہتیہ)

(۱۳) ماہنامہ "کانتی" رام پور، یو۔ پی میں مشہور تفسیر "تفہیم القرآن" (از سید ابو الاعلیٰ صاحب مودودی) کا ہندی ترجمہ تقریباً چھ سال سے مسلسل قسط وار شائع ہو رہا ہے۔ اب تک دس پاروں کا ترجمہ مکمل ہو چکا ہے اور گیارہویں پارے کا ترجمہ شروع ہو گیا ہے۔ سورۂ توبہ عنقریب ختم ہونے والی ہے۔

یہ ترجمہ مدیر ماہنامہ "کانتی" مولانا کوثر یزدانی صاحب کے قلم سے نکل رہا ہے۔ آپ ہندی ادب پر کافی عبور رکھتے ہیں۔ ترجمہ کی زبان ادبی اور معیاری ہے۔

(ب) قرآن مجید کے مکمل ہندی تراجم:-

(۱) پادری ڈاکٹر احمد شاہ مسیحی نے "القرآن" کے نام سے قرآن شریف کا مکمل ہندی ترجمہ پہلی بار ۱۹۱۵ء میں اور دوسری بار جنوری سنہ ۱۹۱۵ء میں اور تیسری بار جنوری سنہ ۱۹۲۵ء میں راج پور ضلع دہرہ دون سے شائع کیا ہے۔

اس ترجمے کا دوسرا ایڈیشن میرے سامنے ہے۔ جو پانچ سو کی تعداد میں پرتاپ پریس، کانپور میں چھپا ہے۔ سائز ۲۰×۲۶/۸ ہے۔ ضخامت ۴۲۲ صفحات ہے اور ہدیہ مع پیکنگ و پوسٹیج چار روپیہ بارہ آنے ہے۔ جلد سادہ اور ہلکی پھلکی ہے۔ طباعت نفیس اور کاغذ عمدہ ہے۔ پادری صاحب نے یہ ترجمہ اصل عربی سے بامحاورہ ہندی میں کیا ہے۔ حاشیہ میں جا بجا مختصر تشریحات بھی ہیں۔ شروع میں ترجمہ کا مجمل تعارف اور سورتوں کی فہرست درج ہے۔ اس کے بعد اصل ہندی ترجمہ ہے جو بلا متن کے ہے۔

(۲) شیخ محمد یوسف صاحب ایڈیٹر اخبار "نور" قادیان ضلع گورداسپور پنجاب۔ آپ نے بھی قرآن شریف

کا ایک ہندی ترجمہ قرآن شریف کا ہندی انواد (قرآن شریف کا ہندی ترجمہ) کے نام سے شائع کیا ہے۔ مترجم کے فرائض ایڈیٹر صاحب نے خود انجام دیے ہیں جس میں غیر مسلم خاص کر ہندوؤں اور سکھوں کے مذاق کو پیش نظر رکھا ہے۔ یہ ترجمہ بھی بغیر عربی متن کے ہے۔ کہیں کہیں حاشیے پر برائے نام بعض الفاظ کی مختصر تشریح کر دی گئی ہے۔ ترجمے کی زبان اچھی ہے۔ خط اتنا جلی ہے کہ پڑھتے وقت آنکھوں کو سکون ملتا ہے۔ اس مجلد ترجمے کا طول دس انچ اور عرض چھ انچ ہے۔ صفحات کی تعداد ۲۲۴ ہے۔ بوسیدہ نسخہ مجھے دستیاب ہوا ہے اس میں قیمت اور سن طباعت درج نہیں ہے۔ طابع کا نام پنڈت دولت رام شرما ہے اور راشٹر پریس بازار ہال امرتسر (پنجاب) میں طبع ہوا ہے۔

(۳) خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی (آپ کا مختصر ذکر پہلے آچکا ہے) نے قرآن مجید کا ہندی ترجمہ و ہندی تفسیر کے نام سے ایک ترجمہ مع تفسیر کے دو جلدوں میں شائع کیا ہے۔ پہلی جلد اکتوبر ۱۹۲۸ء مطابق ربیع الثانی ۱۳۴۷ھ اور دوسری جلد ۱۹۲۹ء میں طبع ہوئی ہے۔ پہلی مجلد کتاب کا طول تیرہ انچ اور عرض دس انچ ہے۔ صفحات کی تعداد ۹۰۰ ہے۔ ہدیہ قسم اول دس روپیہ فی جلد اور قسم دوم پانچ روپیہ فی جلد ہے۔ اسے ابن عربی کارکن حلقہ مشائخ دہلی نے شائع کیا ہے اور ہندوستان الکٹرک پرنٹنگ ورکس دہلی میں طبع ہوا ہے۔

عربی متن اورنگ زیب عالمگیرؒ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآن مجید کا فوٹو (عکس) ہر صفحے پر ہے اور اس کے سامنے شمس العلماء مولانا ڈپٹی نذیر احمد صاحب مرحوم دہلوی کا مشہور و مقبول اردو ترجمہ ہے۔ ہندی رسم الخط میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ حاشیے پر مولانا خواجہ حسن نظامی صاحب کا ہندی ترجمہ اور ہندی تفسیر ہے۔ جو مولانا غلام محمد صاحب (فارغ دیوبند) سابق پنڈت کیشو رام شرما اور دوسرے کئی نامور ہندو دان ہندی ترجمہ کرنے والوں کی امداد سے پانچ سال کے عرصے میں تیار ہوا ہے۔ خواجہ صاحب نے بڑی محنت اور جاں فشانی سے یہ خدمت انجام دی ہے۔ شروع میں ایک مجمل تمہید بھی ہے جو پانچ صفحات کی ہے۔

(۴) قرآن مجید کا ایک اور مکمل ہندی ترجمہ مولانا احمد بشیر صاحب فرنگی محلی نے ترتیب دیا ہے۔ اس ترجمے کا نام قرآن شریف ہے جو بغیر عربی متن کا ہے کہیں کہیں حاشیے پر ضروری نوٹ بھی پائے جاتے ہیں۔ شروع میں مختصر تمہید پھر مندرجہ بالا دہلوی صاحب کا مقدمہ قرآن شریف پر ایک نظر کے عنوان سے شامل ہے جو سولہ صفحات

پرشل ہے۔ ترجمے کی زبان بہت آسان ہے۔

اس ترجمے کو تری پربھاکر ساہتیہ لوک نے رانی گڑھ لکھنؤ سے شائع کیا ہے۔ اس کا سائز ۳۰×۲۰/۱۶ ہے اور ضخامت چھ سو آٹھ صفحات ہے۔ ہدیہ صرف آٹھ روپیہ ہے۔ پہلی بار دو ہزار کی تعداد امین آباد (بجاز) پریس، امین آباد پارک لکھنؤ میں طبع ہوا ہے۔ سنہ طباعت درج نہیں ہے۔ البتہ دیباچے سے قیاس ہوتا ہے کہ یہ ترجمہ آزادی (۱۵ اگست ۱۹۴۷ء) کے بعد شائع ہوا ہے۔

(۵) جنوری ۱۹۶۶ء میں ابوسلیم محمد عبدالحی صاحب مدیر الحسنات، رام پور یوپی نے بڑے اہتمام کے ساتھ ایک مکمل اور مجلد ہندی ترجمہ مع عربی متن کے شائع کیا ہے جس کا نام قرآن مجید ہے۔ اس کا سائز ۲۰×۲۶/۱۶ ہے اور صفحات ایک ہزار سے بھی زیادہ ہیں۔ ہدیہ دس روپیہ اسی نئے پیسے ہے۔ پہلا ایڈیشن پانچ ہزار کی تعداد میں طبع ہوا ہے۔ جلد خوب صورت، خوش نما اور دیدہ زیب ہے — گرد پوش رنگین اور کاغذ عمدہ سفید گلیزڈ ہے۔ طباعت نفیس آفسٹ اور بہترین ٹائپ کی ہے۔ صفحات کی تعداد زیادہ ہونے کے باوجود حجم نہایت موزوں اور مناسب ہے۔

یہ ترجمہ محمد فاروق خاں صاحب سلطان پوری نے کیا ہے۔ ترجمے کے ساتھ آپ نے اس کا ایک مفصل مقدمہ بھی لکھا ہے۔ علاوہ ازیں حواشی، تفسیری اشارات اور اصطلاحی الفاظ کی تشریح بھی لکھ کر کتاب میں شامل کی ہے۔

اس دینی خدمت کو موصوف نے بڑی محنت، لگن اور والہانہ انداز سے تقریباً پانچ سال میں انجام دیا ہے۔ ترجمے کی زبان عام فہم اور ادبی رنگ لیے ہوتے ہے۔ اس ترجمے کا دیباچہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے قلم سے ہے۔ مولانا موصوف کا ایک مضمون "قرآن اور پیغمبر" بھی شامل کتاب ہے۔ اس کے علاوہ دو مختصر تعارفی مضمون کتاب کے شروع میں اور شامل کیے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک مضمون مولانا صدرالدین صاحب اصلاحی کا ہے اور دوسرا وحیدالدین خاں صاحب کا ہے۔ شروع میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مختصر سوانح حیات اور مضامین قرآنی کی ایک فہرست بھی شامل کی ہے۔ یہ سوانح اور فہرست ابوسلیم محمد عبدالحی صاحب کی تیار کردہ ہے۔

کتاب کے بالکل آخر میں قرآن مجید کے بارے میں مولانا مودودی صاحب کا ایک ذاتی تجربہ تاثر "شاہ کلید" کے عنوان سے درج کیا گیا ہے۔

قرض قرآن مجید کا یہ جدید ترین ہندی ترجمہ سیرت وصورت کی تمام خوبیوں سے آراستہ ہے۔
مذکورہ بالا تراجم کے علاوہ کچھ اور ہندی ترجمے بھی پائے جاتے ہیں۔ مثلاً ۱۹۲۳ء کے قبل دہلی کے
پنڈت جی نے دو پاروں کے ترجمے شائع کیے ہیں یا عیسائیوں اور آریہ سماجی حضرات نے بھی قرآن مجید کے
ہندی ترجمے شائع کیے ہیں وہ مجھے تلاش کے باوجود مل نہیں سکے لہٰذا ان کا تعارف کرانے سے۔

مرکز جماعت اسلامی عمارت فنڈ

رفقاء سے تعاون کی اپیل

مرکز جماعت اسلامی کی موجودہ عمارت جس میں چند مرکزی شعبوں کے دفاتر رکھے گئے ہیں، جماعت کی ضرورت کے لیے ناکافی ہے یہی وجہ ہے کہ جماعت کے بعض مرکزی شعبے ماہنامہ زندگی، رسالہ کانتی (ہندی) شعبۂ تصنیف وغیرہ ابھی تک رام پور سے دہلی منتقل نہیں کیے جاسکے ہیں اور جن شعبوں کی منتقلی ہوچکی ہے ان کی ضرورتیں بھی پوری نہیں ہورہی ہیں۔ جگہ کی کمی کی وجہ سے مکتبہ اور بیت المال کو خاص طور سے بڑی دشواریاں درپیش ہیں۔ ان سب ضرورتوں کا تقاضا تھا کہ ایک وسیع تر مکان کا انتظام ہو۔ چنانچہ جماعت کی مجلس شوریٰ نے ایک مکان کی جو بازار چتلی قبر (جامع مسجد) میں واقع ہے۔ خرید لینے کا فیصلہ کیا ہے اور سوا لاکھ (۱۲۵۰۰۰) روپیے میں طے کرکے بیعانہ دے دیا گیا ہے۔

معاہدہ کی رو سے ۱۸ر اکتوبر ۶۶ء تک رقم داخل کرکے مکان کی رجسٹری کرا لینی ضروری ہے۔ اس لیے اس مدت سے پہلے رقم فراہم ہوجانی چاہیے جس کے لیے رفقاء جماعت سے اعانت کی اپیل کی جاتی ہے۔ توقع ہے کہ آپ حسب استطاعت اس اہم ضرورت میں ضرور ہاتھ بٹائیں گے اور اپنی رقمیں جلد سے جلد مرکز کے پتہ پر بھیجیں گے۔

اعانت کے علاوہ قرض کے طور پر بھی رقمیں درکار ہونگی جو حضرات اس سلسلے میں حصہ لینے کے موقف میں ہوں اور قرض پر دینا پسند فرمائیں وہ اپنی رقم کی مقدار اور واپسی کی شرطوں سے مطلع فرمائیں مالی رقمیں شرطیں طے ہوجانے کے بعد منگوائی جائیں گی۔

قرض دینے والوں کے اطمینان کے لیے یہ عرض ہے کہ مجلس شوریٰ میں یہ بات طے ہوچکی ہے کہ بوقت ضرورت مرکز کی موجودہ عمارت یا اور کوئی جائداد فروخت بھی کی جاسکتی ہے۔ اس لیے ان شاء اللہ قرض سے حاصل شدہ رقموں کی ادائیگی وعدے کے مطابق کی جا[illegible]

قیم جماعت اسلامی ہند   سوئی والان دہلی ۶

تناسخ کی افادیت اور ثمرات

جناب سلطان مبین صاحب ایم اے (سنسکرت)

(۱) تخلیق شر کے الزام سے خداوند کی برأت

قدیم بھارت کے اباحت پسند ملاحدہ نہ کسی خالق و مالک کے قائل تھے نہ کسی جوابدہی اور سزا و جزا کے معتقد تھے۔ "بن زندگی نہ رو پیدا ز جسم سوختہ" ان کا دل فریب نعرہ تھا۔ وہ زندگی کو پانی کی لہر کی طرح درخت کے پھل کے مانند سمجھتے تھے۔ مہابھارت: انوشاسن: ۱۴۵ ص۲۲۶ کبھی کبھی وہ زندگی کی نمود و نمود کی مثال تاروں کے طلوع و غروب سے دیتے تھے۔ مہابھارت: انوشاسن: ۱۴۵ ص۲۲۹ شاید اسی تشریح نے تناسخ کی بڑی مدد کی[1] ملحدوں کا یہ مکتب فکر وجود باری کا سخت منکر تھا۔ بعد کے بودھ متکلمین نے ملحدوں کی اس روایت و سنت کو زندہ رکھا۔ یہ لوگ وجود باری کے منکر تھے مگر تناسخ کے قائل تھے۔ برہمن متکلمین وجود باری اور تناسخ دونوں کے معتقد تھے۔ بودھ متکلم چونکہ وجود باری کے سخت منکر و مبطل تھے اس لیے برہمن متکلمین نے ان کو "ناستک" کہا ہے۔ ان ناستک متکلمین کو وجود باری پر یہ اعتراض تھا کہ کائنات کا دکھ درد قتل و خون، مرض و مرگ، غم و کرب، نالہ و شیون کسی معقول ذہن کے پیدا کردہ ہو ہی نہیں سکتے۔ جنگلوں اور سمندروں مخلوق کی باہم چیر پھاڑ اور دھر پکڑ کسی ذہن خالق کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ خود مہاتما بدھ نے اپنے بیشتر ملفوظات میں مرض بڑھاپا اور موت کے دکھ کا رونا رویا ہے۔ چنانچہ ان کے متبعین پر بھی غم و الم کا رنگ کچھ اس طرح چڑھ گیا کہ انھوں نے عالم کی مسرتوں، شادمانیوں، رنگینیوں اور صناعیوں سے آنکھیں بند کر لیں۔ مریض کی افسردہ صورت بوڑھے کی ٹیڑھی کمر اور مردوں کی سفید ہڈیوں کے مناظر نے ان بزرگوں کو کچھ اس طرح بدکا دیا کہ انہیں پھولوں کے نکھار، پھلوں کی مٹھاس، چہ مہ و پی

---

[1] "برہمن" گرنتھوں نے اس سے پہلے ہی یہ نظریہ دے دیا تھا کہ دیوتا اپنے آپ کو گھوڑا، گھوڑی، بکرا، گائے کی شکل میں بدل لیتے ہیں

کی سریلی آواز، جانوروں کے کھیل کود، انسانیت کی موزونیت، ذہانت، صناعی و تخلیق پر نظر ڈالنے کا موقع نہیں ملا۔ سخت تعجب ہوتا ہے۔ مہاتما بودھ جیسا ذہین انسان کیوں غم و الم، ظلم و ستم، نالہ و شیون سے اس قدر متاثر ہو گیا کہ انھوں نے جملہ فرح و انبساط، عدل و انصاف، ساز و طرب کو دنیا میں معدوم پایا۔ غم و الم کی فراوانی نے ان کو نظام کائنات کی موزونیت پر غور و فکر کرنے کا موقع نہیں دیا۔ پیچھے چل کر برہمن متکلمین نے جب "عالم کے حسن ترتیب سے وجود باری پر — جیسا کہ گھڑے سے کمہار کی ذات پر — دلیل قائم کیا تو بودھ متکلم کائنات کو — دیگ کی مٹی کی طرح — بے ہنگام قرار دیتے رہے اور ابطال باری پر غم و الم سے دلائل پیش کرتے رہے اور برہمن متکلم غم و الم کا جواب تناسخ سے دیتے رہے۔ انھوں نے بھی اس نکتہ کو نہیں سمجھا کہ کائنات میں خوشی اور مستی کا پلہ بہرحال غم و الم سے بدرجہا زیادہ ہے اور پھر خوشی کا وجود خود رنج کے وجود پر منحصر ہے اور پھر "باضدادہا تتبین الاشیاء" برہمن متکلمین نے دنیا کو غم کدہ اور قعر دریا مان کر ڈبکیوں اور غوطوں کا جواز تناسخ سے پیدا کیا۔ چنانچہ جانوروں اور مچھلیوں کی باہم مار کاٹ تناسخ کے سبب سے ہے۔ مرض و موت تناسخ کے سبب سے ہے۔ رنج و غم، ذلت و مسکنت تناسخ کے سبب سے ہے۔ عزت و ثروت بھی لازماً تناسخ کا نتیجہ ہیں۔ ماں کا دودھ، نرم گدا، باپ کی تونگری، بچہ کی یتیمی، عورت کی بیوگی، اندھاپن، گونگاپن، بہراپن، چھ انگلیوں کا ہونا، سب کی سب باتیں تناسخ کے سبب سے ہیں۔ غرضیکہ تناسخ کے ذریعے دکھ درد کے دھبے کو — خداوند کے دامن — سے دھویا گیا۔ خدا کی غیر جانبداری، عدل و انصاف کو برقرار رکھنے کے لیے۔ تناسخ کا بھرپور استعمال کیا گیا۔ بس یہی تناسخ کی خدمت ہے افادیت ہے جو اس نے سرزمین ہند میں انجام دیا۔

۲۔ **طبقاتی سکون** سماج اور فرد جب اپنی حیثیت پر مطمئن ہو جاتا ہے۔ اپنے حال پر خوش ہو جاتا ہے۔ تب وہ اپنی دولت و حشمت کو خداوند کا کرم سمجھنے لگتا ہے۔ اموال و اولاد کو خداوند کے تقرب کی علامت سمجھتا ہے۔ اپنی خوش حالی سے یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ دنیا و آخرت دونوں جگہ اسے سکھ چین نصیب ہوگا۔ کرم سکھا میں فریب میں کافر کیا اچھے خاصے مومن افراد بھی گرفتار ہیں۔ قدیم ہندوستان کے شریف بھی کچھ اسی نہج پر سوچتے تھے۔ جب شریف زادے (آریہ) اپنی دولت و حشمت کو دیوتاؤں کا کرم سمجھتے ہوں گے تو دوسروں کے افلاس و مسکنت کو لازماً خداوندوں کا عتاب سمجھتے ہوں گے۔ دولت کو خداوند کا کرم اور غربت کو خداوند کا عتاب سمجھنے کے خیال کو [illegible] برہمنوں نے تناسخ سے مدلل و [illegible]

اس جنم کی دولت پہلے جنم کی نیکی کا انعام واکرام ہے اور اس جنم کی مسکنت و افلاس پہلے جنم کی بدی کی سزا اور پاداش ہے آریہ فاتح تھے غیر آریہ مفتوح تھے آریہ آقا تھے غیر آریہ غلام تھے۔ آریہ دولتمند و تونگر تھے۔ غیر آریہ محنت کش اور فاقہ مست تھے اور یہ دولت و تونگری محنت اور بھوک پہلے جنم کے لازمی نتائج تھے۔ اس طرح دولتمند اور مزدور دونوں طبقے کو تناسخ کے عقیدے سے خوش و مطمئن کر دیا گیا۔ استحصال کی راہ ہموار کر دی گئی۔

تناسخ کے ثمرات

۱۷۔ ہر ایک اچھا درخت اچھا پھل لاتا ہے اور برا درخت برا پھل لاتا ہے۔ ۱۸۔ اچھا درخت برا پھل نہیں لاسکتا، نہ برا درخت اچھا پھل لاسکتا ہے۔ ۱۹۔ جو درخت اچھا پھل نہیں لاتا وہ کاٹا اور آگ میں ڈالا جاتا ہے۔ ۲۰۔ پس ان کے پھلوں سے تم ان کو پہچان لوگے (متی: ۷، ۱۷-۱۹)

اے جمہور۔ جب یہ نقش ذہن میں پوری طرح ابھار دیا گیا کہ لوگ اس زندگی کو گذری ہوئی زندگی کا سایہ سمجھیں۔ اس زندگی کے شیشے کی رنگت سے سابق جنم کے نور و شعاع کا اندازہ لگائیں۔ کیونکہ یہ زندگی دراصل پہلی و آخری زندگی نہیں ہے بلکہ ہماری یہ زندگی ایک ازلی و ابدی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ہر سابق زندگی لاحق زندگی کے لیے "علت" کا درجہ رکھتی ہے۔ اس زندگی کے سکھ و دکھ کا سہرا پہلی زندگی کے سر پر باندھا جائے۔ بھارتی کرم (تقدیر) دراصل کرم (عمل) سے عبارت ہے۔ یعنی موجودہ زندگی کو گزشتہ زندگی کے اعمال کا نتیجہ سمجھنا چاہیے۔ اس زندگی کے سکھ دراصل پہلے جنم کی نیکیوں کے میٹھے پھل ہیں۔ اس جیون کے دکھ درد پہلے جنم کی بدیوں کے خار اور کانٹے ہیں۔ لوگ دھن دولت کو تنگی اور عسرت کو اپنی کمائی کا نتیجہ سمجھنے لگے۔ حالانکہ دھن دولت آنی جانی اور ہر روز بدلنے والی چیز ہے۔ سکھ دکھ بھی دائمی چیز نہیں ہیں، جب ان متحرک و زوال پذیر چیزوں کو اپنی کرنی کا پھل سمجھنے لگے تو اضافہ مستقل اور غیر متبدل چیزوں کو بالخصوص "نتیجہ عمل" سمجھنا ہی چاہیے۔ چنانچہ ایسا ہوا بھی۔ جات برادری، روپ رنگ کو بھی خداوند کی نعمت یا لعنت سمجھا جانے لگا۔ خداوند برہمن کے گھر جس بچے کو پیدا کرتا ہے اس کو برہمن ہی ہونا چاہیے اور چنڈال کے بچے کو چنڈال ہونا چاہیے۔ برہمن کا بچہ اسی لیے برہمن کے گھر میں پیدا ہوا ہے کہ اس کو معزز و مخدوم بنتا ہے اور چنڈال کے گھر کا بچہ خادم بنا کر دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ جو بچہ جس باپ کے گھر پیدا ہوا ہے اس کو اپنا آبائی پیشہ کرنا چاہیے اسی لیے تو خداوند نے اس کو اس گھر میں پیدا کیا ہے اگر اس سے دوسرا کام کروانا ہوتا تو بچے کو دوسرے گھر میں پیدا کیا گیا ہوتا۔ چونکہ اس نظریہ و عقیدہ میں برسر اقتدار طبقے کو نفع ہی نفع تھا اس عقیدے کی رو سے اس کو

پیدائشی قرباں بردار غلام و خدمت گار خود بھگوان کے یہاں سے مل جاتے تھے اس لیے یہ عقیدہ ان کا تو بجا یا طور پسند عقیدہ ہو گیا۔ اس عقیدے کے جادو نے اولاً شودروں کو (غلاموں، خدمت گاروں کو) ذہنی طور پر غلام ابن غلام بنا دیا۔ اگر کہیں کسی شودر نے خدمت کے پیدائشی حق سے روگردانی اور گردن کشی اختیار کیا تو آریوں کا سماج شریعت برادری اس کا دماغ ٹھیک کر دیتی تھی۔ اگر شانزدتا درمعاملہ حکم تک پہنچا تو پیدائشی خدمتگار کو جان سے ہاتھ دھونا پڑتا تھا۔ غرضیکہ اس طرح سے بھارت ورش میں جاہل سے جاہل برہمن مخدوم و مسجود بنا رہا۔ دستکار و خدمتگار شودر قرنہا قرن پیدائشی غلامی کے دام میں جکڑے رہے راجہ و تاجر برہمنوں کو نذر و نذرانہ دے دے کر خوش کر کرکے۔ اس رذیل طبقے سے استحصال کرتا رہا۔ دنیا میں ایسی مثال کہیں نہیں ملے گی کہ کچھ خاندان ہزاروں سال سے معزز و محترم، متمول و حاکم بنے رہے ہیں۔ بادشاہ و تلقین کے گدے پر بیٹھے رہے ہیں۔ اور کچھ خاندان ہزاروں سال سے مردار کھاتے رہے ہیں۔ پاخانہ پھینکتے رہے ہیں چوہے اور کتے پر زندگی گذاریں۔ گیدڑ اور لومڑی کا شکار کرتے رہیں۔ شودر بھی اپنی بدحالی و تنگدستی ذلت و رسوائی کو "خود کردہ را علاج نیست" کے طور پر برداشت کرتا رہا۔ وہ اپنے افلاس و فاقہ مستی کو خدا کا عذاب سمجھ کر اس کو دور کرنے کی جرأت کر کے اور زیادہ گنہگار کیسے بنتا۔ جب گرفتار بلا ہی مصیبت سے نکلنا نہ چاہتا ہو تو اس طبقے سے کیونکر کوئی نجات دہندہ یا مردک پیدا ہوتا۔

یہاں یہ موقع تو نہیں کہ یہ بات تفصیل سے بتائی جائے کہ جات پات پر کتنا سخت احتساب تھا۔ کتنی سخت دارو گیر تھی۔ مگر یہ سختی دراصل اس وجہ سے تھی کہ عوام و خواص نہایت ایمانداری سے یہ سمجھتے تھے کہ جات برادری تکوینی تقسیم ہے۔ بھیڑ، بکری، گھوڑے اور گدھے کی طرح۔ انسان بھی برہمن، کشتری، ویش اور شودر پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے اگر کوئی شخص اپنے آبائی پیشے کو چھوڑ کر دوسرا کام کرتا تھا تو وہ قابل گردن زدنی سمجھا جاتا تھا۔ یہ تبدیلی اتنا بڑا گناہ تھی کہ اس زمانے کی برہمنی تہذیب اس کے تصور ہی سے کانپ جاتی تھی۔

ہ یہ تکوینی نظریہ اتنا مقبول و عزیز تھا کہ اس کی سند "پرش سوکت" ہر چہار ویدوں میں نقش کر دیا گیا۔ ۵) جب دیوتا (پرش) کو انھوں نے تقسیم کیا اس کے کتنے حصے بنائے؟ اس کا منہ اس کے بازو اس کی رانیں اس کے قدم کیا کہلائے؟ ۶) اس کا چہرہ برہمن ہو گیا۔ اس کے بازو راجہ بن گئے۔ اس کی رانوں سے ویشیہ اور دونوں قدموں سے شودر پیدا ہوئے۔ ۱۲) اس سے گھوڑے پیدا ہوئے جو دوہرے دانتوں والے ہیں۔ اس سے گائے پیدا ہوئے اور اس سے بھیڑ بکریاں پیدا ہوئیں۔ پرش سوکت۔ دیکھو "انسان، جانور، پرندے، درخت" [illegible] سب خدا کی بنائی ہوئی ہیں جیسے جانوروں (باقی اگلے صفحہ پر)

نکتہ: ہندو دھرم پر عامیانہ نظر ڈالنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مذہب سنجیدگی سے خالی ہوگا۔ مگر مذہب تو زندگی میں سنجیدگی لانے کے لیے ہی برپا ہوتا ہے۔ ہر مذہب اپنی کلیات اور اصول میں سخت سنجیدہ ہوتا ہے ہندو مذہب جات پات کے بارے میں سخت سنجیدہ ہے۔ جات پات ہندو مذہب کے بہمات مسائل میں سے ہے اور جات پات کی تبدیلی اور اختلاط کو "ارتداد" کا درجہ حاصل ہے۔ ہندو مذہب نے اپنی پوری سنجیدگی "جات پات" کی استواری پر لگا دی ہے۔ الحاصل ہندو مذہب بھی بھرپور سنجیدہ ہے مگر اس کی سنجیدگی کا مرکز اپنا الگ ہے۔ ہر دین را مزاجے، رنگے و قبلہ گاہے۔

راجہ کے فرائض میں سے تھا کہ وہ لوگوں پر کڑی نظر رکھے کہ کہیں "ورن سنکر" اختلاط قومیت نسل و پیشہ" وجود پذیر تو نہیں ہو رہا ہے۔ اگر کوئی شودر خدمت کا کام چھوڑ کر ریاضت، تپسیا اور یاد الٰہی میں مشغول ہوتا تو خداوندوں کا غضب زمین پر نازل ہوتا اور "موت طفلی" ظہور پذیر ہونے لگتی تھی۔ چنانچہ ہم پڑھتے ہیں کہ شری رام چندر جی کے عہد حکومت میں ایک برہمن کے لڑکے کا انتقال ہو گیا۔ رعایا اس "اکال موت" سے سخت گھبرائی۔ رام چندر جی نے جب اکال موت کا سبب ڈھونڈھا تو پایا ایک شودر خدمت گزاری کا دھرم چھوڑ کر تپسیا میں مشغول ہو گیا ہے۔ آنجناب نے موت کے سبب کا ازالہ کیا۔ لڑکا زندہ ہوا[۲]۔ یہ کتھا سو بار غیر معتبر سہی مگر یہ بات تو ثابت ہی کر دیتی ہے کہ قدیم بھارت میں "جاتی دھرم" کا چھوڑنا ایک جرم تھا۔ شرفا نہایت ایمان داری سے یہ سمجھتے تھے کہ خداوند نے رذیلوں کو ہماری خدمت کے لیے پیدا کیا ہے۔

۴۱۳۔ خریدے ہوئے یا نہ خریدے ہوئے شودر سے غلامی کروائے۔ کیونکہ خداوند خدا نے اسے برہمن کی غلامی کے لیے پیدا کیا ہے۔ ۴۱۴۔ مالک سے چھٹی پا جانے کے باوجود بھی شودر غلامی سے آزاد نہیں ہوتا۔ کیونکہ غلامی تو اس کا پیدائشی حق ہے۔ کون اس کو اس (غلامی) سے چھڑا سکتا ہے۔ ۴۱۸۔ راجہ ویش (عوام) اور شودر (غلام) سے با احتیاط اپنے اپنے کام کروائے۔ اگر یہ دونوں اپنے اپنے پیشے سے ہٹیں گے تو

بقیہ حاشیہ) میں گدھے، گھوڑے، ہاتھی وغیرہ جاتیاں۔ درختوں میں پیپل، برگد، آم وغیرہ، چڑیوں میں ہنس، بگلا، کوا، آبی جانداروں میں مچھلی، گھڑیال الگ الگ جات ہیں۔ ویسے انسانوں میں برہمن، کھشتری، ویش، شودر اور پردیسی الگ الگ جات خدا کی بنائی ہوئی ہیں۔ مگر انسانوں میں برہمن کو عام جات میں نہیں مگر عام مختص جات میں گنتے ہیں۔ ستیارتھ پرکاش یہ خیال انیسویں صدی کے نصف ثانی کے ایک بہت بڑے ہندو مصلح کے قلم سے نکلے ہیں۔

[۲] تفصیل کے لیے دیکھیے۔ بالمیکی رامائن: اتر کانڈ: ابواب ۷۴۔ ۷۵۔ ۷۶

اس دنیا کو تہ و بالا کر ڈالیں گے ۔ منوسمرتی: ۸ : ۴۱۳ ۔ ۴۱۸

برہمن متکلمین و فقہا، جات پات "پجاری" راجہ، عوام، غلام "کی تقسیم کو جس طرح خدائی تقسیم سمجھتے تھے اسی طرح اپنے اپنے دھرم کو "خداداد" سمجھ کر اپنے دھرم پر قائم رہنا ضروری سمجھتے تھے ۔ جب جین و بدھ دھرم مذہب کے وجود پذیر ہونے سے پہلے دھرم کے بدلنے کا کوئی خاص مسئلہ نہیں تھا ۔ مگر رقیب مذہبوں کے موجود ہو جانے پر تبدیل مذہب کا مسئلہ بھی خاصی نوعیت رکھنے لگا چنانچہ برہمن متکلمین اپنے مذہب پر جمے رہنے کے لیے یہی دلیل پیش کرتے تھے کہ جس مذہب پر جس کا جنم ہوا ہے وہ اسی (آبائی) پر جما رہے ۔ آبائی مذہب باپ دادا کا دھرم قابل اختیار و ترجیح ہے ۔

۴۷ ۔ اچھائیوں سے خالی اپنا مذہب دوسرے کے خوبیوں والے مذہب سے بہتر ہے ۔ پیدائش کے ذریعے مقرر کیے گئے ہوئے اعمال کو کرنے والا انسان گنہگار نہیں ہوتا ۔ ۴۸ ۔ ابن کنتی! (ارجن) برائیوں سے بھرے ہوئے بھی آبائی کام کو ترک نہیں کرنا چاہیے ۔ کیونکہ سب ہی کام برائیوں سے اسی طرح گھرے ہوئے ہیں جس طرح آگ دھوئیں سے گھری رہتی ہے ۔ گیتا : ۱۸ : ۴۷، ۴۸ (مہابھارت : بھیشم : ۴۲ : ۴۷، ۴۸ ۳۵ ۔ اچھائیوں سے خالی اپنا (آبائی) مذہب دوسروں کے اچھے مذہب سے بہتر ہے ۔ اپنے مذہب پر مرجانا اچھا ہے ۔ دوسرے کا مذہب خطرے سے خالی نہیں ہے ۔ گیتا : ۳ : ۳۵ (مہابھارت : بھیشم : ۲۷ : ۳۵) دیگر ۔ ۹۵ ۔ کشتری بدحالی میں ان سب (تجارت) کے طریقوں سے زندگی گزارے ۔ مگر کبھی بھی اونچے درجے کے (برہمن کے) طریقے سے روزی نہ کمائے ۔ ۹۶ ۔ نیچی جات کا جو شخص لالچ میں پڑ کر اعلیٰ درجے کے لوگوں کے کاموں سے روزی کماتا ہے ۔ راجہ فوراً ہی اس کا مال ضبط کر کے جلا وطن کر دے ۔ ۹۷) اپنا نااہل پیدائشی دھرم دوسرے کے اچھے دھرم سے بہتر ہے ۔ دوسرے کے دھرم (پیشہ) سے روزی کماتا ہوا انسان اپنی برادری سے گر پڑتا ہے ۔ منوسمرتی : ۱۰ : ۹۵ ۔ ۹۷ (باقی)

مسلم مجلس مشاورت پر فرقہ پرستی کا الزام

ہندوستانی مسلمانوں کا نیشنلسٹ گروپ مسلم مجلس مشاورت پر فرقہ پرستی اور ایک نئی مسلم لیگ ہونے کا الزام لگا رہا ہے۔ حالانکہ اس کے مرکزی صدر و نائب صدر دونوں ہی قوم پرور حلقے کے قدیم اور ممتاز رہنما ہیں اور جو لوگ اس مجلس کی تائید کر رہے ہیں ان میں قدیم قوم پروروں کی اچھی خاصی تعداد شامل ہے۔ میں الزام لگانے والوں کی خدمت میں دو باتیں ان کے غور و فکر کے لیے عرض کرنا چاہتا ہوں۔

پہلی بات یہ کہ سابق مسلم لیگ جو ابتداً ایک کمزور سی سیاسی جماعت تھی اور مسلمانوں میں اس کا کوئی خاص وزن نہ تھا اتنی مقبول کس طرح بن گئی کہ ان کی اکثریت میں اسی کا طوطی بولنے لگا اور مسلمان عوام ہر طرف سے ہٹ کر اسی کے پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے۔ پھر یہ کہ مسٹر جناح جو صرف عملی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ بعض مذہبی عقیدے کے لحاظ سے بھی مسلم اکثریت کے ہم نوا نہ تھے، اکثر عوام اور بہت سے علماء و مشائخ کے سیاسی امام کس طرح بن گئے؟ اس سوال پر کبھی انصاف اور خلوص کے ساتھ غور کیجیے۔

ہندوستان کی تاریخ گواہ ہے کہ مسلم لیگ کو مسلمانوں کی طاقت ور سیاسی تنظیم بنانے میں مسلم نیشنلسٹ گروپ نے بھی ایک مؤثر عامل کی طرح کام کیا ہے اس کی صورت یہ ہوئی کہ اس گروپ نے صرف یہی نہیں کہ مسلمانوں کی جائز شکایات، جذبات، مطالبات اور ان کے حقیقی اندیشوں کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ان سب چیزوں کو بے رحمی اور بے بصیرتی کے ساتھ رد کر دیا۔ مسٹر جناح نے ان کی جائز شکایات اور ان کے حقیقی اندیشوں کو سمجھا ان کو وزن دیا اور ان کے مسیحا بن کر سامنے آ کھڑے ہوئے۔ اب مسٹر جناح کی سیاست ان کے دل کی آواز بن گئی۔ رفتہ رفتہ اس سیاست نے مطالبہ پاکستان میں شدت پیدا کی کشمکش تیز ہوئی۔ مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ کے ترانے گونجنے لگے اور لے کے رہیں گے پاکستان کے نعرے فضا میں ارتعاش پیدا کرنے لگے۔

آخر کار یہ ملک تقسیم ہو کر رہا۔ اگر آں جہانی شری جواہر لال نہرو نے مسلمانوں کی تہذیب، ان کی انفرادیت ان کی شکایات اور ان کے اندیشوں کو نہیں سمجھا اور اپنی بے لچک نیشنلزم پر اڑے رہے تو انہیں معذور سمجھا جا سکتا ہے لیکن مسلم نیشنلسٹ گروپ کی ضد اور ہٹ دھرمی کے لیے کوئی معقول عذر موجود نہیں ہے۔ جس رفتار سے یہ گروپ مسلمانوں کے جذبات کے خلاف اپنی جدوجہد تیز کرتا رہا۔ اسی رفتار سے یہ مسلمانوں میں غیر مقبول ہوتا گیا اور اس سے ان کی بیزاری بڑھتی گئی۔ میرا خیال ہے کہ اگر مسلم نیشنلسٹ گروپ، پچاس فی صدی بھی مسلمانوں کے جذبات کی قدر کرتا، ان کے مطالبات پر کان دھرتا اور آگے بڑھ کر کانگریس سے ان کے مطالبات منوانے اور ان کے اندیشوں کو دور کرنے میں واسطہ اور ذریعہ بننے کی پوزیشن اختیار کر لیتا تو مسلمانوں کی اکثریت، مسٹر جناح کو اپنا امام تسلیم نہ کرتی۔ دین و اخلاق، ایثار و قربانی اور دینی علم و فضل کے لحاظ سے ان کو مسلمانوں کے درمیان کوئی مقام حاصل نہ تھا۔ اس کے برعکس قوم پرور حلقے کے متعدد نمایاں افراد کا مسلمان بہت احترام کرتے اور انہیں اپنا صرف سیاسی نہیں بلکہ مذہبی رہنما بھی مانتے تھے لیکن جب ان رہنماؤں نے ان کے جذبات اور ان کے اندیشوں کو نظر انداز کر دیا اور مسلسل نظر انداز کرتے رہے تو وہ اس شخص کے ساتھ ہو گئے جو ان کے دل کی دھڑکنوں کو سنتا اور اس کی قدر کرتا تھا۔ اس صورت حال میں کون یہ کہہ سکتا ہے کہ تقسیم ہند سے پہلے کی مسلم لیگ کو ایک طاقت ور سیاسی تنظیم بنانے میں مسلم نیشنلسٹ حلقے کا ہاتھ نہ تھا۔ بلاشبہ یہ لوگ ایک مؤثر عامل تھے۔

دوسری بات قوم پروروں (نیشنلسٹ یا قوم پرور کا لقب اب بے معنی ہو چکا ہے لیکن یہ لوگ اپنے لیے اب بھی یہی لقب استعمال کرتے ہیں اس لیے ان کے پسندیدہ لقب سے ان کو مخاطب کیا گیا ہے) کی خدمت میں یہ عرض کرنی ہے کہ آپ لوگ پھر وہی غلطی کر رہے ہیں جو آپ نے تقسیم ہند سے پہلے کی تھی۔ آپ مسلم مجلس مشاورت اور اس کے موجدین سے کہتے ہیں کہ یہ لوگ تاریخ سے سبق لیں حالانکہ خود آپ کو اس سے سبق لینا چاہیے۔ مسلم مجلس مشاورت پر آپ فرقہ پرستی اور ایک نئی مسلم لیگ ہونے کا جو الزام لگا رہے ہیں وہ فہم و فراست اور حق و صداقت سے دور ہے۔ کسی پہلو سے اس پر یہ الزام چسپاں نہیں ہوتا۔ آپ اس بات سے ناواقف نہیں ہو سکتے کہ مسلم مجلس مشاورت کیوں بنی اور اس کا مقصد کیا ہے؟ آپ اس سے بھی ناواقف نہیں ہو سکتے کہ اس وقت اس کی لیڈرشپ کن لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔

آپ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی کچھ جائز شکایات ہیں اور ان کے کچھ حقیقی اندیشے ہیں جو آزادی کے

انیس سال گزر جانے کے بعد بھی دور نہیں ہوئے ہیں بلکہ ان کے اندیشوں میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ کانگریس نے مسلمانوں کے معاملے میں جو روش اختیار کر رکھی ہے اور مسلمان وزیروں، سفیروں، افسروں نیز پارلیمنٹ اور اسمبلیوں کے اکثر مسلمان ممبروں نے خود غرضی اور قومی بے غیرتی کا جو شرمناک رویہ اختیار کیا ہے وہ اس ملک کی اور بالخصوص مسلمانوں کی تاریخ کا ایک سیاہ باب ہے۔

اس صورت حال کو بدلنے کے لیے مسلمان کیا کریں؟ نیشلسٹ گروپ کا منشا یہ ہے کہ وہ جو کچھ انیس برسوں میں کرتے رہے ہیں وہی ہمیشہ کرتے رہیں اور وہ زیادہ سے زیادہ قومی دھارے سے قریب آئیں۔ اگرچہ آج تک یہ بات واضح نہیں ہوئی کہ قومی دھارا کیا چیز ہے اور اس سے قریب آنے کا مطلب کیا ہے؟

آپ لوگوں کے منشا اور نصیحت و ہدایت کے خلاف مسلمان عوام نے یہ سوچا کہ اب اس طرح ہماری مصیبتیں ختم نہ ہوں گی۔ مسلمانوں میں جو انتشار پایا جا رہا ہے اسے ختم ہونا چاہیے اور مسلمانوں کی جو جماعتیں الگ الگ کام کر رہی ہیں ان کے رہنماؤں کو ایک ایسا پلیٹ فارم بنانا چاہیے جہاں سب مل کر مشترکہ مسائل پر غور کریں اور انہیں حل کرنے کے لیے مشترکہ و متحدہ سعی کی جائے۔ ان کے اس احساس کی قوت پر مسلم مجلس مشاورت وجود میں آئی۔ اس مجلس نے اب تک جو کام کیا ہے اس میں فرقہ پرستی کا کہیں نام و نشان بھی موجود نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس اس نے سب سے پہلے ہندو مسلم ملاپ ہی کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور اب اس نے اپنا نو نکاتی منشور شائع کیا ہے اس میں بھی فرقہ پرستی کا کوئی نشان موجود نہیں ہے بلکہ معاملہ برعکس ہے۔

اس حقیقت کے باوجود نیشلسٹ گروپ اس پر فرقہ پرستی اور نئی مسلم لیگ ہونے کا الزام عائد کر رہا ہے۔ اس کو سوچنا چاہیے کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح اس نے تقسیم سے پہلے مسلمانوں کو دھکیل کر مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر جمع کرا دیا تھا اسی طرح اب وہ مسلم مجلس مشاورت کو دھکیل کر سابق مسلم لیگ کی راہ پر ڈال دینا چاہتا ہے۔

گویا آپ مسلم مجلس مشاورت سے کہہ رہے ہیں کہ تم مسلم لیگ نہیں ہو تو مسلم لیگ بن جاؤ — اگر آپ مجلس پر فرقہ پرستی کا الزام مسلمانوں کی جائز شکایات اور ان کے حقیقی اندیشوں کو نظر انداز کر کے لگا رہے ہیں تو یہ انتہائی بے رحمی ہے اور اگر آپ کا گروپ کانگریس کو خوش کر کے ذاتی مفاد حاصل کرنا چاہتا ہے تو یہ شرمناک خود غرضی ہے۔ خدا نخواستہ اگر آپ کی اس روش نے مسلمانوں کو پھر سابق مسلم لیگ کی راہ پر دھکیل دیا تو اس امت کا خون اور اس کی تباہی آپ کی گردن پر ہوگی۔ میری نصیحت غیر معروف سہی لیکن اگر میری ان باتوں میں کوئی وزن ہو تو ان پر ٹھنڈے دل سے غور کیجیے۔

رسائل و مسائل

زبردستی کی طلاق اور بیوی کا مہر

سوال

ایک شخص اپنی بیوی کی رخصتی کے لیے سسرال گیا۔ بیوی کے اعزا اقربا رخصت کرنے پر تیار نہ ہوئے اور جھگڑا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ وہ شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرنے لگے۔ اس کے انکار پر وہ لوگ تشدد پر اتر آئے اور دھمکی دینے لگے کہ اگر اس نے طلاق نہ دی تو اس کا ہاتھ پاؤں توڑ دیں گے۔ شوہر کو پہلے سے معلوم تھا کہ یہ لوگ بہت وحشی ہیں اور اپنی بہو کو جان سے مار چکے ہیں۔ مجبور ہو کر اس نے زبان سے ایک طلاق دی لیکن وہ لوگ تین طلاق پر اصرار کرنے لگے اور یہ سب کچھ اس کی بیوی کی مرضی سے ہو رہا تھا۔ شوہر نے خود سنا کہ وہ تین طلاق کا مطالبہ کر رہی ہے۔ آخر کار پھر مجبور ہو کر اس نے تین طلاق کی تحریر لکھ دی لیکن زبان سے صرف ایک ہی طلاق دی تھی۔ اس صورت میں دو سوال ہیں۔ پہلا یہ کہ اس صورت میں کیا تین طلاقیں واقع ہو گئیں۔ دوسرا یہ کہ جب بیوی نے خود اس کو طلاق دینے پر مجبور کیا اور اس طرح کہ اگر وہ نہ مانتا تو اس کو اپنے کسی عضو کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ تھا تو کیا اس صورت میں بھی بیوی مہر کی حق دار ہوگی۔ بعض جگہ سے اس طرح کا جواب آیا ہے کہ وہ ہر حال میں مہر کی مستحق ہوگی۔ لیکن یہ بات انصاف کے خلاف معلوم ہوتی ہے اگر واقعی اس صورت میں بھی وہ مہر کی مستحق ہے تو کتب فقہ حنفی کے حوالے سے جواب عنایت کیجیے۔

جواب

آپ نے جو تفصیل لکھی ہے اس کے لحاظ سے جواب یہ ہے کہ مجبوری کی حالت میں شوہر نے زبان سے جو

طلاق دی ہے اس کا اعتبار کیا جائے گا۔ تحریری طلاق کا اعتبار نہ ہوگا اس لیے اس کی بیوی پر طلاق رجعی واقع ہوئی۔ اگر شوہر نے عدت کے درمیان رجوع نہیں کیا ہے اور عدت گزر چکی تو اب وہ اس کی بیوی نہیں رہی۔ ہاں اگر صلح صفائی ہو جائے تو وہ اس سے دوبارہ نکاح کر سکتا ہے۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ اگر یہ بیان صحیح ہے کہ بیوی ہی نے طلاق پر مجبور کیا تھا اور صورت یہ تھی کہ اگر وہ طلاق نہ دیتا تو اس کے ہاتھ پاؤں توڑ دیے جاتے تو ایسی صورت میں مہر ساقط ہو جائے گا اور بیوی مہر سے محروم کر دی جائے گی۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے:۔

ولو كانت هي المسلطة فاكرهته على ان يطلقها ففعل لم يكن لها عليه شيء من المهر ولو كانت اكرهته بالحبس اخذت منه بنصف الصداق كذا في المبسوط (فتاویٰ عالمگیری کتاب الاکراہ)

اور اگر بیوی ہی مسلط ہو کر اس کو طلاق پر مجبور کرے اور شوہر طلاق دیدے تو وہ شوہر سے کچھ بھی مہر پانے کی مستحق نہیں رہے گی اور اگر اس نے قید کی دھمکی دے کر مجبور کیا تھا تو نصف مہر پانے کی حق دار ہوگی۔

یہی بات علامہ شامی نے فتاویٰ ظہیریہ کے حوالے سے لکھی ہے۔

فلو كان (اي الحامل على الاكراه) الزوجة لم يكن لها شيء عليه هذا اذا اكرهت بالملجيء واما بغيره فعليه نصف المهر كما في الظهيرية (رد المحتار کتاب الاکراہ)

پس اگر اکراہ آمادہ کرنے والی خود بیوی ہو تو شوہر کے ذمے اس کا مہر ساقط ہو جائے گا یہ اس صورت میں کہ اس نے اکراہ ملجی کرایا ہو اور اکراہ ملجی نہ ہو تو شوہر نصف مہر ادا کرنے کا ذمہ دار ہوگا۔

اکراہ ملجی و غیر ملجی کو مختصراً یوں سمجھیے کہ اگر کسی کو قتل کر دینے یا اس کے کسی عضو کو تلف کر دینے کی دھمکی دی جائے اور اندیشہ قوی ہو تو ایسے اکراہ کو اکراہ ملجی کہتے ہیں اور اگر صرف قید کرنے یا مار پیٹ کی دھمکی دی جائے تو اکراہ غیر ملجی ہے۔ آپ نے جو صورت بیان کی ہے وہ اکراہ ملجی کے تحت آتی ہے اس لیے عورت کا مہر ساقط ہو جائے گا۔

یہ جواب اس صورت میں ہے کہ شوہر کا بیان صحیح ہو۔ اگر صحیح نہ ہو یعنی بیوی نے اس کو طلاق پر مجبور نہ کیا ہو تو وہ مہر کی مستحق ہوگی۔

رضاعی بہن کی بہن سے نکاح جائز ہے

سوال

رضاعی رشتہ کی تعریف میں صرف ساتھ دودھ پیے ہوئے لڑکا اور لڑکی داخل ہیں یا دوسرے لڑکا اور لڑکی بھی جو دودھ پینے میں شریک نہیں ہیں۔ ایک مسئلہ نظر سے گزرا کہ "جتنے رشتے نسب سے حرام ہیں وہ رضاعت سے بھی حرام ہو جائیں گے" اس کے برخلاف ایک رشتہ طے پا رہا ہے۔ صورت یہ ہے کہ زید کی ماں کا دودھ سعیدہ نے مدت رضاعت میں پیا ہے اور سعیدہ کی چھوٹی بہن سے زید کی نسبت ہو رہی ہے یہ رشتہ جائز ہوگا یا نہیں معلوم تو ایسا ہوتا ہے کہ ناجائز ہوگا۔ مطلع فرمائیے تاکہ اس ناجائز نکاح کو روکا جا سکے۔

جواب

زید کی رضاعی بہن سعیدہ کی چھوٹی بہن سے زید کا نکاح جائز ہے۔ آپ نے غور نہیں کیا ورنہ اس کو ناجائز نہ سمجھتے۔ بات یہ ہے کہ زید کی ماں سعیدہ کی رضاعی ماں ہوئی اور اس کے تمام لڑکے لڑکیاں سعیدہ کے رضاعی بھائی بہن ہوئے۔ زید کی ماں کے کسی لڑکے سے سعیدہ کا نکاح نہیں ہو سکتا اس لیے کہ سب اس کے رضاعی بھائی ہیں لیکن سعیدہ کی ماں زید یا اس کے کسی بھائی بہن کی رضاعی ماں نہیں ہے۔ رضاعت کا رشتہ صرف سعیدہ سے قائم ہوا ہے۔ اس کے کسی دوسرے بھائی بہن سے قائم نہیں ہوا ہے اس لیے زید اور زید کے بھائیوں پر صرف سعیدہ کا نکاح حرام ہوگا۔ سعیدہ کی چھوٹی بہن چونکہ زید کی رضاعی بہن نہیں ہے اس لیے اس سے اس کا نکاح جائز ہوگا۔ یہ رشتہ اس حدیث کے خلاف نہیں ہے جس کا حوالہ آپ نے اپنے سوال میں دیا ہے۔ البتہ اگر زید کے کسی بھائی سے سعیدہ کا نکاح ہو رہا ہوتا تو یہ حدیث کے خلاف ہوتا

سنتوں کے لیے جگہ کی تبدیلی

سوال

نماز باجماعت میں ادائے فرض کے بعد ادائے سنت کے لیے جگہ کی تبدیلی پر یہاں بہت زور دیا جاتا

ہے اور یہ چیز ایسی عادت بن گئی ہے کہ اگر اس کے خلاف کیا جائے تو اس کو برا سمجھا جاتا ہے گویا یہ بھی ایک ضروری چیز ہے۔ اس کی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ "قیامت میں وہ جگہ گواہی دے گی جہاں سنتیں ادا کی گئی ہیں۔" سوال یہ ہے اس پر اتنا زور دینا کیسا ہے۔ نیز یہ کہ دلیل میں جو بات کہی جاتی ہے وہ حدیث میں ہے یا قرآن میں۔ یہ بھی لکھیے کہ جگہ کی تبدیلی کے کیا معنی ہیں۔ کیا وہاں سے بالکل ہٹ جانا چاہیے۔ جہاں فرض نماز ادا کی گئی

جواب

فرض کے بعد مقتدیوں کے لیے جگہ بدل کر سنتیں ادا کرنا مستحسن ہے ضروری نہیں ہے اور جگہ بدلنے کے معنی یہ ہیں کہ مقتدی اپنی جگہ سے ایک قدم آگے یا پیچھے یا دائیں یا بائیں ہٹ جائے اگر اس نے اتنا بھی کرلیا تو جگہ بدل گئی۔ اس کو ضروری قرار دینا غلط ہے۔ اصل مقصد یہ ہے کہ فرض کے لیے جو صف بندی کی گئی تھی وہ فرض ادا ہوجانے کے بعد توڑ دی جائے۔ اگر فرض کے بعد امام اور مقتدی ٹھیک اپنی اپنی جگہ پر سنتیں شروع کر دیں تو نئے آنے والے کو یہ دھوکا ہوسکتا ہے کہ ابھی جماعت کی نماز ہو رہی ہے۔ اگر امام اپنی جگہ سے ہٹ گیا ہو یا دو چار مقتدی بھی صف سے اِدھر اُدھر ہوگئے ہوں اور صف ٹوٹ چکی ہو تو یہ مقصد حاصل ہوجاتا ہے۔ ہر مقتدی کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ لازماً وہ اپنی جگہ بدل ہی دے۔ دلیل میں جو بات کہی جاتی ہے وہ اس خاص مسئلے سے متعلق نہیں ہے کیونکہ زمین قیامت میں ہر اس عمل کی خبر دے گی جو اس پر کیا گیا ہو وہ اچھا ہو یا برا۔ اگر ایک ہی جگہ فرض اور سنتیں دونوں ادا کی گئی ہوں جب بھی وہ اس کی گواہی دے گی زمین کی گواہی جگہ بدلنے پر موقوف نہیں ہے۔ زمین کے خبر دینے کا ذکر سورۂ زلزال کی آیت یَومَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخبَارَھَا (جس دن زمین اپنی خبریں بیان کرے گی) میں موجود ہے۔ اس آیت کی تشریح میں جو حدیثیں آتی ہیں ان میں بھی اس کا ذکر ہے۔

حضورؐ کا اسمِ گرامی

سوال

ایک جدید تعلیم یافتہ مسلمان کی زبانی معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا پیدائشی نام قُثَم تھا، باقی نام مختلف مواقع پر مختلف وجوہ سے رکھے گئے۔ مثلاً محمد اور احمد کے نام سے آپ کو اولاً حجرِ اسود کے نصب کیے جانے کے موقع پر پکارا گیا چونکہ آپ نے عاقلانہ و منصفانہ فیصلہ کیا تھا۔ مجھ حافظے سے محروم گنہگار کو کچھ ایسا یا

پڑتا ہے کہ جناب کی ولادت کی پیشین گوئیاں سیکڑوں سال پرانی مذہبی کتب میں انہیں ناموں سے کی گئی ہیں بہرحال جو حقیقت ہو بتا کر عنداللہ ماجور ہوں۔ صاحب مذکور کو اپنی معلومات پر بڑا فخر ہے کہتے تھے کہ کسی مولوی سے پوچھا غریب کو پتہ بھی نہ ہوگا۔

جواب

آپ کے جدید تعلیم یافتہ مسلمان کی معذوری یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ اسلام اور نبی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بھی معلومات مستشرقین کی کتابوں سے حاصل کر رہے ہیں۔ یہ بات جو انھوں نے کہی ہے کہ غریب مولوی کو اس کا پتہ بھی نہ ہوگا وہ شاید اسی وجہ سے کہی ہوگی کیونکہ غریب مولوی تو اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں معلومات قرآن، حدیث اور ائمہ سیرت کی کتابوں سے حاصل کرتا ہے، اس کو کیا معلوم کہ میور صاحب نے کیا کہا ہے۔ مارگولیتھ صاحب نے کیا فرمایا ہے اور دوسرے مستشرقین کا کیا ارشاد ہے۔ آپ کو جدید تعلیم یافتہ مسلمان صاحب سے پوچھنا چاہیے تھا کہ جس بات کا وہ انکشاف فرما رہے ہیں اس کا ماخذ کیا ہے انہیں یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ حضور کا پیدائشی نام قطعم تھا اور حجر اسود نصب کرنے کے بعد محمد و احمد سے پکارے گئے۔ ان سے کہیے کہ اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں مستشرقین کی کتابیں سند نہیں ہیں۔ وہ قرآن، حدیث اور ائمہ سیرت کی لکھی ہوئی کتابوں کا مطالعہ کریں وہ کم سے کم مولانا سلمان منصور پوری کی رحمۃ للعالمین، مولانا شبلی کی سیرت النبی اور مولانا عبدالرؤف دانا پوری کی اصح السیر کا مطالعہ کریں۔

جس شخص نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضور کا نام پیدائش کے بعد قطعم رکھا گیا تھا اس نے ایک بالکل بے سند اور غلط بات لکھی ہے اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ ولادت باسعادت کے بعد حضور کا نام محمد ہی رکھا گیا تھا۔ حضور کے یہ دونوں نام محمد اور احمد قرآن میں بھی موجود ہیں۔ یہ آپ کو ٹھیک یاد ہے کہ حضور کی ولادت سے سیکڑوں سال پہلے محمد اور احمد کے ناموں ہی سے آپ کی آمد کی پیشین گوئیاں آسمانی کتابوں میں موجود تھیں احمد کے نام سے پیشین گوئی کا ذکر قرآن کی اس آیت میں موجود ہے۔

وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَىَّ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِىْ مِنْ بَعْدِى اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ

(سورۃ الصف ۶)

یہ بات یہود کو بھی معلوم تھی اور مدینہ کے یہودی آپ کی آمد کے منتظر بھی تھے۔ سیرت کی سب سے

قدیم کتاب "سیرت ابن ہشام ج ا میں یہ واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ جب آپ کی ولادت ہوئی تو مدینے کے ایک یہودی نے اپنے قلعے کی چھت سے چیخ چیخ کر دوسرے یہودیوں کو اپنے پاس جمع کیا اور ان سے کہا کہ گزشتہ شب کو آنے والے نبی احمد کی ولادت کا ستارہ طلوع ہو گیا یعنی آنے والے نبی جن کا نام "احمد" ہے پیدا ہو چکے۔

حضورؐ کی ولادت سے پہلے مکے کے ممتاز لوگوں کو غالباً یہودی اور عیسائی علماء سے یہ بات معلوم ہوئی کہ مکے میں ایک نبی کی پیدائش ہونے والی ہے جن کا نام محمد ہوگا۔ یہ سنکر متعدد افراد نے اپنے پیدا ہونے والے بیٹوں کے نام محمد رکھ دیے تھے۔ محدثین نے ایسے پندرہ بیس افراد کا ذکر کیا ہے جن کے نام حضورؐ کی پیدائش سے پہلے محمد رکھے گئے تھے۔ علامہ ابن حجر نے فتح الباری جلد ۶ میں متعدد نام شمار کرائے ہیں۔

سیرت ابن ہشام میں یہ واقعہ بھی موجود ہے کہ حضورؐ کی والدہ کو آپ کی پیدائش کے وقت کسی انجانا کہنے والے نے یہ بتایا تھا کہ اس بچے کا نام محمد رکھنا۔ چنانچہ انھوں نے اس کی اطلاع آپ کے دادا عبدالمطلب کو کر دی تھی اور انھوں نے آپ کا نام محمد ہی رکھا۔

تنقید و تبصرہ

تحریک جماعت اسلامی ایک تحقیقی مطالعہ　تالیف ڈاکٹر اسرار احمد، ایم اے۔ صفحات ۲۳۶ قیمت مجلد گرد پوش کے ساتھ چار روپیہ۔ ناشر:۔ دار الاشاعت الاسلامیہ۔ بالمقابل ڈاک خانہ، کرشن نگر لاہور، پاکستان

جناب اسرار احمد صاحب کی یہ کتاب تبصرہ نگار نے بالاستیعاب پڑھی ہے۔ جماعت اسلامی پاکستان سے باہر آجانے والے ارکان نے اس سے پہلے بھی جماعت اور اس کے سربراہ کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ یہ کتاب ان سب تحریروں میں متعدد پہلوؤں سے ممتاز ہے۔ اس کا پہلا امتیاز یہ ہے کہ اس میں دس سال پہلے تک کی جماعت اسلامی پاکستان کا ایک مکمل جائزہ سنجیدگی اور دلائل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس کا دوسرا امتیاز یہ ہے کہ فاضل مصنف نے جماعت اسلامی قبل از تقسیم ہند کے موقف کی مکمل تائید کی ہے۔ تیسرا امتیاز یہ ہے کہ جو زبان انھوں نے استعمال کی ہے اس میں جارحیت کم اور سوقیت بالکل نہیں ہے اور اس کا چوتھا امتیاز یہ ہے کہ مصنف جماعت اسلامی پاکستان کو پھر اسی رنگ میں دیکھنا چاہتے ہیں جو تقسیم سے پہلے تھا اور وہ خود اسی نصب العین کے حصول کے لیے کام کرنا چاہتے ہیں جسے انھوں نے پورے شعور کے ساتھ اختیار کیا تھا۔ اپنے نصب العین، موقف اور طریقۂ کار سے جماعت اسلامی پاکستان کے "انحراف" کی وجہ ان کے نزدیک یہ نہیں ہے کہ اس نے نصب العین ہی غلط اختیار کر لیا تھا بلکہ یہ ہے کہ "عجلت پسندی" نے اس کے قدموں میں لغزش پیدا کر دی۔ یہ الگ بحث ہے کہ واقعی جماعت اسلامی پاکستان منحرف ہوئی ہے یا نہیں اور انحراف کے جو دلائل انھوں نے پیش کیے ہیں وہ صحیح ہیں یا نہیں

اب اس وقت فاضل مصنف کی حیثیت ایک فریق کی ہے اس لیے جب تک دوسرے فریق کا بیان بھی اسی تفصیل سے سامنے نہ ہو کسی غیر جانبدار کے لیے دونوں کے درمیان منصفانہ محاکمہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ اور

جہاں تک تبصرہ نگار کا تعلق ہے وہ محاکمے کو مفید بھی نہیں سمجھتا۔ وہ بس اتنی بات عرض کر سکتا ہے کہ
نفس مصنف اگر مثبت طور پر اپنے خیال کے مطابق کام شروع کرتے تو بہتر تھا۔ دس برسوں کے بعد گزری ہوئی
ت کو از سر نو چھیڑنے کا بظاہر کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ مصنف نے اب اس کتاب کی اشاعت کے جو وجوہ
ے ہیں ان سے تبصرہ نگار کو اطمینان نہیں ہوا۔ یہ توقع کہ ان کی یہ کتاب پڑھ کر جماعت اسلامی پاکستان
ے ذمہ دار حضرات یا عام ارکان "اصلاح پذیر" ہو جائیں گے عجیب سی ہے۔ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے
وہاں کے عام ارکان جماعت کے "انحراف" کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے بلکہ صرف مولانا مودودی
اعتماد کی وجہ سے ان کا ساتھ دے رہے ہیں جب بھی اس کی توقع نہیں ہے کہ یہ کتاب پڑھ کر ان کا
اعتماد متزلزل ہو جائے گا اور ان پر چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔ اگر مصنف فی الواقع وہاں کی جماعت کے
ف کوئی محاذ کھولنا نہیں چاہتے تو ان کو اپنے موجودہ طریقۂ کار پر نظر ثانی کرنی چاہیے ورنہ اس سے جماعت
لامی کی تنظیم کو نقصان پہنچے یا نہ پہنچے ان لوگوں کو ضرور فائدہ پہنچے گا جو پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ
نا پسند کرتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ میں جماعت اسلامی پاکستان کے ذمہ داروں کی خدمت میں بھی
ض کرتا ہوں کہ اگر اس کتاب میں جو الزامات لگائے گئے ہیں وہ دس ہیں فی صدی بھی صحیح ہوں تو انہیں ان
غور کرنا چاہیے۔

اس کتاب میں متعدد باتیں ایسی ہیں جن کی طرف مصنف کو توجہ دلائی جا سکتی ہے۔ اختصار کے ساتھ میں
دو کی طرف اشارہ کر رہا ہوں ــــ ایک طرف تو مصنف جماعت اسلامی کے نصب العین اور قبل از تقسیم کے
یقۂ کار اور پروگرام سے اتفاق کرتے ہیں۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں۔

اور واقعہ یہ ہے کہ اس مفصل بیان کے تحریر کرنے سے بھی مقصود یہی تھا اور اب اس کی اشاعت
سے بھی مطلوب یہی ہے کہ کس طرح اس تحریک کی تجدید اور اس کے احیاء کی صورت پیدا ہو جسے لیگ جماعت
اسلامی اٹھی تھی لیکن جسے اس نے تاریخ کی ایک ہی کروٹ پر پیٹھ کے بوجھ کی طرح اتار پھینکا۔ ص۱۵

اور دوسری طرف وہ جناب وحید الدین خاں صاحب کی کتاب "تعبیر کی غلطی" کو قابل تعریف سمجھتے ہیں
کا حاصل یہ ہے کہ جماعت کے ارکان کی کوتاہیاں اور خرابیاں اس بات کا نتیجہ ہیں کہ مودودی صاحب
نے دین کی تعبیر غلط کی ہے اور جماعت نے ایک غلط نصب العین اختیار کر لیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ
نہوں نے اقامت دین کی پوری تحریک اور اس کی تاریخ پر اپنے قلم سے سیاہی پھیر دی ہے اب جب

دین کی صحیح تعبیر کرکے صحیح نصب العین نہ اختیار کیا جائے۔ کر ہی نہیں سکتی ـــــ اس کے علاوہ خان صاحب نے دین کے جس "دبے ہوئے پہلو" کو نمایاں کیا ہے اس کی اہمیت فاضل مصنف نے یہ لکھ کر گھٹا دی کہ

"اگرچہ میرے نزدیک خاں صاحب موصوف بھی فرد اور جماعت اور ظاہر و باطن کے درمیان مقام عدل پر قائم نہیں رہ سکے ہیں بلکہ ان کی تحریریں دوسرا پہلو قدرے غالب آگیا ہے اور اجتماعیت کے حقوق مجروح ہوئے ہیں۔ ص۹۱

اب سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر کس پہلو سے ان کی کتاب کا مطالعہ "انتہائی مفید" ہوگا۔ جب کہ فاضل مصنف کے نزدیک نہ مولانا مودودی کا لٹریچر مقام عدل پر فائز ہے اور نہ خاں صاحب کی کتاب مقام عدل پر کھڑی ہے۔ کوئی بھی ذہین آدمی مصنف کی اس مدح و قدح سے مطمئن نہیں ہو سکتا اور نہ اس کام کے لیے جس کا دعویٰ لے کر مصنف کھڑے ہوئے ہیں۔ خاں صاحب کی یہ کتاب کوئی مفید خدمت انجام دے سکتی ہے۔ یہ کتاب صرف ان لوگوں کے لیے مفید ہے جو مودودی صاحب اور تحریک اقامت دین کو اپنے مزعومہ دین کے لیے ایک خطرہ سمجھتے ہیں۔

فاضل مصنف نے جماعت اسلامی ہند پر بھی اظہار خیال ضروری سمجھا ہے (ص۱۰۹-۱۱۰) اس کے بارے میں صرف اتنا عرض کرنا کافی سمجھتا ہوں کہ وہ جماعت اسلامی ہند کے بارے میں اتنی واقفیت بھی نہیں رکھتے جتنی تبصرہ نگار جماعت اسلامی پاکستان کے بارے میں رکھتا ہے

جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سے غالباً غیر شعوری طور پر یہ شدید علمی غلطی بھی ہوئی ہے کہ انھوں نے "عجلت پسندی" اور "حب عاجلہ" کو مترادف قرار دیا ہے وہ خُلِقَ الْإِنسَانُ مِنْ عَجَلٍ اور كَلَّا بَلْ تُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ وَتَذَرُونَ الْآخِرَةَ جیسی آیتوں کو ہم معنی و ہم مفہوم آیتیں سمجھ رہے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انھوں نے انبیاء کرام علیہم السلام تک کے بارے میں لکھ دیا ہے کہ کبھی کبھی وہ بھی حب عاجلہ سے مغلوب ہو جاتے تھے۔ (نعوذ باللہ من ذالک) وہ لکھتے ہیں:-

لیکن اس حب عاجلہ کے بارے میں یہ گمان کرنا کہ یہ بالکل ہی ختم ہو جاتی ہے۔ مومن مسلم کے پاس بھی نہیں پھٹکتی ایک شدید غلط فہمی ہے۔ مومن درحقیقت وہ ہوتا ہے جو شعوری طور پر دنیا پرستی (یعنی حب عاجلہ) کو چھوڑ کر آخرت پرستی (یعنی حب آخرہ) کو اختیار کرتا ہے لیکن جب تک وہ انسان ہے اور بشری کمزوریاں اس کے ساتھ لگی ہوئی ہیں۔ یہ بنیادی کمزوری (حب عاجلہ) وقتاً فوقتاً اپنا

مظاہرہ کراتی رہتی ہے اور انسانی قلب و دماغ کو مسحور کر کے گناہ، عصیان اور خطا کی شکل میں رونما ہوتی رہتی ہے —— بڑے بڑے انسان حتیٰ کہ پیغمبر تک اس کی گرفت سے بالکلیۃ آزاد نہیں ہوسکے۔ ص۱۱۲

حیرت ہوتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب جیسا ذہین آدمی "عجلت پسندی" اور دنیا پرستی کے درمیان فرق نہ کر سکا حالانکہ کوئی معقول آدمی ان دونوں کو ہم معنی و مترادف نہیں سمجھ سکتا۔ انھوں نے اپنی غلط فہمی کو اس حد تک پہنچا دیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم قرآن سیکھنے میں جو جلدی کرتے تھے وہ بھی ان کے نزدیک حب عاجلہ یعنی دنیا پرستی میں داخل ہوگئی ہے۔ چونکہ یہ غلطی ان سے ناواقفیت کی وجہ سے ہوئی ہے اس لیے اس پر لمبی گفتگو کرنے کے بجائے میں انھیں یہ مشورہ دینا پسند کرتا ہوں کہ وہ اپنی کتاب کا یہ حصہ مولانا امین احسن اصلاحی کو دکھالیں اور ان سے ان آیتوں کو سمجھ لیں جن کو ہم معنی قرار دینے میں ان سے شدید علمی غلطی ہوئی ہے۔

اس کتاب پر اپنا مختصر تبصرہ ختم کرتے ہوئے یہ بات پھر عرض کرنے کو جی چاہتا ہے کہ جناب ڈاکٹر صاحب کو اپنی توجہ اس پر مرکوز نہ کرنی چاہیے کہ جماعت اسلامی پاکستان کے ارکان پر "انحراف" واضح ہو جائے بلکہ ان کو اپنی توجہ اس بات پر مرکوز کرنی چاہیے کہ جو لوگ انحراف کو سمجھ کر باہر آچکے ہیں وہ ایک مرکز پر جمع ہو کر جماعت بن جائیں اور اعلائے کلمۃ اللہ کا وہ کام انجام دیں جس کی محبت میں انھوں نے جماعت اسلامی پاکستان سے قطع تعلق کیا ہے۔ اگر ڈاکٹر صاحب اس میں کامیاب ہوگئے تو یہ ان کا ایک بڑا کارنامہ ہوگا۔ (ع ق)

حیات و کائنات

ڈاکٹر سید عبدالمجید شمس عظیم آبادی ایم اے (علیگ) پی ایچ ڈی (لندن)
صفحات ۴۰ کتابت و طباعت بہتر۔ ٹائٹل مصور۔ قیمت تین روپیے ——

ناشر: سائنٹیفک پبلشرز۔ مجید ولا۔ پٹنہ ۶ بہار

تبصرہ نگار کے بزرگ ڈاکٹر سید عبدالمجید شمس عظیم آبادی صوبہ بہار کی علمی دنیا میں غیر معروف نہیں ہیں عرصہ دراز تک پٹنہ کالج میں پروفیسر رہے اور اب ریٹائر ہونے کے بعد چار سال سے کالج آف کامرس۔ پٹنہ [illegible]

نہیں رکھتے بلکہ شاعری جیسی لطیف صنف علم میں بھی بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ اس کتاب کا پیش لفظ خود مصنف کے قلم سے ہے۔ تعارف سید احتشام حسین رضوی صاحب نے لکھا ہے اور تبصرے کے عنوان سے سید نجیب اشرف ندوی صاحب کی ایک تحریر ہے۔ پیش لفظ میں فاضل مصنف لکھتے ہیں:۔

جدید سائنس کے اصول ارتقا پر اس مثنوی کا مرکزی خیال قائم کیا گیا ہے .... اس مثنوی میں موجودہ انسانی تمدن کی عظمتوں اور کوتاہیوں کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ اور انفرادی و اجتماعی مفاد کی خاطر لائحہ عمل متعین کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ آخر میں انسانی جدوجہد کی عظمت اور اس کی ترقی کے لامحدود امکانات کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے

نثر میں یہ کام زیادہ مشکل نہیں لیکن نظم میں خاصہ مشکل ہے۔ فلسفہ سائنس اور تمدن و تاریخ کے مضامین نظم میں اس طرح لکھنا کہ شاعری کی لطافت مجروح نہ ہونے پائے ہر شاعر کا کام نہیں ہے۔ اس کے لیے فنی مہارت اور زبان پر قدرت کی ضرورت ہے۔ یہ مثنوی ان دونوں چیزوں کا ثبوت مہیا کرتی ہے۔
ڈارون کا نظریۂ ارتقا اب کافی بوسیدہ اور مشکوک ہو چکا ہے لیکن بہر حال سائنس کی گاڑی ابھی اسی پٹری پر دوڑ رہی ہے۔ اسی بنا پر شاعر نے اس مثنوی کا مرکزی خیال سائنس کے اصول ارتقا پر قائم کیا ہے اس کو انھوں نے اپنے عقیدے کے طور پر پیش نہیں کیا ہے اور نہ کھینچ تان کر مذہبی لٹریچر سے اس کی دلیل مہیا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثنوی کے اس پہلو سے تبصرہ نگار کو خاص خوشی حاصل ہوئی ہے۔ شاعر کہتے ہیں:۔

مانیں جو اصول ڈارون کے ــــــ انسان بنا ہے ارتقا سے۔

انبیاء کرام علیہم السلام پر جو اشعار لکھے گئے ہیں وہ شاعر کے مذہبی جوش اور جذبے کی ترجمانی کرتے ہیں

پھر طور پہ روشنی دکھائی — منظور ہوئی جو خود نمائی
موسےٰ نے سنا کلام باری — دنیا کو دیا پیام باری
کی قوم کی ایسی رہنمائی — فرعون کی مٹ گئی خدائی
قدرت کے تعادل کا تقاضا — فرعون جہاں وہیں ہے موسیٰ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

دور آگیا شاہ دو جہاں کا — پیغمبر آخر الزماں کا
وہ رہبر کامل زمانہ — وہ عارف و عاقل زمانہ

وہ واقفِ رمز و نظمِ ہستی وہ اصل فروغ بزمِ ہستی

وحدت کا پیام لانے والا خالق کا کلام لانے والا

انسان کی منزلت کا باعث مخلوق کی مغفرت کا باعث

بحیثیت مجموعی یہ دلچسپ مثنوی لائق مطالعہ ہے اور اس نے اردو شاعری میں ایک اضافہ کیا ہے

خلافت رشید بن رشید امیر المومنین سیدنا یزید

ابو یزید محمد دین بٹ ۔ صفحات ۲۷۴

ملنے کا پتہ :۔ ابو یزید محمد دین بٹ ۔ آئرن مرچنٹ ۔ چوک شہید گنج ۔ لنڈا بازار ۔ لاہور ۔ پاکستان

اس کتاب کا یہ لمبا چوڑا نام خود بتا رہا ہے کہ اس میں کیا ہوگا ۔ شیعوں کے ردعمل میں جو تحریک پاکستان میں چلی ہے ۔ یہ کتاب بھی اسی کا ایک پھل ہے ۔ اتنی ضخیم کتاب پڑھنے کی فرصت نہ مل سکی اور اس موضوع سے دلچسپی بھی نہیں ہے کہ راتوں کو جاگ کر اسے پڑھ لیتا ۔ جن لوگوں کو اس سے دلچسپی ہو وہ مؤلف سے طلب کریں ۔ اس کتاب کی قیمت کہیں درج نہیں ہے ۔ اس لیے امید ہے کہ مؤلف مفت ہی بھیج دیں گے ۔ اسی کتاب میں مفتی محمد شفیع صاحب کراچی کی رائے بھی نقل کی گئی ہے ۔ یزید کے بارے میں میری بھی وہی رائے ہے اس لیے میں ذیل میں اس کو نقل کرتا ہوں :۔

"یزید کے بارے میں علماء محققین کے نزدیک سکوت احوط ہے ۔ علماء محققین یزید کو مومن جانتے ہیں اس کو کافر نہ سمجھنا چاہیے ۔" ص ۲۶۶

حرف حرف

فیض احمد فیض ۔ صفحات ۴۰۴ ۔ قیمت تین روپے

ناشر :۔ کتاب کار پبلیکیشنز ۔ رام پور ۔ یوپی

یہ مشہور ترقی پسند اور کمیونسٹ شاعر فیض احمد فیض کا مجموعہ کلام ہے ۔ اس ایک جلد میں ان کے تمام کلام غیر معروف کلام، دستِ تہِ سنگ، زنداں نامہ، دستِ صبا اور نقشِ فریادی کو یکجا کر دیا گیا ہے ۔ ترقی پسند شعراء میں فیض کو بہت ہی نمایاں اور ممتاز مقام حاصل ہے ۔ ان کے کلام کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ اردو زبان میں ہے ۔ اس اردو زبان میں جس کو ہم جانتے اور سمجھتے ہیں ۔ فیض اردو زبان، اس کے محاورے

اس کے اسلوب اور اس کے الفاظ و معانی سے ناواقف ہیں۔ اس لیے ان کا کلام ہماری سمجھ میں آجاتا ہے ورنہ کتنے ہی نوآموز ترقی پسند شعراء ایسے ہیں جو اپنے جانتے اردو زبان میں شاعری کرتے ہیں لیکن فی الواقع وہ کسی اور ہی زبان میں ہو جاتی ہے۔

ترقی پسند یا کمیونسٹ شاعری ایک مقصدی شاعری ہے اور اس کے اس پہلو کو ہم پسند کرتے ہیں۔ یہ الفاظ کا کوئی ایسا کھیل نہیں ہے جو محض تفریح طبع کے لیے کھیلا جائے۔ یہ الگ بات ہے کہ کمیونسٹوں نے جو مقصد اپنایا ہے اس سے ہمیں شدید اختلاف ہے۔

فیض احمد فیض کی غزلیں ان کی نظموں سے زیادہ بہتر ہیں اور صاف محسوس ہوتا ہے کہ وہ دراصل غزل ہی کے شاعر ہیں جو لوگ ان کی شاعری کو سمجھنا اور اس سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں ان کے لیے "حرف حرف" بڑے کام کی کتاب ہے۔ کم پیسوں میں ان کی پوری شاعری سامنے آجاتی ہے۔

متاعِ شوق شاغل قادری صفحات دو سو سے زیادہ، کاغذ، کتابت، طباعت بہتر۔ مجلد گرد پوش کے ساتھ قیمت تین روپیہ پچاس پیسے۔ ملنے کا پتہ:۔ نار الادب۔ ہاٹ پوریتی۔ بھاگل پور۔ بہار۔

اس کتاب میں "تعارف" ڈاکٹر سید احمد حسن ایم اے پی ایچ ڈی کے قلم سے ہے اور تقریظ مولانا سعید احمد اکبرآبادی مدیر برہان نے لکھی ہے اور "لفظے چند" کے عنوان سے پروفیسر عبدالغفور صاحب نے اظہار خیال کیا ہے اور ان سب نے شاغل صاحب کی شاعری اور ان کے کلام کی تعریف کی ہے۔ مولانا سعید احمد نے لکھا ہے

> غزل کے لیے سوز و گداز اور درد و کرب ضروری ہے۔ شاغل صاحب نے قوم اور وطن کے درد کو ہی اپنا درد بنا لیا ہے۔ اسی وجہ سے میری رائے میں وہ اصلاً اور اولاً نظم کے شاعر ہیں اور پھر غزل کے"

ڈاکٹر سید احمد حسن نے ایک جگہ لکھا ہے۔

> شاغل صاحب ایک پرگو شاعر ہیں۔ یہ خصوصیت ایک بڑی صفت ہے۔ طبیعت موزوں پائی ہے جس پر رسم و عنوان کی قید کبھی بار نہ بن سکی لیکن یہی صفت اکثر احتیاط کے منافی بھی ہوتی ہے اور رطب و یابس کی ذمہ دار بھی۔"

اچھا ہے کہ شاغل صاحب ان کی تنقید پر توجہ دیں گے ــــ شاغل صاحب کی شاعری اب تک کسی اعلیٰ

مقصد کی شاعری نہیں بن سکی ہے' بلکہ گدائے میکدہ ہوں پر طرح کی ہے پیالے میں" کی مصداق ہے۔ بہرحال جو شخص بھی مشتاق شوق کا مطالعہ کرے گا' وہ یہ محسوس کرے گا کہ ان میں شعر کہنے کی فطری صلاحیت موجود ہے۔ کیا اچھا ہوتا اگر وہ اپنی اس صلاحیت سے کسی بلند مقصد کی خدمت انجام دیتے۔

(بقیہ اشارات) افسوس یہ ہے کہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کی اکثریت' وقتی تدبیروں پر تو کچھ سوچنے اور کچھ متحرک ہونے کے لیے آمادہ ہو جاتی ہے لیکن ان مستقل اور پائدار تدابیر پر سوچنے اور ان کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے پر تیار نہیں ہوتی جو اللہ اور اس کے رسول نے بتائی ہیں وہ ہر تجربے کے لیے تیار ہے لیکن اس تجربے کے قریب پھٹکنے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتی۔ خدا کرے اب ہم مسلمانوں کو ہوش آئے اور ہم اسلامی اجتماعیت' اس کے اصول اور تقاضوں پر غور کرنے کے لیے آمادہ ہوں۔" مولانا اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"یہ سوچنا خام خیالی ہوگی کہ خطرات کے مشترک احساس نے طبیعتوں میں جنبش پیدا کر کے تھوڑے یا زیادہ لوگوں کو اکٹھا کر دیا ہے تو یہ ان کے متحد ہو جانے کے ہم معنی بن گیا اور ایسا اتحاد کسی معمولی آزمائش سے دوچار ہونے پر بھی قائم و برقرار رہ سکتا ہے۔ جب تک ان کے درمیان کوئی خاص کلمۂ جامعہ نہ ہو اور ان کا جذبۂ اتحاد کسی منفی بات کے بجائے کسی مثبت ٹھوس اور مستحکم بنیاد پر قائم نہ ہو' یہ اتحاد ایک مصنوعی اتحاد ہوگا اور تادیر قائم نہیں رہ سکتا"

مستحکم اتحاد کی بنیاد کیا ہے؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں

"مسلمانوں کے اصل منصب و مقام کے لحاظ سے ان کی تنظیم کی بنیاد محض اسلام اور اس کے مفادات ہی ہو سکتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ ان کے وہ حقوق جو ان کی اس حیثیت کو برقرار رکھنے یا اس حیثیت میں اپنا فرض انجام دینے کے لیے ضروری ہوں اور ہم یہاں صاف صاف کہنا چاہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک تقسیم سے پہلے یا اس کے بعد مسلمانوں کے جتنے بھی مسائل پیدا ہوئے وہ دراصل اس بات کی پیداوار ہیں کہ انھوں نے اپنا فرض منصبی ادا کرنے سے غفلت برتی اور ان راہوں پر چل پڑے جو وقتی حالات و مصالح کے لحاظ سے انہیں ضروری معلوم ہوئے لیکن درحقیقت ان کے اصل منصب سے کوئی میل نہیں کھاتے تھے"

مولانا نے جن باتوں کی طرف متوجہ کیا ہے۔ کاش ہندوستان کے مسلمان اب بھی ان کی طرف دھیان دینے پر آمادہ ہو جائیں ——— ہمارے مسائل کا مستقل حل انہیں باتوں پر موقوف ہے۔

رجب المرجب ۸۶ھ
نومبر ۶۶ء

زندگی
رامپور

جلد :- ۳۷
شمارہ :- ۵

مدیر: سید احمد قادری

● خط و کتابت و ارسال زر کا پتہ — منیجر رسالہ زندگی رام پور - یوپی
● زر سالانہ: چھ روپیہ — ششماہی - تین روپیہ — فی پرچہ :- ۶۰ نئے پیسے
● ——— ممالک غیر سے :- دس شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر

مالک جماعت اسلامی ہند - ایڈیٹر سید احمد عروج قادری - پرنٹر پبلشر احمد حسن - مطبع :- دہلی پرنٹنگ پریس محلہ آزاد خاں رام پور
مقام اشاعت :- دفتر زندگی رام پور یوپی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

(سید احمد قادری)

ستمبر کے اشارات پڑھ کر ایک صاحب علم کو کچھ اشکال پیش آیا انھوں نے رجسٹرڈ لفافے میں اپنا اشکال ہمارے پاس بھیجا ہم نے بھی رجسٹرڈ لفافے میں اس کا جواب بھیج دیا۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے اشکال کی مزید توضیح کرکے دوسرا رجسٹرڈ لفافہ بھیجا اور خواہش ظاہر کی کہ ان کی مراسلت زندگی میں شائع کردی جائے۔ دوسرے مکتوب کے جواب میں میں نے جو کچھ عرض کیا ہے وہ اسی شمارے میں کیا ہے۔ ان کے پاس ان کے دوسرے مکتوب کی صرف رسید بھیج دی گئی تھی۔ وہ اپنے پہلے مکتوب میں لکھتے ہیں:-

زندگی کا تازہ شمارہ (ستمبر ۶۶ء) ابھی چند دن پیشتر ملا ہے۔ اس کے "اشارات" پر ایک سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے اگر آئندہ اشاعت میں آپ اس پر گفتگو فرمائیں تو اچھا ہو۔

ان اشارات میں آپ نے جماعت اسلامی ہند کے اس موقف کو مدلل کیا ہے کہ (ہندوستان کے) "موجودہ نظام حکومت کو صحیح سمجھتے ہوئے اسمبلیوں اور پارلیمنٹ کے الکشن میں حصہ لینا ناجائز ہو" لیکن آپ کے استدلال سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ موجودہ نظام کو غیر صحیح سمجھتے ہوئے بھی اس کی پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں حصہ لینا جائز نہ ہوگا جب کہ جماعت اسلامی کے مذکورہ بالا موقف سے صرف اقتضاءً یہی ظاہر نہیں ہوتا کہ غیر صحیح سمجھتے ہوئے حصہ لینا جائز ہوگا بلکہ مجلس شوریٰ کی تازہ قرارداد میں بھی

یہ موقف ظاہر کیا گیا ہے وہاں صراحۃً یہ بھی کہا گیا ہے کہ

"موجودہ نظامِ حکومت کو غیر اسلامی اور خلافِ حق سمجھتے ہوئے اس کو اسلامی نظام میں تبدیل کرنے کے لیے الیکشن میں حصہ لینا جائز ہے۔

(۲) موجودہ نظامِ حکومت کو غیر اسلامی اور خلافِ حق سمجھتے ہوئے اسلام اور مسلمانوں کے اہم مفادات کے لیے الیکشن میں حصہ لینا جائز ہے"

جماعتی مجلس شوریٰ کی قرارداد کے یہ الفاظ زندگی کے اسی شمارے میں "رودادِ اجلاس شوریٰ" کے زیرِ عنوان صفحہ ۵۰ - ۵۸ پر درج ہیں — اب میرا اشکال یہ ہے کہ آپ نے جماعت کے موقف کے منفی حصے کا ثبوت جب اس استدلال سے بہم پہنچایا ہے کہ یہ جمہوری اسمبلیاں اور پارلیمنٹیں ٹھیک وہی حکم رکھتی ہیں جو لات و منات کے استھانوں کا تھا تو ان کو "غیر صحیح، خلافِ حق اور خلافِ اسلام" سمجھتے ہوئے بھی ان میں شرکت کیوں کر صحیح ہو سکتی ہے؟ اور جمہوریت کے "مشرکانہ نظام" کو "کامیابی کے ساتھ چلانے کے لیے" نہ سہی محض "اسلام اور مسلمانوں کے کسی اہم مفاد کے لیے بھی" اس نظام کے تحت الیکشن میں حصہ لینے اور پارلیمنٹ یا اسمبلی میں سیٹ حاصل کرنے کی اجازت ایک مومن کو کیوں کر مل سکتی ہے جب کہ یہ کام شرک کے ویسے ہی مظاہر مانے جائیں جیسے کہ چاند اور سورج کو سجدہ کرنا۔

غالباً یہ بات آپ سے مخفی نہ ہوگی کہ پارلیمنٹ اور اسمبلیوں کے ارکان کو دستور سے وفاداری کا حلف بھی اٹھانا پڑتا ہے اور یہ وہی دستور ہے جو جمہوریت پر مبنی ہے۔ پس ان اداروں کی رکنیت حاصل کرنا حکماً ہی شرک کا مظہر نہ ہوگا بلکہ حقیقۃً اس شرک کا مظاہرہ کرنا بھی پڑے گا۔

میرا اصولی اور بنیادی سوال تو بس یہی ہے اور اسی کی طرف آپ کو توجہ دلانا مقصود ہے لیکن ضمناً اس سوال پر بھی توجہ فرمانے کی ضرورت ہے کہ کیا اسلام کا کوئی مفاد ایسا ہو سکتا ہے یا یوں کہیں کہ وہ معتبر ہو اور اسلام نے کسی درجے میں بھی ہم کو اس کے حصول کے لیے مکلف کیا ہو جو عقیدۃً یا عملاً شرک کا ارتکاب کر کے حاصل کیا جا سکتا ہو؟ اور یہی سوال مسلمانوں کے کسی مفاد کے بارے میں کیا جا سکتا ہے۔

غالباً اسلام کے سب سے برتر مفاد کی حیثیت سے مجلس شوریٰ نے "اسلامی نظام کے قیام"

کو الیکشن میں حصہ لینے کی اجازت کا ایک منفرد سبب قرار دیا ہے۔ لہٰذا میں خصوصیت سے اس کے بارے میں بھی جاننا چاہتا ہوں کہ کیا اسلام اس کی اجازت دے گا کہ اس کا مستحکم قائم کرنے کے لیے کوئی ایسا راستہ اختیار کیا جائے جس میں صریح شرک کا ارتکاب کرنا پڑے! شوری کی قرارداد سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بالفرض اگر اس آنے والے الیکشن ہی تک "مطلوبہ ذات عامہ ہوا" ہو جائے تو جماعت اسلامی کو الیکشن میں حصہ لینے سے کوئی اور چیز مانع نہ ہوگی۔ بایں صورت آپ کے اشارات کی روشنی میں جماعت کے ایسے اقدام کا کیا حکم ہوگا؟

آپ نے سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۷۳ تا ۷۵ پیش کر کے فرمایا ہے :-

"مکے کے ان حالات کا تصور کیجیے جن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے مسلمان گھرے ہوئے تھے اور پھر ان آیات کو پڑھیے۔ غور کیجیے کہ یہ باتیں حضور کو مخاطب کر کے کہی گئی ہیں۔ آپ کے بارے میں یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ مشرکوں اور ظالموں کی طرف آپ کا میلان کسی ذاتی مفاد کے لیے ہو سکتا تھا۔ اگر میلان ممکن تھا تو یقیناً اس دین ہی کے مفاد کی خاطر ممکن تھا جس کے آپ داعی تھے اور یہ میلان بھی اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا تھا کہ کفر و شرک کے مقابلے میں اپنا رویہ کچھ نرم کر لیا جائے لیکن بے حد نازک اور اذیت رساں حالات کے باوجود جن شدید ترین الفاظ اور اسلوب میں تنبیہ کی گئی وہ ہم سب کے سامنے ہے۔ اس سے اندازہ کیجیے کہ ظالمانہ اور مشرکانہ اداروں کی برضا و رغبت رکنیت، اس کے لیے دوڑ دھوپ اور ان اداروں کو کامیابی کے ساتھ چلانے کی خواہش کس نوعیت کا جرم ہو گا اور اس کی سزا کیسا ہو گی؟"

اس کے بعد سورۂ القلم کی آیت ۸ تا ۹ پیش کر کے لکھا ہے :-

"مشرکین کش مکش سے بچنے کے لیے اس بات پر آمادہ ہو گئے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اگر ان کے شرک اور ان کے معبودوں کی تردید ترک کر دیں تو وہ بھی اپنے شہر میں اسلام کے وجود کو گوارا کر لیں گے ..... بلکہ وہ تو یہاں تک تیار ہو گئے تھے کہ اگر شرک کی مذمت اور تردید ترک کر دی جائے تو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا سردار تسلیم کر لیں گے۔

میں دریافت کرنا چاہوں گا کہ اگر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ابی و امی فداہ) کو شرک کی صرف تردید ترک کر کے مکے کی سرداری حاصل کرنے کی اجازت نہیں مل سکتی تو آپ کے بعد کسی اور کو

نظام اسلامی قائم کرنے کے نام پر صریح شرک کرگزرنے کی اجازت کہاں سے مل سکتی ہے؟ اور پیغمبر خدا سے بڑھ کر وہ کون اسلام اور مسلمانوں کا مفاد شناس ہے جس کو ان ناموں پر مشرکانہ اعمال تک کی اجازت مل جائے جبکہ آپؐ کو ان اعمال کے مقابلے میں نرمی برتنے کی اجازت بھی نہیں مل سکی۔

"میرا مقصد جماعت اسلامی کے موقف پر تنقید کرنا ہے اور نہ اس کے استدلال پر، میں صرف اپنا اشکال پیش کرنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ کے استدلالی مقدمات صحیح ہیں تو ان سے جماعت کے موقف کی تائید غلط اور اگر جماعت کا موقف صحیح ہے تو یہ مقدمات غلط۔"

میں نے فاضل مکتوب نگار کے پہلے مکتوب کا جواب دیتے ہوئے لکھا تھا:۔

ستمبر ۶۶ء کے اشارات میں میں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے اشکال پیش آنے کا سبب میری سمجھ میں نہیں آیا۔ ممکن ہے کہ میری بات پوری طرح واضح نہ ہوسکی ہو اس لیے پہلے دوسرے الفاظ میں اپنے اشارات کا مختصر تجزیہ پیش کرتا ہوں:۔

(۱) شرک، یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور اس کے حقوق میں کسی کو شریک قرار دینا حقیقۃً انسان کے عقیدے سے تعلق رکھتا ہے جس کا محل قلب ہے۔ یہی شرک ناقابل معافی ہے اور اسی کو قرآن نے ان الشرک لظلم عظیم کہا ہے۔

(۲) کسی کو سجدہ کرنا یا دوسرے مراسم عبودیت ادا کرنا شرک کا مظہر ہے۔ مظاہر شرک سے بھی شریعت اسلامیہ نے دو وجوہ سے روک دیا ہے ایک یہ کہ عموماً مظاہر شرک کے پیچھے عقیدے کا شرک بھی موجود ہوتا ہے دوسری وجہ یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اب قیامت تک اس کے مومن و موحد بندے مظاہر شرک کے قریب بھی نہ پھٹکیں ـــــ اگر کوئی شخص کسی کو مشرکانہ عقیدے کے ساتھ سجدہ کرے تو وہ عقیدہ و عمل دونوں لحاظ سے شرک کا مرتکب ہوگا جس کو معاف نہ کرنے کا اللہ نے اعلان کر دیا ہے۔ اور اگر کوئی شخص عقیدے کے شرک میں مبتلا نہیں ہے لیکن مثال کے طور پر کسی کی تعظیم و احترام کا اظہار کرنے کے لیے یا کسی کی محبت کی سرمستی میں یا بے جا خوشامد میں مشرکانہ عقیدے کے بغیر سجدہ کر دے تو یہ فعل ایک بڑا گناہ ضرور ہوگا جس سے اس کو توبہ کرنی چاہیے لیکن اس کے اس فعل پر ناقابل معافی شرک کا اطلاق صحیح ہوگا۔ یعنی اس کو دائرۂ اسلام سے خارج کرکے "مشرک" قرار نہیں دیا جائے گا۔

(۳) میں نے اشارات میں جس چیز کو منصوص اور صریح شرک کہا ہے وہ جمہوریت نہیں بلکہ حاکمیت جمہور کا عقیدہ ہے۔ موجودہ پارلیمنٹیں چونکہ اس تصورِ حیات کو بروئے کار لانے کے مقامات ہیں اس لیے یہ شرک کے مظاہر بن گئی ہیں۔ مندروں کے مظہرِ شرک بننے اور ان مقامات کے مظہرِ شرک بننے میں عمل شرک کی نوعیت کا فرق ہے۔ مندروں میں بتوں کو سجدے کیے جاتے اور ان کے سامنے دوسرے مراسمِ عبودیت) ادا کیے جاتے ہیں اور پارلیمنٹ کی عمارتوں میں اللہ تعالیٰ کی ہدایات سے بے پروا ہو کر یا ان کے علی الرغم قانون سازی کی جاتی اور تحلیل و تحریم کے فیصلے کیے جاتے ہیں — یہ بات واضح ہے کہ ان عمارتوں کی دیواروں میں شرک گھسا ہوا نہیں ہے بلکہ خدا کی ہدایات سے بے پروا ہو کر اور انہیں نظر انداز کر کے قانون سازی کا عمل' مظہرِ شرک ہے جس طرح مندروں میں بتوں کو سجدہ کرنا مظہرِ شرک ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ کوئی شخص کسی نیت سے بھی اس میں داخل ہو تو اس کے داخل ہوتے ہی شرک کا ارتکاب ہو جائے۔ اب اگر کوئی شخص اس طرح کی قانون سازی کو عقیدۃً بھی صحیح اور جائز سمجھتا ہے تو وہ عقیدہ و عمل دونوں ہی لحاظ سے شرک کا مرتکب ہوگا ورنہ صرف عملی شرک کا مرتکب قرار دیا جائے گا — دینِ اسلام میں اللہ تعالیٰ ہی حاکم علی الاطلاق ہے۔ اسی کو انسانی زندگی کے لیے قانون دینے اور اشیاء کی تحریم و تحلیل کا حق ہے۔ اس حق میں کوئی اس کا شریک نہیں اس لیے حاکمیت جمہور کا عقیدہ حاکمیتِ الٰہ کے عقیدے کی ضد ہے۔

(۴) الکشن فی نفسہٖ کوئی ناجائز کام نہیں ہے۔ اس میں عدمِ جواز اس نیت اور مقصد کی نسبت سے پیدا ہوتا ہے جس کے لیے اس کو ذریعہ بنایا گیا ہے۔ میں نے اشارات میں کہیں بھی غیر اسلامی نظام کے تحت نفسِ الکشن کو شرک یا مظہرِ شرک قرار نہیں دیا ہے۔

(۵) ہم چونکہ حاکمیتِ الٰہ کا عقیدہ رکھتے اور حاکمیت جمہور کو باطل سمجھتے ہیں۔ اس لیے ہمارا موقف یہ ہے کہ حاکمیت جمہور کے تصور پر مبنی غیر اسلامی نظام کو صحیح اور برحق سمجھتے ہوئے اس کو چلانے کی نیت سے الکشن میں حصہ لینا ناجائز ہے۔

(۶) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شرک کی تردید ترک کرنے کا مطالبہ اس لیے رد فرما دیا تھا کہ یہ شرک سے مصالحت کا کام ہوتا جبکہ آپ شرک کی تردید اور توحید کے اثبات کے لیے مبعوث فرمائے گئے تھے۔ آج بھی اگر یہ شرط لگا دی جائے کہ کوئی مسلمان اس وقت تک الکشن میں حصہ نہیں لے سکتا اور نہ اسمبلیوں اور پارلیمنٹ کا ممبر بن سکتا ہے جب تک وہ یہ عہد نہ کرے کہ وہ شرک کی تردید ترک کر دے گا تو اس الکشن میں حصہ لینا اور ممبر

بننا ناجائز ہوگا۔

ان نکات کو سامنے رکھنے کے بعد وہ اشکال پیدا نہیں ہوتا جسے آں جناب نے پیش کیا ہے۔ جو شخص اعل
کرتا ہے کہ موجودہ نظام حکومت اور موجودہ دستور صحیح نہیں ہیں اس کو بدلنے کے لیے الکشن میں حصہ لے رہا ہو
پھر وہ اسی کی مہم چلاتا اور ووٹروں کی رائے ہموار کرتا ہے اور اسی منشور پر الکشن لڑتا ہے تو اس شخص کے بار
میں عقیدے کے شرک کا تو کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا عملاً بھی ایسے الکشن میں حصہ لینے کو شرک کہنا صحیح نہیں ہوگا۔
بھی نظام کے تحت کوئی الکشن فی نفسہ ناجائز نہیں ہوتا بلکہ کسی ناجائز مقصد کے حصول کا ذریعہ بنکر ناجائز ہو
ہے۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا۔ پارلیمنٹ کا عملی شرک قانون الٰہی کے علی الرغم قانون سازی اور تحلیل و تحریم کے فیص
کرنا ہے۔ اگر کوئی شخص اس عملی شرک کو بھی ختم کرنے یا اس کی تردید کرنے کے لیے پارلیمنٹ کا ممبر بنتا ہے تو اس
کو عملی شرک کا مرتکب کہنا بھی صحیح نہیں ہے۔

میں نے اسمبلیوں اور پارلیمنٹوں کو مندروں اور استھانوں سے جو تشبیہ دی ہے اس کی بنیاد یہ ہے
مندروں میں خدا کے حق پرستش میں دوسروں کو شریک کیا جاتا ہے اور پارلیمنٹوں میں خدا کے حق تشریع م
دوسروں کو شریک کیا جاتا ہے۔ مندروں کا مظہر شرک ہونا تمام مسلمانوں کو معلوم ہے لیکن پارلیمنٹوں کا مظ
شرک ہونا ان میں سے بہتوں کو معلوم نہیں ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مندروں اور پارلیمنٹوں م
آدمی جس نیت اور جس قصد سے بھی جائے وہ شرک کا مرتکب ہو جائے گا۔

فرض کیجیے کسی مندر میں ٹکٹ خرید کر داخلے کی اجازت ملتی ہے۔ تین شخصوں نے ٹکٹ خریدے ا
کی نیت یہ ہے کہ وہ اس میں داخل ہو کر بت کو سجدہ کرے گا۔ ایک کی نیت یہ ہے کہ وہ مندر کی س
کرے گا۔ ایک کی نیت یہ ہے کہ وہ وہاں پہنچ کر تبلیغ کرے گا کہ اے لوگو! سجدہ کرنے کے لائق صرف
ہے، بتوں کو سجدہ کرکے شرک نہ کرو۔ کیا تینوں کا حکم ایک ہوگا؟ اور اگر تیسرا شخص ٹکٹ خریدنے کے وقت
اعلان کردے کہ میں ٹکٹ اس غرض سے خرید رہا ہوں کہ مندر میں جا کر توحید کی تبلیغ کروں گا تو اس تیسر
شخص کو آخر کس بنیاد پر شرک کا مرتکب قرار دیا جائے گا۔

باقی رہی دستور کی وفاداری کا حلف لینے کی بات تو سب جانتے ہیں کہ اس کی حیثیت محض رسمی
اور بعض صورتوں میں محض حماقت ہے۔ آپ خود غور کریں کہ ایک شخص دستور کو غلط کہتا اور اس کو بدلنے
کے لیے علی الاعلان الکشن لڑتا ہے اور جب کامیاب ہو جاتا ہے تو اس سے دستور کی وفاداری کا حلف لیا جاتا

آج بھی کمیونسٹوں اور ڈی۔ ام۔ کے ـــ کے ممبروں سے جو حلف لیا جاتا ہے اس کی حیثیت ایک لغو حرکت کے سوا اور کیا ہے۔ لطف یہ ہے کہ حلف دلوانے والا بھی جانتا ہے کہ یہ ممبر جو حلف لے رہے ہیں وہ ایک بے معنی رسم کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس لیے ایسے ممبروں کے حلف کو ـ جو دستور کو ختم کرنے کی نیت اور اعلان کے ساتھ پارلیمنٹ میں گئے ہوں ـ عملاً شرک کہنا بھی صحیح نہیں ہے۔ حقیقۃً شرک کا تو اس میں شائبہ بھی موجود نہیں ہے ـــ بلا شبہ ایک لغو حرکت کا ارتکاب کرنا پڑے گا لیکن آئینی طور پر نظام باطل کو ختم کرنے کے لیے اس کی گنجائش موجود ہے۔

یہی معاملہ کچھ نیچے درجے میں ان افراد کا بھی ہے جو موجودہ نظام حکومت کو غیر اسلامی اور خلاف حق سمجھتے ہوئے کوئی اہم اسلامی مفاد حاصل کرنے کے لیے الکشن میں حصہ لیتے ہیں ان پر بھی شرک کے ارتکاب کا جرم عائد نہیں ہوتا۔ شرک کے مرتکب وہ لوگ قرار دیے جائیں گے جو حاکمیت جمہور کے عقیدے پر مبنی غیر اسلامی نظام کو صحیح اور برحق مانیں اور اس کو چلانے کے ارادے سے الکشن میں حصہ لیں یا ممبر بنیں۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ میں نے اخبارات میں جو کچھ لکھا ہے اور جماعت اسلامی نے الکشن کے سلسلے میں جو موقف اختیار کیا ہے ان دونوں میں تضاد نہیں ہے۔

آخر میں ضمنی طور پر ایک اور بات عرض کرنا چاہتا ہوں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے جماعت اسلامی سے باہر کے علماء بھی نظام حکومت کو برحق مانتے ہوئے اس کے الکشن میں حصہ لینے کو جائز نہیں کہتے اور اسلامی مفاد کے حصول کے لیے ـ موجودہ نظام کو برحق سمجھے بغیر ـــ جائز کہتے ہیں آخر ان کے نزدیک ان دونوں میں تطبیق کیا ہے؟ اور جہاں تک مجھے معلوم ہے کسی عالم دین کو بھی حاکمیت الٰہ کے حق ہونے اور حاکمیت جمہور کے باطل ہونے میں شبہہ نہیں ہے۔ اس کے باوجود ایک صورت کے ناجائز اور دوسری صورت کے جائز ہونے کی تاویل ان کے نزدیک کیا ہے؟

اگر علماء کے ان دو اقوال میں اشکال پیش نہیں آتا تو جماعت اسلامی کے ان دو اقوال میں کیوں اشکال پیش آرہا ہے؟ امید ہے کہ میری توضیح سے اشکال رفع ہو جائے گا۔

میرے اس جواب کے بعد انھوں نے جو دوسرا مکتوب بھیجا ہے وہ یہ ہے :-

میں نے آپ کی وضاحت کو بہت غور سے پڑھا۔ میرا مقصد چونکہ آپ کو غلط ثابت کرنا نہیں ہے۔ اس لیے

میں اس سوال کو کوئی اہمیت نہیں دوں گا کہ آپ کی توضیحات میں سے سب کو "توضیح" ہی کہنا چاہیے یا ان میں سے بعض کو "تصحیح" کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ میرا مقصد یہ ہے کہ ایک مسئلہ صاف ہونا چاہیے، چونکہ ان توضیحات سے بھی مسئلہ صاف نہیں ہوا ہے۔ اس لیے مجھے مزید کچھ گذارش کرنے کی ضرورت ہو

آپ کے جواب میں کافی تفصیل ہے۔ مگر میں اس کا خلاصہ دو لفظوں میں یہ سمجھا ہوں کہ موجودہ نظام حکومت کو باطل اور ناقابل تعاون سمجھتے ہوئے اگر کوئی شخص محض اس کو بدلنے کے لیے یا محض اسلام اور مسلمانوں کے اہم مفادات کے تحفظ کے لیے اس نظام کے تحت قانون ساز اداروں کے الیکشن میں حصہ لیتا ہے تو آپ کے "اشارات" سے نہ صرف یہ کہ اس کا عملاً مشرک ہونا لازم نہیں آتا بلکہ اس میں کوئی ادنیٰ شرعی قباحت بھی نہیں لازم آتی۔

میں نے اپنے اشکال کے سلسلے میں ایک بہت موٹی بات کی طرف توجہ دلانے پر اکتفا کیا تھا۔ اور وہ یہ کہ کوئی بھی آدمی پارلیمنٹ یا اسمبلی کا رکن بنے گا تو اسے موجودہ نظام حکومت کے بنیادی پتھر (دستور) کی وفاداری کا حلف اٹھانا پڑے گا یعنی "عقیدۂ حاکمیت جمہور" کا تراشا ہوا جو واحد محسوس بت بقول آپ کے ان جدید "مندروں اور استھانوں" میں رکھا ہوا ہے۔ کم از کم ایک بار اسے "سجدہ" ضرور کرنا پڑے گا! آپ نے اس حلف وفاداری کو ان لوگوں کے حق میں جو موجودہ نظام کو باطل اور ناقابل تعاون سمجھتے ہیں محض "ایک بے معنی رسم" قرار دے کر میرے اشکال کا قصہ ختم کر دیا ہے ــــ لیکن آپ غور فرمائیں کہ کیا کسی مندر میں توحید کی تبلیغ کرنے یا دین و ملت کا کوئی اہم مفاد حاصل کرنے کے لیے جانے والے مسلمان کو آپ اس کی اجازت دے دیں گے کہ اگر ضروری ہو تو وہ وہاں "قشقہ لگوائے" "پرشاد چڑھائے" یا "ڈنڈوت" کی رسم بجا لائے؟ اگر نہیں تو پھر یہ دستور ہی تو وہ شے ہے جس کی بنا پر آپ کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ نظام حاکمیت جمہور کے عقیدے یا نظریے پر مبنی ہے اور اس بنا پر جب اس نظام کی پارلیمنٹ اور اسمبلیاں آپ کے نزدیک بعینہ "مورتی پوجا" والے "مندر" کا حکم رکھتی ہیں تو ان نئے "مندروں" کی اس "مورتی" کو کسی نیک سے نیک مقصد کے لیے بھی محض رسماً ہی پوجنے کی اجازت آپ کیسے دے سکتے ہیں؟ ــــ آپ نے الیکشن لڑنے کے سلسلے میں اپنے تصورات کے مطابق بہت صحیح مثال دی ہے کہ یہ محض ایک مندر میں داخلے کا ٹکٹ خریدنا ہے۔ اور اس بلحاظ نتیجہ کے اگر اس مندر میں کوئی قباحت نہیں ضرر ناک کوئی چیز نہ ہو یا بڑا اسلامی مقصد سامنے ہو تب تو

قباحت کیا معنی رکھتی ہے لیکن اسی مثال کو ذرا آگے بڑھا کر حلف وفاداری کے مرحلے تک بھی لے آتے تو آپ ہرگز یہ نہ فرماتے کہ یہ تو ایک صحیح العقیدہ کے لیے محض ایک بے معنی رسم ہوگی۔ کیونکہ اس مثال میں آپ کو اسی بے معنی رسم کے لیے قشقہ لگوانے پر شادچڑھانے یا ڈنڈوت بجا لانے کے سوا کوئی دوسری تعبیر نہیں مل سکتی تھی۔ بہرحال اس وقت آپ کو توجہ نہ ہوئی۔ اب میں عرض کرتا ہوں کہ اپنی مثال کو مکمل کرکے دیکھیے۔ اس کے بعد آپ خود محسوس فرمائیں گے کہ دستور سے وفاداری کے حلف کو محض "بے معنی رسم" کہہ کر سند جواز نہیں عطا کی جا سکتی۔

یہ گزارش پارلیمنٹ اور اسمبلیوں کی ایک خاص رسم سے متعلق تھی جس کی طرف میں نے اپنے عریضے میں یہ کہہ کر توجہ دلائی تھی کہ اس کے ارتکاب کی وجہ سے پارلیمنٹ اور اسمبلی کی رکنیت حاصل کرنا آپ کے نظریات کے مطابق حکماً ہی عملی شرک نہیں قرار پائے گا بلکہ یہ حقیقۃً عملی شرک کا ارتکاب ہوگا۔ آپ نے اس بارے میں میرے قول سے فی نفسہٖ اختلاف نہیں کیا ہے بلکہ ایک تاویل کی ہے کہ جو آدمی موجودہ دستور پر اعتقاد نہیں رکھتا۔ (عام اس سے کہ وہ موجودہ نظام کو بدلنے کے ارادے اور اعلان کے ساتھ جائے یا بغیر ان دونوں باتوں کے محض کوئی اسلامی مفاد حاصل کرنا اس کی نیت ہو) اس کے حق میں اس رسم کی ادائگی کسی طرح کا بھی شرک نہیں ہوگی بلکہ محض ایک بے معنی رسم! میں نے اس تاویل کے بارے میں اپنی گزارشات پیش کر دی ہیں اور اس کے بعد میں اپنی بات کے اس پہلو کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ باقاعدہ ایک عمل کے ذریعے ایک مشرکانہ کام کا جو مرحلہ لازماً ممبران پارلیمنٹ اور اسمبلی کو پیش آتا ہے۔ اگر اس سے صرف نظر بھی کر لیا جائے یا کسی وقت یہ رسم منسوخ بھی ہو جائے تب بھی موجودہ نظام اور اس کے قانون ساز ایوانوں کے بارے میں آپ کے شرعی تصورات کی رو سے محض ان ایوانوں میں حصہ لینا ہی جس طرح ان لوگوں کے حق میں قطعی طور پر شرک فی العقیدہ کا مظہر ہوگا۔ جو اس نظام کو صحیح مانتے ہیں اور اس کو چلانا چاہتے ہیں۔ اسی طرح ان لوگوں کے حق میں یہ چیز قطعی طور پر شرک فی العمل کے حکم میں داخل ہوگی جو اس نظام کو صحیح نہیں مانتے (خواہ وہ اس نظام کو بدلنے کے ارادے اور اعلان کے ساتھ ان ایوانوں میں جائیں یا بغیر ان دونوں باتوں کے محض کوئی اسلامی مفاد حاصل کرنے کی نیت سے ان کا جانا ہو!)

میرے اس قول کی تفصیل یہ ہے کہ جہاں تک ان لوگوں کا سوال ہے جو اس نظام کو بدلنے کے

لیے نہیں بلکہ محض اسلام اور مسلمانوں کا کوئی مفاد حاصل کرنے کی نیت سے پارلیمنٹ اور اسمبلی میں جائیں
ان کے لیے تو کوئی تاویل سوچی ہی نہیں جاسکتی ۔ کیونکہ یہ بات ناممکن اور ناقابل تصور ہے کہ ایک نظام
کے اندر کوئی مفاد بغیر اس سے کسی درجے میں بھی سازباز کیے ہوئے حاصل ہو سکے ۔ اس نظام کے اندر آئینی
طریقے سے کوئی مفاد آپ اسی بنیاد پر حاصل کرسکتے ہیں کہ یہ آئین اور دستور کی رو سے آپ کو ملنا چاہیے۔
آپ کو ان مفادات کے لیے اسی آئین کی دہائی دینی ہوگی اور اس کی منت کشی گوارا کرنی پڑے گی
لیکن جب ان ایوانوں میں قانون سازی کا ہر عمل اور ہر فیصلہ اس بنا پر شرک ہے کہ ان کی "آخری سند" خدا
نہیں بلکہ یہ خود اور ان کا دستور ہی آخری سند ہے تو پھر اس سند سے کوئی پاکیزہ سے پاکیزہ مفاد
حاصل کرنا بھی عملی شرک کے حکم میں داخل کیسے نہیں ہوگا ! اور ایوان کی تمام تر "مشرکانہ" کارروائی
میں شریک ہو کر ایک مسلمان اگر مساجد میں اذان اور نماز کا حق بھی بحال کرائے (یعنی فرض کرلیجیے کہ
پارلیمنٹ نے ان حقوق پر دست درازی کی ہو) تو آپ کے نظریہ کی رو سے عملاً شرک کے فتنے سے
وہ بھی کیسے بچ سکے گا ۔

رہے وہ لوگ جو اس نظام باطل کو بدلنے کی نیت اور اعلان کے ساتھ الیکشن لڑ کر پارلیمنٹ
میں جائیں تو حلفِ وفاداری قسم کی رسوم سے صرف نظر کرلینے کی صورت میں بے شک کچھ ایسا لگتا
ہے کہ یہ لوگ اس فتوے کی زد میں نہیں آتے لیکن ذرا تجزیہ کیجیے تو سوائے اس شکل کے کہ اس قسم کی
کوئی جماعت پہلے ہی ہلے میں پرستارانِ باطل کو شکستِ فاش دے کر اپنی غالب اکثریت کے ذریعہ
پارلیمنٹ پر چھا جائے، اس کے لیے بھی اس فتنے سے بچنے کی کوئی صورت نہیں ــــ اور یہ شکل کم از کم
ہندوستان میں خوارق میں سے ہونے کے ساتھ ساتھ ہماری بحث سے خارج بھی ہے ۔ کیونکہ اس
شکل میں پارلیمنٹ کی بساط لپیٹ دی جائے گی اور ایک نئی دستور ساز اسمبلی سے کام شروع ہوگا ــ لیکن یہ
خیالی شکل کے علاوہ واقعات میں جو چیز رونما ہوگی اور جس سے اس بحث کا تعلق ہے وہ یہ ہے کہ ایک دو یا
دس بیس بہرحال ایک چھوٹی سی اقلیت کی تعداد میں ایسے لوگ پہنچ کر اسی پارلیمنٹ کا جزو بنیں گے جو
صریحاً مالکیت جمہور کی بنیاد پر قائم ہے اور کل قانون سازی میں آپ ہی اپنی سند ہونے کا "فرمانروائیت" رکھتی ہے۔
یہ لوگ ہزار کہتے رہیں کہ ہم عقیدۃً اس شرک سے بری ہیں لیکن کیا اس پارلیمنٹ کا جز ہونے سے انکار کرسکتے ہیں؟ اور جز ہونے
کے بجائے اپنی کوئی اور حیثیت ان "مشرکوں" بلکہ "خدائی کے دعوے داروں" کے درمیان بتا سکتے ہیں۔

اگر نہیں تو پھر یہ عملاً شرک بھی ہے اور دعویٰ الوہیت بھی۔

میری اس بحث کی حد یہاں ختم ہو گئی لیکن اگر اجازت ہو تو سخن گسترانہ طور پر اس طرف بھی توجہ دلاؤں کہ یہ حضرات الیکشن لڑ کر اکثریت نہ حاصل کرنے کی صورت میں اگر استعفا نہیں دے دیتے ہیں اور پارلیمنٹ میں جاتے ہیں تو ذرا غور فرمائیے کہ شرک کا داغ لینے کے بعد اپنے مقصد کی خدمت وہاں کس طرح انجام دیں گے؟ کیا وہاں اسلامی نظام کی برتری پر تقریریں کریں گے؟ ایوان کی کارروائی کے قواعد و ضوابط کے اعتبار سے اس کی کیا صورت ہو گی؟ اور اگر کوئی صورت مجرد اس کام کی ممکن بھی ہو جس سے میں واقف نہیں تو کوئی ان سے یہ نہیں پوچھے گا کہ یہ تبلیغ اگر ہمیں لوگوں پر کرنا تھی تو اس کے لیے ہم باہر بھی مل سکتے تھے۔ یہ آخر اس "بتکدے" کے مہنتوں بلکہ معبودوں" میں اپنا نام آپ نے کس لیے لکھایا ہے؟ —— اور اگر یہ تبلیغ ایوان کی کارروائیوں میں حصہ لیتے ہوئے ضمناً مواقع پیدا کر کے کی گئی تو یہ بات پھر ہماری اصل بحث کی سرحد میں آجاتی ہے اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ عملاً شرک کا ارتکاب نہیں ہو گیا؟ ویسے میرا خیال یہی ہے کہ یہ حضرات کسی کارروائی میں حصہ نہیں لے سکیں گے۔ یہ کسی بل کے بارے میں ووٹنگ کے موقع پر بھی بس اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ جب تک پارلیمنٹ اپنی سندی حیثیت سے دست بردار نہ ہو اس کی کارروائی میں موافق یا مخالف حصہ لینے سے وہ معذور ہیں۔

ایک بات آپ نے یہ دریافت فرمائی ہے کہ جماعت اسلامی کے باہر کے علماء بھی موجودہ نظام حکومت کو برحق مانتے ہوئے اس کے الیکشن میں حصہ لینے کو جائز نہیں کہتے اور اسلامی مفاد کے حصول کے لیے موجودہ نظام کو برحق سمجھے بغیر جائز کہتے ہیں۔ آخر ان کے نزدیک ان دونوں میں تطبیق کیا ہے؟

میں عرض کروں گا کہ میں اگر جماعت اسلامی کے موقف پر کوئی اشکال پیش کر رہا ہوں تو بے شک مجھے اس سوال کا جواب دینا چاہیے لیکن میں نے تو اصلاً جماعت اسلامی کے موقف پر کوئی اشکال نہیں پیش کیا ہے۔ میرے اشکال کا تعلق تو محض آپ کی تحریر سے ہے کہ آپ نے جس استدلال سے جماعت اسلامی کے الیکشنی موقف کی تائید کی ہے اس سے میرے نزدیک جماعت کا موقف صحیح نہیں بلکہ غلط ثابت ہوتا ہے اور کوئی اصولی گنجائش جماعت کا موقف صحیح ہے جب تک کی باقی نہیں رہتی جس کا نتیجہ

یہ ہے کہ خود آپ کا بنیادی موقف وضاحت طلب ہو گیا ہے مجھے چونکہ اس مسئلے سے جو بنیادی طور پر آپ نے اشارات میں اٹھایا ہے دلچسپی ہے۔ اس لیے میں واضح طور پر یہ جاننے کا خواہش مند ہوں کہ آپ کا موقف ہے کیا؟ آپ کا موقف میرے نزدیک بالکل واضح ہی تھا اور میں اس پر کچھ عرض کرتا۔ لیکن جہاں سے آپ کی تحریر میں جماعت کے تازہ فیصلہ کی تائید آگئی وہاں سے معاملہ مشتبہ ہو گیا۔ اور اس کی ضرورت پڑی کہ جماعت کے موقف سے آپ کا اصل فکر میرے نزدیک جس جس طرح ٹکراتا ہے اس کی وضاحت کر دوں تاکہ آپ یا دونوں باتوں کے تضاد کو محسوس فرمالیں یا ان میں تطبیق کی کوئی شکل پیدا کر دیں۔ الغرض جماعت کا موقف اس وقت میرے پیش نظر نہیں ہے۔ صرف آپکی تحریر پر کچھ طالب علمانہ معروضات ہیں۔ امید ہے کہ ان معروضات کو آپ اسی روشنی میں دیکھیں گے۔

اس دوسرے مکتوب کو پڑھ کر اندازہ ہوا کہ فاضل مکتوب نگار نے میری توضیح (یا جزوی تصحیح جیسا کہ وہ سمجھتے ہیں) کو غور سے ضرور پڑھا ہوگا لیکن اپنے اشکال کی مزید وضاحت کرتے وقت انھوں نے میری توضیح کو نظرانداز کر دیا ورنہ وہ میری تحریر کے خلاف باتیں میری طرف منسوب نہ کرتے۔

میں نے اپنی توضیح کے نکتہ ۲ میں وضاحت کی ہے کہ مندروں کے مظہرِ شرک بننے اور پارلیمنٹوں کے مظہرِ شرک بننے میں عملِ شرک کی نوعیت کا کیا فرق پایا جاتا ہے۔ قارئین زندگی نکتہ ۲ کو دوبارہ پڑھ لیں۔ اس کے علاوہ میں نے موجودہ پارلیمنٹوں کو ستمبر کے اشارات میں مندروں سے جو تشبیہ دی تھی اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا تھا کہ :-

"اس کی بنیاد یہ ہے کہ مندروں میں خدا کے حق پرستش میں دوسروں کو شریک کیا جاتا ہے اور پارلیمنٹوں میں خدا کے حق تشریع میں دوسروں کو شریک کیا جاتا ہے۔ مندروں کا مظہرِ شرک ہونا تمام مسلمانوں کو معلوم ہے لیکن پارلیمنٹوں کا مظہرِ شرک ہونا ان میں سے بہتوں کو معلوم نہیں ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مندروں اور پارلیمنٹوں میں آدمی جس نیت اور جس قصد سے بھی جائے وہ شرک کا مرتکب ہو جائے گا۔"

اس وضاحت کو نظرانداز کرتے ہوئے مکتوب نگار لکھتے ہیں :-

یعنی عقیدۂ حاکمیت جمہور کا تو انکار ہو [illegible] لیکن جب تک آپ کے ان جدید مندروں [illegible]
[illegible] ہو جائے گا مجرد [illegible] گا۔

دستور کی وفاداری کو عقیدۂ حاکمیت جمہور کا واحد محسوس بت اور اس کے حلف کو سجدہ میں نے نہیں کہا ہے۔ اس کی یہ حیثیت مکتوب نگار خود متعین کر رہے ہیں۔

نیز یہ کہ میں نے مندر کے ٹکٹ خریدنے کی مثال یہ بات واضح کرنے کے لیے دی تھی کہ نیت اور مقصد کے فرق سے احکام بدل جاتے ہیں لیکن انھوں نے اس مثال کو اپنی طرف سے پارلیمنٹ کے داخلے پر چسپاں کر دیا اور مجھ سے فرما رہے ہیں کہ اگر میں اس مثال کو حلف وفاداری تک لے آتا تو مجھے اس کے لیے قشقہ لگا لینے پرشاد چڑھانے یا ڈنڈوت بجا لانے کے سوا کوئی دوسری تعبیر نہیں مل سکتی تھی۔ یہ بات وہ اس شخص سے کہہ رہے ہیں جس نے اپنی "توضیح" میں یہ کھول کر بیان کر دیا ہے کہ پارلیمنٹ کا عملی شرک 'سجدے کرنا اور بت پوجنا' نہیں ہے بلکہ قانون الٰہی کے علی الرغم قانون سازی کرنا ہے۔ اس وضاحت کے بعد کوئی شخص بھی حلف وفاداری کے لیے وہ تعبیر اختیار نہیں کرے گا جس کے بارے میں موصوف فرما رہے ہیں کہ اس کے سوا کوئی دوسری تعبیر نہیں مل سکتی تھی۔

دستور کی وفاداری اور اس کا حلف مکتوب نگار کے اشکال کا بہت بڑا سبب بنا ہوا ہے اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ دستور کی وفاداری اور اس کے حلف کو پارلیمنٹ کی عمارت اور اس کے ممبروں تک محدود سمجھ رہے ہیں حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ بھارت کے ۴۹ کروڑ شہری اس وسیع ملک کے ہر گوشے میں عملاً دستور کی وفاداری کا حلف اٹھائے ہوئے ہیں ورنہ اس ملک کا کوئی باشندہ یہاں کا شہری باقی نہ رہتا۔ پارلیمنٹ کے ممبروں سے جو حلف لیا جاتا ہے وہ اس عملی حلف کی قولی توثیق ہے۔ دستور کی وفاداری کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ آدمی اس کے برحق اور ناقابل تبدیل ہونے پر ایمان لائے بلکہ یہ ہے کہ وہ اس کے خلاف بغاوت نہیں کرے گا۔ اس کی دفعات کو نہیں توڑے گا اور عملاً اس کا پابند رہے گا ورنہ جہاں تک اس میں تبدیلی اور ترمیم کا تعلق ہے تو آئینی حدود کے اندر اس کی ہر دفعہ بدل سکتی ہے یہاں تک کہ پورا دستور تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ میں دستور کی اس عملی پابندی کو نہ شرک سمجھتا ہوں اور نہ میں نے کہیں اسے شرک کہا ہے۔ اگر فاضل مکتوب نگار کے نزدیک اس کی حیثیت قشقہ لگوانے کی ہے تو یہ قشقہ پارلیمنٹ کا ممبر بنے بغیر ہی ہماری اور ان کی پیشانی پر لگا ہوا ہے ۔۔۔ میں نے اپنی توضیح میں حلف وفاداری کو بے معنی رسم ان لوگوں کی جہت سے کہا تھا جو دستور کو تبدیل کرنے کے ارادے اور اعلان کے ساتھ پارلیمنٹ میں جائیں ان کے پابندی دستور کی قولی توثیق بے معنی بات ہوگی۔ جہاں تک اس کی عملی پابندی کا تعلق ہے وہ پارلیمنٹ کے

باہر بھی کرتے رہتے، پارلیمنٹ کے اندر بھی کریں گے اور اسے تبدیل بھی آئینی حدود کے اندر ہی کریں گے۔ اس کے بعد مکتوب نگار نے اپنے اس دوسرے مکتوب میں جو باتیں لکھی ہیں ان کا حاصل یہ ہے کہ جب میں حاکمیت جمہور کے عقیدے پر مبنی موجودہ نظام کو غیر اسلامی، خلاف حق اور مشرکانہ سمجھتا ہوں تو پھر اس نظام کے تحت موجودہ آئین و دستور کی سند سے پاکیزہ سے پاکیزہ مفاد بھی یہاں تک کہ بالفرض اگر اذان اور نماز روک دی جائے تو اس کی بحالی بھی شرک سے ساز کیے بغیر حاصل نہیں کی جا سکتی۔ میں عرض کرتا ہوں کہ حاکمیت جمہور کے نظریہ پر مبنی نظام کو برسرِ کار لانے والی پارلیمنٹوں کو مظہر شرک قرار دینے سے اگر وہ بات مستنبط ہو سکتی ہے جو فاضل مکتوب نگار نے مستنبط کی ہے تو پھر کوئی شخص اس سے یہ استنباط بھی کر سکتا ہے کہ دستور کی سند سے اس ملک کا شہری ہونا، چلنا پھرنا، اظہار خیال کرنا، تبلیغ کرنا یہاں تک کہ سانس لینا یہ سب کچھ شرک کے ساتھ سازگاری اور عملی شرک ہے۔

اگر علوم دین سے ناواقف لوگ اس طرح کا استنباط کریں تو انہیں سمجھایا جا سکتا ہے لیکن جب مکتوب نگار جیسے لوگ یہ استنباط کرنے لگیں تو کیا جواب دیا جائے۔ بس یہی عرض کر سکتا ہوں کہ میں ایسا نہیں سمجھتا اور نہ میرے اشارات کے کسی جز سے یہ باتیں نکل سکتی ہیں۔

اللہ کی بھیجی ہوئی شریعت نے جو حقوق ہمیں دے رکھے ہیں اور جو فرائض ہم پر عائد کیے ہیں ان حقوق سے استفادہ کرنے، انہیں حاصل کرنے اور ان فرائض پر عمل کرنے کے لیے ہم دستور کی سند کے محتاج نہیں ہیں اس لیے کہ ہماری اصل سند شریعت ہے نہ کہ کوئی انسانی دستور۔ یہی وجہ ہے کہ کسی استحقاق یا کسی عمل کے جائز یا ناجائز ہونے کا فتویٰ ہم دستور سے طلب نہیں کرتے بلکہ شریعت سے طلب کرتے ہیں۔ اب اگر کوئی حکومت کسی ایسے حق یا فرض پر پابندی عائد کرے تو یہ ظلم ہوگا اور ہم اس ظلم کو ختم کرنے کے لیے اپنے شرعی اور انسانی حق کی بنا پر مطالبہ کریں گے۔ فرض کیجیے کہ کسی ملک کا دستور ہی ان حقوق و فرائض پر پابندی عائد کر دے تو کیا وہاں کے مسلمان اس لیے خاموش ہو جائیں گے کہ دستور کی سند حاصل نہیں ہے؟ یا فرض کیجیے کہ یہاں کی حکومت سود لینے دینے پر پابندی عائد کر دے تو کیا کسی مسلمان کے لیے دستور کی دہائی دے کر اس پابندی کو ختم کرانا صحیح ہوگا؟ معلوم ہوا کہ ہمارے لیے اصل سند اسلامی شریعت ہے کسی حق تلفی کے خلاف دستور کا حوالہ اور واسطہ دینا ایسا ہے جیسے کوئی ظالم ایک طرف اپنے انصاف پسند ہونے کا دعوےٰ کرے اور دوسری طرف کسی کا حق دبا بیٹھے اس سے کہا جائے کہ جب تم انصاف پسندی کے مدعی ہو تو یہ ظلم کیوں کر رہے ہو اسے ختم کر دو۔ بجا رہے گے

دستور میں ہمارے جو جائز حقوق درج ہیں دہ کسی جہت سے بھی ہم پر اس کا احسان نہیں ہے۔ حق تعلٰی کے خلاف دستور کا حوالہ اور واسطہ دینے کو کسی شرکت یا شرک کی منت کشی کہنا ایک ایسی بات ہے جس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے جماعت سے باہر کے علماء کے موقف پر جو سوال کیا تھا وہ اہم تھا اور فاضل مکتوب نگار کو اس کا جواب دینا چاہیے تھا۔ اس سے اس تضاد کے دور ہونے میں مدد ملتی جو وہ میرے اشارات اور جماعت کے موقف میں محسوس کر رہے ہیں لیکن جب وہ اس سے بچ گئے تو مجھے اصرار نہیں ہے۔ آخر میں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ جب آپ کو جماعت کے موقف پر اشکال نہیں ہے تو بات ختم ہے۔ میں جماعت کے موقف اور اپنے اشارات میں تضاد نہیں پاتا۔ اگر آپ تضاد پاتے ہیں تو انہیں رد کر دیجیے۔ اصل چیز جماعت کا موقف ہے نہ کہ میرے اشارات۔

شرائطِ ایجنسی

۱۔ ایجنسی کم سے کم پانچ پر دی جائے گی۔

۲۔ ‎5/-‎ ایڈوانس جمع کرنے ہوں گے۔

۳۔ ۵ سے ۵۰ پرچوں تک ٪25 کمیشن دیا جائے گا۔ ۵۰ سے زائد رسالوں پر کمیشن ٪33 دیا جائے گا۔

۴۔ رسائل کی روانگی کا خرچ دفتر برداشت کرے گا۔ رجسٹری اور وی پی کا خرچ ایجنٹ صاحبان کے ذمے ہوگا۔

۵۔ ہر مہینے کا بل باقاعدگی سے ادا کرنا چاہیے۔

منیجر رسالہ زندگی رام پور

شرکت و مضاربت کے شرعی اصول

(۴)

جناب نجات اللہ صدیقی، شعبۂ معاشیات مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

دوسرا کاروبار کرنے کی آزادی کاروبار مضاربت میں اپنا ذاتی سرمایہ شامل کر اور اس سرمایہ میں سے شرکت یا مضاربت کے ... پر کسی دوسرے فریق کو سرمایہ دینے کے سلسلے میں حنبلی فقہاء کا مسلک وہی ہے جو حنفی فقہاء کا ہے۔ یعنی ... اقدامات مالک کی اجازت کے بعد ہی کیے جا سکتے ہیں۔ البتہ ابن قدامہ کی مذکورہ عبارت سے نیا مسئلہ سامنے آتا ہے۔ یعنی کاروباری فریق کا یہ اختیار کہ وہ دوسرے اصحاب سرمایہ سے مضا... کے اصول پر سرمایہ حاصل کر کے کاروبار کرے۔ ان کے نزدیک ایسا کرنے کے لیے بھی پہلے صاحب سر... اجازت ضروری ہے۔ بشرطیکہ نیا کاروبار پرانے کاروبار کے حق میں مضر ہو۔ ابن قدامہ نے خو... بات کی صراحت کر دی ہے کہ اکثر فقہاء اس صورت میں بھی مالک کی اجازت ضروری نہیں سمجھتے کاروباری فریق کو اس بات کے لیے آزاد سمجھتے ہیں کہ وہ دوسرے اصحاب سرمایہ سے مزید سرمایہ حا... کر کے نئے کاروبار شروع کرے۔ جیسا کہ اس سے پہلے نقل کی ہوئی عبارتوں سے ظاہر ہے حنفیہ کی رائے یہی ہے۔ کیونکہ اس نئے معاہدۂ مضاربت کا سابقہ معاہدہ سے کوئی تعلق نہیں اور سابقہ معاہدہ، کاروباری فریق کی کاروباری آزادی نہیں سلب کر سکتا، الا یہ کہ خود اس معاہدے کی رو سے اس نے اپنے کو اس کا پابند کر لیا ہو کہ وہ کسی نئے فریق کے ساتھ مضاربت کا معاہدہ نہ کرے گا[1]۔ مالکی فقہاء بھی ... سلسلے میں کاروباری فریق کو پہلے صاحب سرمایہ کی اجازت کا پابند نہیں بناتے۔ جیسا کہ الشرح الصغ...

---

[1] کاسانی : بدائع الصنائع جلد ۶ صفحہ ۹۶

محولہ بالا عبارت سے واضح ہے ۔ کاروباری فریق کو یہ اختیار ہے کہ وہ مضاربت پہ لیے ہوئے سرمایہ کو دوسرے افراد سے حاصل کیے ہوئے سرمایہ میں ملا کر کاروبار کرے[1] شافعی فقہاء کے بیان ہمیں اس ضمن میں کوئی صریح بیان نہ مل سکا لیکن قیاس یہی ہے کہ ان کا مسلک بھی وہی ہوگا جو حنابلہ نے اختیار کیا ہے یعنی اگر نیا کاروبار سابق کاروبار کے لیے مضر ہو سکتا ہو تو ایسا کرنے سے پہلے صاحب سرمایہ کی اجازت ضروری ہے ۔

اس مسئلے میں صحیح موقف یہ معلوم ہوتا ہے کہ کاروباری فریق کو آزاد سمجھا جائے کہ وہ دوسرے افراد سے مضاربت پر سرمایہ حاصل کر کے نیا کاروبار شروع کر سکتا ہے لیکن صاحب سرمایہ کو اس بات کا حق حاصل ہو کہ وہ اگر نئے کاروبار کو اس کاروبار کے لیے مضر سمجھے جو اس کے سرمایہ سے کیا جا رہا ہے تو کاروباری فریق کو ایسا کرنے سے روک سکتا ہے ۔ اس کے لیے یہ بھی ممکن ہے کہ مضاربت کا معاہدہ کرتے وقت کاروباری فریق سے یہ طے کرلے کہ وہ اس کاروبار کے دوران کوئی نیا کاروبار نہ شروع کرے گا ۔ یہی موقف ہم شرکت کے سلسلے میں بھی اختیار کریں گے ۔ مضاربت پر سرمایہ حاصل کر کے کاروبار کرنے کے ساتھ کاروباری فریق کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ اپنے ذاتی سرمایہ سے کسی دوسرے کاروبار میں شرکت کر سکے ۔ بشرطیکہ صاحب سرمایہ نے معاہدہ کرتے وقت یہ شرط نہ طے کی ہو کہ وہ ایسا نہیں کرے گا ۔ اگر معاہدے کے وقت یہ شرط نہیں طے کی گئی ہے تو بھی صاحب سرمایہ کو اختیار ہوگا کہ اگر نئے مشترکہ کاروبار میں کاروباری فریق کی مصروفیت اس کاروبار کو نقصان پہنچا رہی ہو جو وہ مضاربت کے سرمایہ سے کر رہا تھا تو وہ اسے شرکت کرنے سے منع کر دے ۔ اگر کاروباری فریق کو شرکت پر اصرار ہے تو وہ مضاربت کا معاہدہ ختم کر سکتا ہے ۔

یہی موقف اس کاروباری آزادی سے ہم آہنگ ہے جو مضاربت کا معاہدہ کرنے سے پہلے کاروباری فریق کو حاصل تھی ۔ اگر معاہدہ مضاربت نے کسی شرط کی رو سے اسے اس آزادی سے محروم کر دیا ہے تو معاہدے کے بعد کاروباری فریق صاحب سرمایہ کی اجازت کے بغیر نیا کاروبار نہ شروع کر سکے گا ۔ لیکن اگر اس معاہدے میں کوئی ایسی شرط نہیں تھی تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اس آزادی سے محروم قرار دیا جائے ۔ رہا یہ امکان کہ نئے کاروبار پرانے کاروبار میں کاروباری فریق کی سرگرمی پر اثر انداز ہو کر اسے نقصان پہنچا سکتا ہے تو اس کا عملی شکل اختیار کرنا بہت سے دوسرے حالات پر موقوف ہے ۔ مثلاً پرانے کاروبار میں سرمایہ کی مقدار، کاروبار

[1] احمد الدردیر ۔ الشرح الصغیر جلد ۲ صفحہ ۲۱۲

فریق کی صلاحیت کاروغیرہ۔ عام حالات میں ہمیں یہی توقع رکھنی چاہیے کہ کاروباری فریق پہلے کاروبار کو بھی پوری دلچسپی کے ساتھ انجام دے گا کیونکہ اس کے نفع سے اس کا نفع وابستہ ہے۔ اگر عملاً نئے کاروبار سے پرانا کاروبار قابل لحاظ حد تک متاثر ہوتا نظر آئے۔ یا آغاز کاروبار سے پہلے قرائن کی بنا پر صاحب سرمایہ کو اس بات پر اعتماد ہو کہ ایسا ہی ہوگا تو اسے اختیار ہے کہ کاروباری فریق کو نیا کاروبار شروع کرنے سے روک دے۔ اس طور پر حنابلہ نے جو مسلک اختیار کیا ہے اس کی بھی پوری رعایت ہو جاتی ہے اور کاروباری فریق کی آزادی کاروبار بھی محفوظ رہتی ہے۔

کاروبار مضاربت میں ذاتی سرمایہ شامل کرنے کا حق

صاحب سرمایہ اور کاروباری فریق کے درمیان نفع نقصان کا ٹھیک ٹھیک حساب کرنے کے لیے ضروری ہے کہ کاروباری فریق اپنے ذاتی سرمایہ کو مضاربت پر حاصل کیے ہوئے سرمایہ میں ملا کر کاروبار کرنے کا اقدام صاحب سرمایہ کے علم و اطلاع کے ساتھ کرے۔ اگر معاہدہ کرتے وقت، یا اس کے بعد اس علم و اطلاع کے باوجود صاحب سرمایہ اسے ایسا کرنے سے منع نہ کرے تو اسے اجازت کے مرادف سمجھنا چاہیے البتہ اگر وہ ایسا کرنے سے منع کر دے تو کاروباری فریق کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا کہ ایسا کرنے سے باز رہے یا مضاربت کا معاہدہ ختم کر دے۔ یہ موقف اگرچہ مالکیہ کے مسلک کی طرف زیادہ جھکا ہوا ہے لیکن حنفی مسلک کے بھی مطابق ہے۔ جیسا کہ الفقہ علی المذاہب الاربعہ کے مذکورہ بالا حوالے سے واضح ہے۔[1]

مضاربت کے سرمایہ کو مضاربت پر دینے کا اختیار

اس ضمن میں سب سے اہم بحث یہ ہے کہ مضاربت پر سرمایہ حاصل کر کے کاروبار کرنے والے کو یہ اختیار حاصل ہے کہ نہیں کہ وہ اس سرمایہ کو یا اس کے ایک حصہ کو مضاربت کے طور پر کسی دوسرے فریق کو دے۔ مذکورہ بالا تصریحات سے ظاہر ہے کہ اس بات پر تمام مکاتب فقہ کا اتفاق ہے کہ کاروباری فریق کو یہ اختیار خود بخود نہیں حاصل ہو جاتا بلکہ اس کے لیے صاحب سرمایہ کی اجازت ضروری ہے۔ حنفی، مالکی اور حنبلی فقہاء کے نزدیک صاحب سرمایہ کی اجازت کے بعد یہ اختیار حاصل ہو جاتا ہے۔ یہ اجازت عام بھی ہو سکتی ہے۔ مثلاً یہ طے پا جائے کہ کاروباری فریق اپنی صوابدید کے

[1] عبدالرحمٰن الجزیری: کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ جلد ۳ ص ۴۱

کے مطابق کاروبار کرے گا۔ یا مخصوص طور پر اس اقدام کے لیے بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔ شافعی فقہاء کا ایک اشکول یہ رائے رکھتا ہے کہ کاروباری فریق کو یہ اختیار کسی صورت میں حاصل نہیں ہو سکتا۔ جو شخص خود مضاربت کے طور پر سرمایہ حاصل کرکے کاروبار کر رہا ہو اس کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ اس سرمایہ کو کسی دوسرے فریق کو مضاربت کے طور پر دے۔ لیکن بعض شافعی فقہاء وہی رائے رکھتے ہیں جو جمہور فقہاء نے اختیار کی ہے۔ آئندہ مباحث میں ہم اس رائے کو ترجیح دیں گے۔ اس موقف کی دلیل وہی ہے جو فقہائے احناف نے دی ہے۔ کاروبار کا منشا نفع کمانا ہے۔ اگر کاروباری فریق یہ دیکھے کہ نفع کمانے کی بہتر شکل یہ ہے کہ وہ اس سرمایہ کو مضاربت کے طور پر کسی دوسرے فریق کو دے دے تو اسے نفع کمانے کی یہ شکل اختیار کرنے کا حق ملنا چاہیے۔

درمیانی فریق کا حق نفع

اس صورت میں جسے آئندہ ہم مضاربت در مضاربت کے نام سے یاد کریں گے ایک مخصوص مسئلہ پیدا ہوتا ہے جس پر علیحدہ سے گفتگو ضروری ہے۔ ایک کاروباری فریق ایک صاحب سرمایہ سے مضاربت کے اصول پر سرمایہ حاصل کرتا ہے۔ اس سرمایہ کو وہ ایک دوسرے کاروباری فریق کو مضاربت کے اصول پر دے دیتا ہے۔ پہلا کاروباری فریق جو کاروباری عمل انجام دیتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ اس نے اپنی صوابدید کے مطابق ایک ایسے کاروباری فریق کا انتخاب کیا ہے جس کے کاروبار کے ذریعے اسے سرمایہ مضاربت پر نفع ملنے کی توقع ہے۔ اس کے علاوہ وہ کوئی اور کاروباری عمل نہیں انجام دیتا جب دوسرے کاروباری فریق کی کاروباری جدوجہد کے نتیجے میں سرمایہ مضاربت پر نفع حاصل ہوتا ہے تو اختتام معاہدے پر کل نفع میں سے ان تینوں فریقوں صاحب سرمایہ پہلا کاروباری فریق، دوسرا کاروباری فریق — نفع ان شرائط کے مطابق تقسیم پائے گا جو ان دونوں معاہدوں میں طے کی گئی ہوں۔ دو صورتیں ممکن ہیں۔ اگر صاحب سرمایہ نے پہلے کاروباری فریق سے یہ طے کیا تھا کہ اس کو جو نفع ہوگا اس میں سے فلاں نسبت، مثلاً نصف، صاحب سرمایہ کا حق ہوگا تو یہ ایک صورت ہوگی۔ اگر اس نے پہلے کاروباری فریق سے یہ طے کیا تھا کہ اس سرمایہ سے کیے جانے والے کاروبار کے کل نفع میں سے وہ فلاں نسبت مثلاً نصف حصے کا حقدار ہوگا تو یہ دوسری صورت ہوگی۔ پہلی صورت میں کل نفع پہلے کاروباری فریق اور دوسرے کاروباری فریق کے درمیان اس نسبت سے تقسیم پائے گا جو ان کے درمیان طے پائی ہے۔ پھر پہلے کاروباری فریق کے حصہ نفع میں صاحب سرمایہ

طابق حصہ ملے گا جو اس نے طے کی تھی باقی نفع پہلے کاروباری فریق کو ملے گا۔ دوسری صورت میں پہلے کل نفع میں سے صاحب سرمایہ کو اس کی طے کردہ شرط کے مطابق حصہ دیا جائے۔ اب اگر دوسرے کاروباری فریق کے ساتھ پہلے کاروباری فریق کا معاہدہ یہ تھا کہ دوسرے فریق کو کل نفع کی ایک متعین نسبت کے مطابق حصہ ملے گا تو ایسا ہی کیا جائے گا، اور باقی نفع پہلے کاروباری فریق کو ملے گا۔[1] اگر دوسرے کاروباری فریق سے یہ معاہدہ کیا گیا ہے کہ کل نفع کا جو حصہ پہلے کاروباری فریق کو ملنے والا ہے اس میں سے وہ ایک متعین نسبت کے مطابق حصہ لے گا تو اس کے مطابق عمل کیا جائے گا۔

حنفی فقہاء نے صراحت کر دی ہے کہ مضاربت در مضاربت کی یہ صورت جائز ہے۔ سرخسی نے اس پر تفصیلی بحث کی ہے اور مضاربت در مضاربت کی مختلف شرائط کے مطابق نفع کی تقسیم کا اصول مثالوں کے ذریعے واضح کیا ہے۔[2] پہلے کاروباری فریق کو اس صورت میں جو حصہ نفع ملتا ہے اس کے بارے میں وہ لکھتے ہیں: —

"یہ اس کے لیے حلال ہے اور اسے مضاربت کے دونوں معاہدے کرنے کی بنا پر ملتا ہے خواہ وہ خود کوئی کاروباری جد و جہد نہ کرے"[3]

اس کی فقہی دلیل انھوں نے یہ دی ہے کہ اگر پہلے کاروباری فریق کی جانب سے کوئی آدمی کسی حصہ نفع اجرت کے بغیر کاروباری اعمال انجام دے دے اور نفع ہو تو اس کو نفع میں سے اس کا طے شدہ حصہ ملے گا اور یہ نفع لینا اس کے لیے حلال ہوگا۔ اگرچہ اس صورت میں بھی اس نے خود کاروباری اعمال نہیں انجام دیے ہیں تو بھی یہی حکم ہے۔ معلوم ہوا کہ نفع ملنے کی بنیاد معاہدے میں طے شدہ شرط ہے۔ خواہ عملاً کاروباری جد و جہد کی انجام دہی کسی طریقے سے انجام پائے۔[4]

---

[1] نظری طور پر یہ امکان سامنے رہے کہ پہلے کاروباری فریق کے لیے کچھ نہ بچے، یا اسے کچھ رقم دوسرے کاروباری فریق کو اپنے پاس سے بھی دینا پڑے۔ مثلاً صاحب سرمایہ کے لیے کل نفع کا نصف اور دوسرے کاروباری فریق کے لیے کل نفع کا نصف ہے تو پہلے فریق کے لیے کچھ نہ بچے گا۔ صاحب سرمایہ کے لیے نصف اور دوسرے فریق کے لیے دو تہائی طے پایا ہے تو نفع کے چھٹے بقدر رقم پہلے کاروباری فریق کو اپنی جیب سے ادا کرنی ہوگی۔ مگر عملی طور سے یہ بعید از قیاس شکلیں ہیں لہٰذا ان سے کچھ حاصل نہیں۔

[2] سرخسی: المبسوط جلد ۲۲ صفحات ۹۵ تا ۱۰۴

[3] ایضاً ص۱۰۱

[4] ایضاً ایضاً

پہلے کاروباری فریق کے استحقاق نفع کی یہی دلیل کاسانی نے بھی دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

"یہ نفع اس کے لیے حلال آمدنی ہوگی کیونکہ دوسرے کاروباری فریق کے انجام دیے ہوئے کاروباری اعمال اسی کی جانب سے انجام دیے گئے ہیں۔ گویا کہ اس نے انہیں خود انجام دیا ہو۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کسی نے کسی آدمی کو ایک درہم اجرت کے عوض ایک کپڑا سینے پر رکھا۔ پھر اس اجیر نے ایک دوسرے آدمی کو اجرت پر رکھا جس نے وہ کپڑا نصف درہم کے عوض سی دیا۔ تو پہلے اجیر کے لیے فاضل رقم (یعنی نصف درہم) حلال آمدنی ہوگی کیونکہ اس کے رکھے ہوئے اجیر نے جو کام کیا وہ اسی کے لیے کیا گیا ہے۔ گویا کہ اس نے خود ہی وہ کام کر دیا ہو......" [۵]

اس استدلال کے تجزیے سے واضح ہے کہ اصل چیز یہ ہے کہ کاروباری فریق کاروبار کے انجام پانے کی ذمہ داری لے۔ اس ذمہ داری کو وہ خود انجام دیتا ہے یا اپنے ملازمین کے ذریعے یا نفع میں شرکت کی بنیاد پر کسی کاروباری فریق کے ذریعے پورا کرتا ہے، یا کوئی فریق کسی اجرت اور حصۂ نفع کے بغیر اس کے لیے کاروباری اعمال انجام دے دیتا ہے۔ اس سے کاروباری فریق کے استحقاق نفع پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ وہ اپنے اور صاحب سرمایہ کے درمیان طے شدہ شرائط کے مطابق نفع کا مستحق ہوگا۔ اس نفع میں سے وہ اپنے اور کاروباری اعمال انجام دینے والے دوسرے فریق کو طے شدہ شرط کے مطابق حصہ دے گا۔

مالکی فقہاء بھی صاحب سرمایہ کی اجازت سے مضاربت در مضاربت کو جائز قرار دیتے ہیں۔ ایسی صورت میں پہلا کاروباری فریق طے شدہ شرائط کے مطابق نفع میں سے حصہ پائے گا۔ ذیل کی عبارت سے بھی یہی رائے ظاہر ہوتی ہے۔ کیونکہ اس میں یہ صراحت کی گئی ہے کہ اگر پہلے کاروباری فریق نے صاحب سرمایہ کی اجازت کے بغیر دوسرے کاروباری فریق کے ساتھ مضاربت کا معاہدہ کیا تو اسے نفع میں کوئی حصہ نہ ملے گا، اور اگر کاروبار میں نقصان ہوا تو وہ اس کا ذمہ دار ہوگا۔

"اگر اس نے مضاربت کی، یعنی مضاربت کے سرمایہ یا اس کے کسی حصے کو مضاربت کے طور پر دے دیا، صاحب سرمایہ کی اجازت کے بغیر تو وہ ذمہ دار قرار پائے گا...... اس صورت میں نفع ان دونوں فریقوں کے درمیان تقسیم پائے گا۔ یعنی صاحب سرمایہ اور دوسرا کاروباری فریق جو سرمایہ کو کام میں لایا ہے اور پہلے کاروباری فریق کے لیے نفع میں کوئی حصہ نہیں ہوگا کیونکہ اس نے صاحب سرمایہ کی اجازت کے بغیر اسے دوسرے کاروباری فریق

کو دے کر زیادتی کی ہے۔ [1]

اس عبارت کے آخری جملے سے واضح ہے کہ صاحب سرمایہ کی اجازت ہو تو مضاربت در مضاربت کی صورت میں پہلا کاروباری فریق بھی جو خود کاروبار نہیں کرتا نفع کا مستحق ہوگا۔

جو شافعی فقہا مضاربت در مضاربت کو جائز سمجھتے ہیں ان کے نزدیک پہلا کاروباری فریق طے شدہ شرائط کے مطابق نفع پائے گا۔ یہ بات کتاب المہذب کی محولہ بالا عبارت سے واضح [2] ہے کیونکہ دی ہوئی مثال میں صراحت موجود ہے کہ سرمایہ سے اشیاء یا اجناس خریدنے اور ان کو فروخت کرنے کا کام صرف دوسرا کاروباری فریق کرتا ہے۔

حنبلی محقق ابن قدامہ مضاربت در مضاربت کا جواز بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں

"پہلا کاروباری فریق صاحب سرمایہ کے ایجنٹ (وکیل) کی حیثیت سے یہ کام کرے گا۔ چناں چہ اگر اس نے سرمایہ کو کسی تیسرے آدمی کو دے دیا اور خود اپنے لیے کوئی نفع نہیں طے کیا تو یہ معاہدہ درست ہوگا۔ اگر اس نے اپنے لیے بھی نفع میں ایک حصہ طے کیا تو درست نہ ہوگا کیونکہ اس کی جانب سے نہ سرمایہ لگایا گیا ہے نہ وہ کاروباری اعمال انجام دے رہا ہے اور نفع کا استحقاق انہی دو بنیادوں میں کسی پر ہوتا ہے۔" [3]

اس بیان کے مطابق ہماری دی ہوئی مثال میں پہلے کاروباری فریق کو نفع میں سے کوئی حصہ نہیں مل سکتا۔ ابن قدامہ نے اس کا سبب یہ بتایا ہے کہ یہ فریق کاروباری اعمال نہیں انجام دیتا لیکن یہ دلیل زیادہ وزن نہیں رکھتی۔ کاروباری اعمال صرف محنت اور دوڑ دھوپ کا نام نہیں ہے۔ بلکہ اہم کاروباری فیصلے بھی کاروباری اعمال میں داخل ہیں اور اکثر اوقات یہ فیصلے کاروبار کے نتیجے کے لیے زیادہ اہم ہوتے ہیں۔ بہ نسبت اس جسمانی محنت کے جو کاروباری فریق کاروبار کے سلسلے میں انجام دیتا ہے۔ کاروباری فریق جب یہ فیصلہ کرتا ہے کہ نفع کمانے کی بہتر شکل یہ ہے کہ اس سرمایہ کے ذریعے کسی صاحب صلاحیت کاروباری فریق کے ساتھ مضاربت کا معاہدہ کر لیا جائے تو وہ ایک اہم کاروباری عمل انجام

---

[1] شیخ احمد الصاوی: بلغۃ السالک لاقرب المسالک۔ جلد ۲ ص۲۳۲

[2] ابو اسحٰق ابراہیم بن یوسف فیروزآبادی: کتاب المہذب جلد ۱ ص۳۹۱

[3] ابن قدامہ: المغنی جلد ۵ ص۱۶۱

دیتا ہے۔

اگر کاروباری اعمال کا وہ سادہ تصور ہی سامنے رکھا جائے جس میں خرید و فروخت اور وقت اور محنت چاہنے والی دوسری سرگرمیاں شامل ہیں تو بھی پہلے کاروباری فریق کو ملنے والے نفع کی وہ توجیہ کافی ہے جو سرخسی اور کاسانی اور دوسرے حنفی فقہا نے پیش کی ہے۔ یعنی یہ کہ دوسرا کاروباری فریق کاروباری اعمال انجام دیتا ہے ان کی حیثیت پہلے کاروباری فریق کی جانب سے کرائے ہوئے کاروبار اعمال کی ہے۔

اس مسئلے پر ایک اور زاویۂ نگاہ سے غور کرنا مفید ہوگا جس کی طرف ہم نے اس مقالے کی تمہید میں اشارہ کیا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی نہ سرمایہ رکھتا ہے نہ اتنی فرصت کہ اپنا وقت لگا کر محنت طلب کاروبار کرے۔ لیکن اپنی کاروباری سوجھ بوجھ اور تجربے کی بنیاد پر وہ اس کی بہت عمدہ صلاحیت رکھتا ہے کہ سرمایے کو اچھے کاروباری فریقوں کو مضاربت پر دینے کا کام کر سکے۔ اس کی خصوصی صلاحیت کاروباری فریق کے انتخاب کی صلاحیت ہے۔ مضاربت در مضاربت کی وہ صورت جس کے جواز کی صراحت حنفی فقہا نے کی ہے یہ ممکن بنا دیتی ہے کہ اصحاب سرمایہ کو ایسے ماہرین کا تعاون حاصل ہو سکے۔ صاحب سرمایہ اور ایسے افراد کا تعاون عملاً کاروبار کرنے والے افراد کے لیے سرمایہ کی فراہمی کو سہل بنا دیتا ہے اور مضاربت در مضاربت کا معاہدہ تینوں فریقوں کے مصالح کی ترویج کرتا ہے۔ شریعت نے جس طرح اصحاب سرمایہ اور کاروبار کر سکنے والے افراد کے درمیان تعاون کے لیے مضاربت کی صورت کو جائز رکھا ہے اسی طرح اصحاب سرمایہ، ماہرین انتخاب اور کاروبار کر سکنے والے افراد کے درمیان تعاون کے لیے مضاربت در مضاربت کی صورت کو جائز قرار دینا چاہیے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ نفع آور کاروباری جد و جہد کی نوعیت اور ماہیت پر بحث کرنے والے معاشی ماہرین نے اس بات پر بہت زور دیا ہے کہ اہم ترین کاروباری فیصلے ایسے افراد کے انتخاب میں مضمر ہیں جن کے سپرد کاروبار کو عملاً انجام دینے کا کام کیا جا سکے۔ کاروبار کر سکنے والے افراد کا انتخاب جد و جہد معیشت میں کاروباری جد و جہد (　　　) کا جوہر ہے [1]

[1] (فرینک ایچ نائٹ: خطر، عدم تیقن اور نفع: ابواب ۱۱ تا ۱۳)

ہمارے نزدیک مضاربت در مضاربت کے جواز اور درمیانی فریق کے استحقاق نفع کے سلسلے میں حنفی فقہاء نے جو مسلک اختیار کیا ہے وہ زیادہ صحیح اور دورِ جدید کے معاشی تقاضوں سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔ مالکی اور ایک رائے کے مطابق شافعی فقہاء بھی یہی رائے رکھتے ہیں۔ آئندہ مباحث میں ہم اسی رائے کو ترجیح دیں گے۔ ضمناً اس بات کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ہم آئندہ غیر سودی نظام بنک کاری کا جو خاکہ تجویز کریں گے اس میں مضاربت در مضاربت کو کلیدی مقام حاصل ہے۔

مضاربت کے سرمایہ سے شرکت کرنے کا اختیار

جہاں تک مالک کی اجازت سے مضاربت کے سرمایے کو کسی دوسرے کاروباری فریق کے ساتھ شرکت کا معاہدہ کرنے میں استعمال کرنے کا سوال ہے، مختلف مکاتب فقہ اس بارے میں وہی رائے رکھتے ہیں جو وہ مضاربت در مضاربت کے سلسلے میں رکھتے ہیں۔ اگر صاحب سرمایہ کی اجازت ہو تو حنفی، مالکی اور حنبلی فقہاء کے نزدیک کاروباری فریق سرمایۂ مضاربت کے ذریعے کسی دوسرے فریق کی شرکت میں مشترکہ کاروبار کرسکتا ہے۔ مشترکہ کاروبار کے نفع میں سے جو حصہ کاروباری فریق کو ملے گا وہ اس کے اور سرمایہ کے مالک کے درمیان طے شدہ شرائط کے مطابق تقسیم پائے گا۔

اس بحث کے آغاز میں حنفی[1] اور مالکی[2] فقہاء کی وہ عبارتیں نقل کی جاچکی ہیں جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ مالک کی اجازت سے کاروباری فریق سرمایۂ مضاربت کے ذریعے دوسرے افراد کے ساتھ شرکت کا معاہدہ کرسکتا ہے۔ شافعی فقہاء کا غالب مسلک عدم جواز کا ہے جیسا کہ امام نووی کے مذکورہ بالا بیان سے ظاہر ہے[3] البتہ کتاب المہذب کی جو عبارت اوپر نقل کی جاچکی ہے اس سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ بعض شافعی فقہاء کے نزدیک کاروباری فریق صاحب سرمایہ کی اجازت سے سرمایہ مضاربت کے ذریعے دوسرے کاروباری فریقوں کے ساتھ شرکت کا معاہدہ کرسکتا ہے۔ حنبلی فقہاء کا اس بارے میں بھی وہی مسلک ہے جو انھوں نے مضاربت کے سلسلے میں اختیار کیا ہے۔ یعنی صاحب سرمایہ کی اجازت

[1] کاسانی: بدائع الصنائع جلد ۶ ص ۹۵

[2] احمد الدردیر: الشرح الصغیر۔ جلد ۲ ص ۲۳۱-۲۳۲

[3] نووی: منہاج ص ۹۵

سے ایسا کرنا جائز ہوگا ۔ ابن قدامہ نے مضاربت کے باب میں ایک اصولی بات یہ بیان کی ہے کہ :

> اس کا حکم بھی وہی ہے جو شرکت عنان کا ہے ۔ ہر وہ تصرف جو شریک کے لیے جائز ہے مضاربت میں کاروباری فریق کے لیے بھی جائز ہے جو تصرفات شریک کے لیے ممنوع ہیں وہ مضاربت کرنے والے کے لیے بھی ممنوع ہیں ۔ ..... [1]

اس سے پہلے پانچویں اصول پر بحث کرتے وقت اس بات کی سند فراہم کی جا چکی ہے کہ شرکت میں ہر شریک کو دوسرے شرکا کی اجازت سے سرمایۂ شرکت کے ذریعے کسی نئے فریق کے ساتھ شرکت کا معاہدہ کرنے کا اختیار ہے اور حنبلی فقہا کی بھی یہی رائے ہے [2]

اس اصول سے متعلق بحث کے اختتام پر یہ یاد دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا تمام صورتوں میں کاروبار میں نقصان ہونے کی شکل میں سرمایہ میں جو کمی واقع ہوگی وہ صاحب سرمایہ ہی برداشت کرے گا ۔ پہلا کاروباری فریق ' دوسرا کاروباری فریق یا پہلے کاروباری فریق کا شریک اس سرمایہ میں واقع ہونے والی کمی کا کوئی حصہ نہ برداشت کرے گا جو مضاربت کے طور پر حاصل کیا گیا تھا ۔ اسی طرح اگر مضاربت پر سرمایہ حاصل کرکے کاروبار کرنے والا فریق اس کاروبار میں اپنا ذاتی سرمایہ بھی لگاتا ہے تو اس کاروبار میں نقصان ہونے کی صورت میں وہ صرف اپنے سرمایہ کی نسبت سے نقصان برداشت کرے گا ۔ مضاربت کے سرمایہ میں واقع ہونے والی کمی کو صاحب سرمایہ ہی برداشت کرے گا ۔ یہ مذکورہ بالا پہلے اصول کا تقاضا ہے اور اس پر تمام مکاتب فقہ متفق ہیں ۔

قرض لینے یا قرض دینے کا اختیار

(۷) کوئی شریک یا مضاربت پر مال لے کر کاروبار کرنے والا فریق دوسرے شرکا ، یا صاحب سرمایہ کی صریح اجازت کے بغیر شرکت یا مضاربت کے سرمایہ میں سے دوسرے افراد کو قرض نہیں دے سکتا ' نہ دوسرے افراد سے قرض سرمایہ حاصل کرکے اس کاروبار میں لگا سکتا ہے ۔

دوسرے افراد سے قرض لینے سے ہماری مراد کاروبار کی جانب سے قرض لینا ہے ۔ جہاں تک اپنی ذاتی حیثیت میں ذاتی ذمہ داری پر قرض لینے کا سوال ہے ہر فرد کو اس کا اختیار ہے اور یہ اختیار مضاربت

---

[1] ابن قدامہ : المغنی جلد ۵ ص [illegible]

[2] بحوالہ ابن قدامہ : ۔ المغنی جلد ۵ ص [illegible]

یا شرکت کے معاہدے سے ختم نہیں ہو جاتا قرض لیے ہوئے سرمایہ کی حیثیت قرض لینے والے کے ذاتی سرمایہ کی ہوگی۔ اور اگر وہ اسے مشترکہ کاروبار میں لگانا چاہتا ہے تو اسی قاعدے کے مطابق لگا سکے گا جو اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ یعنی اس کے لیے مضاربت میں صاحب سرمایہ اور شرکت میں دوسرے شرکاء کی اجازت ضروری ہوگی۔ اس کے نفع نقصان کا مالک خود وہ فرد ہوگا۔

قرض دینے کے سلسلے میں مذکورہ بالا اصول پر تمام مکاتب فقہ کا اتفاق ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شرکت اور مضاربت کے معاہدے سرمایہ کے ذریعے نفع آور کاروبار کرنے کے لیے کیے جاتے ہیں اور قرض دینا ایک غیر نفع آور کام ہے۔ اس لیے اس کا حق شرکت یا مضاربت کے معاہدے سے خود بخود نہیں حاصل ہو سکتا، نہ اس عام اجازت سے جو جملہ کاروباری تصرفات کے لیے کافی ہے، بلکہ قرض دینے کی صریح اجازت لینا ضروری ہے۔

کاروبار کی طرف سے سرمایہ قرض لینا شرکاء یا مضاربت پر سرمایہ فراہم کرنے والے کی ذمہ داری میں اضافہ کرتا ہے۔ کیونکہ اگر کاروبار میں نقصان ہو تو بھی قرض لیا ہوا سرمایہ پورا واپس کرنا ہوگا۔ مالی ذمہ داری میں یہ اضافہ اصحاب سرمایہ کی صریح اجازت کے بغیر نہیں کیا جانا چاہیے۔ اس بارے میں جن فقہاء کی رائیں صراحت کے ساتھ سامنے آسکی ہیں وہ اس اختیار کو شرکاء یا صاحب سرمایہ کی اجازت کا پابند قرار دیتے ہیں۔

حنفی فقہاء نے اس سلسلے میں اپنا مسلک دلیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

"جہاں تک قرض دینے کا سوال ہے، چونکہ اس کا فی الحال کوئی بدلہ نہیں ملتا لہذا وہ حسن سلوک (تبرع) میں داخل ہے اور ایک شریک کو دوسرے شریک کی طرف سے حسن سلوک کا اختیار نہیں، خواہ وہ یہ کہے یا نہ کہے کہ تم اپنی صوابدید کے مطابق کاروبار کرو الا یہ کہ وہ صراحۃً ایسا کرنے کی اجازت دے[1]۔

"اگر (صاحب سرمایہ نے) اس سے کہا ہو کہ تم اس سرمایہ سے اپنی صوابدید کے مطابق کاروبار کرو تو اسے ان تمام تصرفات کا حق حاصل ہو جائے گا بجز قرض دینے کے ...... وہ قرض دینے کا اختیار اس لیے نہیں رکھتا کہ یہ حسن سلوک میں داخل ہے، کاروباری عمل نہیں ہے۔"[2]

---

[1] کاسانی: بدائع الصنائع جلد ۶ ص ۷۲ (کتاب الشرکۃ)

[2] سرخسی: المبسوط جلد ۲۲ ص ۳۹-۴۰ (کتاب المضاربۃ)

یہی حکم قرض لینے کا بھی ہے ۔

"شرکت عنان میں کسی شریک کو یا مضاربت پر کاروبار کرنے والے کو معاہدے کی رو سے قرض لینے کا اختیار نہیں ملتا ۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اگر ان دونوں صورتوں میں قرض لینے کا حق تسلیم کر لیا جائے تو شرکت یا مضاربت کے اصل سرمایہ میں اضافہ لازم آتا ہے جب کہ (از روئے معاہدہ) شرکا میں سے ہر ایک دوسرے کے کاروباری تصرفات پر صرف اسی سرمایہ کی حد تک راضی ہوا تھا جسے دونوں نے شرکت کا سرمایہ قرار دیا تھا ......" [1]

یہی بات کاسانی نے بھی لکھی ہے [2] انھوں نے اس بات کی صراحت بھی کر دی ہے کہ یہ حق اس عام اجازت کے تحت بھی نہیں حاصل ہوتا جو جملہ کاروباری تصرفات کے لیے دی جاتی ہے بلکہ اس کے لیے مخصوص صریح اجازت لینا ضروری ہے ۔

"رہی تصرفات کی وہ قسم جس کا اختیار مضاربت پر کاروبار کرنے والے کو صریح اجازت کے بغیر نہیں ملتا تو اسے یہ اختیار نہیں کہ مضاربت کے سرمایہ میں مزید سرمایہ قرض لے کر شامل کرے ۔" [3]

قرض دینے کے مسئلے میں حنابلہ کا مسلک بھی وہی ہے جو احناف کا ہے ۔ ابن قدامہ لکھتے ہیں :-

"(شرکت عنان میں) اسے یہ اختیار نہیں کہ قرض دے سکے ۔" [4]

"اگر اس کا شریک اس سے یہ کہے کہ تم اپنی رائے کے مطابق کاروبار کرو تو اس کے لیے تمام کاروباری تصرفات جائز ہو جائیں گے ...... البتہ بلا معاوضہ کسی غیر کو مالک بنانے مثلاً ہبہ کرنے ...... یا قرض دینے ...... ان کاموں کا حق نہیں حاصل ہوگا ۔" [5]

جیسا کہ اوپر واضح کیا جا چکا ہے ۔ مضاربت میں کاروباری فریق کے لیے بھی وہی حکم ہے جو شرکت میں ایک شریک کے لیے ۔

---

[1] سرخسی : المبسوط جلد ۱۱ ص ۱۷۲

[2] کاسانی : بدائع الصنائع جلد ۶ ص ۶۸

[3] ایضاً ایضاً ص ۶۹ نیز ملاحظہ ہو ہدایۃ جلد ۳ ابواب المضاربۃ

[4] ابن قدامہ : المغنی جلد ۵ ص ۱۳۰

[5] ایضاً ص ۱۳۳

مشترکہ کاروبار کی جانب سے کاروبار کی ذمہ داری پر قرض لینے کے سلسلے میں بھی حنابلہ کا مسلک یہی
،کہ یہ اختیار اجازت کے بغیر نہیں حاصل ہو سکتا۔

"اسے یہ اختیار نہیں کہ شرکت کے سرمایہ میں قرض لے کر مزید سرمایہ شامل کرے۔ اگر وہ ایسا کریگا
تو یہ اس کا ذاتی سرمایہ سمجھا جائے گا جس کا نفع اسی کے لیے مخصوص ہوگا اور اس میں ہونے والا خسارہ بھی
اسی کو برداشت کرنا ہوگا" [1]

ابن قدامہ نے اس بات کی صراحت نہیں کی ہے کہ اگر دوسرے شرکاء اس کی اجازت دیں تو ایسا کیا
سکتا ہے کہ نہیں لیکن قیاس یہی ہے کہ اجازت کے بعد ایک شریک ایسا کر سکے گا کیونکہ انھوں نے یہ لکھا ہے
اگر دوسرے شرکاء اجازت دے دیں تو ایک شریک کے لیے وہ تمام کاروباری تصرفات جائز ہو جائیں گے
تجارت میں معروف ہیں مثلاً شرکت، مضاربت، اپنا سرمایہ ملانا اور ادھار فروخت کرنا وغیرہ۔ دوسرے شرکاء
اجازت کے بعد لیے ہوئے قرض کی حیثیت تمام شرکاء کی جانب سے لیے ہوئے قرض کی ہو جاتی ہے اور
ی فقہی اصول اس میں مانع نہیں کہ ایک شریک دوسرے شرکاء کی مرضی سے ایسا کر سکے۔
مالکی اور شافعی فقہاء کے یہاں ہمیں قرض دینے اور لینے کے اختیار کے سلسلے میں کوئی صریح بیان نہ مل سکا
اس سلسلے میں ہمارا موقف وہی ہے جو اس بحث کے آغاز میں ایک اصول کے طور پر بیان کیا گیا
ے۔ احناف کا مسلک اس رائے کی تائید کرتا ہے۔ اس مسئلے میں بنیادی بات یہ ہے کہ ہر صاحب سرمایہ کو
پنے ذاتی سرمایہ میں سے قرض دینے یا اپنی ذمہ داری پر قرض لینے کا اختیار رہے۔ اس اختیار کو وہ خود
استعمال کر سکتا ہے اور اپنے وکیل (ایجنٹ) کے ذریعے بھی استعمال کر سکتا ہے۔ اس بات پر تمام فقہاء
تفاق ہے کہ مضاربت میں کاروباری فریق صاحب سرمایہ کا ایجنٹ ہوتا ہے اور شرکت میں ہر شریک دوسرے
ر کا ایجنٹ ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں کوئی وجہ نہیں کہ اگر شرکاء یا مضاربت کے اصول پر سرمایہ فراہم کرنے
اس بات کی صراحت کے ساتھ اجازت دے تو بھی ایک شریک یا کاروباری فریق کو یہ اختیارات نہ
ل ہوں۔

ادھار خرید و فروخت کا اختیار

ہ شرکت میں ہر شریک اور مضاربت میں کاروباری فریق کاروبار کے سلسلے میں ادھار فروخت کا اختیار

---

[1] ابن قدامہ :- المغنی جلد ۵ صفحہ ۱۲

رکھتا ہے، الّا یہ کہ اسے دوسرے شرکار یا صاحب سرمایہ لینا کرنے سے منع کردیں۔ مشترکہ کاروبار کی جانب سے ادھار خریدی جانے والی اشیاء اور خدمات کی قیمت کاروبار کی مالیت سے زیادہ نہ ہونی چاہئیں۔ اس سے زیادہ ادھار مال خریدنے کا اختیار دوسرے شرکار یا صاحب سرمایہ کی اجازت سے ہی حاصل ہوسکتا ہے۔ اجازت کے بعد اگر کسی فریق نے کاروبار کی جانب سے ادھار مال خریدا ہو اور کاروبار کا سرمایہ اس مال کی قیمت ادا کرنے کے لیے کافی نہ ہو تو وہ اس کی قیمت ادا کرنے میں دوسرے فریقوں کے ساتھ برابر کا ذمہ دار ہوگا۔

ادھار فروخت کرنا قرض دینے اور ادھار خریدنا قرض لینے کی طرح ہے۔ اس لیے فقہار کے مسلک اس باب میں بھی تقریباً وہی ہیں جو انھوں نے قرض کے سلسلے میں اختیار کیے ہیں۔ البتہ ان دونوں تصرفات کے درمیان ایک فرق بھی ہے۔ کاروبار میں ادھار لین دین سے پرہیز دشوار ہے۔ اور اگر کاروباری فریق یا شرکار کو اس اختیار سے محروم کردیا جائے تو کاروبار کا پھیلنا مشکل ہوگا اور نفع کا امکان بھی محدود ہوگا۔ اس فرق کی وجہ سے عام طور پر فقہار نے کاروباری فریق اور شرکار کو ادھار فروخت کا اختیار دیا ہے اور اس سلسلے میں ان کو صاحب سرمایہ یا دوسرے شرکار کی اجازت کا محتاج نہیں قرار دیا ہے ادھار خریدنے کے سلسلے میں فقہار کی رائیں مختلف ہیں۔ جیسا کہ ذیل میں بیان کیا جائے گا۔

احناف کے نزدیک ہر شریک اور مضاربت میں کاروباری فریق کو ازروئے معاہدہ ادھار فروخت کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ چند حدود کے اندر اسے ادھار خریدنے کا بھی اختیار ہے البتہ ان حدود سے تجاوز کے لیے دوسرے شرکار یا صاحب سرمایہ کی اجازت ضروری ہے۔ کاسانی لکھتے ہیں:۔

"ہر شریک کو شرکت کا مال نقد یا ادھار فروخت کرنے کا اختیار ہے .... اور اسے یہ اختیار بھی حاصل ہے کہ نقد یا ادھار مال خریدے .... بشرطیکہ اس کے پاس شرکت کے سرمایہ میں سے نقد موجود ہو۔ یعنی درہم و دینار .... اگر اس کے پاس نہ درہم ہوں نہ دینار اور وہ کوئی ایسی چیز خریدے جس کی قیمت درہم و دینار میں دینی ہو تو خرید کردہ چیز اس کی ذاتی ملکیت ہوگی۔ شرکار کی ملکیت سے علیحدہ اس کا سبب یہ ہے کہ اگر ہم اس کی اس خریداری کو شرکت کے حساب میں شمار کریں تو یہ شرکت کی جانب سے قرض لینے کے مرادف ہوگا اور شریک کو اجازت کے بغیر شرکت کی جانب سے قرض لینے کا اختیار نہیں اور یہی حکم مضاربت کا بھی ہے[1]

[1] کاسانی:- بدائع الصنائع جلد ۶ ص۶۶

مضاربت کی بحث میں کاسانی نے یہ لکھا ہے کہ مضاربت میں کاروباری فریق کو ادھار فروخت کا اختیار حاصل ہونے کے سلسلے میں امام ابوحنیفہ کی رائے ایک ہے اور امام محمد اور قاضی ابویوسف کی رائے دوسری ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک یہ اختیار از روئے معاہدہ خود بخود حاصل ہو جاتا ہے اور امام محمد اور ابویوسف کے نزدیک بغیر اجازت کے نہیں حاصل ہو سکتا۔[1] فقہ حنفی میں جو رائے اختیار کی گئی ہے وہ امام ابوحنیفہ کی رائے ہے۔ ادھار خریدنے کے اختیار کے بارے میں حنفی فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ یہ اختیار صاحب سرمایہ کی صریح اجازت کے بغیر نہیں حاصل ہو سکتا۔ کیونکہ مال ادھار خریدنا قرض لینے کے مرادف ہے۔ اگر کاروباری فریق صاحب سرمایہ کی اجازت کے بغیر ایسا کرے گا تو یہ اقدام اس کی جانب سے اس کی ذاتی حیثیت میں سمجھا جائے گا۔ کاروبار مضاربت سے اس کا تعلق نہ ہوگا۔ کاسانی لکھتے ہیں۔

"قرض لینے کی صورت یہ ہے کہ کاروباری فریق کچھ سامان تجارت اس طور پر خریدے کہ اس کی قیمت قرض رہے اور اس کے پاس قیمت کی جنس کا مال نہ موجود ہو...... کاروبار مضاربت کی جانب سے ایسا کرنا جائز نہیں...... جب کاروباری فریق مضاربت کے سرمایہ پر قبضہ حاصل کرلے تو اسے اس کا اختیار نہیں کہ جو سرمایہ اس کے ہاتھ میں ہے اس سے زیادہ دام کا سامان خریدے کیونکہ یہ زیادہ قرض ہوگا اور اس کے پاس مضاربت کے سرمایہ میں سے اس قرض کی ادائیگی کے لیے کچھ نہیں ہے۔ اگر اس نے کچھ سامان دو ہزار درہم میں خریدے اور مضاربت کا اصل سرمایہ صرف ایک ہزار ہے تو خریدے ہوئے سامان میں سے ایک ہزار کا مال تو کاروبار مضاربت کے لیے ہوگا اور باقی مال کاروباری فریق کا اپنی ذاتی حیثیت میں ہوگا۔ اس کا نفع اسی کو ملے گا اور خسارہ ہوا تو یہ خسارہ بھی اسی کو برداشت کرنا ہوگا۔ یہ زائد قیمت اس کے ذمے قرض رہے گی جسے وہ اپنے ذاتی سرمایہ میں سے ادا کرنے کا ذمہ دار ہوگا۔"[2]

جیسا کہ مذکورہ بالا عبارتوں سے واضح ہے حنفی فقہاء کے نزدیک صاحب سرمایہ یا دوسرے شرکاء اجازت کے بغیر بھی اتنا سامان ادھار خریدا جا سکتا ہے جس کی قیمت کی ادائیگی کے بقدر نقد سرمایہ موجود ہو، کیونکہ اس کی صورت میں اگرچہ قیمت ادھاری رہتی ہے لیکن اس کی ادائیگی ہر وقت ممکن ہے اور کاروبار کی مالی ذمہ داری میں اس کے سرمایہ کی حد سے زیادہ توسیع نہیں عمل میں آتی۔ اگر دوسرے

---

[1] کاسانی: بدائع الصنائع، جلد ۶، ص ۸۶

[2] ایضاً، ص ۹۱

یا مضاربت میں سرمایہ فراہم کرنے والا اجازت دیدے تو کسی مقدار میں بھی ادھار مال خریدا جا سکتا ہے۔
شرکت میں اس مال کی نوعیت مشترکہ مال کی اور اس کی قیمت کی نوعیت مشترکہ ذمہ داری پہ لیے ہوئے قرض
کی ہوگی۔ مضاربت میں بھی حنفی فقہاء کے نزدیک اس مال کی نوعیت صاحب سرمایہ اور کاروباری فریق
کے مشترکہ مال کی اور اس کی قیمت کی نوعیت مشترکہ ذمہ داری پہ لیے ہوئے قرض کی ہوگی۔ اس مال کو
صاحب سرمایہ کا مال اور اس کی قیمت کو صرف صاحب سرمایہ کے ذمے قرض کی حیثیت نہیں دی جائیگی
اس کا سبب وہ یہ بتاتے ہیں کہ مضاربت کا معاہدہ قرض سرمایہ کی بنیاد پر نہیں کیا جاسکتا۔ قرض سرمایہ
کی بنیاد پر کاروبار کی جائز شکل شرکتِ وجوہ کی شکل ہے۔ دو افراد کسی سرمایہ کے بغیر، صرف اپنی کاروباری
ساکھ کی بنیاد پر ایک دوسرے کی شرکت میں کاروبار کا معاہدہ کرتے ہیں تو یہ معاہدہ 'شرکت وجوہ' قرار
پاتا ہے۔ یہ دونوں ادھار مال خریدتے ہیں اور اس کی فروخت کے ذریعے نفع کماتے ہیں [1]

مذکورہ بالا صورت میں جب کاروباری فریق صاحب سرمایہ کی اجازت سے ادھار مال خریدتا ہے تو حنفی
فقہاء کے نزدیک وہ صاحب سرمایہ سے اس ادھار مال کے کاروبار کی حد تک 'شرکت وجوہ' میں ایک فریق بن جاتا
ہے۔ دونوں اس کی قیمت ادا کرنے کے ذمہ دار ہوں گے اور اس کے نفع نقصان میں برابر کے شریک
ہوں گے۔ خواہ خود کاروبار مضاربت میں ان کے درمیان نفع کی تقسیم کے لیے جو نسبت بھی طے پائی ہو۔
سرخسی نے زیر غور مسئلے پر تفصیلی بحث کے بعد اس کا حکم یہی بتایا ہے۔ جو اختصار کے ساتھ ہم نے بیان کیا ہے [2]

مالکی فقہاء شرکت میں ایک شریک کی جانب سے ادھار فروخت کے سلسلے میں وہی رائے رکھتے
ہیں جو احناف نے اختیار کی ہے لیکن مضاربت میں کاروباری فریق مالک کی اجازت کے بغیر ایسا
نہیں کرسکتا۔ ادھار مال خریدنے کا اختیار شرکت میں شرکاء کی اجازت سے مل سکتا ہے مگر مضاربت میں
کاروباری فریق کو یہ اختیار اجازت لینے کے باوجود نہیں مل سکتا۔

" اسے اختیار ہے کہ شرکت کا مال ایک متعین مدت کے بعد ادا کی جانے والی رقم کے عوض ادھار

[1] شرکت کی یہ شکل صرف حنفی فقہاء کے نزدیک جائز ہے۔ ملاحظہ ہو کتاب الفقہ علی المباحث الاربعہ جلد ۳ مباحث الشرکۃ
اور حنفی ماخذ فقہ میں شرکت کے ابواب

[2] سرخسی: المبسوط۔ جلد ۲۲۔ صفحات ۱۷۸ - ۱۸۵ (باب المضارب یامرہ رب المال بالاستدانۃ علی المضاربۃ
نیز کاسانی: بدائع الصنائع جلد ۶ - ص ۹۲

فروخت کرے۔ لیکن اسے ادھار خریدنے کا اختیار نہیں جب وہ شرکت کی اجازت کے بغیر اپنے ذمے واجب الادا رقم کے عوض شرکت کے لیے مال خریدے گا تو اس کے شریک کو نہ اس مال کا نفع مل سکے گا نہ اس پر اس میں واقع ہونے والے خسارے کی ذمہ داری ہوگی۔ کیونکہ یہ ذمہ داریوں میں شرکت ہے جو جائز نہیں۔ (عدم جواز کی بنیاد یہ اصول ہے کہ) اس کا شریک ایسے سرمایہ کا نفع نہ پائے جس کے نقصان کی ذمہ داری اس نے لی ہو نہ ایسا تاوان بھگتے جو اس پر عائد نہ ہوتا ہو۔ اس قرض کی ذمہ داری صرف خریدنے والے کے سر ہوگی۔ البتہ اگر اس کا شریک کسی مخصوص چیز کے سلسلے میں ایسا کرنے کی اجازت دے دے تو اس کے لیے ادھار خریدنا جائز ہوگا۔ اس اجازت کے بعد اس کی حیثیت ایک ایسے کام میں اپنے شریک کے ایجنٹ کی ہوگی جس کا اسے اختیار تھا۔ اب ان دونوں کی حیثیت ان دو افراد کی ہوگی جو اپنی مشترکہ ذمہ داری پر کسی چیز کو ادھار خریدیں۔ یہ بالکل جائز ہے۔[1]

ابن حاجب نے یہ مسلک اختیار کیا ہے کہ اسے ادھار خرید و فروخت کا اختیار حاصل ہے خواہ اسے ادھار خریدنے کی صراحتاً اجازت نہ ملا ہو۔ کیونکہ شرکت مفاوضہ میں مال خریدنے کی عام اجازت شامل ہے۔ ابن رشد کی بھی یہی رائے ہے اور مدونہ میں بھی ظاہر مسلک یہی ہے۔[2]

یہ شرکت کا حکم تھا۔ مضاربت کی صورت میں مال فروخت کرنے کا اختیار از روئے معاہدہ نہیں حاصل ہو جاتا بلکہ اس کے لیے مالک کی اجازت ضروری ہے۔ جہاں تک کاروباری فریق کے ادھار مال خریدنے کا سوال ہے۔ مالکیہ کا مسلک یہ ہے کہ اسے یہ اختیار صاحب سرمایہ کے اجازت دینے پر بھی نہیں حاصل ہو سکتا احمد الدردیر لکھتے ہیں کہ اگر کاروباری فریق مضاربت کا مال مالک کی اجازت کے بغیر ادھار فروخت کریگا تو اس کی قیمت کا ذمہ دار قرار پائے گا۔ (یعنی اگر خریدار سے قیمت نہ وصول ہوئی تو وہ اپنے پاس سے ادا کرے گا)[3] اسی حکم کی صراحت موطا کی شرح زرقانی میں بھی کی گئی ہے[3] اور خود امام مالک کی موطا میں یہ قول نقل کیا گیا ہے۔ ادھار خریدنے کے سلسلے میں احمد الدردیر نے یہ لکھا ہے کہ:-

---

[1] احمد الدردیر: الشرح الصغیر جلد ۲ ص۱۵۶

[2] ایضاً ص۱۵۷

[3] محمد الزرقانی: شرح موطا۔ کتاب القراض۔ باب الدین فی القراض

[4] احمد الدردیر: الشرح الصغیر۔ جلد ۲ ص۱۸۲

"مضاربت پر کاروبار کرنے والا ادھار نہیں خرید سکتا۔ اس کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ کوئی
چیز کاروبار مضاربت کے لیے ادھار خریدے یعنی اس کی قیمت کی وصولی کو مؤخر رکھے اور وہ کاروبار
کے مالک (صاحب سرمایہ) کے ذمے قرض رہے۔ اگر مالک اسے ایسا کرنے کی اجازت دے تو
بھی وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ ....

کاروباری فریق کاروبار مضاربت کے لیے سرمایہ مضاربت سے زیادہ قیمت کا مال نہیں خریدے
گا خواہ اس کا دام وہ اپنی جیب سے نقد ادا کرے۔ اگر وہ مضاربت کے کاروبار کے لیے ادھار
یا اپنے پاس سے نقد قیمت ادا کر کے سرمایہ مضاربت سے زیادہ دام کا مال خریدے تو اس زیادہ
مال کا نفع اسی کے لیے یعنی کاروباری فریق کے لیے ہوگا ...... مالک کے لیے اس نفع میں کوئی
حصہ نہ ہوگا۔ اسی طرح اگر اس میں نقصان ہو تو اسے بھی کاروباری فریق ہی برداشت کرے گا۔[1]

شافعی فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ شرکت اور مضاربت میں ادھار مال فروخت کرنے کے لیے دوسرے شرکاء
سرمایہ کی اجازت حاصل کرنا ضروری ہے۔ مضاربت میں کاروباری فریق کو سرمایہ مضاربت کی حد کے
اندر رہتے ہوئے ادھار مال خریدنے کا اختیار ہے۔ اس سے زیادہ کا مال ادھار خریدنے کے لیے صاحب سرمایہ کی
اجازت درکار ہوگی۔ امام نووی لکھتے ہیں :۔

"ہر شریک کو ایسے تصرفات کا اختیار ہے جس سے دوسرے شرکاء کا نقصان نہ ہو' چنانچہ وہ
ادھار نہیں فروخت کرے گا ...... بغیر اپنے شریک کی اجازت کے "[2]

امام غزالی نے صراحت کر دی ہے کہ یہی حکم مضاربت میں کاروباری فریق کے لیے بھی ہے[3]
مضاربت کی صورت میں کاروباری فریق کے مال ادھار خریدنے کے سلسلے میں یہ حکم ہے کہ

"کاروباری فریق کاروبار مضاربت کے لیے اصل سرمایہ سے زیادہ کا مال نہ خریدے گا ....
بغیر مالک کی اجازت کے ...... اگر وہ ایسا کرے گا تو یہ فعل مالک کی ذمہ داری پر نہ ہوگا بلکہ
کاروباری فریق اس کا ذمہ دار ہوگا۔"[4]

---

[1] احمد الدردیر:۔ الشرح الصغیر، جلد ۲ صفحہ ۲۴۲
[2] نووی: منہاج صفحہ ۹۵
[3] غزالی: کتاب الوجیز ج ۱ صفحہ ۲۲۲
[4] نووی:۔ منہاج صفحہ ۹۵

شرکت کی صورت میں اس مسئلے میں کوئی صریح بیان نہ مل سکا کہ ایک شریک دوسرے شرکا کی اجازت سے مال ادھار خرید سکتا ہے کہ نہیں۔ استاذ علی الخفیف نے یہ لکھا ہے کہ دوسرے شرکا کی اجازت سے اس کے جواز پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے۔[1]

حنبلی کتب فقہ میں شرکت اور مضاربت میں شریک اور کاروباری فریق کے لیے ایک ہی حکم ہے اور وہ یہ کہ اجازت کے بغیر بھی ادھار فروخت کا اختیار حاصل ہے لیکن بعض حنبلی فقہاء کی رائے یہ ہے کہ اس کے لیے مالک یا دوسرے شرکا کی اجازت ضروری ہے اور یہ کہ اس کے لیے عام اجازت کافی ہے۔ ادھار خریدنے کے سلسلے میں ان کا مسلک وہی ہے جو شافعی فقہاء نے اختیار کیا ہے یعنی مشترکہ سرمایہ کے حدود میں رہتے ہوئے مال ادھار خریدا جا سکتا ہے۔ اس سے زیادہ کا مال خریدنے کے لیے شرکا یا صاحب سرمایہ کی اجازت ضروری ہے۔

"اور کاروباری فریق جب صاحب سرمایہ کی اجازت کے بغیر مال ادھار فروخت کرے تو ایک روایت کے مطابق وہ ضامن ہوگا اور دوسری روایت کے مطابق نہیں ضامن ہوگا۔ خلاصۂ بحث یہ ہے کہ کاروباری فریق یا کسی مشترکہ کاروبار میں ایک شریک کو جب صراحۃً بتا دیا جائے کہ وہ نقد اور ادھار، یا اسی ملک کے سکے کے عوض یا کسی اور سکہ کے عوض فروخت کر سکتا ہے تو یہ پابندی جائز ہوگی اور اس کی خلاف ورزی ناجائز ہوگی۔ کیونکہ وہ اجازت کی بنیاد پر تصرف کرتا ہے لہذا ایسا تصرف نہیں کرے گا جس کی اسے اجازت نہ ملی ہو۔ جیسا کہ الحیث کا مقام ہے ...... اگر کوئی صراحت نہ ہو اور معاہدہ علی الاطلاق ہو تو نقد قیمت کے عوض فروخت کے اختیار میں کوئی اختلاف نہیں اور ادھار فروخت کے سلسلے میں دو روایتیں ہیں، پہلی یہ کہ اسے ایسا کرنے کا اختیار نہیں، یہ امام مالک، ابن ابی لیلیٰ اور امام شافعی کی رائے ہے ...... اور دوسری یہ کہ اس کو ادھار فروخت کا اختیار ہوگا۔ یہ ابوحنیفہ کی رائے ہے اور ابن عقیل نے بھی یہی رائے اختیار کی ہے۔ دلیل یہ ہے کہ تجارت اور مضاربت میں کاروباری فریقوں کو جو اجازت دی گئی ہے اس کی تعبیر کاروبار میں مروجہ طریقوں کے مطابق کی جائے گی اور یہ (ادھار فروخت) کاروباری افراد کی عادت ہے اور ایک دلیل یہ بھی ہے کہ ان معاہدوں کا مقصد نفع کمانا ہے اور ادھار فروخت میں نفع زیادہ ہوتا ہے ...... اور اگر (صاحب سرمایہ یا شرکا نے) اس سے یہ کہا ہے کہ اپنی صوابدید

[1] علی الخفیف: الشرکات فی الفقہ الاسلامی ص ۸

کے مطابق کاروبار کرے تو اسے ادھار فروخت کا اختیار (بالاتفاق) حاصل ہو جائے گا۔[1]

ادھار خریدنے کے سلسلے میں ابن قدامہ لکھتے ہیں کہ :۔

راجح مسلک یہ ہے کہ جب اس کے پاس شرکت کے مال میں سے اتنا مال موجود ہو جس کو فروخت کرکے قیمت ادا کرنا ممکن ہو تو ایسا کرنا جائز ہوگا۔ کیونکہ اس کے لیے مال شرکت میں سے قیمت کی ادائیگی ممکن ہے اس لیے یہ ایسا ہی ہے جیسے اس کے پاس اتنا نقد موجود ہو۔ جواز کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ یہ تاجروں کا عام طریقہ ہے جس سے پرہیز ممکن نہیں۔"[2]

آگے اس بات کی صراحت کی گئی ہے کہ اگر اجازت حاصل ہو تو اس اختیار کے ملنے میں کسی کو اختلاف نہیں۔"[3]

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ حنفی، مالکی اور حنبلی فقہاء کے نزدیک ہر شریک کو دوسرے شرکاء کی اجازت کے بغیر ادھار فروخت کا اختیار رہے۔ شافعی فقہاء کے نزدیک اجازت ضروری ہے۔ مضاربت کی صورت میں بھی حنفی اور حنبلی فقہاء کے نزدیک یہ اختیار صاحب سرمایہ کی اجازت کا محتاج نہیں، مگر مالکی اور شافعی فقہاء کے نزدیک اجازت ضروری ہے۔ ہم نے جس رائے کو ترجیح دی ہے وہ حنبلی اور حنفی فقہ کے مطابق ہے۔ یعنی شرکت اور مضاربت میں ہر شریک اور کاروباری فریق کو اجازت حاصل کیے بغیر ادھار فروخت کا اختیار رکھتا ہے۔ اس پر ہم نے یہ اضافہ کیا ہے کہ دوسرے شرکاء یا صاحب سرمایہ کسی وقت بھی اپنے شریک یا کاروباری فریق کو ادھار فروخت سے منع کر سکتے ہیں۔ یہ اضافہ حنفی فقہ کے اصول سے ہم آہنگ ہے اور اس میں شافعی نقطہ نظر کی بھی رعایت ہے۔ وکیل (ایجنٹ) کو مالک بعض تصرفات سے صراحۃً منع کرنے کا اختیار رکھتا ہے اور اس کی یہ ممانعت نافذ ہوگی۔

مال ادھار خریدنے کے سلسلے میں بھی ہم حنفی مسلک کو ترجیح دیں گے۔ ہمارے نزدیک مالکی فقہاء کی یہ رائے کہ مضاربت میں کاروباری فریق کو صاحب سرمایہ کی اجازت کے باوجود یہ حق نہیں حاصل ہو سکتا۔ کاروباری فریق کی اصولی حیثیت — وکیل (ایجنٹ) کی حیثیت — سے ہم آہنگ نہیں۔ ہر شخص کو خود

---

[1] ابن قدامہ :۔ المغنی۔ جلد ۵ ص۱۴۹-۱۵۰

[2] ایضاً ص۱۳۱

[3] بحوالۂ بالا نیز ملاحظہ ہو علی الخفیف : الشرکات فی الفقہ الاسلامی ص۸۴-۸۵

مال ادھار خریدنے کا اختیار ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ وہ اپنے نمائندے کے ذریعے یہ کام نہ کر سکے حنفی، شافعی اور حنبلی فقہاء اس بارے میں متفق ہیں کہ شرکت کی طرح مضاربت کی صورت میں بھی اجازت حاصل کر کے مال ادھار خریدا جا سکتا ہے۔ یہی رائے قابل ترجیح ہے۔

حنفی، شافعی اور حنبلی فقہاء کے نزدیک اور شرکت کی حد تک بعض مالکی فقہاء کے نزدیک بھی ایک خاص حد کے اندر رہتے ہوئے ہر فریق کو اجازت حاصل کیے بغیر بھی مال ادھار خریدنے کا اختیار ہے۔ عام طور پر یہ حد اس طرح بیان کی گئی ہے کہ اگرچہ خریدے ہوئے مال کی قیمت نقد نہ ادا کی گئی ہو لیکن کاروبار میں اتنی مالیت موجود ہو کہ نقد قیمت ادا کرنا ممکن ہو۔ اس شرط سے ان فقہاء کا منشاء یہ ہے کہ ادھار مال خریدنے کے باوجود اصحاب سرمایہ کی مالی ذمہ داریوں میں کوئی اضافہ نہ ہو۔ دوسرے الفاظ میں اس بات کا کوئی امکان نہ پیدا ہو کہ خسارے کی صورت میں مجموعی خسارے کی مقدار کاروبار میں لگائے ہوئے کل سرمایہ سے زیادہ ہو۔ اس دائرے کے اندر رہتے ہوئے فریقین کو ادھار مال خریدنے کا اختیار دینے کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ اس کے بغیر کامیاب نفع آور کاروبار کرنا مشکل ہو جائے گا۔

ہمارے نزدیک یہ ایک وزنی دلیل ہے اور مذکورہ بالا شرط کی پابندی کرتے ہوئے ہر فریق کو ادھار مال خریدنے کا اختیار رہنا چاہیے۔ اس شرط کی پابندی کی صورت یہ ہے کہ کسی وقت بھی کسی مشترکہ کاروبار کے ذمے واجب الادا رقوم اس وقت اس کاروبار کی مجموعی مالیت سے زیادہ نہ ہونی چاہییں۔ آئندہ مباحث میں ہم یہی رائے سامنے رکھیں گے اور اسی کی صراحت ہم نے اس بیان میں کی ہے جو اس بحث کے شروع میں ایک اصولی حکم کے طور پر درج کیا گیا ہے۔

اس ضمن میں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر دوسرے فریقوں کی اجازت سے مشترکہ کاروبار کی مالیت سے زیادہ کا ادھار کاروبار کیا گیا اور کاروبار میں خسارہ ہوا، جس کے نتیجے میں واجب الادا رقوم کی ادائیگی کاروبار کے سرمایہ میں سے ممکن نہ ہو سکی تو اس کی ادائیگی کس طور پر ہو گی؟ شرکت کی صورت میں اس کا حکم واضح ہے۔ یعنی یہ کہ اس مشترکہ ذمہ داری کی تکمیل میں تمام شرکاء مساوی طور پر شریک ہوں گے، خواہ ان کے سرمائے برابر رہے ہوں یا کم و بیش رہے ہوں۔ مضاربت کی صورت میں ایک ممکن رائے یہ ہو سکتی ہے کہ یہ ادائیگی صاحب سرمایہ کے ذمے ہو گی جس کے ایجنٹ کے

طور پر کاروباری فریق نے یہ اقدام کیا تھا۔ لیکن حنفی فقہاء نے صراحت کی ہے کہ اس ذمہ داری میں کاروباری فریق اور صاحب سرمایہ مساوی طور پر شریک ہوں گے کیونکہ یہ اقدام ان دونوں کی جانب سے مشترکہ اقدام قرار پائے گا۔ حنبلی اور شافعی فقہاء کی بحث میں ہمیں اس ذیل میں کوئی صراحت نہیں مل سکی ہے۔ اور مالکی فقہاء اس اقدام کو جائز نہیں قرار دیتے۔ ایسی صورت میں ہم اس رائے کو ترجیح دیں گے جو حنفی فقہاء نے اختیار کی ہے۔ ساتھ ہی اس مال کے نفع کی تقسیم کے بارے میں بھی احناف کی یہ رائے اختیار کرنی ہوگی کہ یہ نفع مساوی طور پر تقسیم پائے گا۔ اس نسبت کے مطابق نہیں جو مضاربت کے سرمایے کے نفع کے سلسلے میں طے پائی ہو۔

حنفی فقہاء کی رائے کے حق میں یہ دلیل دی جاسکتی ہے کہ اگر صاحب سرمایہ مضاربت کے کاروبار میں قرض سرمایہ لگانا چاہتا ہے تو اس کی سیدھی شکل یہ ہے کہ وہ خود قرض لے کر اسے اپنے ذاتی سرمایہ کے طور پر کاروباری فریق کو دے، اور اگر ادھار مال خرید کر کاروبار کرنا چاہتا ہے تو خود ادھار مال خرید کر اس سے کاروبار کرے۔ مال کے ادھار خریدنے میں جو چیز کام آتی ہے وہ خریدنے والے کی ساکھ ہے اور ادھار مال دینے والا خریدنے والے ہی کی ساکھ اور صلاحیت ادائیگی کے پیش نظر ایسا کرتا ہے۔ کاروباری فریق کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ اپنی ذاتی ذمہ داری پر مال ادھار خرید کر اس سے کاروبار کرتا۔ ایسی صورت میں اس کا نفع اس کو ملتا اور اس کی قیمت ادا کرنے کا بھی وہ تنہا ذمہ دار رہتا۔ اگر اس نے ایسا نہیں کیا ہے بلکہ کاروبار کی جانب سے ادھار مال خریدتا ہے تو اس کا مطلب یہ سمجھا جائے گا کہ وہ قیمت کی ادائیگی کی ذمہ داری تنہا خود نہیں لینا چاہتا۔ ایسی صورت میں قیمت کی ادائیگی کی ذمہ داری اور نفع دونوں میں کاروباری فریق اور صاحب سرمایہ کو برابر کا شریک قرار دینا انصاف کے مطابق ہوگا اور اس اصول کے بھی کہ

"نفع کا استحقاق ذمہ داری سے وابستہ ہے۔"

کاروبار کرنے میں جہاں اشیاء کی خرید و فروخت عمل میں لائی جاتی ہے۔ وہاں 'خدمات' کی خرید و فروخت بھی عمل میں لائی جاتی ہے۔ مزدوروں کی خدمات، انجینئروں یا کسی اور فن کے ماہرین کی خدمات اور تیار شدہ مال فروخت کرنے والوں کی خدمات اس شرط پر حاصل کی جاتی ہیں کہ ان کو متعین وقفوں پر ہفتہ وار یا ماہانہ ان کی خدمات کے معاوضے ادا کیے جاتے رہیں گے۔ خدمات کے معاوضے ان

کی عملاً انجام دہی کے بعد ادا کیے جاتے ہیں۔ یہی کاروباری دنیا کا معروف طریقہ ہے۔ اس سے ادھار قرینا لازم آتا ہے لیکن اس تصرف کا ہر کاروباری فریق کو مالک یا شرکا کی اجازت کے بغیر از روئے معاہدہ اختیار حاصل ہونا چاہیے۔ ورنہ کاروبار چلانا ممکن نہ رہ جائے گا۔ خدمات کی ادھار خرید کا اختیار بھی انہی حدود کا پابند ہوگا جو اوپر بیان کی گئی ہیں۔
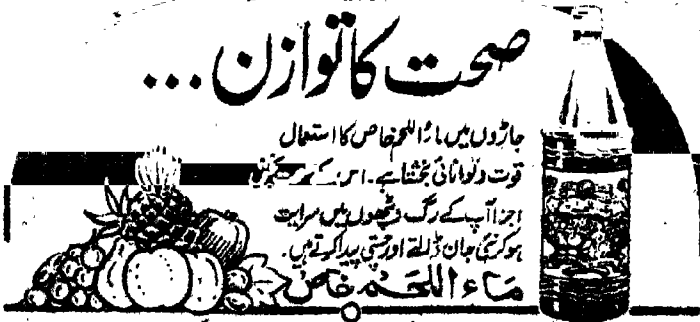
جب منزل سامنے ہوتی ہے

جناب محمد فاروق خاں صاحب

"چاند تو ہمارا انتظار کر، ہم جلد ہی پہنچ رہے ہیں" ـــــ یہ روس کے خلائی مسافر الیکسی لیونوف کی آواز تھی۔ لیونوف نے یہ بات اس وقت کہی تھی جب کہ روسی سائنس دانوں کو اپنے راکٹ لونا نمبر ۹ کو چاند کی سطح پر اتارنے میں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ یہ خبر اتنی اہم سمجھی گئی کہ ٹیلی ویژن اناؤنسر نے ٹیلی ویژن کے پروگرام میں خلل ڈال کر اسے لوگوں تک پہنچایا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان جس چیز کو بھی اپنا مقصد اور اپنی کامیابی کا نشان سمجھ لیتا ہے اس کے لیے وہ حد درجہ حساس ہو جاتا ہے۔ جب اسے اپنی منزل قریب ہوتی نظر آتی ہے تو اس کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانا نہیں رہتا۔

آدمی کا مقصد اس کے سامنے ہو تو اس کے جذبات اور احساسات عام لوگوں سے بالکل مختلف ہو جاتے ہیں۔ جس محنت اور مشقت کے کام کو لوگ بار محسوس کرتے ہیں اس کو وہ زندگی کا حاصل سمجھتا ہے اور جو عمل عام نظر میں بے لذت اور خشک محض ہوتا ہے وہ اس کا محبوب مشغلہ قرار پاتا ہے۔ آدمی کی منزل مقصود اس کی نگاہ میں ہو تو اسے پانے کے لیے وہ کسی ایسی کوشش سے باز نہیں رہ سکتا جو اس کے امکان میں ہو۔ وہ اس راہ میں بڑی سے بڑی قربانیاں پیش کر سکتا ہے اور سخت سے سخت حالات کا سامنا بھی خندہ پیشانی سے کر سکتا ہے۔

تاریخ کے اوراق اس بات کے شاہد ہیں کہ جن لوگوں نے دل کی سچائی کے ساتھ کسی مقصد کو اپنایا تھا انھوں نے کسی چیز کو بھی اپنے مقصد کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننے دیا۔ جارج اسٹیفنسن نے جب طے کیا کہ اسے ایک ایسی گاڑی ایجاد کرنی ہے جو گھوڑوں کے بجائے انجن کے زور سے چلتی ہو تو اس کے سامنے ہر طرح کی مشکلات تھیں لیکن جس چیز نے اس کے ذہن کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا اس سے وہ دست بردار نہ ہو سکا۔ اس کی مخالفت ہر طرف سے ہوئی، اس کا مذاق اڑایا گیا۔ اخبارات نے اس کی کوشش اور جال فشانی کو

حماقت قرار دیا، لیکن اس نے کسی کی پرواہ نہ کی۔ ہر مشکل پر اس نے قابو پالیا۔ آخر وہ وقت آیا کہ لوگوں نے دنیا کی پہلی ریل گاڑی کو نہایت تیزی کے ساتھ دوڑتے دیکھا۔

تار، وائرلیس، ٹیلی فون وغیرہ کے موجدوں کا حال اسٹیفنسن سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ ہر ایک کے سامنے مشکلات تھیں جن کا اس نے مردانہ وار مقابلہ کیا۔ ٹیلی فون کا موجد الگزنڈر گریہم بل جب وہ قسط اپنی ایجاد کے کام میں مصروف تھا اس کے دوست اسے یہی مشورہ دے رہے تھے کہ وہ اپنا وقت ضائع کرنے کے بجائے اسے کسی دوسرے مفید کام میں صرف کرے۔ اس کے دو ساتھیوں نے جو اس کے ساتھ مالی تعاون کر رہے تھے اس کی مدد کرنے سے صاف انکار کر دیا لیکن وہ اپنے کام میں لگا رہا۔ وہ اسے چھوڑنا بھی چاہتا تو شاید چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ اس کے پاس کی رقم سب ختم ہو گئی۔ پھر بھی چالیس ہفتے تک وہ لگاتار کام کرتا رہا۔ مسلسل کوشش کے باوجود اس کے تیار کیے ہوئے آلات ابھی تک بے معنی آوازیں نکالتے تھے۔ یہ وقت اس کے لیے بڑی سخت آزمائش کا تھا لیکن یاس کی حالت میں امید کی کرن پھوٹی۔ ۱۰ مارچ ۱۸۷۶ء کو اس کے آواز گیر آلے سے صاف یہ آواز سنائی دی۔

"مسٹر واٹسن یہاں آئیے، مجھے آپ سے کام ہے۔"

وہ خوشی کے مارے پاگلوں کی طرح دوڑ پڑا اور ایک ہی سانس میں تیسری منزل پر چڑھ گیا اور اپنے ساتھی سے کہا: میں نے تمہاری بات سن لی۔ تمہارے الفاظ مجھے سنائی دے گئے۔

اس طرح کی مثالیں زندگی کے ہر میدان میں ملتی ہیں۔ ان سیاحوں کے حالات کا مطالعہ کیجیے جو دنیا کے دشوار گزار راستوں سے گزرے اور اپنے سفر کے نتیجے میں دنیا کو نئی معلومات فراہم کیں۔ منزل تک پہنچنے کی تڑپ ہی تھی جس نے انھیں منزل سے ہمکنار کیا۔ جن لوگوں نے بھی تاریخ انسانی میں کوئی اہم کارنامہ انجام دیا ہے ان کی زندگیاں گواہ ہیں کہ انھوں نے اپنے آپ کو اپنے مقصد میں گم کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ آج ہم انھیں ان کے مقصد ہی کے ذریعے سے پہچانتے ہیں۔ مقصد سے بڑھی ہوئی دلچسپی نے ان کے اندر بے نیازی کی ایک شان پیدا کر دی تھی۔ آئن اسٹائن شاہی دعوت پر بلجیم پہنچا تو استقبالیہ دستے کو اسٹیشن ہی پر اپنا منتظر چھوڑ کر اپنا سامان ہاتھ میں اٹھائے پیدل ہی شاہی محل کے دروازے پر جا کھڑا ہوا۔ اسی طرح ایک مرتبہ ایک فیلو فاؤنڈیشن نے اسے ۱۵۰۰ ڈالر کا چیک بھیجا۔ یہی چیک کو وہ کتاب کے اوراق کے درمیان یادداشت کے طور پر استعمال کرتا رہا۔

ایسے لوگوں کو اپنے کام سے جس درجے کا شغف ہوتا ہے اس کا اندازہ اسی کو ہو سکتا ہے جو خود کبھی کسی مقصد کے لیے سرگرداں رہ چکا ہو۔ ایڈیسن سائنس کی دنیا میں مختلف ایجادات کا مالک ہے اس شخص کا حال یہ تھا کہ مسلسل ۲۴ گھنٹے کام کرتا رہتا۔ کام کے بغیر اسے چین ہی نہ آتا تھا۔ اپنے کام سے بڑھی ہوئی دلچسپی نے بڑی حد تک اسے بستر سے بے نیاز کر دیا تھا۔ نیند غالب ہوتی تو اپنی لیبارٹری میں پرانے اخبارات کا تکیہ بنا کر چند منٹ کے لیے سو جاتا۔ نیند پر قابو پاتے ہی پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتا۔ اس کی زندگی کا دلچسپ واقعہ ہے کہ جب لوگوں کو اس کی شادی کے موقع پر اس کی تلاش ہوئی تو پتہ چلا کہ وہ اپنی لیبارٹری کو اندر سے مقفل کر کے ایک تجربے میں مصروف ہے۔ اس کی محویت اور اپنے کام سے غیر معمولی دلچسپی کا نتیجہ اس شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے کہ آج ہم اسے مختلف اہم ایجادات کے موجد کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ ایڈیسن کو اپنے مقصد میں وہ کامیابی حاصل ہوئی جس کا پہلے سے کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

اپنے مقصد سے شیفتگی اور والہانہ تعلق کا اظہار سب سے زیادہ دین واخلاق کی دنیا میں ہوا ہے جن لوگوں نے بھی سچے دل سے دین واخلاق کو زندگی کا مقصد قرار دیا۔ ان کی زندگیاں بدل کر رہ گئیں یہاں تک کہ عام ذہن سے بنے ہوئے انسان کی اور دنیا کی مخلوق معلوم ہونے لگے۔ انھوں نے اپنے اخلاق وکردار سے دنیا کو وہ روشنی عطا کی جس کی دنیا کو ہر آن اور ہمیشہ ضرورت ہے۔ خدا کے رسولوں اور نبیوں کا مقام تو نہایت بلند ہوتا ہے۔ ان کے سچے پیرو وں کی زندگیاں بھی انتہائی تابناک اور روشن ہیں۔ ان کے کارناموں سے ان کی سچائی اور اخلاص کا ثبوت ملتا ہے۔ راہ حق میں ان کے صبر و استقلال کو جس چیز نے سہارا دیا وہ یہی منزل حق تھی جس کو ان کی نگاہ نے ایک دم کے لیے بھی اوجھل نہ ہونے دیا جس مقصد کو انھوں نے اختیار کیا تھا اس میں ان کے لیے اتنی جاذبیت اور کشش تھی کہ کسی دوسری طرف متوجہ ہونا ان کے لیے ممکن ہی نہ تھا۔ فرض کی ادائگی کا بے پناہ جذبہ ان کی رگ رگ میں پیوست ہو چکا تھا قرآن کے صحیح ترین الفاظ میں یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے خوشنودی رب کے لیے اپنے آپ کو بیچ دیا تھا وہ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ (البقرہ: ۲۰۷) کی کامل تصویر تھے۔ ان کے پاس اپنے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ جو کچھ تھا خدا کے لیے اور اس مقصد کے لیے جو انھیں خدا کی طرف سے عطا ہوا تھا۔ اس چیز نے انھیں ایسا فراغ اور قلبی نشاط و اطمینان بخشا تھا جس کے تصور سے ہم

روح وجد میں آجاتی ہے۔ تبوک کی مہم درپیش ہے۔ حضرت ابوبکرؓ اپنا سارا اثاثہ لاکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں ڈال دیتے ہیں۔ حضورؐ کے دریافت فرمانے پر کہ گھر والوں کے لیے کیا چھوڑا ہے کہتے ہیں: "گھر پر خدا اور اس کے رسول کو چھوڑا ہے۔" ہمارے گھر کی آبادی مال و دولت سے نہیں اللہ اور اس کے رسولؐ سے ہے۔ اللہ اور اس کے رسول سے کچھ چھپا کر رکھنا ہمارے لیے ممکن نہیں۔ جس چیز نے حضرت صدیق کو اتنا اونچا اٹھایا وہ ان کا ایمان تھا۔ حضرت ابن عباسؓ ان کے بارے میں فرماتے ہیں۔ ما سبقکم ابوبکر بکثرۃ صوم ولا صلوٰۃ ولکن بشیئ وقر فی قلبہ" ابوبکرؓ نماز اور روزے کی کثرت کی وجہ سے سبقت نہیں لے گئے بلکہ ایک چیز کے سبب جو ان کے دل میں راسخ ہو گئی" حضرت صدیق اکبرؓ کو حق کی کامل معرفت حاصل تھی انھوں نے اصل منزل کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھا۔

صحیح معنوں میں جس نے حق کو پہچان لیا اسے اس کی طرف بڑھنے میں تامل نہیں ہوا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر لوگوں کو جہاد پر ابھارا اور جنت کا تذکرہ فرمایا۔ ایک انصاری کھڑے ہو گئے۔ ان کے ہاتھ میں چند کھجوریں تھیں جنھیں وہ کھا رہے تھے۔ کہنے لگے اگر میں اس انتظار میں بیٹھا رہا کہ یہ کھجوریں ختم ہو جائیں تو میں دنیا کا حریص ہوں گا۔ وہ اپنے ہاتھ کی کھجوریں پھینک دیتے ہیں اور تلوار لے کر میدان کی طرف نکل پڑتے ہیں۔ یہاں تک کہ خدا کی راہ میں شہید ہو جاتے ہیں۔ یہ ہے یقین کی وہ کیفیت جو کسی بڑے کام کو انجام دینے کے لیے درکار ہوتی ہے۔

جو حق کے طالب ہیں انھیں جس چیز کی فکر ہوتی ہے وہ عیش و نشاط کی زندگی نہیں ہے بلکہ وہ اس کے لیے فکر مند ہوتے ہیں کہ ان کی زندگی خدا کی طاعت اور اس کی رضا جوئی میں بسر ہو۔ حضرت خبیبؓ کو ان کے دشمن قتل کرنے کے لیے حدود حرم سے باہر لے گئے تو انھوں نے دو رکعت نماز پڑھنے کی اجازت چاہی نماز پڑھ کر فرمایا: "جی تو چاہتا تھا کہ دیر تک نماز پڑھوں لیکن تمھیں خیال ہوتا کہ میں موت سے ڈر گیا پھر انھوں نے یہ شعر پڑھے:۔

وما ان ابالی حین اقتل مسلما ۔۔۔ علی ای شق کان للہ مصرعی

وذالک فی ذات الالہ وان یشأ ۔۔۔ یبارک علی اوصال شلو ممزع

"جب میں اسلام کے لیے قتل کیا جا رہا ہوں تو مجھے اس کی پروا نہیں کہ میں کس پہلو قتل کیا جاتا ہوں یہ جو کچھ ہے خالصاً خدا کے لیے ہے اگر وہ چاہے گا تو ان پارہ پارہ ٹکڑوں پر برکت نازل فرمائے گا"

حضرت خبیبؓ جان دے کر اپنے بعد آنے والوں کو منزل کا پتہ دے گئے۔ وہ اپنی مراد کو پہنچے، ان کے نقش قدم پر چلنے والے بھی کامیاب ہیں۔ خواہ وہ حسن البنا ہوں یا عبدالقادر عودہ ہوں یا سید قطب اور ان کے ساتھی ہوں۔ زندگی کا ہر شخص طالب ہے۔ خدا جسے زندگی عطا کرنی چاہتا ہے اسے یوں زندگی عطا کرتا ہے۔

راہ حق کے مسافر سخت سے سخت آزمائشوں سے گزر جاتے ہیں لیکن اس راہ کو نہیں چھوڑتے جس پر چلے بغیر حق بندگی ادا نہیں ہوتا۔ وہ اس راہ کی سختیوں کو اس عیش کی زندگی پر ترجیح دیتے ہیں جو باطل کی پیروی میں حاصل ہو۔ حق کا نشہ ہی اور ہوتا ہے اس کے مقابلے میں ہر چیز حقیر معلوم ہونے لگتی ہے۔ اہل ایمان کی نہ تو طاقت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور نہ ان کے عزائم اور حوصلوں کو ناپا جا سکتا ہے۔ حق کے غلبہ و استیلا کی طرح انہیں وہ موت بھی عزیز ہوتی ہے جو خدا کی راہ میں آجائے۔ قل ھل تربصون بنا الا احدی الحسنیین کی آواز ان کے کان میں ہوتی ہے۔ انہیں سچائی سے کون پھیر سکتا ہے اور ایسے لوگوں کو کون شکست دے سکتا ہے جو زندگی سے بڑھ کر موت کو عزیز رکھتے ہوں جنہیں رسولؐ کی یہ بات یاد ہو موت فی طاعۃ اللہ خیر من حیٰوۃ فی معصیۃ اللہ عز وجل "موت جو اللہ کی اطاعت میں آئے وہ اس زندگی سے بہتر ہے جو اللہ عز وجل کی نافرمانی میں حاصل ہوتی ہو۔

دنیا کی زندگی میں سب سے زیادہ قابل لحاظ چیز آدمی کی شخصیت ہوتی ہے۔ کامیاب شخص وہی ہے جو مال کی کثرت اور جاہ و حشمت کی بنا پر نہیں بلکہ اپنے ذاتی اوصاف و کمالات کے سبب متعارف ہو۔ شخصیت کی تعمیر اور ذات کی تکمیل ممکن ہی نہیں ہے جب تک آدمی اس مقام بلند کو اپنی نگاہ میں نہ رکھے جس تک پہنچنا اس کے لیے سب سے بڑی سعادت ہے۔ جو چیز کسی شخص یا قوم کو بلند کرتی ہے وہ مقصد کی بلندی ہے۔ سفلی اور پست قسم کے اغراض و مقاصد تو آدمی کو تباہ کر ڈالتے ہیں۔ ان کے پیچھے پڑ کر آدمی چاہے سب کچھ حاصل کر لے لیکن شخصیت اور عزت نفس نام کی کوئی چیز اس کے پاس نہیں رہ سکتی۔ شخصیت اعلیٰ کردار کے مالک وہی لوگ ہوتے ہیں جو کسی بلند مقصد کے لیے جینے اور اس کے لیے مرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ قلعوں کو فتح کر لینا اور دشمنوں کو شکست دینا آسان ہے لیکن خواہشات نفس کو زیر کرنا اور مستقل طور پر اپنے آپ کو ایک راہ پر لگا دینا بے حد مشکل ہوتا ہے۔ لیکن ان کے لیے یہ مشکل بھی آسان ہو جاتی ہے جو فکر بلند کے حامل اور کسی منزل کے جویا ہوتے ہیں۔ ایمان کی طاقت ابھرتی ہے تو وہ ہر چیز کو زیر کر لیتی ہے۔

عمر بن عبد العزیزؒ نے جب زمام خلافت ہاتھ میں لی تو انھوں نے لوگوں کی غصب کردہ املاک کی واپسی کا حکم دے دیا۔ غصب شدہ املاک کی جو دستاویزیں شاہی خاندان کے پاس تھیں انھیں خود قینچی سے کتر ڈالا۔ اس طرح انھوں نے سارے خاندان کی اور خود اپنی جائدادیں ختم کر دیں۔ ایک انگوٹھی کا نگینہ رہ گیا تھا جو انھیں ولید سے ملا تھا اسے بھی واپس کر دیا۔ جب ان سے کہا گیا: "اولاد کا کیا ہوگا؟" تو دل میں چھپے ہوئے جذبات آنسو بن کر رخسار پر بہہ نکلے۔ فرمایا "میں انھیں اللہ پر چھوڑتا ہوں"۔ شیوۂ حق پرستی اسے کہتے ہیں اور ایمان باللہ اس کا نام ہے۔ حق عظیم سیرت و کردار کا طالب ہے۔ کھوکھلی سیرت کے ساتھ حق کے راستے پر ایک قدم بھی چلنا ممکن نہیں۔ آدمی اگر اس مقام کو اپنے پیش نظر رکھے جو انسانی سعادت کا سب سے اونچا مقام ہے تو اس سے اس کے کردار میں طاقت اور اس کی سیرت میں پختگی آسکتی ہے۔ جب ہماری نگاہ منزل کے سوا دوسری طرف بھٹکی ہوئی ہو اور ہمارا دل اصل مقصد کے علاوہ کہیں اور اٹکا ہوا ہو تو حق کی طرف ہمارا ایک قدم بھی نہیں اٹھ سکتا۔ منزل نگاہ میں ہو تو آدمی اس چیز کا آج ہی آرزومند ہو جائے جس کی آرزو وہ مرنے کے بعد کرے گا۔ مہلتِ عمر تمام ہونے کے بعد ہر شخص کی یہی تمنا ہوگی کہ کاش اس نے پوری زندگی حق کے لیے وقف کر دی ہوتی۔ کاش دنیا کے بجائے اس نے آخرت کا گھر پسند کیا ہوتا۔ عمر بن عبد العزیزؒ کی درخواست پر ابو حازم نے انہیں جو نصیحت کی تھی اس میں اسی حقیقت کا اظہار ہے کہ آدمی کی سعادت اس میں ہے کہ وہ آج ہی اپنے اوپر اس چیز کو طاری کرے جو کل اس پر طاری ہونے والی ہے۔ حضرت ابو حازم نے فرمایا۔ "اے خلیفہ! لیٹ جاؤ اور یہ تصور کرو کہ موت تمہارے سر پر کھڑی ہے۔ پھر سوچو اس وقت تم کیا پسند کرو گے؟ بس اسی چیز کو اختیار کر لو اور جو چیز موت کے وقت تمھیں ناپسند ہو اس سے ہمیشہ کے لیے دست بردار ہو جاؤ۔"

شدائد اور مشکلات کی پروا کیے بغیر ہنسی خوشی اپنی زندگی کو ایک ضابطے میں کس دینا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لیے وہ نگاہ مومن درکار ہے جو ظاہری چیزوں پر نہیں رکتی۔ وہ ان چیزوں کی جویا ہوتی ہے جو قدر کی حامل ہوتی ہیں۔ یہ بات جسے حاصل ہوتی ہے وہ دنیائی زندگی میں ہی جنت کی مسرتوں کو دیکھنے لگتا ہے۔ وہ اس وقت بھی شاداں و فرحاں نظر آتا ہے جب کہ ہر طرف خوف طاری ہو۔ وہ یقین و اطمینان کی انشراحی کیفیت کے ساتھ جدھر سے گزر جاتا ہے نسیم چمن کی طرح لوگوں کو کسی باغ و بہار کا پتہ دیتا ہے۔

—

خدا ہندوستانی کلچر میں

جناب ڈاکٹر احمد خضر زبیری صاحب

ڈاکٹر سمپورنا نند کا ایک مضمون بعنوان "خدا پر اعتقاد اور ہندوستانی کلچر" ان کی کتاب "ہندوستانی دانشور" (Indian intellectual) میں شائع ہوا ہے اس میں وہ رقمطراز ہیں۔

"الحاد اور ہندوستانی کلچر میں کوئی بیر نہیں ہے۔ اگر ہندوستانی کلچر کو فی المحال ہندو کلچر تک محدود رکھا جائے جیسا کہ فی الواقع وہ ہے"

اس کی مزید تشریح انھوں نے یوں کی ہے :-

رگ وید میں کسی ایسے لفظ کا استعمال نہیں کیا گیا ہے جس سے واضح اور مکمل طور پر خدا کا مفہوم لیا جا سکے البتہ یجر وید میں جس کو رگ وید کے بعد کے زمانے کی تصنیف مانا جاتا ہے اس میں ایشور کا ذکر ہے جیسا کہ سلسلۂ بیان سے معلوم ہوتا ہے۔ یہ لفظ "رودر" کے لیے استعمال کیا گیا ہے یہ ہو سکتا ہے کہ "رودر" خدا سے الگ کسی ہستی کا نام نہ ہو مگر پھر بھی وہ محض خدا کا ایک پہلو (Aspect) ہی ہے ...... مابعد طبیعی طور پر رودر اِندر وَرُن ایک ہی ہستی کے مختلف پہلو ہیں مگر ہم یہ بات نظر انداز نہیں کر سکتے کہ وید میں مختلف پہلوؤں کی براہ راست اور غیر مبہم طور پر پرستش کی کہیں دعوت نہیں دی گئی ہے۔ ہندوستان کے مکاتب فکر میں شنکھ سب سے قدیم ہے اس کے بانی کپل کو وشنو کا اوتار کہا جاتا ہے (بھگوت گیتا میں شری کرشن خود اپنے آپ کو اور ان کو صرف ایک ہی ہستی قرار دیتے ہیں) اس سے ظاہر ہے کہ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ شنکھ کا نظام فکر ہندو کلچر سے خارج ہے مگر اس کے باوجود اس نظام فکر میں پرش یا پردھان کے علاوہ کسی (خدا) کی گنجائش نہیں ہے اس فکر کے لوگ (ایشور اسدھیا) کو مانتے ہیں یعنی وہ یہ کہتے ہیں کہ خدا کے وجود کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ ان کے

نزدیک وید بشمول اپنشد خدا کے لیے کوئی اشلوک پیش نہیں کرتے۔ اسی طرح جیمنی کے سیمیا کے مکتب خیال
کے لوگ (یعنی اس مکتب کے لوگ جو وید کی تشریح ہی کے لیے وجود میں آیا) اپنی تحقیق سے وید میں
خدا پر اعتقاد کے لیے کوئی وجہ جواز نہیں پاتے۔ ان کے نزدیک ریت اور ستّ جو کرم کے ابدی
قانون کے اجزا ہیں نظام کائنات کو چلانے کے لیے کافی ہیں۔ جو لوگ خدا پر اعتقاد رکھتے ہیں
وہ کہہ سکتے ہیں کہ کرم خدا کا دوسرا نام ہے۔ ممکن ہے کہ خدا کو کرم سمجھنے سے کسی کو روحانی
تسکین ہو سکے مگر سیمیا کے مفکر اس کو پانچویں پہیے کی طرح غیر ضروری خیال کرتے ہیں۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ گوتم اور مہابیر جنھوں نے مذاہب فکر و عمل کی بنیاد ڈالی تھی ان کے
نزدیک خدا کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے یقیناً یہ بڑی دیدہ دلیری کی بات ہوگی اگر کوئی یہ کہے
کہ بدھ ازم یا جینی ازم ہندوستانی کلچر کا صحیح کا مظہر نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ برہما پرماتما اور ایشور
ہندوستانی کلچر کے اہم عناصر ہیں لیکن یہ (نہیں بھولنا چاہیے کہ) برہما خدا نہیں ہے وہ ہستی مطلق ہے
جو سب تعینات سے بالاتر ہو۔ اس لیے نہ اس کی پرستش کی جاتی ہے نہ اس سے دعا مانگی جاتی ہے
وید میں اس کا ذکر محض منفی طور پر ہے نیتی نیتی یعنی وہ یہ نہیں ہے۔ وہ یہ نہیں ہے۔ برہما جس کے
متعلق (بطور جملہ معترضہ) یہ کہہ دیا جائے کہ وہ لاجنس (Neuter) خدا نہیں ہے پرماتما
اور ایشور کو بالعموم ہم معنی سمجھا جاتا ہے اور دونوں کا ترجمہ خدا یا (God) کیا جاتا ہے یہ بدقسمتی
کی بات ہے پرماتما کا تصور فلسفیانہ ہے وہ اصل میں کائنات کے ظہور کا وہ مقام ہے جو کہ برہما سے
بھی ذرا سا پست ہو (اگر اس سلسلۂ بیان میں لفظ پست کے استعمال کی اجازت دی جائے) وہ کل ہے
اور ہر چیز اس کا جز ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ہر چیز اس کا ایک پہلو ہے وہ وحدت ہے جس میں
کثرت نہ پیدا ہوئی ہو یا وہ نکتہ ہے جہاں سے کثرت کا آغاز ہوتا ہے لیکن جب اس میں کثرت
(Differenciation) پیدا بھی ہو جاتی ہے تب بھی وہ اجزا میں منقسم نہیں ہو جاتا بلکہ اپنی
کلیت کو برقرار رکھتا ہے۔ اس مقام پر یوں کہنا چاہیے کہ گویا تثلیث توحید میں پنہاں رہتی ہے یعنی
اس وقت وہ کل بھی ہوتا ہے اور اس کے باوجود لاتمناہی مختلف اجزا میں منقسم بھی (جو باشعور بھی ہیں
اور بے شعور بھی) یہ وہ کل ہے جو ہر جز میں موجود ہے اور ان کی زندگی میں حرارت اور حرکات و
سکنات میں توافق پیدا کرتا ہے اس کو اس مقام پر ایشور کہہ سکتے ہیں اس کو خدا یا گوڈ (God).

بھی کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ اس کا مفہوم ادا کرنے کے لیے (اردو یا انگریزی میں) کوئی دوسرا لفظ نہیں ہے لیکن یہ ایشور سامی قوم کے خدا کی طرح نہیں ہے جو کائنات کو اپنی مرضی سے وجود میں لاتا، برقرار رکھتا اور فنا کر دیتا ہے جو اپنی طاقت کے جوش میں کسی ہمسر کو برداشت نہیں کرتا جو اپنے لیے کہتا ہے "جیہوا (Jehovah کی) تمہارا خدا ایک حاسد خدا ہوں" ہندوؤں کی مقدس کتابوں اور فلسفہ کا ایشور قرآن یا بائبل کے خدا کی طرح صاحب جبروت نہیں صدیوں تک مسلمانوں کی حکومت اور اسلامی تعلیم کے اثر سے (ہندوؤں کا ایشور کچھ بدل تو گیا ہے مگر اس کے باوجود عام ہندوؤں کے ایشور کو ان حدود (limitations) کے اندر ہی رہنا پڑتا ہے جن کو کرم قانون نے مقرر کر دیا ہے۔"

"آستک اور ناستک الفاظ کے غیر محتاط استعمال نے بہت سی غلط فہمیاں پیدا کر دی ہیں۔ یہ الفاظ خدا پرستی اور الحاد پسندی کے معنوں میں استعمال کیے جانے لگے ہیں۔ مگر ان کے یہ معنی بالکل نہیں ہیں۔ آستک (مقلد) وہ شخص ہے جو پرانے (عملی زندگی کے کچھ قواعد) کو ماننا اور وید کی صداقت پر اعتقاد رکھتا ہو۔ جو ان کو نہیں مانتا۔ وہ ناستک (غیر مقلد) ہے۔ خدا پرستی اور الحاد پسندی اس درجہ بندی کے خلاف ہیں۔ بدھ، جین اور شنکر کے مکتب خیال کے لوگ سب الحاد پسند ہیں مگر اس کے باوجود شنکر کی فکر کے لوگ اچھے آستک یا مقلد ہیں۔ عیسائی اور مسلمان خدا پرست ہیں، مگر اس کے باوجود وہ ناستک (غیر مقلد) ہیں۔ دھرم شاستر ناستک یا غیر مقلد کو برا کہتے ہیں مگر الحاد پسندی پر ان کو کچھ اعتراض نہیں ہے۔"

اس ساری بحث سے وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ خدا پرستی ہندوستانی کلچر کا جز نہیں ہے۔ اس مضمون کے آغاز میں انھوں نے اس بات کا بھی اظہار کیا ہے کہ انھوں نے اپنے سوشلزم کی بنیاد ویدانت پر رکھی ہے۔ اپنی دوسری کتاب جس کا نام ہماری جمہوریت کی آزمائش (The Trial of our democracy) ہے اس میں ایک مضمون بعنوان ہندوستان میں اسٹیٹ کی فطرت (The nature of our democracy) میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اسٹیٹ کا لادینی تصور (Secular concept) محض منفی ہے۔ اس وجہ سے کافی نہیں ہے اس کو ایجابی طور پر "ویدانتی" ہونا چاہیے کیونکہ ویدانت ہمارے کلچر کا جز و عظیم ہے اور اس کے ہمہ وسعت کے [illegible]

کی بنیاد فراہم ہوسکتی ہے۔

ہندوازم کے متعلق ڈاکٹر سمپورنانند کے خیالات ہماری گہری دلچسپی کے مستحق ہیں کیونکہ ہندوازم ہمارے قریب ترین پڑوسی کا مذہب ہے۔ اور ہندوستان کی جدید تعمیر میں اس کا بڑا ہاتھ ہے۔ ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم پورے شعور کے ساتھ یہ فیصلہ کریں کہ اس میں کون کون سے عناصر ہمارے عقیدہ اور ضرورت کے مطابق ہیں جن کو ہم اپنی کھوئی ہوئی دولت کی طرح قبول کرسکتے ہیں اور کون سی باتیں اسلام سے متصادم ہیں جن کی اصلاح کرنے پر ہم خود مامور ہیں۔ اس لیے کہ ہماری پوزیشن یہ نہیں کہ ہندوازم ایک دوسری قوم اور اسلام ایک دوسری قوم کا مذہب ہے جس سے قومی بنیادوں پر تصادم ناگزیر ہو۔ دہریت اور مادہ پرستی کے خلاف ہم مذہب کے حامی ہیں اور ہماری نیت مختلف مذہبوں میں اتفاق کار کے لیے بنیاد فراہم کرنے کی ہے۔

ڈاکٹر سمپورنانند کے سارے خیالات پر تو ایک مضمون میں بحث نہیں کی جاسکتی ہے اس لیے ہم یہاں گفتگو صرف تین باتوں تک محدود رکھیں گے۔

۱۔ کیا وید خدا کے تصور سے خالی ہیں؟

۲۔ ویدانت کا وید سے کیا تعلق ہے؟

۳۔ بطور تمہید ہم پارسیت کے ارتقا پر بھی ایک نظر ڈالیں گے۔ کیونکہ اس کے ساتھ ہندوازم کے تقابلی مطالعہ سے اس کو سمجھنے میں سہولت ہوگی۔

ڈاکٹر سمپورنانند جی نے سامی اور آریائی قوم کے تصور خدا میں امتیاز کیا ہے حالانکہ سامی کے مقابلہ میں انھوں نے آریائی کا لفظ کہیں استعمال نہیں کیا۔ مگر سلسلۂ بیان کی مناسبت سے یہ بات مترشح ہوتی ہے۔ اگر یہ بات درست ہو تو اس کی بنیاد بھی غلط ہی ہے۔ سمپورنانند جی اس سے ناواقف تو نہ ہوں گے کہ آریاؤں کی ایک شاخ ہندوستان آکر آباد ہوئی تو دوسری شاخ ایران میں بھی گئی تھی اور اس کا مذہب اوستا اب تک ایک مربسر کتاب تھی مگر این کیٹل (An qutil) اسپاجل (Spingel) ہاگ (Haugh) اور ڈاکٹر ویسٹ (West) کی تحقیقات نے اس کو منظر عام پر پیش کر دیا۔ اور اسی وجہ سے آریہ قوم کی دونوں شاخوں کے مذاہب کے ارتقا کا تقابلی مطالعہ کرنا اب ممکن ہوگیا ہے۔ اسی کی مدد سے اب خدا کے تصور کے متعلق پارسیت کے ساتھ ہندوازم کا نقطۂ نظر سمجھنے میں

سہولت ہوگی۔

پارسیت اور ہندوازم کے تعلق کو ظاہر کرنے کے لیے یہ اہم شہادتیں ہیں جن پر ایک نظر ڈال لینی چاہیے۔

پارسیت اور ہندوازم کے مقدس لٹریچر میں بہت گہری مماثلت ہے۔ دونوں کی زبان، شعری و ادبی خصوصیات اور مضامین ملتے جلتے ہیں۔

پارسیت میں سب سے قدیم پانچ گاتھائیں (Gathas) ہیں۔ ان کو غالباً بعض مراسم کے موقع پر تلاوت کے لیے وسیع تر سیستاتھ (Sashyauth) سے الگ جمع کر لیا گیا تھا جس طرح کہ رگ وید کی نظموں کو سام وید کی شکل میں جمع کر لیا گیا ہے۔ بدقسمتی سے سیستاتھ (Sasthauth) بالکل ضائع ہو گئے ہیں۔ صرف یہ گاتھائیں اس کی باقیات ہیں۔ ان میں سے تین پہلی گاتھائیں تو خود زردشت کی تعلیم تسلیم کی جاتی ہیں اور اس کی بعد کی دو زرتشت کے قریب ترین آریوں کی تصنیف سمجھی جاتی ہیں۔ اس کے بعد یاسنا کا نمبر ہے۔ یہ مضامین اور انداز بیان کے اعتبار سے یجروید کے ہم پلہ ہیں اس میں دعائیں جادو منتر وغیرہ ہیں۔ یہ زرتشت کے عہد کے بعد تصنیف کی گئی ہیں اور ان کی تعلیم کو ان میں مخلوط کر دیا گیا ہے۔

پارسیوں کی دین ڈیا نا کا مرتبہ وہی ہے جو ہندوؤں میں سمرتی کا ہے جن پر دھرم کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ دین ڈیاڈ میں سمرتی کی طرح نظام حیات کے قوانین بیان کیے گئے ہیں مگر ان میں اور گاتھاؤں میں صرف یہ بات مشترک ہے کہ دونوں میں "پاس عہد" کی تعلیم دی گئی ہے ورنہ اور کوئی بات مشترک نہیں ہے اس کے بیشتر احکام مردہ کی چھوت سے متعلق ہیں اس قسم کی چھوت ہندوؤں میں نہیں ہے مگر پارسیوں میں زندگی میں مردہ کی چھوت کو وہی اہمیت حاصل ہے جو کہ ہندوؤں میں کھانے کے متعلق چھوت چھات میں ہے اس کا دوسرا اہم مضمون "پاکیزگی کی رسم" ہے۔ اس رسم کو بہت اہمیت حاصل ہے اس میں "گاؤ نتر" کا استعمال ہوتا ہے اور اس کے مقابلے میں ہندوؤں کی رسم بھی ہے۔

پارسیوں کی یاستھیا کو کلیۃً تو نہیں مگر جزوی طور پر ہندوؤں کے پران کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے۔

پارسیت اور ہندو مذہب کے تعلق کو ظاہر کرنے کے لیے دوسری اندرونی شہادت یہ ہے کہ دونوں میں بعض ایک ہی طرح کی ہستیوں کا تذکرہ موجود ہے مثلاً دونوں میں دیوتا۔ اشر۔ منترا اندر وغیرہ وغیرہ کا ذکر ہے اس طرح بعض دوسری ہستیاں ملتی جلتی ہیں جیسے ہندوؤں کے یم کے مقابلے میں ایرانیوں کا

یم (Yim) اور تریتنا (Traitana) کے مقابلے میں تری تونا (Traetona) فریدون وغیرہ۔

ان ہستیوں میں بعض تو ایسی ہیں جن کی اوستھا اور وید دونوں مدح خواں ہیں جیسے متر مگر بعض ایسی ہیں جن میں دونوں کا نقطہ نظر بالکل مختلف ہے۔ مثلاً اندر کی وید میں ثنا ہے اور اوستھا میں مذمت اوستھا کے لوگ اسُر کو مانتے ہیں اور وید کے دیوتاؤں کو رد کر دیتے ہیں۔ وید کے شاعر دیوتاؤں کے پجاری ہیں اور اسُر کے دشمن۔

تیسری اہم شہادت پارسیوں اور ہندوؤں کی یکساں رسومات ہیں مثلاً ہندوؤں کی سوم کی رسم کے مقابلہ میں پارسیوں کی ہوم کی رسم پانے اور پورے چاند کی رسم کے مقابلے میں دُرادن (Draun) کی رسم وغیرہ اس طرح ملتی جلتی رسمیں بہت سی ہیں۔

اس پارسیت میں جس کا ہندو ازم سے گہرا تعلق ہے اور جو کہ آرین قوم کی ایک اہم شاخ کا مذہب ہے اس میں زردشت نے خدا کا وہی تصور پیش کیا ہے جس کو سمپورنا نند جی فقط سامی قوم تک محدود کرتے ہیں۔ زرتشت نے واضح طور پر بہت سے دیوتاؤں کی پرستش ترک کر کے واحد "اہُرمزدا" کی پرستش قبول کرنے کی دعوت دی ہے۔ اہُرمزدا کے لفظی معنی ہیں "زندہ صاحب عقل خالق کائنات" اس کے متعلق زردشت کا تصور مکمل طور پر یہودیوں کے الوہیم (Elohuum) یا جوجہوا (Jehovah) کے تصور کے مطابق ہے وہ "اہُرمزدا" کو دنیاوی اور روحانی زندگی کا خالق، کائنات کا آقا وہ جس کے ہاتھ میں ساری مخلوقات (کی ہستی) ہے "کہتا ہے اس کے نزدیک وہ نور ہے اور نور کا سرچشمہ ہے وہ جو ساری چیزوں کا مالک ہے خواہ وہ روحانی ہوں یا دنیاوی۔ مثلاً صحیح ذہنیت راستبازی "نیکی" ہیروئنڈ ایمان (ازلی) دنیا کی نعمتوں کی بہتات اہُرمزدا اپنے ان نیک بندوں کو عطا کرتا ہے جو اپنی فکر گفتگو اور عمل میں راستباز ہوں وہ ساری کائنات کا حاکم ہے وہ صرف نیک بندوں کو جزا ہی نہیں دیتا بلکہ بدکاروں کو سزا بھی دیتا ہے۔ (ملاحظہ ہو گاتھا Yasana X, III) ہر چیز جو دنیا میں پیدا ہوتی ہے خواہ وہ اچھی ہو یا بری نیک ہو یا بد اسکی تخلیق ہے (Yasna XVIII) زرتشت کی تعلیم میں کسی ایسی شریر ہستی کا وجود نہیں جو "اہُرمزدا" کی ہمسر اور اس سے برسرپیکار ہو (یعنی یزدان کے مقابلہ میں اہرمن کا تصور نہیں) لیکن وین ڈیاڈ (Vandidad) کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد کو یہ تصور کا اضافہ پارسیت میں کر دیا گیا۔
(باقی)

روداد اجتماع یک روزہ

۹ ستمبر ۱۹۶۶ء بروز جمعہ جماعت اسلامی ہند حلقۂ مرکز رام پور کا تربیتی اجتماع درس گاہ جماعت اسلامی ہند رام پور کے ہال میں منعقد ہوا تھا۔ اس اجتماع کا پروگرام صبح ساڑھے ۹ بجے ٹھیک سے تین بجے کے پہلے چھ بجے تک جاری رہا۔ درمیان میں نماز جمعہ اور نماز عصر کے لیے وقفے ہوئے تھے۔ پروگرام کا ایک جز "تحریک اسلامی کو زوال سے محفوظ رکھنے کی تدبیریں" کے عنوان سے سمپوزیم بھی تھا جس اتفاق سے جناب افضل حسین صاحب معاون قیم جماعت اسلامی ہند بھی رام پور تشریف لائے تھے اور یہ سمپوزیم انہی کی نگرانی میں ہوا تھا۔ اکثر رفقاء نے اس موضوع پر اپنے خیالات قلمبند کر لیے تھے۔ مولانا صدر الدین اصلاحی تشریف نہیں رکھتے تھے لیکن وہ اپنی تحریر دے گئے تھے۔ ان کی تحریر راقم الحروف نے پڑھی تھی۔ یہ چونکہ موضوع پر ایک جامع تحریر ہے اس لیے میں یہاں سب سے پہلے اسی کو بہ تمام و کمال نقل کر دوں گا۔ پھر دوسرے رفقاء کی تحریروں کے اقتباسات دوں گا۔ رفقاء کی تحریروں سے اقتباسات لینے میں یہ بات پیش نظر رکھی گئی ہے کہ حتی الوسع مشترک نکات کی تکرار نہ ہو۔ اور آخر میں اختتامی تقریر کے اقتباسات پیش کروں گا۔

مولانا صدر الدین اصلاحی کی تحریر

میرے جائزے کے مطابق کسی اسلامی تحریک کو زوال سے محفوظ رکھنے کی ضروری تدبیریں مختصر لفظوں میں حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ سب سے اہم اور سب سے مقدم ضرورت یہ ہے کہ تحریک کے کارکنوں کے دل و دماغ میں اس کی بنیادی اسپرٹ کو پوری طرح جگائے رکھا جائے اور ہر آن تر و تازہ رکھنے کی پیہم جدوجہد جاری رکھی جائے کیونکہ تحریک کے اصل نصب العین کے بارے میں کارکنوں کے ذہن میں جو گہری وابستگی اور یک سوئی ابتدا میں ہوتی ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ

بندبرقرار رہی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ وابستگی داخل اور خارج دونوں ہی کی بہت سی مخالف قوتوں
ز دمیں رہا کرتی ہے۔ مثلاً ہمت شکن سیاسی اور معاشی دشواریاں، ماحول کی اجنبیت، دوسرے مسلم گروہوں
افراد کے افکار سے اثر پذیری اور اسی طرح کی دوسری چیزیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس طرح کے اسباب
عث اقامت دین کے نصب العین کے یقین و اذعان میں جو کچھ زنگ پیدا ہو اسے پوری مستعدی اور
مندی سے برابر صاف کیا جاتا رہے۔ ورنہ قرآن کی روزانہ تلاوت کرتے اور اس کی عظمت و
رلیس کی کیفیت جسم پر طاری کرتے رہنے کے باوجود جس طرح اس کا حق اتباع ادا کرنے کا خیال لوگوں کے
میں بمشکل ہی آیا کرتا ہے۔ اسی طرح قطعی ممکن ہے کہ لوگ تحریک اسلامی سے وابستہ رہتے ہوئے اور
ست دین کے نصب العین کو اپنا فریضۂ حیات قرار دیتے ہوئے بھی غیر شعوری طور پر عملاً اس سے دور
رہیں۔

۲۔ دوسری ضرورت یہ ہے کہ کارکنوں کے اندر خالص رضائے الٰہی کی طلب نہ صرف یہ کہ برقرار
رکھی جائے، بلکہ اسے فزوں سے فزوں تر بنانے کا اہتمام رکھا جائے۔ کیونکہ ایک بار ابتدا میں پورے
ص کے ساتھ یہ عزم و اقرار کر لینا کہ اللہ کی رضا طلبی ہی ہمارا پہلا اور آخری مقصود ہے اور ہم صرف
کی خاطر اس تحریک میں شامل ہوئے ہیں۔ اس بات کی ہرگز کوئی ضمانت نہیں کہ ایک دن کا یہ فیصلہ
نہ اسی اخلاص و عزیمت کے ساتھ برقرار رہے گا۔ ایمان و اسلام کی پوری تاریخ اس خوش گمانی کی
تردید کر رہی ہے اور رضائے الٰہی کے جذبے کا کمزور پڑ جانا قطعاً تحریک کو جسد بے روح بنا دینا ہے۔

۳۔ تیسری ضروری بات یہ ہے کہ تحریک کے علم برداروں کے اندر باطل نظام، افکار اور نظریات
سازگاری اور مداہنت کی بیماری نہ گھسنے پائے اور وہ اس طرف سے پوری طرح چوکنے رہیں۔ کھلی بات
صاحبِ اقتدار باطل فطری طور پر اور مختلف جہتوں سے اہل حق کے ذہنوں پر مرعوبیت طاری کرنے
کوشش میں رہتا ہی ہے۔ اس لیے اگر تحریک اس کی ان کوششوں کو سختی اور استقلال کے ساتھ ناکام
کی طرف متوجہ نہ رہے گی تو وہ اس سے سازگاری پیدا کرنے کے خطرے سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔
یہ کوئی ڈھکی چھپی حقیقت نہیں کہ سازگاری کا یہ میلان تحریک کے لیے زہر ہلاہل سے کم نہیں۔

۴۔ چوتھی بات یہ ہے کہ تحریک کو جہاں مداہنت کے رجحان سے محفوظ رکھا جائے وہیں اسے بے تدبیری
اور تہور سے بھی بچایا جائے اور حکمت و دانش کے تقاضوں کو ہر آن ملحوظ رکھا جائے۔ ہر تحریک

کی طرح اسلامی تحریک بھی ایک تدریج سے قدم آگے بڑھاتی ہے۔ اگر اس تدریج کو پس پشت ڈال دیا جائے اور پہلے ہی قدم پر ہر طرح کے محاذ کھول دیے جائیں تو اس کا مطلب صرف یہ ہوگا کہ سرکش گھوڑے کی طرح تحریک کی گاڑی کو لے جا کر کسی گڑھے میں ڈال دیا جائے۔

۵۔ پانچویں بات یہ کہ تحریک کے کارکنوں میں دین کا صحیح اور متوازن تصور، عدم توازن سے نہ بدلنے پائے اور اس بات کی پوری نگرانی رکھی جائے۔ کہ ان کے ذہنوں میں دین کی ہر ہدایت اور اس کے ہر مطالبے کو وہی حیثیت حاصل رہے، فکری طور پر بھی اور عملی طور پر بھی، جو قرآن و سنت میں فی الواقع اس کی ہے۔ اس عدم توازن کا خطرہ جس بنا پر ایک واقعی خطرہ ہوتا ہے وہ تحریک کے کارکنوں کا وہ شدید ردعمل ہے جو دوسرے مسلمانوں کے ناقص اور غیر متوازن تصورات دین کے خلاف ان کے اندر پیدا ہو جایا کرتا ہے۔ جب تک یہ ردعمل معقول حدود کے اندر رہتا ہے خیر کا موجب بنتا ہے، لیکن جب وہ شدت اور ایک بحران کی شکل اختیار کر لیتا ہے تو اس سے شر پیدا ہونے لگتا ہے۔ ایک بہت واضح مثال لیجیے دین کا وہ تصور جو معروف عبادات سے آگے نہیں جاتا، قطعی طور پر ایک ناقص تصور ہے، وہ دین کو انسانی زندگی کے عظیم اجتماعی کردار سے بے تعلق رکھتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے احکام کا ایک بڑا حصہ بالکل معطل پڑا رہ جاتا ہے اور انسان کی دینی زندگی اللہ تعالیٰ کی مکمل طاعت و بندگی کی سعادت سے محروم رہ جاتی ہے۔ اب اگر اس ناقص تصور دین کے خلاف کسی اسلامی تحریک کے داعیوں میں اتنا شدید ردعمل پیدا ہو جائے کہ وہ دین کے اجتماعی اور سیاسی احکام ہی کو سب کچھ سمجھنے لگیں اور ذکر و تسبیح اور شب بیداری کی کما حقہ اہمیت ان کے اندر کم ہو جائے، حتیٰ کہ وہ اسے خدانخواستہ 'خانقاہیت' سے موسوم کرنے پر اتر آئیں تو یہ ایک بڑا نامبارک اور خطرناک ردعمل ہوگا، اور تحریک کی جڑیں ہلا دینے کے لیے بالکل کافی ثابت ہوگا۔ وجہ بالکل ظاہر ہے۔

۶۔ چھٹی بات یہ ہے کہ عام کارکنوں کی عملی سرگرمیوں ہی کو نہیں ان کی فکری جولانیوں کو بھی ماند پڑنے سے بچایا جائے۔ تحریک اپنے صحیح رخ پر ہرگز سرگرم سفر نہیں رہ سکتی اگر اس کے عام کارکنوں میں فکری جمود پیدا ہو جائے اور وہ تحریک کے لیے سوچنا اور فکر مند رہنا چھوڑ دیں۔ کیونکہ اس کے معنی یا تو یہ ہوں گے کہ ان کی دلچسپیوں کا اصل مرکز اب تحریک کے بجائے کوئی اور چیز ہو چکی ہے، یا پھر یہ کہ تحریک کے مستقبل کے بارے میں ان کے ولولے سرد پڑ گئے ہیں۔ اور ان میں سے جو بات بھی ہو وہ تحریک کے

لیے پیام مرگ ہی ثابت ہوسکتی ہے ۔

۷ ۔ ساتویں ضروری بات یہ ہے کہ تحریک کے خادموں میں اختلاف رائے تو ضرور ہو کہ یہ انسانی قوت فکر و تدبر کا فطری تقاضا ہے، مگر یہ اختلاف رائے انتشارِ فکر اور ذہنی طوائف الملوکی کی شکل ہرگز نہ اختیار کرنے پائے، کہ یہ کج فکری اور سوءِ تدبر کی علامت ہے ۔ آزادیٔ فکر و رائے ہر شخص کا بنیادی حق ہے ۔ اس حق کو اگر صحیح طریقے سے استعمال کیا جائے تو وہ جماعت میں عمل کی صحت اور اقدام کی قوت پیدا کرتا ہے، لیکن اگر یہ استعمال غلط طریقے سے کیا گیا تو اس کا نتیجہ بھی الٹا نکلتا ہے ، اور جماعت کو منتشر اور بے دم کرکے رکھ دیتا ہے ۔ آزادیٔ فکر و رائے کے صحیح استعمال کی شکل یہ ہے کہ غیر منصوص اور اجتہادی امور میں رایوں کے کسر و انکسار سے کام لیا جائے، صحیح بات تک پہنچنے کے لیے کھلے دل سے بحث و گفتگو تو چاہے جتنی بھی ہو ضرور کی جائے، مگر جب آخر میں کوئی فیصلہ ہو جائے تو پھر اپنی رائے پر اصرار کرنے کا خیال ترک کر دیا جائے ۔ اِعْجَابُ کُلِّ ذِیْ رَایٍ بِرَایِہٖ ۔ یعنی رائے والے کا اپنی ہی رائے پر فریفتہ ہو رہنا ایسی مہلک بیماری ہے جس کی موجودگی میں کسی جماعت کا اپنے مقصد کے لیے کامیابی سے سرگرم سفر رہنا تو دور کی بات ہے اس کا جماعت باقی رہنا ہی مشکل ہو جاتا ہے ۔

۸ ۔ آٹھویں ضروری بات یہ ہے کہ تحریک کے کارکنوں میں تواصی بالحق و تواصی بالصبر کا ایمانی ذوق کم نہ ہونے پائے، بلکہ اسے برابر بڑھاتے رہنے کا اہتمام رکھا جائے ۔ ورنہ کہنے کو تو یہ اہل ایمان کا ایک ایسا قافلہ ہو گا جس کے افراد کے جسم ہی نہیں ان کے دل بھی ملے ہوئے ہیں اور جن کے اندر اتباع دین اور استقامت علی الحق کے جذبات موج زن ہیں، مگر فی الواقع ان میں سے کوئی بات نہ ہو گی، اور جب یہ باتیں نہ ہوں گی تو تحریک کی کامیابی کا بھی کوئی سوال باقی نہ رہ جائے گا ۔

۹ ۔ نویں اہم ضرورت یہ ہے کہ تحریک کے عام رکن اپنے سربراہوں کے ساتھ 'نصح' کا فرض پورے احساسِ فرض کے ساتھ ادا کرتے رہیں ۔ اس کے دو پہلو ہیں : ۔ ایک تو یہ کہ معروف میں ان کی پوری پوری اطاعت کریں اور ان کے لیے اپنے دل میں محبت اور احترام کے جذبات رکھیں ۔ دوسری یہ کہ ان کے لیے فکری اور عملی ہر طرح کی لغزشوں سے بچنے کا ذریعہ بنیں ۔

۱۰ ۔ دسویں ضروری بات یہ ہے کہ تحریک کے داعی اور کارکن اپنے کام کے سلسلے میں جسے انھوں نے اپنا فریضۂ حیات سمجھ کر قبول کیا ہے، کبھی دل شکستگی یا مایوسی یا اکتاہٹ کا شکار نہ ہوں ۔ انھیں صرف چند

روز کی کوششوں کے بعد یہ خیال نہیں کر لینا چاہیے کہ جس زمین پر ہم اس وقت کام کر رہے ہیں وہ بنجر ہے اور لوگ بات سننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس قسم کی جلد بازی سخت خطرناک چال ہے نفس اور شیطان کی۔ اس چال کا ہرگز شکار نہ ہونا چاہیے نہ کسی دوسرے ہمراہی کو اس کا شکار بننے دینا چاہیے۔ آخر آدمی یہ کیوں سوچے کہ اس بارے میں سارا قصور مخاطب ہی کا ہے، یہ بھی کیوں نہ خیال کرے کہ خود میرے اپنے طریق دعوت میں بھی تو نقص ہو سکتا ہے، خود میرے اخلاق اور عمل کی شہادت میں بھی تو خامیاں ہی خامیاں ہیں۔ ایسی حالت میں اگر میری دعوتی کوششوں کا دوسروں پر خاطر خواہ اثر نہیں ہو رہا ہے تو اس کی ذمہ داری میں میرا بھی حصہ ضرور ہے۔

اس ضمن میں جو اصل بات ہے وہ یہ ہے کہ داعی کو اپنی کامیابی ناپنے کا پیمانہ دعوت کی کامیابی اور اس کے پھیلاؤ کو نہ بنانا چاہیے۔ کیونکہ یہ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔ نظر اس پر جمی رہنی چاہیے کہ میں اپنی دعوتی ذمہ داری کو تا حد امکان پوری طرح انجام دے رہا، اس پر نہیں کہ اس کے محسوس نتائج کیا نکلتے ہیں؟ دعوتی کام میں سستی اور مایوسی پیدا ہی اسی وقت ہوتی ہے جب نظر کا کانٹا اس طرح بدل جاتا ہے۔ تحریک کی زندگی کے لیے بہت ضروری ہے کہ اس کے داعیوں میں فکر و نظر کی یہ سلامتی برقرار رہے۔

مولانا ایوب اصلاحی

اخلاق و معاملات میں اسلامی تعلیمات کی مکمل پابندی ضروری ہے۔ دعوت کی مقبولیت اور ترقی بڑی حد تک موقوف ہوتی ہے داعیوں کے عمل و اخلاق پر۔ بالخصوص عوام اور اوسط درجے کا دماغ رکھنے والے منطق و فلسفہ کے بجائے کردار کے نمونے سے متاثر ہوتے ہیں اس لیے اپنے اعمال و کردار پر کڑی نظر رکھنی چاہیے نیز یہ کہ تمام حفاظتی تدابیر کی جان خوف آخرت اور فکر آخرت ہے۔ وہاں کی جواب دہی کا تصور غالب اور چھایا رہے تو انحراف کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

جناب اسلام اللہ صاحب

تحریک اسلامی کو زوال سے بچانے کی تدبیر میرے نزدیک ایک ہی ہے اور وہ تدبیر وہی ہے جس کی طرف رہنمائی آج کے درس قرآن میں إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا کی آیت پڑھ کر کی گئی ہے۔ تحریک اسلامی کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ اس کے داعیوں اور فدائیوں نے تمام مشکلات راہ کو "استقامت" ہی سے دور کیا ہے۔

مولانا جلال الدین عمری

واقعہ یہ ہے کہ تحریک اسلامی کو زوال سے محفوظ رکھنا اور اس کو اپنی اصلی حالت میں باقی رکھنا یہ دو
الگ الگ حقیقتیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی حقیقت کی دو مختلف تعبیریں۔ تحریک اسلامی کو زوال سے محفوظ رکھنے
کی واحد تدبیر یہ ہے کہ اس کو اپنی اصلی حالت پر باقی رکھا جائے۔ اگر ہم اس کو اپنی اصلی حالت پر
رکھنے میں کامیاب ہوگئے تو اس کو زوال سے محفوظ رکھنے میں بھی کامیاب ہوجائیں گے۔

جناب رونق علی صاحب

تحریک اسلامی کا قرآن و حدیث کی روشنی میں مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پر زوال
داخلی اسباب سے آتا ہے جب تحریک کے داخلی پہلو کمزور ہوتے ہیں تو خارجی دباؤ اس کو ختم کرنے
میں معاون و مددگار ثابت ہوتا ہے۔ جماعتی استحکام اس کو زوال سے بچانے کے لیے بہت ضروری
تدبیر ہے اور یہ اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب جماعت کی صحیح رہنمائی کی جائے، کارکنوں میں
ہم آہنگی ہو، ان میں اخلاص، حسن ظن، مساوات، عدل و انصاف، سمع و طاعت اور ایثار کی صفات

مولانا سلیمان صاحب

اگر کسی تحریک کے علم بردار اتنا جی گردہ رکھتے ہیں کہ وہ اپنے زوال کا خلوص سے احساس واعتراف
کریں اور اس سے بچنے کی تدابیر پر عمل پیرا ہونے کے لیے آمادہ ہوں تو وہ تحریک زندہ رہے گی۔ کسی تحریک
زوال کا ایک بنیادی سبب یہ ہوتا ہے کہ اس تحریک کے علم بردار اس کا مخصوص اور موزوں طریقۂ
چھوڑ کر کسی ایسے طریقۂ کار کو اپنا لیتے ہیں جو اس تحریک کے اساسی افکار و نظریات سے میل نہ کھاتا ہو
منزل تک پہنچانے کے بجائے راستے ہی میں چھوڑ دیتا ہو یا مکہ کے بجائے ترکستان پہنچا دیتا ہو۔ تحریک اسلامی
کے علم برداروں کو اس سے چوکنا رہنا چاہیے۔

شریف احمد صاحب

امیر و مامور کے درمیان کامل اعتماد، تحریک اسلامی کو زوال سے بچانے کے لیے بہت زیادہ
ہے کیونکہ یہ اس کے اٹھنے کا ایک بہت اہم جز ہے۔ اگر کسی ایک طرف بھی اس میں کمی پائی جائے گی تو
کی بنیاد ہل جائیں گی۔ اس میں ذمہ داری کسی کی بھی کم نہیں ہے لیکن اس کے باوجود انسان کی فطرت
ہے کہ وہ عمل کے لیے اپنے سے بلند رتبہ شخص کی طرف دیکھتا ہے۔ اس لیے تحریک کے ذمہ داروں کو اپنی

پوزیشن کا ہمیشہ خیال رکھنا چاہیے۔

جناب عبدالوہاب صاحب

کسی تحریک کو زوال سے بچانے کے لیے تطہیر کا عمل بھی جاری رہنا چاہیے یعنی ایسے افراد جو اخلاق و کردار کے لحاظ سے تحریک کو نقصان پہنچا رہے ہوں اور ان کی اصلاح سے مایوسی ہو گئی ہو انہیں جماعت سے خارج کر دیا جانا چاہیے نیز یہ کہ کوئی تحریک پھولوں کی سیج پر آرام کر کے زوال سے نہیں بچ سکتی کانٹوں کی سیج پر تڑپنا بھی ضروری ہے۔

جناب عبدالغفار صاحب

تحریک اسلامی کے ہر رکن کو ان صفات سے پاک ہونا چاہیے جو کسی جماعت کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیتی ہیں۔ اس سلسلے میں خاص طور سے سورۂ حجرات کی متعلقہ آیات کو سامنے رکھنا چاہیے مثبت صفات کے لیے سورۂ المومنون کی ابتدائی آیتوں کو اپنے لیے کسوٹی بنانا چاہیے۔

جناب محمد فاروقی صاحب

اسلامی تحریک اس وقت تک روبزوال نہیں ہوتی جب تک اس کے علمبرداروں کے اندر شرافت کا شعور باقی ہو۔ شرافت کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی برائیوں کو مٹانے اور انسانیت کو غلامی اور مظلومی سے نجات دلانے کی ہر ممکن کوشش کرے۔ حق کے صرف تحفظ کی سعی نہ کرے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر اعلائے حق اور اعانت حق کے لیے بھی سرگرم عمل ہو۔ ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ اسلام کے علم بردار اپنی قوت اجتہاد سے کام لے کر اسلام کو آج کی علمی سطح پر قابل فہم بنانے کی کوشش کریں وہ باطل کے چیلنج کا جواب دینے پر اکتفا نہ کریں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر وہ خود باطل کے لیے چیلنج بن جائیں۔

جناب قادر علی صاحب

یہ عقیدہ رکھنے کے باوجود کہ دنیا کی زندگی عارضی ہے۔ یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس زندگی کو خوش گوار بنانے کے لیے علم و جسم، مال و دولت، وقت اور فکر کی جو قوتیں صرف کی جاتی ہیں اس کے مقابلے میں آخرت کی دائمی زندگی کے لیے جو کوششیں کی جاتی ہیں وہ پاسنگ کے برابر بھی نہیں ہوتیں۔ دین کا رکنوں کی عملی زندگی ان کے عقیدے کی شاہد ہونی چاہیے۔

جناب کوثر یزدانی صاحب

کسی تحریک کو زوال سے بچانے کے لیے اس کی قیادت بھی ایک اہم عنصر ہوتی ہے وہ اگر فعال، نیک، مدبر اور معاملہ فہم ہو تو تحریک آگے بڑھتی رہتی ہے۔ تحریک اسلامی کو زوال سے محفوظ رکھنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ہمیشہ اقدامی پوزیشن میں رہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے نصب العین کے حصول کے لیے اپنی قوت کار کے بقدر نئے نئے میدان عمل تلاش کرتی رہے اور مشکلات کو صبر کے ساتھ انگیز کرے۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ دعا کرتے رہنا چاہیے اس لیے کہ اسی کی توفیق اور مدد سے سب کچھ حاصل ہوسکتا ہے۔

جناب محمد مخدوم صاحب

تحریک اسلامی کی کامیابی کے لیے دوسرے مذاہب کی خوبیوں اور کمزوریوں سے بھی واقفیت کی ضرورت ہے تاکہ اپنی بات اچھی طرح سمجھائی جاسکے۔ لوگوں کے شکوک سے بھی آگاہ ہونا چاہیے اور پھر انہیں تسلی بخش طور پر حل کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا چاہیے۔

اختتامی تقریر

آج کے سمینار کے لیے ہم نے جو موضوع منتخب کیا تھا اس میں "زوال" یا "ترقی" کا وہ مفہوم نہیں ہے جو دنیا کی عام تحریکوں کے لیے استعمال ہوتا ہے بلکہ ہمارے لیے زوال و عروج کو جانچنے کا معیار تعلق باللہ، حصول مقصد کا سچا جذبہ اور اخلاق و کردار کا ارتقاء ہے۔ ان چیزوں میں اگر اضافہ ہو رہا ہو تو تحریک روبہ ترقی ہوگی اور کمی ہو رہی ہو تو روبہ زوال ہوگی۔ اس عنوان کے انتخاب کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہماری تحریک روبزوال ہو چکی ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ ہم اس سے چوکنا رہیں اور اپنے اندر زوال کو گھسنے کا موقع نہ دیں۔

رفقاء کرام! زوال سے بچنے کی جو تدبیریں ہم سب نے سوچی ہیں ان پر ہمیں سرگرمی کے ساتھ عمل کرنا ہے۔ میں اخیر میں آپ کے سامنے جو کچھ پیش کرنا چاہتا ہوں وہ اپنے حالات اور اپنی ذمہ داریوں پر ان تدابیر کا انطباق ہے۔ کلیات ہمیشہ جزئیات ہی کی شکل میں وجود پذیر ہوتی ہیں۔ جماعت اسلامی ہند کے متعدد شعبے ہیں اور یہی شعبے مل کر تحریک اسلامی کو میدان میں چلا رہے ہیں۔ اگر یہ سب شعبے ٹھیک ٹھیک اپنے مفوضہ کام انجام

رہیں تو تحریک آگے بڑھے گی اور طاقتور ہوگی۔ میں اس وقت جماعت کے تمام شعبوں اور ان کے متعلقہ کاموں پر گفتگو نہیں کروں گا بلکہ صرف ان شعبوں پر الگ الگ چند باتیں عرض کروں گا جن میں ہم اور آپ کام کر رہے ہیں۔ یہ شعبے صرف تین ہیں :-

شعبۂ زندگی و کانتی ہم اور آپ بھی جانتے ہیں کہ اس زمانے میں اخبارات اور رسائل تبلیغ خیالات اور عوام و خواص کی ذہنی تربیت کا بہت عام اور مؤثر ذریعہ ہیں۔ اس لیے مجھ پر اور جو لوگ بھی تحریک اسلامی کے اس شعبے میں کام کر رہے ہیں ان پر ذمہ داری کا ایک بڑا بوجھ ہے۔ یہ ذمہ داری دو بڑی قسموں میں بٹی ہوئی ہے۔ فکری اور نظریاتی طور پر دعوت اسلامی پیش کرنے کی ذمہ داری اور عملی طور پر خود اس کا نمونہ بننے کی ذمہ داری۔ ہماری فکری ذمہ داری مثبت طور پر یہ ہے کہ ان رسالوں میں اسلام کی صحیح اور مکمل ترجمانی کی جائے۔ دین حق کو زندگی کے قانون و دستور اور ایک مکمل نظام کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔ ان میں ایسی چیزیں شائع ہوتی رہیں جو رفقاء کے ذہن کو اقامت دین کے نصب العین پر مرکوز رکھیں اور عام قارئین کے ذہنوں کو اس سے قریب لائیں۔ منفی طور پر ہماری فکری ذمہ داری یہ ہے کہ ان رسالوں میں ایسی چیزیں شائع نہ کی جائیں جو ہمارے نصب العین سے میل نہ کھاتی ہوں، جو ذہنوں میں سطحیت پیدا کرتی اور ثانوی درجے کے مسائل کو اصل مسائل کے رنگ میں پیش کرتی ہوں۔ ہمیں اس کا حق بھی نہیں ہے کہ ان رسالوں میں اپنی ذاتی رایوں کو اس طرح لکھیں کہ پڑھنے والے انہیں جماعت کی طے کردہ پالیسی اور پروگرام کا جز سمجھنے لگیں۔ مختصر یہ کہ جماعت نے نشر و اشاعت کے جو شعبے ہمارے حوالے کیے ہیں ان کا حق ہمیں پوری دیانت و امانت کے ساتھ ادا کرنا چاہیے۔ عملی طور پر ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ ہم ان شعبوں کی دیکھ بھال ان کے انتظامات اور معاملات میں کھرے ثابت ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ ہم دوسروں کو امانت دار ہونے کی نصیحت کریں اور خود امانت دار نہ ہوں، دوسروں کو معاملات درست رکھنے کا اپدیش دیں اور خود ہمارے معاملات درست نہ ہوں۔ نیز یہ کہ ہم نے ملازمت کی پست ذہنیت کے ساتھ ان شعبوں کی خدمت اختیار نہیں کی ہے اس لیے ہم میں سے ہر شخص کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس ذہنیت کو اپنے پاس پھٹکنے نہ دے۔ یہ ایک زہر ہے اگر خدانخواستہ یہ زہر ہمارے ذہنوں میں سرایت کرنے لگے تو ہم اقامت دین کا کام نہیں کر سکیں گے۔

شعبۂ تصنیف تصنیفات کو ایک پہلو سے اخبارات و رسائل پر فوقیت حاصل ہے [illegible]

تالیفات مستقل چیزیں ہوتی ہیں جن سے لوگ مستقلاً فائدہ اٹھاتے ہیں اور اٹھاتے رہتے ہیں۔ اخبارات و رسائل کا حال یہ ہے کہ عموماً لوگ انہیں پڑھ کر الگ ڈال دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ہر مہینے، یا ہر تین دنوں پر یا روزانہ انہیں تازہ اخبارات و رسائل ملتے رہتے ہیں اور گزشتہ رسالے اور اخبارات باسی ہو کر عام طور سے لوگوں کی نگاہوں میں اپنی اہمیت کھو دیتے ہیں۔ اس لیے مصنفین و مؤلفین پر دعوت اسلامی پیش کرنے کی وہ ذمہ داریاں کچھ اضافے کے ساتھ عائد ہوتی ہیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ دوسری ذمہ داری جو میرے نزدیک ان پر عائد ہوتی ہے وہ اپنے وقت کا صحیح استعمال ہے۔ رسائل و اخبارات کا چونکہ وقت پر شائع ہونا ضروری ہے اس لیے ان کے مرتبین پر یہ پابندی آپ سے آپ لگ جاتی ہے کہ وہ وقت کے اندر انہیں مرتب کر دیں۔ مؤلفین و مصنفین پر وقت کی اتنی شدید پابندی نہیں ہوتی اور اندیشہ ہو سکتا ہے کہ ان کے اوقات کا کوئی حصہ کار مفوضہ کے بجائے کسی دوسرے غیر ضروری کام میں لگ جائے اس لیے انہیں خاص طور پر متوجہ رہنا چاہیے۔ اگر تھوڑے تھوڑے وقفے سے حسب ضرورت نئی نئی تصنیفات سامنے نہ آتی رہیں تو فکری جمود پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ یہ شعبہ رفقاء کو فکری غذا مہیا کرتے رہنے اور عام لوگوں میں تبلیغ دین کے سلسلے میں اپنی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس شعبے کو اپنی اس اہمیت کا عملی احساس تازہ رکھنا چاہیے۔

درس گاہ حلقۂ مرکز کے اس شعبے میں مرکزی جماعت اسلامی رام پور کے ارکان کی سب سے بڑی تعداد خدمات انجام دے رہی ہے۔ اس شعبہ کے ذمے جو کام ہے وہ اہمیت میں کم نہیں ہے۔ آنے والی نسل کو اسلام کی خدمت کے لیے تیار کرنا کوئی معمولی خدمت نہیں ہو سکتی۔ اس شعبے کو تیم و رکت کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ اس شعبے کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اس مقصد کو ہمیشہ ذہن میں تازہ رکھے جس کے لیے یہ درس گاہ قائم کی گئی تھی۔ درس گاہ میں کام کرنے والے ارکان پر بچوں کی اسلامی تعلیم اور اسلامی تربیت کی دوہری ذمہ داری ہے۔ دوسرے شعبوں کی طرح اس شعبے کا بھی ملازمانہ ذہنیت سے پاک ہونا اشد ضروری ہے۔ تعلیم گاہوں کے تعلیمی و تربیتی معیار کی پستی کے جہاں دوسرے اسباب ہوتے ہیں وہاں ملازمت والی ذہنیت بھی اس کا ایک بڑا سبب ہوتی ہے۔ اس ذہنیت کا خاصہ یہ ہے کہ کارکنوں کی توجہ کار مفوضہ اور فرض منصبی سے ہٹا کر ان میں اونچ نیچ کا تصور پیدا کرتی، انہیں آرام طلب اور کام چور بناتی، اپنے مال [illegible] کرتی اور باہمی تنافس و تحاسد کا جذبہ ابھارتی ہے۔ تعلیم اور

تربیت دونوں ہی رسمی بن کر رہ جاتے ہیں یہاں تک کہ طلبہ بس کسی طرح پاس ہو جائے اور اساتذہ میں اپنے درجے کے طلبہ کو کامیاب کرا دینے کی ٹیکنیک کام کرنے لگتی ہے ــــ اس زہر کا تریاق آخرت کے زندہ یقین اور نصب العین سے گہری وابستگی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ یہ جو کچھ عرض کیا جا رہا ہے اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ خدانخواستہ ہم سب میں یہ ذہنیت پیدا ہو چکی ہے بلکہ غرض صرف اتنی ہے کہ اگر اس کا شائبہ بھی پایا جاتا ہو تو اسے کھرچ کر پھینک دینا چاہیے۔ ہمارے ان اجتماعات کا مقصد یہی ہے کہ ہم اپنا جائزہ لیں اور خود تنقیدی یعنی اپنے اوپر آپ تنقید کے ذریعے اپنی اصلاح کی کوشش کریں۔ درس گاہ کے اساتذہ پر اور نگراں پر مثبت انداز میں یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ طلبہ کے ذہن میں یہ بٹھاتے رہیں کہ ان کی تعلیم کا مقصد مسلمان بننا اور اسلام کا خادم بن کر جینا ہے اور کتاب و سنت کا براہِ راست علم حاصل کرنا ایک بڑی سعادت ہے ــــ منفی طور پر ان کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ طلبہ کے سامنے کوئی ایسی بات پیش نہ کریں جو علم دین کی اہمیت کو گھٹانے والی ہو۔ ان کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ اپنا کڑا جائزہ بطورِ خود لیتے رہیں کہ وہ اپنے فرائض منصبی ٹھیک ٹھیک ادا کر رہے ہیں یا نہیں۔ طلبہ کے تعلیمی و تربیتی معیار کو بڑھانے کی اپنی حد تک پوری سعی کر رہے ہیں یا نہیں؟ ان کا نفس کوئی ایسا عذر تو نہیں پیش کر رہا ہے جس کی حقیقت بہانے کے سوا اور کچھ نہ ہو۔

QADIANISM
(قادیانیت)
A CRITICAL STUDY
ایک تنقیدی جائزہ

از : ایس ۔ ابوالحسن علی ندوی صاحب
ترجمہ : ظفر الحق انصاری ۔ ایم اے
صفحات ۱۵۲ ۔ مجلد قیمت ۔ 5-50 ۔ شائع کردہ
اکیڈمی آف اسلامک ریسرچ اینڈ پبلیکیشنز ندوۃ العلماء لکھنؤ

قادیانیت کے بارے میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اس تحریک کو سمجھنے اور سمجھانے کی حد تک کسی نئی کتاب کی ضرورت نہیں لیکن مولانا ابوالحسن علی میاں نے اس موضوع پر جس انداز سے لکھا ہے اس نے اس کتاب کو اپنی قسم کی بالکل منفرد کوشش بنا دیا ہے ۔ مولانا موصوف نے اصل کتاب عربی زبان میں "القادیانی والقادیانیت" کے نام سے تحریر فرمائی تھی ۔ پھر آپ نے شیخ گرامی حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد پر اس کو خود ہی اردو زبان میں منتقل کیا اور یہ کتاب "قادیانیت" کے نام سے شائع ہوئی ۔ اب اسی کا انگریزی ترجمہ اکیڈمی آف اسلامک ریسرچ اینڈ پبلیکیشنز لکھنؤ نے شائع کر کے اس راہ پر دوسرا مؤثر قدم اٹھایا ہے جس پر پہلا قدم [illegible] صاحب بھی اپنی انگریزی کتاب کے ذریعے اٹھا چکے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ بیرونی ممالک خصوصاً مشرق وسطیٰ اور یورپ میں قادیانی مشنریوں کی کارفرمائی کے باعث انگریزی زبان میں اس نوع کی کتابوں کی سخت ضرورت تھی [illegible] پیش لفظ میں مصنف موصوف نے جیسا کہ خود کہا ہے ہم بھی یہ کتاب پڑھ کر یہی محسوس کرتے ہیں ــــ فرماتے ہیں :-

راقم الحروف کی ذہنی ساخت چونکہ تاریخ کے ایک طالب علم کی سی ہے اسی لیے اس نے اس تحریک کے بالکل آغاز کار سے اپنا فکری و عقلی سفر شروع کیا اور اس تحریک کے ارتقاء اور پھیلاؤ کے ہر ہر مرحلہ کا جائزہ لیتا ہوا آگے بڑھا ۔ چنانچہ راقم الحروف کے مشاہدات اور خیالات ان ہی خطوط پر

پہلے جن سے اپنے ارتقاء کے دوران میں قادیانیت کا گزر ہو چکا تھا۔ اس انداز و اسلوب نے مصنف کو اس کا موقع دیا کہ وہ قادیانی تحریک، اس کے تدریجی ارتقاء اور اس کے فعال عوامل کی حقیقی نوعیت کا ادراک کر سکے۔ اس اسلوب نے ایسے بہت سے پہلوؤں کو بے نقاب کیا کہ جو دوسری شکل میں نظروں سے اوجھل رہتے۔ مصنف نے تحریک کے بانی خود مرزا غلام احمد قادیانی کی کتابوں کا گہرا مطالعہ کیا اور اس طرح قادیانیت کے پیغام، تحریک اور عمل کا رناموں کے ذیل میں ایک مورخ کی سی غیر جذباتیت کو قائم رکھنے کی سعی کرتے ہوئے براہ راست ماخذ سے استفادہ کرتے ہوئے ایک غیر جانبدارانہ فیصلہ پر پہنچنے کی کوشش کی ہے۔

یہ کتاب مجموعی طور سے اس موضوع پر ایک بہت کامیاب مقالے کا درجہ رکھتی ہے۔ البتہ "لاہوری شاخ" کے زیر عنوان قادیانیت کی لاہوری جماعت کا جہاں جائزہ لے کر اس کی غیر معذرتیت اور غیر معقولیت واضح کی گئی ہے وہاں یہ تشنگی رہ گئی کہ کتاب و سنت کی روشنی میں ان لوگوں کے بارے میں کیا فیصلہ ہونا چاہیے؟ ۔ آیا یہ گروپ جو مرزا کو نبی نہیں مانتا (حالانکہ مرزا خود صاف لفظوں میں نبوت کا مدعی ہے) تو کیا یہ مسلمان قرار دیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

انگریزی ترجمہ بھی ترجمے کی اچھی خصوصیات کا حامل ہے اور مترجم نے واقعی بڑی کاوش کے ساتھ اصل کی روح اور چاشنی ممکن حد تک قائم رکھنے کی سعی جمیل کی ہے۔

——————(ش۔ ن عثمانی)

ماہنامہ

زندگی
رامپور

جلد: ۳۷
شمارہ: ۶

شعبان ۱۳۸۶ھ
دسمبر ۱۹۶۶ء

مدیر:- سید احمد قادری

- خط و کتابت و ارسال زر کا پتہ — منیجر رسالہ زندگی رام پور۔ یوپی
- زر سالانہ: چھ روپیہ — ششماہی: تین روپیہ — فی پرچہ ۵۰ پیسے
- — ممالک غیر سے۔ دس شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر

مالک جماعت اسلامی ہند۔ ایڈیٹر: سید احمد قادری۔ پرنٹر پبلشر: افضل حسین۔ مطبع: دہلی پرنٹنگ ورکس محلہ [illegible]
مقام اشاعت: دفتر زندگی رام پور یوپی

اشارات

سید احمد قادری

جماعت اسلامی ہند حلقہ مغربی یوپی وغیرہ کے اجتماع سہارن پور میں شرکت کے لیے ۲۰ر اکتوبر ۹۶۶ کو ہمارا قافلہ جب سہارن پور اسٹیشن پہنچا تو سورج دس پندرہ منٹ پہلے ہی ڈوب چکا تھا۔ ہم میں کچھ لوگوں نے نماز مغرب ٹرین ہی میں ادا کر لی تھی اور کچھ لوگوں نے پلیٹ فارم پر ادا کی۔ جب ہم اسٹیشن سے باہر نکلے تو وہاں سب سے پہلی جو خبر ملی وہ یہ تھی کہ مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی امیر جماعت اسلامی ہند اپنے سات دوسرے رفقاء کے ساتھ گرفتار کر لیے گئے ہیں۔ دوسرے دن صبح سے اجتماعات کے سہ روزہ پروگرام شروع ہو رہے تھے۔ امیر جماعت کو اس اجتماع کی افتتاحی تقریر بھی کرنی تھی اور اختتامی تقریر بھی۔ برادرم سید حامد حسین صاحب کو اجتماع عام میں خطاب عام کرنا تھا اس کے علاوہ جدید تعلیم یافتہ افراد اور کارکنوں سے خطاب بھی انہیں کے ذمے تھا۔ ہماری مرکزی اور ریاستی حکومتیں جس "ہوش گوش" اور "با خبری" کے ساتھ ملک کا نظم ونسق چلا رہی ہیں اس کے پیش نظر ہلکا سا اندیشہ یہ بھی تھا کہ کہیں اس اجتماع کے انعقاد ہی میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ کر دی جائے۔ اگرچہ یہ بات اخبارات سے معلوم ہو چکی تھی کہ دہلی میں مصر کے ڈکٹیٹر جمال عبدالناصر صاحب کے استقبال کے لیے یہ گرفتاریاں عمل میں لائی گئی ہیں۔ پھر بھی [illegible] کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ صرف اپنے نشانے ہی پر لگے گی۔ کیا جانے اس [illegible] سے دوسرے لوگ بھی مجروح ہو جائیں جو ہدف نہ ہوں۔ اس صورت حال میں جلسہ گاہ پہنچتے ہی ضرورت محسوس ہوئی کہ چند افراد کی مشاورتی میٹنگ کر کے دو باتیں طے کر لی جائیں۔ ایک یہ کہ پروگرام میں [illegible] کی کیا اس طرح پابندی کی جائے کہ ان پروگراموں کو ہم آپس ہی میں تقسیم کر لیں۔ اور دوسری [illegible]

ہم میں سے بھی کچھ افراد کو حکومت نے اپنا جبری مہمان بنا لیا تو بعد کو اس اجتماع کی ذمہ داری و نگرانی ان کے سپرد ہو گی۔ شکر ہے کہ اس اجتماع میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کی گئی اور سارے پروگرام بخیر و خوبی اپنے اختتام کو پہنچے۔ انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ کے بعض افراد ہمارے قافلے کے ساتھ رام پور سے سہارن پور آئے تھے اور وہ یہاں کے مقامی سی آئی ڈی بھی اجتماع گاہ کا گشت لگا رہے تھے اور ان میں سے بعض نے تاسف کے ساتھ یہ بھی فرمایا تھا کہ دہلی کی گرفتاریوں کی وجہ سے جلسہ پھیکا رہے گا۔ خدا کا شکر ہے کہ جلسہ پھیکا نہیں رہا بلاشبہ ہم مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی اور سید حامد حسین صاحب کے خطابات سے بجبر محروم کر دیے گئے تھے لیکن یہ اللہ کا کرم ہے کہ اجتماع عام بھی کامیاب رہا اور رفقا نے بھی پروگراموں میں کمی محسوس نہیں کی بلکہ ان میں سے بعض کا یہ تاثر سامنے آیا کہ ادھر ایک عرصے کے بعد ایک ایسا اجتماع منعقد ہوا جس میں اسلام کی دعوت راست انداز میں پیش کی گئی۔

اختتامی تقریر میں رفقا سے خطاب کرتے ہوئے مقرر نے کہا:۔

حضرات! آپ یہ جانتے ہیں کہ اختتامی تقریر مولانا ابواللیث اصلاحی امیر جماعت اسلامی ہند کو کرنی تھی لیکن ہم ان کے افادات سے محروم کر دیے گئے ہیں مجھ سے جب کہا گیا کہ یہ خدمت میں انجام دوں تو اپنی حالات کے باوجود میں نے اسے صرف اس لیے قبول کر لیا کہ چند کلمات خیر کہنے کی سعادت سے محروم ہونا مجھے گوارا نہ ہوا۔ عربی کا مشہور حکیمانہ جملہ ہے۔ انظر الی ما قال ولا تنظر الی من قال۔ یہ دیکھو کہ کہنے والے نے کیا کہا، یہ نہ دیکھو کہ کس نے کہا۔

حضرات! قرآن کریم کی تلاوت کے وقت مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے اور شاید آپ بھی محسوس کرتے ہوں گے کہ اس کی ہر سورہ ایک دریا ہے اور تمام دریا ایک ہی سمت میں رواں دواں ہیں۔ ان سورتوں کی آیتیں اور رکوع ان دریاؤں کی لہریں اور موجیں محسوس ہوتی ہیں اور پھر محسوس ہوتا ہے کہ یہ تمام کے تمام دریا ایک اتھاہ سمندر میں جا کر مل جاتے ہیں۔ یہ بے کراں سمندر اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جس کی کنہ و حقیقت تک کوئی نہیں پہنچ سکتا اور جو پوری کائنات کا نور، مبدء وجود اور منبع فیض ہے۔ گویا قرآن ہمیں اسی منبع فیض تک پہنچاتا ہے۔ اس کی تعلیم کا حاصل یہ ہے کہ اللہ کے بندے شیطان اور شیطانی گروہ سے کٹ کر صرف اس سے جڑ جائیں۔ قرآن ہمیں ہر طرف سے یکسو کر کے صرف ایک اللہ کے سامنے جھکا دینا چاہتا ہے جو اس کائنات کا خالق، مالک، معبود، فرماں روا، حاکم اور بادشاہ ہے وہی اس کائنات کا مرکز محور

اور مرجع بھی۔

ہم اور آپ دور دور سے سفر کر کے اپنے کام اور کاروبار چھوڑ کر یہاں صرف اس لیے جمع ہوئے کہ اپنے ایمان تازہ کر لیں۔ اس شہر کے عوام و خواص تک حق کی دعوت پہنچائیں اور اپنے مقصد حیات اور نصب العین کی راہ میں جدوجہد کا جائزہ لیں۔ ان دو دنوں میں ہم نے اور آپ نے بہت کچھ سنا ہے اور کہا ہے اور اب وقت قریب ہے کہ ہم اور آپ ایک دوسرے سے جدا ہو کر اپنی اپنی جگہ پہنچ جائیں۔ رخصت ہوتے ہوئے میں اپنے لیے اور آپ کے لیے صرف چار باتیں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

پہلی بات ہے، ذکر اللہ یہی چیز تمام طاعات و عبادات کی روح ہے اگر یہ نہ ہو تو ہر طاعت اور ہر عبادت بے جان ہے۔ ذکر صرف یہی نہیں ہے کہ آدمی اپنی زبان سے اسمائے الٰہی کا ورد، تسبیح و تہلیل اور دعائیں کرتا رہے بلکہ اللہ، اس کی صفات، اس کی عظمت و جلال اور اس کے احکام کو زندگی کے ہر معاملے میں یاد رکھنا اور اس کے مطابق زندگی بسر کرنا بھی ذکر ہے اور دراصل زبانی اذکار اسی وسیع ذکر کے لیے انسان کو تیار کرتے ہیں۔ نماز جو بہترین ذکر اللہ ہے۔ انسان کو اللہ کی کامل اطاعت کے تیار کرتی ہے اور اس کو بے حیائیوں اور بری باتوں سے روکتی ہے۔ یہی کسوٹی ہے کسی نماز کے حقیقی نماز ہونے کی۔

اللہ کی یاد سے غافل کرنے کے لیے شیطان اور نفس ہر وقت پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ دنیا کے کاروبار، اپنے ذرائع معاش کی دیکھ بھال اور بیوی بچوں کے ساتھ رہن سہن بھی ذہول پیدا کرنے والی چیزیں ہیں۔ نماز میں یا تلاوت قرآن میں یا زبانی اذکار کے ورد میں یا تذکیر و وعظ کے وقت یا خدا کے کسی فرماں بردار مقدس انسان کی صحبت میں خدا کی یاد اور آخرت کا استحضار جس درجے پر ہوتا ہے وہ دوسرے اوقات میں جن کا ذکر اوپر کیا گیا اس درجے پر نہیں رہتا لیکن اتنا تو ضرور رہنا چاہیے کہ ان اوقات میں ہم خدا کو اس طرح نہ بھول جائیں کہ ہمارے قدم حدود شریعت سے تجاوز کر جائیں۔ مختلف اوقات کے لحاظ سے ایمانی کیفیات میں کمی بیشی سے اگر کوئی جماعت محفوظ رہی ہو اور اس کی ایمانی کیفیات ہمہ وقت یکساں رہی ہوں تو یقیناً وہ انبیاء کرام علیہم السلام کی جماعت ہوگی ورنہ ہم تو صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے اندر بھی ان کیفیات میں کمی بیشی کا وجود پاتے ہیں۔ امام مسلمؒ، امام ترمذی اور امام ابن ماجہ نے حضرت حنظلہ کی ایک حدیث روایت کی ہے جس کا مفہوم یہ ہے۔

حضرت حنظلہ رضؓ فرماتے ہیں کہ مجھ سے ایک بار حضرت صدیق اکبر ملے اور میرا حال پوچھا تو میں نے

کہا کہ حنظلہ تو منافق ہوگیا۔ حضرت صدیقؓ نے تعجب سے کہا سبحان اللہ! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ میں نے جواب دیا کہ جب ہم حضورؐ کی خدمت میں ہوتے ہیں اور آپ ہمیں جہنم اور جنت کی یاد دلاتے ہیں تو ہم ایسا محسوس کرتے ہیں جیسے جہنم اور جنت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں لیکن جب ہم حضور کے پاس سے اپنے گھر واپس آتے ہیں اپنے بیوی بچوں سے ملتے ہیں اور اپنے کھیت، باغات کی دیکھ بھال میں لگتے ہیں تو ہم بہت کچھ بھول جاتے ہیں۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے کہا خدا کی قسم یہ ماجرا تو ہمارے ساتھ بھی گزرتا ہے پھر میں اور ابوبکرؓ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور وہاں پہنچ کر میں نے کہا۔ یا رسول اللہ! حنظلہ تو منافق ہوگیا۔ حضورؐ نے فرمایا کیا بات ہے؟ میں نے کہا۔ یا رسول اللہ! ہم آپ کے پاس ہوتے ہیں، آپ ہمیں جنت و دوزخ کی یاد دلاتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جنت دوزخ ہمارے سامنے ہیں۔ پھر جب ہم آپ کے پاس سے واپس جاکر بیوی بچوں سے ملتے ہیں اپنی جائداد سنبھالنے کی فکر کرتے ہیں تو بہت کچھ بھول جاتے ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے میرے پاس تمہاری جو کیفیت ہوتی ہے اور ذکر و وعظ کے وقت تم جس حال میں ہوتے ہو اگر وہ ہر وقت باقی رہے تو فرشتے تمہارے بستروں پر اور تمہارے راستوں میں تم سے مصافحہ کریں لیکن اے حنظلہ کسی وقت یہ کیفیت ہوتی ہے اور کسی وقت وہ کیفیت، آپ نے یہ بات تین بار فرمائی۔

حضرت حنظلہ بن الربیعؓ حضور صلعم کے کاتبین وحی میں ہیں اور حضرت صدیقؓ کا کیا کہنا جو انبیاء کے بعد سب سے زیادہ اونچے درجے کے انسان ہیں۔ جب مختلف اوقات کے لحاظ سے ان جیسے لوگوں کو ذہول ہوسکتا ہے اور ان کی ایمانی کیفیت میں کمی بیشی ہوسکتی ہے تو ہم اور آپ کس شمار قطار میں ہیں۔ اس حدیث سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ انسان دنیا میں اس لیے نہیں بھیجا گیا کہ بیوی بچوں اور تلاش معاش سے الگ ہوکر فرشتہ بن جائے اور دوسری یہ کہ مختلف اوقات کے لحاظ سے استحضار آخرت کی کیفیت میں کمی بیشی نفاق تو نہیں ہے لیکن اس سے چوکنا رہنا چاہیے۔

ذہول و نسیان انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ اسی لیے ہم قرآن میں بھی پاتے ہیں کہ وہ نماز جیسی عبادت سے فارغ ہونے کے بعد بھی ذکر اللہ کا حکم دیتا ہے۔

فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا — جب نماز جمعہ تمام ہوچکے تو زمین میں پھیل

فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو اور اللہ کو بہت

وَاذْكُرُوا اللّٰہَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ٥ (الجمعہ) — یاد کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

نماز سے جو خود بہترین ذکر ہے فارغ ہونے کے بعد اپنی روزی تلاش کرنے کی حالت میں اللہ کے ذکر کثیر کی ہدایت، ہمیں تعلیم دیتی ہے کہ اللہ کا ذکر مسجد تک محدود نہ ہونا چاہیے بلکہ اس کو زندگی کے تمام معاملات تک وسیع ہونا چاہیے۔ اس کو دفتروں، کارخانوں اور بازاروں تک پھیلنا چاہیے اس لیے کہ یہی اوقات ذہول ونسیان کے ہوتے ہیں اور یہیں ہیں انسان کے قدم اللہ کے مقرر کیے ہوئے حدود سے تجاوز کر سکتے ہیں۔

دوسری بات۔ جو میں پیش کرنا چاہتا ہوں وہ ہے "باطل سے شدید نفرت اور حق سے شدید محبت" باطل کو مٹانا اور اس کی جگہ حق کو قائم کرنا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک باطل سے شدید نفرت اور حق سے شدید محبت نہ ہو۔ جس درجے میں باطل سے نفرت ہوگی اسی درجے میں حق سے محبت ہوگی۔ اگر کوئی اپنی محبت حق کو ناپنا چاہتا ہو تو اس کو یہ دیکھنا چاہیے کہ باطل سے اسے کتنی نفرت ہے جس درجے میں اس سے نفرت ہوگی اسی درجے میں حق سے محبت ہوگی اور وہی درجہ اس کے ایمان کا ہوگا۔

جب باطل سے شدید نفرت اور حق سے شدید محبت ہوتی ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان کے تمام کام صرف اللہ کی خوشنودی کے لیے ہو کر رہ جاتے ہیں اور یہی درجہ کمال ایمان کا درجہ ہے۔ حدیث میں ہے۔ "جس نے اللہ سے محبت کی، اللہ کے لیے نفرت کی۔ اللہ کے لیے دیا اور اللہ کے لیے روکا، اس نے اپنا ایمان مکمل کر لیا۔

منکر کو مٹانے کا حکم جس حدیث میں ہے اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ جب تک باطل سے شدید نفرت نہ ہو اسے مٹانے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ برائی کو محض دل سے برائی سمجھنا تو وہ ضعیف ترین ایمان ہے جس کے بعد ایمان کا کوئی درجہ ہے ہی نہیں۔

تیسری بات۔ جو میں پیش کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ہمیں اقامت دین کے نصب العین کو فی الواقع اپنی تمام سعی وجہد کا مرکز ومحور بنانا چاہیے۔ یہی بات ہماری کوششوں کو کنٹرول کرنے والی ہے ورنہ اندیشہ ہے کہ ہم ادھر ادھر بہک کر اپنے نصب العین سے دور جا پڑیں گے۔

چوتھی اور آخری بات یہ ہے کہ ہم سب کو اپنی روزانہ زندگی کا ہمہ جہتی اور کڑا جائزہ لیتے رہنا چاہیے قرآن میں ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ	اے مومنو! اللہ سے ڈرتے رہو اور ہر شخص
وَلْتَنظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۖ وَ	کو دیکھتے رہنا چاہیے کہ اس نے کل (قیامت)
اتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا	کے لیے کیا توشہ آگے بھیجا ہے اور اللہ سے ڈرو
تَعْمَلُونَ ۝ (الحشر)	وہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔

اوامر الٰہی کی تعمیل اور اس کے نواہی سے اجتناب کی حیثیت سے بھی، اپنے اخلاق و کردار کی جہت سے بھی، اپنے کاروبار کے پہلو سے بھی اور اقامت دین کی جد و جہد کے لیے اپنے کیے ہوئے عہد و پیمان کے لحاظ سے بھی ہمیں روزانہ اپنا احتساب کرتے رہنا چاہیے۔ اور یہ احتساب بھی یہ سمجھتے ہوئے کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے تمام اعمال سے باخبر ہے۔ وہ حقیقت سے بھی واقف ہے اور نفس کے بہانوں سے بھی آگاہ ہے۔

حضرات! یہی چار باتیں ہیں جو میں اس وقت پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ مجھے اور آپ کو اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

---

۲۲ اکتوبر ۶۷ء کو شب کے وقت ادب اسلامی کا اجتماع ہوا اور یہ بھی توقع سے زیادہ کامیاب رہا اگر اس کو جاری رکھا جاتا تو رات کا بڑا حصہ گزر جاتا لیکن ہم عام مشاعروں کی طرح رات بھر ادبی اجتماع کرتے رہنے کو صحیح نہیں سمجھتے۔ اس لیے مجبوراً دو گھنٹوں کے بعد اس کو ختم کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ ادارۂ ادب اسلامی کے کئی نمایاں ارکان بھی اپنی کوئی چیز پیش نہ کر سکے۔ اس اجتماع کا افتتاح کرتے ہوئے میں نے تحریک ادب اسلامی کے تعارف میں ذیل کے چند کلمات کہے تھے:۔

تحریک ادب اسلامی کوئی نئی تحریک نہیں ہے اس لیے ہم کسی لمبی تعارفی تقریر کی ضرورت محسوس نہیں کرتے اور نہ ہم اس وقت دنیا کے مختلف اور متنوع مکاتب فکر پر اظہار خیال ضروری سمجھتے ہیں۔ ہم مختصر الفاظ میں صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر ادب کا انسانی زندگی سے تعلق ہے اور یقیناً ہے تو پھر زندگی کا جو مقصد ہو وہی ادب کا بھی ہونا چاہیے۔ ادب ہمارے نزدیک خود کوئی مقصد نہیں ہے بلکہ کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ اور وسیلہ ہے جو ادیب اپنی زندگی ہی کو محض تفریح سمجھتے ہیں انہیں حق [illegible] تفریح کا وسیلہ بنائیں — ہم ادب کو ایک سنجیدہ اور بامقصد چیز [illegible]

سمجھتے ہیں اس لیے ہمارے لیے اس کی گنجائش نہیں ہے کہ ہم ادب کو صرف تفریح کا ذریعہ بنا سکیں۔ ہم یقین رکھتے ہیں کہ ہماری زندگی کا مقصد اس ذات ستودہ صفات کی بندگی ہے جس نے ہمیں پیدا کیا ہے۔ ہمارے خالق نے ہمیں کچھ غیر متبدل اخلاقی اقدار دیے ہیں۔ اس نے ہماری زندگیوں کو متعدد سماجی بندھنوں سے وابستہ کر دیا ہے۔ اس نے ہمیں زندگی بسر کرنے کا ایک طریقہ بتایا ہے اور اس نے ہماری زندگی کے ایک آخری انجام کی خبر دی ہے۔ ہم نہ ان اخلاقی اقدار کو توڑ سکتے نہ ان سماجی بندھنوں سے آزاد ہو سکتے نہ اس طریق زندگی کو بدل سکتے اور نہ اپنے آخری انجام سے بے پروا ہو سکتے ہیں ——— تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جب کبھی انسانوں نے ان اخلاقی اقدار کا احترام کیا ہے۔ جب کبھی انسانوں کی زندگیاں ان سماجی بندھنوں سے وابستہ ہوئی ہیں، جب کبھی انسان اس طریق زندگی پر چلے ہیں اور جب کبھی انھوں نے اپنے آخری انجام کو سامنے رکھ کر کاروبار زیست کو مرتب و منظم کیا ہے ان کی زندگیاں سچائی اور پاکیزگی کا نمونہ بن گئی ہیں، ان میں انسانی ہمدردی کا جذبہ اور برادرانہ ملاطفت کا حسن پیدا ہوا ہے ان کے معاشرے میں امن و سلام کی بہار آگئی ہے اور ان کی انسانیت اپنے نقطۂ کمال تک پہنچ گئی ہے۔ یہ اور اس طرح کی بے شمار تفصیلات ایک لفظ "اسلام" میں سمٹ آتی ہیں۔ ہم مسلم ہیں اور اسلام کی سربلندی ہی ہمارے ادب کا مقصد ہے۔

پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ دنیا کے بہترین کلاسیکی ادب کے نمونے وہی ہیں جو خدا کے عطا کیے ہوئے دین و مذہب کی بنیاد پر تیار کیے گئے ہیں۔ آج کی دنیا پھر ایک ایسے ہی ادب کی سخت محتاج ہے — ادب اسلامی کی تحریک اسی طرح کے ادب کو پروان چڑھا کر انسانی معاشرے کو سنوارنا چاہتی ہے اور یہ سب کچھ ہم اس لیے کرنا چاہتے ہیں کہ اپنے خالق و مالک کی نگاہ کرم کے مستحق بن سکیں۔

۲۳ر اکتوبر کو سہارن پور کا اجتماع ارکان کی مخصوص میٹنگ کے بعد ختم ہوا اور ہم یہ فیصلے کر کے واپس ہوئے کہ اگر خدانخواستہ ہمارے گرفتار رفقا کی قید طویل ہوئی تو ان کے ذمہ کے اہم کاموں کی انجام دہی کا بندوبست کیا ہوگا لیکن شکر ہے کہ جن افراد کو ۱۹ر اکتوبر ۶۶ء کو گرفتار کیا گیا تھا انھیں گیارہ دنوں کے بعد جب صد ناصر مصر پہنچ کر اپنے سفر کی تکان بھی دور کر چکے — آزاد کر دیا گیا۔

ہمارا ملک اس وقت جس افراتفری اور جس انتشار و برہمی کے دور سے گزر رہا ہے (باقی صفحہ ۶۲ پر)

(۵)

جناب محمد نجات اللہ صدیقی، شعبۂ معاشیات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

شرکاء کی مالی ذمہ داریاں

ذیل کے اصول کا تعلق مشترکہ کاروبار میں شرکاء کی مالی ذمہ داری یا ضمان (LIABILITY) سے ہے۔ وہ صورتیں زیر بحث نہیں جن میں معاہدے کی خلاف ورزی یا اس کے طے کردہ حدود سے تجاوز کے سبب یا کسی ذاتی فعل کے سبب کسی فریق پر کوئی مالی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ صرف اس مالی ذمہ داری کا ذکر ہے جو معاہدے کی پوری پابندی کی صورت میں کسی فریق پر عائد ہو سکتی ہے۔

جہاں تک شرکت یا مضاربت کی اس سادہ شکل کا سوال ہے جس میں کوئی فریق مشترکہ کاروبار میں اپنا ذاتی سرمایہ شامل کرنے، قرض سرمایہ شامل کرنے یا کاروبار کی مالیت سے زیادہ ادھار مال خریدنے یا اس قسم کا کوئی اور تصرف نہیں کرتا۔ کاروبار کی مجموعی مالی ذمہ داریاں کبھی اس کے مجموعی سرمایے سے متجاوز نہیں ہو سکتیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ اختتام کاروبار پر کاروبار کے ذمے ایسی واجب الادا رقوم رہ جائیں جن کی ادائیگی خود کاروبار کے سرمایے سے ممکن نہ ہو۔ ایسی صورت میں مالی ذمہ داری کی وہ بحث پیدا ہی نہیں ہوتی جس کے بارے میں اصولی حکم ذیل میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ بحث صرف اس صورت میں پیدا ہوتی ہے جب مشترکہ کاروبار کی جانب سے قرض لیا گیا ہو، یا ادھار مال خریدا گیا ہو، یا مستقبل میں ادائیگی کے وعدے پر کچھ خدمات حاصل کی گئی ہوں۔ اس صورت میں یہ ممکن ہے کہ کاروبار کے ذمے جو رقوم واجب الادا ہوں ان کی ادائیگی، نقصان یا دیوالیہ کی صورت میں، سرمایہ کاروبار میں سے ممکن نہ رہ جائے۔ ایسی صورت میں یہ

بات واضح طور پر متعین ہونی چاہیے کہ ان باقی مالی ذمہ داریوں کی تکمیل کس کے ذمے ہوگی جن کی تکمیل مشترکہ سرمایے میں سے ممکن نہ ہو سکی۔

محدود مالی ذمہ داری کا اصول

۹۔ شرکت میں کوئی شریک دوسرے شرکاء کی اٹھائی ہوئی مالی ذمہ داریوں کا کفیل (ضامن) نہیں ہوتا الا یہ کہ یہ ذمہ داری تمام شرکاء کی اجازت سے مشترکہ کاروبار کی جانب سے اٹھائی گئی ہو۔ مضاربت میں سرمایہ فراہم کرنے والے فریق کی مالی ذمہ داری اس کے فراہم کردہ سرمایہ کی حد تک محدود ہوگی۔ الا یہ کہ اس نے اپنی جانب سے قرض لینے یا ادھار خریدنے کی اجازت دے کر اس ذمہ داری کو مزید وسعت دی ہو۔

یہ اصول ان مباحث کی روشنی میں واضح ہے جو اوپر کے چار اصولوں کے سلسلے میں سامنے آچکے ہیں چنانچہ استاذ علی الخفیف نے صراحت کی ہے کہ اس پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"تمام فقہاء کے نزدیک شرکت عنان کا معاہدہ وکیل (ایجنٹ) بنانے اور امین بنانے کو مستلزم ہے۔ چنانچہ ہر شریک دوسرے شرکاء کا ایجنٹ قرار پاتا ہے۔ ان تمام تصرفات میں جو وہ کاروبار کے سرمایے میں کرتا ہے ۔۔۔ وہ تصرفات جو کاروبار کے دائرے میں داخل ہیں۔ ان تصرفات میں نہیں جو کاروبار کے دائرے سے خارج ہوں۔ یہ بات ان حدود کے اندر رہتے ہوئے ہی درست ہے جو معاہدے میں شامل شرائط اور ان پابندیوں نے قائم کی ہوں جن پر تمام شرکاء کا اتفاق ہو معاہدۂ شرکت کی رو سے کوئی شریک دوسرے کے تصرفات سے پیدا ہونے والی مالی ذمہ داریوں کا مکلف نہیں ہوتا"[۱]

"جب کوئی شریک ان حدود سے تجاوز کرے جن کا شرکت نے اسے پابند بنایا ہو تو وہ دوسرے شرکاء کی نسبت سے ایک اجنبی کی حیثیت رکھے گا اور اس کا یہ تصرف اپنی ذات سے سمجھا جائے گا"[۲]

حنفی فقہاء نے بھی صراحت کی ہے کہ شرکت عنان میں ایک شریک دوسرے کا کفیل نہیں ہوتا۔[۳] کفیل سے ان کی مراد وہ فرد ہے جو دوسرے کی مالی ذمہ داریوں کی تکمیل کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

---

[۱] علی الخفیف: الشرکات فی الفقہ الاسلامی ص۲۲

[۲] ایضاً ایضاً

[۳] مرغینانی: ہدایۃ جلد ۲ اور کاسانی: بدائع الصنائع جلد ۶ ص۶۲

شرکتِ عنان میں کوئی شریک دوسرے شرکاء کے ان تصرفات کا ذمہ دار نہیں ہوتا جو کاروبار شرکت کے دائرے سے باہر کیے گئے ہوں۔ کسی شریک کے ذاتی قرضے ادا کرنے یا ذاتی حیثیت میں ادھار خریدے ہوئے مال کی قیمت ادا کرنے کے لیے دوسرے شرکاء کے سرمایے کو ہاتھ نہیں لگایا جا سکتا۔ جہاں تک خود مشترکہ کاروبار کی مالی ذمہ داریوں کا تعلق ہے۔ ہم یہ واضح کر چکے ہیں کہ عام طور پر وہ سرمایۂ شرکت کے حدود کے اندر ہی ہوں گی اور دوسرے شرکاء اگر ان کو اپنی مرضی سے اس حد سے آگے بڑھائیں تو وہ ان ذمہ داریوں کی تکمیل کے مساوی طور پر ذمہ دار ہوں گے۔

کاروبار مضاربت پر اس اصول کا اطلاق واضح ہے۔ مضاربت کے جو احکام اوپر بیان کیے جا چکے ہیں ان کی روشنی میں صاحب سرمایہ کی مالی ذمہ داری اس کے دیے ہوئے سرمایے کے حدود سے اس وقت متجاوز ہو سکتی ہے جب وہ کاروباری فریق کو قرض سرمایہ لے کر یا ادھار مال خرید کر کاروبار میں توسیع کی اجازت دے۔ کاروباری فریق اگر صاحب سرمایہ کی اجازت کے بغیر کوئی ایسا تصرف کرے جس سے کاروبار کی مالی ذمہ داریاں سرمایۂ کاروبار سے متجاوز ہوتی ہوں تو اس کا ذمہ دار وہ خود ہوگا۔ اسی طرح اگر کوئی مالی ذمہ داری کاروباری فریق کے کسی ذاتی فعل کی وجہ سے اس پر آئی ہو تو اس کا کاروبار مضاربت سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔

شرکا یا مالک کی اجازت سے سرمایہ کسی دوسرے فریق کو مضاربت یا شرکت کے اصول پر دینے کی صورت میں بھی اصل کاروبار کی مالی ذمہ داریاں سرمایۂ کاروبار کے دائرے میں ہی رہتی ہیں۔ البتہ اگر اس نئے کاروبار میں قرض سرمایہ یا ادھار خریدے ہوئے مال کے ذریعے کاروبار کو آگے بڑھایا جا رہا ہو تو اس سے پہلے کاروبار کی مالی ذمہ داریاں بھی بڑھیں گی۔ اصولی طور پر یہ ضروری ہوگا کہ نئے کاروبار کی یہ توسیع اس کاروبار کے اصحاب سرمایہ کی مرضی کے بغیر نہ ہو جس کے سرمایے کا ایک حصہ نئے کاروبار میں لگایا گیا ہے۔

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ شرکت اور مضاربت کی سادہ صورتوں میں جب قرض سرمایہ یا ادھار مال کے ذریعے کاروبار کی توسیع عمل میں لائی جائے، کاروبار میں شریک اصحاب سرمایہ کی مالی ذمہ داریاں ان کے فراہم کردہ سرمایوں کی حد تک محدود ہوتی ہیں۔ یعنی خسارہ یا دیوالیہ کی صورت میں کسی صاحب سرمایہ کا زیادہ سے زیادہ جو نقصان ہو سکتا ہے وہ اس کے سرمایے کے بقدر ہوگا۔ البتہ جب مشترکہ کاروبار کو قرض سرمایہ اور ادھار مال کے ذریعے وسیع کیا جائے تو اس کاروبار میں شریک اصحاب سرمایہ کی مالی ذمہ داریاں ان کے

سرمایوں سے متجاوز نہیں گی۔ اس تجاوز کے حدود اصحاب سرمایہ کے ان فیصلوں سے متعین ہوں گے جو انھوں نے سرمایہ قرض حاصل کرکے کاروبار میں لگانے یا ادھار مال خرید کر کاروبار کو وسعت دینے کے سلسلے میں کیے ہیں۔

مدتِ کاروبار

شرکت اور مضاربت پر مبنی کاروبار سے متعلق آخری بحث اس کی مدت سے متعلق ہے۔ ذیل میں اس ضمن میں تین اصولی احکام بیان کیے گئے ہیں چونکہ یہ معاہدے معاہدہ کرنے والوں کے آزادانہ اختیار کے تحت عمل میں آتے ہیں اس لیے انھیں ہر وقت اس معاہدے کو ختم کرکے کاروبار بند کردینے کا اختیار ہوگا۔ البتہ اس امر کا لحاظ کیا جائے گا کہ کاروبار اس طرح ختم کیا جائے کہ ایسا کرنے سے کسی فریق کی حق تلفی نہ لازم آئے۔ دوسرا اصولی حکم اس سوال سے متعلق ہے کہ کیا اس معاہدے کے فریق معاہدہ کرتے وقت یہ طے کرسکتے ہیں کہ یہ معاہدہ ایک مخصوص مدت کے لیے کیا جا رہا ہے جس کے ختم ہونے پر معاہدہ خود بخود ختم ہو جائے گا۔ آخری حکم شرکاء معاہدہ میں سے کسی فریق کی موت سے پیدا ہونے والی صورت حال سے متعلق ہے۔

معاہدہ ختم کرنے کا اختیار

(۱۰) شرکت یا مضاربت کے معاہدے کو کوئی فریق کسی وقت بھی فسخ کرسکتا ہے۔ اگر فریقوں کی تعداد دو سے زائد ہو تو باقی فریقوں کے حق میں معاہدہ قائم رکھا جا سکتا ہے۔

اس اصول پر تمام فقہاء متفق ہیں۔ جزئی اختلاف صرف اس صورت میں پیدا ہوتا ہے جب کسی فریق کے اس فیصلے کے وقت کہ معاہدہ ختم کیا جائے کاروبار کی تحویل میں قابل فروخت اشیاء تجارت ہوں جن کی فروخت عمل میں نہ آئی ہو۔ ایسی صورت میں اختتام معاہدہ اس وقت عمل میں آنا چاہیے جب ان اشیاء کی فروخت عمل میں آجائے۔

صاحب ہدایہ نے صراحت کی ہے کہ ہر شریک کو اختیار ہے کہ جب چاہے شرکت سے علیحدہ ہو جائے[1]۔ اور سرخسی نے واضح کر دیا ہے کہ یہی اختیار معاہدۂ مضاربت کے ہر فریق کو بھی حاصل ہے[2] لیکن جیسا کہ کاسانی نے لکھا ہے بعض حنفی فقہاء کے نزدیک شرکت میں اور تمام حنفی فقہاء کے نزدیک مضاربت میں یہ ضروری ہے

[1] مرغینانی: ہدایہ جلد ۲ کتاب الشرکۃ

[2] سرخسی: المبسوط جلد ۲۲ ص۱۹

کا اختتام معاہدہ کے وقت کاروبار کا سرمایہ نقد کی صورت میں منتقل ہو چکا ہو۔ وہ لکھتے ہیں :۔

شرکت ایک غیر لازم جائز معاہدہ ہے جس کے مطابق دونوں شرکاء میں سے ہر ایک کو معاہدہ ختم کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ البتہ معاہدہ ختم کرنے کا فیصلہ اسی وقت درست ہوگا جب یہ فیصلہ دوسرے فریق کی موجودگی میں یعنی اس کے علم و اطلاع کے ساتھ کیا جائے...... کیا یہ بھی ضروری ہے کہ شرکت کا مال معاہدہ ختم کرنے کے فیصلے کے وقت نقد کی صورت میں ہو...... طحاوی نے لکھا ہے کہ یہ بھی شرط ہے ...... ہمارے ائمہ سے شرکت کی صورت میں اس ضمن میں کوئی روایت نہیں نقل کی گئی ہے البتہ مضاربت کی صورت میں ایک روایت نقل کی گئی ہے...... چنانچہ طحاوی نے شرکت کو مضاربت کے مثل قرار دیا ہے اور ہمارے بعض اساتذہ شرکت اور مضاربت کے درمیان فرق کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اگر کاروبار کا مال اشیاء و اجناس کی صورت میں ہو تو بھی شرکت کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ البتہ ایسی صورت میں مضاربت کو ختم کرنے کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا "۔ [1]

مضاربت کی صورت میں تمام حنفی فقہاء کے نزدیک یہ ضروری ہے کہ معاہدہ ختم کرتے وقت کاروبار کا سارا مال فروخت کر کے نقد کی صورت میں منتقل کیا جا چکا ہو۔ کاسانی نے لکھا ہے کہ :۔

دونوں میں سے ہر ایک کو یعنی صاحب سرمایہ اور کاروباری فریق کو معاہدہ ختم کرنے کا اختیار ہے لیکن یہ شرط پوری کرتے ہوئے کہ دوسرے فریق کو اس فیصلے کی اطلاع ہو...... اور اس شرط کا پورا ہونا بھی ضروری ہے کہ معاہدہ ختم کرتے وقت مال نقد کی صورت میں آچکا ہو "۔ [2]

شرکت کی صورت میں مالکی فقہاء کے درمیان اختلاف ہے، ایک رائے تو وہی ہے جو حنفی فقہاء نے اختیار کی ہے، یعنی شرکت ایک جائز معاہدہ ہے جسے کوئی فریق کسی وقت بھی ختم کر سکتا ہے اور دوسری رائے یہ ہے کہ یہ ایک لازم معاہدہ ہے جو اس وقت تک ختم نہیں کیا جا سکتا جب تک وہ کاروبار تکمیل کو نہ پہنچ جائے جس کے لیے شرکت کا معاہدہ کیا گیا تھا۔ [3]

پہلی رائے ابن رشد کی ہے جس کا اظہار انھوں نے بدایۃ المجتہد میں بھی کیا ہے اور

---

[1] کاسانی، بدائع الصنائع، جلد ۶ ص ۷۸

[2] ایضاً ص ۱۰۹

[3] تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو علی الخفیف: الشرکات فی الفقہ الاسلامی ص ۸۱-۸۲

مدوّنہ میں بھی۔[21] دوسری رائے اکثر مالکی فقہاء کی ہے کیونکہ وہ اس معاہدے کو بھی ایک لازم معاہدہ سمجھتے ہیں۔ لازم معاہدہ کی ایک واضح مثال کسی مزدور کو اجرت کے عوض کسی متعین کام کے لیے رکھنے کی ہے معاہدہ کرنے کے بعد مالک کو یہ اختیار نہیں کہ مزدور کو کام کرنے اور پوری اجرت پانے سے روک سکے۔ اسی طرح مزارعت کا معاہدہ بھی ایک لازم معاہدہ ہے معاہدہ کرنے کے بعد زمین کا مالک فصل تیار ہو کر کٹ جانے سے پہلے کسی درمیانی مرحلے میں معاہدے کو ختم نہیں کر سکتا۔ ان مالکی فقہاء کے نزدیک شرکت کا معاہدہ بھی یہی نوعیت رکھتا ہے۔[21]

مضاربت کی صورت میں تمام مالکی فقہاء کی رائے یہ ہے کہ کوئی فریق اس معاہدے کو کسی وقت بھی ختم کر سکتا ہے۔ البتہ اگر اس فیصلے کے وقت کچھ مال اشیاء واجناس کی صورت میں ہے' یا کوئی کاروباری عمل شروع کیا جا چکا ہے ـــ مثلاً کاروباری فریق مال کی فروخت کے لیے کسی دوسری جگہ کے سفر کا آغاز کر چکا ہے۔ تو اشیاء کی فروخت اور کاروباری عمل کی تکمیل کر کے معاہدہ ختم کیا جائے گا۔ اس سے پہلے نہیں۔ یہ حکم امام مالک نے موطا میں بھی روایت کیا گیا ہے[23] اسی روایت کی شرح میں زرقانی نے یہ لکھا ہے کہ :۔

خلاصہ یہ کہ ہر فریق کو کاروبار کے عملاً شروع ہونے سے پہلے معاہدہ ختم کرنے کا اختیار ہے۔ اس کے بعد اس وقت تک یہ اختیار نہیں جب تک پھر یہ مال نقد سرمایہ کی صورت میں نہ آ جائے جس صورت میں کہ وہ لیا گیا تھا۔[24]

اور احمد الدردیر نے یہ لکھا ہے :۔

صاحب سرمایہ اور کاروباری فریق دونوں کو عملاً کاروبار شروع ہونے سے پہلے معاہدہ ختم کرنے کا اختیار ہے ..... بصورت دیگر یعنی اس کے اسی مقام پر کاروبار کرنے یا سفر پر چلے جانے کی صورت میں مال کے نقد کی شکل میں آ جانے یعنی اشیاء کے فروخت ہو چکنے پر معاہدہ ختم کرنے کا

---

[21] ابن رشد :۔ بدایۃ المجتہد جلد ۲ ص ۲۵۲۔ مدوّنہ میں ظاہر کی ہوئی رائے احمد الدردیر نے الشرح الصغیر جلد ۲ ص ۱۵۵ پر نقل کی ہے۔

[22] ملاحظہ ہو احمد الدردیر :۔ الشرح الصغیر جلد ۲ صفحات ۱۵۳ ـــ ۱۵۵ اور شیخ احمد الصاوی بلغۃ السالک لاقرب المسالک جلد ۲ صفحات ۱۵۳ ـــ ۱۵۵

[23] امام مالک : موطا۔ کتاب القراض۔ باب ما لا یجوز من الشرط فی القراض

[24] محمد الزرقانی : شرح موطا۔ کتاب القراض۔ باب ما لا یجوز من الشرط فی القراض

اختیار ہوگا۔[1]

خلاصہ یہ کہ اگر کسی فریق نے معاہدہ ختم کرنے کا ارادہ کر لیا ہے تو اسے دوسرے فریق کو اتنی مہلت دینی ہوگی کہ وہ اشیاء و اجناس کو فروخت کر کے کاروبار کے سرمایہ کو نقد کی صورت میں منتقل کر لے۔

شافعی فقہاء کے نزدیک شرکت اور مضاربت دونوں معاہدوں کو کوئی فریق کسی وقت بھی ختم کر سکتا ہے۔ امام نووی لکھتے ہیں :۔

"ہر شریک جب چاہے شرکت کا معاہدہ ختم کر سکتا ہے۔"[2]

اور

"مضاربت میں ہر فریق کو مضاربت ختم کر دینے کا اختیار ہے۔"[3]

امام غزالی نے بھی یہی حکم بیان کیا ہے کہ :۔

"مضاربت ایک جائز معاہدہ ہے جو فریقین میں سے کسی ایک کے ختم کرنے سے ختم ہو جاتا ہے۔"[4]

یہی مسلک حنبلی فقہاء کا بھی ہے۔

"شرکت جائز معاہدوں میں سے ہے جو ...... کسی ایک شریک کے ختم کرنے سے ختم ہو جاتا ہے۔"[5]

"مضاربت جائز معاہدوں میں سے ہے۔ کسی ایک فریق کے ختم کرنے سے ختم ہو جائے گا خواہ جو فریق بھی ایسا کرے۔"[6]

معاہدہ ختم کرنے کے لیے حنفی اور مالکی فقہاء نے جو شرط لگائی ہے وہ ہمارے نزدیک ایک معقول شرط ہے بالخصوص مضاربت کے معاہدے میں فریقین کے درمیان حساب فہمی کے لیے اور عدل و انصاف قائم رکھنے کے لیے اس کی پابندی ضروری ہے۔ مضاربت کی صورت میں اگر کوئی فریق دوران کاروبار معاہدہ ختم کرنے کا فیصلہ

---

[1] احمد الدردیر: الشرح الصغیر۔ جلد ۲ ص ۲۳۵

[2] نووی: منہاج ص ۵۶

[3] ایضاً ص ۵۹

[4] غزالی۔ کتاب الوجیز جلد ۱ ص ۲۲۵

[5] ابن قدامہ: المغنی جلد ۵ ص ۱۳۳

[6] ایضاً ص ۱۷۹

کرے تو اس بات کا اہتمام کیا جانا چاہیے کہ کاروبار کو جلد ختم کردیا جائے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہ ہونا چاہیے کہ اگر اشیاء و اجناس کو فوراً فروخت کردینے میں خسارہ ہو تو بھی ایسا کیا جائے بلکہ معروف کے مطابق رفتہ رفتہ کاروبار کو اس طرح ختم کرنا چاہیے کہ کوئی ایسا نقصان نہ دیکھنا پڑے جس سے بچا جاسکتا ہو۔ البتہ جب مضاربت میں کاروباری فریقوں یا اصحاب سرمایہ کی تعداد ایک سے زائد ہو اور معاہدہ ختم کرنے کا فیصلہ صرف ایک فریق کر رہا ہو تو تمام فریقوں کی رضامندی سے یہ ممکن ہونا چاہیے کہ کاروبار جاری رکھتے ہوئے بھی اس فریق کا حساب صاف کرکے اس کے حق میں معاہدہ ختم کردیا جائے۔

شرکت کی صورت میں بھی اگر شرکا کی تعداد دو سے زیادہ ہو تو اسی قاعدے پر عمل کرنا چاہیے۔ اگر شرکا کی تعداد صرف دو ہو اور دونوں اس بات پر راضی ہوں کہ وہ کاروبار کی تکمیل کے بغیر اس کے اثاثہ ــــ نقد، اشیاء و اجناس اور آلات عمل ــــ کو باہم تقسیم کرکے معاہدہ ختم کرلیں تو اس کی پوری گنجائش ہونی چاہیے ایسی صورت میں ہمیں ان مالکی فقہاء کی رائے سے اتفاق نہ ہوگا جو اختتام کاروبار کے لیے تکمیل ضروری قرار دیتے ہیں۔ اس مسئلے یعنی مشترکہ کاروبار کو ختم کرنے کے سلسلے میں اصولی بات یہی ہے کہ ہر فریق کو ہر وقت اس کی آزادی ہونی چاہیے اور اس آزادی کو صرف اس صورت میں اسی حد تک محدود کرنا چاہیے جب اس سے دوسرے فریقوں کے مفادات پر قابل لحاظ اثر پڑتا ہو۔ باہمی رضامندی سے اختتام معاہدہ کا اختیار ہر وقت حاصل ہونا چاہیے خواہ کاروبار کا سرمایہ نقد کی صورت میں ہو یا اشیاء و اجناس کی صورت میں البتہ اگر کسی فریق کو اس طرح معاہدہ ختم کرنے سے اپنے مفادات مجروح ہوتے نظر آئیں تو اسے اس بات پر اصرار کا حق ہوگا کہ پہلے کاروبار کا سرمایہ نقد کی صورت میں منتقل کرلیا جائے تب حساب کتاب کیا جائے۔ جب فریقوں کی تعداد دو سے زیادہ ہو تو ایک فریق کے اس حق کو بھی معقول حدود کے اندر ہی رکھنا چاہیے۔ ان حدود کی تعیین شرکا کی تعداد مشترکہ سرمایے میں اس فریق کے حصے اور کاروبار کی نوعیت کو سامنے رکھ کر ہی کی جاسکتی ہے۔

شرکت اور مضاربت پر بحث کرتے وقت ہمارے فقہاء نے جو مثالیں دی ہیں وہ زیادہ تر خالص تجارتی کاروبار سے متعلق ہیں۔ انھوں نے صنعتی کاروبار کو سامنے نہیں رکھا ہے۔ جیسا کہ ہم آئندہ واضح کریں گے ــ شرکت اور مضاربت کے اصول پر صنعتی کاروبار بھی کیا جاسکتا ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ کسی صنعتی کاروبار کو اس طرح ختم کرنا کہ کاروبار کا پورا سرمایہ نقد کی شکل اختیار کرلے اتنا آسان نہیں جتنا کسی تجارتی کاروبار کو ختم کرنا ہے۔ دوسری طرف دور جدید میں کسی جاری کاروبار کی مالیت کی تعیین میں زیادہ دشواری نہیں، اگرچہ

اس میں اختلاف کی کافی گنجائش ہے ۔ ان دونوں حقیقتوں کو سامنے رکھتے ہوئے اگر یہ اصول وضع کیا جائے کہ اگر تمام فریق راضی ہوں تو کسی ایک فریق کی شرکت یا مضاربت سے علیحدگی کی صورت میں یہ کافی ہوگا کہ کاروبار کی مالیت کسی ایسے ماہر سے متعین کرائی جائے جس کے انتخاب پر تمام فریق راضی ہوں اور اسی مالیت کو بنیاد بنا کر اس فریق کا حساب صاف کیا جائے ۔

یہ بات کہ شرکا کی تعداد یا مضاربت کے معاہدے میں فریقوں کی تعداد دو سے زیادہ ہو تو ایک فریق کی علیحدگی کے باوجود باقی فریقوں کے حق میں معاہدہ قائم رکھا جا سکتا ہے ۔ تمام فقہی مکاتب کے اصولوں سے ہم آہنگ ہے ۔ استاذ علی الخفیف نے شرکت اور مضاربت کے اختتام کے مسئلے میں تمام فقہا کا مسلک بیان کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ

> جب متعدد شرکا فریق معاہدہ ہوں اور ان میں سے ایک اسے ختم کر دے یا اس کے ساتھی اسے شرکت سے علیحدہ کر دینے کا فیصلہ کرلیں تو یہ فیصلہ صرف اس فریق کے حصے میں نافذ ہوگا اور باقی شرکا کے حصے کی حد تک شرکت طے شدہ شرائط کے مطابق قائم رہے گی ۔ [1]

اس ضمن میں ہمیں چاروں مکاتب فقہ کے ماخذ میں صریح بیانات نہ مل سکے جس کا سبب بڑی حد تک یہ ہے کہ پوری بحث میں مثال کے طور پر معاہدے کی صورت میں اس صورت کو سامنے رکھا گیا ہے جس میں دو فریق باہم معاہدہ کرتے ہیں ۔ البتہ اس بات کی صراحت علیحدہ سے ملتی ہے کہ شرکا کی تعداد دو سے زائد ہو سکتی ہے اور اسی طرح مضاربت میں سرمایہ فراہم کرنے یا کاروبار کرنے کا کام ایک سے زائد افراد کر سکتے ہیں ۔ اس سلسلے میں فقہی ماخذ کے حوالے اوپر دیے جا چکے ہیں ۔

متعین مدت کے لیے معاہدہ

(۱۱) شرکت یا مضاربت کا معاہدہ متعین مدت کے لیے بھی کیا جا سکتا ہے ۔

متعین مدت کے لیے معاہدہ کرنے سے یہ لازم آتا ہے کہ اس مدت کے اختتام پر معاہدہ کسی نئے فیصلے کے بغیر خود بخود ختم ہو جائے ۔ حنفی اور حنبلی فقہا اور ایک رائے کے مطابق شافعی فقہا کے نزدیک ایسا کیا جا سکتا ہے لیکن مالکی فقہا کے نزدیک تعیین مدت سے معاہدہ فاسد ہو جائے گا ۔ رہا یہ سوال کہ متعین مدتوں کے لیے معاہدہ کرنے کی صورت میں اس مدت کی تکمیل سے پہلے کسی فریق کو معاہدہ ختم کرنے کا اختیار ہوگا یا نہیں ؟ تو اس کا جواب تمام فقہا متفقہ طور پر یہ دیتے ہیں کہ اسے یہ اختیار ہوگا ۔ دوسرے الفاظ میں

---

[1] علی الخفیف : الشرکات فی الفقہ الاسلامی ص ۱۱

زیرِ غور اصول اس اصول کے تحت نافذ ہوگا اسے فسوخ نہیں کیا جا سکے گا جس کا مطالعہ ہم نے اس سے پہلے کیا ہے یعنی ہر فریق کو ہر وقت معاہدہ ختم کرنے کا اختیار ہوگا۔

حنفی محقق ابومسعود کاسانی نے لکھا ہے

"اگر صاحب سرمایہ یہ کہے کہ یہ سرمایہ مضاربت کے اصول پر ایک سال کے لیے ہے تو ہمارے نزدیک مضاربت صحیح ہوگی اور شافعی رحمہ اللہ یہ کہتے ہیں کہ مضاربت فاسد ہو جائے گی۔ ان کی رائے کی بنیاد یہ ہے کہ جب مالک نے مضاربت کے لیے مدت مقرر کر دی تو ممکن ہے اس مدت میں کاروبار نہ ہو سکے اور ایسا ہوا تو معاہدہ سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ مضاربت وکیل (ایجنٹ) بنانے کے مرادف ہے اور وکیل بناتے وقت مدت کی تعیین کی جا سکتی ہے۔" [1]

کاسانی نے یہ واضح کر دیا ہے کہ یہی حکم شرکت کا بھی ہے۔ [2]

حنبلی فقیہ ابن قدامہ نے بھی یہی لکھا ہے:

"مضاربت کے لیے وقت کی تعیین جائز ہے۔ مثلاً یہ کہے کہ میں نے ان درہموں پر تمہارے ساتھ ایک سال کے لیے مضاربت کا معاہدہ کیا، لہذا جب یہ مدت پوری ہو جائے تو مزید خرید و فروخت نہ کرنا۔" [3]

ابن قدامہ نے شرکت کے سلسلے میں اس حکم کی صراحت نہیں کی ہے لیکن حنابلہ کے نزدیک شرکت اور مضاربت کے احکام اکثر مسائل میں ایک سے ہیں اور استاذ علی الخفیف نے لکھا ہے کہ شرکت کی صورت میں بھی حنابلہ مدت کی تعیین درست سمجھتے ہیں۔ [4]

ابن قدامہ نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ مدت کی تعیین کے باوجود کسی فریق کا یہ اختیار ختم نہیں ہو جاتا کہ وہ جب چاہے معاہدے کو ختم کر دے۔ وہ لکھتے ہیں

"فاسد شرطوں کی تین قسمیں ہیں، پہلی وہ جو معاہدہ کے منشا کے منافی ہوں، مثلاً یہ شرط طے کرنا

---

[1] بدائع الصنائع جلد ۶ ص ۹۹

[2] ایضاً " ص ۵۰

[3] ابن قدامہ: المغنی جلد ۵ ص ۱۸۱

[4] علی الخفیف: الشرکات فی الفقہ الاسلامی۔ ص ۲۷

کہ مضاربت لازمی ہے یا یہ کہ ایک متعین مدت تک کوئی فریق دوسرے کو معزول نہ کرسکے گا۔[1]

شافعی فقہاء کی طرف اس سلسلے میں دو رائیں منسوب ہیں جیسا کہ ذیل کے اقتباسات سے واضح ہے ۔

"مضاربت کے لیے مدت کا بیان ضروری نہیں ۔ اگر کسی مدت کا ذکر کیا گیا اور اس کے بعد کاروباری فریق کے لیے تصرفات ممنوع قرار دے دیے گئے تو معاہدہ فاسد ہوجائے گا۔ البتہ اس مدت کے بعد اگر اسے مزید مال خریدنے سے منع کر دیا جائے تو زیادہ صحیح رائے کے مطابق معاہدہ فاسد نہیں ہوگا"۔[2]

امام نووی نے جس رائے کو ترجیح دی ہے اس کی وجہ امام غزالی نے یہ بتائی ہے کہ صاحب سرمایہ کو ہر وقت یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ کاروباری فریق کو مزید مال خریدنے سے روک دے۔ اس لیے اس کے لیے ایک وقت پہلے سے بھی متعین کیا جاسکتا ہے لیکن کاروباری فریق کو مال فروخت کرنے سے نہیں روکا جاسکتا اس لیے اس کا کوئی آخری وقت بھی نہیں طے کیا جاسکتا۔[3]

یہی بات ضروری استدلال کے ساتھ ایک دوسرے شافعی محقق نے لکھی ہے ۔

شافعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ شرط طے کرنا درست نہیں کہ (مضاربت) ایک متعین وقت تک رہے گی۔ ہمارے بعض فقہا نے یہ کہا ہے کہ اس میں مدت کی تعیین اس لیے درست نہیں کہ یہ معاہدہ ایک معاوضہ پر کیے جانے والے کام سے متعلق ہے اس لیے تعیین مدت سے باطل ہوجائے گا۔ جیسا کہ خرید فروخت یا نکاح کے معاہدوں کا حکم ہے۔ بعض فقہا نے کہا ہے کہ اگر اس نے تعیین مدت کے ساتھ معاہدہ اس طور پر کیا ہے کہ کاروباری فریق اس مدت کے بعد کوئی چیز فروخت نہ کرے گا تو یہ درست نہ ہوگا کیونکہ کاروباری فریق کو نفع کمانے کے لیے فروخت کا حق حاصل ہے۔ جب مالک نے فروخت سے از روئے شرط منع کر دیا تو ایسی شرط کی جو معاہدہ مضاربت کے تقاضے کے خلاف ہے۔ اگر اس نے تعیین مدت کے ساتھ معاہدہ اس طور پر کیا ہے کہ وہ اس مدت کے بعد مزید خریداری نہ کرے گا تو درست ہوگا کیونکہ صاحب سرمایہ کو اختیار ہے کہ جب چاہے خریداری سے روک دے۔ لہٰذا جب اس نے خریداری سے

---

[1] ابن قدامہ :۔ المغنی جلد ۵ ص۱۸۶

[2] نووی : منہاج ص۶۹

[3] غزالی : کتاب الوجیز جلد ۱ ص۲۲۲

ممانعت کی شرط طے کی تو ایسی شرط طے کی جس کا اسے معاہدہ مضاربت کی رو سے پورا حق حاصل ہے یہ شرط صحت معاہدہ میں مانع نہ ہو گی۔[1]

یہ مسلک عملاً اس مسلک سے زیادہ مختلف نہیں جو حنبلی اور حنفی فقہاء نے اختیار کیا ہے۔ اگر اختتام معاہدہ کا وقت آگیا اور کچھ اشیاء فروخت ہونا باقی ہیں تو اس میں کسی کو اختلاف نہ ہوگا کہ کاروباری فریق کو ان اشیاء کو فروخت کا حق حاصل ہے حنفی اور حنبلی مسلک کے مطابق کاروباری فریق کو مدت آنے سے پہلے مزید مال خریدنا بند کرکے ایسے اقدامات کرنے چاہئیں کہ اختتام مدت پر کاروبار کا سرمایہ اشیاء کی فروخت کے ذریعے نقد کی صورت میں آجائے۔ شافعی فقہاء کے مذکورہ بالا مسلک کے مطابق بھی مدت پوری ہونے پر کاروباری فریق مزید مال خریدنا بند کر دے گا اور اب موجودہ مال فروخت کرکے حسابات صاف کرلینے کے علاوہ کوئی اور کام نہ رہ جائے گا۔

شرکت کے سلسلے میں شافعی فقہاء کا کوئی واضح بیان نہ مل سکا۔

مالکی فقہ میں بھی مضاربت کے لیے مدت کی تعیین جائز نہیں۔ موطا میں روایت کی گئی ہے کہ

امام مالک کہتے ہیں کہ جو شخص مضاربت پر سرمایہ حاصل کرے اس کے لیے یہ جائز نہیں کہ یہ شرط طے کرے کہ وہ چند برسوں تک اس سرمایے سے کاروبار کرے گا جس کے دوران اس سے یہ سرمایہ واپس نہ لیا جاسکے گا۔ صاحب سرمایہ کے لیے بھی درست نہیں کہ وہ یہ شرط طے کرے کہ تم (کاروباری فریق) اسے چند برسوں تک واپس نہیں کروگے۔ ایک ایسے وقت تک جسے وہ متعین کرلیں۔ کیونکہ مضاربت کا معاہدہ متعین مدت کے لیے نہیں ہوتا بلکہ (صحیح طریقہ یہ ہے کہ) صاحب سرمایہ سرمایہ اس شخص کے حوالے کر دے جسے اس کے ذریعے کاروبار کرنا ہے۔ پھر اگر دونوں میں سے کسی کی رائے یہ ہوتی ہے کہ معاہدہ ختم کردے اور ابھی سرمایہ نقد کی صورت میں موجود ہو اس سے کوئی چیز خریدی نہ گئی ہو تو وہ مضاربت ترک کرسکتا ہے اور مالک اپنا سرمایہ واپس لے لے گا۔ اگر اس سرمایہ سے اشیاء تجارت خریدی گئیں اور اس کے بعد صاحب سرمایہ کی رائے یہ ہوئی کہ وہ سرمایے کو واپس لے لے تو اسے اس وقت تک ایسا کرنے کا اختیار نہیں جب تک یہ اشیاء فروخت نہ ہو جائیں اور سرمایہ پھر نقد کی صورت نہ اختیار کرلے۔ اگر کاروباری فریق اسے واپس کرنا چاہتا ہے مگر سرمایہ اشیاء و اجناس کی صورت میں ہے تو وہ اس وقت

[1] ابو اسحٰق ابراہیم بن یوسف۔ کتاب المہذب جلد ۱ صفحہ ۳۹۰

تک ایسا نہیں کر سکتا جب تک انہیں فروخت کرکے نقدی کی شکل میں نہ واپس کرے جس شکل میں کہ اس سے اسے حاصل کیا تھا"۔ [1]

اس اصول کا اطلاق شرکت پر بھی ہوتا ہے، جیسا کہ ذیل کی عبارت سے واضح ہے۔

ایسی شرکت یا مضاربت جس میں کاروبار کے آغاز یا انتہا کے لیے وقت کی تعیین کر دی گئی ہو مثلاً آج کی تاریخ سے سال بھر کاروبار کرو، یا جب فلاں وقت آجائے تب کاروبار شروع کرنا، فاسد ہوگی کیونکہ اس میں مضاربت کے معروف طریقے کے خلاف ایک پابندی عائد کر دی گئی ہے"۔ [2]

تعیین مدت کو ناجائز قرار دینے کی دلیل مالکی فقہا نے یہ دی ہے کہ جیسا کہ خود امام مالک نے یہ لکھا ہے قرن اول کے مسلمانوں میں مضاربت کا معاہدہ معین مدت کے لیے نہیں کیا جاتا تھا۔ ہمیں اس دلیل کا وزن تسلیم کرنے سے انکار ہے، کیونکہ کسی طریقے کا نہ رائج ہونا اس کے غلط ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ کسی طریقے کو غلط قرار دینے کے لیے یہ بتانا ضروری ہے کہ اس میں کیا خرابی ہے یا وہ کس اصول سے ٹکراتا ہے۔ حنفی اور حنبلی فقہاء کے مسلک کے خلاف ہمیں کوئی وزنی دلیل نہ مل سکی۔ اس کے برعکس مالکی فقہاء کا یہ موقف کمزور معلوم ہوتا ہے کہ اگر فریقین راضی ہوں تو بھی وہ ایک متعین مدت کے لیے معاہدہ نہیں کر سکتے۔

جیسا کہ ایک حنبلی محقق نے لکھا ہے۔ اصول کا تقاضا یہی ہے کہ تعیین مدت کو جائز سمجھا جائے۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ ...... جس طرح وکالت (ایجنٹ بنانے) میں زمانی تحدید درست ہے اسی طرح مضاربت میں بھی درست ہے ...... مزید دلیل یہ ہے کہ صاحب سرمایہ ہر وقت یہ اختیار رکھتا ہے کہ اگر وہ اپنے سرمایے کے عوض اشیاء و اجناس واپس لینے پر تیار ہو تو کاروباری فریق کو جملہ کاروباری تصرفات سے روک دے۔ اب اگر وہ اس بات کو شرط کے طور پر طے کر لیتا ہے تو ایسی شرط کرتا ہے جو معاہدے کے منشا کے مطابق ہے۔ لہٰذا درست ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہوگا جیسے کہ وہ یہ کہے کہ جب سال پورا ہو جائے تو پھر تم کوئی چیز نہ خریدنا۔ اس کے درست ہونے کو سب نے تسلیم کیا ہے"۔ [3]

یہ ایک معقول بات ہے کہ اگر سرمایے کے مالک کو اس بات پر اصرار نہ ہو کہ اس کا سرمایہ نقدی کی صورت میں

---

[1] امام مالک: موطا، کتاب القراض، باب مالا یجوز من الشرط فی القراض

[2] احمد الدردیر: الشرح الصغیر جلد ۳ ص ۲۴۹

[3] احمد بن قدامہ المقدسی: الشرح الکبیر جلد ۵ ص ۱۶۱

واپس لانا چاہیے جبکہ وہ اس پر راضی ہو کہ اشیاء کے موجودہ نرخ کے مطابق کاروبار مضاربت کے نفع کی تعیین کر کے کاروباری فریق کا حساب صاف کر دیا جائے اور خود وہ اپنے سرمایہ کو اس شکل میں واپس لے جس شکل میں وہ عملاً موجود ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں کہ طے شدہ وقت پر معاہدہ ختم کر دیا جائے۔ مزید برآں جیسا کہ ہم گذشتہ بحث میں واضح کر چکے ہیں۔ اس بات کی پوری گنجائش ہے کہ معاہدہ وقت مقررہ پر ختم کرنے کی بجائے اتنے عرصے اور قائم رکھا جائے جتنے عرصے میں اشیاء کی فروخت عمل میں لا کر سرمایہ کو نقد کی صورت میں منتقل کیا جا سکتا ہو۔

ہمارے نزدیک تعیین مدت کے سلسلے میں وہی مسلک زیادہ صحیح اور قابل ترجیح ہے جو حنفی اور حنبلی فقہاء نے اختیار کیا ہے۔ جیسا کہ ہم نے اوپر واضح کیا ہے۔ شافعی فقہاء کی رائے بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔

متعینہ مدت سے پہلے کاروبار ختم کرنے کا اختیار

مذکورہ بالا دسویں اصول کے مطابق تمام فقہاء کے نزدیک تعیین مدت کی صورت میں بھی ہر فریق کو ہر وقت معاہدہ ختم کرنے کا اختیار رہے گا۔ حنبلی اور مالکی فقہاء کے مذکورہ بالا اقتباسات میں اس کی صراحت بھی ملتی ہے کہ اگر فریقین وقت مقررہ سے پہلے معاہدہ نہ ختم کر سکنا از روئے معاہدہ لازم کر لیں تو معاہدہ فاسد ہو جائے گا۔ ہماری رائے یہ ہے کہ تجارتی کاروبار اور صنعتی کاروبار کی نوعیت میں جو اصولی فرق ہے اس کے پیش نظر اس مسئلے پر از سر نو غور کرنے کی ضرورت ہے ــــ اس حقیقت کے پیش نظر اس مسئلے پر از سر نو غور کرنے کی پوری گنجائش بھی ہے کہ فقہاء کی اس متفقہ رائے کی بنیاد قرآن و سنت کی کوئی نص صریح نہیں بلکہ شرکا ر کاروبار کے مصالح ہیں، نیز ان کی آزادی کاروبار کے برقرار رکھنے کے لیے یہ موقف اختیار کیا گیا ہے، جیسا کہ ان فقہاء کے اس استدلال سے واضح ہے جو انھوں نے یہ اصول بیان کرتے وقت پیش رکھا ہے۔ دوسرے مسائل میں جہاں مصالح کا تقاضا دوسرا تھا، انھوں نے اس لیے مختلف رائے اختیار کی ہے۔ اس کی ایک واضح مثال مزارعت اور مساقاۃ کے معاہدے ہیں۔ زرعی کاروبار کی نوعیت اس بات کی متقاضی ہے کہ اگر یہ کاروبار مشترکہ طور پر کیا جا رہا ہو تو ایک بار معاہدہ کر لینے کے بعد اس وقت تک اسے ختم نہ کیا جائے جب تک فصل تیار ہو کر قابل فروخت نہ ہو جائے۔ اسی لیے تمام فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ مزارعت کا معاہدہ ایک لازم معاہدہ ہے جو تکمیلِ زراعت سے پہلے ختم نہیں کیا جا سکتا۔

صنعتی کاروبار کی نوعیت بھی ایک حد تک ایسی ہی ہے۔ اگر ایک کاروباری فریق کو کسی صاحب سرمایہ نے

کارخانہ قائم کرکے مصنوعات کی تیاری اور فروخت کے ذریعے نفع کمانے کے لیے مضاربت کے اصول پر سرمایہ دیا ہو تو کاروباری فریق کو یہ اطمینان ہونا چاہیے کہ پیداواری عمل کی تکمیل سے پہلے یہ معاہدہ ختم نہیں کیا جائے گا۔ اگر مضاربت سے متعلق قوانین میں اس کی رعایت نہیں ملحوظ رکھی گئی تو صنعتی کاروبار کے لیے مضاربت کے اصول پر سرمایہ حاصل کرنے کا امکان بہت کم رہ جائے گا۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ پیداواری عمل کی تکمیل سے پہلے معاہدہ ختم کرنے میں کاروباری فریق کے ساتھ انصاف برتنے کا امکان کم ہوجائے گا اور اکثر اوقات یہ اقدام صاحب سرمایہ کے لیے بھی نقصان دہ ہوگا۔

دور جدید میں اکثر کاروبار صنعتی نوعیت کے کاروبار ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں مناسب ہوگا کہ متعین مدت کے لیے شرکت اور مضاربت کے معاہدے کرنے کے ساتھ اس بات کو بھی جائز قرار دیا جائے کہ اس مدت کے ختم ہونے سے پہلے کسی ایک فریق کو معاہدہ ختم کرنے کا اختیار نہ ہوگا۔ البتہ تمام فریق راضی ہوں تو ایسا کیا جاسکے گا۔ اس رائے کو اختیار کرلینے کے بعد یہ ممکن ہوجائے گا کہ شرکت اور مضاربت کے اصولوں پر صنعتی کاروبار منظم کیا جاسکے۔ اس کو رد کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ صنعتی کاروبار صرف ذاتی سرمایہ سے کیے جاسکیں گے۔ کیونکہ سود کی حرمت کے بعد نفع آور کاروبار میں متعدد اصحاب سرمایہ کے سرمایوں کا لگایا جانا شرکت اور مضاربت کے اصولوں پر ہی ممکن ہے۔

جدید معیشت سے ابتدائی درجے کی واقفیت بھی یہ سمجھنے کے لیے کافی ہے کہ صنعتی کاروبار کے لیے جتنے بڑے پیمانے پر کاروبار کرنے اور جتنا کثیر سرمایہ یک جا کرکے ایک کاروبار میں لگانے کی ضرورت ہے۔ نزدہ انفرادی وسائل کے بل بوتے پر نہیں ممکن ہوسکتا۔ اس کے لیے متعدد اصحاب سرمایہ کا اشتراک ضروری ہے۔ باہمی رضامندی سے طے کرنا کہ جب تک شریک ایک متعین مدت سے پہلے مشترکہ کاروبار سے علیحدگی نہ اختیار کرے گا شریعت کے کسی اصول سے نہیں ٹکراتا۔ اس سے شرکا رکار کی آزادی کاروبار ضرور محدود ہوتی ہے لیکن ہر فرد کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنی کاروباری آزادی کو کسی معاہدے کے ذریعے پابند کرلے۔ جو کسی کاشتکار کو زمین اور بیج یا آلات زراعت فراہم کرکے اس کا ساتھ مزارعت کا معاہدہ کرتا ہے وہ چند مہینوں کے لیے اس زمین اور اس سرمایہ پر جو آلات زراعت یا بیج کی فراہمی لگایا گیا ہے تصرف سے محروم ہوجاتا ہے لیکن یہ خود عائد کردہ پابندی معاہدۂ مزارعت کو ناجائز نہیں قرار دے دیتی۔ اس طرح اگر ایک کارخانہ دار کو ایک صاحب سرمایہ مضاربت کے اصول پر ایک

سال کے لیے سرمایہ فراہم کرتا ہے اور خود کو سال بھر تک اس سرمایہ پر تصرف سے محروم کر لیتا ہے تو اس سے یہ معاہدۂ مضاربت ناجائز نہیں ہو جانا چاہیے ۔

جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا ہے ۔ ضرورت ہے کہ فقہ اسلامی کے ماہرین اور اسلامی معاشیات کے طلبہ زیر غور مسئلے پر ایک جدید حالات کو سامنے رکھ کر از سر نو رائے قائم کریں ۔ ہمارے نزدیک یہ رائے یہ ہونی چاہیے کہ شرکت اور مضاربت کے معاہدے اس شرط کے ساتھ بھی کیے جا سکتے ہیں کہ ایک متعین مدت تک کسی فریق کو معاہدہ ختم کرنے کا اختیار نہ ہوگا ۔

یہ رائے تجویز کرنے کے باوجود ہم دسویں اصول کو علیٰ حالہ برقرار رکھیں گے ۔ ہمارا موقف یہ ہوگا کہ جب تک معاہدۂ مضاربت میں صراحت کے ساتھ یہ شرط نہ طے کی جائے کہ ایک متعین مدت تک کے لیے ہر فریق معاہدۂ ختم کرنے کے اس اختیار سے دست بردار ہوتا ہے جو اسے حاصل تھا تب تک ہر فریق کے اختیارات وہی ہوں گے جو دسویں اصول میں بیان کیے گئے ہیں، یعنی اسے کسی وقت بھی معاہدہ ختم کر دینے کا اختیار ہوگا۔

شرائط ایجنسی

۱۔ ایجنسی کم سے کم پانچ پرچوں پر دی جائے گی ۔

۲۔ ۔ رقم ایڈوانس جمع کرنے ہوں گے ۔

۳۔ ۵ سے ۵۰ پرچوں تک 25٪ کمیشن دیا جائے گا ۔ البتہ ۵۰ سے زائد رسالوں پر کمیشن 33٪ دیا جائے گا ۔

۴۔ رسائل کی روانگی کا خرچ دفتر برداشت کرے گا ۔ رجسٹری اور وی پی کا خرچ ایجنٹ صاحبان کے ذمے ہوگا ۔

۵۔ ہر مہینے کا بل باقاعدگی سے ادا کرنا چاہیے ۔

منیجر رسالہ زندگی رام پور ۔ یوپی

وہ لوگ جن کو خدا کا دین ملتا ہے

(مولانا سید جلال الدین عمری)

اس دنیا میں کچھ لوگوں کو خدا کا دین ملتا ہے اور کچھ لوگ اس سے محروم ہوتے ہیں۔ آج کے دور میں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ حالانکہ کسی کو خدا کے دین کے ملنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ کامیاب ہے اور کسی کے اس دین سے محروم ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ ناکام ہے۔ اتنا بڑا واقعہ انسان کی زندگی میں بخت و اتفاق سے نہیں پیش آتا بلکہ یہ اس کا اپنا ارادہ اور فیصلہ ہے جو اس کو خدا کے دین سے قریب یا دور کرتا ہے۔ جن لوگوں پر خدا کے دین کی حقیقت کھلتی ہے اور جو آگے بڑھ کر اس کو قبول کرتے ہیں ان میں کچھ خصوصیات ہوتی ہیں جو ان کو دین سے الگ رہنے نہیں دیتیں اور دین ان کے لیے اس قدر ضروری ہو جاتا ہے کہ اس کے بغیر وہ زندگی کا تصور ہی نہیں کر سکتے۔ یہاں ہم ان ہی خصوصیات کو قرآن کی روشنی میں بیان کرنا چاہتے ہیں

صحیح الفطرت انسان۔ خدا کا دین انسان کی فطرت کے عین مطابق ہے۔ وہ فطرتاً جن چیزوں کو پسند کرتا ہے وہ خدا کے دین میں بھی پسندیدہ ہیں اور جن چیزوں کو اس کی فطرت ناپسند کرتی ہے وہ خدا کے دین میں بھی ناپسندیدہ ہیں۔ خدا کا دین اس سے کوئی ایسی چیز نہیں چاہتا جو اس کے لیے نامانوس ہو اور جس کے قبول کرنے سے اس کی فطرت انکار کرے۔ خدا کے دین کو ماننا حقیقت میں انسان کا اپنی فطرت کے مطالبات کو ماننا ہے۔ اسی وجہ سے قرآن میں کہا گیا ہے:-

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا	پس تم یکسو ہو کر اپنا رخ (خدا کے) دین
فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا	کی طرف کیے رہو۔ اس فطرت پر جم جاؤ جس
لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ	پر اللہ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی
الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ	تخلیق میں کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ یہی دین

لَا يَعْلَمُونَ (الروم: ۳۰) قیم ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ہیں

دین کی حقیقت کو اگر ہم دو لفظوں میں بیان کرنا چاہیں تو اسے توحید اور عدل کہہ سکتے ہیں۔ توحید کے معنیٰ ہیں خدا کو ماننا، اس کی ذات و صفات میں کسی دوسرے کو شریک نہ قرار دینا اور صرف اسی کی عبادت کرنا۔ عدل کا مطلب ہے لوگوں کے ساتھ معاملات میں افراط و تفریط سے بچنا اور انصاف پر قائم رہنا۔ یہ دونوں باتیں انسان کی فطرت میں داخل ہیں لیکن فطرت کا بگاڑ اس کو ان کے قبول کرنے سے روکتا ہے۔

انسان کی ذات کے اندر اور باہر کی دنیا میں بہت سے ایسے اسباب ہیں جو اس کی فطرت کو مسخ کر دیتے ہیں۔ اگر یہ اسباب نہ ہوں تو خدا کا انکار یا اس کے ساتھ شرک اس کے لیے ممکن نہیں ہے اسی طرح طبعاً ظلم و زیادتی اس کو ناپسند ہے لیکن غلط عوامل اس کو عدل و انصاف کی راہ سے پھیر دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک انسان اپنی فطرت کو دبا نہ دے خدا کے دین اور اس کی تعلیمات کو رد نہیں کر سکتا۔ وہ اسی طرح اس کی طرف بڑھے گا جس طرح پیاسا پانی کی طرف بڑھتا ہے۔

اگر انسان کی فطرت صحیح حالت میں ہے تو یہی نہیں کہ دین کو قبول کرنے میں اسے کوئی تامل نہیں ہوتا بلکہ وہ دین کا مبلغ اور ترجمان بن کر ابھرتا ہے۔ کیونکہ صحیح الفطرت انسان کے لیے خدا کے دین کے علاوہ کسی نظریے پر مطمئن ہونا اور اپنے ماحول کے اندر اس سے انحراف اور بغاوت کو برداشت کرنا ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم کے بارے میں قرآن کہتا ہے۔

إِذْ جَاءَ رَبَّهُ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ ۝
إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ مَاذَا تَعْبُدُونَ ۝
أَئِفْكًا آلِهَةً دُونَ اللَّهِ تُرِيدُونَ ۝
فَمَا ظَنُّكُمْ بِرَبِّ
الْعَالَمِينَ ۝
(الصفت: ۸۴-۸۷)

جس وقت وہ اپنے رب کے پاس قلب سلیم کے ساتھ آیا (اور) جب اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا کہ یہ کیا چیز ہے جس کی تم عبادت کرتے ہو، کیا محض جھوٹ گھڑ لیا ہے جو خدا کے سوا دوسرے معبودوں کو چاہتے ہو تو تمہارا اللہ رب العٰلمین کے بارے میں کیا خیال ہے۔

اس کے بعد قرآن نے معبودان باطل پر ان کی تنقید اور اس راہ میں ان کی استقامت اور قربانی کا ذکر کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ یہی چیز انسان کی کامیابی کا ذریعہ ہے۔

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ۝ إِلَّا مَنْ أَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ۝ (الشعراء: ۸۸، ۸۹)

اس دن نہ مال کام آئے گا اور نہ اولاد۔ ہاں صرف اس شخص کو نجات ملے گی جو قلب سلیم کے ساتھ خدا کے حضور میں حاضر ہوگا۔

جو غور و فکر کرتے ہیں

جو شخص دین کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش کرے اس کا دین تک پہنچنا آسان ہے اور جس کو یہ کوشش ہی ناگوار گزرے اسے دین خود بخود نہیں مل سکتا۔ اسی لیے قرآن کا مطالبہ ہے۔

وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَأَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ (الاعراف: ۲۰۴)

جب قرآن پڑھا جائے تو توجہ سے سنو اور خاموش رہو (اس سے) امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے۔

خدا کا دین کوئی افسانہ یا بے حقیقت چیز نہیں ہے جسے نظر انداز کر دیا جائے بلکہ اس میں غور و فکر کے لیے بڑا سامان ہے۔ وہ اپنی صداقت کا محض دعوے نہیں کرتا بلکہ اس پر بہت ہی مضبوط دلائل فراہم کرتا ہے اور ان پر غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔

كِتٰبٌ أَنْزَلْنٰهُ إِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ أُولُوا الْأَلْبَابِ ۝ (ص: ۲۹)

یہ کتاب جو ہم نے تم پر نازل کی ہے بڑی برکت والی ہے تاکہ یہ لوگ اس کی آیتوں میں تدبر کریں اور عقل والے اس سے نصیحت حاصل کریں۔

خدا کے دین پر غور و فکر سے انسان پر اس کی عظمت کھلتی ہے اور وہ اس سے قریب ہوتا ہے۔ جو لوگ دین کی مخالفت کرتے ہیں ان کا سب سے بڑا مرض یہ ہے کہ وہ اس پر غور نہیں کرتے۔ ان کو اندازہ ہی نہیں ہے کہ وہ کتنی بڑی حقیقت کو جھٹلا رہے ہیں۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ کسی سوجھ بوجھ والے انسان کے لیے اس کا انکار ممکن نہیں ہے۔ اس کا انکار تو انسان اسی وقت کر سکتا ہے جب کہ وہ غور و فکر ہی کے لیے آمادہ نہ ہو یا پہلے سے نہ ماننے کا فیصلہ کر چکا ہو۔ قرآن حیرت کے ساتھ پوچھتا ہے کہ عقل خدا کے دین کو ماننے کی دعوت دیتی ہے اور لوگ اس کو جھٹلا رہے ہیں آخر اس کی وجہ کیا ہے؟

أَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ أَمْ

کیا وہ قرآن پر غور نہیں کرتے یا دلوں کے

عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (محمد: ۲۴) ان کے قفل چڑھے ہوئے ہیں

انسانی علم کی جہاں تک رسائی ہے خدا کا دین اس کے عین مطابق ہے۔ انسان نے آج تک کوئی ایسی چیز دریافت نہیں کی جو دین اور اس کی تعلیمات کی تردید کرتی ہو۔ اسی وجہ سے قرآن کہتا ہے کہ اصحابِ علم والوں کو دین کے ماننے میں کوئی فکری الجھن نہیں پیش آتی۔ وہ بخوشی اسے قبول کرتے ہیں اور اس کے حق ہونے کی گواہی دیتے ہیں۔

وَيَرَى الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ هُوَ الْحَقَّ (سبا: ۶)

جن لوگوں کو علم دیا گیا ہے وہ جانتے ہیں کہ جو دین تم پر تمہارے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے وہ حق ہے۔

خدا کا دین کوئی پیچیدہ فلسفہ نہیں ہے جس کے سمجھنے کے لیے عقل و خرد کی بہت بڑی مقدار مطلوب ہو بلکہ وہ کتابِ مبین کی شکل میں نازل ہوا ہے اسے دیکھ کر ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ وہ کیا چاہتا ہے اور کیا نہیں چاہتا۔ اس کے نزدیک انسان کی صحیح حیثیت اور اس کی نجات کی سبیل کیا ہے؟ وہ زندگی کا کون سا راستہ تجویز کرتا ہے اور کیا بیانی وناکامی کے کیا اسباب بیان کرتا ہے؟ ان حقیقتوں کے اظہار میں اس نے کوئی ابہام نہیں رکھا ہے بلکہ کھول کھول کر صاف اور سیدھی زبان میں بیان کر دیا ہے۔ اس لیے ہر شخص اپنی ذہنی صلاحیت کے لحاظ سے اسے سمجھ بھی سکتا ہے اور اس سے فائدہ بھی اٹھا سکتا ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا (الکہف: ۱)

سب تعریف خدا کے لیے ہے جس نے اپنے بندے پر یہ کتاب نازل کی اور اس میں کوئی کجی نہیں رکھی۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا کے دین نے اپنے آپ کو انسان کے سامنے اس طرح پیش کر دیا ہے کہ جو شخص فی الواقع اس کو سمجھنا چاہے اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ اب یہ اس کا اپنا کام ہے کہ دین کو سمجھنے کی کوشش کرے یا اپنی عقل کو اس سے ہٹا کر کسی اور کام میں لگا دے۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (القمر: ۱۷)

ہم نے قرآن کو آسان کر دیا ہے تاکہ لوگ اس سے نصیحت حاصل کریں بس ہے کوئی جو اس سے نصیحت حاصل کرے۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ خدا کے دین پر غور و فکر کرنے والا ہر شخص اس کو پا نہیں لیتا، بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ انسان ہر طرح کے تعصبات سے بلند ہو اور صاف ذہن سے اس پر سوچے۔ انسان کو جس چیز سے تعصب ہو اس کے علاوہ کوئی اور چیز نظر نہیں آتی۔ اسے دین کی حقانیت پر اگر یقین آ بھی جائے تو اس کے قبول کرنے کے لیے اس کے دل کے دروازے نہیں کھلتے۔ چھٹی صدی عیسوی میں خدا کے دین کے ساتھ بنی اسرائیل کا رویہ اس کی گواہی دیتا ہے۔ وہ خدا کے دین کو اس طرح پہچانتے تھے جس طرح باپ اپنے بچے کو پہچانتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کی اکثریت نے محض اس وجہ سے اسے قبول نہیں کیا کہ اس کا پیش کرنے والا ان کی قوم کا فرد نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ان میں وہ لوگ بھی تھے جن کے نزدیک خدا کا دین قوم و وطن اور حسب و نسب سب سے اونچا تھا۔ جب ان کے سامنے خدا کا دین آیا تو پکار اٹھے کہ یہی حق ہے اور بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ دعا کرنے لگے کہ خدایا ہماری اس شہادت کو قبول فرما اور ہمیں ان لوگوں میں جگہ دے جنھوں نے تیرے دین کی گواہی دی۔

وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى	جب وہ اس کلام کو سنتے ہیں جو رسول پر
الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ	نازل کیا گیا ہے تو تم دیکھو گے کہ حق کو پہچاننے کی
مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ يَقُوْلُوْنَ	وجہ سے ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں اور وہ
رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ	کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم ایمان لائے پس
(المائدہ ۵: ۸۲)	ہمیں بھی گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔

بعض چیزیں خدا کے دین پر غور و فکر کی راہ میں رکاوٹ بھی بنتی ہیں۔ چنانچہ دنیا کی محبت اور یہاں کی آسائش کی فکر انسان کے اوقات اور اس کی صلاحیتوں کو اس سے چھین لیتی ہے اور اسے اس بات کا موقع نہیں دیتی کہ وہ دین کو اپنے فکر کا موضوع بنائے اور یکسوئی کے ساتھ اس پر غور کرے۔ اسی طرح اقتدار کا نشہ دین پر غور و فکر کی راہ میں ایک حجاب ہے۔ جب تک یہ نشہ دور نہ ہو دین کی طرف انسان کی توجہ نہیں ہوتی۔ ان کے علاوہ اور بھی اسباب ہیں جو انسان کو دین پر غور و فکر سے روکتے ہیں لیکن اگر انسان میں حق کو دیکھنے اور پہچاننے اور سمجھنے کی صلاحیت ہے تو وہ ان تمام اسباب کو ہٹا کر اس طرح دین کی طرف بڑھتا ہے جیسے ان میں سے کوئی بھی سبب اس کی راہ کی رکاوٹ نہیں تھا۔ اسی صلاحیت نے ملکہ سبا کو دین کے قبول کرنے پر آمادہ کیا اور وہ ایمان لے آئی۔ اس کے برعکس اس صلاحیت کے نہ ہونے کی وجہ سے فرعون اس گھمنڈ میں پڑا رہا کہ میں ہی سب

بتا رہا ہوں۔ اس لیے کسی کے سامنے سر جھکانا میری توہین ہے۔ اسی حقیقت کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ	تم مردوں کو سنا نہیں سکتے اور نہ بہروں کو
الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ	سنا سکتے ہو (اور وہ بھی) جب کہ وہ پیٹھ پھیر کر
وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِى الْعُمْىِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ	بھاگ رہے ہوں اور نہ تم اندھوں کو راستہ بتا کر
اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا	بھٹکنے سے بچا سکتے ہو۔ تم تو صرف ان لوگوں کو سنا سکتے
فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ○	ہو جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں اور پھر
(النمل: ۸۱-۸۰)	فرماں بردار بن جاتے ہیں۔

"تم تو صرف ان لوگوں کو سنا سکتے ہو جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں" کا مطلب اس وقت واضح ہوگا جبکہ آپ اسے اوپر کے جملوں کی روشنی میں دیکھیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہی لوگ تمہاری بات سنیں گے اور خدا کے دین پر ایمان لائیں گے جن میں حق کو سننے اور قبول کرنے کی صلاحیت ہے جن کے دل زندہ اور ضمیر بیدار ہیں، جو خدا کا کلام سن کر اپنے کانوں میں انگلیاں نہیں ٹھونس لیتے۔ بلکہ اس کو توجہ سے سنتے ہیں اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس صلاحیت کو قرآن نے زندگی اور حیات سے تعبیر کیا ہے۔ اگر یہ زندگی ہے تو خدا کا دین ملتا ہے ورنہ انسان چلتی پھرتی میت ہے اور مردوں کو سنانا خدا کے پیغمبر کے بس میں بھی نہیں ہے۔

لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّ	تاکہ ڈرائے اس شخص کو جو زندہ ہے اور
يَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ○ (یٰس: ۷۰)	کافروں پر حجت تمام ہو جائے۔

عبرت حاصل کرنے والے خدا کے دین کو رد کرنا اس کے عذاب کو دعوت دینا ہے۔ جن قوموں نے اسے ٹھکرایا، وہ بالکل تباہ ہوگئیں اور دنیا کی کوئی قوت انہیں بچا نہ سکی۔ جس شخص کے اندر تاریخ کے اس واقعہ سے عبرت حاصل کرنے کی صلاحیت ہوگی۔ وہ کبھی یہ جرأت نہیں کر سکتا کہ خدا کے دین کو رد کر دے۔ جب بھی دین کی آواز اس کے کان میں پہنچے گی وہ تیزی سے اس کی طرف لپکے گا اور بخوشی اسے قبول کرے گا۔ سورۂ قٓ میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ	ہم نے ان سے پہلے کتنی ایسی قوموں کو ہلاک
مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا	کر دیا جو (اپنی) پکڑ میں ان سے زیادہ سخت تھیں
فَنَقَّبُوْا فِى الْبِلَادِ هَلْ مِنْ مَّحِيْصٍ	(جب ان پر خدا کا عذاب آیا تو) انھوں نے

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَذِكْرَىٰ لِمَن كَانَ لَهُ قَلْبٌ أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ ۝ ٢٧-٢٦

شہروں کو چھان مارا کہ کہیں کوئی جائے پناہ ہے؟ (لیکن ان کو کوئی پناہ نہ ملی) یقیناً اس میں نصیحت ہے۔ اس شخص کے لیے جس کے (سینے میں زندہ) دل ہو یا جو کان لگا کر حضور قلب کے ساتھ بات سنے۔

ہر انسان فطرتاً نجات کا طالب ہے۔ کوئی بھی شخص ہلاک ہونا نہیں چاہتا۔ اس لیے اسے تاریخ کی تنبیہات سے سبق حاصل کرنا چاہیے لیکن بعض اوقات انسان پر غفلت اور بے حسی طاری ہو جاتی ہے۔ وہ ان تنبیہات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا اور ہلاکت سے بچنے کی خواہش کے باوجود ہلاکت ہی کی راہ پر بڑھتا چلا جاتا ہے — آخر ایک دن دین کی مخالفت کرنے والے بے شمار انسانوں کی طرح خود بھی بعد والوں کے لیے عبرت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

وَكَأَيِّن مِّن قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَقَصْرٍ مَّشِيدٍ ۝ أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا أَوْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ (الحج: ۴۶-۴۵)

کتنی ہی بستیاں ہیں کہ جب انھوں نے ظلم کی روش اختیار کی تو ہم نے ان کو ہلاک کر دیا اور اب وہ اپنی چھتوں پر الٹی پڑی ہیں اور کتنے کنوئیں بے کار پڑے ہیں اور کتنے ہی مضبوط محل (ویران ہو چکے ہیں) تو کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ ان کے ایسے دل ہوتے جو سمجھتے ہیں اور ایسے کان ہوتے جو سنتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔

دین کے طالب

خدا کا دین اس شخص کو ملتا ہے جو اسے چاہے جس شخص کے اندر دین کی طلب ہی نہ ہو وہ اس سے محروم رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس معاملے میں اپنا قانون صاف الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔

يَهْدِي إِلَيْهِ مَن يُنِيبُ ۝ (الرعد: ۲۷)

وہ اپنے دین تک پہنچنے کا راستہ اسی شخص کو دکھاتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرے۔

خدا کے دین کے بغیر زندگی میں اتنا زبردست خلا پیدا ہو جاتا ہے کہ اگر انسان بے حس زندگی گزارنے کا عادی نہیں ہے تو اس کو دین کی طلب میں اس سے زیادہ بے چین ہونا چاہیے جتنی بے چین پانی کے لیے مچھلی ہوتی ہے۔ کیونکہ جن پہلوؤں سے خلا پیدا ہوتا ہے اس کو خدا کا دین ہی پُر کر سکتا ہے کسی اور ذریعے سے اس کا پر ہونا ممکن نہیں ہے۔ ان میں سے بعض پہلوؤں کی طرف ہم اشارہ کر رہے ہیں۔

(۱) ہر انسان یہ جاننا چاہتا ہے کہ اس کا کوئی خالق و مالک اور حاکم و معبود ہے یا نہیں اور اگر ہے تو اس سے اس کے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ خدا کا دین اس سوال کا اس قدر صحیح اور اطمینان بخش جواب دیتا ہے کہ اگر انسان میں کسی نظریے کے اچھے اور برے پہلوؤں پر غور و فکر کی صلاحیت ہے تو وہ بے اختیار پکار اٹھے گا کہ یہی حق ہے اور اسی کی مجھے تلاش ہے۔

(۲) انسان کو قانون کی ضرورت ہے۔ اس ضرورت کو اس نے جب بھی خود سے پورا کرنا چاہا، سخت ناکام رہا۔ اس کا بنایا ہوا ہر قانون توازن اور اعتدال سے محروم ہوتا ہے۔ اس میں ایک چیز کی رعایت پائی جاتی ہے تو دوسری چیز کا وجود ہی غائب ہوتا ہے۔ اس کے برعکس خدا کا دین ہمیں ایسا قانون دیتا ہے جو افراط و تفریط سے پاک اور بے حد متوازن ہے۔ اگر انسان اپنے بنائے ہوئے غیر معتدل قوانین کا اس سے مقابلہ کرے گا تو اس کا دل از خود گواہی دے گا کہ یہ کسی انسان کا مرتب کردہ نہیں ہے بلکہ خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ اس کے باوجود اگر دین کی طلب اس کے اندر پیدا ہو نہیں ہو رہی ہے تو اس دنیا میں کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے کہ دین خود بخود اس کے سینے میں اتر جائے۔

(۳) موت ایک ننگی تلوار ہے جو ہر شخص کے سر پر لٹک رہی ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ موت کب آئے گی اور کب مدت حیات ختم ہو جائے گی۔ موت کے بعد کیا ہوگا؟ یہ ایک اہم سوال ہے جو ہر سوچنے سمجھنے والے انسان کو پریشان کیے ہوئے ہے۔ وہ جاننا چاہتا ہے کہ موت کے بعد کوئی خطرہ تو نہیں ہے تاکہ وہ سکون اور اطمینان کے ساتھ زندگی کی یہ تھوڑی سی مہلت جو اسے حاصل ہے گزار سکے اور اگر کوئی خطرہ ہے تو اس سے محفوظ رہنے کی تدبیر کیا ہے؟ خدا کا دین اسے بتاتا ہے کہ موت کے بعد یا تو وہ ہمیشہ کے لیے کامیاب قرار پائے گا، یا اس کی ابدی ناکامی کا فیصلہ ہوگا۔ کامیاب وہ ہوں گے جو اس کو قبول کریں گے اور جو اس کو رد کریں گے وہ ناکامی سے کسی طرح اپنے آپ کو بچا نہیں سکتے۔ اس حقیقت کو اس نے بار بار اتنے زوردار طریقے سے اور اتنی قوت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ انسان

کے لیے ممکن نہیں ہے کہ اس سے صرف نظر کرے۔

یہ ہیں وہ اسباب جن کی وجہ سے انسان کے اندر لازماً دین کی طلب پیدا ہونی چاہیے جس شخص میں یہ طلب پائی جائے خدا کا دین اسے یقیناً ملے گا۔ کیونکہ جو شخص خدا سے اس کا دین مانگے گا یہ اس کی رحمت سے بعید ہے کہ وہ اسے بے دینی میں پڑا رہنے دے اور اسی حال میں اس دنیا سے اٹھالے۔

جن میں ہمت ہوتی ہے

خدا کا دین اس شخص کو ملتا ہے جس کے اندر حق کے لیے باطل سے لڑنے کی جرأت ہو۔ جو اس بات کے لیے تیار رہو کہ خدا کے دین کے سامنے آنے کے بعد ہر قیمت پر اسے قبول کرے گا۔ جو دین کی خاطر بڑے سے بڑے اعزاز اور بڑی سے بڑی دولت کو قربان کر سکے۔ اور جس میں یہ عزم و حوصلہ ہو کہ خدا کا دین اس سے اس کی جان بھی مانگے تو بخوشی اسے نذر کر دے۔ عزم و ہمت ہو تو خدا تعالیٰ ایک معمولی انسان کو بھی اپنے دین کا حامل بنا دیتا ہے۔ اور اگر ہمت ہی نہیں ہے تو بڑے بڑے مفکر اور شاہان وقت بھی اس کے حق دار نہیں قرار پاتے۔ اس کی مثال ہمیں ان جادوگروں میں ملتی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں آگئے تھے۔ فرعون نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ اپنے کرتب کے ذریعے حضرت موسیٰ پر غالب آگئے تو وہ اس کے دربار کے مقرب ہوں گے لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ حضرت موسیٰ جادوگر نہیں ہیں بلکہ داعی حق اور خدا کے پیغمبر ہیں تو فوراً ان کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ ایمان لے آئے۔ حالانکہ وہ جانتے تھے کہ ان کا یہ اقدام ان کو فرعون کے غضب کا نشانہ بنا دے گا۔ لیکن انھوں نے اس کی پرواہ نہیں کی اور ہر مشکل کو برداشت کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ چنانچہ فرعون نے جب ان کو دھمکی دی کہ میں پہلے تمہارے ہاتھ پیر کاٹوں گا اور پھر تختہ دار پر لٹکاؤں گا تو انھوں نے وہی جواب دیا جو ہر صاحبِ ایمان کو دینا چاہیے۔

لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰی مَا جَآءَنَا	یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ جو کھلی دلیلیں ہمارے
مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالَّذِيْ فَطَرَنَا فَاقْضِ	سامنے آئی ہیں اور جس خدا نے ہمیں پیدا کیا
مَآ اَنْتَ قَاضٍ اِنَّمَا تَقْضِيْ	ہے اس کے مقابلہ میں تجھ کو ہم ترجیح دیں
هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا اِنَّآ اٰمَنَّا	تجھے جو کچھ کرنا ہے کر لے۔ تو دنیا کی اسی زندگی
بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَمَآ	پر اپنا حکم چلا سکتا ہے۔ ہم تو اپنے رب پر

اٰثَرَهُمْ نَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ایمان لے آئے تاکہ وہ معاف کرے ہمارے
وَاللّٰهُ خَيْرٌ وَّ گناہوں کو اور اس جادوگری کو جس پر تو نے
اَبْقٰى ○ ہمیں مجبور کیا تھا اور اللہ بہتر ہے اور باقی رہنے والا ہے

(طٰہٰ: ۷۳-۷۲)

خدا کا دین اس طرح سامنے آتا ہے کہ کم ہمت انسان اسے دیکھ کر کانپ اٹھتا ہے۔ قرآن کے الفاظ میں جو لوگ یہ کہتے ہوں کہ "اگر ہم تمہارے ساتھ اس ہدایت کی اتباع کریں تو اپنی اس زمین سے نکال دیے جائیں گے"۔ ان کا خدا کے دین کو قبول کرنا آسان نہیں ہے۔ وہ سکون اور اطمینان چاہتے ہیں اور خدا کا دین ان لوگوں کو ملتا ہے جو خطرات کا سامنا کر سکتے ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا کے دین کا استقبال ہمیشہ ان باہمت نفوس نے کیا ہے اور اب بھی وہی کر سکتے ہیں جن کو اس کے سوا کسی چیز کے پانے یا کھونے کی فکر نہیں ہوتی۔ بے ہمت انسان کو اپنی ہر متاعِ حقیر بہت بڑا سرمایہ معلوم ہوتی ہے۔ وہ اس سرمایہ کو نہ کھوئے گا اور نہ خدا کا دین اسے نصیب ہوگا۔
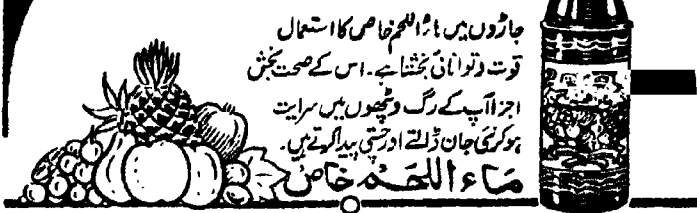
آنکھوں کی وصیّت

سیّد احمد قادری

پاکستان سے ایک صاحب علم لکھتے ہیں:۔

"ہمارے پاکستان میں اعضائے انسانی کے عطیے اور وصیت پر عمل شروع ہوگیا ہے اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک آدمی مرتے وقت وصیت کرجاتا ہے کہ میرے مرنے کے بعد میری آنکھیں نکال کر دوسرے کسی کے یا فلاں مخصوص آدمی کے لگادی جائیں۔ آنکھوں کے علاوہ دوسرے اعضاء کے بارے میں بھی اس طرح کی وصیت کی جارہی ہے۔ کیا یہ وصیت شرعاً جائز ہوگی؟ اور کیا مرنے کے بعد کسی مسلمان کی آنکھیں نکال کر یا کوئی عضو کاٹ کر اس طرح کا استفادہ جائز ہوگا؟ پاکستان میں کچھ اہل علم حضرات اس مسئلے پر غور و فکر کر رہے ہیں لیکن ابھی کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکے ہیں۔ گزارش ہے کہ اس مسئلے پر گہری نظر ڈال کر آپ اپنی رائے ظاہر کریں۔ یہ اظہار زندگی کے صفحات میں مناسب ہوگا' تاکہ دوسرے لوگ بھی پڑھ سکیں۔

ماہنامہ زندگی جلد ۳۶ شمارہ ۲، فروری ۱۹۶۶ء میں شام کے مشہور فقیہ شیخ مصطفےٰ الزرقا کے ایک مضمون کا ترجمہ ابوالمکارم رامپوری کے قلم سے شائع ہوا تھا' جو اسی موضوع سے متعلق تھا اور راقم الحروف نے علماء کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ وہ اس جدید مسئلے پر اپنی رائیں ظاہر فرمائیں۔ زندگی کے صفحات ان کے لیے حاضر ہیں لیکن افسوس کہ کہیں سے اس مسئلے پر کوئی رائے نہیں آئی۔ اور اب پاکستان سے ایک صاحب علم نے خود راقم الحروف سے اس کی رائے دریافت کی ہے۔ مناسب سمجھتا ہوں کہ میں اپنے طالب علمانہ خیالات علماء کے سامنے پیش کردوں۔ ممکن ہے کہ ان میں کوئی بات کام کی نکل آئے۔

شیخ مصطفےٰ الزرقاء نے ضرورت شدیدہ کی بنیاد پر مُردوں کے اعضاء سے استفادے کو جائز قرار

دیا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ان کی تحریر اور ان کے دلائل کا حاصل یہاں نقل کر دیا جائے۔ وہ لکھتے ہیں کہ :۔

اس مقصد کے لیے مُردوں کی آنکھوں کے مسئلے میں دورِ حاضر کے بعض فقہاء متردد ہیں اور بعض اسے ناجائز قرار دیتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اس موضوع پر ایک مخصوص شرعی نقطۂ نگاہ سے غور کرتا ہے۔ چنانچہ بعض علماء انسانی ہمدردی کے پہلو سے سوچتے ہیں اور انسانیت کے سلسلے میں کتاب و سنت میں جو نصوص آئے ہیں ان پر غور کرتے ہیں اس طرح ان کے نزدیک جواز کا پہلو راجح ہوتا ہے اور بعض علماء یہ پہلو سوچتے ہیں کہ اس طرح میت کے ایک جز سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ چنانچہ ان کے نزدیک عدم جواز کا پہلو راجح ہوتا ہے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ یہ مسلمانوں کے درمیان تو جائز ہو سکتا ہے لیکن یہ بات جائز نہ ہوگی کہ مسلمان میت کا عضو لے کر اسے غیر مسلم کے عضو میں جوڑا جائے۔ حال ہی میں "آنکھوں کی پیوند کاری" کے موضوع پر جمہوریہ شام کے سابق مفتی اعظم محمد ابوالیسر عابدین کی طرف سے اس کے جواز میں ایک فتویٰ شائع ہوا ہے۔ علماء کے اقوال کا ذکر کرنے کے بعد شیخ زرتار نے اپنی یہ رائے ظاہر کی ہے۔

"اس مسئلے میں میری رائے یہ ہے کہ اسلامی شریعت میں "ضرورت شدیدہ" کا اصول اس طرح کے تبدیلِ اعضاء کی تمام قسموں کے جواز کا متقاضی ہے۔"

اپنی رائے پر جو دلائل انھوں نے دیے ہیں وہ یہ ہیں :۔

(۱) آنکھوں کے تبادلے کو اس ضرورت شدیدہ پر قیاس کیا جاتا ہے جس کے تحت بعض حرام چیزوں کا استعمال کر کے زندگی کو بچایا جاتا ہے یا عضو کو ضائع ہونے سے بچایا جاتا ہے۔ فقہاء کہتے ہیں کہ دفع ہلاکت کے لیے ایسا کرنا واجب ہے اسی طرح اگر یہ کہا جائے کہ میت کی آنکھ کو استعمال کرنا بھی جائز ہے جبکہ کسی تلف شدہ آنکھ کو زندہ کرنا مقصود ہو تو یہ بات شرعاً قابلِ قبول ہوگی۔

(۲) میت کی چیر پھاڑ کرنا قطعی حرام ہے لیکن علم طب حاصل کرنے یا جرم کا پتہ لگانے کے لیے جائز بلکہ واجب ہے۔

(۳) مرد اور عورت کی شرم گاہ کو کھولنا حرام ہے لیکن کسی طبی ضرورت یا تکلیف دور کرنے کے لیے جائز ہے۔ یہ حرام چیزیں الضرورات تبیح المحظورات (شدید ضرورتیں شریعت کی ممنوعات کو مباح کر دیتی ہیں) کے اصول کے تحت مباح یا واجب قرار دی گئی ہیں۔ لہٰذا ایک اندھے شخص کی بصارت کو لوٹانے کے

لیے مردوں کی آنکھوں سے استفادہ بدرجۂ اولیٰ جائز ہونا چاہیے ۔

(۴) ایک جسم کا خون دوسرے جسم میں منتقل کرنا یا ایک شخص کی جلد دوسرے کے جسم میں لگانا جائز سمجھا جاتا ہے جب کہ خون اور جلد بھی جسم کے اجزاء ہیں تو پھر مردوں کی آنکھیں استعمال کرنے میں کیوں تردد ہے ۔ زندہ جسم سے خون یا جلد لینے اور مردہ جسم سے آنکھیں نکالنے میں کوئی فرق نہیں ہے اس لیے کہ زندہ کا احترام مردہ سے زیادہ ہی ہے ۔

اِن دلائل کے بعد انھوں نے اس کام کے لیے تین[۳] شرطیں لگائی ہیں :۔

(الف) کوئی شخص خود اپنی زندگی میں اجازت دے دے ۔

(ب) اگر مرنے والے نے اپنی آنکھیں دینے سے منع نہیں کیا تھا تو اس کے اولیاء اجازت دیدیں

(ج) یہ کام صرف عطیہ اور تبرع کے طور پر کیا جائے اس میں کسی طرح کے معاوضے کا حصول مقصود نہ ہو

میں شیخ زرقاء کے دلائل و شرائط پر تو آگے کچھ عرض کروں گا ۔ یہاں صرف یہ اشارہ کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ جس "ضرورت شدیدہ" کے تحت وہ مردوں کی آنکھوں کا استعمال جائز قرار دے رہے ہیں وہ انسانی ہمدردی کے سوا اور کچھ نہیں ہے ۔ اس لیے ان کا موقف تقریباً وہی ہے جو ان لوگوں کا ہے جنھوں نے انسانی ہمدردی کی دلیل پر اس کام کو جائز قرار دیا ہے اور جن کا ذکر شیخ موصوف نے اپنے مضمون کی ابتدا میں کیا ہے ۔

چند بنیادی سوالات

میرے نزدیک اس کام کے جواز یا عدم جواز کا فیصلہ مندرجہ ذیل اصولی سوالات کے حل ہو جانے پر موقوف ہے ۔

(۱) شریعت اسلامیہ میں انسانی ہمدردی اور رحمت و مواسات کی جو ترغیب دی گئی ہے وہ کچھ حدود و شرائط کی پابند ہے یا ایک انسان دوسرے انسان کو فائدہ پہنچانے میں بالکل آزاد ہے ۔

(۲) کیا اسلامی شریعت میں انسان اپنے جسم کا ایسا مالک تسلیم کیا گیا ہے کہ وہ اس میں اپنی مرضی کے مطابق جو تصرف چاہے کر گزرے ؟

(۳) اسلامی شریعت میں میت کے احترام اور اسے اذیت نہ پہنچانے کو کیا درجہ دیا گیا ہے ؟

(۴) کیا الضرورات تبیح المحظورات کے فقہی قاعدے نے شریعت کے تمام محظورات و ممنوعات کو مباح قرار دے دیا ہے ۔

(۵) کیا انسانی جسم کی محض چیر پھاڑ اور اس کے کسی عضو کو علیحدہ کر کے اس سے استفادہ دونوں یکساں حکم رکھتے ہیں؟

جوابات میرے علم کی حد تک ان سوالات کے جوابات یہ ہیں:-

(۱) ایک انسان دوسرے انسان کو فائدہ پہنچانے میں آزاد نہیں ہے بلکہ شرعی حدود کا پابند ہے جن افعال و اعمال اور جن اشیاء کو شریعت نے جائز قرار نہیں دیا ان سے دوسروں کو فائدہ پہنچانا جائز نہ ہوگا۔ اگر یہ اصول سامنے نہ ہو تو انسان دوسرے انسان کو فائدہ پہنچانے کے لیے بیسیوں ممنوعات شرعیہ کے ارتکاب پر آمادہ ہو سکتا ہے۔ شریعت نے جہاں دوسرے انسانوں کے ساتھ ہمدردی کی انتہائی تعلیم دی ہے وہاں اپنے مقرر کیے ہوئے حدود پر سختی کے ساتھ قائم رہنے کی تاکید بھی کی ہے۔ اس لیے دونوں کو سامنے رہنا چاہیے۔ یک رخا مطالعہ کسی صحیح فیصلے تک نہیں پہنچاتا۔ فائدہ پہنچانے میں دو چیزیں دیکھنی پڑیں گی۔ ایک یہ کہ اس فائدے کی نوعیت کیا ہے۔ دوسری یہ کہ جس ذریعے سے فائدہ پہنچانا ہے وہ کیا ہے۔

(۲) اسلامی شریعت میں انسان اپنے جسم و جان کا خود مختار مالک نہیں ہے کہ جس طرح چاہے اس میں تصرف کرے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں خودکشی حرام ہے۔ اس اسلامی نظریے سے مستنبط بعض احکام یہ ہیں:-

(الف) ایسی عبادت تک درست نہیں جس میں خدا کے اذن اور اس کی مرضی کے بغیر جسم کی تعذیب لازم آتی ہو۔

(ب) اس کو اپنے جسم کے بارے میں کسی ایسی وصیت کا حق نہیں جو شریعت میں جائز نہ ہو اور اگر کوئی ایسی وصیت کرے تو اس پر عمل نہ کرنا واجب ہے۔ مثلاً کسی مسلمان کو اس کا حق نہیں ہے کہ دفن کرنے کے بجائے وہ اپنے جسم کو جلانے کی وصیت کرے۔

(ج) اپنے جسم کے بارے میں کسی جائز وصیت پر بھی اولیاء کا عمل کرنا واجب نہیں۔ مثلاً کوئی وصیت کر جائے کہ مرنے کے بعد اس کو یہاں نہیں بلکہ کسی دوسرے شہر میں دفن کیا جائے۔

(۳) اسلامی شریعت میں میت کے احترام اور اسے اذیت نہ پہنچانے کی حیثیت یہ ہے کہ اس کی اہانت اور ایذا رسانی حرام کا درجہ رکھتی ہے۔ مسلمان میت کے احترام و اکرام کے سلسلے میں اس نے جو ہدایات دی ہیں وہ اتنی ہیں کہ فقہ میں ان سے مستنبط مسائل و احکام کا ایک مستقل باب تیار ہو گیا ہے۔

(۴) آج کل لوگ 'الضرورات تبیح المحذورات' کو بہت افسوسناک انداز میں استعمال کر رہے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جس طرح کلمۂ شہادت ادا کرتے ہی کوئی کافر مسلمان ہو جاتا ہے۔ اسی طرح یہ کلمۂ فقہ زبان سے نکالتے ہی ہر ناجائز جائز ہو جاتا ہے' یا یہ کوئی ایسا وظیفہ ہے کہ اس کو پڑھ کر جس حرام پر بھی پھونک دیجیے وہ حلال ہو جائیگا۔

فقہ کے اس قاعدے پر تفصیل کے ساتھ اظہار خیال کا یہ موقع نہیں صرف مسئلہ زیر بحث کے تعلق سے چند اصولی باتوں کی طرف اشارہ کرنا کافی ہے

(الف) الضرورات تبیح المحذورات کا قاعدہ فقہ کا کوئی ایسا مطلق قاعدہ نہیں ہے جس نے ہر ضرورت کے وقت ہر محذور و ممنوع کو مباح قرار دے دیا ہو۔

(ب) یہ ایک فقہی قاعدہ ہے کوئی دلیل شرعی نہیں ہے۔ اس لیے دلائل شرعیہ کی روشنی میں اس پر غور کیا جائے گا یہ دیکھنا ہوگا کہ اس فقہی فقرے کی اصل کیا ہے اور وہ ہمیں کہاں تک جانے کی اجازت دیتی ہے۔ اس فقہی قاعدے کا اگر کسی مسئلے میں کسی دلیل شرعی سے تصادم ہو جائے تو اس کو ترک کر دیا جائے گا۔

(ج) اضطرار کی حالت میں جو رخصتیں منصوص ہیں ان پر قیاس کر کے کسی دوسری جگہ اس رخصت کا اثبات اسی وقت صحیح ہوگا جب قیاس شرعی کی تمام شرائط پائی جا رہی ہوں۔

(د) جن فقہاء نے اپنی کتابوں میں الضرورات تبیح المحذورات (۱) کا قاعدہ درج کیا ہے انہیں فقہاء نے حسب ذیل قاعدے بھی درج کیے ہیں۔

الضرر لا یزال بالضرر (کسی کا ضرر کسی دوسرے کو ضرر پہنچا کر دور نہیں کیا جائے گا۔

درء المفاسد اولیٰ من جلب المصالح (مفاسد کو دور کرنا مصالح کے حصول سے بہتر ہے۔

لترک ذرة مما نهی الله عنه افضل من عبادة الثقلین (اللہ نے جن چیزوں سے منع کیا ہے ان میں سے ایک ذرے کو ترک کرنا، جن و انس کی عبادت سے افضل ہے)

یہ قاعدے بھی ابن نجیم کی الاشباہ والنظائر میں موجود ہیں۔ بوقت ضرورت کسی ممنوع کی اباحت کا فیصلہ کرنے سے پہلے علماء کو یہ قاعدے بھی سامنے رکھنے چاہییں۔

(۵) پانچویں سوال کا جواب یہ ہے کہ کسی جسم کے صرف آپریشن اور اس کے کسی عضو کو کاٹ کر اس سے استفادہ کرنے کا حکم یکساں نہیں ہے۔ ان دونوں کے حکم کو ایک قرار دینا بالکل غلط ہے۔ مثال کے طور پر کسی شخص کے پھوڑے کو چیر کر اس سے مواد خارج کر دینے اور اس کے صحیح سلامت ہاتھ کو کاٹ کر کسی دوسرے شخص کے

۱۔ یہ فقہی قاعدہ ابن نجیم کی کتاب الاشباہ والنظائر میں ہے

ہاتھوں میں جو لٹھ دینے کو ایک کون کہہ سکتا ہے

بنیادی سوالات کے ان جوابات سے شاید ہی کسی عالم دین کو اختلاف ہو۔ بہرحال ان اصول و قواعد کی روشنی میں مسئلہ زیر بحث پر غور کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کسی انسانی لاش بالخصوص کسی مسلمان میت کی آنکھیں نکال کر یا اس کے جسم کے کسی عضو کو کاٹ کر کسی زندہ انسان کے جسم میں فٹ کرنا جائز نہیں ہے

جو لوگ محض انسانی ہمدردی کی بناء پر اس فعل کو جائز کہتے ہیں ان کی رائے قطعاً غلط ہے اس لیے کہ کسی فعل کے جائز ہونے کے لیے صرف "انسانی ہمدردی" سرے سے کوئی دلیل شرعی ہے ہی نہیں۔ اگر اس کو دلیل شرعی مان لیا جائے تو مثال کے طور پر امیروں کے فاضل مال پر ڈاکہ ڈال کر اس کو غریبوں میں تقسیم کر دینا بھی جائز قرار پا جائے گا۔ ایسی مثالیں موجود ہیں کہ بعض ڈاکوؤں نے لوٹا ہوا مال غریبوں میں تقسیم کر دیا ہے اور آج اشتراکیت ایک منظم و پرشوکت ڈاکہ ہے جو انسانی ہمدردی ہی کی دلیل پر انفرادی ملکیت کو باطل قرار دے کر مال داروں کی مملوکات پر قبضہ جما رہی ہے۔ اوپر سوال ۱۰ کے جواب کو دوبارہ ملاحظہ کر لیا جائے۔

شیخ مصطفےٰ الزرقا نے "ضرورت شدیدہ" کے تحت تبدیل اعضاء کی تمام قسموں کو جائز قرار دیا ہے اس کے معنے یہ ہیں کہ طبی سائنس نے کچھ اور ترقی کر لی تو ایک مسلمان کی پوری لاش چندے میں تقسیم ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے۔ شیخ الزرقا کی "ضرورت شدیدہ" بھی انسانی ہمدردی کے سوا اور کچھ نہیں ہے اس لیے کہ انھوں نے ضرورت شدیدہ کو اتنی وسعت دے دی کہ اس کا لازمی نتیجہ یہی نکلتا ہے ان کے نزدیک کسی شخص کا اندھا ہونا ایسی ضرورت شدیدہ ہے کہ اس کے تحت میت کی آنکھیں نکال لینا جائز ہو جاتا ہے اسی طرح اگر کوئی لنگڑا ہو تو میت کی ٹانگ کاٹی جا سکتی ہے۔ اگر کوئی لولا ہو تو میت کے ہاتھ کاٹے جا سکتے ہیں۔ ضرورت شدیدہ کی یہ ایک ایسی قسم ہے جس سے ہم پہلے واقف نہ تھے۔ اس ضرورت شدیدہ کے تحت تو کسی ایسے محتاج شخص کو جس کے پاس نان شبینہ بھی نہ ہو کسی مال دار کی جیب کاٹ کر حوالے کی جا سکتی ہے یا کہیں سے چوری کر کے یا لوٹ کر روٹی بھی دی جا سکتی ہے۔ جیب کاٹنا، چوری کرنا اور لوٹنا اگرچہ حرام افعال ہیں لیکن اس ضرورت شدیدہ کے تحت یہ تمام کام مباح ہو جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ اسلام نے اس طرح کی انسانی ہمدردی کی تعلیم نہیں دی ہے اور نہ ان ضرورتوں کو اس نے ایسی ضرورتیں تسلیم کیا ہے جو کسی حرام کو مباح کر دیتی ہیں ——— مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شیخ الزرقا کے دلائل و طرز استدلال بھی کچھ

لفظاً عرض کیے جائیں

ان کی پہلی دلیل قیاس پر مبنی ہے لیکن اس قیاس کو قیاس شرعی نہیں کہا جا سکتا۔ اس لیے کہ احیائے نفس کے لیے کسی حرام کے استعمال پر آنکھوں کے عطیے کو قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ صحیح قیاس کے لیے لازمی اور سب سے ضروری شرط یہ ہے کہ اصل اور فرع کے درمیان علت کا اشتراک ہو۔ یہاں یہ شرط نہیں پائی جارہی ہے کسی اندھے کی آنکھیں درست کر دینے کو احیائے نفس اور دفع ہلاکت کے مساوی قرار دینا شیخ مصطفیٰ جیسے لوگوں کو زیب نہیں دیتا۔ آنکھوں کے لیے زندگی اور موت کے الفاظ استعمال کر کے صرف ان ناخواندہ لوگوں کو مطمئن کیا جا سکتا ہے جو حقیقت اور مجاز کا فرق نہیں سمجھتے۔ میں مثال دے کر صحیح اور غلط قیاس کے فرق کو واضح کرتا ہوں۔

جان لیوا بھوک کی حالت میں جب انسان بھوک سے مر رہا ہو اور کوئی حلال چیز کھانے کی موجود نہ ہو تو شریعت نے رخصت دی ہے کہ حرام غذا مثلاً سور کا گوشت کھا کر جان بچالی جائے اس منصوص رخصت پر یہ قیاس کرنا صحیح ہے کہ جان لیوا پیاس کی حالت میں جب انسان پیاس سے مر رہا ہو اور کوئی حلال چیز پینے کی موجود نہ ہو تو وہ شراب پی کر اپنی جان بچا سکتا ہے۔ یہ قیاس اس لیے صحیح ہے کہ سور کا گوشت کھانے اور شراب پینے کی علت مشترک ہے اور وہ ہے احیائے نفس یعنی جان کو ہلاکت سے بچانا لیکن اس منصوص رخصت پر اگر یہ قیاس کیا جائے کہ ضعف جسم کی حالت میں محض قوت حاصل کرنے کے لیے شراب پی جا سکتی ہے تو یہ قیاس قطعاً غلط ہوگا اس لیے کہ اس صورت میں وہ علت نہیں پائی جارہی ہے جس نے سور کے گوشت کو مباح کر دیا تھا۔ اگر کوئی شخص حصول قوت کو احیائے قوت یا قوت کو زندہ کرنا کہے یا دفع ضعف کو دفع ہلاکت قرار دے تو اس لفظی بازی گری کی وجہ سے علت مشترک نہیں ہو جائے گی۔ دونوں علتیں الگ ہی رہیں گی الزرقا کا قیاس ایک اور جہت سے بھی غلط ہے۔ شریعت نے اس خاص شخص کو جو حالت اضطرار میں مبتلا ہو یہ رخصت دی ہے کہ حرام کا استعمال کر کے اپنی جان بچالے اور شیخ الزرقا مضطر کی رخصت پر قیاس کر کے اس شخص کو فعل حرام کے ارتکاب کی رخصت عطا فرما رہے ہیں جو نہ مضطر ہے اور نہ خود کسی ضرورت شدیدہ میں مبتلا ہے۔ آخر مضطر پر غیر مضطر کو قیاس کرنا قیاس کی کون سی قسم ہوگی۔

شیخ مصطفیٰ نے اپنی دوسری دلیل میں علم طب حاصل کرنے یا جرم کا پتہ لگانے کے لیے میت کی چیر پھاڑ کو جائز بلکہ واجب کہا ہے اور اس پر قیاس کر کے میت کی آنکھوں یا اس کے دوسرے اعضاء سے استفادہ

کو جائز قرار دیا ہے۔ یہ درحقیقت کوئی دلیل نہیں بلکہ ایک دعویٰ ہے جو خود محتاج دلیل ہے۔ میرے نزدیک علم طب حاصل کرنے یا جرم کا پتہ لگانے کے لیے کسی مسلمان میت کی چیر پھاڑ کرنا اور اس کو میڈیکل کالج کے طلبہ کا تختہ مشق بنانا جائز نہیں ہے اور اس کو واجب کہنا تو سخت زیادتی ہے۔ اس فعل سے صرف آدمیت وانسانیت کا احترام ہی مجروح نہیں ہوتا بلکہ ایمان واسلام کی بھی تحقیر ہوتی ہے۔ ایک مسلمان کو اس کے ایمان واسلام کی وجہ سے عزت کا جو مقام حاصل ہوتا ہے اس کو حقیر دنیوی فائدوں پر قربان کرنا صحیح نہیں ہے۔ مسلمان میت کی توہین وتحقیر سے جو مفاسد پیدا ہوتے ہیں وہ ان حقیر مصلحتوں سے بدرجہا بڑھے ہوئے ہیں۔ پھر ستم ظریفی یہ ہے کہ علم طب حاصل کرنے کے لیے ایسی ہی لاشیں تختہ مشق بنائی جاتی ہیں جن کا کوئی پرسانِ حال نہ ہو۔ میں نہیں جانتا کہ دنیوی یا دینی لحاظ سے کسی ممتاز شخص کی لاش بھی علم طب حاصل کرنے کے لیے چیری پھاڑی گئی ہو۔ اور میں نہیں سمجھتا کہ اس مقصد کے لیے چیر پھاڑ کو واجب قرار دینے والے کوئی مفتی صاحب اپنی لاش کے لیے بھی یہ عمل پسند فرمائیں گے۔ حالانکہ واجب کی ادائگی کے لیے تو اپنی لاش کو پیش کرنا بڑی سعادت کی بات ہوگی۔

یہی حال تفتیش جرم کا ہے۔ کتنے ہی ملک کے صدر اور وزیراعظم قتل کیے گئے ہیں لیکن میں نہیں جانتا کہ جرم کا پتہ لگانے کے لیے ان میں سے کسی کی لاش اس طرح چیری پھاڑی گئی ہو جس طرح عام لوگوں کی لاشیں چیری پھاڑی جاتی ہیں۔ حالانکہ جرم کی سنگینی اور اہمیت کے لحاظ سے بڑے لوگوں کی لاشوں کا پوسٹ مارٹم زیادہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کیا یہ جواز اور وجوب صرف غریبوں کی لاشوں کے لیے ہے؟

شیخ الزرقا نے تیسری دلیل میں ضرورتاً کشف عورت کی جو نظیر پیش کی ہے اس سے ان کا نقطۂ نظر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ضرورت شدیدہ کے وقت اگر فقہاء نے کسی ایک نوعیت کے ممنوع محذور کو مباح قرار دیا ہے تو اس کو نظیر بنا کر بوقت ضرورت ہر نوعیت کے ممنوعات کو مباح بنایا جاسکتا ہے۔ یہ نقطۂ نظر صحیح نہیں ہے اس لیے کہ تمام ممنوعات مساوی الدرجہ نہیں ہیں اور نہ تمام "ضرورتیں" یکساں درجہ رکھتی ہیں۔ اگر بوقت ضرورت کسی ایک ممنوع کو جائز قرار دیا جائے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کو نظیر بنا کر کسی دوسرے ممنوع کو بھی جائز کر لیا جائے بلکہ ہم تو یہ پاتے ہیں کہ ایک ہی نوعیت کے ممنوع میں بھی "ضرورت" کی نوعیت بدل جانے سے حکم بدل جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک مردے کو دفن کر کے مٹی برابر کر دینے کے بعد پھر اس کی قبر کو کھولنا ممنوع ہے۔ اب دیکھیے کہ ایک ضرورت

کے وقت فقہا قبر کھولنے کو جائز کہتے ہیں اور ایک دوسری ضرورت کے وقت ناجائز۔ اگر کسی شخص کا مال قبر میں چھوٹ جائے تو قبر کھول کر مال برآمد لینے کو جائز کہتے ہیں اور اگر مردے کو غسل دیے بغیر دفن کر دیا گیا ہو یا اس کی پیٹھ قبلے کی طرف کر دی گئی ہو تو وہ قبر کھولنے کی اجازت نہیں دیتے۔ میں اس وقت ایک صورت میں اس کے جواز اور دوسری صورت میں اس کے عدم جواز کی علتوں سے بحث نہیں کروں گا۔ دکھانا صرف یہ ہے کہ اگر کسی ضرورت کی بنا پر کوئی ممنوع مباح قرار دیا جائے تو ضروری نہیں ہے کہ وہ کسی دوسرے ممنوع کی اباحت کے لیے نظیر بن جائے بلکہ ہر ضرورت اور ہر ممنوع پر الگ الگ غور کر کے فیصلہ کرنا ہوگا۔ بوقت ضرورت کسی کی شرم گاہ پر نظر ڈالنے کی اباحت کو مردے کی آنکھیں نکال لینے کے لیے نظیر بنانا بالکل غلط ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں شریعت سے واقف کوئی شخص بھی ان دونوں حرمتوں کو مساوی الدرجہ قرار نہیں دے سکتا۔ اس کے علاوہ کسی مریض کی ستر پر خود اسی کو فائدہ پہنچانے کے لیے نظر ڈالنا اس بات کے لیے نظیر نہیں بن سکتا کہ آپ آنکھیں تو نکالیں کسی اور کی، فائدہ پہنچائیں کسی اور کو۔ ایک انسان کو نقصان پہنچا کر دوسرے کو فائدہ پہنچانے کے لیے یہ نظیر بالکل بے کار ہے۔

اس کے بعد شیخ مصطفےٰ الزرقاء نے ایک جدید فتوے کو دلیل میں پیش کیا ہے ان کا خیال ہے کہ جب زندہ انسان کے جسم سے خون لے کر دوسرے جسم میں منتقل کرنا اور کسی شخص کی جلد دوسرے کے جسم میں لگانا جائز ہے تو مُردوں کی آنکھیں نکال کر دوسرے جسم میں لگا دینا بھی جائز ہونا چاہیے۔ ان کے نزدیک اس جواز کی دو بنیادیں ہیں۔ ایک یہ کہ خون اور جلد بھی جسم کے اجزا ہیں اور آنکھیں بھی جسم کے اجزا ہیں۔ جب ان اجزا کا استعمال جائز ہو سکتا ہے تو آنکھوں نے کیا قصور کیا ہے۔ دوسری یہ کہ زندہ جسم سے خون لینے اور مردہ جسم سے آنکھیں نکالنے میں کوئی فرق نہیں ہے اس لیے کہ زندہ کا احترام مُردے سے زیادہ ہی ہے۔ ان کے اس استدلال پر چند باتیں عرض ہیں:

(الف) بلاشبہ انسانی جسم کے ہر جز سے استفادہ ممنوع ہے لیکن انسانی جسم کے تمام اجزا مساوی الدرجہ نہیں ہیں۔ اس لیے ان سے استفادے کی ممانعت کے درجات بھی یکساں نہیں ہو سکتے۔ مثال کے طور پر بال بھی انسانی جسم کا جز ہیں اور ہاتھ بھی انسانی جسم کے اجزا ہیں لیکن کسی کے بال کاٹ کر ان سے استفادہ کر لینا اور کسی کے ہاتھ الگ کر کے انہیں استعمال کر لینا برابر نہیں ہے۔ دونوں میں آسمان زمین کا فرق ہے۔ انسانی جسم کے تمام اجزا کو مساوی الدرجہ قرار دینا بداہۃً غلط ہے۔ اس لیے موصوف کی پہلی بنیاد صحیح نہیں ہے

(ب) ان کی دوسری بنیاد بھی اس لیے غلط ہے کہ جسم کے بعض اجزاء کو الگ کرنا یا کاٹنا صرف یہی نہیں کہ تحقیر و توہین کا فعل نہیں ہے بلکہ انہیں کاٹتے یا کٹواتے رہنا ضروری ہے جیسے ناخون اور سر کے بال (اور غالباً شیخ الزرقاء کے نزدیک داڑھی کے بال بھی اس لیے کہ مصر و شام کے موجودہ علماء داڑھی کے معاملے میں بھی بہت روشن خیال واقع ہوئے ہیں الا ماشاء اللہ) فقہ شافعی میں تو مرنے کے بعد بھی اگر میت کے ناخون اور مونچھیں بہت بڑھی ہوئی ہوں تو انہیں کاٹنا درست ہے۔ یہی حال انسانی جسم سے خون نکالنے کا بھی ہے۔ نفس اس فعل کو تحقیر و توہین کا فعل سمجھنا صحیح نہیں ہے۔ زندہ انسان کے جسم سے خون نکالنے کو تحقیر قرار دینا اور پھر اس کو میت کی آنکھیں نکالنے کے برابر کہنا ایسی بات ہے جس کی توقع شیخ الزرقاء جیسے فاضل سے نہیں کی جاسکتی تھی۔

(ج) زندہ انسان کے جسم سے خون لے کر دوسرے جسم میں منتقل کرنا صرف اسی وقت جائز ہے جب کسی کی جان بچانی ہو اور وہ بھی اس لیے کہ اس فعل سے خون دینے والے کے جسم کی ساخت میں نہ کوئی نقص پیدا ہوتا ہے اور نہ تغییر لخلق اللہ کے جرم کا ارتکاب ہوتا ہے۔ اس لیے اس پر مسئلہ زیر بحث کو قیاس کرنا صحیح نہیں ہے۔ باقی رہی جلد تو میرے نزدیک کسی مسلمان کو اس کا حق نہیں ہے کہ وہ اسے کاٹ کر دوسرے جسم میں لگانے کی اجازت دے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ شیخ الزرقاء نے جن دلائل سے میت کی آنکھیں نکال کر اس سے استفادے کو جائز قرار دیا ہے ان میں سے کسی دلیل سے بھی اس شنیع فعل کا جواز نہیں نکلتا ــــــ اب ان کے شرائط پر گفتگو لاحاصل ہے اس لیے کہ نہ مرنے والے کو کسی ناجائز فعل کی وصیت کا حق ہے اور نہ میت کے ورثہ کو اس کا حق پہنچتا ہے کہ وہ کسی ناجائز فعل کی اجازت دیں۔

خدا ہندوستانی کلچر میں

(۲)

جناب ڈاکٹر احمد خضر زبیری صاحب

نو سری گا تھا کے تیسرے جز میں زرتشت کا وہ خطبہ ہے جس میں اس نے دیوتاؤں کو ترک کر کے "اہُرمزدا" کی طرف دعوت دی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ سارے پارسی لٹریچر میں یہی اسپرٹ نہیں ہے کیونکہ سات ابواب والی یاسنا میں جو کہ زرتشت کے ابتدائی پیروؤں کی تصنیف خیال کی جاتی ہے اور جو کہ یجر وید کے ہم پلہ ہیں اس میں مخالفین کی رعایت سے "اہُرمزدا" کے علاوہ اوروں سے دعائیں مانگی گئی ہیں۔ جادو منتر اس میں موجود ہیں پرانے رسوم کو کچھ بدل کر اس میں پھر اختیار کر لیا گیا ہے۔ مثلاً سوم کی رسوم ہوم کے نام سے اس میں موجود ہے اس طرح وین ڈیڈاڈ (V endiad) میں جو کہ ہندوؤں کی سمرتی کا ہم پلہ ہیں وہ اس میں آریائی خدا کا ہمسر اور مدمقابل ہے یاسنا (y ashts) جو کہ جزوی طور پر ہندوؤں کے "پران" سے مشابہ ہیں ان میں "پرانے خداؤں کو فرشتوں کا لقب دے کر پھر قبول کر لیا گیا ہے اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ زرتشت اور خود "اہُرمزدا" کو ان کا پرستار تک قرار دے دیا گیا ہے۔ مثلاً اس میں متھرا کو یہ شرف حاصل ہے۔ الغرض اس مذہب کے ارتقا یا زوال کی تاریخ جو کچھ بھی ہو یہ بات بہت اہم ہے کہ اس مذہب کو جس کو سمپورنا نند جی کے نزدیک بھی لازماً آریائی مذہب ہی قرار دیا جائے گا۔ اس میں خدا کا واضح تصور موجود ہے جس کو وہ صرف سامی قوم تک ہی محدود کرتے ہیں اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اس مذہب میں توحید، رسالت، الہام، حیات بعد الموت، پل صراط وغیرہ کا تصور نہ صرف یہ کہ موجود ہے بلکہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ایک اور دلچسپی کی بات یہ ہے کہ تقریباً ان سب باتوں کا ذکر گاتھا (Gath) میں ہے جو کہ

اوستا کا سب سے اہم جز ہے جو کا ذکر ہاڈوکٹ ناسک (Hadokht Nask) میں ہے

اب اگر ایک قدم اور آگے بڑھایا جائے تو معلوم ہوگا کہ معاملہ صرف یہاں ہی تک نہیں بلکہ ایران کے ایرین کا تصور خدا اس تصور خدا سے گہری مناسبت رکھتا ہے ۔ بلکہ سمپورنانند جی کے اس دعوے کی صحت بھی مشتبہ ہے کہ آرین قوم کی ہندوستانی شاخ کی مقدس کتاب رگ وید خدا کے تصور سے خالی ہے ۔

سمپورنانند جی وید کے عالم ہیں اس وجہ سے یہ گمان تو نہیں کیا جا سکتا کہ وید میں "ورن" کے تصور سے وہ ناواقف ہوں گے ۔ یہ صحیح ہے کہ رگ وید میں ورن کا ذکر کم ہے مگر بارہ حمدیں صرف ورن کی شان میں ہیں اور چو میں ورن اور متر دونوں کی ثنا میں ہیں ۔ اگر ورن کو اس محض حمدوں کی تعداد کے لحاظ سے پرکھا جائے تو وہ ایک معمولی درجے کا دیوتا ہے جس کا مقام اگنی اور اندر سے پست ہے لیکن اگر وید کی نظموں کو تاریخ کے اعتبار سے مرتب کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ ورن کا تصور اگنی اور اندر سے زیادہ قدیم ہے اور اس کا ذکر وید کے پرانے حصے میں ہے اور اس کی اہمیت ان سب دیوتاؤں سے بلند ہے ۔ ایک خاص بات ہے کہ ورن کے متعلق چند اور دیوتاؤں کی طرح تعریف میں "اسُر" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اس کا استعمال اس کی عظمت اور قدامت کا پتہ دیتا ہے کیونکہ وید کے نسبتاً جدید حصوں میں ایرانیوں کی مخالفت میں "اسُر" کے لفظ کا مفہوم بدل دیا گیا ہے اور اس کے معنی برے لیے جانے لگے تھے ۔ برہمنی لٹریچر دیوتاؤں اور اسُروں کی جنگ کے تذکروں سے پُر ہے ۔

رگ وید میں ورن کی یہ خصوصیات بیان ہوئی ہیں وہ بے انتہا قدرت (یا علم) کا مالک ہے ۔ زمین اور آسمان اسی نے بنائے ہیں اور وہ ہی ان کو برقرار رکھتا ہے وہ کائنات کے حاکم کی طرح رہتا ہے ۔ (ملاحظہ ہو (۱ ، ۲ ، ۷ iii) وہ دونوں عالم (زمین فضا اور آسمان) کا احاطہ کیے ہوئے ہے (5 ، 87 ، ۷ii) اس نے سنہرا اور گردش کرتا ہوا سورج آسمان پر چمکنے والا پیدا کیا ہے (2 ، 85 ، ۷) اس نے سورج کے لیے وسیع راستہ مقرر کر دیا ہے اور دریاؤں کے لیے زمین میں گہری راہیں بنا دی ہیں (جن میں وہ) اس کے حکم سے جاری ہیں (8 ، 24 ، ز) یہ اس کی حکمت کا نتیجہ ہے کہ دریا اپنا پانی سمندر میں ڈالتے ہیں مگر کبھی اس کو بھر نہیں پاتے (6 ، 85 ، ۷) اس کے قوانین مقرر ہیں اور ان کی خلاف ورزی ممکن نہیں (18 ، 54 ، iii) قوانین (فطرت) اس (ورن) پر قائم ہیں (اس لیے) وہ ٹوٹ نہیں سکتے (گویا کہ) ان کی

بنیاد (مضبوط) پہاڑ پر ہو (8، 28، ii - 10، 6، 25، i - 14، 44، i - 9، 14، i - 4، ii - 25، 2) ان قوانین کے مطابق چاند روشن ہے اور گردش کرتا ہے اور تارے رات کو آسمان پر چمکتے ہیں۔ صبح کی روشنی میں غائب ہو جاتے ہیں (10، 24، i) چڑیاں جو ہوا میں پرواز کرتی ہیں اور دریا جو بے خواب سفر میں سرگرم کار رہتے ہیں ان میں سے کوئی اس کی قدرت یا غضب کا اندازہ نہیں کر سکتا (6، 24، i) اس کے پیغام بر (فرشتہ؟) دونوں عالم پر نظر رکھتے ہیں (3، 87، vii 5، 87، 8، vi - 13، 24، i) اس کو آسمان میں پرندوں کی پرواز کا سمندر میں جہازوں کی آمد و رفت کا (زمین پر) ہوا کی حرکت کا علم ہے۔ وہ ساری خفیہ باتوں پر نظر رکھتا ہے جو ہو رہی ہیں یا ہوں گی (7، 25، i) کوئی مخلوق اس کے علم کے بغیر پلک بھی نہیں مار سکتی (6، 28، ii) وہ آدمیوں کی سچ اور جھوٹ کا شاہد ہے (3، 49، ii) اس کو آدمی کی تقدیر پر پورا اختیار ہے اس کے پاس آدمی کے لیے سینکڑوں ہزاروں علاج ہیں اس کے لطف بے نہایت کی دعا کی جاتی ہے اور گناہ اور برائی سے اس کی پناہ مانگی جاتی ہے (9، 24، i) اس سے التجا کی جاتی ہے کہ وہ لوگوں کو رسی (کے بلوں) کی طرح آپس میں ملا دے اور گناہ سے پاک کر دے (78، 8، v - 5، 28، ii) زندگی کو چھینے (چرائے نہیں) بلکہ اس کو اور بڑھا دے (11، 24، i) (12، 25، i) اکثر اس کی گرفت کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جس میں وہ حد سے گزر جانے والوں کو گرفتار کرتا ہے۔ (15، 24، i - 21، 25، i - 4، 74، vi - 4، 74، vi - 24 - 5، 85، x - 1، 25، i - 6، 16، vi A.V.) اور ان کو گناہ گاروں کی مغفرت کرنے والا بھی کہا جاتا ہے (7، 87، vii) وہ حیات جاوداں بخشنے پر قادر (اس کا نگہبان) ہے یہ کام وہ پوری ہوشیاری کے ساتھ انجام دیتا ہے (2، 12، viii) اس کے گرد پیغام بر (فرشتہ؟) جمع رہتے ہیں (13، 25، i) وہ دور بین ہے (16، 5، 25، i) (2، 90، viii) اس کو رب یا بادشاہ یا راجہ کہا جاتا ہے (8، 7، 24، i - 7، 40، v - 2، 1، iv اور 64، vi - 9، 103، x اور 5، 173، x) وہ سب کا راجہ ہے (4، 132، x) وہ سب دیوتاؤں اور انسانوں کا راجہ ہے — (10، 27، ii) وہ ساری کائنات کا راجہ ہے (3، 85، v) (6، 87، vii) وہ کائنات کا آقا یا سمراٹ ہے (10، 25، i - 6، 28، ii - 1، 25، v - 9، 68، vi - 1، 42، viii) وہ اپنی مرضی سے حکومت کرتا ہے (1، 28، ii) وہ غضب ناک یا رودر ہے (3، 2، 70، v) وہ علم اور طاقت میں بالا

ہے (14، 48، vi۔4، 28، ii، vii۔10، 99، x۔5، 127، x) وہ زندہ یا امر ہے (۱۰، ۲۴، i،
5۔10، 27، ii) اس نے رشی وشستھا کو علم معرفت عطا کیا ہے۔

معلوم نہیں کہ سپنوزا نندجی کو "ورن" کے اس تصور میں کچھ "الوہیت" کی جھلک نظر آتی ہے یا نہیں،
اور وہ ان کو سامی قوم کے خدا کی طرح صاحب قدرت و جبروت آقا مالک حاکم حقیقی غضبناک اور رحیم
جزا و سزا کا مختار معلوم ہوتا ہے یا نہیں

یجروید میں "ورن" کی شان میں ایک حمد ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ وہ آقا جو عالموں پر حکمراں ہے وہ
(ہمارے) اعمال پر اس طرح نظر رکھتا ہے گویا کہ وہ قریب پہلو ہی میں موجود ہو جب کوئی آدمی یہ سمجھتا ہے
کہ وہ کوئی کام خفیہ طور پر انجام دے رہا ہے تب اس کی بھی "ورن" کو خبر رہتی ہے اور وہ اس کو (ہر
وقت) دیکھتا ہے جبکہ کوئی کھڑا ہو، چل رہا ہو، یا چھپا پھر رہا ہو، یا گھر میں گھس گیا ہو یا کہیں اور جا چھپا ہو
جب آدمی آپس میں بیٹھ کر کوئی خفیہ تدبیر کرتے ہیں تو راجہ ورن کو اس کی بھی خبر رہتی ہے گویا کہ وہ تیسرے
کی طرح ان میں موجود ہو یہ زمین راجہ ورن کی ملکیت ہے اور وہ وسیع آسمان بھی اس کی ملکیت ہے جس کے
کنارے اتنی دور دور ہیں کہ دونوں سمندر (پانی کا سمندر اور ہوا کا سمندر یا فضا) ورن کا پیٹ (جس کے
برابر) ہیں (اور اس کے باوجود) وہ ایک چھوٹے تالاب میں بھی سما جاتا ہے۔ کوئی آدمی اگرچہ آسمان
کے پرے چلا جائے تب بھی ورن راجہ سے نہیں بچ سکتا اس کے پیغامبر (فرشتہ ؟) آسمان سے
نازل ہوتے ہیں وہ ساری دنیا کو چھان ڈالتے ہیں اور اپنی ہزاروں آنکھوں سے ساری زمین کے گرد
دیکھتے ہیں۔ راجہ ورن کو ہر چیز کی خبر ہے جو کہ آسمان یا زمین میں موجود ہے یا جو کہ اس سے پرے ہیں
آدمی کے پلک مارنے کو بھی وہ گنتا رہتا ہے۔

رگ وید میں رشی وشستھا کی دعا ہے۔ راجہ ورن مجھ کو زمین کے گھر (قبر ؟) میں جانے سے بچالے۔ رحم
کر اے قدرت والے دیوتا رحم کر جب ایک کھال کی طرح جس میں محض ہوا بھری ہوئی ہو کانپتا ہوا چلتا ہوں
اے غضبناک آواز والے رحم کر۔۔۔۔۔۔ اے روشن اور قدرت والے دیوتا میں حد سے گزر گیا تھا رحم
کر۔۔۔۔۔ پیاس (خواہشات) نے تیرے پرستار پرقابو پالیا تھا۔ جب تو پانی کے بیچ میں کھڑا ہو رحم کر
۔۔۔۔۔ ہمارے جو کچھ بھی خطا ہو اے ورن جو کہ ہم فانی آسمان والوں کے خلاف کرتے ہیں یا ہماری
بے احتیاطی سے جو کچھ تیرے احکام کی خلاف ورزی ہو جاتی ہے تو اس سے ہم کو معاف کر دے

اے قدرت والے دیوتا رحم کر (ا، 99، vii) کیا ان نظموں میں ورن بائبل یا قرآن مجید کے خدا کی طرح بااختیار اور صاحب جبروت اور حاکم حقیقی نہیں معلوم ہوتا؟ کیا ورن کا تصور ہندو کلچر کا صحیح مظہر نہیں ہے اور کیا یہ بھی عیسائی اور مسلمانوں کے اثر سے آلودہ ہے؟

مادہ پرست مغربی مفکرین نظریہ ارتقاء پر اعتماد کرکے ہر حماقت عہد قدیم کے آدمی کی جانب منسوب کر دیتے ہیں چنانچہ ان کے نزدیک ورن ایک مظہر قدرت سے زیادہ نہیں مگر ہمیں یہ باور کرنے میں تامل ہے کہ روحانی اعتبار سے آدمی کبھی اتنا پست تھا کہ وہ الوہیت کے تصور سے خالی الذہن ہو کر کسی سے اس طرح عاجزانہ دعا کر سکے۔

اس میں شک نہیں کہ رگ وید میں ورن کا تصور کتنا ہی عظیم الشان کیوں نہ ہو مگر اس کو کلیۃً خدا کے تصور کے مانند نہیں سمجھا جا سکتا۔ وید میں ورن کا ذکر الگ بھی ہے مگر اکثر متر کو اس کا شریک قرار دیا جاتا ہے۔ اسی طرح مندرجہ ذیل باتیں ورن کی طرف منسوب کی گئی ہیں جو خدا کے شایان شان نہیں۔ مثلاً کبھی ورن اپنے پرستاروں کو نظر آتا ہے۔ ایک رشی کا قول ہے:-

"میں نے اس کو (ورن) دیکھا جو سب نظر آتا ہے۔ میں نے زمین پر اس کا رتھ دیکھا (18، 25، i)"

"میں نے ورن کا جلوہ دیکھا جس کی آب و تاب آگ کی مانند ہے (2، 88، vii) اس کے محل کے جہاں اس کے پرستار پہنچے ہزاروں دروازے ہیں (5، 88، vii) وہ متر کے ساتھ اس تخت پر جلوہ گر ہوتا ہے جس کے ہزاروں دروازے ہیں (41، ii) دونوں دیوتا رتھ میں سوار ہوتے ہیں جس کو ایسے گھوڑے چلاتے ہیں جو نمود صبح کے وقت سونے اور غروب آفتاب کے وقت لوہے کی طرح چمکتے ہیں (1، 63، v - 8، 4، 62، v) سورج ورن اور متر کی آنکھ ہے (1، 37، x، 63، vii - 1، 61، vii) اس کی ہزاروں آنکھیں ہیں (10، 34، vii) ہوا جو فضا میں آتا جاتا کرتی ہے۔ ورن کی سانس ہے۔ (2، 87، vii) وہ سنہرا لباس زیب تن کرتا ہے۔ (13، 25، i)"

راجہ اور کائنات کے آقا کے خطابات سے ورن اور متر دونوں کو یاد کیا جاتا ہے۔ (1، 136، i - 9، 71، 5، 65، x - 2، 9، 9، vii - 8، 7، 4، 25، vii / 30، 23، vii - 2، 64،

(i 137، i-v 62، 6-v 63، 2، 3، 5-v 65، 2-v 68، 2-vi) طاقت اور شاہانہ حاکمیت ورن اور متر دونوں کی جانب منسوب کی جاتی ہے اور ان دونوں کے ساتھ آدیت کو طاقتور "دیوتا" کہا جاتا ہے (3، 1، 8، 6، v-1، 87، v-2، 66، v-1، 136، i-6، 24، i 2، 90، viii، i، 56، viii-8، 29، viii-2، 64، vii-11، 34، vii-6، 9، 67، vii-i، vi-10، 51، vi) دونوں کو غضب ناک (رود) (3، 2، 70، v) (3، 2، 70، v) زندہ (اسُر) (2، 65، vii) طاقت والا (ماین) کہا جاتا ہے۔ (14، 48، vi-4، 28، vii-10، 99، x-5، 147، x) اسُر یا زندہ کا لفظ عموماً ورن کے خطاب کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے کہ گویا اسُر ورن اور متر سے الگ ایک مستقل وجود ہے جس کی قوت سے یہ دونوں کام کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہا جاتا ہے کہ یہ دونوں اسُر کی طاقت (مایا) سے آسمان سے مینہ برساتے ہیں اور اس کی طاقت سے قوانین (فطرت) کو برقرار رکھتے ہیں۔

ورن کا ذکر تو متر کے بغیر اکثر ہے مگر متر کا ذکر تنہا صرف رگ وید کی صرف ایک حمد (59، iii) میں ہے جس میں اس کو زمین اور آسمان کو برقرار رکھنے والا کہا گیا ہے اور یہ کہ وہ بغیر پلک جھپکائے مخلوقات پر نظر رکھتا ہے جس کو اس کی مدد حاصل ہوتی ہے وہ نہ تو قتل ہوتا ہے اور نہ مغلوب اور مفتوح۔ مصیبت اس شخص کے قریب آتی ہے اور نہ دور رہتی ہے۔ (گویا اس کے لیے مصیبت بالکل مٹ ہی جاتی ہے) وہ (متر) راجہ طاقت والا اور عقل مند ہے اس کی عظمت آسمان سے بڑی اور اس کی شوکت دنیا سے زیادہ ہے۔ وہ سارے دیوتاؤں کو برقرار رکھتا ہے۔

رسائل و مسائل

تحریک جماعت اسلامی پر تبصرہ

مکتوب

مجھے جمادی الاخریٰ ۸۶ھ (اکتوبر ۶۶ء) کے "زندگی" میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی کتاب پر آپ کا تبصرہ پڑھنے کا موقع حاصل ہوا اس کے ایک فقرے پر مجھے تعجب سا ہوا۔ آپ نے فرمایا ہے کہ اب اس وقت فاضل مصنف کی حیثیت ایک فریق کی ہے اس لیے جب تک دوسرے فریق کا بیان بھی اسی تفصیل سے سامنے نہ ہو کسی غیر جانب دار کے لیے دونوں کے درمیان منصفانہ محاکمہ ممکن نہیں۔

دراصل یہ پورا مقالہ فروری ۵۷ء کے اجتماع عام منعقدہ ماچھی گوٹھ میں پڑھا گیا تھا اور اس نقطۂ نظر کے دوسرے حامیوں نے بھی وہاں مفصل تقریریں کی تھیں۔ یہ اجتماع اسی لیے منعقد ہوا تھا کہ پالیسی اور نصب العین کے اختلافات کا فیصلہ ارکان کے اجتماع عام میں کیا جائے۔ ان کے جواب میں مولانا نے بھی ایک مفصل تقریر کی تھی جو "تحریک اسلامی کا آئندہ لائحۂ عمل" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہو چکی ہے۔ دونوں طرف کی پوری بات پیش ہونے کے بعد جب رائے شماری کی گئی تو نو سو بیس (۹۲۰) ارکان نے مولانا کے پیش کردہ لائحۂ عمل کی توثیق کی اور صرف پندرہ نے اس کے خلاف رائے دی۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ تبصرہ کرتے وقت اتنی اہم سرگزشت اور اس سلسلۂ واقعات سے کیسے ذہول ہو گیا؟ ڈاکٹر صاحب نے تو غالباً قصداً اسی بات کو چھپایا ہے کہ ان کا یہ مقالہ ۹ برس پہلے پوری جماعت کے سارے ارکان کے سامنے پیش کیا گیا تھا اور اس کا مفصل جواب بھی دیا گیا تھا اور جس جماعت

کے دستور کو کم از کم اس وقت وہ تسلیم کر رہے تھے اس کے اجتماع عام میں ارکان کی عظیم اکثریت نے ان کی رائے کے خلاف فیصلہ دے دیا تھا۔ اس بات کا چھپانا تو ان کے مقصد کے لیے مفید ہے مگر تبصرہ کرتے وقت آپ کو اس معاملے سے بے خبر نہ رہنا چاہیے تھا۔

جواب

مجھے یہ بات معلوم نہ تھی کہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا یہ پورا مقالہ "ماچھی گوٹھ" میں پڑھا گیا تھا۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے یہ بات بتا دی۔ آپ نے میرے جس فقرے کا حوالہ دیا ہے اس پر آپ کو تعجب اس لیے ہوا کہ آپ نے بعد والے جملے کی طرف دھیان نہیں دیا۔ میں نے اس فقرے کے بعد لکھا ہے "اور جہاں تک تبصرہ نگار کا تعلق ہے وہ محاکمے کو مفید بھی نہیں سمجھتا" اس سے معلوم ہوا کہ تبصرہ نگار محاکمہ کرنے کی ذمہ داری سے بچنا چاہتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس بحث کو مفید نہیں سمجھتا۔

جناب ڈاکٹر صاحب کی کتاب نے مجھے جن پہلوؤں سے متاثر کیا تھا انہیں میں نے اپنے تبصرے میں لکھ دیا ہے۔ جماعت اسلامی پاکستان سے باہر نکلنے والے دو نمایاں افراد نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مدظلہ العالی اور جماعت اسلامی کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے اور ان کی تحریروں کا بڑا حصہ غصے، جھنجلاہٹ، جارحیت، جوش انتقام اور کہیں کہیں سوقیت کی نذر ہو کر رہ گیا ہے۔ پھر یہ کہ اب وہ جماعت اسلامی کے نصب العین سے بھی متفق نہیں رہے ہیں بلکہ انھوں نے اس کے خلاف بھی لکھنا شروع کر دیا ہے۔ ان دو افراد میں جو نمایاں ترین فرد ہیں ان کی تحریروں سے تو ایسا محسوس ہوا ہے کہ پوری جماعت میں ان کی ذات ہدایت کا منارہ تھی اور جب وہ نکل آئے تو اس میں گمراہی اور تاریکی کے سوا کچھ باقی نہیں رہا۔ اس صورت حال میں ڈاکٹر صاحب کی کتاب مجھے غنیمت معلوم ہوئی تھی۔ ویسے یہ بات میں نے لکھی ہے کہ دس سال کے بعد اس کتاب کی اشاعت کا جو سبب انھوں نے لکھا ہے اس سے مجھے اطمینان نہیں ہوا۔

اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے جس نیت اور جس مقصد کا واضح الفاظ میں اظہار کیا ہے اس کو بلا دلیل رد کر دینے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ محاکمہ کرنے کے بجائے میں نے اپنے تبصرے میں اس چیز پر زور دیا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کو مثبت کام کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ گڑے مردے اکھاڑنے سے کوئی فائدہ نہیں بلکہ اس سے پاکستان کی اسلام پسند قوتوں کو نقصان پہنچے گا۔ مجھے توقع تھی کہ وہ اپنے طریق کار پر نظر ثانی کریں گے لیکن ان کی دو باتوں سے مجھے صدمہ پہنچا۔ ایک یہ کہ میثاق میں "نقش غزل" کے عنوان سے

جو سلسلۂ مضامین انھوں نے شروع کیا ہے اس کا بڑا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا مودودی کو مطعون کیا جائے اور لوگوں کی نظر میں ان کی وقعت کم کی جائے۔ دوسری بات یہ کہ انھوں نے نومبر ۶۲ء کے میثاق میں جماعت اسلامی ہند کے سرکاری ترجمان ماہنامہ زندگی رام پور کے پہلے اور آخری پیراگراف کے سرنامے کے ساتھ میرے تبصرے کے صرف اول و آخر دو مختصر پیراگراف شائع کیے ہیں۔ تنقید کا حصہ اور وہ حصہ جس میں ان سے ان کے موجودہ طریقۂ کار پر نظر ثانی کی گزارش کی گئی تھی، حذف کر دیے گئے ہیں۔ "سرکاری ترجمان" کی صراحت سے شاید وہ یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ جیسے یہ تبصرہ بھی جماعت اسلامی ہند کا سرکاری تبصرہ ہے حالانکہ کسی کتاب پر تبصرہ، تبصرہ نگار اپنے علم اور اپنی ذاتی رائے کے مطابق کرتا ہے۔ اس کا تعلق 'سرکار' سے کچھ نہیں ہوتا۔

اگر ڈاکٹر صاحب کے پیش نظر جماعت اسلامی پاکستان کے خلاف ایک نیا تحریری محاذ کھولنا اور مولانا مودودی کو لوگوں کی نگاہوں میں ہلکا ثابت کرنا ہے تو مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں نے اپنے تبصرے میں بھی لکھا تھا۔ "اگر مصنف فی الواقع وہاں کی جماعت کے خلاف کوئی محاذ کھولنا نہیں چاہتے تو ان کو اپنے موجودہ طریقۂ کار پر نظر ثانی کرنی چاہیے ورنہ اس سے جماعت اسلامی کی تنظیم کو نقصان پہنچے یا نہ پہنچے ان لوگوں کو ضرور فائدہ پہنچے گا جو پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کو ناپسند کرتے ہیں۔"

میں پہلے بھی یہی خیال رکھتا تھا اور اب بھی یہی خیال رکھتا ہوں کہ جماعت اسلامی پاکستان اپنے نصب العین سے منحرف نہیں ہوئی ہے جو لوگ اس پر انحراف کا الزام لگاتے ہیں ان کی رائے صحیح نہیں ہے۔ تبصرے میں اپنی اس رائے کا صراحۃً اظہار نہ کرنے کی وجہ یہ نہ تھی کہ مجھے اس میں کوئی تذبذب تھا اور نہ یہ وجہ تھی کہ "ماچھی گوٹھ" کا اجتماع مجھے یاد نہ رہا ہو۔ اس کا ذکر تو ڈاکٹر صاحب کی کتاب میں بھی موجود ہے بلکہ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ میں ڈاکٹر صاحب کو ماضی کی اس داستان کو نظر انداز کر کے مثبت کام پر آمادہ کرنا چاہتا تھا۔ فہمید ہے کہ ڈاکٹر صاحب بھی پرانی بحث کو نظر انداز کرنے پر آمادہ نہ ہو سکے۔ اب تجربہ ہی ان کو بتائے گا کہ اس بحث کا مفید نتیجہ نکلتا ہے یا مضر۔

میں نے تبصرے میں جماعت اسلامی پاکستان کے رفقاء کی خدمت میں جملۂ شرطیہ کے ساتھ یہ درخواست پیش کی تھی کہ اگر ڈاکٹر صاحب کے الزامات میں دس میں سے ایک صدی الزامات بھی صحیح ہوں تو انہیں غور کرنا چاہیے۔ یہ مجموعہ بحث کا ہم ہے جس ... کے سامنے اپنے قول و فعل کا حساب دینا ہو۔ یہاں کسی کی حمایت یا مخالفت آخرت کے انجام پر اثر انداز نہ ہوگی۔

فہرست مندرجات زندگی

از جنوری ۶۶ء تا دسمبر ۶۶ء

اشارات

نمبر شمار	لکھنے والے	موضوع بحث کا مختصر تعارف	جلد	شمارہ	مہینہ
۱	مولانا ابو اللیث اصلاحی امیر جماعت اسلامی	شہریوں کے بنیادی حقوق کا مسئلہ	۳۶	۳	مارچ ۶۶ء
	ہند	″	″	۴	اپریل ۶۶
	سید احمد قادری	چین اور روس کی کش مکش پر ایک تبصرہ بسلسلۂ کشمیر ایک وزیر کے بیان پر تبصرہ	۳۶	۱	جنوری
	″	مکی اور مدنی سورتوں کے درمیان فرق اور فہم قرآن کے سلسلے کی ایک بحث	″	۲	فروری
	″	″	″	۵	مئی
	″	اتحاد عالم اسلامی کے لیے شاہ فیصل کی سعی	″	۶	جون
	″	شاہ فیصل کے ساتھ صدر ناصر کا رویہ	۳۷	۱	جولائی
	″	جماعت اسلامی کے خلاف خفیہ سرکلر کا تجزیہ	″	۲	اگست
	″	موجودہ قانون ساز پارلیمنٹوں کی شرعی حیثیت	″	۳	ستمبر
	″	سید قطب کی شہادت پر اظہار تاسف مجلس مشاورت کے نونکاتی منشور پر اظہار خیال	″	۴	اکتوبر
	″	ستمبر کے اشارات کی توضیح		۵	نومبر
	″	اجتماع سہارنپور اور دہلی میں امیر جماعت اور چند دوسرے رفقاء کی گرفتاری		۶	دسمبر

ارشادات رسول

نمبر شمار	لکھنے والے	موضوع بحث کا مختصر تعارف	جلد	شمارہ	مہینہ
۱	سید احمد قادری	عشق عید کے روزے	۳۶	۴	[illegible]

نمبر شمار	لکھنے والے	موضوع بحث کا مختصر تعارف	جلد	شمارہ	مہینہ
۱	سید احمد قادری	ہجرت کے دوسرے سال عبادات و معاملات کے لیے قمری مہینہ کا تعین	۳۶	۶	جون ۶۶ء
۲	جناب وحید الدین خاں	قرآن — دل کے زنگ دور کرنے والی کتاب	۳۶	۱	جنوری
		مقالات			
۱	سید احمد قادری	زکوٰۃ کے چند اصولی احکام	۳۶	۱	جنوری
	"	سود اور جوا ہر ملک میں حرام ہے	"	۴	اپریل
	"	مجلس تحقیقات شرعیہ کی خدمت میں	"	۵	مئی
	"	زکوٰۃ کا مصرف "فی سبیل اللہ"	"	۶	جون
	"	حل التعارض کا مختصر تنقیدی جائزہ	۳۷	۱	جولائی
	"	"	"	۲	اگست
	"	آنکھوں کی وصیت	"	۶	دسمبر
۲	"الاعتصام" لاہور	کتاب اللہ کے اہم تراجم کی تاریخ	۳۶	۲	فروری
۳	ڈاکٹر احمد خضر زبیری	خدا ہندوستانی کلچر میں	۳۷	۵	نومبر
	"	"	"	۶	دسمبر
۴	مولانا جلال الدین عمری	امر بالمعروف و نہی عن المنکر	۳۶	۱	جنوری
		"	"	۲	فروری
		نماز اور انفاق	"	۵	مئی
		تنظیم کیسے مستحکم ہو	"	۶	جون
		دعوت دین کے مراحل	۳۷	۱	جولائی
		دعوت دین اور اتباع دین	"	۲	اگست
		انکار دین کے اسباب	"	۳	ستمبر
		وہ لوگ جن کو خدا کا دین ملتا ہے	"	۶	دسمبر
۵	جناب حسن احمد جیلانی	رویت ہلال	۳۷	۱	جولائی

مہینہ	شمارہ	جلد	عنوانات	لکھنے والے	نمبر شمار
اکتوبر	۴	۳۴	مسلم مجلس مشاورت پر فرقہ پرستی کا الزام	مدیر زندگی	۱
نومبر	۵	"	روداد اجتماع یک روزہ		
			رسائل و مسائل		
مارچ	۳	۳۶	عشر کے ایک جزیے کی توضیح	سید احمد قادری	۱
اپریل	۴	"	خطبہ نماز عیدین کے بعد دعا ثابت نہیں ہے		
			زکوٰۃ کی رقم سے تبلیغ دین		
			اردو زبان میں جمعہ کا خطبہ		
مئی	۵	۳۶	چرم قربانی کی قیمت سے شفاخانے کا قیام		
			جوے کی ایک شکل		
جولائی	۱	۳۷	حولان حول کی شرط اور چاندی کا نصاب		
			دنیا میں حضرت عیسیٰؑ کا نزول		
اگست	۲	"	اہل کتاب کا ذبیحہ		
اکتوبر	۴	"	زبردستی کی طلاق اور بیوی کا مہر		
			رضاعی بہن کی بہن سے نکاح		
			سنتوں کے لیے جگہ کی تبدیلی		
			حضورؐ کا اسم گرامی		
دسمبر	۶		تحریک جماعت اسلامی پر تبصرہ		
			روداد اجتماع مجلس شوریٰ		
[illegible]	۵	۳۶	روداد اجتماع شوریٰ منعقدہ مارچ ۶۶ء	قیم جماعت اسلامی ہند	۱
[illegible]	[illegible]	۳۷	جولائی ۶۶ء		

قومی سالمیت NATIONAL INTEGRATION AND OTHER ESSAYS اور دوسرے مضامین

از ایم ۔ ایم شریف صاحب ۔ صفحات ۱۵۳ ۔ قیمت ۔/۶ ۔ شائع کردہ :۔ انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک کلچر کلب روڈ ۔ لاہور

ایم ایم شریف صاحب انگریزی میں اسلام کے مفاد میں بہت سی کتابیں پیش کر چکے ہیں ۔ آپ کی تحریر کی خصوصیات یہ ہیں کہ ان میں فکر اور جذبات کی بڑی معتدل آمیزش ہوتی ہے ۔ تعقل کی شریانوں میں خون علاوہ جگر کا رچاؤ اور بہاؤ ہوتا ہے ۔ مطالعے کی وسعت اور گہرائی ہوتی ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جو کچھ کہتے ہیں وہ اصولی متانت کے ساتھ کہتے ہیں اور تنقید کی قوت کو تعمیری درجے کے ساتھ استعمال کرنے کی ممکن ترین کوشش کرتے ہیں ۔ زیر نظر کتاب میں بھی یہ تمام خصوصیات موجود ہیں ۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں مذہبی حقائق کو نفسیات کی ترازو میں تول تول کر پیش کیا ہے ۔ اس لحاظ سے ان کی یہ کتاب عہد حاضر کے دل و دماغ کے لیے خاصے کی چیز ہے

ایک مختصر سے پیش لفظ کے بعد یہ کتاب ۵ مقالات پر پھیلی ہوئی ہے ۔

پہلے مقالے کا عنوان حزن پسندی (MELANCHOLIA) ہے ۔ اس علم النفس کی روشنی میں یہ دکھایا گیا ہے کہ شوہر اور بیوی کے رجحانات میں ٹکراؤ ہوتا ہے تو اس سے بیوی کی ذہنی ساخت کس طرح بگڑتی اور وہ کن [illegible] امراض اور نفسیاتی پیچیدگیوں کا شکار رہتی ہے اور پھر اس سے گھریلو نظام زندگی کیسے کیسے تباہ ہوتا ہے ۔ مضمون بہت [illegible] اور فکر افروز ہے ۔ ان مسائل کا بنیادی حل مصنف کے نزدیک یہ ہے [illegible]

پیش لفظ میں اشارہ کیا گیا ہے) کہ عائلی قوانین میں ترمیم اور اصلاح کی جائے۔ لیکن جس تجدد زدہ شوہر کی مثال اس ذیل میں مصنف نے دی ہے۔ حق یہ ہے کہ اس کو قانون کا ڈنڈا پورے طور پر راہ راست پر نہیں لا سکتا۔ ہاں جزوی اور سطحی روک تھام ضرور کر سکتا ہے۔ اس کا بنیادی حل قانون نہیں خدا کا خوف ہے۔

دوسرا مقالہ "ہم اور ہماری نفسیات" کے زیر عنوان ہے۔ اس مضمون میں حکومت اور معاشرے میں گوناگوں اخلاقی بدعنوانیوں کی نفسیاتی جڑوں کا پتہ چلانے کی وقیع کوشش کی گئی ہے۔ اس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ مسلمانوں میں جو اخلاقی زوال آ رہا ہے اس کا ذمہ دار "اسلام" نہیں بلکہ یہ حقیقت ہے کہ اسلاف کے اسوۂ حسنہ کی نقل کرتے ہوئے اخلاف پورے اسوۂ حسنہ کی خوبیوں کو ماضی سے حال کی طرف منتقل کرنے میں ناکام ہوتے رہتے ہیں اور اس طرح ان کا "اخلاقی سرمایہ" کم سے کم ہوتا چلا جاتا ہے اور پھر جب وہ کسی بڑے تمدن و تہذیب کے سامنے آتے ہیں تو احساس کہتری کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں اور احساس کہتری اپنے ساتھ اپنی تمام نحوستیں لے کر ان کے اندر گھس جاتا ہے۔

مغربی تہذیب کی زد میں آ کر یہ احساس کہتری کا اجتماعی مرض ہم مسلمانوں میں پیدا ہوا اور اس کے تباہ کن اثرات پیدا ہو کر رہے۔ اس اجتماعی احساس کہتری کے مرض سے نجات دلانے والوں میں مصنف نے سرسید مرحوم، ڈاکٹر اقبال مرحوم اور مرحوم محمد علی جناح کا تذکرہ خصوصی العقیدت کے ساتھ کیا ہے کہ کوئی شبہ نہیں کہ سرسید اسکول نے مسلمانوں کو احساس کہتری سے نکالنے کی جہد آفریں کوشش کی تھی لیکن اس کوشش میں کئی ایک مقامات پر انہیں اسلام کے سلسلے میں ایسی تاویلات کو اختیار کرنا پڑا جو درحقیقت معذرت کیشانہ تھیں۔ مغربی اعتراضات کی زد سے اسلام کو بچانے کا نیک جذبہ ان کو وہاں لے آیا جہاں معجزوں اور ملائکہ جیسے "معتقدات" کی تمام قدیم اور متفقہ تعریفات سے ہٹ کر انہوں نے اس طرح کی نکتہ آفرینی کی ایک نئی راہ اختیار کی کہ ان کا فکری جہاد اپنی روح کے لحاظ سے جہاد نہیں بلکہ مغربی ذہن کی مناسبت سے بات کرنے کا ایک طرح کا "انداز معذرت" بن کر رہ گیا۔ اس کے علاوہ ان حضرات کی فکری رہنمائی میں چل کر مسلمان ابھی تک اس مقام پر نہیں پہنچ سکے جہاں مغربی تہذیب کے "دام ہمرنگ زمین" سے مکمل نجات مل گئی ہو۔ سیاسی آزادی کے بعد مکمل فکری آزادی کی منزل ابھی تک نظروں سے اوجھل ہے ہاں اس منزل کا شعور ضرور پیدا ہو چکا ہے اور یہ شعور منزل تک پہنچنے کے لیے صحیح راہ کا انتخاب کرنے میں بھی

تک تجربی بھول بھلیاں میں بڑی حد تک سرگرداں ہے۔ اس شعور کا کریڈٹ متذکرہ شخصیات کو ضرور حاصل ہے۔ مگر اس سے زیادہ نہ اس سے کم۔ اس لیے اس ضمن میں مصنف کے یہ الفاظ مبالغے سے خالی نہیں کہ ان حضرات کی رہنمائی میں :۔

"ہم نے غیر ملکی اقتدار سے آزادی بھی حاصل کرلی ہے" ص۲۷

"غیر ملکی اقتدار" میں سیاسی ہی نہیں فکری اقتدار اور تہذیبی تسلط کو بھی شامل سمجھیے ، ساس کے بغیر آزادی محض ایک لفظ ہے۔

تیسرا مضمون "صالح زندگی اور شہریت" (Good life and citizenship) اس کتاب کا سب سے کامیاب مضمون ہے ہماری نظر میں۔ حقائق سے بھرپور اور افادیت سے لبریز — فکر انگیز — حیات آموز۔

یہی حال "سماجی نشوونما کی شرائط" نامی مقالے کا ہے۔ اس کی ترتیب نہایت کامیاب اور تحلیل نہایت متوازن ہے۔

آخری مضمون جو سب سے طویل ہے اس کا عنوان قومی سالمیت National integration ہے ممکن ہے اس کو جن مختلف وجوہ سے کتاب کا "سرنامہ" بنایا گیا اس میں یہ وجہ بھی شامل ہو کہ لفظ "قوم" اس عہد کا ایک مقدس لفظ بن چکا ہے۔ اگرچہ مصنف موصوف اس قسم کی "تقدیس" کے دل دادہ نہیں ہیں۔ تاہم مخاطب کی ذہنی مناسبت سے ان کو بھی اس کی اہمیت کا شعوری یا غیر شعوری احساس رہا ہوگا — حالانکہ ہمارے نزدیک تیسرا درجہ تھا مضمون بھی اس قابل تھا کہ کتاب کا عنوان بن سکے۔

اس مقالے کے بارے میں چند باتیں عرض کرنا ہیں :۔

اس میں جمہوریہ اسلامیہ پاکستان کے بنیادی قوانین و اصول کا خاکہ پیش کرنے کے بعد یہ دعوے کہ "ساری دنیا جانتی ہے کہ ہماری حکومت بڑی سختی کے ساتھ ان اصولوں پر چل رہی ہے" (ص۱۲۸) — ایک خوبصورت دعوے ہے جس میں مکمل طور پر مطابق واقعہ نہ ہونے کے سوا اور کوئی عیب نہیں ہے۔

اسی مضمون میں صفحہ ۱۲۰ پر قومی استحکام میں مذہب کے حصے سے بحث شروع ہوتی ہے۔ بتایا گیا ہے کہ "ملی اور پھر شکری جموعے اور چیزوں کی طرح مذہب بھی باسی ہو جاتا ہے جسم رہ جاتا ہے اور روح ہٹ جاتی ہے" اس کی خصوصی وجوہ میں سے ایک وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ مذہبی رہنما جس کی تبلیغ کرتے ہیں اس پر عمل نہیں

کرتے ہیں۔ چنانچہ مصنف کی رائے ہے کہ غیر منقسم ہندوستان میں جو تحریکیں چلی ہیں اور ان تحریکوں سے [illegible] کے لیے شاہ ولی اللہ، سرسید مرحوم اور ڈاکٹر اقبال مرحوم نے اپنی حیات پرور کرنیں دوڑائیں۔ ہم یہاں ان کی تردید نہیں کرتے کہ مصنف کا یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے۔ ہاں یہ سوال ضرور محسوس ہوا کہ کیا خود سرسید مرحوم اور ڈاکٹر اقبال نے جو کچھ کہا اور جتنا کچھ کہا اتنا ہی ان کا "عمل" بھی تھا؟ کیا ابھی تک دنیا کو اقبال کے "کردار کے غازی" کا انتظار نہیں ہے؟ ...... درحقیقت ان "مصلحین" کی جاذبیت اور عظمت کا راز ان کی عملیت میں نہیں بلکہ اس بات میں مضمر تھا کہ وہ لوگ واقعی ایک فرسودہ نظام کے خلاف بغاوت وانقلاب کی آواز تھے۔ ایک غلط عمل کے خلاف صحت مندانہ ردِ عمل تھے۔ اس لیے ان "نئے ستاروں" سے کسب نور کرتے ہوئے ہمیں یہ یاد رکھنا ہوگا کہ ردِ عمل میں نفسیاتی طور پر افراط و تفریط کے کچھ دھبے ضرور ہوتے ہیں اور اس ردِ عمل کے "تزکیہ" کے لیے اور اس کو معتدل و متوازن بنانے کے لیے زندگی کو ایک اور "عمل" کا انتظار رہتا ہے۔

مصنف موصوف کا ایک خاص اندازِ تحریر ہے — بے حد متین، بہت بے ضرر قسم کا۔ نقد بھی اس قدر نرمی سے کرتے ہیں کہ جیسے کوئی چٹکی نہیں لے رہا، سہلا رہا ہے۔ لیکن ہم نے محسوس کیا کہ صفحہ ۱۸ پر مصنف نے انگریزوں کے "ظلم و تشدد" کو جس خوبصورت اور لطیف انداز میں بیان کیا ہے، "مذہبی" قدامت پسندوں پر نقد کرتے ہوئے وہ لطافت و حسن کسی قدر لطیف تلخی میں بدل گیا ہے۔ مثلاً صفحات ۱۲۹ اور ۱۳۰ پر۔ ہمیں احساس ہے کہ یہ ان کی مذہبی غیرت اور مذہب دوستی کا نتیجہ ہے۔ مگر پھر بھی جی چاہتا ہے کہ ان کے اسلوب کی اس مخصوص شفافیت روانی میں اتنی سی بھی جذباتی ملاوٹ نہ ہوتی۔ انگریزوں کے سلسلے میں ان کے اسلوب کا یہ حسن حسب ذیل سطور میں ملاحظہ فرمائیے۔

"غدر کے بعد ان کی حکومت نے بیدردانہ تشدد کی شکل اختیار کرلی۔

میں ان کو الزام نہیں دیتا۔

شاید کسی اور قوم کی حکومت اس سے بھی زیادہ دبرنی ہوتی۔

میں تو محض حقائق بیان کرتا ہوں

مجموعی طور سے کتاب نہایت وقیع اور نہایت قابلِ قدر ہے۔ خدا ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

(ش. ن. عثمانی)

(بقیہ اشارات)

اس میں ہر زیادتی اور ہر حماقت ممکن ہے۔ صدر ناصر کے خلاف مظاہرہ اور ان کو کالی جھنڈی دکھانے کے اندیشے کی بنیاد پر امیر جماعت اسلامی ہند اور ان کے رفقاء کو گرفتار کرنا بھی اسی طرح کا ایک واقعہ تھا یہ بات بھی دیکھی جا رہی ہے کہ جہاں تک مسلمانوں اور ان کے رہنماؤں کو گرفتار کرنے کا تعلق ہے، حکومت کسی معقولیت کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتی۔ اس بے ہودہ الزام میں گرفتاری کو مولانا ابواللیث صاحب نے بجا طور پر اپنی توہین قرار دیا ہے وہ ایک انٹرویو میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"اس الزام کے بارے میں میرا حقیقی تاثر یہ ہے کہ وہ ہمارے لیے ایک شدید ترین توہین کی حیثیت رکھتا ہے جس سے یقیناً ہماری حیثیت عرفی مجروح ہوئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہمارے دلوں میں حکومت کے خلاف کوئی تلخی نہیں ہے کیونکہ ہماری تسلی کے لیے یہ بات کافی ہے کہ اس طرح کے الزامات تو دراصل ہماری گرفتاری کا محض بہانہ ہیں۔ ہمارا اصلی جرم یہی ہے کہ ہم اس زمانے میں بھی اسلام اور اقامت دین کا نام لیتے ہیں۔ اس لیے اس راہ میں جو کچھ بھی پیش آئے وہ ہمارے لیے عین سرمایۂ سعادت ہے۔"

(دعوت دہلی - ۴ر نومبر ۶۶ء)

اس الزام کو ثابت کرنے کے لیے جو دلیلیں مہیا کی گئی تھیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ حکومت مسلمانوں کے بنیادی حقوق سلب کرنے کے لیے بھی کسی معقولیت کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔ مولانا اپنے انٹرویو میں کہتے ہیں۔

اس بے بنیاد الزام کو صحیح ثابت کرنے کے لیے جو "دلائل اور شواہد" فراہم کیے گئے ہیں ان کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ میں نے شہید قطب اور ان کے ساتھیوں کی سزائے موت پر بذریعہ تار صدر ناصر سے ان پر رحم کرنے کی اپیل کی تھی اور ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ ان شہیدوں کے لیے ایک نماز جنازہ کا ذکر کرتے ہوئے مجھے اس نماز کا امام قرار دیا گیا ہے۔ درآں حالیکہ فرد جرم کے مطابق جس تاریخ کو وہ نماز جنازہ پڑھی گئی تھی اس میں سرے سے میں دہلی میں موجود ہی نہ تھا اور یہ بات تو اس فرد جرم سے معلوم ہوئی کہ کسی مسلمان کی نماز جنازہ پڑھنا یا اس کے لیے دعائے مغفرت کرنا بھی جرم ہے۔ اسی طرح میرے اور جو الزامات کے سلسلے میں جو تاریخیں درج ہیں وہ بھی وہ ہیں جن میں میں دہلی سے ہزاروں میل سے بھی زیادہ دور [illegible] اور [illegible] کے دورے پر تھا اور اس موقع پر بھی دعوت میں حسب معمول میرے باہر جانے اور واپسی کی اطلاعات [illegible] چھپ چکی ہیں اور اس موقع پر جن لوگوں کو گرفتار کیا گیا تھا ان سب کے

الزامات کی نوعیت بھی قریب قریب یہی ہے۔"

اس فردِ جرم پر کسی کی آزادی سلب کرنے کے معنی اس کے سوا اور کیا ہیں کہ حکومت جس مسلمان کو جب چاہے گرفتار کرے۔ جن لوگوں نے یہ فردِ جرم بنائی انہیں پورا اطمینان تھا کہ وہ جو کچھ بھی لکھ دیں گے اس کی کہیں کوئی بازپرس ہونی نہیں ہے ——— بہرحال اس ظلم پر زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ اس کا کڑوا پھل وزیرِ داخلہ شری گلزاری لال نندہ کو چکھنا پڑا اور وہ جو شاعر نے "ترے کوچے سے ہم نکلے" والا شعر کہا ہے کا منظر آنکھوں کے سامنے آگیا۔ ۷ر نومبر ۶۶ء کو پارلیمنٹ کے سامنے اور نئی دہلی کے متعدد حلقوں میں جو فسادات کیے گئے وہ کوئی تعجب کی چیز نہیں ہے۔ اب شاید شری نندہ کو اندازہ ہو رہا ہوگا کہ جن سنگھ اور آر ایس ایس کو بڑھاوا دے کر انھوں نے کتنی بڑی غلطی کی ہے۔ طلبہ کی یہ ملک گیر شورش ہو یا جن سنگھ کی یورش۔ یہ دراصل نتیجہ ہے اس غلط پالیسی کا جو کانگرس کی حکمراں پارٹی اور مرکزی حکومت کی وزارتِ داخلہ نے مسلمانوں کے بارے میں اختیار کر رکھی ہے۔ مسلمان اٹھارہ انیس سال سے کہتے آرہے ہیں کہ اگر مسلمانوں پر ظلم و ستم کا سلسلہ بند نہ کیا گیا تو حکومت کو یاد رکھنا چاہیے کہ آج مسلمان مشقِ ستم ہیں تو کل حکومت بھی ہدف بن سکتی ہے۔ جن لوگوں کو آج مسلمانوں کو لوٹنے اور مارنے کی چھوٹ دی جارہی ہے وہ کل خود آپس میں بھی یہ مشق دہرا سکتے ہیں اور اس طرح پورا ملک افراتفری کا شکار ہو سکتا ہے۔ مسلمانوں کی اس تنبیہ کو پٹے ہوئے لوگوں کی چیخ سمجھ کر نظرانداز کر دیا گیا لیکن اب ان کی وہ تنبیہ اس طرح سچ ثابت ہو رہی ہے کہ خود صدرِ کانگرس اور وزیروں کے گھر بھی آتش زنی سے محفوظ نہیں رہ گئے ہیں۔

اب بھی وقت ہے کہ کانگرس کے وہ بااثر لوگ جو مسلمانوں کی دشمنی میں اندھے نہیں ہو چکے ہیں، یہاں ہوں اور ملک کو تباہی و بربادی سے بچانے کی جان توڑ کوشش کریں۔ مسلمان اس کوشش میں ان سے پورا تعاون کریں گے۔